حضرت مولانا محمد علی صاحب صدیقی کاندھلوی

امامِ اعظمؒ اور علمِ الحدیث

مؤلفہ

حضرت مولانا محمد علی صاحب صدیقی کاندھلوی

صدر دار العلوم الشہابیہ

سیالکوٹ

انجمن دار العلوم الشہابیہ ○ رنگپورہ روڈ سیالکوٹ شہر

ملکیت ـــ انجمن دار العلوم الشہابیہ شہر سیالکوٹ

تالیف ـــ مولانا محمد علی الصدیقی الکاندھلوی

ترتیب فہارس ـــ عبدالوکیل علوی ایم۔اے

عناوین ـــ ۲۸۸

آیات ـــ ۵۲

احادیث ـــ ۹۳

طابع ـــ حفیظ اللہ فاروقی

تزئین و آرائش ـــ سید نفیس الحسینی، لاہور

کتابت ـــ محمود صوفی، گوجرانوالہ

مطبع ـــ شاہد بشیر پرنٹرز لاہور

کل صفحات ـــ ۸۱۲

تاریخ اشاعت ـــ اپریل ۱۹۸۱ء

قیمت ـــ روپے Rs 55/-

انتساب

عالی جناب عباس حسین ملک رئیس اعظم شہر سیالکوٹ کے نام

جن کی دینی حمیت اور محبت اسلام میں ڈوبی ہوئی مخلصانہ

دریادلی اور ہمدردانہ عنایت کی انجمن دارالعلوم الشہابیہ

رہینِ منت ہے اور جو اپنے دل میں آئندہ بھی انجمن کے

فلاحی، تعلیمی اور تبلیغی کاموں کو پروان چڑھانے کا

خاص جذبہ رکھتے ہیں۔

انجمن دارالعلوم الشہابیہ شہر سیالکوٹ

پیش لفظ

باسمہٖ سبحانہٗ :-

۱۹۵۳ء میں جب مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک میں نظربندی کے ایام سیالکوٹ جیل میں گزار رہا تھا، میرا جی چاہا کہ علم حدیث میں امام اعظم کی جلالتِ قدر اور اس فن میں اُن کی عظمت کو شاہراہِ عام پر لاؤں اور یہ تمنا اس لیے ہوئی کہ جیل ہی کی زندگی میں ایک روز صبح کی نماز کے بعد اذکارِ مسنونہ میں مشغول تھا کہ اچانک میری جیل کی زندگی کے دو رفیق میرے کمرے میں آئے۔ ان میں سے ایک کو میرے سے عقیدت اور دوسرے کو عقیدت تو نہیں مگر تلمذ کی نسبت حاصل تھی۔ بغیر کسی تمہید کے دونوں نے مجھ سے دریافت کیا:

آپ دار العلوم الشہابیہ میں کس قدر عرصہ سے رہتے ہیں؟

میں نے جواباً بتایا کہ

۵ار فروری ۱۹۳۶ء میں دار العلوم الشہابیہ سے وابستگی ہوئی ہے اور اب ۱۹۵۳ء ہے حساب کر لو غالباً اٹھارواں سال ہے۔

اٹھارہ کا لفظ سنتے ہی دونوں کچھ چونک سے گئے اور باہم آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرنے لگے

میں نے حیرت سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟

اُن میں سے ایک نے کہا کہ

میں نے آج رات خواب دیکھا ہے کہ میں دار العلوم گیا ہوں۔ دار العلوم کا کتب خانہ بڑا شاندار ہے شیشہ لگی ہوئی خوبصورت الماریاں ہیں، کتب خانے میں ایک نورانی صورت بزرگ ہستی سپید لباس میں جلوہ افروز ہے۔ میں نے اُن سے مصافحہ کیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ ہیں۔ میں نے مؤدبانہ انداز میں دریافت کیا کہ آپ دار العلوم الشہابیہ میں کتنے عرصہ سے قیام پذیر ہیں۔ جواب میں ارشاد فرمایا کہ مجھے غالباً اٹھارواں سال ہے۔

میں یہ خواب سن کر کچھ پریشان سا ہوگیا۔ دو روز تک اسی پریشانی میں وقت گزرا۔ تیسرے دن میں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، کو خواب میں دیکھا اس خواب کے بعد میرے قلب میں امام اعظم کی محدثانہ شان اور علم حدیث میں ان کی عظمت کے موضوع پر کام کرنے کا داعیہ رونما ہوا اور اس داعیہ کا اپنے دوستوں میں اظہار بھی کر دیا۔ جب میں نے اپنے احباب کو یہ بات بتائی تو میرے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میں ایک ایسے کام کا اعلان کر رہا ہوں جو تیرہ برس تک التوا میں پڑا رہے گا لیکن حالات و واقعات کچھ اسی طرح بن گئے۔

ارمغانِ ایمان

جیل سے باہر آتے ہی دوستوں کے اصرار سے ارمغانِ ایمان پر نظر ثانی کی۔ مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ نے اس کی طباعت کا اہتمام کیا۔ اس سے فراغت ہوئی تو دار العلوم کی انتظامی اور اہتمامی مصروفیات سدِ راہ ہوگئیں۔ نئے انداز میں نئے طرز کے اسکول کا آغاز کیا، پرائمری پھر مڈل۔

اسلام کا نظامِ اذکار

اسکول کی انتظامی مصروفیات ہی میں اسلام کا نظامِ اذکار نامی کتاب کی طباعت کا مرحلہ بھی پیش آگیا۔ اس کے لیے جب مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ نے کمرِ ہمت باندھی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ پوری کتاب پر نظر ثانی کی جائے اصل کتاب صرف ۷۰ صفحات پر مشتمل تھی نظر ثانی میں کتاب کی ضخامت ساڑھے تین سو صفحات سے زائد ہوگئی۔

نقوشِ زنداں

جیل کی زندگی میں کچھ وقت خود ہی تفریحِ طبع کے لیے مقرر کر رکھا تھا اور تفریح یہ ہوتی تھی کہ روزانہ قلم کی زبان سے کسی عزیز، کسی دوست اور کسی بزرگ کو مخاطب کر کے جو کچھ جی میں آتا لکھ دیتا مختلف بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کے نام لکھے ہوتے یہ خطوط میرے بکس میں محفوظ تھے۔ میرا معمول تھا کہ جو کچھ بھی لکھتا تاریخی ترتیب کے ساتھ بکس میں رکھ دیتا۔ جیل سے آنے کے بعد کافی عرصہ یہ خطوط رکھے رہے۔ ایک روز میں نے یہ خطوط نکال کر مولوی محمد شریف قاسمی کو نقل کرنے کے لیے دیے۔ مولوی صاحب نے ان کو اس طرح نقل کیا کہ ان کا حسن و جمال دوبالا ہوگیا۔ احباب نے

پڑھے تو ان کی طباعت کے لیے متقاضی ہو گئے۔ بالآخر مکتبہ قاسمیہ سیالکوٹ نے اس کی طباعت کا بھی انتظام کیا۔

ان کاموں سے فراغت ہوئی تو انجمن دارالعلوم الشہابیہ نے اپنی نگرانی میں مختلف ادارے کھول دیے۔ پرائمری اسکول، مڈل اسکول، شعبۂ حفظ قرآن، شعبۂ علوم اسلامی، شعبۂ تبلیغ، شعبۂ نشر و اشاعت اور دارالافتاء ـــــ انتظامی و اہتمامی مشغولیتیں اس قدر بڑھ گئیں کہ فرصت میرے لیے معدومات میں سے ہو گئی اور اس پر یہ سرگرانی کہ اخراجات کے لیے آمد کے وسائل ساتھ نہ دیتے تھے۔ یہ میرے لیے زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی لیکن میں نے کوشش کی کہ اس میں پورا اتروں انتظامی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ امام اعظم پر کچھ لکھنا پُرسکون زندگی کے بغیر ممکن نہ تھا اور زندگی کا سکون میرے لیے عنقا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ کچھ سرمایہ جمع کیا جونہی ترتیب کے لیے تیار ہوتا تو انجمن دارالعلوم الشہابیہ کے مختلف اداروں کی پھیلی ہوئی پریشانیوں سے طبیعت میں انقباض آجاتا اور دو چار صفحے لکھ کر چھوڑ دینا پڑتا۔

ستمبر ۶۵ء کی چھ تاریخ تھی کہ بھارتی حکمرانوں نے پاکستان پر ناپاک ارادوں سے حملہ کر دیا۔ دارالعلوم کے تمام ادارے بند ہو گئے اور ؎ عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد کے مطابق میں جس سکون کی تلاش میں تھا الحمدللہ مل گیا۔ تنہائی اور بالکل تنہائی۔ میں اور میری رفاقت کا کام دارالعلوم کے کتب خانے کی کتابیں کر رہی تھیں۔ الحمدللہ، ان کی شبانہ روز محنت کے بعد امام اعظم اور علم الحدیث کی ہستی وجود میں آگئی ضروری ہے کہ امام اعظم اور علم الحدیث کے متعلق چند امور کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔

۱۔ کتاب کی ترتیب سے مقصود یہ تھا کہ امام اعظم کی محدثانہ شان کو خود محدثین کی زبانی شاہراہ عام پر لایا جائے لیکن محدثانہ شان کو بتانے کے لیے مولف نے محسوس کیا کہ علم حدیث کے تاریخی تعارف کے بغیر یہ مبحث اصولی حیثیت سے نامکمل رہے گا۔ اس لیے اولاً علم حدیث کا تاریخی چہرہ پیش کیا گیا ہے۔

۲۔ مقصد کے پیش نظر جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

اول کوشش کی گئی ہے کہ حدیث میں امام اعظم کی علمی زندگی کا کوئی گوشہ بغیر اشارہ و تشریح کے نہ رہ جائے اور جن جن مقامات کے لیے تفصیلی بحث کی ضرورت محسوس ہوتی ان پر مستقل مباحث لکھے گئے۔ یہ مباحث بعض مقامات پر قدرے طویل ہو گئے مثلاً حدیث میں امام اعظم

کے اساتذہ پر پورے سو صفحات کا مبحث ہے۔

مجہول اور ضعیف راویوں سے روایت پر بیس صفحوں میں تبصرہ ہے۔

تاریخ تدوین حدیث کا چونکہ امام اعظم سے خاص تعلق ہے اس لیے یہ بحث ۲۹۳ سے شروع ہوکر ۳۲۶ تک آگئی ہے۔

تصانیف کی تاریخ کے تذکرے میں کتاب الآثار پر مختلف حیثیتوں سے صفحہ ۳۲۷ سے ۳۷۶ تک بحث کی گئی ہے اور اس کے ساتھ حدیث کی دوسری کتابوں مثلاً موطا، جامع معمر، جامع سفیان کے ساتھ اس دور کی تصانیف کا پورا تاریخی خاکہ صفحہ ۴۱۲ تک پیش کیا گیا ہے۔

علم حدیث میں مسانید کی حیثیت اور تاریخ لکھ کر مسند امام احمد اور مصنف عبدالرزاق کی تاریخی اور علمی حیثیت کی نشاندہی کی ہے۔ تیسری صدی میں صحاح کی تالیف پر ایک تفصیلی نوٹ ہے۔

الغرض تمام موضوعات پر تفصیل و تشریح کا ہی انداز رہا ہے۔ بلاشبہ یہ تفصیلات قاری کے لیے بارِ خاطر ہوں گی مگر مؤلف اپنی افتادِ طبع سے کچھ مجبور ہے۔ زبانِ قلم پر بات آنے کے بعد روکنا مؤلف کے بس کی بات نہیں ہے۔

۳۔ کتاب میں جو علمی مواد فراہم کیا گیا ہے اس میں مؤلف نے حوالہ کا التزام کیا ہے اور کتاب کے آخر میں جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی فہرست بھی شامل ہے۔ کام کی علمی نوعیت کے پیشِ نظر کتابوں کی نایابی مؤلف کے لیے پریشان کن رہی ہے۔ اس پریشانی میں جس گرامی قدر شخصیت کی علمی محنتوں سے میں نے استفادہ کیا ہے اور جن کے لیے میرے رُوئیں رُوئیں سے دُعائیں نکل رہی ہیں وہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی جامعہ اسلامیہ بہاولپور ہیں۔ موصوف کی تصانیف ماتمس بہ الحاجۃ، امام ابن ماجہ اور علم حدیث، تعلیقات دراسات، تعلیقات ذب ذبابات میری قدم قدم پر رہنمائی کر رہی ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ کتاب میں مطبعی اغلاط کافی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب لکھنے کے بعد طباعت کے وقت دارالعلوم کے تعلیمی ادارے کھل چکے تھے، نہ میں تصحیح کر سکا ہوں اور نہ پروف پڑھ سکا ہوں اور نہ اس پر صحیح معنے میں نظرِ ثانی کر سکا ہوں حتیٰ کہ کتاب کی فہرستیں مرتب کرنے کا بھی میرے پاس وقت نہیں تھا۔

فہرستوں کی ترتیب کے لیے میں عزیز امین اللہ وثیر ایم۔ اے لیکچرر پنجاب یونیورسٹی کے لیے خلوصِ قلب سے دُعاگو ہوں انہوں نے بڑی تندہی اور عرق ریزی سے کتاب کی فہرستیں مرتب کیں۔

آخر میں مَیں اپنے ان احباب کا بھی صمیم قلب سے شکرگزار ہوں جنہوں نے میری صرف ایک آواز پر مصارف طباعت کے لیے مطلوبہ رقم پیش کرکے میری حوصلہ افزائی کی۔ جزاہم اللہ۔

معذرت

تمام خامیوں کے باوجود وقت کی تنگی اور عدیم الفرصتی قدم قدم پر میرے خیالات کو میری خواہش کے مطابق عملی جامہ پہنانے میں مانع رہی ہے۔

چونکہ ۱۹۶۶ء میں اس کتاب کو پیش کرنے کا اعلان ہو چکا تھا اس لیے کام کی رفتار تیز رکھنی پڑی، مسودے کو میرے ایک عزیز مولوی محمد شریف قاسمی صاف کرتے تھے میں اس پر سرسری نگاہ ڈالتا تھا اور کاتب کے حوالہ کرنے کو کہہ دیتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں گزشتہ کا استحضار رہنا مشکل تھا اس لیے عنوانات میں جس قدر ترتیب کا حسن قائم رہنا چاہیے تھا، قائم نہیں رہ سکا۔ ارباب علم سے استدعا ہے کہ وہ اپنی منصفانہ علمی تنقید سے مطلع فرمائیں تاکہ طبع ثانی میں اس کا خیال رکھا جائے۔ اللھم تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

○

امام اعظم اور علم الحدیث کے متعلق گرامی قدر آراء

حضرت مولانا علامہ ابوالوفا افغانی رحمہ اللہ صدر مجلس احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد (دکن)

ماشاء اللہ تعالیٰ آپ نے بڑی جدوجہد کے بعد ایک ایسا مجموعہ مرتب کیا کہ قوم کو مستغنی کر دیا۔ کتاب کی تحقیقات اور اس کی خوبیاں تو فوراً اس پر بھی واضح ہو جائیں گی جس نے اس کا سرسری مطالعہ بھی کیا چہ جائیکہ امعان و تعمق سے دیکھا ہو، جزاک اللہ تعالیٰ خیراً بڑی تحقیق کی اور تفصیل سے بیان کیا۔ کاش یہ کتاب عربی میں ہوتی تو اس کی منفعت عام ہوتی۔ اب اس کا فائدہ صرف ان کے لیے ہے جو اردو سے واقف ہیں۔ میں کتاب پر تفصیلاً تو اس وقت کچھ لکھ سکوں گا کہ اس کا پورا مطالعہ کر سکوں۔ اشتغال و امراض وغیرہ سے پوری کتاب کے مطالعہ کی اجازت کہاں دیتے ہیں۔ تاہم میں ضرور اس کے مطالعہ سے فارغ ہونے کی کوشش کروں گا بشرط زندگی، والموت ادنیٰ من شراک نعلہ، تبدیل آب و ہوا کے لیے افغانستان جانے کا قصد ہے دو ماہ بعد اگر میسر ہو تو شاید دیکھ سکوں۔ اب تو کتاب الحجہ جزء ثانی کی طباعت میں مشغول ہوں، اکثر حصہ کی طباعت ہو چکی ہے بحمد للہ، اللہ تعالیٰ آپ کو مزید اس قسم کی خدمتوں کی توفیق دے اور حیات طیبہ نصیب فرماتے و فقکم اللہ لکل خیر، آپ کے تعارف کا مشتاق ہوں والسلام دمتم بالخیر والعافیہ۔

حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرسہ خیر المدارس، ملتان

حدیث اور امام اعظم، پہنچی، ماشاء اللہ، ایں کار از تو آید و مردان چنیں کنند۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، رحمۃ اللہ علیہ صدر دار العلوم، کراچی

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی علمی جلالت، شان اور علمی کمالات، ورع و تقویٰ، عبادت و زہادت ایسی چیز نہیں جس سے کوئی لکھا پڑھا مسلمان ناواقف ہو، اپنوں اور غیروں میں موافق اور مخالف سبھی میں یہ چیز ناقابل اختلاف سمجھی گئی ہے لیکن ہر امام اور ہر عالم مقتدا، علوم دین کے مختلف شعبوں میں سے کسی ایک شعبہ کو بحیثیت فن کے اپنے سعی و عمل کے لیے مخصوص کر لیتا ہے یا منجانب اللہ ایسے اسباب ہو جاتے ہیں کہ یہ فن ان کی خصوصیت بن جاتی ہے۔ وہ دنیا میں عام طور پر اسی فن کے ماہر کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے مگر اس کا یہ مطلب کہیں نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے علوم و فنون کا ماہر نہیں ہے۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام علوم اسلامیہ نقلیہ تفسیر، حدیث وغیرہ میں بلکہ عقلیہ کلام وغیرہ میں بھی اعلیٰ کمال عطا فرمایا تھا۔ مگر ان تمام علوم و فنون میں سے جس چیز کو اپنے لیے خاص فن کی حیثیت سے انہوں نے اختیار فرمایا وہ فقہ فی الدین ہے، اس لیے دنیا میں ان کی عام شہرت تفقہ کی حیثیت سے ہوئی۔ اہل بصیرت سے تو یہ بات مخفی نہیں کہ فقہ میں کوئی شخص مہارت و امامت کا درجہ اس وقت تک حاصل کر ہی نہیں سکتا جب تک، قرآن و سنت میں مہارت تامہ حاصل نہ کرے۔ مگر بعض سطحی نظر والوں نے امام اعظم کی جلالت شان فی علم الحدیث پر کچھ شبہات کیے، کچھ دوسرے لوگوں نے اسے عوام میں پھیلایا اور بہت سے عوام غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ ان حالات کو دیکھ کر میری دیرینہ تمنا تھی کہ حضرت امام اعظم کی مہارت علم حدیث اور ان کے اساتذہ و تلامذہ فی الحدیث پر کوئی کتاب لکھی جائے۔ اب سے تقریباً چالیس سال پہلے خود احقر نے محدثین حنفیہ کے نام سے ایک مقالہ ماہنامہ القاسم دار العلوم دیوبند میں شروع کیا تھا مگر اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔

حال میں حضرت مولانا محمد علی صاحب صدیقی کاندھلوی کی تصنیف جدید "امام اعظم اور علم الحدیث" نظر نواز ہوئی تو دیرینہ تمنا پوری ہونے کا وقت آگیا۔ کتاب کو جوں جوں دیکھا گیا مسرت بڑھتی گئی۔ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے کہ پوری شرح و بسط کے ساتھ اس موضوع پر بہترین اور مستند مواد جمع فرما دیا، اور اس کی افادیت اس سے اور بڑھ گئی کہ ہر جگہ اصل ماخذ کا حوالہ پوری وضاحت کے ساتھ دے دیا ہے۔ اور جب کتاب کے مقدمہ میں یہ پڑھا کہ اس کی تالیف کا زمانہ صرف وہ سترہ دن ہیں جن میں پاکستان ہندوستان کے حملہ پر دفاعی جہاد میں مصروف تھا اور

مولانا مدظلہ کا محل قیام سیالکوٹ خصوصیت سے اس جنگ کا سخت ترین محاذ تھا انہی دنوں میں اس کتاب کی تالیف ہوئی تو معلوم ہوا کہ بلاشبہ یہ ایک کرامت ہے۔ اب کتاب چھپی ہوئی سامنے ہے سترہ دن میں کوئی متوسط آدمی اس کو اطمینان سے پڑھ کر بھی پورا نہیں کر سکتا۔ لکھنا اور وہ بھی سینکڑوں کتابوں کے حوالوں اور ان کی تشریحات کے ساتھ لکھنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔

بہرحال کتاب کو مختلف مقامات سے پڑھ کر یہ اندازہ ہوا کہ الحمدللہ اس موضوع پر کافی، شافی اور بڑا قابل قدر ذخیرہ مولانا نے پیش فرما دیا ہے فجزاہم اللہ خیر الجزاء۔

حضرت مولانا نعمت اللہ شاہ صاحب، حیدرآباد (دکن)

کتاب امام اعظم اور علم الحدیث، کے ابواب و فصول ایک مستقل کتاب کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر چار دن ائمہ کے فقہ کی تدوین کی جاتے اور مختلف معروضات پر ضمیموں اور تذییل اور ترتیب، تہذیب نگارش جو علم الحدیث نبوی خاطر جمع کیے گئے ہیں، کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے، میں اس کتاب کو ہر مسلم یونیورسٹی اور ہر دارالعلوم کے لیے لازم و ملزوم سمجھتا ہوں۔ میں نے مواعظیت اور اپنے خطبات کے لیے اس کتاب کو نہایت اہم اور ضروری سمجھا ہے۔ سینکڑوں اسماء الرجال، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کیوں نہ لکھی جائیں اس کتاب کی اہمیت پیدا نہیں کر سکتیں۔

حضرت مولانا شمس الحق افغانی صاحب صدر شعبہ تفسیر اسلامی یونیورسٹی، بہاولپور

یہ کتاب حضرت مولانا محمد علی صاحب کاندھلوی کا تصنیفی شاہکار ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت جامع الکمالات تھی۔ آپ بیک وقت فقیہ اعظم اور مجتہد بھی تھے، عارف، زاہد، عابد اور متقی بھی تھے، مفسر، متکلم اور سیاسی مبصر بھی تھے۔ اس کے ساتھ قضاء و افتاء کا سرچشمہ بھی تھے اور بڑے عظیم محدث اور ناقد حدیث بھی تھے، آخری وصف کے علاوہ باقی اوصاف امام کی تاریخی حیثیت اس قدر واضح تھی کہ ان پر کسی مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت نہ تھی کہ ان میں کسی موافق مخالف کو تردد نہ تھا، البتہ آپ کا آخری کمال کہ آپ ایک عظیم محدث اور ناقد حدیث تھے بعض حضرات کی نظر دل سے پوشیدہ تھا اگرچہ آپ کا یہ کمال بھی واقعات اور تاریخی شواہد کی بنیاد پر بالکل منقح تھا لیکن اس کے

دلائل کتب رجال، تاریخ و طبقات کے وسیع ذخیروں میں منتشر ہونے کی وجہ سے ناظرین کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ حضرت مولانا موصوف کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ آپ نے ان ذخائر منتشرہ کو مظان بعیدہ سے فراہم کر کے نہایت عمدہ ترتیب، شگفتہ تعبیر اور موزوں اسلوب استدلال کی شکل میں پیش کیا اور ساتھ ہی جدید معیاری فہرست بھی منسلک کر دی۔ یہ کتاب صرف ایک تاریخی کتاب نہیں بلکہ دلائل حجیت حدیث متاہت واجتہاد، شرائط وخصوصیات، کتب حدیث واحوال محدثین، علم اصول الحدیث، علم الرجال کے قیمتی مباحث کا ایک بیش بہا خزانہ ہے جس کا مطالعہ نہ صرف طلبہ بلکہ علماء اور مدرسین کے لیے بھی ضروری ہے اللہ تعالیٰ آپ کی اس خدمت کو قبول فرما دئیے۔

حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب شیخ الحدیث نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ

آپ کا رسالہ گرامی قدر علمی تحفہ موصول ہوا، کچھ حصہ پڑھا اور سیر نہ ہوا، یہی خیال اور ارادہ تھا کہ ساری کتاب کو دفعۃً پڑھ کر اپنے تاثر کا اظہار بھی وصولی کے عریضہ میں بھیج دوں گا مگر افسوس کہ اچانک تین چار بیماریاں حملہ آور ہوئیں جن میں ایک عارضۂ قلب بھی ہے، چند دن صاحب فراش رہا اور نماز کے لیے بھی گھر سے باہر نہ جا سکا، اب خدا خدا کر کے کل سے مسجد اور مدرسہ میں حاضری دیتا ہوں لیکن نظر جما کر مطالعہ مشکل ہے۔ جتنا حصہ کتاب کا پڑھا ہے بلا مبالغہ دل کی تہ سے دعائیں نکلتی رہی ہیں کہ ایسی مدلل، ٹھوس اور لاجواب کتاب اپنے باب میں آگئی ہے جس کے بعد انشاء اللہ اس سلسلہ میں عنوان تو بدل سکتا ہے لیکن تحقیق حد آخر کو پہنچ چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ آنجناب کو تمام اہل اسلام کی طرف سے عموماً اور حضرات احناف کی طرف سے خصوصاً جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔ راقم کی صحت کے لیے خصوصی اوقات میں دعا فرمائیں۔

حضرت مولانا محمد چراغ صاحب شیخ الحدیث مدرسہ عربیہ، گوجرانوالہ

حضرت مولانا محمد علی صاحب صدیقی کاندھلوی کی تصنیف "امام اعظم اور علم الحدیث" کے چیدہ چیدہ مقامات دیکھنے کا اتفاق ہوا، میرے خیال میں حضرت مؤلف کی یہ علمی کاوش داد تحسین حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔

مولانا نے یہ کتاب تصنیف کر کے ملت اسلامیہ کی ایک عظیم خدمت سرانجام دی ہے۔

امام اعظم کے علم حدیث سے استغنائے اور تعلق کے بارے میں بعض لوگ جن غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اگر انہوں نے تعصب سے بالاتر ہو کر اس کتاب کو پڑھنے کی کوشش کی تو امید ہے کہ یہ تصنیف لطیف ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو جائے گی۔

مصنف محترم نے کتاب کے پیش لفظ میں جن تین امور کا ذکر کیا ہے، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف محترم کے قلم نے ان کا پورا پورا لحاظ کیا ہے اور اتفاقی دونوں امور پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو تمام مسلمانوں کے لیے نافع بنائے اور مصنف محترم کو دنیا و آخرت میں بہتر صلہ عطا فرمائے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

حضرت مولانا محمد بشیر صاحب صدیقی رحمۃ اللہ علیہ

ہمارے محترم مولانا الحاج محمد علی صدیقی کاندھلوی نے اپنی مایہ ناز تصنیف "امام اعظم اور علم الحدیث" کو بڑی محنت اور کاوش سے ترتیب دیا ہے جس کا متن ۴۴۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ممدوح نے اس میں بدلائل ثابت کیا ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ صرف علم فقہ میں ہی امام الائمہ نہیں بلکہ علم حدیث میں بھی ایک برترین اور قابل فخر مقام رکھتے ہیں۔ اگر کسی کی کم علمی یا حاسدانہ نگاہ اسے معلوم نہ کر سکے تو "چشمۂ آفتاب را چہ گناہ"۔

موضوع کتاب کا دائرہ تحقیق اگرچہ صرف امام اعظم کی محدثانہ شان کا اظہار ہے مگر ضمناً بڑے بڑے مفید مباحث زیر قلم آ گئے ہیں، چنانچہ کہیں تو مقام حدیث کی اہمیت بتائی ہے اور کہیں قرآن و سنت کا باہمی تعلق نہایت لطیف پیرایہ میں واضح کیا ہے۔ کہیں اس بات کی تشریح و توضیح ہے کہ ابتدا میں کتابت حدیث کی ممانعت کیوں تھی پھر اس غلط فہمی کو دور کر دیا ہے کہ حدیث کی تدوین وصال نبوی کے ایک سو سال بعد ہوئی اور اس کے ثبوت میں دور نبوت میں ہی حدیث کے کتابی ذخیرے کی نشاندہی کر کے ثابت کر دکھایا ہے کہ تحریر حدیث کی ابتدا دور نبوت میں ہی شروع ہو چکی تھی اور خلافت راشدہ کے دور میں اشاعت حدیث کی سب سے زیادہ کوشش فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کی۔

امام اعظم کے نام اور کنیت پر بحث کرتے ہوئے بعض لوگوں کی اس غلط فہمی کو دور کر دیا ہے کہ

آپ کے جدامجد غلام تھے۔ اور اس کی تائید میں خود امام موصوف کی تشریح پیش کی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیش گوئی کے متعلق کہ (اگر ایمان یا علم) ثریا میں بھی ہوگا تو بھی فارس میں سے کچھ لوگ اسے حاصل کرلیں گے) سیر حاصل بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ امام اعظم اس بشارت میں بدرجۂ اولیٰ داخل ہیں بلکہ اس کا اولین مصداق آپ ہی ہیں۔

امام موصوف کی تابعیت کے ثبوت میں آپ کی روایت عن الصحابہ کو بھی بدلائل ثابت کیا ہے پھر آپ کی تعلیم وتربیت کے مبحث میں علم حدیث میں آپ کے شیوخ کی علمی عظمت وبرتری ثابت کرکے کوفہ کی علمی عظمت کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہاں ان دنوں حدیث وفقہ کی تعلیم کا کس قدر چرچا تھا اور امام موصوف نے کتنے جلیل القدر شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا۔

امام اعظمؒ کا حافظ حدیث میں برترین مقام واضح کرتے ہوئے یہ بھی بتادیا کہ ناقدین نے راویوں کی عدالت وثقاہت کے بارے میں امام موصوف کی رائے کو خاص طور پر پیش کیا ہے۔ گویا آپ علم جرح وتعدیل اور اسماء الرجال کے فن میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ آپ کے تلامذۂ حدیث کا ذکر کرتے ہوئے ثابت کردیا ہے کہ جلیل القدر ائمہ حدیث وفقہ کو آپ سے تلمذ کی نسبت ہے اور اصحاب صحاح ستہ بھی بالواسطہ آپ کی شاگردی کے دائرہ سے خارج نہیں۔

"حدیث میں امام اعظم کے اصول" اور حدیث وقیاس کے باہمی تعارض کے مبحث اہل نظر کی خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ الغرض زیر تبصرہ کتاب گوناگوں مباحث کو ضمن میں لیے ہوئے ہے جو صرف طلبہ حدیث کے لیے ہی نہیں بلکہ طبقۂ علماء کے لیے بھی بے حد مفید اور کارآمد ہیں۔ اگر مولانا بعض علمی مباحث کو حذف کرکے صرف اس مواد کو شائع کردیں جو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی محدثانہ شان کے اظہار پر مشتمل ہے تو عام پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے مستفید ہوسکیں گے۔

مولانا کا طرز بیان شگفتہ اور دل آویز ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ نے ہر مکتب فکر کے علماء فضلاء کے نام بڑے ادب واحترام سے لیے ہیں اور یہ ایسی خوبی ہے جس سے ہمارے اکثر علماء تہی دست نظر آتے ہیں۔

دوسرے ایڈیشن میں کتاب کے مواد اور عناوین کی ترتیب اور ان کے باہمی تعلق میں زیادہ دقت نظر کی ضرورت ہے تاکہ ہر مبحث ایک خاص دائرہ میں محدود ہو اور یہ بکھرے ہوئے درگراں مایہ ایک مسلسل مسلک مروارید نظر آئیں۔

علمی نسب نامہ

امام اعظمؒ نے سربراہ حکومت عباسیہ ابوجعفر منصور دوانیقی کے سامنے بر سرِ دربار بتایا ہے :

"ربیع بن یونس کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ امیر المومنین ابوجعفر منصور کے پاس آئے اس وقت دربار میں امیر کی خدمت میں عیسیٰ بن موسیٰ بھی موجود تھے۔ عیسیٰ نے امیر المومنین کو مخاطب کر کے کہا اے امیر المومنین! ھٰذا عالم الدنیا الیوم، یہ آج تمام دنیا کے عالم ہیں، ابوجعفر منصور نے امام اعظمؒ سے دریافت کیا کہ اے نعمان! تم نے کن لوگوں کا علم حاصل کیا ہے؟ امام صاحب نے فرمایا کہ امیر المومنین! میں نے فاروق اعظمؓ علی مرتضیٰؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کا علم حاصل کیا ہے۔ ابوجعفر نے کہا کہ آپ تو علم کی ایک مضبوط چٹان پر کھڑے ہیں۔"

(تاریخ بغداد، جامع المسانید)

علمی شہرت

"امام لیث فرماتے ہیں کہ میں امام اعظمؒ کی شہرت سُنتا تھا۔
ملنے کا بے حد مشتاق تھا حُسنِ اتفاق سے مکہ میں
اس طرح ملاقات ہوئی کہ میں نے دیکھا کہ لوگ ایک
شخص پر ٹوٹے پڑے جا رہے ہیں۔ مجمع میں مَیں نے
ایک شخص کی زبان سے کلمہ سُنا کہ اے ابوحنیفہ! میں نے
جی میں کہا کہ تمنا تو بر آئی، یہی امام ابوحنیفہ ہیں۔"

(مناقب ابی حنیفہ للذہبی ص ۲۲)

علمی طلب

حافظ ذہبی الامام الحافظ مسعر بن کدام سے جو زمانہ طالب علمی میں کوفہ کے اندر امام صاحبؒ کے رفیق ہیں، نقل کرتے ہیں :

"میں امام اعظمؒ کا رفیق مدرسہ تھا، وہ علم حدیث کے طالب علم بنے تو حدیث میں ہم سے آگے نکل گئے یہی حال زُہد و تقویٰ میں ہوا۔ اور فقہ کا معاملہ تو تمہارے سامنے ہے۔"

مناقب ذہبی ص ۲۷

علمی کمال

حافظ ابن عبدالبرؒ نے مشہور محدث یزید بن ہارون کا امام اعظمؒ کے بارے میں یہ تأثر نقل کیا ہے:

"میں نے ہزار محدثین کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے اور ان میں اکثر سے احادیث لکھی ہیں لیکن ان سب میں سب سے زیادہ فقیہ، سب سے زیادہ پارسا اور سب سے زیادہ عالم صرف پانچ ہیں ان میں اوّلین مقام ابوحنیفہؒ کا ہے۔"

(جامع بیان العلم وفضلہ۔ الانتقاء، ص ۱۶۳)

علمی جامعیت

امام ابو جعفر طحاوی نے بکار بن قتیبہ کے حوالہ سے امام ابو عاصم کی زبانی نقل کیا ہے کہ:

"ہم مکہ میں امام اعظم کے پاس رہتے تھے، آپ کے پاس اربابِ فقہ اور اصحابِ حدیث کا ہجوم ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ کیا ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو صاحبِ خانہ کو کہہ کر ہم سے ان لوگوں کو ہٹوا دے۔"

(مقدمہ اعلاء السنن ص ۷۲)

فہرست مضامین تفصیلی

صفحہ	عنوان	شمارہ
۳۱۸	قرآن کی ۶۲۳۶ آیتیں اور ۴۰۰۰ ہزار حدیثیں	۴۲۸
۳۲۰	احادیث یاد کرنے کا سلف میں رواج	۴۲۹
۳۲۱	تدوینِ حدیث اور عمر بن عبدالعزیز	۴۳۰
۳۲۲	جمع قرآن اور صحابہ کی مساعیٔ جلیلہ	۴۳۱
۳۲۴	جامع القرآن کا حضرت عثمان کے لیے لقب	۴۳۲
۳۲۵	سنہ ۱ھ سے سنہ ۹۸ھ تک موضوعِ حدیث پر علمی سرمایہ	۴۳۳
۳۲۶	عمر بن عبدالعزیز کا تدوینِ حدیث کے لیے سرکلر	۴۳۴
۳۳۰	اسلام کے علمی سرمایہ پر حافظ ابن حزم کا بیان	۴۳۵
۳۳۱	فرمانِ خلافت میں حدیثِ عمر کا اضافہ	۴۳۶
〃	اسلام میں خلفاءِ راشدین کی سنت	۴۳۷
۳۳۶	جمع قرآن بیانِ قرآن پر ایک اہم تفسیری نکتہ	۴۳۸
۳۳۶	آیت جمع کی تفسیر ابن عباس اور شاہ ولی اللہ کی تنقید	۴۳۹
۳۳۷	ان علینا جمعہ کی شاہ ولی اللہ کی بیان کردہ تشریح	۴۴۰
۳۴۱	عمر اول اور عمر ثانی کے عمل میں ہم آہنگی	۴۴۱
۳۴۲	تدوینِ حدیث کی اولیت کا شرف	۴۴۲
〃	دوسری صدی ہجری میں تدوینِ حدیث	۴۴۳
۳۴۵	امام اعظم شرائع کے مدونِ اول ہیں	۴۴۴
۳۴۷	حدیث میں امام اعظم کی تصنیف	۴۴۵
〃	کتاب الآثار کا طریقِ تالیف املائی ہے	۴۴۶
۳۴۸	املائی طریق میں تلامذہ کے لیے محدثین کی تعبیری زبان	۴۴۷
۳۴۹	کتاب الآثار کے نسخے اور اس کی روایات	۴۴۸
۳۵۰	کتاب الآثار بروایت امام محمد اور اس کی تاریخی حیثیت	۴۴۹
۳۵۳	کتاب الآثار بروایت ابی یوسف اور اس کی تاریخی حیثیت	۴۵۰
۳۵۵	کتاب الآثار بروایت امام زفر اور اس کی تاریخی حیثیت	۴۵۱

صفحہ	عنوان	شمارہ
	۶۱۹

اہم تعلیقات وحواشی کی فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی سب سے پہلے ایک ارشادِ ربانی اور ایک حدیث سن لیجئے۔ اللہ سبحانہٗ فرماتے ہیں۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ط وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ[1]

کہہ دو میری راہ تو یہ ہے کہ میں روشنی کی بنا پر اللہ کی طرف بلاتا ہوں
اور جن لوگوں نے میری پیروی کی وہ بھی اللہ کی طرف بلاتے ہیں
اور اللہ کی پاکی ہو میں مشرکوں سے نہیں ہوں۔

ارشادِ ربانی کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر کہہ دو کہ میری راہ تو یہ ہے کہ میں اس روشنی کی بنا پر جو میرے سامنے ہے اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جن لوگوں نے میری پیروی کی ہے وہ بھی اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر[2] فرماتے ہیں،

كُلُّ مَنِ اتَّبَعَهٗ يَدْعُوْٓا اِلٰى مَا دَعَا اِلَيْهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔[3]

جو شخص بھی حضورؐ کا پیرو کار ہے اس کا کام اسی بات کی دعوت دینا ہے
جس کی حضور انورؐ نے دعوت دی ہے۔

اس آیت میں دعوت کو دونوں کا کام بتایا ہے اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ جیسے آپ کی پیروی کرنے والے آپ کے ساتھ دعوت میں شریک ہیں، فرق ہے تو صرف یہ کہ دعوت دینا نبی کا کام

---

[1] پارہ ۱۳ آیت ۱۰۸ [2] ابوالفداء کنیت، عماد الدین لقب، اسماعیل بن عمر بن کثیر نام ہے نسباً قرشی، وطن دمشق ہے۔ ولادت ۷۰۱ھ میں بمقام مجدل ہوئی۔ حافظ جمال الدین المزی ۷۴۲ھ، حافظ ابن تیمیہ ۷۲۸ھ، حافظ شمس الدین ۷۴۸ھ کے سامنے زانوئے شاگردی طے کیا ہے ابن العماد حنبلی، حافظ ابن حجر، حافظ سیوطی، حافظ ابن تغر حنفی اور شیخ ابن ناصر نے ان کے مناقب لکھے ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۷۷۴ھ میں وفات پائی۔ مسلک کے لحاظ سے شافعی ہیں۔ [3] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۹۳

اللہ کا نبی ہونے کی وجہ سے ہے اور مومن کا صرف اُمتی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ نبی کا متبع اور پیرو کار ہونے کی وجہ سے ہے۔ ایسے ہی طاعت میں بھی دونوں شریک ہیں لیکن نبی کی طاعت نبی ہونے اور اس کے معصوم ہونے کی وجہ سے ہے اور اُمتی کی طاعت متبع رسُول اور مجتہد ہونے کی وجہ سے ہے شاطبی نے الموافقات میں الآمدی نے احکام میں اسے عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت کیا ہے۔

اتباع محبت کی نشانی ہے

بات بڑی معنی خیز ہے اور اس کی معنویت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب اس پر غور کیا جائے کہ نبوت کے اس کام میں نبوت کی اتباع کرنے والے شریک ہیں۔ صرف ایمان لانے والے نہیں۔

اتباع کے موضوع پر قرآن نے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی محبت کی نشانی نبوت کا اتباع ہے۔ اور جو اس نشانی کو قائم کرنے میں پورا اترتے ہیں اللہ سبحانہٗ ان کو اپنا محبوب بنا لیتے ہیں دوسرے یہ کہ اللہ سبحانہٗ ان کی گناہوں سے حفاظت فرماتے ہیں۔

ارشاد ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

کہہ دو اگر تم اللہ سے پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو محبوب بنا لے گا اللہ پاک تم کو اور بخش دے گا تمہارے لیے تمہارے گناہوں کو۔ اللہ بڑا بخشنہار اور رحم کار ہے [1]

---

[1] اس آیت میں محبتِ الٰہی کے دعوے کی جانچ کے لیے اچھا معیار بتایا ہے یعنی اتباعِ رسُول۔ جو جتنا متبع رسُول ہو گا اسی قدر اس کی محبت الٰہی کا دعویٰ زیادہ معتبر و مسلم ہو گا۔ اس کو اسی بنا پر آیتِ امتحان کہتے ہیں۔ ابوسلیمان الدارانی کہتے ہیں جب لوگوں نے محبت کے بلند بانگ دعوے کیے تو اللہ سبحانہٗ نے آیتِ محبت نازل کی۔ اس آیت میں دونوں باتیں جمع ہیں۔ دلیل محبت اور فائدہ محبت، محبتِ الٰہی کی علامت اگر اتباعِ رسُول کو قرار دیا۔ تو محبت کا فائدہ یہ بتایا کہ اللہ تم سے محبت کرے گا۔

جو بات یہاں شرط و جزا کے پیرائے میں کہی گئی ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ اتباع کی سرشاریاں دیکھ کر یہی بات مقامِ مدح میں بولی گئی ہے يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ اور کہیں رضی اللہ عنھم و رضوا عنہٗ۔

آیتِ دعوت کا اجمال اور اس کی حدیث سے تشریح

آیتِ دعوت نے یہ بات کھول دی ہے کہ نبوت کی پیروی کرنے والوں کا کام نبوت کے کام میں ہاتھ بٹانا ہے۔ لیکن آیت ہاتھ بٹانے کی نوعیت میں مجمل ہے۔ اس اجمال کے چہرے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقاب اٹھائی ہے۔

> حضرت ابو موسیٰ اشعری[1] کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو ہدایت اور دین اللہ سبحانہٗ نے مجھے دے کر روانہ فرمایا ہے اس کی مثال بارش کی سی ہے جو زمین پر برسی۔ زمین کے ایک حصے نے جو بہت عمدہ تھا خوب پانی پیا۔ گھاس اور سبزہ اچھا اگایا اور ایک حصہ جو بنجر تھا اس نے پانی کو سمیٹ لیا۔ اس کے ذریعے اللہ سبحانہٗ نے دوسروں کو فائدہ پہنچایا خود پانی پیا دوسروں کو پلایا لیکن زمین کا ایک حصہ جو چٹیل تھا اس نے نہ پانی روکا اور نہ گھاس اگایا۔ یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ سبحانہٗ کے دین میں تفقہ کیا اور اللہ سبحانہٗ نے اسے دین سے فائدہ دیا۔ اس نے خود سیکھا اور دوسرں

---

[1] نام عبداللہ بن قیس، کنیت ابو موسیٰ ہے۔ فتح خیبر کے زمانے میں مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لائے۔ حضور انورؐ نے ان کو حضرت معاذ کے ساتھ یمن کا گورنر مقرر فرمایا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں کوفہ کے گورنر رہے ہیں۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ بصرے کے شہریوں کے قرات اور فقہ میں استاد ہیں۔ امام شعبی فرماتے ہیں کہ علم کا ماخذ صحابہ میں چھ بزرگ ہیں۔ عمرؓ، علیؓ، ابیؓ، ابن مسعودؓ، زیدؓ اور ابو موسیٰؓ اشعری۔ صفوان بن سلیم فرماتے ہیں کہ زمانہ نبوت میں یہ چار فتوی دیتے تھے۔ عمرؓ، علیؓ، معاذؓ اور ابو موسیٰ اشعری۔ آواز اتنی اچھی تھی کہ قرآن پڑھتے تو سماں بندھ جاتا حضور انورؐ نے ایک دفعہ قرآن سنا تو فرمایا۔
لَقَدْ اُوْتِيَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِيْرِ آلِ دَاوٗدَ۔ ۴۴ھ ذی الحجہ کے مہینے میں انتقال ہوا۔
(تذکرۃ الحفاظ ص ۲۴، ۱۶)

کو سکھایا اور اس شخص کی مثال ہے جس نے ادھر سر اٹھا کر نہیں دیکھا
اور ہدایت ہی کو قبول نہیں کیا جسے مجھے دے کر روانہ کیا گیا ہے [1]

اس حدیث کی مخاطب اُمتِ اجابت یعنی مسلمان ہیں نہ کہ اُمتِ دعوت یعنی عام انسان اسی بنا پر حضرت امام بخاری نے کتاب العلم میں عالم بننے اور عالم بنانے کی فضیلت کا عنوان قائم کر کے بطورِ دلیل پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عالم ہونے اور علم سکھانے کی فضیلت کا مقام ایمان سے پہلے نہیں بلکہ ایمان کے بعد ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ حق و باطل کی آویزش میں حق کے بقا کا کیا قانون ہے۔ اور نبوت کی لائی ہوئی ہدایت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ اس نازک اور دقیق حقیقت کے لیے ایسی صاف اور عام فہم الورو مثال پیش کی ہے جس کے معائنہ سے کوئی انسانی نگاہ بھی محروم نہیں فرمایا جب پانی برستا ہے اور زمین کے لیے شادابی اور گل ریزی کا سامان مہیا ہونے لگتا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ زمین بارش کے پانی سے فائدہ اٹھانے میں تین حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔

الف :۔ پانی کو چوس کر پیداوار کرنے والی زمین
ب :۔ پانی کا ذخیرہ رکھنے والی زمین
ج :۔ ناقابلِ کاشت اور ناقابلِ ذخیرہ

ٹھیک ایسے ہی علم و ہدایت کی بارش کے لیے انسانی قلوب کی زمین بھی تین حصوں میں منقسم ہے۔

الف :۔ وہ جو قرآن و سنت کا ذخیرہ رکھتے ہیں
ب :۔ وہ جو قرآن و سنت سے مسائل کا استخراج کرتے ہیں
ج :۔ وہ جو نہ ذخیرہ رکھتے ہیں اور نہ ہی استنباط و استخراج کرنے والوں میں سے ہیں۔

پانی کا ذخیرہ رکھنے والی زمین یعنی محدثین

جو لوگ قرآن و سنت کا ذخیرہ رکھتے ہیں یہ زمین کی وہ قسم ہے جسے زبانِ نبوت نے

كَانَتْ مِنْهَا اَجَادِبُ اَمْسَكَتِ الْمَاءَ فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا۔

زمین کا ایک حصہ جو بنجر تھا اس نے پانی کو روکا اللہ نے اس سے لوگوں

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۲۶

کو فائدہ دیا لوگوں نے پانی پیا اور زمین سیراب کی۔

سے تعبیر کیا ہے۔ یہ قرآن و سنت کی بالذات نگرانی کرنے والے اور ان کے الفاظ کو اس طرح سمیٹے ہوتے ہیں کہ ان میں بال برابر فرق نہیں آنے دیتے۔ یہ ہیں اصحاب حدیث اور محدثین۔ علامہ سندھی فرماتے ہیں۔

قسم ینتفع بعین علمہ ذالک کاھل الحفظ والروایۃ[1]

یہ وہ قسم ہے جس میں بالذات علم ہی سے فائدہ ہوتا ہے جیسے محدثین اور اصحاب روایت۔

اسی قسم کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

نَضَّرَ اللّٰہُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِیْ فَحَفِظَہَا وَوَعَاھَا وَاَدَّاھَا فَرُبَّ حَامِلِ فِقْہٍ اِلٰی مَنْ ھُوَ اَفْقَہُ مِنْہُ

رواہ الشافعی[2]

خوش و خرم رکھے اللہ اس شخص کو جس نے میری بات سنی اسے محفوظ رکھا اور پوری حفاظت سے آگے روانہ کیا۔ بہت سے سمجھ کی بات رکھنے والے بات کو اپنے سے زیادہ سمجھ دار تک پہنچاتے ہیں۔

پانی سے پیداوار کرنے والی زمین یعنی مجتہدین

کچھ لوگ صرف پانی کی حفاظت ہی کا کام نہیں بلکہ اس سے مسائل کے استخراج اور استنباط

---

[1] سندھی علی البخاری ج ۱ ص ۲۶

[2] یہ حدیث ان لفظوں میں بحوالہ ابن مسعود بیہقی میں ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی میں الفاظ یہ ہیں نضر اللہ امرأ سمع منا شیئا فبلغہ کما سمعہ فرب مبلغ اوعی من سامع۔ یہی حدیث مسند بزار میں بحوالہ ابوسعید خدریؓ صحیح ابن حبان میں بحوالہ زید بن ثابت آئی ہے۔ نیز دوسرے صحابہ مثلاً معاذ بن جبل، نعمان بن بشیرؓ، جبیر بن مطعمؓ اور ابوالدرداءؓ کے حوالے سے بھی یہی حدیث مختلف الفاظ میں مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ یہ حدیث بھی خود بتا رہی ہے کہ علماء دو قسم کے ہیں۔ حفاظ اور فقہاء ہر حافظ حدیث فقیہہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ امام شافعی نے اس حدیث پر یہ خاص نوٹ لکھا ہے۔ دل علی انہ قد یحمل الفقہ غیر فقیہ یکون لہ حافظا ولا یکون فیہ فقیھا۔ (الرسالہ ص ۵۵)

کا کام بھی کرتے ہیں۔ اس کے ثمرات سے برائے عامہ کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ نتائج کو منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ یہ تمثیل میں زمین کی وہ قسم ہے جسے زبانِ نبوت نے

نَقِيَّةٌ قَبِلَتِ الْمَاءَ فَأَنْبَتَتِ الْكَلَأَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيْرَ

صاف زمین جس نے پانی کو چوس لیا اور پانی کے ذریعے گھاس اور زیادہ سے زیادہ سبزہ اُگایا۔

سے تعبیر کیا ہے۔ یہ لوگ قرآن و سنت کے پانی سے اپنی قوتِ اجتہاد کے ذریعے مسائل کے موتی نکالنے والے اور پانی کو نہیں بلکہ پانی کے نتائج کو شاہراہِ عام پر لانے والے ہیں یہ ہیں اربابِ اجتہاد اور فقہاءِ کرام۔

علامہ سندھی فرماتے ہیں[1]:

قسم ينتفع بثمرات علمه و نتائجه كاهل الاجتهاد والاستخراج[2]

یہ وہ قسم ہے جس میں علم کے ثمرات اور نتائج سے فائدہ ہوتا ہے جیسے مجتہدین اور فقہاء۔

اسی قسم کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ[3]

جس کے ساتھ اللہ سبحانہٗ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اسے دین میں فقاہت عطا فرماتے ہیں۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ارشادِ نبوت کی روشنی میں ارشاداتِ نبوت کا ذخیرہ رکھنے والے ہوں

---

[1] پورا نام ابوالحسن نورالدین محمد بن عبدالہادی ہے۔ سندھ میں مقام ٹھٹھہ کے رہنے والے ہیں۔ یہیں نشو و نما پائی، تعلیم تستر میں حاصل کی مدینہ منورہ ہجرت کر گئے۔ حرم نبوی میں ان کا درس حدیث خاص شہرت رکھتا تھا۔ ۱۱۳۸ھ میں وفات پائی اور البقیع میں دفن ہوئے۔ حدیث کی چھ کتابوں پر ان کے حاشیے ہیں۔

[2] سندھی علی البخاری ج ۱ ص ۲۶ — [3] صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۶۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے حضرت معاویہ سے، صرف مسلم نے سعد بن ابی وقاص سے، ابوداؤد، مسلم، ترمذی نے ثوبان سے۔ ترمذی نے معاویہ بن قرہ سے اور ابوداؤد نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے۔

یعنی محدثین یا ارشاداتِ نبوت اور قرآن سے مسائل نکالنے والے ہوں یعنی فقہاء، دونوں اسلام کا سرمایۂ علمی ہیں۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں۔

ایک قسم وہ حفاظ ہیں جن کا کام صرف روایات کو یاد رکھنا اور جیسی سُنی ہیں ویسی ہی آگے پہنچا دینا ہے۔ ان کا کام مسائل معلوم کرنا اور استنباط کرنا نہیں ہے۔ دوسری قسم ان علماء کی ہے جن کا کام محفوظ سرمایہ سے مسائل نکالنا اور احکام مستنبط کرنا ہے۔ پہلی قسم جیسے حافظ ابو زرعہ اور ابو حاتم اور دوسری قسم جیسے امام مالک، امام شافعی وغیرہ۔ خود صحابہ میں بھی حفظِ روایت اور استنباطِ مسائل کے لحاظ سے یہ تقسیم موجود تھی۔ غور فرمایئے۔ عبداللہ بن عباسؓ حبرِ امت اور قرآن کے ترجمان ہیں۔ مگر اس کے باوجود آپ کی ان حدیثوں کی تعداد بیس سے زیادہ نہیں ہے جن میں ذاتی سماع اور دید کی تصریح ہو۔ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباسؓ کے صرف فتاویٰ ضخیم جلدوں میں جمع کیے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ یہ بھی ان کے دریائے فقاہت کی ایک چُلّو ہے۔ ذالك فضل الله يوتيه من يشاء ان کے مقابلے میں ابوہریرہؓ ہیں حفظِ روایت میں علی الاطلاق حافظِ اُمت تو ہیں مگر تفقہ اور استنباط میں ابنِ عباسؓ کے پاسنگ بھی نہیں۔ حفظِ روایت اور استنباطِ مسائل کے لحاظ سے یہی تقسیم اُمت کو صحابہ سے وراثت میں ملی ہے[1]

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

التخريج على كلام الفقهاء و تتبع لفظ الحديث لكل منهما اصل اصيل في الدين[2]

فقہاء کے انداز پر حدیث سے مسئلہ نکالنا اور الفاظِ حدیث کا تتبع و تلاش دونوں کی دین میں بنیادی حیثیت ہے۔

دونوں اس ارشادِ نبوت کا منطوق ہیں۔ محدثین بھی اور فقہاء بھی، یا بالفاظِ دیگر اصحابِ روایت

---

[1] الوابل الصیب ص ۸۰ ، [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۵۲

بھی اور اصحاب درایت بھی۔

ائمہ اجتہاد کی طاعت ضروری ہے

اسی بنا پر حافظ ابن القیم جوزی نے اعلام میں دونوں کو الفاظ نبوت کو آگے پہنچانے والے ہوں یا الفاظ نبوت کو سمجھانے والے ہوں یہ کہہ کر کہ

حضور انور کی جانب سے تبلیغ دو طرح کی ہے الفاظ نبوت کی تبلیغ اور معانی کی تبلیغ۔

بتایا ہے کہ اُمت محمدیہ کے علماء دو قسموں میں منحصر ہیں ایک حفاظ حدیث۔ یہ اُمت کے رہنما اور مخلوق کے پیشوا ہیں جنہوں نے اُمت کے لیے دین کو محفوظ رکھا ہے۔ اور اس کی ہر قسم کے ردّو بدل سے حفاظت فرمائی ہے۔ آگے فرماتے ہیں:

دوسری قسم ان فقہاء اسلام کی ہے جن کو مسائل نکالنے کی نعمت ارزانی ہوئی اور جو حلال و حرام کے ضابطے بنانے کے لیے متوجہ ہوتے ان فقہاء کا مقام زمین میں ایسا ہے جیسے ستارے آسمان میں۔ ان کے ذریعے ہی تاریکیوں میں سرگرداں راستہ معلوم کرتے ہیں۔ لوگوں کو ان کی ضرورت کھانے اور پینے سے زیادہ ہے اور ان کی طاعت والدین سے بھی زیادہ از روئے قرآن فرض ہے۔

اس کے بعد حافظ ابن القیم نے قرآن کی یہ آیت لکھی ہے

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔

اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور اولی الامر کا جو تم میں سے ہوں۔

اور بتایا ہے کہ

اس آیت کی رُو سے فقہاء اور مجتہدین کی طاعت فرض ہے اور اس آیت میں عبداللہ بن عباس، جابر بن عبداللہ، حسن بصری، ابوالعالیہ عطاء بن ابی رباح، ضحاک اور مجاہد کے خیال میں "اولی الامر" سے

حکام نہیں بلکہ فقہاءِ اسلام مراد ہیں [1]

صاف اور سنگلاخ زمین یعنی مقلدین

جو لوگ نہ قرآن و سنت کا ذخیرہ رکھتے ہوں اور نہ قرآن و سنت سے مسائل نکالنے پر قدرت رکھتے ہوں۔ اس ارشادِ نبوت میں زمین کی وہ قسم ہیں جسے زبانِ نبوت نے اس تمثیل میں اِنَّمَا هِيَ قِيعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلَأً سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اُمت کا وہ طبقہ جو مسلمان ہونے کے باوجود علمِ نبوت سے بہرہ ور نہیں۔

علامہ قسطلانی فرماتے ہیں هُوَ مَنْ دَخَلَ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يَسْمَعِ الْعِلْمَ، یعنی وہ مسلمان جو دین سیکھنے کے لیے زندگی بھر کچھ وقت بھی دین سیکھنے پر صرف نہیں کرتے اور کوئی موقعہ بھی دین کی طرف سر اُٹھا کر دیکھنے کے لیے نہیں نکالتے۔ وہ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَاسًا کا مصداق ہیں۔ اُمتِ اسلامیہ میں ان کی اکثریت ہے اور ان کا کام اس کے سوا کچھ نہیں جو جانتے ہیں ان سے پوچھ پوچھ کر گزارہ کریں۔ اسی کو تقلید کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ تقلید پر چونکیں اس لیے اس حقیقت کو آشکارا کرنا نہایت ضروری ہے کہ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ علم صرف تحقیق کا نام ہے اور صدرِ اول میں صرف تحقیق تھی، تقلید کا نام و نشان نہ تھا وہ سخت غلط فہمی میں ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے سنن ابن ماجہ کی حدیث انس بن مالک

امتی علی خمس طبقات فاربعون سنة اهل برٍ وتقوىٰ ثم الذين يلونهم الى عشرين ومائة سنة اهل تراحم وتواصل ثم الذين يلونهم الى ستين ومائة اهل تدابر وتقاطع ثم الهرج الهرج النجا النجا۔

میری اُمت پانچ طبقوں پر ہے چالیس برس تک تو نیک اور پرہیزگار لوگ ہوں گے پھر اُن کے بعد والے ایک سو بیس برس تک آپس میں رحم کرنے والے اور حق قرابت ادا کرنے والے ہوں گے۔

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۴

پھران کے بعد والے لوگ ایک سو ساٹھ تک باہم ترک صحبت اور قطع
تعلقات کرنے والے ہوں گے۔ پھر (ان طبقوں کے بعد) قتل ہی قتل
ہے (اس زمانے سے) نجات طلب کرو نجات طلب کرو۔

میں آئے ہوئے پانچ طبقوں کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ صحابہ کرام میں مختلف مراتب اور مدارج تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

دآں جماعہ سلیم الفطرت برمنازل شتی بودہ اند طائفہ مخلوق براستعدادے
کہ شبیہ باستعداد انبیاء بود ونمونہ از نبوت در جوہر طبیعت ایشاں مودع۔
ایشاں سر دفتر امت آمدند وبشہادت دل آں داعیہ وآں علوم را تلقی
نمودہ اند وپارہ از تحقیق نصیب ایشاں شد۔ وطائفہ استعداد تقلید تمام
داشتند وقبول انعکاس آں داعیہ وآں علوم نمودند وحصہ از سعادت
یافتند وکلاً وعد اللہ الحسنیٰ[1]

پھر یہ فطرت سلیمہ والے بھی مختلف مراتب پر تھے۔ بعضے تو ایسی استعداد
کے ساتھ مخلوق ہوتے تھے کہ وہ (استعداد) انبیاء کی استعداد سے
مشابہ تھی۔ اور ان کے جوہر طبیعت کے اندر نبوت کا نمونہ امانت رکھا
گیا تھا۔ یہ لوگ اُمت کے سر دفتر ہوئے ان لوگوں نے اپنے دل کی
شہادت سے اس داعیہ کو اور ان علوم کو (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)
سے لیا اور تحقیق کا ایک حصہ ان کو نصیب ہوا اور بعضے تقلید کی
استعداد کامل رکھتے تھے اور انہوں نے اس داعیہ اور ان علوم کے
عکس کو قبول کیا اور سعادت سے ایک حصہ پایا اور سب کے لیے اللہ
نے نیکی کا وعدہ کیا ہے۔

یہاں سے یہ بات الم نشرح ہو گئی کہ علم تحقیقی ہو یا تقلیدی دونوں علم ہیں اور دونوں اُمت کو صحابہ سے وراثت میں ملے ہیں۔ مولانا اسماعیل شہید نے منصب امامت میں یہ بات کھول کر سمجھائی ہے کہ:

---

[1] ازالۃ الخفاء ج ا ص ۵۶۸

علم باحکام شرعیہ بہ دو طریق حاصل میشود تقلید و تحقیق۔ و علم انبیاء از جنس علم تقلیدی اصلاً نیست بلکہ آنچہ ایشاں را ازیں علم بدست آمد ہمہ بطریق تحقیق حاصل شد و تحقیق را دو طریق است اجتہاد بشرطیکہ معقول ذوی العقول باشد و الہام بشرطیکہ از مداخلت نفسانی محفوظ باشد پس مشابہ بانبیاء در علم احکام یا مجتہدین مقبولین باشند یا ملہمین محفوظین و از بسکہ استناد احکام بسوئے کشف و الہام در اوائل اُمت معروف نبود پس مشابہ بانبیاء دریں فن مجتہدین مقبولین اند پس ایشاں را از ائمہ فن باید شمرد مثل ائمہ اربعہ ہر چند مجتہدین بسیار از بسیار گزشتہ اند فاما مقبول درمیان جمہور اُمت ہمیں چند اشخاص اند پس گویا کہ مشابہت تامہ دریں فن نصیب ایشاں گردیدہ بناء علیہ درمیان جماہیر اہل اسلام از خواص و عوام بلقب امام معروف گردیدند و بقوت اجتہاد موصوف[1]

علم بہ احکام شرعیہ دو طریق پر حاصل ہوتا ہے۔ تقلیداً اور تحقیقاً۔ اور علم انبیاء منجملہ علم تقلیدی بالکل نہیں بلکہ جو کچھ ان کو علم حاصل ہوا تمام بطریق تحقیق حاصل ہوا۔ اور تحقیق کے دو طریق ہیں۔ اوّل اجتہاد بشرطیکہ معقول ذوی العقول ہو۔ دوم الہام بشرطیکہ مداخلت سے محفوظ ہو۔ پس انبیاء علیہم السلام کے مشابہ علم احکام میں یا مجتہدین مقبولین ہیں۔ یا ملہمین محفوظین اور چونکہ کشف و الہام کی طرف احکام کی نسبت اوائل اُمت میں معروف و مشہور نہ تھی پس مشابہ بانبیاء اس فن میں مجتہدین مقبولین، ہیں۔ سو ان کو ائمہ فن سے معلوم کرنا چاہیئے۔ مثل ائمہ اربعہ، ہرچند کہ مجتہدین دین بہت کچھ گزرے ہیں۔ لیکن مقبول درمیان جمہور اُمت یہی چند اشخاص ہیں۔ پس گویا کہ مشابہت تامہ اس فن میں انہیں کے نصیب ہوئی۔ نظر بریں تمام اہل اسلام خواص و عوام میں بلقب امام معروف ہوئے اور بقوت اجتہاد موصوف۔

---

[1] منصب امامت ص ۵۳

علامہ شاطبی نے الموافقات میں لکھا ہے کہ شریعت میں قابل اعتماد و قابل اعتبار وہ علم ہے جس کے ذریعے انسان میں عمل پر آمادگی ہو۔ پھر فرماتے ہیں کہ اہل علم تین قسم کے ہیں۔

۱۔ ایک وہ جن کا علم تقلیدی ہے اور درجہ کمال حاصل نہیں ہے

۲۔ دوسرے وہ جن کا علم استدلالی ہے اور دلائل و براہین سے واقف ہیں

۳۔ تیسرے وہ جن کا علم تحقیقی ہے خود علم ان کے لیے ملکہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اگر یہ واقعہ ہے کہ شریعت میں علم معتبر وہی ہے جس کے ذریعے انسان عمل پر آمادہ ہو جاتے تو پھر علم تقلیدی کے علم نہ ہونے کی وجہ کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ مقلد اپنی عملی زندگی میں جن کی تقلید کرتا ہے صرف اس لیے کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ قرآن وسنت کے ترجمان ہیں۔

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اہل السنت کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے اہل السنت کے تقلیدی موقف کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ

الناس لم یاخذوا قول مالک والشافعی واحمد وغیرھم الا لکونھم یسندون اقوالھم الی ماجاء بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فان ھؤلاء من اعلم الناس بماجاء بہ واتبعھم لذالک واشدا اجتھادا فی معرفۃ ذالک واتباعہ[1]

لوگوں نے امام مالک، شافعی اور احمد کی باتوں کو صرف اس لیے اختیار کیا ہے کہ یہ اکابر اپنی باتوں کی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت کی طرف نسبت کرتے ہیں کیونکہ یہ ائمہ تمام لوگوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کی ہوئی باتوں یعنی احادیث کے سب سے زیادہ عالم ہیں اور سب سے زیادہ احادیث کی پیروی کرنے والے اور احادیث کی معرفت اور اتباع میں سب سے اچھی قوت اجتہاد رکھنے والے ہیں۔

اسی بناء پر شاہ ولی اللہ نے اصولیین کی بنائی ہوئی عام شاہراہ سے ہٹ کر تقلید کی یہ تعریف کی ہے ان یکون اتباع الروایۃ دلالۃ[2] یعنی بات نبوت کی ہو اور الفاظ امام مجتہد کے ہوں

---

[1] المنتقیٰ من منہاج الاعتدال ص ۱۸۹ [2] عقد الجید ص ۶۹

اسے مان لینے کا نام تقلید ہے۔

الغرض ارشادِ نبوت کی رُو سے دونوں محدثین ہوں یا فقہاء۔ اسلام کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ منطوق میں محدثین سے اخذ کرنا اور مفہوم میں فقہا کی تقلید کرنا اسلاف کا مسلک اور اکابر کا مذہب ہے۔

میری اس تحریر کا منشا یہ ہے کہ میں آپ کو بتاؤں کہ امام اعظم کی ذات گرامی صرف امام فقاہت ہی نہیں بلکہ امام حدیث بھی ہے۔ چونکہ امام اعظم کی زیادہ شہرت فقاہت میں ہوئی اس لیے کچھ لوگوں کی نظروں سے امام اعظم کی محدثانہ شان اوجھل ہو گئی اور فقاہت میں شہرت کی وجہ میں جو کچھ سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ امام موصوف نے بطورِ فن جس چیز کو تمام علوم میں کمال پیدا کرنے کے بعد اپنایا وہ علم الفقہ تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جو شخص جس فن کو اپناتا ہے۔ شہرت اسی میں ہوتی ہے۔ امام بخاری اور مسلم فقہی مسائل میں صاحب رائے تھے مگر ان کو محدثین سے نکال کر فقہاء میں کسی نے شمار نہیں کیا کیونکہ فقہ کو انہوں نے بطورِ فن نہیں اپنایا تھا۔ تاریخ تو فن کے اپنانے کے لحاظ سے کسی شخص کا تعارف کراتی ہے۔ یہ بات ایک درجہ میں صحیح ہے کہ ایک شخص محدث ہے مگر فقیہہ نہ ہو لیکن یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص فقیہہ اور مجتہد ہو مگر محدث نہ ہو کیونکہ مجتہد ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اولاً اس کی نظر شریعت حقہ کے پورے کے پورے سسٹم، قرآن حکیم، اسوۂ نبوت اور اعمالِ صحابہ پر ہو اور اس کی نظر سے شریعت کا کوئی گوشہ اوجھل نہ ہو۔ اور پھر ان سے مسائل نکالنے کا سلیقہ رکھتا ہو۔

چنانچہ شاطبی لکھتے ہیں:

انما تحصل درجة الاجتهاد لمن اتصف بوصفين احدهما فهم مقاصد الشريعة على كمالها والثاني من الاستنباط[1]

درجہ اجتہاد صرف اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو دو صفتوں سے موصوف ہو۔ ایک یہ کہ پوری کی پوری شریعت کے مقاصد کو سمجھتا ہو، دوسرے یہ کہ مسائل نکالنے کی قدرت رکھتا ہو۔

یاد رہے کہ شریعت کے پورے سسٹم میں بصیرت ہونے اور اس سسٹم کے کسی ایک گوشے

---

[1] الموافقات ج ۱ ص ۲۴

میں فنکار کی حیثیت سے نام آوری پیدا کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ محدثین نے ایک فنکار کی حیثیت سے حدیث میں نام پیدا کیا ہے۔ لیکن ائمہ اربعہ کی حیثیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کا فن علم حدیث میں یہ نہیں کہ حدیث کس کس سند سے آئی ہے بلکہ ان کا مقام علم حدیث میں وہ ہے۔ جو علامہ شاطبی نے الموافقات میں لکھا ہے:-

وان كان متمكناً من الاطلاع على مقاصدها كما قالوا
فی الشافعی و ابی حنیفۃ فی علم الحدیث[1]

اگر شریعت کے مقاصد پر اطلاع رکھتا ہو جیسا کہ امام شافعی اور
امام ابوحنیفہ کے متعلق علم الحدیث کے بارے میں سب کی رائے ہے

اور اجتہاد میں یہی وہ اُسوہ ہے جو صحابہ نے چھوڑا تھا۔ الغرض میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ امام اعظم کی ذات گرامی صرف امام فقاہت نہیں بلکہ امام حدیث بھی ہے۔

حدیث کیا ہے

امام اعظم کی محدثانہ شان اور حدیث میں ان کی جلالت قدر کے تذکرے سے پہلے ضروری ہے کہ کچھ حدیث کے بارے میں بتایا جائے۔ اتنی بات تو کم و بیش سب ہی جانتے ہیں کہ قرآن میں اللہ پاک نے لوگوں کو صرف حضور انور کی نبوت و رسالت سے روشناس نہیں کیا۔ بلاشبہ نبوت ایک عہدہ اور منصب ہونے کی وجہ سے ایمانیات سے متعلق یعنی ماننے اور باور کرنے کی چیز ہے مگر قرآن نے منصب کے ساتھ نبی کے مقام کا بھی ذکر کیا ہے۔

منصب تو یہی ہے کہ جناب سیدنا محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب الہاشمی المکی ثم المدنی نبی اور رسول ہیں جو قرآن کی صورت میں خدا کا پیغام لے کر آئے ہیں اور مقام یہ ہے کہ آپ رسول ہونے کے ساتھ اس پیغام الٰہی یعنی قرآن کے مبلغ، داعی، معلم اور مبین بھی ہیں۔ آپ طیبات کے محلل اور خبائث کے محرم ہیں۔ اس کے ذریعے آپ باہمی تنازعات کے حکم، قاضی اور معاشرے کی اسلامی زندگی کے لیے اُسوۂ حسنہ ہیں۔ اور یہ بھی یاد رکھئے کہ نبی و رسول ہونے کی حیثیت میں اُمت سے آپ کے ماننے کا اور مقامات والی شخصیت

---

[1] الموافقات ج ۳ ص ۱۰۸

ہونے کی وجہ سے اُمت سے آپ کی طاعت، اتباع، توقیر، تعظیم اور محبت کا مطالبہ کیا گیا ہے۔
منصب اور مقام دونوں کو سمجھ لینے کے بعد حضور کو نبی مانتے ہوئے آپ کے کاموں، باتوں، عادتوں اور حالتوں کی قانونی حیثیت کو نہ ماننے کا مطلب آپ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ منصب کو مان کر مقامِ نبوت کا انکار ہے۔ کیونکہ اگر نبی کی باتوں، کاموں اور عادتوں کی قانونی حیثیت نہیں مانی جاتی تو پھر نبی کا نبی ہونا اور نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے اور اس طرح نبی اور غیر نبی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

قرآن وقائع کے تحت نازل ہوا ہے

رسول کے مقامات ہی کو انسانیت میں اجاگر کرنے کے لیے قرآن کا نزول بتدریج اور آہستہ آہستہ ہوا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ سینۂ قرآن سے اُبلی ہوئی صدا یہی ہے۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ
نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا[1]

اور پڑھنے کا وظیفہ کیا ہم نے جُدا جُدا کر کے پڑھے تو اس کو لوگوں پر
ٹھہر ٹھہر کر اور اس کو ہم نے اتارتے اتارتے اتارا۔

گویا آہستہ آہستہ اس لیے نازل ہوا ہے کہ جیسے جیسے حالات پیش آئیں ان کے موافق ہدایات حاصل ہوتی رہیں اور اس کے نتیجے میں وہ جماعت بنے جسے آگے چل کر تمام دُنیا کا معلم بننا ہے۔ قرآن کی ہر بات اور موقع و محل کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے یاد رکھ سکے۔ اور آنے والی نسلوں کے لیے کسی بھی قرآنی بات کے لیے بے موقع اور بے جا استعمال کی گنجائش نہ رہے۔ اس طرح ان تیئیس سالہ نزولِ قرآن کے وقت میں پیش یا افتادہ حالات و وقائع کا نام یا صاحبِ قرآن کی تیئیس سالہ شب و روز میں قرآن ہی کی ہدایات پر اٹھی ہوئی عادتوں، باتوں، کاموں اور حالتوں کا نام السنہ ہے۔ دراصل یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک قرآن، دوسرے وقائع جن کے تحت قرآن اترا ہے۔ ان دونوں میں وہ ہی تعلق ہے

---

[1] پارہ ۱۵ سورۃ بنی اسرائیل

جو نقش اور نقاش میں، حکمت اور حکیم میں، پروردگا اور پروردگاری میں، معمار اور عمارت میں، نظم اور ناظم میں ہوتا ہے۔ اگر آپ چراغ کی روشنی کو چراغ سے یا چراغ کو اس کی روشنی سے الگ نہیں کر سکتے تو پھر السنۃ کو قرآن سے یا قرآن کو السنۃ سے کیسے جدا کر سکتے ہیں۔ قرآن کو چراغ اور السنۃ کو اس کی روشنی یا السنۃ کو چراغ اور قرآن کو اس کی روشنی کہہ دیجئے۔ قرآن میں دونوں تعبیریں موجود ہیں۔ ایک مقام پر قرآن میں نبوت کو روشنی کہا گیا ہے۔

قَدْ جَاءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ [1]

بے شک تمہارے پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب ظاہر کرنے والی۔

اور دوسری جگہ خود قرآن کو روشنی قرار دیا ہے۔

قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا [2]

تمہارے پاس پہنچ چکی تمہارے رب کی طرف سے سند اور اتاری ہم نے تم پر روشنی واضح۔

دونوں نور ہیں۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ وحی کے ذریعے آئی ہوئی ہدایات کا نام کتاب یا قرآن اور اسی وحی کی رہنمائی میں بنے ہوئے نقشۂ عمل کا نام اسوۂ حسنہ یا السنۃ ہے۔

حدیث تاریخِ سنت کا نام ہے

اگرچہ متاخرین نے اصطلاحی طور پر اپنے اپنے موضوع کے لحاظ سے لفظ السنت کو ایک سے زیادہ معانی کا جامہ پہنا دیا ہے۔ مثلاً

حضور انور کے افعال و اقوال اور آپ کی موجودگی میں ہونے والے کاموں، باتوں کو السنۃ کہا گیا ہے۔ بدعت کے مقابلے پر لفظ سنت استعمال ہوا ہے۔

حضور انور کے کاموں، باتوں، عادتوں اور حالتوں کو بھی سنت کہا گیا ہے۔

لیکن فقہاء اور اسلامی قانون کے علماء کی زبان میں نبوت کے اس محسوس جادۂ عمل کو سنت

---

[1] پارہ ۶ سورۃ مائدہ [2] پارہ ۶ سورۃ نساء

کہتے ہیں جو ذاتِ نبوت نے اسلامی معاشرے کی دینی زندگی کے لیے بطور پیمانۂ عمل پیش کیا ہو اور جسے جماعتِ صحابہ نے دین بنا کر اختیار کیا ہو۔ چاہے یہ افعال اعمال ہوں یا اخلاق و معاملات۔ اسی بنا پر صحابہ کے معمولات کو بھی سنت کہا گیا ہے۔ اس موقعہ پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جیسے قرآن کے لیے قرار سبعہ کی روایات ہیں ایسے ہی سنت کے لیے محدثین کی روایات ہیں۔ نہ تو قرآن کا قرآن ہونا قرار سبعہ کی روایات پر موقوف ہے اور نہ سنت کا سنت ہونا روایات

---

[1] قرار سبعہ قرآن پاک کے وہ سات قاری جن کی قرأت کے مطابق ساری دنیا میں تلاوت قرآن کی جاتی ہے حافظ عبدالقادر قرشی الجواہر المضیۃ میں فرماتے ہیں۔ سات ماہتاب آئمہ قرار یہ ہیں

۱۔ عبداللہ بن کثیر بن المطلب القرشی مولاہم ابومعبد تابعین میں سے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر سے قرآن کا سماع کیا ہے۔ سنہ ۱۲۰ھ میں مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا۔ بعض نے سنہ ۱۲۲ھ بتایا ہے۔

۲۔ نافع بن عبدالرحمٰن بن ابی نعیم اللیثی مدنی۔ ان کے بزرگ اصفہان کے رہنے والے تھے۔ ابورویم کنیت ہے سنہ ۱۶۹ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

۳۔ ابن عامر۔ یہ عبداللہ بن عامر بن یزید بن تمیم بن ربیعہ الیحصبی الدمشقی ہیں۔ دمشق کے قاضی تھے۔ کبار تابعین سے ہیں۔ سنہ ۲۱ھ کے آغاز میں ولادت ہوئی اور عاشوراء کے دن سنہ ۱۱۸ھ کو وفات پائی۔ کچھ کی رائے میں تاریخ ولادت سنہ ۸ھ ہے اس لحاظ سے ان کی عمر ایک سو دس برس کی ہوتی ہے۔

۴۔ ابوعمرو بن العلاء بن عمار بن عبداللہ المقری البصری۔ ان کا نام کسی نے ریان کسی نے عریان کسی نے یحیٰی کسی نے عثمان کسی نے محبوب اور کسی نے کچھ اور بتایا ہے۔ سنہ ۱۵۴ھ میں کوفہ میں انتقال ہوا۔

۵۔ عاصم بن ابی النجود ابوبکر الاسدی۔ سنہ ۱۲۷ھ میں کوفہ میں وفات پائی۔ کچھ کی رائے میں سنِ وفات سنہ ۱۲۸ھ ہے۔ امام سفیان ثوری اور امام احمد بن حنبل نے فرمایا ہے کہ بہدلہ ابوالنجود کا نام ہے۔ اور عمرو بن علی الفلاس کہتے ہیں کہ یہ ان کی ماں کا نام ہے مگر ابوبکر ابن ابی داؤد نے اسے غلط کہا ہے۔

۶۔ حمزہ بن حبیب بن عمارہ بن اسماعیل الزیات التیمی مولاہم الکوفی ابوعمارہ بمقام حلوان سنہ ۱۵۶ھ میں وفات پائی ہے

۷۔ کسائی ابوالحسن علی بن حمزہ الاسدی مولاہم الکوفی۔ سنہ ۱۸۹ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے حمزہ اسدی کے پاس قرأت کی تھی۔

ان ساتوں میں بجز ابن عامر اور ابوعمرو کے کوئی عرب نہیں ہے۔ (الجواہر المضیۃ ج ۲ ص ۴۲۲، ۴۲۳)

محدثین پر موقوف ہے۔ اگر حدیث کے نام سے اسناد و روایت کا کوئی بھی سلسلہ موجود نہ ہوتا۔ تو پھر بھی سنت اپنی جگہ ایسے ہی موجود ہوتی۔ حدیث تو دراصل تاریخ سنت اور اس کی روایت کا نام ہے اس تاریخی اور روایتی سلسلہ سے پہلے بھی حدیث موجود تھی۔ اور اس کے بعد بھی موجود ہے۔ قرآن ہو یا سنت دونوں روایتی اور تاریخی سلسلے سے الگ ہو کر متواتر ہیں۔ قرآن چونکہ خالص ایک فکری اور علمی شاہکار ہے اس لیے وہ کتابی طور پر ہی متواتر ہے۔ اور سنت چونکہ ایک عملی چیز ہے۔ اس لیے وہ عملاً ہی متواتر ہے۔ بلاشبہ اگر قرآن کا قرآن ہونا روایات قراء کا محتاج نہیں ہے۔ تو سنت کا سنت ہونا بھی روایاتِ محدثین کا محتاج نہیں ہے۔

اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ قرآن کے لیے ائمہ قرآت کی روایات بعد میں منصہ وجود پر آئی ہیں تو پھر یہ کیوں نہیں مانتے کہ سنت کے لیے بھی آئمہ حدیث کی روایات بعد میں ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ تاریخ قرآن ہے۔ اور یہ تاریخ سنت ہے۔

حافظ ابن تیمیہ نے یہی بات کیسے لطیف انداز میں بیان فرمائی ہے۔

انما قولنا رواہ البخاری کقولنا رواہ القراء السبعۃ والقرآن منقول بنقل المتواتر[1]

ہمارا یہ کہنا کہ اسے بخاری نے روایت کیا ہے ایسا ہی ہے جیسا ہم کہیں کہ اسے ائمہ سبعہ قراء نے روایت کیا ہے حالانکہ قرآن بتواتر منقول ہے

اور یہاں تک فرما گئے

لو لم یخلق البخاری و مسلم لم ینقص من الدین شیئ[2]

اگر بخاری اور مسلم پیدا نہ ہوتے تو دین میں کچھ بھی کمی نہ ہوتی۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ دین میں جو چیز قرآن کے بعد حجیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ سنت ہے حدیث نہیں ہے۔ حدیث تو تاریخ سنت کا نام ہے۔

معاملے کے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ

قرآن کی حفاظت کے لیے جیسے دو طریقے اختیار کیے گئے ہیں ایک سینہ دوسرے صحیفہ۔ ٹھیک ٹھیک اسی طرح سنت کی حفاظت بھی دو طرح سے ہوتی ہے۔ ایک سینہ دوسرے

---

[1] منہاج السنۃ ج ۴ ص ۵۸ [2] منہاج السنۃ ج ۴ ص ۵۸

عمل کا محسوس پیمانہ۔

چونکہ قرآن نازل ہی علم بن کر ہوا تھا اس لیے اس کی حفاظت بھی علم ہی کی طرح سینہ اور صحیفہ سے ہوئی اور سنت چونکہ اسی علم کے پرتو اور عکس کا نام تھا اس لیے اس کی حفاظت عمل کی طرح سینہ کے ساتھ صحیفہ سے نہیں بلکہ رائے عامہ کی محسوس عملی زندگی کے ذریعے ہوئی۔ صرف نوعیت کا فرق ہوا۔ ورنہ نفس حفاظت تو قرآن وسنت دونوں کی ہوئی اور نوعیت کا یہ فرق بھی خود قرآن وسنت کے باہمی فرق کی وجہ سے ہوا کیونکہ قرآن سرتاسر علم کا نام ہے اور سنت سرتاسر عمل اور کردار کا نام ہے سنت سن سے ہے سن الطریقۃ کے معنی راستہ چلنے کے ہیں۔ اہل عرب بولتے ہیں سن فلان طریقاً من الخیر فلاں نے نیکی کا کام کیا۔ اسی سے لفظ سنت طریقہ اور سیرت کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ جب یہ انسانی اعمال کے لیے بولا جاتا ہے تو اس کے معنے شاہراہ عمل، طریق کار کے ہوتے ہیں اسی سے ہے سنوا بھم سنۃ اھل الکتاب مجوسیوں سے اہل کتاب کا برتاؤ کرو۔

تاریخ سنت کے لیے حدیث کا لفظ

اگرچہ لغت میں لفظ حدیث کا قریب قریب وہی مفہوم ہے جو اُردو میں بات کا ہے مگر تاریخ سنت کے لیے یہ لفظ محدثین کا گھڑا ہوا نہیں بلکہ قرآن ہی سے لیا گیا ہے۔ انبیاء کے کاموں، عادتوں، باتوں اور حالتوں کے لیے قرآن میں اللہ پاک نے ایک سے زیادہ مقامات پر حدیث ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ سورہ ذاریات میں حضرت ابراہیم کے متعلق ایک واقعہ کا آغاز اس طرح ہوا ہے۔

هَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرَاهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۔

کیا پہنچی تجھ کو بات ابراہیم کے مہمانوں کی جو عزت والے تھے۔

حضرت موسیٰ کے حالات میں ایک جگہ نہیں بلکہ دو جگہ فرمایا ہے:

هَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى

کیا پہنچی ہے تجھ کو بات موسیٰ کی

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کے لیے بھی قرآن میں لفظ حدیث آیا ہے

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا

اور جب چھپا کر کہی نبی نے اپنی کسی عورت سے ایک بات

مزید براں یہ کہ اللہ پاک نے قرآن میں ایک مقام پر حضور انور کو حکم دیا ہے

اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ

جو احسان ہے تیرے رب کا سو بیان کر

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ قرآن کی زبان میں دین کی نعمت کو پیش کرنے کا نام حدیث ہے۔ اللہ اکبر! امت کی علمی دیانت کو کن لفظوں میں سراہا جائے جس نے اپنے رسول کی سنت کی تاریخ اور تعلیمی زندگی کے وقائع کے لیے قرآن سے الگ ہو کر نام بھی تجویز کرنا گوارا نہیں کیا۔

حدیث کا صحیح مقام

تشریحات بالا سے یہ امور واضح ہو گئے کہ

۱۔ دین میں قرآن و سنت دونوں حجت ہیں۔ دونوں قطعی اور یقینی ہیں۔ دونوں کی حفاظت ہوئی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کو علم اور دوسرے کو عمل کی صورت میں امت کے پاس چھوڑا ہے اور پورا پورا اطمینان کر لیا کہ دونوں محفوظ ہو چکے ہیں۔ حضور انور کے بعد خلفاء راشدین نے دونوں کی حفاظت کی اور دونوں کی نشر و اشاعت کو اپنا اہم دینی فریضہ قرار دیا۔

۲۔ حدیث تاریخ سنت کا نام ہے اور سنت شناسی کا ذریعہ ہے۔ اس کے فنکاروں کو محدثین کہتے ہیں۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کا مقام دین کی زندگی میں کیا ہے؟ جنہوں نے منصب رسالت کی عظمت و عزت کو گھٹانے اور نبی کی سنت سے امت کا رشتہ توڑنے اور سنت کی حیثیت کو لوگوں کی نگاہوں میں مشتبہ بنانے کے لیے یہ بات گھڑی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف ایک ہی قسم کی وحی نازل ہوئی ہے جو قرآن کی صورت میں موجود ہے اور اس سے الگ کسی قسم کی وحی کو ماننا یہودیت ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسی بنیاد پر سنت کی تقدیس کو داغدار بنانے کے لیے یہ عمارت بھی بنائی ہے کہ سنت چونکہ وحی نہیں ہے اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محض ایک اجتہادی رائے ہے جسے قانونی لحاظ سے واجب الاتباع نہیں کہا جا سکتا۔ اس انداز فکر کی لغویت بالکل واضح ہے کیونکہ قرآن ہی سے ثابت ہے کہ وحی متلو کے علاوہ بھی بکثرت نہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بلکہ خدا کے ہر پیغمبر پر وحی نازل ہوتی رہی ہے جس پر خود عمل کرنا اور جس کی تعمیل پوری امت سے کرانا انبیاء علیہم السلام کے مقاصد بعثت میں شامل تھا۔

قرآن اور سنّت میں فرق

لیکن وحی ہونے کے لحاظ سے قرآن و سنت میں علماء نے جو جوہری فرق بتایا ہے وہ بھی گوش گزار فرما لیجئے۔ اور قرآن کی بیان کردہ وحی کی قسموں میں قرآن و سنت دونوں کا مقام معلوم کر لیجئے۔
دراصل قرآن ہو یا سنت دونوں اللہ سبحانہٗ کی جانب سے نازل شدہ وحی ہیں۔ لیکن چونکہ قرآن حکیم وحی ہونے کے ساتھ اپنے اندر شان اعجاز بھی رکھتا ہے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع ہی سے اس کی کتابت کا اہتمام فرمایا۔ برخلاف اس کے سنت چونکہ معجزہ نہ تھی۔ اس کے الفاظ نہیں بلکہ معانی و مطلب آپ پر نازل ہوتے تھے اور اس کو آپ اپنے لفظوں میں ادا فرماتے تھے اور یہ الفاظ بھی حسب ضرورت مختلف ہوتے تھے۔ کیونکہ آپ کو مختلف طبائع اور مختلف مذاق کے لوگوں کو سمجھانا پڑتا تھا اس لیے اس کے لفظوں کی بعینہٖ تلاوت کا حکم نہ تھا۔ بالفاظِ دیگر قرآن و سنت میں وہی فرق ہے جو اردو زبان میں نامہ و پیام میں ہوتا ہے۔

امام الحرمین کا نظریہ

یہ فرق حافظ جلال الدین السیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں امام الحرمینؒ کے والد امام ابو محمد الجوینی سے نقل کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> اللہ سبحانہٗ کی جانب سے نازل شدہ کلام دو قسم کا ہے ایک قسم یہ کہ اللہ سبحانہٗ حضرت جبریل سے فرمائیں کہ ہمارے رسول کو ہمارا یہ پیغام پہنچا دو کہ

ؒ حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں کہ امام الحرمین دو عظیم المرتبت شخصیتوں کا لقب ہے ایک حنفی اور دوسرے شافعی۔ حنفی تو ابوالمظفر یوسف القاضی الجرجانی۔ اور دوسرے شافعی یعنی ابوالمعالی عبدالملک ابن الامام ابو محمد عبداللہ بن الجوینی المتوفی ۴۷۸ھ ہیں۔ چونکہ آپ کا مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ دونوں جگہ قیام رہا اور آپ نے دونوں جگہ تدریس و افتاء کا کام کیا۔ اس لیے آپ کو امام الحرمین کہتے ہیں۔ امام غزالی نیشاپور میں تشریف لاتے تو امام الحرمین ہی کے پاس رہے اور ان کی ہی محنت سے امام غزالی ہر فن مولی بن گئے۔ اسی سے اندازہ لگائیے کہ جن کے غزالی شاگرد ہوں خود ان کی جلالتِ علمی کا کیا حال ہوگا۔

اللہ سبحانہٗ کہتا ہے کہ فلاں فلاں کام کر دو ایسے کرو حضرت جبریل رب العزت کا پیغام سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ بعدازیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لاتے ہیں اور اللہ سبحانہٗ کا پیغام پہنچاتے ہیں قال له ما قال ربه ولم تكن العبارة تلك العبارة یعنی بات اللہ سبحانہٗ کی ہوتی ہے اور عبارت حضرت جبریل کی۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے معتمد سے کہے کہ فلاں شخص سے کہو کہ بادشاہ کہتا ہے کام ٹھیک کیا کرو، فوج تیار رکھو۔ اس پیغام کو اگر قاصد اپنے الفاظ میں یوں پہنچا دے کہ سست مت ہو۔ محنت کرو۔ اور فوجی نظام کو پامال نہ ہونے دو تو تعبیر کے اس اختلاف سے اوائے پیغام میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ اور اسے فرض رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کا نام نہیں دیا جائے گا۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ حضرت جبریل سے کہیں کہ یہ خط ہمارے رسول کو جا کر سناؤ اور اس کے سامنے پڑھو۔ حضرت جبریل تشریف لاتے ہیں اور بلا کم وکاست اور بغیر ردوبدل خط آکر سنا دیتے ہیں اور ان کے سامنے پڑھ دیتے ہیں[1]

حافظ جلال الدین السیوطی کی تائید

حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں کہ دوسری قسم قرآن اور پہلی قسم سنت ہے اور امام جوینی کے نظریہ کی تائید میں لکھتے ہیں۔

وقد رأيت من السلف ما يعضد كلام الجويني[2]

میں نے سلف سے ایسی چیز دیکھی ہے جس سے جوینی کے کلام کی تائید ہوتی ہے۔

گویا قرآن یعنی نامہ اپنے الفاظ و معانی دونوں کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ سنت معجزہ نہیں ہے قرآن میں ایک لفظ بلکہ ایک حرف کا بھی تغیر و تبدل جائز نہیں ہے۔ لیکن سنت یعنی پیام

---

[1] [2] الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۴۴

روایت بالمعنٰے ہے۔ یعنی اصل مقصود مولیٰ سبحانہ' کا ہے اور الفاظ کا جامہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ہے۔

حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں کہ چونکہ سنّت کا آغاز ہی روایت بالمعنی سے ہوا ہے اس لیے اس میں روایت بالمعنی جائز ہے اور قرآن پہلے ہی چونکہ روایت باللفظ میں وحی ہوا ہے اس لیے اس میں روایت بالمعنی جائز نہیں ہے کیونکہ پیام میں اگر پیامی آپ کا منشا اور مافی الضمیر صحیح طور پر مرسل الیہ تک پہنچا دیتا ہے تو پیام رسانی کا مقصد حاصل ہو گیا خواہ پیغام رساں اسے آپ کے الفاظ میں نہ پہنچائے بلکہ اکثر اوقات اس کے لیے الفاظ میں تبدیلی کرنا ضروری ہو جاتا ہے لیکن نامہ کی صورت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں ان ہی الفاظ کو مکتوب الیہ تک پہنچانا ضروری ہے۔ اگر قاصد نے بیچ میں خط کو چاک کر ڈالا اور اسی مضمون کا دوسرا خط تحریر کر دیا یا اس کا مطلب ہی بلاکم وکاست زبانی جا کر بیان کر دیا تو وہ کسی طرح اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہوا بلکہ الٹا خیانت کا ملزم اور بددیانتی کا مرتکب ٹھہرا۔

سنّت بھی اللہ سبحانہ' کی وحی ہے

سنّت بھی اللہ سبحانہ' کی وحی ہے مگر اس کی نوعیت پہلی قسم کی ہے جس میں الفاظ کی بعینہٖ ادائیگی ضروری نہیں ہے اور قرآن حکیم کی نوعیت دوسری قسم کی ہے۔ یہاں اصل لفظ ہیں جو روح القدس کے ذریعے حق تعالیٰ کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے اور آپ کے ذریعے اُمت تک پہنچے۔ ان میں نہ روایت بالمعنے کی اجازت ہے نہ کسی قسم کے

---

[1] علماء نے تصریح کی ہے کہ قرآن نظم ومعنی دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ درایہ میں ہے ان القرآن اسم للنظم والمعنی جمیعاً ابوالحسن مرغینانی رقمطراز ہیں انا امرنا بحفظ اللفظ والمعنی فانہ دلالۃ علی النبوۃ شرح اصول میں علامہ عبدالعزیز بخاری لکھتے ہیں القرآن اسم للنظم والمعنی جمیعاً ان تصریحات کا مقصد یہی بتانا ہے کہ قرآن کی حیثیت نامہ کی ہے نہ کہ پیام کی۔ اسی بنا پر ترجمہ قرآن کو ہم قرآن نہیں کہہ سکتے۔ آلوسی لکھتے ہیں فلا شک ان الترجمۃ لیست بالقرآن نماز میں قرآن پڑھنے کا حکم ہے نہ کہ ترجمہ قرآن کا فاقرءوا ما تیسر من القرآن اور قرآن نام ہے نظم ومعنی دونوں کا۔

تغیر و تبدل کا اختیار۔ ہاں ترجمہ و تفسیر کی اجازت ہے لیکن اسے کلام الٰہی نہ کہا جائے گا۔ یہ بات بھی خود قرآن ہی کی بیان کردہ حقیقت ہے۔ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے۔

اِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ

جب ہم پڑھیں تو ساتھ رہ اس پڑھنے کے بلاشبہ ہمارے ذمے ہے اس کا بیان۔

یہاں دعویٰ یہ ہے کہ نزول قرآن کے بعد قرآن کا بیان بھی اللہ سبحانہٗ کے ذمے ہے۔ اگر قرآن کا یہ بیان خود قرآن سے کوئی علیحدہ چیز ہے اور یقیناً ہے کیونکہ اگر قرآن ہی کو قرآن کا بیان بتایا جائے تو پھر اس کے لیے بھی قرآن ہونے کی وجہ سے بیان کی ضرورت ہوگی اور یہ سلسلہ ایک غیر متناہی ہو جائے گا، ماننا پڑے گا کہ بیان قرآن خود قرآن سے الگ ہے جو قرآن نہیں ہے۔ اگر قرآن سے الگ ہے تو اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہے اور بذریعہ وحی ہے۔ یہ وحی جس کے ذریعے قرآن کا بیان عمل میں آیا ہے۔ کون سی ہے؟ خود قرآن نے نزول وحی کی تین صورتیں بتائی ہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ۔ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ۔

کسی آدمی کی طاقت نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ مگر اشارے سے یا پردے کے پیچھے سے یا بھیجے کوئی پیغام لانے والا پھر پہنچا دے اس کے حکم سے جو وہ چاہے تحقیق وہ سب سے اوپر ہے حکمتوں والا۔

اوّل: وحی

دوم: مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ

سوم: يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ۔

نزول قرآن کے لیے جو صورت اختیار کی گئی ہے وہ تیسری ہے یعنی بواسطۂ فرشتہ اللہ سبحانہٗ وحی فرمائیں مگر فرشتہ آنکھوں سے نظر نہ آتے بلکہ براہ راست نبی کے قلب پر فرشتہ کا نزول ہو۔ یہی صورت ہے جسے حدیث میں یاتینی مثل صلصلۃ الجرس سے تعبیر فرمایا ہے۔ اسی کو حدیث میں ھو اشدہ علی فرمایا ہے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ تمہارے نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم پر زیادہ تر وحی اسی طرح آتی تھی۔ اسی صورت کو حافظ سیوطی نے اصوب الحالین بتایا ہے علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ نزول قرآن اس طرح ہوا ہے کہ فرشتہ اللہ سبحانہ سے روحانی طور پر وحی حاصل کرتا ہے اور اسے لے کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا ہے اور آپ کو القا کرتا ہے۔ اس صورت میں یقیناً بیان قرآن کا نزول نہیں ہوا ہے۔ ایسی ہی وہ صورت نہیں ہے جسے قرآن میں من وراء حجاب کہا ہے۔ نزول بیان کے لیے اگر کوئی صورت ہے تو تیسری ہے جسے قرآن وحیاً کہہ رہا ہے جس میں نفث فی الروع، الہام اور رویائے صادقہ سب داخل ہیں۔

حضرت امام شافعی المتوفی ۲۰۴ھ نے الرسالہ[1] میں اب نہیں بلکہ اب سے بارہ سو سال پہلے بتا دیا ہے کہ نہ صرف سنت قرآن کا بیان ہے۔ اور یہ بیان اللہ سبحانہ کی جانب سے بذریعہ وحی آیا ہے۔ بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ کلام الٰہی کی تین صورتوں میں سے جس صورت میں سنت آپ پر نازل ہوئی ہے۔ وہ وہی ہے جسے قرآن نے وحیاً کہا ہے اور جس میں نفث فی الروع یا اراءت وغیرہ داخل ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

---

[1] الرسالہ۔ یہ اصول فقہ میں امام شافعی کی لکھی ہوئی ہے۔ شاہ ولی اللہ الانصاف میں رقمطراز ہیں۔ مختلف نصوص میں مطابقت کرنے کے لیے قواعد نہ تھے اس لیے اجتہادی مسئلوں میں بڑا رخنہ پڑتا تھا حضرت امام شافعی نے اس کے قواعد بنائے اور ان کو کتابی صورت میں مرتب کیا۔ وھذا اول تدوین کان فی اصول الفقہ (ص ۲۸)

دراصل یہ کتاب امام شافعی نے امام عبدالرحمٰن بن مہدی کی فرمائش پر لکھی ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے امام شافعی کے مشہور شاگرد ابو ثور کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ امام عبدالرحمٰن بن مہدی نے امام شافعی کو ایک خط لکھا اور درخواست کی کہ ایسی کتاب لکھیں جس میں قرآن کے معانی و مطالب ہوں اور جس میں اخبار و احادیث کی اقسام حجت، اجماع اور کتاب و سنت کے ناسخ و منسوخ کا تذکرہ ہو۔ امام ابو ثور فرماتے ہیں فوضع لہ الرسالۃ اس درخواست کے مطابق امام شافعی نے الرسالہ لکھا۔ (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۶۵)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے توالی التاسیس میں اس خط کا خلاصہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے کتب عبدالرحمٰن بن مھدی الی الشافعی وھو شاب ان یضع لہ کتاباً فوضع لہ کتاب الرسالۃ (ص ۵۵)

الحاصل اصول فقہ کی کتاب الرسالہ امام عبدالرحمٰن بن مہدی کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔

القی فی روعہ کل ما سن و سنتہ الحکمۃ الذی القی فی روعہ من اللہ
فکان بما القی فی روعہ سنتہ
آپ کی تمام سنت آپ پر القاء کی گئی۔ سنت ہی وہ حکمت ہے۔ جو
آپ پر القاء ہوئی لہٰذا سنت نبوی اللہ سبحانہ کی جانب سے القا شدہ ہے

قرآن میں حکمت سے مراد سنّت ہے

یہ صرف امام شافعی کی رائے نہیں کہ حکمت سے مراد سنت ہے بلکہ قرآن کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حکمت سے مراد سنّت ہے۔ قرآن میں آپ کو ایسی متعدد آیات ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ حکمت بھی قرآن کی طرح اللہ سبحانہ کی جانب سے نازل ہوئی ہے۔ سورۃ نساء میں ایک جگہ ارشاد ہے :

وَ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْكَ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ
تَكُنْ تَعْلَمُ ۔

اور اللہ نے اتاری تجھ پر کتاب اور حکمت اور تجھ کو سکھائیں وہ باتیں جو
تو نہ جانتا تھا۔

سورۃ بقرہ میں ایک موقع پر فرمایا ہے :

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰہِ عَلَیْكُمْ وَ مَآ اَنْزَلَ عَلَیْكُمْ مِّنَ الْکِتٰبِ
وَالْحِكْمَةِ یَعِظُكُمْ بِہٖ ۔

اور یاد کرو اللہ کا احسان تم پر ہے اور اس کو کہ جو اتاری تم پر کتاب
اور علم کی باتیں کہ تم کو نصیحت کرتا ہے اس کے ساتھ۔

ان آیات میں اور اس طرح کی دوسری آیات میں کتاب سے قرآن اور حکمت سے سنت مراد ہے۔ کیونکہ حکمت کا ذکر قرآن کے ساتھ آیا ہے چنانچہ امام شافعی نے اپنے ایک مناظرے میں اسے دلائل سے ثابت کیا ہے اور جب ان سے پوچھنے والے نے دریافت کیا کہ اس قسم کی آیات میں حکمت سے کیا مراد ہے آپ نے جواباً فرمایا کہ :

حکمت سے مراد سنت ہے۔ سائل نے کہا اس کا بھی امکان ہے
کہ یعلمھم الکتاب والحکمۃ کا یہ مطلب ہو کہ رسول کتاب کی

تعلیم دیتا ہے اور خصوصی طور پر حکمت کی اور حکمت سے مراد اللہ کے احکام ہوں۔ امام شافعی نے جواب دیا کہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کا رسول اللہ کی جانب سے لوگوں کے سامنے ایسے ہی بیان کرتا ہے جیسا کہ اس نے ان کے سامنے تمام فرائض نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کو پیش کیا ہے اور اس طرح گویا خود اللہ نے کتاب کے ذریعے فرائض کو محکم بنا دیا ہے اور اللہ نے خود ہی بیان کر دیا کہ یہ فرائض زبان نبوت پر کیسے ہیں ؟ مخاطب نے کہا کہ ٹھیک ہے ایسا ہی ہے۔ امام شافعی نے فرمایا اگر یہی مطلب ہے تو پھر اس کا پتہ بغیر خبر نبی کے کیسے ہو سکتا ہے اس صورت میں بھی ارشادات نبوت کی ضرورت ہوگی۔ سائل بولا اگر کتاب وحکمت دونوں سے مراد ایک چیز ہو اور کلام میں صرف تکرار ہی ہو۔ امام شافعی نے فرمایا یہ آپ ہی بتائیے کہ کون سی چیز پسندیدہ ہے کتاب وحکمت دونوں الگ ہوں یا دونوں کا مطلب ایک ہو۔ سائل نے جواب دیا دونوں کا احتمال ہے چاہے تو کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے سنت ہو جیسا کہ آپ کا خیال ہے اور چاہے دونوں سے ایک ہی مراد ہو۔ امام شافعی نے فرمایا زیادہ قرین عقل یہی صورت ہے کہ کتاب سے قرآن اور حکمت سے سنت مراد ہے جیسا کہ میرا خیال ہے اور اس پر قرآن میں شہادت ہے۔ سائل نے پوچھا کہ قرآن میں کون سی شہادت ہے امام شافعی نے جواب میں قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ۔[1]

سورۃ احزاب کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیتوں کی طرح حکمت بھی ایک ایسی چیز ہے جس کی تلاوت ازواج مطہرات کے گھروں میں ہوتی تھی۔ اور تلاوت کا مطلب جیسا کہ امام شافعی نے بتایا ہے یہ ہے کہ

---

[1] کتاب الام جلد ۷ ص ۲۵۱

انما معنی التلاوۃ ان ینطق بالسنۃ کما ینطق بالقرآن

تلاوت کے معنے یہ ہیں کہ سنت کو بھی ویسے ہی بولا جاتا ہے جیسے قرآن کو۔

ذرا سوچیے کہ ازواج مطہرات کے گھروں میں قرآن کی آیتوں کے علاوہ دوسری کیا چیز پڑھی جاتی ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قرآن کے سوا کیا سناتے تھے۔ اس کا حل اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ آپ کی سنت تھی اور چونکہ اس آیت میں حکمت کے "تذکار" کا حکم ہے اس لیے اسی آیت سے سنت کے یاد کرنے اور یاد رکھنے کا وجوب بھی معلوم ہو گیا اور یہ بات بھی بدیہی ہے کہ علم و ذکر خود مقصود بالذات نہیں بلکہ عمل کے لیے مقصود ہیں۔ اس لیے اسی آیت سے سنت پر عمل کا وجوب بھی معلوم ہو گیا۔ اور جب سنت کا دوسرا نام حکمت ہے تو ان آیات سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ سنت بھی منزّل من اللہ اور وحی خداوندی ہے۔

قرآن ہی کی ان تصریحات کی بنا پر تمام ائمہ اور علماء سلف اس پر متفق ہیں کہ یعلمھم الکتاب والحکمۃ اور اس طرح کی دوسری آیات میں جو حکمت کا لفظ آیا ہے اس سے مراد سنت ہے اور سنت بھی وحی الٰہی کی ایک قسم ہے۔ چنانچہ حافظ ابن القیم لکھتے ہیں[1]

> اللہ سبحانہ نے اپنے رسول پر دو قسم کی وحی نازل کی اور دونوں پر ایمان لانا اور جو کچھ ان دونوں میں ہے اس پر عمل کرنا واجب قرار دیا اور وہ دونوں قرآن و حکمت ہیں۔

اس کے بعد حافظ ابن القیم نے وہی آیات تلاوت فرمائی ہیں جن میں کتاب و حکمت کی تنزیل و تعلیم کا ذکر ہے۔ ان آیات کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

> کتاب تو قرآن ہے اور حکمت سے باجماع سلف سنت مراد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے پا کر جو خبر دی ہے اور اللہ نے رسول کی زبان سے جو خبر دی دونوں واجب التصدیق ہونے میں یکساں ہیں۔ یہ اہل اسلام کا بنیادی اور اتفاقی مسئلہ ہے۔ اس کا انکار وہی کرے گا جو ان میں سے نہیں ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے کتاب دی گئی اور اس کے ساتھ اسی کے مثل ایک اور چیز بھی دی

---

[1] کتاب الروح ص ۹۲

گئی یعنی سنّت [1]

پھر یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں اللہ سبحانہ نے قرآن کے پڑھنے کو اپنا پڑھنا اور قرآن کے بیان کو اپنا بیان بتایا ہے۔ مگر قرآن میں دوسری جگہ قرآن کے پڑھنے اور قرآن کے بیان کو حضور کا کام بتایا ہے لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ یعنی تاکہ آپ پڑھیں لوگوں کے سامنے آہستہ آہستہ اور اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ اتاری ہم نے تجھ پر یہ یادداشت تاکہ بیان کر دے تو لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اتاری گئی ان کی طرف۔ اس آیت میں للناس اور ما نزل الیہم لاکر یہ بتایا ہے کہ کتاب کے ساتھ نبوت آنے کی ضرورت ہی اس لیے پیش آئی کہ نبوت کے بیان کے ذریعے کتاب الٰہی کا منشا صاف اور واضح ہو کر آئے۔

چنانچہ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

> اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دینِ حق دے کر روانہ فرمایا تاکہ اس کو سب ادیان پر غالب کرے۔ ان پر وہ کتاب اتاری جو عمل کرنے والوں کے لیے سر تا سر نور و ہدایت ہے اور اپنے نبی کو یہ حق دیا ہے کہ وہ قرآن کے ظاہر، باطن، خاص، عام اور ناسخ منسوخ بتائیں۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کتاب اللہ کے مفہوم و معنے کے مبیّن تھے۔ اس کلام کو صحابہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جن کو اللہ نے اپنے نبی کی رفاقت کے لیے منتخب کیا تھا۔ انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بیان اور توضیح نقل کی ہے۔ اس مشاہدہ کی وجہ سے وہی سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاننے والے اور اس بات سے واقف تھے کہ قرآن کی آیت میں اللہ کی مراد کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن کی مراد بتانے والے صرف صحابہ کرام ہیں [2]

امام ابو حنیفہ کے بارے میں امام سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ:

---

[1] کتاب الروح ص ۹۲ [2] طبقات الحنابلہ ص ۳۲۵

جو حدیثیں صحیح ہوتی ہیں اور ثقات جن کو روایت کرتے ہیں۔ نیز جو
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ہوتا ہے امام ابوحنیفہ اس کو
اپناتے ہیں[1]

حافظ ذہبی نے امام یحییٰ بن معین کی سند سے امام اعظم کا جو ارشاد نقل کیا ہے اس سے بھی حدیث کے قرآن کا بیان ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

میں کتاب اللہ سے لیتا ہوں۔ اگر اس میں نہ ملے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کی ان صحیح حدیثوں سے جو ثقات کے ذریعے مشہور ہوئی ہوں اور اگر یہاں بھی نہ ملے تو پھر صحابہ میں جس کا قول چاہتا ہوں لیتا ہوں[2]

صرف یہی نہیں بلکہ کئی دوسرے مواقع پر بھی انہوں نے فرمایا ہے کہ فقہ اسلام اور قوانین اسلام تک پہنچنے کے لیے سنت ضروری ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ

قرآن میں اللہ سبحانہ نے ایک سے زیادہ ارشادات میں اتباع رسول کا حکم دیا ہے اور حکم بھی اس بارے میں مطلق اور بے قید ہے۔ یعنی اتباع کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے کسی خاص گوشے کی تعیین نہیں کی۔ یہ ایک طرف اگر اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ذات نبوت زندگی کے ہر گوشہ میں واجب الاتباع ہے تو دوسری طرف اس میں اس بات کی بھی رہنمائی ہے کہ پیغمبر اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں معصوم ہوتا ہے جیسے آپ کی زندگی میں آپ کی پیروی ضروری تھی اسی طرح آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے ارشادات، اخلاق، اعمال اور احوال کی روشنی میں زندگی کا نقشہ تیار کرنا ضروری ہے۔ غرض سنت قرآن کا بیان ہے۔ اس کے مجمل کی تبیین ہے اس کے معنے کی توضیح و تائید کرتی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ

اول قرآن کی حیثیت متن کی اور سنت کی شرح کی ہے پھر یہ متن شرح میں اور شرح متن میں اس طرح درج ہے کہ ایک کا اقرار و انکار دوسرے کے اقرار و انکار کے مترادف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں قرآن کی طرح اس کا بیان بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ فرق صرف

---

[1] الانتقاء۔ ص ۱۴۲ [2] مناقب از حافظ ذہبی ص ۲۰

یہ ہے کہ ایک ما انزل اللہ جو کچھ اللہ نے اتارا) اور دوسرا ما اراک اللہ (جو کچھ تم کو اللہ نے دکھایا) ہے۔ اس لیے ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

دوم یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی قرآن کے مفسر تھے۔ آپ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو یہ حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ آیاتِ قرآنی کی تفسیر و تاویل کرے۔ اس لیے صرف سنت ہی قرآن کا بیان ہے اور یہ بیان سنت کے علاوہ کسی دوسری راہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

سوم یہ کہ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی اثر مروی نہ ہو تو صحابہ تفسیر کا حق رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے قرآن اترا ہے۔ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آیاتِ قرآنی کی تاویل سنی اور جو سنت سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔

بہرحال سنت بھی اللہ پاک کی وحی ہے مگر اس کی حیثیت پیام کی ہے اور قرآن بھی اللہ سبحانہٗ کی وحی ہے اور اس کی حیثیت نامہ کی ہے۔ سنت میں روایت بالمعنی جائز ہے مگر قرآن میں روایت بالمعنی ناجائز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ میں اعجاز کے ساتھ شانِ تعبد بھی ہے۔ چنانچہ حافظ جلال الدین السیوطیؒ فرماتے ہیں:

---

[1] جلال الدین لقب، ابوالفضل کنیت، عبدالرحمٰن بن الکمال نام ہے۔ اتوار کے دن یکم رجب ۸۴۹ھ میں پیدا ہوئے، ۸ سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا بعد ازیں علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی۔ کاشغری نے طبقات میں خود ان کی زبانی نقل کیا ہے کہ تین سو اساتذہ سے علمی استفادہ کیا ہے۔ ۱۷ سال کی عمر میں تمام علوم و فنون سے نہ صرف فارغ ہو چکے تھے بلکہ میدان تالیف میں بھی قدم زن ہو گئے تھے۔ عربی ادب اور حدیث میں علامہ تقی الدین شبلی حنفی کے شاگرد ہیں۔ چھ علموں میں اجتہادی شان رکھتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، نحو، معانی، بیان۔

ان کی تصانیف کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے اپنے تئیں اجتہاد کے مدعی تھے مگر فرماتے تھے کہ اجتہاد دو قسم کا ہوتا ہے اجتہادِ مطلق، اجتہادِ نفسی،

اجتہادِ مطلق ائمہ اربعہ پر ختم ہے اور دوم تا قیامت باقی ہے اور مجتہد منتسب ہونے کا ان کو دعویٰ تھا۔ ہمیشہ امام شافعی کے مذہب کے مطابق مسئلہ بتاتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ پوچھنے والا مذہب دریافت کرتا ہے میرا اجتہاد نہیں پوچھتا۔ اللہ اکبر! اللہ کے دین میں کس قدر احتیاط ہے تبییض الصحیفہ کے نام سے امام اعظم کے مناقب پر کتاب لکھی ہے۔ ۹۱۱ھ میں بعمر ۱۱ سال دس ماہ گیارہ دن وفات پائی۔ (اتحاف)

والسر فی ذالک ان المقصود منہ التعبد والاعجاز بہ[1]

راز اس میں یہ ہے کہ قرآن سے مقصود تعبد اور اعجاز ہے۔

برخلاف سنت کے کہ اس کے الفاظ میں اعجاز نہیں بلکہ اس کے معانی میں شان تعبد ہے اور سنت معنی ہی کے لحاظ سے متواتر بھی ہے چنانچہ علامہ الجزائری رقمطراز ہیں۔

الراجح انہ لیس فی السنۃ متواتر الا التواتر فی المعنی دون اللفظ۔[2]

راجح یہی ہے کہ سنت میں تواتر لفظی نہیں بلکہ صرف تواتر معنوی ہے۔

اور عمل کے لیے معنی ہی کے متواتر ہونے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے الفاظ میں نہ تعبد ہے اور نہ اعجاز۔ اسی بنا پر متواتر سے بحث کرنا محدثین کا کام نہیں۔

ان المحدثین لا یبحثون عن المتواتر لاستغنائہ بالتواتر عن ایراد سندلہ۔[3]

محدثین کے یہاں متواتر سے کوئی بحث نہیں ہوتی کیونکہ تواتر کو سند کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

اس موقعہ پر حافظ ابن تیمیہ بڑے پتے کی بات لکھ گئے فرماتے ہیں کہ اس مقام پر دو اصولی باتیں یاد رکھنی چاہئیں:۔

۱۔ قرآن اپنے الفاظ اور معانی میں ایک ایسی امتیازی شان رکھتا ہے کہ اس میں کوئی کلام بھی کسی طرح اور کسی درجے میں قرآن کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا نہ الفاظ میں اور نہ معنے میں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی غیر عربی میں قرأت ناجائز ہے۔ کیونکہ غیر عربی میں جو کچھ ہے وہ سب کچھ ہے مگر قرآن ہرگز نہیں ہے۔ قرآن تو نظم اور معنے دونوں کا نام ہے۔ ترجمہ اگرچہ درست ہے مگر قرآن کی طرح اس کی قرأت و تلاوت ہرگز جائز نہیں۔

۲۔ قرآن میں الفاظ کے ساتھ معنی کی بھی ایک ایسی نمایاں حیثیت

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۴۴ [2] توجیہ النظر ص ۷، ۸ [3] توجیہ النظر ص ۴۴

ہے کہ کوئی کلام بھی اس سے مشابہت نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کے معنوی اعجاز میں زیادہ قوت ہے۔ قرآن کی اس آیت میں جو تحدی کی گئی ہے وہ ہر قسم کے اعجاز کے پیش نظر کی گئی ہے

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا [1]

امام خطابی فرماتے ہیں:

کلام کی جان تین چیزیں ہیں۔ لفظ، معنے اور نظم۔ قرآن ان تینوں میں بہت بلند، اشرف اور افضل مقام رکھتا ہے۔ قرآن کے الفاظ سے زیادہ فصیح، مختصر اور شیریں الفاظ آپ کو کہیں نہیں ملیں گے۔ قرآن کا نظم اپنی مثال آپ ہے۔ حسن تالیف قرآن کی ذاتی خوبی ہے۔ معانی کے لحاظ سے عقلا نے ہمیشہ قرآن کا لوہا مانا ہے۔ یہ تینوں خوبیاں الگ الگ تو ایک سے زیادہ مقامات پر موجود ہیں مگر یہ ساری خوبیاں یک جا قرآن کے سوا کہیں موجود نہیں ہیں۔ اس کا حال یہ ہے کہ الفاظ کی سطح موتیوں سے لدی ہوئی ہے۔ حسن کی نظم کی تہ میں سوتیں بہہ رہی ہیں اور گہرائی سے معانی اُبل رہے ہیں [2]

اتباعِ وحی اور تلاوتِ وحی میں فرق

اسی بنیادی اور جوہری فرق کو بتانے کے لیے قرآن میں وحی کے متعلق دو قسم کے حکم ہیں کہیں وحی الٰہی کی اتباع پر زور دیا گیا ہے۔ اور کہیں وحی الٰہی کی تلاوت کا حکم ہے مگر قرآن نے ان دونوں میں ایک جوہری فرق قائم رکھا ہے۔ قرآن میں جہاں وحی کی تلاوت کا حکم ہے وہاں ما اوحی کے ساتھ الکتاب کی قید ضرور لگائی ہے مثلاً اتل ما اوحی الیک

---

[1] رسالہ تسعینیہ ص ۲۱۵ [2] توجیہ النظر ص ۶

من کتاب ربک اور اتل ما اوحی الیک من الکتاب یا اسی قسم کے دوسرے مقامات، لیکن جہاں وحی کی اتباع کا مطالبہ ہے وہاں لفظ کتاب کو ہٹا دیا گیا۔ مثلاً اتبع ما اوحی الیک من ربک اور ان اتبع الا ما یوحی الیک واصبر اور اتبع ما یوحی الیک من ربک اور ان اتبع الا ما یوحی الیّ من ربی اور لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک ان اتبع الا ما یوحی الیّ

یہ اور اس قسم کی دوسری آیات میں جہاں وحی کی اتباع کا تذکرہ کیا ہے لفظ کتاب نہیں لایا گیا۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں نے اپنے مطالعہ قرآنی میں یہی محسوس کیا ہے کہ قرآن یہ جتانا چاہتا ہے کہ وحی جو ذات نبوت پر آئی ہے وہ کتاب تک محدود نہیں ہے بلکہ کتاب سے باہر بھی وحی ہے۔ کتابی وحی کی تلاوت کی جاتی ہے اور اس کے نفظوں میں اعجاز کے ساتھ شان تعبد بھی ہے۔ غیر کتابی وحی کا اتباع کیا جاتا ہے۔ گویا تلاوت الفاظ میں تعبد کی وجہ سے کتابی وحی کی خصوصیت ہے اور اتباع کا دائرہ کتابی اور غیر کتابی وحی کے لیے عام ہے۔

صحیح مسلم کی حدیث ابی سعیدؓ کا منشا

اس روشنی میں صحیح مسلم کی اس حدیث کا منشا بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی زبانی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت منقول ہے۔

لا تکتبوا عنی و من کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا عنی ولا حرج و من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار۔

مجھ سے نہ لکھو اور جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا وہ اسے مٹا دے مجھ سے حدیث بیان کیا کرو اس میں کوئی حرج نہیں اور جس شخص نے میرے متعلق ارادتاً جھوٹ بولا اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا دوزخ بنا لے۔

اگرچہ امام بخاری اور دیگر محدثین کے نزدیک یہ روایت صحیح نہیں بلکہ معلول ہے چنانچہ حافظ

ابن حجر عسقلانی[1] فتح الباری میں لکھتے ہیں:

منہم من اعل حدیث ابی سعید وقال الصواب وقفہ علی ابی سعید قالہ البخاری

کچھ لوگوں نے حدیث ابی سعید کو معلول قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ابی سعید ہے۔

یعنی ان کی تحقیق میں یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں بلکہ خود ابو سعید خدریؓ کے ہیں جن کو غلطی سے راوی نے مرفوعاً نقل کر دیا ہے لیکن بالفرض اگر اس روایت کو موقوف نہیں بلکہ مرفوع ہی تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ ممانعت وقتی اس لیے تھی کہ قرآن کے الفاظ میں تعبد ہے قرآن سے الگ ہو کر کوئی وحی نہیں جس کے الفاظ میں تعبد ہو اور تعبدی طور پر جس کی تلاوت کی جاتی ہو، خود انداز بیان بول رہا ہے کہ مقصود یہی ہے۔ فرمایا ہے: لا تکتبوا عنی قرآناً غیر القرآن یعنی مجھ سے تلاوت کی چیز قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو۔ اس ارشاد میں قرآن کی شانِ تعبدی کو ظاہر کیا جا رہا ہے۔ اور اس کی تائید خود حضرت ابو سعید خدری کے ان بیانات سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں درج کیے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں:

---

[1] شہاب الدین لقب، ابو الفضل کنیت، احمد بن علی بن محمد بن الکنانی العسقلانی نام ہے۔ تاریخ پیدائش ۷۷۳ھ ہے۔ ابن حجر سے مشہور ہیں۔ سیوطی طبقات میں رقمطراز ہیں کہ حافظ عراقی سے وفات کے وقت دریافت کیا گیا کہ آپ کے بعد آپ کا جانشین کون ہے فرمایا کہ ابن حجر پھر ابو زرعہ نے نظم العقیان فی اعیان الاعیان میں ان کا تذکرہ اس طرح شروع کیا ہے فرید زمانہ حامل لواء السنۃ ذہبی ہذا العصر نضارہ وجوہرہ الذی ثبت بہ علی کثیر من الاعصار فخارہ امام ہذا الفن للمتقدمین و مقدم عساکر المسلمین وعمدۃ الوجود فی التوہین والتصحیح۔ حافظ زین الدین العراقی الشیخ سراج الدین البلقینی، الشیخ برہان الدین الانباسی، علامہ عز الدین بن جماعہ، علامہ مجد الدین فیروزآبادی جیسے اساطین علم کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ہے۔ ڈیڑھ سو سے زائد تصانیف ہیں۔ ان کی تصانیف میں فتح الباری شرح صحیح بخاری بڑے معرکہ کی شرح ہے۔ حافظ سیوطی نے طبقات الحفاظ میں لکھا ہے کہ اولین و آخرین میں اس جیسی کتاب نہیں ہے۔

عن ابی نضرۃ قال قلت لابی سعید الخدری الا نکتب ما
نسمع منك قال أتریدون ان تجعلوھا مصاحف
ابونضرۃ کہتے ہیں کہ میں نے ابوسعید سے دریافت کیا کہ کیا ہمیں آپ
سے سنی ہوئی احادیث کو لکھنے کی اجازت ہے فرمایا کیا تم ان کو مصاحف
بنانا چاہتے ہو۔

ابونضرہ ہی نے حضرت ابوسعید خدری کے حوالے سے اس سوال کے جواب میں کہ ہمیں لکھنے کی اجازت دیجیے یہ بھی نقل کیا ہے:

قال أأردتم ان تجعلوہ قرآنا لالا[1]
فرمایا کیا تم نے اسے قرآن بنانے کا ارادہ کیا ہے نہیں نہیں۔

یہاں ڈاکٹر صبحی صالح استاذ اسلامیات دمشق یونیورسٹی کی رائے ہے کہ ابوسعید خدری کی روایت میں لکھنے کی جس ممانعت کا تذکرہ ہے اس کا پس منظر زمانہ نزول وحی میں وحی اور اس کی تشریح میں التباس کا اندیشہ ہے[2]

معالم السنن میں علامہ خطابی نے اس ممانعت کے عملی مصداق کی توضیح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ سنت کو قرآن کے ساتھ ایک ہی صحیفہ میں لکھنے سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ اختلاط نہ ہو اور پڑھنے والے کے لیے سامان اشتباہ نہ ہو۔ علامہ خطابی کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

انما نھی ان یکتب الحدیث مع القرآن فی صحیفۃ واحدۃ
لئلا یختلط بہ ویشتبہ علی القاری[3]
ایک صحیفہ میں قرآن کے ساتھ حدیث لکھنے سے اس لیے منع کیا
تاکہ التباس نہ ہو اور قاری پر مشتبہ نہ ہو۔

رامہرمزی نے المحدث الفاصل میں حدیث ابی سعید خدری کا ذکر کرکے لکھا ہے
فاحسبہ انہ کان ممنوعا فی اول الھجرۃ وحین کان لایومن
الاشتغال بہ عن القرآن[4]

---

[1] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۴ [2] علوم الحدیث ص ۸
[3] معالم السنن ج ۴ ص ۱۸۴ [4] تعلیق علوم الحدیث ص ۹

میرا خیال ہے کہ آغاز ہجرت میں ممنوع تھا۔ بالخصوص اس وقت جبکہ
اس میں لگ کر قرآن سے ہٹ جانے کا امکان تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ممانعت آغاز ہجرت میں ہوتی ہے اور معلوم ہے کہ ابو سعید خدری ۳ھ میں جنگ اُحد میں اتنے کم عمر تھے کہ فوج میں بھرتی ہونے کے شوق میں آتے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس کر دیا۔

یہاں اگر حضرت ابو ہریرہ کی ایک اور حدیث پیش نظر ہو تو راہ کی ساری مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت تشریف لائے جب ہم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں لکھ رہے تھے۔ فرمایا کیا لکھ رہے ہو؟ ہم نے کہا وہ باتیں جو ہم نے آپ سے سُنی ہیں۔ فرمایا کیا تم کتاب اللہ کے سوا کوئی اور کتاب چاہتے ہو؟ تم سے پہلے اُمتوں کو اس کے سوا کسی چیز نے نہیں گمراہ کیا کہ انہوں نے کتاب اللہ کے ساتھ دیگر کتابیں بھی لکھ ڈالیں[1]

ایک اور روایت اسی کے ہم معنے ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور کتاب؟ کتاب اللہ کو خالص رکھو۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے حضرت ابو ہریرہ کی اس ممانعتی حدیث سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ

ان تمام روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ۷ھ یا اس کے بعد ایک بار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بہت ہی عجیب و غریب تقریر فرمائی ہے۔ یمن سے نومسلموں کی ایک جماعت مدینے آئی ان میں کئی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان کو قرآن حکیم کی سورتیں یاد کرنے کے لیے دی گئیں کہ پڑھیں اور یاد کریں۔ جب ان لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تقریر سُنی تو حسنِ عقیدت سے یہ

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل

تقریر بھی لکھ لی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لے قرآن کے ان ہی اوراق پر جو انہیں یاد کرنے کے لیے دیے گئے تھے لکھ لی[1]

اس بنا پر حضور انور نے فرمایا۔ کیا کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور کتاب؟ کتاب اللہ کو خالص رکھو۔ اور اسی موقعہ پر یہ بات فرمائی گئی لا تکتبوا عنی غیر القرآن من کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ۔

حضرت ابو سعید خدری نے حضور انور کا یہی ارشاد حضرت ابو ہریرہ سے سنا تو اسے بطور ارشادِ نبوت بیان فرمادیا۔ شاید اسی علت دقیقہ کے پیشِ نظر امام بخاری نے اسے موقوف قرار دیا ہے۔ اس صورت میں علت ممانعت صرف اختلاط اور قرآن وغیر قرآن کا التباس ہے۔ اس لیے یہ ان احادیث کے معارض نہیں ہے جن میں احادیث لکھنے کی صریح اجازت ہے۔ مثلاً جامع بیان العلم، تقیید العلم اور المحدث الفاصل میں حضور انور کا یہ ارشاد۔ کہ

قَیِّدُوا العِلْمَ بالکتاب

علم کو کتاب سے مقید کرو

یا تدریب الراوی میں یہ واقعہ کہ

عن رافع بن خدیج انہ قال قلت یا رسول اللہ انا نسمع منک اشیاء أفنکتبھا قال اکتبوا ولا حرج[2]

رافع کہتے ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ! ہم آپ سے کچھ سنتے رہتے ہیں کیا ہمیں لکھنے کی اجازت ہے فرمایا لکھو کوئی مضائقہ نہیں ہے

علامہ احمد محمد شاکر کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ

اگر حدیث ابی سعید ان احادیث کے بعد میں ہوتی تو تمام صحابہ کو پتہ ہوتا۔ پوری اُمت کا اس پر مجتمع ہونا اس بات کی نشانی ہے کہ فیصلہ یہی ہے اور اجماع تواتر عمل سے ثابت ہے[3]

اور پھر جہاں تک حدیث کے بیان کرنے کی اجازت کا تعلق ہے۔ وہ اس میں صاف اور صریح موجود ہے کہ حدثوا عنی مجھ سے حدیثیں بیان کیا کرو۔ ممانعت تو دراصل قرآن کے

---

[1] مقدمہ صحیفہ ہمام بن منبہ باختصار [2] تدریب الراوی ص ۱۵۰ [3] الباعث الحثیث ص ۱۳۳

سوا کسی دوسری چیز کے لکھنے کی اس بنا پر کی گئی تھی کہ قرآن سے باہر کسی دوسری وحی میں نہ اعجاز ہے اور نہ شانِ تعبد۔ ورنہ نفسِ حدیث بیان کرنے کی اجازت تو خود ابو سعید خدری کی یہ حدیث بھی دے رہی ہے اور کتابت ہی کے متعلق دوسری احادیث میں صاف اجازت آئی ہے۔ چنانچہ ترمذی میں ہے:

> ایک انصاری صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں بیٹھتے آپ کی باتیں سنتے اور بہت پسند کرتے مگر یاد نہ رہتیں۔ بالآخر انہوں نے اپنی یادداشت کی خرابی کی شکایت آنحضرت سے کی کہ یارسول اللہ! میں آپ سے حدیثیں سنتا ہوں وہ مجھے اچھی لگتی ہیں مگر میں انہیں یاد نہیں کرسکتا اس پر آپ نے فرمایا کہ اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو اور اپنے دستِ مبارک سے ان کو لکھنے کا اشارہ فرمایا[1]

سنن ابی داؤد[2] اور مسند دارمی[3] میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ

---

[1] جامع ترمذی باب ماجاء فی الرخصۃ فی کتابۃ العلم

[2] سلیمان بن الاشعث بن اسحاق بن بشیر نام، ابوداؤد کنیت، عرب کے مشہور قبیلہ ازد سے نسبی تعلق کی وجہ سے ازدی اور سجستان میں بودوباش کی وجہ سے سجستانی ہیں۔ سجستان دراصل مشہور مقام سیستان کی تعریب ہے۔ تاریخ ولادت ۲۰۲ھ ہے۔ امام احمد، قعنبی، ابوالولید طیالسی، مسلم بن ابراہیم اور یحییٰ بن معین کے شاگرد ہیں۔ علامہ شیخ ابواسحاق الشیرازی نے طبقات میں ان کو حنبلی قرار دیا ہے۔ ان پر فقہی ذوق بہ نسبت دوسرے محدثین کے زیادہ غالب تھا۔ اسی لیے ان کی کتاب میں صرف احادیث احکام ہیں اور فقہی احادیث کا جتنا ذخیرہ اس کتاب میں موجود ہے صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں نہیں۔ چنانچہ حافظ ابوجعفر بن زبیر غرناطی المتوفی ۷۰۸ھ رقمطراز ہیں۔ احادیث فقہ کی حصر و استیعاب میں جو بات ابوداؤد کو حاصل ہے وہ دوسرے مصنفین صحاح کو نہیں۔ ان کی وفات جمعہ کے دن ۱۶ شوال المکرم ۲۷۵ھ میں بعمر ۷۳ سال ہوئی اور بصرہ میں دفن ہوئے۔

[3] عبداللہ بن عبدالرحمٰن نام، ابومحمد کنیت، عرب کے قبیلہ دارم سے نسبی لگاؤ کی وجہ سے دارمی، سمرقند میں رہائش کی وجہ سے سمرقندی ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۸۱ھ ہے۔ یزید بن ہارون (جو کہ امام اعظم کے شاگرد ہیں) جعفر بن عون وغیرہ کے شاگرد ہیں۔ امام مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور محمد بن یحییٰ زہری نے ان کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ خراسان میں چار شخص حفاظِ حدیث ہیں۔ ابوزرعہ، محمد بن اسماعیل بخاری، دارمی، حسن بن شجاع بلخی، عرفہ والے دن جمعرات کو بمقام مرو ۲۵۵ھ میں وفات پائی۔

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا تھا حفظ کرنے کے لیے اس کو
لکھ لیتا تھا۔ پھر قریش نے مجھ کو منع کیا اور کہنے لگے کہ تم جو بات سنتے
ہو لکھ لیتے ہو حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں غصہ میں بھی
کلام فرماتے ہیں اور خوشی میں بھی، یہ سن کر میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ اور
آنحضرت سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے اپنی انگشت سے اپنے دہن مبارک
کی طرف اشارہ کیا اور فرمانے لگے کہ تم لکھو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے
قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس سے بجز حق کے کچھ نہیں نکلتا[1]

یہ احادیث بتا رہی ہیں کہ حضرت ابوسعید خدری کی حدیث میں آمدہ ممانعت خاص تھی اور خصوصیت یہی تھی کہ الفاظ کا تعبد تلاوت کی حیثیت میں قرآن سے باہر کسی چیز میں نہیں ہے اور قرآن وحدیث دونوں کی یہ حیثیتیں آج بھی قائم ہیں۔ اس لیے روایت ابی سعید ان روایات سے معارض نہیں جن میں کتابت کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ اس کا حکم ہے۔

اگرچہ علماء نے یہ فرض کر کے کہ ابوسعید کی روایت معارض ہے اس کے علاوہ اور بھی جوابات دیے ہیں مثلاً:

اول: یہ کہ حدیث ابی سعید موقوف ہے۔

دوم: یہ کہ ممانعت خاص اس شخص کے لیے تھی۔ جس کے حافظہ پہ پورا اعتماد تھا۔

سوم: یہ کہ ابوسعید کی حدیث منسوخ ہے۔

علامہ احمد محمد شاکر کا اصرار ہے کہ آخری جواب درست ہے اور دوسرے علماء نے بھی یہی راہ اختیار کی ہے۔ علامہ امیر یمانی فرماتے ہیں:

آغاز میں ممانعت اختلاط کے اندیشے کے پیش نظر تھی۔ کیونکہ لوگوں
کے دلوں میں قرآن نے ابھی گھر نہیں کیا تھا اور حفاظ خال خال تھے
جب قرآن سے رائے عامہ میں پختگی پیدا ہو گئی اور قرآن کے اسالیب،
کمال بلاغت اور حسن نظم سے تعلق پیدا ہو کر ایسا امتیازی ملکہ پیدا
ہو گیا کہ قرآن اور غیر قرآن میں امتیاز کرنے لگے اور التباس کا

---

[1] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۴

اندیشہ جاتا رہا تو ممانعت ختم ہو گئی [1]

لیکن حدیث ابی سعید کا جو محمل ہم نے بتایا ہے اس کو مانتے ہوئے تعارض کا سوال ہی درمیان سے اٹھ جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس سے کراہت کتابت پر استدلال کیا ہے یہ ان کی رائے ہے۔ ارشاد نبوت کا یہ مصداق نہیں ہے۔ اس کی تائید ان واقعات سے بھی ہوتی ہے جو خود کتابت حدیث کے سلسلے میں ایک سے زیادہ زمانۂ نبوت میں پیش آئے ہیں۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ پورے دین کی حفاظت کے لیے وہی آسان طریقہ اختیار کیا گیا جو اس دور میں اہل عرب کا فطری اور رائج الوقت طریق تھا۔ قرآن حکیم جو دین کی تمام بنیادی اور اساسی تعلیمات پر مشتمل اور جملہ عقائد و احکام کے متعلق کلی ہدایات کا علمبردار ہے۔ اس کا لفظ لفظ لوگوں نے نوک زبان کیا۔ مزید احتیاط کے لیے خود حضور اقدس نے معتبر کاتبوں سے اس کو لکھوایا، حدیث جو شریعت اسلامی کی تمام اعتقادی اور عملی تفصیلات کا نام ہے۔ اس کا قولی حصہ صحابہ نے اپنی عادت کے موافق اس سے بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ اپنے حافظہ میں محفوظ رکھا کہ جس اہتمام کے ساتھ وہ اس سے پہلے اپنے خطیبوں کے خطبے، شاعروں کے قصیدے اور حکماء کے مقولے یاد رکھا کرتے تھے اور اس کے عملی حصے پر فوراً عملدرآمد شروع کر دیا گیا، ظاہر ہے کہ اس وقت میں اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن بعد کو جب قرآن حکیم کا کافی حصہ نازل ہو چکا اور عموماً آبادی قرآنی ذوق سے آشنا ہو گئی۔ اُدھر غزوہ بدر کے بعد مدینے میں بہت سے لوگوں نے لکھنا سیکھ لیا تو پھر حدیث کے لکھنے کا سلسلہ بھی جستہ جستہ زمانۂ نبوت ہی میں شروع ہو گیا جہاں تک ان واقعات کی تفصیل کا تعلق ہے۔ یہ ایک بڑی طول طویل داستان ہے۔ ہم یہاں اشارات کرتے ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ارشادات نبوت کے لکھنے کا مسئلہ خود زمانۂ نبوت ہی میں طے ہو گیا تھا۔

دورِ نبوت میں حدیث کا کتابی ذخیرہ

اسی کے نتیجے میں حدیث کی کتابت کے کام کا آغاز دورِ نبوت ہی میں ہو چکا تھا۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض و سنن کے ساتھ دیوانی اور فوجداری ضوابط

---

[1] توضیح الافکار ص ۲۶۵

لکھا کر لوگوں کو دیے اور احکام وسنن کی یہ کتابیں حضور کی جانب سے باہر گئے لوگوں کے لیے اسلام شناسی کا ذریعہ بنیں۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبر جامع بیان العلم میں رقمطراز ہیں۔

کتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب الصدقات والدیات والفرائض والسنن[۲]

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات، خون بہا، فرائض اور سنن پر مشتمل دستاویز لکھی۔

احکام کی یہ تحریری دستاویزیں سرکار نبوت کی جانب سے مدینہ سے باہر جانے والے گورنروں کو باقاعدہ ملتی تھیں۔

عمرو بن حزم صحابی کی تالیف

حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشہور صحابی عمرو بن حزم کو نجران کا کمشنر بنا کر روانہ فرمایا۔

استعملہ النبی صلعم علی نجران[۳] اور استیعاب میں ہے کہ وذالک سنۃ عشر

یہ واقعہ سنہ ۱۰ھ کا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی عمر اس وقت صرف سترہ[۴] سال تھی۔ روانگی کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک دستاویز کتابی شکل میں قلم بند کرا کے دی۔ اس دستاویز میں دیوانی اور فوجداری ضوابط کے ساتھ فرائض وسنن کی بھی تفصیل تھی۔

چنانچہ حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں۔

---

[۱] یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر نام، ابوعمر کنیت اور قرطبہ (اندلس) سے تعلق رکھنے کی وجہ سے قرطبی ہیں۔ ماہ ربیع الاول ۳۶۸ھ تاریخ ولادت ہے اپنے وطن ہی میں اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ہے۔ بہترین تصانیف ان کا علمی کارنامہ ہیں، خصوصاً التمہید کے بارے میں حافظ ابن حزم کا فیصلہ ہے کہ فقہ حدیث میں میرے علم میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ الاستذکار لمذاہب علماء الامصار، الاستیعاب لاسماء الصحابہ، ان کے علاوہ اور بے شمار کتابیں ہیں۔ امام مالک، امام شافعی اور امام اعظم کے فضائل ومناقب پر بھی الانتقاء کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ جمعہ کے دن ربیع الثانی ۴۶۳ھ کو شہر شاطبہ میں وفات پائی۔

[۲] ابوداؤد باب کتابۃ العلم، مسند دارمی ص ۶۷، جامع بیان العلم ج ا ص ۷۱

[۳] اصابہ ج ۴ ص ۲۹۳ [۴] الاستیعاب ج ۲ ص ۴۳۷

وکتب لہ کتابا فیہ الفرائض والسنن والصدقات والدیات[1]

آپ نے ان کے لیے فرائض، سنن اور صدقات و دیات پر مشتمل کتاب لکھی۔

حافظ عسقلانی نے تو نہیں مگر حافظ ابن عبد البر نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ عمرو بن حزم کو صرف عامل یعنی کمشنر اور انتظامی سربراہ نہیں بلکہ اس کے ساتھ ان کو یفقھھم فی الدین و یعلم القرآن۔ معلم قرآن و فقہ بنا کر بھی روانہ فرمایا[2] یعنی یہ کمشنر ہونے کے ساتھ دین کے مفتی اور قرآن کے معلم بھی تھے۔ اور تعلیم و افتا ہی کے لیے اس دستاویز میں الفرائض، السنن قلم بند کیے گئے تھے۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ یہ کتاب چمڑے میں تحریر تھی۔ اور عمرو بن حزم کے پوتے ابو بکر بن حزم کے پاس موجود تھی۔ ابو بکر خود یہ کتاب میرے پاس لے کر آتے تھے اور میں نے اس کو پڑھا ہے[2]

عمرو بن حزم نے اس قیمتی دستاویز کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اکیس دیگر فرامین نبوی بھی فراہم کیے اور ان سب کی ایک کتاب تالیف کی جو زمانۂ نبوت کی سیاسی دستاویزوں اور سرکاری پروانوں کا اولین مجموعہ ہے۔

اس کی روایت مشہور محدث ابو جعفر الدیبلی نے کی ہے۔ چنانچہ اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین کے نام سے ابن طولون نے جو کتاب لکھی ہے اور جو زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے۔ اس میں حضرت عمرو بن حزم کی یہ تالیف بطور ضمیمہ شامل اور محفوظ کر دی گئی ہے آپ آئندہ پڑھیں گے کہ امیر المومنین عمر بن عبد العزیز نے ان ہی عمرو بن حزم کے پوتے قاضی ابو بکر کو تدوین حدیث کے کام پر مامور کیا تھا۔ نیز امیر المومنین عمر بن عبد العزیز کو خلیفہ ہونے کے بعد جب صدقات کے بارے میں نبوی دستاویز کی تلاش ہوئی تو یہی دستاویز امیر عمر کو عمرو بن حزم کی اولاد کے پاس ملی تھی۔ چنانچہ حافظ دارقطنی فرماتے ہیں۔

ان عمر بن عبد العزیز حین استخلف ارسل الی المدینۃ یلتمس عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الصدقات

---

[1] الاستیعاب ج ۲ ص ۴۳۷۔ [2] ایضاً
[3] نسائی۔

فوجدہ عند آل عمرو بن حزم کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی
عمرو بن حزم فی الصدقات[1]

عمر بن عبدالعزیز نے خلیفہ بننے کے بعد مدینہ اس مقصد کے لیے قاصد
روانہ کیا کہ صدقات کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی
دستاویز تلاش کرے۔ یہ دستاویز عمرو بن حزم کی اولاد کے پاس ملی۔

حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ اس کتاب کے مالیاتی اور فوجداری حصہ کو ابو داؤد، نسائی ابن حبان اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ امام زہری نے اسی کو قاضی ابوبکر بن حزم سے روایت کیا ہے۔ چنانچہ امام ابوداؤد نے اپنے مراسیل میں اسے درج کیا ہے۔ حافظ جمال الدین زیلعی نے مراسیل ابی داؤد کے حوالے سے یہ دستاویز نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

نسخۃ کتاب عمرو بن حزم تلقاھا الائمۃ الاربعۃ بالقبول
وھی متوارثۃ۔[2]

عمرو بن حزم کی کتاب کو چاروں اماموں نے قبول کیا ہے۔ اور یہ
متوارث ہے۔

بلکہ صاحب الروض الباسم نے بتایا ہے کہ حافظ ابن کثیر نے ارشاد میں اس کے سارے طرق پر بحث کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ کتاب ائمہ اسلام میں زمانہ جدید و قدیم دونوں میں برتی جاتی رہی ہے اور اس پہ لوگوں کا اعتماد رہا ہے۔

فھذا الکتاب متداول بین ائمۃ الاسلام قدیماً وحدیثاً
یعتمدون علیہ[3]

اور حافظ یعقوب بن سفیان یہاں تک فرما گئے۔ میرے علم میں عمرو بن حزم کی کتاب سے زیادہ کوئی کتاب صحیح نہیں ہے۔ صحابہ اور تابعین کا بھی یہ کتاب مسائل میں مرجع تھی۔

کان الصحابۃ والتابعون یرجعون الیہ ویدعون
آراءھم[4]

---

[1] دارقطنی ص ۲۱۰ [2] نصب الرایہ للحافظ الزیلعی ج ۲ ص ۳۴۲
[3] الروض الباسم ج ۱ ص ۳۴ [4] ایضاً

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر لکھتے ہیں کہ یہ امر واقعہ ہے کہ عمرو بن حزم کی کتاب کی مقبولیت پر صدر اول کا اجماع تھا۔

اجماع الصدر الاول علیٰ قبول حدیث عمرو بن حزم [۱]

احادیث کی کتابوں میں اس کتاب کی جستہ جستہ حدیثیں منقول ہیں اور امام بیہقی فرماتے ہیں کہ حفاظ حدیث میں سے سلیمان بن داؤد الخولانی، امام احمد، ابو حاتم، ابو زرعہ، دارمی اور ابن عدی نے اسے خراج تحسین ادا کیا ہے [۲]

اور تنقیح الانظار میں حافظ ابن کثیر کے حوالہ سے لکھا ہے:

اسی حدیث کو مسنداً بھی روایت کیا گیا ہے۔ اور مرسلاً بھی مسنداً جن ائمہ حدیث نے اس کو روایت کیا ہے وہ یہ ہیں۔ امام نسائی نے سنن میں امام احمد نے مسند میں، امام ابوداؤد نے مراسیل میں، امام دارمی امام یعقوب بن سفیان، امام ابو یعلیٰ موصلی نے اپنے اپنے مسند میں نیز حسن بن سفیان، عثمان بن سعید، عبداللہ بن عبد العزیز بغوی نے ابو زرعہ دمشقی، احمد بن الحسن ابن عبد الجبار صوفی، حامد بن شعیب، حافظ طبرانی اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ امام بیہقی لکھتے ہیں کہ یہ حدیث موصول الاسناد ہے۔ اور اس حدیث کو جن لوگوں نے مرسلاً روایت کیا ہے وہ ایک سے زیادہ ہیں [۳]

کتاب الصدقہ

اس تحریری دستاویز کے علاوہ دوسرا تحریری سرمایہ بھی خود نبوت ہی کا ساختہ و پرداختہ صحابہ کے پاس موجود تھا۔ ابوداؤد اور ترمذی میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب الصدقہ تحریر فرمائی۔ حضرت ابوبکر صدیق نے اس پر عمل کیا اور حضرت صدیق اکبر کے بعد حضرت فاروق اعظم

---

[۱] الروض الباسم ج ۱ ص ۳۵ [۲] دار قطنی ص ۲۰۹
[۳] تنقیح الانظار ج ۲ ص ۳۵۰

کا بھی اسی پر عمل رہا۔ امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے اس نوشتہ کی حدیثیں بھی نقل کی ہیں۔ اور امام ترمذی[1] تو یہاں تک لکھ گئے۔

والعمل علی ھذا الحدیث عند عامۃ اھل العلم حضرت عمرؓ کے بعد یہ دستاویز آپ کے خاندان میں رہی۔ امام زہری کہتے ہیں کہ مجھے خود فاروق اعظم کے پوتے حضرت سالم نے یہ تحریر دکھائی ہے میں نے اسے پڑھا ہے اور اسے حرف بحرف زبانی یاد کیا ہے قال ابن شہاب اقرانیھا سالم بن عبداللہ فوعیتھا علی وجھھا[2]۔ اس کتاب کی بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ میں گورنری کے زمانے میں حضرت سالم سے نقل لی تھی[3]۔ اور زمانہ خلافت میں اسے اپنی قلمرو میں نافذ کیا تھا[3]۔

واضح رہے کہ حضرت سالم کو بھی عمر بن عبدالعزیز نے تدوین سنن کے کام پر مامور فرمایا تھا[4]۔ حافظ جمال الدین زیلعی نے نصب الرایہ فی تخریج احادیث الھدایہ میں یہ پوری دستاویز[5] نقل کی ہے۔ بہرحال حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کا تحریری سرمایہ خود نبوت ہی نے اپنے زمانے میں لوگوں کے لیے فراہم کیا تھا۔ اگرچہ محسوس و مرئی اسوۂ حسنہ کی موجودگی میں اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اسی بنا پر جو دستاویزیں باہر روانہ نہیں کی گئیں۔ ان میں صرف صدقات جیسی چیز پیش پا افتادہ ضرورت کے لیے قید تحریر میں لائی گئی۔ باقی اسلام کے

---

[1] محمد بن عیسیٰ بن سورہ نام، ابوعیسیٰ کنیت۔ عرب کے قبیلہ سلیم سے نسبی لگاؤ کی وجہ سے سلمی اور ترمذ میں بود و باش کی وجہ سے ترمذی ہیں۔ سنن ترمذی، کتاب العلل اور شمائل نبوی ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ حدیث کے مشہور اساتذہ کے سامنے زانوے ادب طے کیا ہے۔ امام بخاری ان کے اساتذہ میں سے ہیں۔ حاکم نے عمر بن علک کے حوالے سے بتایا ہے کہ امام بخاری کی وفات کے بعد خراسان میں امام بخاری کا جانشین زہد و تقویٰ اور علم و حفظ میں ابوعیسیٰ کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ روتے روتے آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو گئے۔ اگرچہ امام ترمذی امام بخاری کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں مگر ان کو یہ شرف حاصل ہے کہ خود استاد نے ان سے حدیث کا سماع کیا ہے بعض مواقع پر امام ترمذی نے اپنی جامع میں احادیث کی تصحیح کے سلسلہ میں امام بخاری اور مسلم سے اختلاف کیا ہے۔ تاریخ ولادت ۲۰۰ھ اور وفات ۱۳ رجب ۲۷۹ھ بمقام ترمذ ہوئی۔

[2] دارقطنی ص ۲۰۹ [3] دارقطنی ص ۲۰۹ [4] تاریخ الخلفاء

[5] نصب الرایہ ج ۲ ص ۳۳۸

لیے خود اسوۂ حسنہ موجود تھا۔ لیکن جب مدینہ سے جانے والوں کے لیے دستاویزیں لکھی گئیں تو اس میں صرف صدقات نہیں بلکہ الدیات الفرائض اور السنن تک قلم بند کیے گئے۔ یہ چند نوشتوں کا حال ہے ورنہ ان کے علاوہ مختلف قبائل کو تحریری ہدایات، خطوط کے جوابات، سلاطین وقت کے نام دعوت نامے، معاہدات اور صلح نامے۔ اس قسم کا بہت سا تحریری سرمایہ حضورِ انور نے چھوڑا ہے علماء نے اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً کتاب الاموال الامام ابوعبید القاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ اعلام السائلین حافظ ابن طولون المتوفی ۹۵۳ھ اور الوثائق السیاسیہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

صحابہ کرام اور کتابتِ حدیث

حضور ہی کے زمانے میں حضور انور کی اجازت سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مجموعے صحابہ کرام نے مرتب کیے۔ مثلاً

صحیفہ صادقہ

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے حضورِ انور کی اجازت سے آپ کے ارشادات لکھنے شروع کیے۔ کیوں لکھتے تھے؟ خود فرماتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جو کچھ سنتا تھا حفظ کرنے کے ارادے سے قلم بند کر لیتا تھا۔ یہی لکھی ہوئی دستاویز ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب ہو گئی تھی۔ اس کا نام انہوں نے صادقہ رکھا۔ فرماتے تھے۔ مجھے زندگی میں دو چیزیں مرغوب ہیں رہط اور صادقہ ــــ رہط وہ باغ جو ان کے والد نے وقف کیا تھا اور یہ اس کے متولی تھے۔ اور اور صادقہ کے متعلق فرماتے ہیں[1]

اما الصادقۃ فصحیفۃ کتبتہا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[2]

صادقہ یعنی وہ صحیفہ جو میں نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم سے لکھا ہے

حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ یہی صحیفہ ان کی وفات پر ان کے پڑپوتے عمرو بن شعیب بن محمد بن عبداللہ کو ملا تھا[3] حدیث کی کتابوں میں اس نام سے روایات کا جس قدر ذخیرہ ملتا ہے۔ وہ

---

[1] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۲، [2] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۲، [3] تہذیب ترجمہ عمرو بن شعیب

اسی صحیفہ کا سرمایہ ہے۔ حافظ زیلعی نے اسے بھی عمرو بن حزم کی کتاب کی طرح متوارث قرار دیا ہے۔ امام ترمذی ایک دوسرے مقام پر رقمطراز ہیں اما اکثر اھل الحدیث یحتجون بحدیث عمرو بن شعیب و یثبتونہ یعنی محدثین کی اکثریت عمرو بن شعیب کی احادیث کو صحیح اور قابل استدلال سمجھتی ہے[1] عبداللہ کے پڑپوتے یعنی عمرو بن شعیب کی ثقاہت میں کسی کو کوئی کلام نہیں اور اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ یہ صحیفہ حضرت عبداللہ ہی کا نوشتہ ہے لیکن چونکہ ان کے والد کا انتقال اپنے والد کی زندگی ہی میں ہو گیا۔ اس لیے محدثین کا اس میں اختلاف ہے کہ شعیب نے دادا سے پڑھا ہے کہ نہیں؟ اگر پڑھا ہے تو سماع متصل ہے۔ اگر نہیں پڑھا تو سماع مرسل ہے حافظ عسقلانی سید الحفاظ یحییٰ بن معین سے ناقل ہیں۔

وجد شعیب کتب عبداللہ فکان یرویھا عن جدہ مرسلا
وھی صحاح عن عبداللہ بن عمرو غیر انہ لم یسمعھا
شعیب نے عبداللہ کی کتابیں پائی ہیں اس لیے ان کتابوں کے ذریعے
اپنے دادا سے ان کی روایات مرسل ہیں۔

یہ تو ایک محدثانہ عرف ہے ورنہ آج بھی ہم حدیثیں جن کتابوں سے نقل کرتے ہیں تو ایک سیکنڈ کے لیے نہیں سوچتے کہ خود بیان کرنے والے کا کتاب کے مؤلف سے اسنادی رشتہ متصل ہے یا نہیں۔

دراصل محدثین کے یہاں بہ نسبت کتابوں کے حافظہ پر زیادہ اعتماد کا اسی طرح رواج تھا۔ جیسے ہمارے عرف میں حافظہ کے مقابلے میں کتابوں پر اعتماد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس دور میں کتابت گویا اہل علم میں ایک بہت بڑی کمزوری سمجھی جاتی تھی۔ اور ان کا یہ طرز عمل صرف اسنادی رشتہ کو متصل کرنے کے لیے ضروری تھا۔ لیکن آج کی دنیا میں بہ نسبت راوی کے خود مؤلف کی ذات پر اعتماد ہے۔ اس لیے اس نظریہ کا مقام محدثانہ اصطلاح سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ یہ نسخہ حضرت شعیب کو اپنے دادا سے وراثت میں ملا ہے خواہ شعیب نے دادا سے پڑھا یا نہیں۔ اور کتب حدیث میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے جس قدر احادیث کا ذخیرہ ہے وہ سب اسی صحیفہ علمی کا سرمایہ ہے۔ ان کی مرویات کی تعداد سات سو

---

[1] جامع ترمذی ج ۱ ص ۲۳۳

ہے۔ مسند امام احمد میں ان کی حدیثیں ۱۳۳ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں[1]

صحیفہ علی مرتضیٰ رضؓ

یہ صحیفہ چمڑے کے ایک تھیلے میں تھا جس میں یہ صحیفہ نیام سمیت سما جاتا تھا اس کے متعلق خود حضرت علی کا بیان ہے ما کتبنا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا القرآن وما فی هذا الصحیفة[2] یعنی ہم نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن اور اس صحیفہ کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ یہ وہی صحیفہ ہے جس کے متعلق صحیح بخاری میں حضرت علی کے صاحبزادے محمد بن الحنفیہ

---

[1] موصوف کی حدیث میں اس اسنادی سلسلے کے ساتھ جو وہ عن ابیہ عن جدہ کر کے لاتے ہیں علماء کے مابین یہ اختلاف ہے کہ اس ذریعے سے آئی ہوئی موصوف کی روایات میں حجت و استدلال کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ اگرچہ محدثین کی اکثریت حسب تصریح امام ترمذی اسے حجت سمجھتی ہے مگر کچھ کی رائے میں ان کی یہ روایات قابل حجت نہیں ہیں۔ اس اختلاف کا باعث یہ ہے کہ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ میں جدہ کی ضمیر کا مرجع کون ہے اگر ضمیر کا مرجع خود عمرو کی ذات ہے تو اس صورت میں عمرو کے دادا محمد بن عبداللہ ہیں اور حاصل یہ ہے کہ روایت عمرو نے اپنے والد شعیب سے سنی ہے اور شعیب نے عمرو کے دادا محمد بن عبداللہ سے سنی ہے اور معلوم ہے کہ شعیب کے دادا صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں اس لیے اصطلاح محدثین میں یہ حدیث مرسل ہے اور اگر جدہ کی ضمیر کا مرجع عمرو نہیں بلکہ شعیب ہے تو مطلب یہ ہے کہ عمرو نے روایت اپنے والد شعیب سے سنی اور شعیب نے اپنے دادا عبداللہ بن عمرو صحابی سے سنی ہے تو اس صورت میں یہ حدیث مرفوع متصل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع جن کے خیال میں شعیب ہے ان کی رائے میں عمرو کی روایات قابل حجت ہیں کیونکہ شعیب کی ملاقات عبداللہ بن عمرو سے ثابت ہے اور جو لوگ جدہ کی ضمیر کا مرجع عمرو بتاتے ہیں ان کے خیال میں یہ روایات تاریخی طور پر صحیح نہیں ہیں اسی بنا پر حافظ دارقطنی نے تصریح کی ہے کہ جن اسانید میں دادا کے نام کی تصریح آجاتی وہ بے غبار ہیں اور تصریح نہ ہو تو احتیاط اسی میں ہے کہ اس سے استدلال نہ کیا جائے کچھ ہو یہ سلسلہ سند محدثین کے یہاں اصح الاسانید ہے امام بخاری فرماتے ہیں کہ امام احمد، امام علی ابن المدینی، امام اسحاق بن راہویہ، امام ابو عبید اور ہمارے عام اصحاب کی رائے میں یہ سلسلۂ سند قابل حجت ہے۔ اُمت میں سے کسی نے اسے رد نہیں کیا ہے۔ امام بخاری پوچھتے ہیں کہ ان ائمہ کے بعد اور کون ہے؟ بلکہ امام اسحاق نے تو اس سلسلۂ سند کو ایوب عن نافع عن ابن عمر سے تشبیہ دی ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ تشبیہ اس سلسلۂ سند کی جلالت قدر کو آشکار کرتی ہے اور یہ بھی لکھا ہے

ان الاحتجاج به هو الصحیح المختار الذی علیه المحققون من اهل الحدیث وهم اهل هذا الفن وعنهم یوخذ

[2] صحیح بخاری

سے منقول ہے کہ مجھے میرے والد نے بھیجا اور کہا کہ یہ کتاب لو اور حضرت عثمان بن عفان کے پاس لے جاؤ اس میں صدقہ کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام ہیں۔ نیز اس کتاب میں زکوٰۃ کے علاوہ خون بہا، قیدیوں کی رہائی، قصاص، حرم مدینہ کے حدود، غیر کی طرف نسبت کا حکم، نقض عہد، غیر اللہ کے نام پر ذبح وغیرہ مسائل و احکام درج تھے۔

صحیفہ صدیقی

حضرت صدیق اکبر نے جب حضرت انس کو بحرین کا ڈپٹی کمشنر مقرر کیا تو حکومت کے واجبات کے بارے میں ایک یادداشت ان کو لکھ کر دی۔ اس دستاویز کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ھذہٖ فریضۃ الصدقۃ التی فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی المسلمین والتی امر اللہ بھا[1] امام بخاری[2] نے اس نوشتہ کی روایات کو کتاب الزکوٰۃ کے تین

---

[1] صحیح بخاری [2] جامع بیان العلم ج ا ص ۱۔ [3] کنیت ابوعبداللہ نام محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ ہے چونکہ بردزبہ کے صاحبزادے یمان جعفی کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس لیے ان کو نسبت ولاء کی وجہ سے جعفی کہتے ہیں۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ امام بخاری کے دادا ابراہیم بن مغیرہ کے حالات کا تاریخ سے ہمیں کوئی پتہ نہیں چلا لیکن امام بخاری کے والد محترم امام مالک، امام حماد بن زید کے شاگرد اور عبداللہ بن المبارک کے صحبت یافتہ ہیں۔ اسماعیل اور امام ابوحفص کبیر حنفی کے درمیان بہت مخلصانہ محبت تھی۔ اسماعیل کی وفات کے وقت امام ابوحفص کبیر موجود تھے۔ اس وقت ان سے اسماعیل نے کہا تھا کہ میں اپنے مال میں ایک درہم بھی حرام یا شبہ کا نہیں پاتا (مقدمہ ص ۴۸۴) یہ تعلقات اسماعیل کی وفات کے بعد بھی دونوں خاندانوں میں برابر استوار رہے۔ چنانچہ امام بخاری اور امام ابوحفص کبیر کے صاحبزادے ابوحفص صغیر مدت تک طلب حدیث میں رفیق اور ہمسفر رہے ہیں۔ ایک بار امام ابوحفص کبیر نے امام بخاری کو اس قدر مال تجارت دیا تھا جس کو کچھ تاجروں نے پانچ ہزار کے نفع سے خریدا اور کچھ اس سے زائد نفع دے کر خریدنے کو آمادہ تھے لیکن امام بخاری نے اپنے ارادے کو بدلنا پسند نہ کیا (مقدمہ فتح) حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام ابوحفص کبیر کو (جو امام ابو یوسف اور امام محمد کے شاگرد ہیں) امام بخاری کے اساتذہ میں شمار کیا ہے اور ان کے حق میں ابوحفص کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اس کا شہرہ ہوگا"۔ امام بخاری جمعہ کے دن ۱۳ شوال ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے خود فرماتے ہیں کہ گیارہ سال کی عمر میں میں نے امام اعظم کے دونوں شاگردوں امام وکیع اور امام عبداللہ بن المبارک کی کتابیں نوک زبان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۷ پر)

مختلف ابواب میں درج کیا ہے اور امام ابوداؤد نے اس صحیفہ کو حدیث کے مشہور امام حماد بن سلمہ[1] سے روایت کیا ہے جس میں حماد خود تصریح کرتے ہیں کہ میں نے خود ثمامہ سے اس نوشتہ کو حاصل کیا ہے[2]۔ امام حاکم نے یہ دستاویز نقل کی ہے[3] حافظ ابوجعفر طحاوی نے بھی یہ دستاویز بحوالہ حماد بن سلمہ بتائی ہے مگر اس میں حماد بن سلمہ کی یہ تصریح بھی ہے کہ مجھے ثابت البنانی نے یہ دستاویز لینے ثمامہ بن عبداللہ کے پاس بھیجا۔ انھوں نے مجھے یہ دستاویز دی۔ میں نے دیکھا ہے کہ فاذا علیہ خاتم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر تھی۔[4]

صحیفہ جابر

حافظ ذہبی[5] نے تذکرے میں حضرت قتادہ کے ترجمے میں لکھا ہے کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ یہ

(ص ۹۶ کا بقیہ حاشیہ) ۔۔کرلی تھیں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں آپ صاحب تصنیف ہو چکے تھے۔ آپ کی تصانیف اگرچہ کافی ہیں لیکن ان میں المسند الجامع الصحیح المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ جو صحیح بخاری کے نام سے مشہور ہے سب سے زیادہ معرکہ کی کتاب ہے یہ صرف حدیث ہی کی نہیں بلکہ علوم اوائل کا خلاصہ ہے۔ تاریخ وفات یکم شوال ۲۵۶ھ ہے۔

[1] امام ذہبی نے ان کا تذکرہ الامام الحافظ شیخ الاسلام کے پرشوکت القاب سے کیا ہے۔ کنیت ابوسلمہ اور نام حماد بن سلمہ، بصرہ کے رہنے والے ہیں۔ حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر المضیئۃ میں، حافظ بزازی نے مناقب میں ان کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ شہاب بن تیمیہ کہتے ہیں کہ امام حماد کو ابدال میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ حافظ ذہبی نے انکشاف کیا ہے کہ اسلام میں سعید بن عروبہ کے ساتھ پہلے مصنف ہیں۔ امام عبدالرحمن بن مہدی نے ان کی پارسائی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے اگر حماد سے کہا جائے کہ تم کو کل مرنا ہے تو یہ عمل میں اضافہ نہیں کر سکتے یعنی پہلے سے ہی اس قدر ہمہ گیری ہے۔ عفان بن مسلم کہتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ عابد تو دیکھے لیکن ان سے زیادہ خیر، قراءت قرآن اور عمل لوجہ اللہ پر میں نے مواظب کوئی نہیں دیکھا۔ دس ذی الحجہ بعد نماز عید ۱۶۷ھ میں وفات پائی۔

[2] ابوداؤد ص ۲۲۵ [3] مستدرک حاکم ج ۱ ص ۳۹۰ [4] شرح معانی الآثار ص ۳۱۶

[5] کنیت ابوعبداللہ نام محمد بن احمد بن عثمان الترکمانی الدمشقی الذہبی ہے۔ علامہ تاج الدین السبکی نے محدث العصر، خاتم الحفاظ، امام العصر لکھا ہے۔ فقہ، حدیث، تاریخ، تجوید، رجال میں بے مثال تھے۔ ان گنت

(باقی ص ۹۸ پر)

بصرہ میں سب سے زیادہ حافظ تھے۔ ان کے سامنے حضرت جابر کا صحیفہ پڑھا گیا تو ان کو ازبر ہو گیا۔ قرأت علیہ صحیفۃ جابر مرۃ فحفظھا حضرت جابر کا صحیفہ ایک بار پڑھا گیا تو ان کو ازبر ہو گیا[1] حافظ عسقلانی نے طلحہ بن نافع کے ترجمہ میں سفیان بن عیینہ اور امام شعبہ دونوں کا بیان لکھا ہے کہ حدیث ابی سفیان عن جابر انما ھی صحیفۃ ابوسفیان جو حضرت جابر کی حدیثیں بیان کرتے ہیں وہ صحیفۂ جابر ہی سے نقل کرتے ہیں[2]

صحیفۂ سمرہ (۴)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام حسن بصری[3] کے ترجمے میں لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت سمرہ بن جندب سے ایک بہت بڑا نسخہ روایت کیا ہے جس کی بیشتر حدیثیں سنن اربعہ میں موجود ہیں امام علی بن المدینی اور امام بخاری نے تصریح کی ہے کہ اس نسخہ کی سب حدیثیں اسی کی ہیں۔ اسی نسخہ کو امام حسن بصری کے علاوہ خود حضرت سمرہ کے صاحبزادے سلیمان نے بھی ان سے روایت کیا ہے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں سلیمان روی عن ابیہ نسخۃ کبیرۃ[4]

ص۹۴ کا بقیہ حاشیہ)، کتابوں کے مصنف ہیں۔ امام اعظم کی سیرت پر مستقل رسالہ لکھا ہے تذکرۃ الحفاظ میں ایک مقام پر علم الحدیث اور طلب الحدیث پر ایک بڑا مفید نوٹ لکھا ہے۔ ۶۷۳ھ میں پیدا ہوئے اور تاریخ وفات ۷۴۸ھ ہے۔

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۱۶ [2] تہذیب ترجمہ طلحۃ بن نافع

[3] الحسن بن ابی الحسن نام ابو سعید کنیت۔ مدینہ میں نشو و نما پائی۔ شہادت عثمانؓ کے وقت چودہ سال عمر تھی۔ حضرت عثمان غنی، عمران بن حصین، مغیرہ بن شعبہ اور ان کے علاوہ چند در چند صحابہ سے احادیث روایت کی ہیں۔ ان کی عادت تھی کہ مرسل حدیثیں پیش فرماتے یعنی تابعی ہونے کے باوجود ارشاد کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتے۔ اپنے اور حضور کے درمیان واسطہ کا ذکر نہ کرتے جیسا کہ عموماً سعید بن المسیب، مکحول دمشقی، ابراہیم نخعی اور دیگر اکابر تابعین کا معمول تھا۔ امام محمد بن جریر فرماتے ہیں: ان الناس باسرھم علی قبول المرسل تابعین سارے کے سارے مرسل کے قبول کرنے پر متفق تھے۔ امام علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ امام حسن بصری کے مرسلات صحیح ہیں (خلاصہ) ان کے متعلق امام اعظم کتاب الآثار میں فرماتے ہیں کہ میں نے امام باقر سے سنا ہے کہ عراق میں حسن بصری جیسا کوئی نہیں (ص ۲۰۹) تاریخ وفات ۱۱۰ھ

[4] تہذیب ج ۴ ص ۱۹۳

صحیفۂ صحیحہ

یہ اصل میں حضرت ابوہریرہ کی تالیف ہے۔ جو انہوں نے اپنے شاگرد ہمام بن منبہ کے لیے ترتیب دی تھی۔ چونکہ حضرت ابوہریرہ سے اس صحیفہ کے راوی ہمام ہیں۔ اس لیے صحیفۂ ہمام کے نام سے مشہور ہوگیا۔ دراصل اس کا نام صحیفہ ابی ہریرہ لہمام بن منبہ ہونا چاہیے — آپ پہلے سن چکے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ صحابہ میں سے اگر کسی کی حدیث دانی کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے تو وہ عبداللہ بن عمرو بن العاص تھے۔ موصوف نے الصحیفۃ الصادقۃ کے نام سے احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ شاید حضرت ابوہریرہ نے ان ہی کی تقلید میں اپنی تالیف کا نام الصحیفۃ الصحیحۃ رکھا ہے بہرحال یہ تالیف عہد صحابہ کی یادگار ہے۔ ڈاکٹر حمیداللہ کو دمشق اور برلن میں اس کے دو قلمی نسخے ملے ہیں۔ بڑی تحقیق و جستجو کے بعد انہوں نے پہلی صدی ہجری کی اس گراں مایہ تالیف کو شائع کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ مقابلہ کرنے پر نظر آتا ہے کہ بعد کے موتفوں نے مفہوم تو کیا کوئی لفظ تک نہیں بدلا۔ اس صحیفہ کی ہر حدیث نہ صرف صحاح ستہ میں حضرت ابوہریرہ کے حوالے سے ملتی ہے بلکہ مسند احمد میں آج بھی پورے کا پورا رسالہ بلا حذف و اضافہ موجود ہے۔ اس سے متعلق تفصیلات کے لیے صحیفہ ہمام بن منبہ کا مقدمہ دیکھیے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہم نے زمانہ صحابہ میں حدیث کی تدوین پر ان تالیف کا تذکرہ لوگوں کی پھیلائی ہوئی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کیا ہے کہ حدیث کی تدوین ایک سو سال بعد ہوئی ہے۔ یاد رکھیے یہ بہت بڑا سنگین مغالطہ ہے۔ حدیث کے موضوع پر تالیف و تصنیف کے اس قدر سرمایہ ہونے کے باوجود یہ سمجھنا تاریخ سے بہت بڑی بے انصافی ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر صبحی صالح نے علوم الحدیث میں تفصیلی بحث کی ہے۔

یہ صحابہ کرام کے چند نوشتے ہیں جو بہت سی احادیث پر مشتمل ہیں یا جو مستقل کتاب یا صحیفہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ورنہ اگر صحابہ کی ان تمام تحریروں کو یکجا کیا جائے جس میں انہوں نے کسی حدیث کا تذکرہ کیا ہے تو ایک مستقل کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تدوین حدیث کے کام کا آغاز دور نبوت ہی میں ہوچکا تھا اور پھر

دورِ صحابہ میں بھی یہ کام ہوتا رہا تحریری بھی تقریری بھی۔ لیکن زیادہ تر توجہ تقریری طور پر کام کرنے کی طرف مبذول تھی کیونکہ ــــــ عرب والوں کی تاریخ اور ان کی معاشرت میں علمی سرمایہ کو محفوظ رکھنے کا پہلے سے یہی طریقہ رائج تھا۔ وہ اپنے تمام شجرہ ہائے نسب، اہم تاریخی واقعات جنگی کارنامے، بڑے بڑے خطبے، لمبے لمبے قصیدے اور نظمیں سب زبانی یاد رکھتے تھے۔ قرآن پاک نازل ہوا تو اس نے اپنے لیے اسی طریقے کو سراہا اور خود نبوت اور صحابہ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ

بلکہ وہ آیتیں صاف ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جن کو علم ملا ہے[1]

یہی طریقہ ارشادِ نبوت کو محفوظ رکھنے کے لیے صحابہ نے اختیار کیا اور خود ذاتِ نبوت نے بھی ان کو ایسا ہی کرنے کو کہا تھا۔ چنانچہ وفد عبد القیس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب حاضر ہوا تو آپ نے وفد کو زبانی ہدایات سے نوازا تو یہ خصوصی ہدایت بھی فرمائی کہ

احفظوھن — ان کو زبانی یاد کر لو[2]

حدیث بیان کرنے والے صحابہ کرام

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جن صحابہ کرام کے ذریعے احادیث کا ذخیرہ اُمت کو ملا ہے اور تاریخ احکام یا تاریخ سنت کی معلومات کا سرمایہ جن اکابر کی وساطت سے کتابوں میں آیا ہے ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار میں سے صرف چار ہزار مرد و زن ہیں۔ چنانچہ امام حاکم لکھتے ہیں:

---

[1] یعنی جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے پڑھا نہیں ایسے ہی یہ دین جو وہ لے کر آتے ہیں ان کے صحابہ (جن کو اللہ کی جانب سے علم ملا ہے) کے ذریعے بن لکھے سینہ بسینہ جاری ہو گا اللہ کے فضل سے ان کے ہی سینے اس کے الفاظ و معانی کی حفاظت کریں گے الفاظ کی حفاظت کرنے والوں کو حفاظ و قراء اور معانی کی نگرانی کرنے والوں کو فقہاء و مجتہدین کہتے ہیں صراط مستقیم یہی ہے کہ دین کے پہنچانے میں حفاظ و قراء اور دین کے سمجھنے میں فقہاء پر اعتماد رکھے دونوں میں سے کسی ایک میں بھی خود رائی کرنا خسارے کو مول لینا ہے اور غالباً حدیث افتراق میں ما انا علیہ و اصحابی سے بھی یہی بتانا مقصود ہے۔

[2] الخیرات الحسان ص ۱۰

قد روی عنہ صلی اللہ علیہ وسلم من الصحابۃ اربعۃ آلاف
رجل وامرأۃ [1]

صحابہ میں سے صرف چار ہزار مرد وزن نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے
روایات بیان کی ہیں۔

اتنی بڑی تعداد میں سے اس قلیل عدد ہی کے ذریعے علوم نبوت ہم تک پہنچنے کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ میں ہر شخص یہ کام نہ کرتا تھا بلکہ خاص خاص وہ حضرات ہی کرتے تھے جن کو اپنی قوت حافظہ پر پورا پورا اعتماد تھا اور یہ بھی بہت احتیاط کے ساتھ روایت کرتے تھے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفا میں لکھا ہے۔

فاروق اعظم عبد اللہ بن مسعود را باجمعے بکوفہ فرستاد و معقل بن یسار و عبد اللہ
بن معقل و عمران بن حصین را بہ بصرہ و عبادہ بن الصامت و ابو الدرداء
را بشام و معاویہ بن ابی سفیان را کہ امیر شام بود قدغن بلیغ نوشت
کہ از حدیث ایشاں تجاوز نکنند [2]

فاروق اعظم نے عبد اللہ بن مسعود کو ایک جماعت دے کر کوفہ روانہ کیا۔
معقل بن یسار، عبد اللہ بن معقل اور عمران بن حصین کو بصرہ اور عبادہ
ابن الصامت ابو الدرداء کو شام، معاویہ ابن ابی سفیان کو جو کہ شام
کے امیر تھے پوری تاکید فرمائی کہ ان کی حدیث سے تجاوز نہ کریں۔

یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ صحابہ میں یہ کام ہر شخص نہیں کرتا تھا اور جو کرتے تھے ان میں بے حد فرق مراتب تھا۔ اس فرق مراتب کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سب سے زیادہ احادیث کی تعداد جن حضرات سے آتی ہے وہ صرف چار ہیں۔ مثلاً

حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، ان کے بعد اس سے کم تعداد والے تین ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت جابر بن عبد اللہؓ، حضرت ابو سعید خدری، جن صحابہ کی روایات ہزار سے زیادہ نہیں وہ صرف دس ہیں۔

---

[1] مدخل ص ۷، [2] ازالۃ الخفا ص ۶

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت عمر بن الخطابؓ، حضرت اُم سلمہؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت براء بن عازبؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت ابو امامہ باہلیؓ۔

وہ صحابہ جن کی روایات سو سے زیادہ ہیں وہ تعداد میں انیس ہیں

حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت عبادہ بن الصامتؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت ابوقتادہؓ، حضرت بریدہؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت ابوایوب انصاریؓ، حضرت مغیرہؓ، حضرت ابوبکرہؓ، حضرت نعمان بن بشیرؓ، حضرت ابومسعود انصاریؓ، حضرت جریر بن عبداللہؓ، حضرت سہل بن سعدؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت ثوبانؓ۔

ان کے بعد سینکڑوں سے نیچے احادیث بیان کرنے والے صرف چوراسی ہیں۔

انیس حدیثیں بیان کرنے والے صرف دو صحابی ہیں۔

اٹھارہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف چھ صحابی ہیں۔

سترہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف تین صحابی ہیں۔

سولہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف تین صحابی ہیں۔

پندرہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف چار صحابی ہیں۔

چودہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف گیارہ صحابی ہیں۔

تیرہ حدیثیں بیان کرنے والے صرف سات صحابی ہیں۔

سب سے زیادہ تعداد ایک ارشاد بیان کرنے والے صحابہ کی ہے۔ اس کے بعد پھر تین، بالترتیب ہزاروں تک۔[1]

اور جن صحابہ کے ذریعے اُمت کو اپنے پیغمبر سے یہ علم کی میراث ملی ہے۔ علماء نے ان کی زندگیوں پر مفصل اور مبسوط کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے قدیم کتاب اس موضوع پر اگرچہ السیوطی کے خیال میں امام بخاری کی تاریخ ہے۔ لیکن اس سے زیادہ قدیم کتاب اس موضوع پر طبقات ابن سعد ہے۔ صحابہ کے حالات ہیں اس سے پہلے اتنی بڑی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب عرصے سے

---

[1] تلقیح فہوم اہل الاثر ص ۱۸۴ تا ص ۱۹۷

مفقود تھی اب یورپ میں چھپ گئی ہے۔ اس کے بعد دوسری کتابیں منصہ وجود پر آئی ہیں۔ طبع شدہ کتابوں میں سب سے مبسوط حافظ ابن حجر عسقلانی کی الاصابہ فی تمیز الصحابہ ہے۔ یہ کتاب آٹھ جلدوں میں ہے۔ اس میں کل صحابہ ۱۲۲۷۹ کے تراجم آتے ہیں۔ ابن سعد نے طبقات میں تمام صحابہ کو پانچ طبقوں اور امام حاکم نے بارہ طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ طبقات صحابہ یہ ہیں :

۱۔ وہ لوگ جنہوں نے مکہ میں مسلمان ہونے میں پہل کی جیسے خلفاء راشدین۔
۲۔ وہ لوگ جو مشرکین مکہ کے دار الندوہ میں مشاورت سے پہلے مسلمان ہوئے۔
۳۔ مہاجرین حبشہ
۴۔ اصحاب عقبہ اولیٰ
۵۔ اصحاب عقبہ ثانیہ
۶۔ وہ مہاجرین جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مدینہ جاتے ہوئے قبا میں ملے۔
۷۔ اصحاب بدر
۸۔ وہ صحابہ جنہوں نے بدر اور حدیبیہ کے درمیان ہجرت کی ہے۔
۹۔ اصحاب بیعۃ الرضوان۔
۱۰۔ وہ صحابہ جو حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان مہاجر ہوئے۔
۱۱۔ وہ صحابہ جو فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے۔
۱۲۔ وہ بچے جنہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح مکہ کے دن اور حجۃ الوداع میں زیارت کی ہے۔

صحابہ کرام میں حفاظ و فقہاء

پھر صحابہ کرام میں خدمت دین کا کام علمی طور پر دو حصوں میں تقسیم تھا۔
کچھ تو وہ تھے جن کا کام صرف محفوظ سرمایہ کو آگے پہنچانا تھا۔ یہ احادیث روایت کرتے تھے
کچھ وہ تھے جن کا کام قرآن و حدیث کے محفوظ سرمائے سے مسائل کا استنباط اور ان میں تفقہ اور تدبر تھا۔ اس سلسلے میں حدیث ابی موسیٰ اشعری پر حافظ ابن القیم کی تصریحات آپ پڑھ چکے ہیں۔

ان دونوں طبقوں میں باہم علمی مسائل پر اپنے اپنے فن کے لحاظ سے گفتگو بھی ہوتی اور فقہاء کی جانب سے ان حفاظ پر فقہی اعتراض بھی ہوتے تھے۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی پیش کیا۔ لوگو! اس چیز سے وضو کرو جسے آگ نے بدل دیا یعنی آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا میں تو گرم پانی سے وضو کرتا ہوں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا میرے بھائی: جب تم حضور انورؐ کا ارشادِ گرامی سنو تو اس کے لیے مثالیں نہ تراشو۔ مسند امام احمد بن حنبل میں ہے کہ ابوحسان الاعرج کہتے ہیں کہ دو شخص حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس آئے اور انہوں نے ان کو بتایا کہ حضرت ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بیان کرتے ہیں کہ

انما الطیرۃ فی المرأۃ والدابۃ والدار

بے شک شگون عورت، سواری اور گھر میں ہے

حضرت عائشہؓ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے قرآن ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا ایسا نہیں ہے۔ حضور تو یوں فرماتے تھے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ شگون عورت، گھر اور گھوڑے میں ہے۔ اس کے بعد حضرت عائشہ نے قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب

حضرت ابوہریرہ نے بات کا آخری حصہ سنا آغاز نہیں سنا جتنا سنا بیان کر دیا۔

مسند ابی داؤد طیالسی میں ہے کہ حضرت علقمہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت عائشہ کے پاس تھے۔ ابوہریرہؓ آئے حضرت عائشہ نے کہا اے ابوہریرہ کیا تم یہ حدیث بیان کرتے ہو کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک عورت کو بلی کے باندھنے، کھانا پینا بند کرنے کی پاداش میں عذاب ہوا۔

حضرت ابوہریرہ نے کہا کہ جی ہاں میں نے حضور سے ایسا ہی سنا ہے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ پتہ ہے کہ یہ عورت کون تھی؟ حضرت ابوہریرہ نے کہا نہیں۔ فرمایا کہ یہ عورت کافرہ تھی۔ خوب یاد رکھو اللہ سبحانہٗ کے نزدیک مومن کا اس سے کہیں زیادہ اکرام ہے کہ وہ اسے صرف ایک بلی کی وجہ سے عذاب دے۔

یاد رہے کہ حضرت ابوہریرہ پر حضرت عائشہ کے ان تعقبات سے یہ شبہ ہرگز نہ کرنا چاہیے، کہ اس سے حضرت ابوہریرہ کی شان فقاہت پر کوئی حرف آتا ہے کیونکہ حضرت عائشہ کے تعقبات صرف حضرت ابوہریرہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ان کی جانب سے ایسے تعقبات تو ان پر بھی ہیں جو فقاہت میں معروف اور کثیر الفتاویٰ ہیں۔ مثلاً فاروق اعظمؓ علی بن ابی طالبؓ۔

ابن سعد نے طبقات میں ابن القیم نے اعلام میں حضرت ابو ہریرہ کو ان صحابہ میں شمار کیا ہے جو بیان فتاویٰ و مسائل میں درمیانے درجہ پر تھے۔ کسی صحابی کے کثیر الحدیث اور ضبط و حفظ میں شہرت پالینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ عدیم الفقاہت ہے۔ اگر کثرت حدیث اور اسناد و روایت کی فن کاری کی وجہ سے ارباب طبقات نے امام احمد اور امام بخاری کو فقہاء میں شمار نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ امام احمد اور امام بخاری فقیہ نہ تھے۔ یقیناً تھے لیکن دوسرے ارباب فن کی طرح ان کا یہ فن نہ تھا ایسے ہی حضرت ابو ہریرہ یقیناً فقیہ تھے مگر فاروق اعظم، علی بن ابی طالب اور ابن مسعود کی طرح فنکار نہ تھے ان کی فنکاری تحدیث و روایت تھی۔ علامہ عبد العزیز بخاری نے کشف الاسرار میں، حافظ ابن الہمام نے تحریر میں، حافظ عبد القادر قرشی نے الجواہر المضیۃ میں یہ بات پوری قوت کے ساتھ واضح کی ہے۔ حافظ ابن الہمام لکھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ فقیہ ہیں اور اسباب اجتہاد سے مالا مال تھے[1]

حافظ عبد القادر قرشی لکھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ فقیہ تھے ان کو حافظ ابن حزم نے فقہاء صحابہ میں شمار کیا ہے۔ شیخ تقی الدین السبکی نے ان کے فتاویٰ کتابی صورت میں جمع کیے ہیں[2] یہ امر آخر ہے کہ دوسرے صحابہ کے مقابلے میں ان کو فنی شہرت نہ ہو جیسا کہ الوابل الصیب میں ابن القیم حافظ ابن حزم کے حوالہ سے رقمطراز ہیں۔

ابن عباس کے فتاویٰ، تفسیر اور مسائل کا حضرت ابو ہریرہ کے فتاویٰ سے کیا مقابلہ اور کیا نسبت؟ بے شک حضرت ابو ہریرہ حفظ میں صاحب مقام ہیں بلکہ علی الاطلاق پوری امت میں حافظ ہیں۔ حدیث کو جیسا سنا ہے آگے پیش کرتے ہیں۔ ان کی ساری توجہات کا مرکز حفظ حدیث اور ان محفوظ حدیثوں کو آگے پہنچانا ہے اور ابن عباس کی توجہ کا مرکز تفقہ اور استنباط مسائل ہے لیجئے خود ان کے الفاظ پڑھ لیجئے۔

فکانت همته مصروفة الی الحفظ و تبلیغ ما حفظه کما سمعه وهمة ابن عباس مصروفة الی التفقه والاستنباط۔[3]

ابو ہریرہ کی ساری توجہ حدیثوں کے یاد کرنے اور یاد شدہ حدیثوں کے پہنچانے پر لگی تھی اور ابن عباس کی ہمت و توجہ کا مرکز فقہ فتاویٰ

---

[1] تحریر ج ۳ ص ۴ [2] الجواہر المضیۃ ج ۲ ص ۴۱۹ [3] الوابل الصیب ص ۸۷

اور استنباطِ مسائل تھا۔

اسی بنا پر اُصول کی کتابوں میں یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ ان صحابہ کی حدیثوں کو جو فقہ و اجتہاد میں معروف ہیں ترجیح دی جائے۔ برخلاف ان کے جو فقہ د اجتہاد میں نہیں بلکہ صرف عدالت و حفظ میں ممتاز و مشہور ہیں۔ ان کی حدیث کو راجح نہیں قرار دیا جائے گا۔ فقہ و اجتہاد میں شہرت رکھنے والوں کی مثال میں خلفاء راشدین، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن الزبیر، حضرت عائشہ، حضرت ابی بن کعب اور حضرت معاذ بن جبل کا نام لیا ہے اور حفظ و عدالت میں شہرت رکھنے والوں کی مثال میں حضرت ابوہریرہ، حضرت انس بن مالک، حضرت سلمان فارسی اور حضرت بلال کا نام لیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں :

ان عرف بالفقہ والتقدم فی الاجتہاد کالخلفاء الراشدین کان حدیثہ حجۃ وان عرف بالعدالۃ والضبط دون الفقہ کانس وابی ھریرۃ۔

اگر فقہ اور اجتہاد میں مشہور ہو جیسے خلفاء راشدین تو اس کی حدیث حجت ہے اور اگر کوئی عدالت، ضبط و حفظ حدیث میں مشہور ہو مگر فقہ میں شہرت نہ رکھتا ہو جیسے ابوہریرہؓ اور انسؓ۔

اب سابقہ بیانات کی روشنی میں آپ ہی فیصلہ فرمائیے کہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت فاروقؓ کو کس چیز میں شہرت حاصل ہے یقیناً حضرت ابوہریرہؓ کو حفظ میں اور حضرت فاروق اعظمؓ کو فقہ و اجتہاد میں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک حضرت ابوہریرہ فقیہ نہیں ہیں۔ حاشا ثم حاشا فقیہ ہیں مگر حضرت ابن عباسؓ، حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرح فقہ میں معروف نہیں اور کسی فن میں شہرت نہ ہونا کوئی عیب نہیں یہ تو فرق مراتب ہے۔

حافظ زرکشی نے حضرت عائشہ کے ایسے تعقبات کو ایک رسالہ نامی "الاجابۃ فیما استدرکتہ عائشۃ علی الصحابۃ" میں جمع کر دیا ہے۔ یہ رسالہ مصر میں طبع ہو چکا ہے۔ حافظ سیوطی نے اپنی عادت کے مطابق اسی کی تلخیص "عین الاجابہ فی استدراک عائشہ علی الصحابہ" کے نام سے کی ہے۔ یہ مطبع معارف اعظم گڑھ ہندوستان میں طبع ہوا ہے۔

الغرض بتانا یہ چاہتا ہوں کہ صحابہ میں اس لحاظ سے فرقِ مراتب تھا اور فرقِ مراتب کی ہی میراث

تابعین اور تبع تابعین کو بھی صحابہ سے ملی ہے۔
اور یہاں سے یہ حقیقت بھی الم نشرح ہو گئی کہ حضرت فاروق اعظم کے متعلق جو یہ تصریحات ملتی ہیں کہ

اقلوا الروایۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کم کرو۔

یا حضرت قرظہ کا یہ کہنا کہ نھانا عمر (منع کیا ہم کو عمر نے) اور یا حضرت ابوہریرہ کا ابوسلمہ کے سوال پر یہ کہنا کہ

لو کنت احدث فی زمان عمر مثل ما احدثکم لضربنی بمخفقۃ۔[1]

اگر میں زمانہ عمر میں ایسے حدیث بیان کرتا جیسے تم سے کرتا ہوں تو مجھے وہ درّے لگاتے۔

تو ان کا منشا وہ نہیں جو عموماً آج سمجھ لیا گیا ہے بلکہ اس کا پس منظر یہ ہے کہ فاروق اعظم نے تحدیث اور اشاعت سنت کے لیے سرکاری طور پر شخصیتیں مقرر کی تھیں۔ ہر کس و ناکس کو یہ کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ امام دارمی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر کا یہ منشا تھا کہ غزوات اور جنگی سرگرمیوں کے واقعات رائے عامہ کے سامنے نہ بیان کیے جائیں۔ صرف فرائض و سنن سے ان کو روشناس کیا جاتے اور حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر کا مطلب یہ تھا کہ حضور انور کی وہ حدیثیں جن کا تعلق عادات و شمائل سے ہے وہ نہ بیان کی جائیں کیونکہ ان سے کوئی غرض شرعی متعلق نہیں یا وہ حدیثیں مقصود ہیں جن کے حفظ و ضبط کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔[2] ان تاویلات کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت عمر کا موقف خود ان کے طرز عمل سے متعین ہو سکتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم نے تمام ممالک محروسہ میں معلمین مقرر کیے تھے اور ہر جگہ تاکیدی احکام روانہ کیے تھے کہ ان معلمین سے فرائض اور سنن سیکھو جیسا کہ قرآن سیکھتے ہو۔ چنانچہ مسند دارمی میں ہے۔ تعلموا الفرائض والسنن کما تعلمون القرآن۔ (فرائض اور سنن کو سیکھو جیسے تم قرآن سیکھتے ہو)

اور قرآن کے ساتھ صحت الفاظ و اعراب بھی سیکھو۔ ان کے خاص الفاظ حسب روایت

---

[1] تذکرۃ الحفاظ [2] ازالۃ الخفاء ص ۱۴۱

ابن الانباری یہ ہیں۔ تعلموا اعراب القرآن کما تعلمون حفظہ۔ اعرابِ قرآن سیکھو جیسے اس کو یاد کرنا سیکھتے ہو۔

مورخین نے چونکہ زمانہ فاروق اعظم میں تعلیمی نظم کے لیے کوئی خاص عنوان قائم نہیں کیا اس لیے ان معلموں کی تعداد معلوم نہیں ہو سکی مگر جستہ جستہ تصریحات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہر شہر میں متعدد صحابہ اس کام پر مامور تھے۔ قرۃ العینین میں ہے کہ

دربر شہرے مقرئے ومحدثے را فرستاد[1] آپ نے ہر شہر میں ایک قاری اور ایک محدث بھیجا۔

اور روضۃ الاحباب کے حوالے سے لکھا ہے کہ زمانہ فاروق اعظم میں ایک ہزار چھتیس شہر فتح ہوئے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ فاروق اعظم نے اپنے دورِ خلافت میں ایک ہزار چھتیس صحابہ کرام کو حدیث کی اشاعت کے لیے مقرر فرمایا۔ آپ چاہیں تو تذکرۃ الحفاظ، اسد الغابہ اور الاصابہ جیسی کتابوں سے ایسے صحابہ کی ایک فہرست مرتب کر سکتے ہیں۔ جن کو حضرت عمرؓ نے معلمین سنن اور محدثین کی حیثیت سے روانہ کیا۔ ایک بار مجمع عام میں تقریر کرتے ہوئے یہ بات واشگاف لفظوں میں فرمائی۔

انی اشھد کم علی امراء الامصار انی لم ابعثھم الا لیفقھوا الناس فی دینھم[2]

میں تم گواہ بناتا ہوں کہ میں نے امراء کو شہروں میں دین سکھانے کے لیے روانہ کیا ہے۔

ایک اور تقریر میں اس سے زیادہ وضاحت ہے۔

انی واللہ ما ابعث الیکم عمالی لیضربوا ابشارکم ولکنی ابعثھم الیکم لیعلموا دینکم و سنۃ نبیکم[3]

میں بقسم کہتا ہوں کہ میں نے امراء کو صرف اس لیے بھیجا ہے کہ تمہیں دین اور تمہارے نبی کی سنت سکھائیں۔

گویا فاروق اعظمؓ کے زمانے میں ہر ملکی افسر انتظامی سربراہی کے ساتھ محدث اور معلم فقہ ہوتا تھا اور یہ التزام صرف انتظامیہ تک محدود نہ تھا۔ بلکہ فوجی افسروں میں بھی اس کا خاص لحاظ ہوتا تھا۔ قاضی ابو یوسف رقمطراز ہیں:

---

[1] قرۃ العینین ص ۱۳۱ [2] کتاب الخراج ص ۱۱۸
[3] کتاب الخراج ص ۱۱۵

ان عمر بن الخطاب کان اذا اجتمع الیہ جیش من اھل الایمان بعث علیھم رجلاً من اھل الفقہ والعلم۔

حضرت عمر کے پاس مسلمان فوجی آتے تو ان پر اہل فقہ اور علم کو امیر بناتے۔

یاد رہے کہ صدر اول میں فقہ سے مراد سنّت ہوتی تھی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

مسلمین در زمان شیخین متفق بودند باخذ بہ سنت ظاہر کہ معتبر بفقہ است[1]

مسلمان شیخین کے زمانے میں سنّت کو اپنانے پر متفق تھے جسے فقہ کہتے ہیں۔

اس تمام تفصیل سے مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ تاریخ کی اتنی بڑی شہادت ہوتے ہوئے روایت حدیث سے ممانعت کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ کام ہر کس و ناکس کے کرنے کا نہیں بلکہ سرکاری طور پر اس کے لیے خاص شخصیتیں مقرر تھیں۔

خلافت راشدہ اور تدوینِ حدیث

خلفاء راشدین کے سارے دور میں ارشادات پیغمبر کی عمومی حفاظت رائے عامہ نے اسی طرح کی اور اسی کا نام ان کی زبان میں العلم تھا۔ اور یہ علم کی نگرانی سابقہ رواج کے مطابق بطریق الروایۃ تھی۔

یہ بات کہ خلافت راشدہ میں باقاعدہ قانونی طور پر کتابی صورت میں حدیث کی تدوین کیوں نہیں کی؟ اس کے لیے ہم یہاں حافظ ابوبکر بن عقال کے بیان کا ایک اقتباس ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

ابوبکر بن عقال الصقلی بروایت ابن بشکوال رقمطراز ہیں کہ — حدیث کا سارا ذخیرہ زمانۂ نبوت کے بعد صحابہ کے سینوں میں الگ الگ تھا۔ یعنی کسی کو کچھ معلوم تھا۔ ساری زندگی ایک ہی شخص کو معلوم نہ تھی اور پھر جسے جو کچھ بھی معلوم تھا وہ بھی معانی کی حد تک۔ کیونکہ الفاظ کی حفاظت کا اس کے لیے کوئی قانونی اہتمام روز اول ہی سے نہیں کیا گیا تھا۔ برخلاف قرآن کے اس کے الفاظ کی قانونی طور پر نگرانی کی گئی تھی۔

ایسی حالت میں اگر صحابہ کرام زمانۂ خلافتِ راشدہ میں قرآن ہی کی طرح احادیث کو بھی یکجا کر لیتے

---

[1] قرۃ العینین ص ۱۶۴

اس میں ایک طرف یہ خوبی ضرور ہوتی ۔ کہ ایک قابلِ اعتماد علمی سرمایہ کتاب کی صورت میں لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا مگر یہ قباحت بھی یقینی طور پر پیش آتی کہ قرآن اپنے اعجاز کی وجہ سے متعینہ الفاظ میں محفوظ تھا بر خلاف سنّت کے کہ اس کے معانی و مطالب مقرر تھے مگر الفاظ کا اعجاز نہ ہونے کی وجہ سے قرآن جیسی حفاظت نہیں کی گئی ۔ اس لیے حدیث کا جو ذخیرہ کتاب سے باہر رہتا وہ حدیث ہونے کے باوجود بے اعتبار ہو جاتا ۔

ان وجوہ سے خلافت راشدہ نے حدیث کو خود سرکاری طور پر کتابی طرز پر جمع نہیں کیا بلکہ اس کو بعد میں آنے والوں پر چھوڑ دیا ۔

اس کے ساتھ یہ ذہن میں رکھئے کہ

۱۔ نبوّت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام دوسرے انبیاءؑ کی نبوّتوں کے مقابلے میں ایک نمایاں حیثیت لے کر آئی ہے ۔ دوسری نبوّتوں سے اس کو ممتاز کرنے والی چیز یہ ہے کہ یہ نبوّت اپنے ساتھ خلافت لے کر آئی ہے ۔ حجۃ اللہ البالغہ میں حکیم الاُمت شاہ ولی اللہ نے نبوّت کے اس امتیاز کو قرآن کا منطوق قرار دیا ہے ۔ قرآن کی مشہور آیت نسخ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا
فَصَوْلُهٗ بِخَيْرٍ مِّنْهَا فِيْمَا تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ مضمومة بالخلافة
جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو لے آتے ہیں
اس سے اچھی یا اس جیسی ۔ اس سے اچھی اور بہتر کا مطلب یہ
ہے کہ ہم وہ نبوّت عطا کرتے ہیں جو خلافت سے وابستہ ہو ۔

حجۃ اللہ ہی میں ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :

اعظم الانبياء شأنا من له نوع آخر من البعثة وذلك
ان يكون مراد الله تعالىٰ فيه ان يكون سببا لخروج الناس
من الظلمات الى النور وان يكون قومه خير امة اخرجت
للناس فيكون بعثه يتناول بعثا آخر ۔

نبیوں میں بڑی شان کا نبی وہ ہے جو نبی ہونے کے ساتھ ایک اور
بعثت بھی ساتھ لے کر آئے ۔ یہ اس طرح کہ نبی کی نبوّت کے ذریعے
اللہ سبحانہٗ کا مقصد ایک تو لوگوں کو کفر کی ظلمت سے نکال کر ایمان

کی روشنیوں میں لانا ہو اور دوسرا یہ کہ اس کی قوم بہترین اُمت ہو جسے
لوگوں کے لیے روانہ کیا گیا ہو۔ اس لیے آپ کی بعثت ایک دوسری
بعثت سے کرائی ہے اور یہ آپ کی قوم کی بعثت ہے۔

۲۔ اسلام میں خلافت راشدہ کی حد تک قول خلیفہ کا مقام حجت اور دلیل کا ہے۔ حکیم الامت شاہ
ولی اللہ نے خلفاء کے ارشاد و کردار کی حجیت پر ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۴۳۰ پر تفصیلی بحث کی ہے اور
اپنے دعویٰ کو قرآن و سنت کے دلائل سے ثابت کیا ہے۔ قرآن کی اس آیت کہ

وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ

پر لکھا ہے

دریں آیت افادہ مے فرماید آنچہ بسعی ایشاں ممکن و شائع و مشہور مے
شود دین مرتضیٰ است [1]

اس آیت کا مفاد یہ ہے کہ صحابہ کی کوشش سے اس کو جو قوت ملی اور دین کی جو اشاعت
اور شہرت ہوئی وہ دین پسندیدہ ہے۔

اور آیت:

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ

پر لکھتے ہیں کہ:

دریں آیت افادہ فرمود ہر نمازے و زکوٰتے و امر معروفے و نہی
منکرے کہ از ممکناں ظاہر شود محمود و محل رضا است [2]

یعنی خلافت راشدہ کے قول و فعل کے دین میں حجت ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ پاک
نے قرآن میں دین کو ان کی طرف نسبت کر کے لیے اپنا پسندیدہ قرار دیا ہے اس لیے ان کے
تمام اعمال دین میں محمود و محل رضا ہیں۔

۳۔ اسلام میں جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت واجب الاتباع ہے ایسے ہی
خلفاء راشدین کی سنت بھی واجب الاتباع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس نے ان کو
معیار حق گردانتے ہوئے ہمیں ان کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ حضرت عرباض بن ساریہؓ سے

---

[1] ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۶۱ ۔ [2] ایضاً

روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فعلیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین
تمسکوا بها و عضوا علیها بالنواجذ[1]

میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت سے چمٹ جاؤ، اسے تھام لو اور اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑ لو۔

اسی سنت کی تعریف یہ کی جاتی ہے:

السنة هی الطریقة المسلوکة فیشتمل ذالک التمسک بما کان علیه و خلفائه الراشدون من الاعتقادات والاعمال والاقوال و هذه هی السنة الکاملة[2]

سنت طریقہ مسلوکہ کا نام ہے۔ یہ حضور انور کی سنت اور خلفاء راشدین کے تمام اعتقادات، اعمال اور اقوال کو شامل ہے یہی سنت کاملہ ہے۔

۴۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں امت کے اختلاف وافتراق کا پتہ دیا ہے وہاں امت کے لیے اختلاف کے اسی دلدل میں شاہراہ نجات کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا ہے مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ (وہ جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں) یہاں آپ نے اپنے ساتھ صحابہ کو ملا کر راہ نجات کی تعیین فرمائی ہے۔

اسی بنا پر فرقہ ناجیہ کی یہ تعریف کی گئی ہے۔

اَلْفِرْقَةُ النَّاجِیَةُ هُمُ الْاٰخِذُوْنَ فِی الْعَقِیْدَةِ وَالْعَمَلِ جَمِیْعًا بِمَا ظَهَرَ مِنَ الْکِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَجَرٰی عَلَیْهِ جُمْهُوْرُ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِیْنَ[3]

فرقہ ناجیہ وہ ہی لوگ ہیں جو عقیدہ وعمل دونوں میں کتاب وسنت کے ظواہر اور جمہور صحابہ وتابعین کی شاہراہ پر ہوں۔

یعنی فرقہ ناجیہ مفہوم میں کتاب وسنت اور مصداق میں صحابہ وتابعین سے استفادہ کرتا ہے

---

[1] ترمذی ج ۲ ص ۹۲، ابن ماجہ ص ۵، ابوداؤد ج ۲ ص ۲۷۹، مسند دارمی ص ۲۶، مسند احمد ج ۴ ص ۲۷، مستدرک ج ۱ ص ۹۵ ۔ [2] جامع العلوم والحکم ج ۱ ص ۱۹۱ ۔
[3] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۲۰

اور اسی مفہوم و مصداق کی ہم آہنگی کو بتانے کے لیے اس فرقہ ناجیہ کا نام اہل السنۃ والجماعۃ رکھا گیا ہے۔

اس تفصیل سے آپ یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ

اسلام کا علمی، اخلاقی اور روحانی نظام نبوت اور خلافت سے مل کر بنا ہے۔ یعنی قرآن کی ہدایات، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی و عملی تشریحات اور خلافت کی آئینی اور قانونی ترتیب کا نام مکمل اسلام ہے۔ اگر صدیق اکبر، فاروق اعظم، عثمان غنی اور علی مرتضیٰ میں سے کوئی بھی تدوین سنن کا یہ کام کرتا تو یقیناً یہ تدوین پورے اسلام کی آئینہ دار نہ ہوتی بلکہ خلفاء کے ادوار اربعہ میں سے ایک کے رہ جانے سے بھی سنت کی تدوین ادھوری ہوتی۔ اس لیے ان اکابر میں سے کسی نے یہ کام نہیں کیا ہے۔

۵۔ قرآن حکیم میں اللہ سبحانہ نے مسلمان کا منتہائے نظر صراط مستقیم قرار دیا ہے اور اسی کی طلب گاری کے لیے ہر نمازی نماز کی ہر رکعت میں درخواست کرتا ہے صراط مستقیم کے تعارف یا تعریف میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ نہیں کہ وہ صرف انبیاء کا راستہ ہے بلکہ بتایا یہ گیا ہے کہ وہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ پاک نے انعام فرمایا ہے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا ہے) اور ان انعام یافتگان کی قرآن ہی نے خود جو تعیین کی ہے وہ دنیا کے سامنے ہے فرمایا:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ
وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ۔

یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا انبیاء، صدیقین، شہداء، اور صالحین۔

یہ آیت گرامی اس بات میں فیصلہ کن ہے کہ صرف انبیاء کی نہیں بلکہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی راہ قرآن کی زبان میں صراط مستقیم ہے۔

آیت استخلاف میں جہاں مخاطبوں سے منکم کے ذریعے خلافت کا وعدہ کیا ہے وہاں ان کی صلاحیت کا پہلے ذکر کیا ہے اور ایک دوسرے موقع پر کلمہ حصر لاکر صدیقیت اور شہادت کو صحابہ کا وصف خصوصی بتایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ

وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔

اور وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے یہی لوگ
صدیقین اور شہداء ہیں اپنے پروردگار کے حضور۔

ایک اور موقعہ پر کلمۂ خطاب کے ذریعے صحابہ کو کہا ہے۔

لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ۔

اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ قرآن کے نزدیک عقائد، اعمال، اخلاق اور آداب میں نبوت اور خلافت کے قائم کیے ہوتے نقوش کا نام صراطِ مستقیم ہے۔

اسی بنا پر قرآن نے نبوت کے سارے کاموں کو اپنے مخاطبوں کے فرائض بتایا ہے مثلاً نبوت کا کام دعوت ہے قرآن نے منکم کے خطابی زور سے اسے اپنے مخاطبوں کا فرض قرار دیا ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ۔

چاہیے کہ تم میں سے ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف بلائے۔

نبوت کا مشن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے قرآن نے اسے اُمت کی خیریت کا مبنیٰ قرار دیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

تم بہترین اُمت ہو لوگوں کے لیے برپا کیے گئے ہو نیکی کا حکم دیتے
ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

نبوت کا مقام شہادت علی الناس ہے قرآن نے اسی کو اپنے مخاطبوں کے نقطۂ اعتدال پر ہونے کی علت بتا کر خلافت کا فرض قرار دیا ہے۔

كَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ
عَلَى النَّاسِ

ایسے ہی بنا دیا ہم نے تم کو درمیانی اُمت تاکہ تم ہو جاؤ گواہ لوگوں پر

نبوت کا کام تبلیغ ہے مگر قرآن میں اسی کو خصوصی طور پر خلافت راشدہ کا فریضہ

قرار دیا ہے۔ فرائض کا یہ اشتراک بول رہا ہے کہ اسلام نبوت اور خلافت کے مجموعہ کا نام ہے۔

اس تمام تفصیل سے مجھے یہ بتانا مقصود ہے کہ چونکہ اسلام کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت نبوت کا خلافت کے ساتھ پیوند ہے۔ نبوت اگر انفرادی اُسوہ ہے تو خلافت اسی کی اجتماعی تشکیل کا نام ہے اس لیے خلافت راشدہ کے اس دور میں جو اسلامی نقطہ نظر سے معیار حق اور حجت و دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سنن کو کتابی صورت میں مدوّن نہیں کیا گیا اگر ایسا کیا جاتا تو دورِ خلافت تدوین سے رہ جاتا اور سنّت کی ادھوری تدوین ہوتی۔

خلافتِ راشدہ کے دَور میں خدمتِ حدیث

دورِ خلافتِ راشدہ میں حدیث کی اشاعت میں سب سے زیادہ کوشش حضرت فاروق اعظمؓ نے کی ہے اور صرف حدیث نہیں بلکہ روایت کے اُصول کے موجد درحقیقت حضرت عمرؓ ہی ہیں جیسا کہ آپ آئندہ پڑھیں گے۔

حدیث کے سلسلے میں جو کام حضرت فاروق اعظم نے کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ

۱۔ احادیثِ نبوت کو نقل کر کے وقتاً فوقتاً گورنروں اور ضلعی حکام کے پاس روانہ کرتے۔ ان احادیث کا تعلق سنن و فرائض سے ہوتا۔

۲۔ صحابہ میں جو لوگ فنِ حدیث کے امام تھے ان کو مختلف ممالک میں حدیث کی تعلیم کے لیے روانہ کیا۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

> فاروق اعظم عبداللہ بن مسعودؓ را باجمعے بکوفہ فرستاد و معقل بن یسارؓ و عبداللہ بن مغفلؓ و عمران بن حصینؓ را بہ بصرہ و عبادہ بن الصامتؓ و ابوالدرداءؓ را بہ شام و معاویہ بن ابی سفیان کہ امیر شام بود قدغن بلیغ نوشت کہ از حدیث ایشاں تجاوز نہ کند۔[1]

> فاروق اعظمؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو ایک جماعت کے ساتھ کوفہ روانہ کیا اور معقل بن یسارؓ و عبداللہ بن مغفلؓ اور عمران بن حصینؓ کو بصرہ، عبادہ بن الصامتؓ، ابوالدرداءؓ کو شام روانہ کیا اور حضرت

---

[1] ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ٦

معاویہؓ کو بڑی تاکید سے لکھا کہ ان کی حدیثوں سے آگے نہ بڑھیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں ببادی النظر ذہنوں میں یہ خلش پیدا ہو سکتی ہے کہ فاروق اعظم نے اگر واقعی اشاعتِ حدیث کا اتنا اہتمام فرمایا ہے تو پھر حضرت عمرؓ سے دفترِ حدیث میں احادیث کیوں کم مروی ہیں؟ یہ خلش بظاہر وزنی ہے لیکن دراصل یہاں ایک مغالطہ اور غلط فہمی ہے۔

محدثین کے یہاں یہ مانا ہوا اُصول ہے کہ صحابی جب کوئی ایسا مسئلہ بیان کرے جس میں رائے کو دخل نہ ہو تو اگرچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہ لے مطلب یہی ہوگا کہ حدیث مرفوع ہے جیسا کہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے حافظ ابن عبدالبر اور دوسرے محدثین سے نقل کیا ہے اور ہے بھی یہ ایک عقلی قانون۔ اس اُصول کی روشنی میں حضرت فاروق اعظم کی تقریروں اور تحریری فرامین، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کے جس قدر اُصولی مسائل بیان ہوتے ہیں وہ سب احادیث مرفوعہ کے حکم میں ہیں۔ حکیم الاُمت شاہ ولی اللہ محدث نے یہ بات کھول کر بیان کی ہے:

> مضمون احادیث در خطب خود ارشاد مے فرمایند تا اصل احادیث باں موقوف خلیفہ قوت یابد۔ بار اینکہ بغور سخن نرسند ایں رانمی فہمند ونمی دانند کہ فاروق اعظمؓ تمام علم حدیث را اجمالاً تقویت دادہ و اعلان نمودہ[1]

> فاروق اعظمؓ اپنی تقریروں میں حدیثوں کا حوالہ دیتے تاکہ حدیث کا ذخیرہ موقوف خلیفہ ہونے کی وجہ سے زیادہ مستند ہو جاتے جو لوگ غور و فکر سے کام نہیں لیتے وہ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ فاروق اعظمؓ نے تمام علم حدیث کو اس طرح قوی سے قوی تر بنا دیا ہے اور اس کو لوگوں تک پہنچایا ہے۔

قرۃ العینین میں یہاں تک لکھا ہے کہ:

---

[1] ازالۃ الخفاج ۲ ص ۱۴۱

حضرت فاروق اعظمؓ کی حدیثیں صرف اس قدر نہیں جو ان کے نام سے مسانید میں موجود ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر صحابہ سے جس قدر روایات مرفوعہ نقل ہو کر ہم تک پہنچی ہیں وہ سب فاروق اعظم ہی کی روایات ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی بے شمار روایات کا وہ ذخیرہ ہے جن کو ان بزرگوں نے فاروق اعظمؓ سے سن کر براہ راست حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا ہے[1]

خدمت حدیث کے سلسلے میں شاہ ولی اللہؒ نے ازالۃ الخفاء میں حضرت فاروق اعظمؓ کا ایک کارنامہ یہ بھی بتایا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی تمام تر توجہ ان احادیث کی اشاعت پر صرف کی جن سے عبادات، معاملات یا اخلاق کے مسائل مستنبط ہوتے تھے۔

سنن ہدیٰ اور سنن زوائد میں امتیاز

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی چند در چند اعمال و افعال کا مجموعہ تھی اور آپ رسول اللہ ہونے کے ساتھ عربی ہونے اور قریشی ہونے کی بھی حیثیت رکھتے تھے اس لیے فاروق اعظمؓ نے ان سب حیثیتوں میں بھی ایک نمایاں امتیاز اور خطِ فاصل قائم کیا تاکہ سننِ ہدیٰ اور سننِ زوائد میں اختلاط اور التباس نہ ہو۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

فاروق اعظم نظر دقیق در تفریق بیان احادیث کہ بہ تبلیغ شرائع و تکمیل افراد بشر تعلق دارد از غیر آں مصروف ساخت لہٰذا احادیث شمائل آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم و احادیث سنن زوائد در لباس و عادات کمتر روایت مے کرد بدو وجہ۔ یکے آنکہ اینہا از علوم تکلیفیہ تشریعیہ نیست۔ محتمل کہ چوں اہتمام تام بروایت آں بکار برند بعض اشیاء از سنن زوائد بہ سنن ہدیٰ مشتبہ گردد[2]

فاروق اعظم نے دقتِ نظر سے دو قسم کی حدیثوں میں ایک جوہری فرق

---

[1] قرۃ العینین فی فضائل الشیخین [2] ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۱۴۱

قائم کیا اور بتایا کہ وہ حدیثیں کون سی ہیں جن کا تعلق شرائع سے ہے اور
وہ کون سی ہیں جو ان سے متعلق نہیں ہیں اسی لیے حضرت عمرؓ وہ احادیث
کم بیان کرتے جن کا تعلق سنن زوائد سے ہوتا اور اس میں دو وجہ
پیش نظر تھیں ایک یہ کہ سنن زوائد کا تعلق تشریع سے نہیں ممکن ہے
کہ ان کی روایت کا اہتمام لوگوں میں سنن زوائد اور سنن ہدیٰ میں اشتباہ
پیدا کر دے۔

شاہ صاحب نے قرۃ العینین میں بالکل درست لکھا ہے کہ فاروق اعظمؓ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ صحابہ کو خاص اسی مشن پر تمام اطراف مملکت میں روانہ فرمایا اور ان کو روایت کا طریقہ سکھایا اور روایتِ حدیث کی ان کو زیادہ سے زیادہ تحریص فرمائی اور رائے عامہ کو ان حضرات سے احادیث سیکھنے کی ترغیب دی اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کی پوری پوری نگرانی خود کی اور ان کی بیان کردہ حدیثوں کو جانچا اور پرکھا اور اس کے ساتھ ان محدثین کو قرآن و حدیث میں باہم ربط، قرآن میں آئی ہوئی عام بات کی سنت کے ذریعے تخصیص اور مجملاتِ قرآن کے لیے سنت کے ذریعے بیان کے قوانین سکھائے۔

اللہ اکبر! ایسے شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو حدیث بیان کرنے سے روکتے تھے۔ بزرگوں کے منہ سے نکلی ہوئی بات لوگ خود نہیں سمجھتے اور بزرگوں کو بدنام کرتے ہیں۔

میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا ایسا نہ ہو کہ دامانِ مقصود ہاتھ سے نکل جاتے میں بتا یہ رہا تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور احوال کا نام حدیث ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہؒ اس فن میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں اور کچھ بتانے سے پہلے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ امام اعظم کے بارے میں چند ضروری اور بنیادی باتیں ناظرین کے سامنے رکھوں۔

نام، کنیت اور لقب

نام نعمان، کنیت ابو حنیفہ اور لقب امام اعظم ہے۔ پیدائش کا سال ۸۰ھ مطابق ۶۹۹ء ہے ابن حجر مکی نے امام صاحب کو یہ کہہ کر اسم بامسمیٰ قرار دیا ہے کہ نعمان لغت میں دراصل اس خون کو کہتے ہیں جس پر بدن کا سارا ڈھانچہ قائم ہے اور جس کے ذریعے جسم کی ساری مشینری حرکت

کرتی ہے۔ اسی لیے رُوح کو بھی نعمان کہتے ہیں چونکہ امام اعظم[1] کی ذات گرامی اسلام میں قانون سازی کے فن کے لیے محور اور اس کے مدارک و مشکلات کے لیے مرکز ہے اس لیے آپ کا نام نعمان ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں فَاَبُوحَنِیْفَۃَ بِہٖ قِوَامُ الْفِقْہِ[2] (ابوحنیفہ فقہ کا آسرا ہیں) سُرخ اور خوشبودار گھاس کو بھی نعمان کہتے ہیں اور امام صاحب کی کمالاتی مہک اور لہک سے اسلامی زندگی کا ہر گوشہ متاثر ہے۔

طَابَتْ خِلَالُہٗ وَ بَلَغَ الْغَایَۃَ کَمَالُہٗ[3]

عادات میں پاکیزگی اور کمال انتہا کو پہنچ گیا۔

ابن حجر ہیتمی[4] نے یہ بھی لکھا ہے کہ نُعمان فُعلان کے وزن پر نعمت سے بنا ہے۔ اسم گرامی میں معنوی رعایت یہ ہے کہ آپ کی ذات گرامی مخلوق خدا کے لیے ایک نعمت ہے اسی لیے آپ کا

---

[1] ابوحنیفہ کو امام اعظم کہنے والے صرف احناف ہی نہیں بلکہ یگانے اور بیگانے سب ہی ان کو اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ حافظ ذہبی نے تذکرہ میں، حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے الروض الباسم میں اور ملک العلماء عزالدین بن عبدالسلام نے قواعد الاحکام میں اسی لقب سے پکارا ہے اور کیوں نہ پکاریں جبکہ بقول حافظ محمد بن ابراہیم آپ کی علمی بزرگی، عدالت تقویٰ اور امانت تواتر سے ثابت ہے اور آپ کا علمی مقام تمام عالم اسلامی میں شرقاً و غرباً سنہ ۱۵۰ھ سے آج تک علماء میں مانا ہوا ہے۔

[2] الخیرات الحسان ص ۱۰ [3] الخیرات الحسان

[4] پورا نام احمد بن محمد بن علی بن حجر ہے۔ ان کو الہیثمی مصر غربی میں ایک شہر کے محلہ ابی الہیثم میں بود و باش کی وجہ سے کہتے ہیں اور قبیلہ بنی اسعد سے نسبی تعلق کی وجہ سے ان کو اسعدی بولتے ہیں (النور السافر فی القرن العاشر) رجب سنہ ۹۰۹ھ میں ولادت ہوئی بچپنے ہی میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا یتیمی کا سارا وقت عارف باللہ شمس الدین بن ابی الحمائل اور امام شمس الدین الشناوی کی کفالت میں گزارا، الشناوی ان کو ابی الہیثم سے مقام قطب الشریف میں لے گئے ابتدائی کتابیں اسی جگہ پڑھیں پھر جامع ازہر میں داخل ہو گئے اچھے اور مہربان اساتذہ کی آغوش میں تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، فلسفہ، منطق اور فرائض میں خاص مہارت پیدا کی سنہ ۹۳۳ھ کے آخر میں مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور حج کے بعد واپس آ گئے لیکن سنہ ۹۴۰ھ میں گھر بار سمیت مکہ معظمہ میں ڈیرا لگا لیا اور تا وفات یہیں درس و افتاء کا کام کیا ان کی تصانیف میں بڑی مفید کتابیں ہیں تاریخ وفات سنہ ۹۹۵ھ ہے۔ مناقب امام اعظم پر الخیرات الحسان کے نام سے کتاب لکھی ہے مسلک کے لحاظ سے شافعی ہیں۔

نام نامی نعمان ہے۔ فرماتے ہیں۔

فَاَبُوْحَنِیْفَۃَ نِعْمَۃُ اللّٰہِ عَلٰی خَلْقِہٖ[1]

ابوحنیفہ مخلوق کے لیے اللہ کی نعمت ہے۔

آپ کی کنیت ابوحنیفہ ہے لغت میں حنیفہ حنیف کا مونث ہے۔ حنیف اسے کہتے ہیں جو سب سے ہٹ کر اللہ کا ہورہے۔ اسی بنا پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو حنیف کہتے ہیں۔ امام اعظم نے یہ کنیت اپنے لیے کیوں تجویز فرمائی ہے؟ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں یہ صرف تفاؤل کی وجہ سے اختیار کی گئی ہے جیسے عموماً ابوالمحاسن، ابوالحسنات، ابوالکلام وغیرہ کنیتیں رکھی جاتی ہیں ورنہ اس نام کی آپ کی کوئی صاحبزادی نہیں ہے۔

وَلَا یُعْلَمُ لَہٗ ذَکَرٌ وَلَا اُنْثٰی غَیْرُ حَمَّادٍ[2]

آپ کی کوئی لڑکی نہیں ہے اور نہ حماد کے سوا کوئی لڑکا

اور یہ محض قیاس آرائی ہے کہ عراقی زبان میں حنیفہ دوات کو کہتے ہیں اور آپ کا قلم و دوات سے چونکہ گہرا لگاؤ رہا ہے اس لیے آپ کو ابوحنیفہ کہتے ہیں۔

دراصل جیسے اشخاص میں حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف ہیں ایسے ہی ادیان میں ان کا دین حنیف اور ملل میں ان کی ملت حنیفہ ہے۔ حنیف دراصل وہ شخص کہلاتا ہے جو سب سے کٹ کر مولیٰ کا ہو رہے۔ اسی بنا پر غلط دین سے مٹنے اور کٹ کر اسلام اختیار کرنے والے کو حنیف کہتے ہیں۔ اسلام کو دینِ حنیف اور ملتِ حنیفہ کہتے ہیں حتیٰ کہ تحنّف مسلمان ہوجانے کے مترادف ہوگیا۔ زمخشری نے اساس البلاغہ میں اس کے سارے مجازات جمع کر دیے چونکہ امام اعظم میں دینِ حنیف اور ملتِ حنیفہ کی خدمت کا جذبہ و شوق شروع ہی سے تھا اور اسی جذبہ و شوق کی بنا پر آپ نے تمام فنون کی تکمیل کے بعد فن کاری کے لیے علم الشرائع کو اپنایا جس کے ذریعے پورے دین کی خدمت ہوسکے میری مراد علم الفقہ ہے اس لیے آپ نے ان ہی لطیف احساسات کے اظہار کی خاطر بربنائے تفاؤل اپنی کنیت ابوحنیفہ تجویز فرمائی۔ اصل میں ابوالملۃ الحنیفہ ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے زمخشری کے حوالہ سے لکھا ہے:

وَ تَدَ اللّٰہُ الْاَرْضَ بِالْاَعْلَامِ الْمُنِیْفَۃِ کَمَا وَطَّدَ الْحَنِیْفِیَّۃَ

---

[1] [2] الخیرات الحسان ص ۱۲

بِعُلُومِ اَبِی حَنِیْفَۃَ۔ اَلْاَئِمَّۃُ الْجِلَّۃُ الْحَنَفِیَّۃُ اَزِمَّۃُ الْمِلَّۃِ الْحَنِیْفَۃِ اَلْجُوْدُ وَالْحِلْمُ حَاتِمِیٌّ وَاَحْنَفِیٌّ وَالدِّیْنُ وَالْعِلْمُ حَنِیْفِیٌّ وَحَنَفِیٌّ۔

اللہ تعالیٰ نے زمین کو بلند پہاڑوں سے جکڑ دیا اور دینِ حنیف کو علوم ابی حنیفہ کے ذریعے مضبوط بنا دیا۔ ائمہ احناف ہی ملت حنیفہ کی باگیں ہیں جیسے سخاوت حاتمی اور حلم احنفی ہے ایسے ہی دین حنیفی اور علم حنفی ہے[۱]

امام اعظمؒ کا نسب نامہ

مشہور مورخ ابن خلکان[۲] نے امام اعظمؒ کا سلسلہ نسب اس طرح لکھا ہے،

ابوحنیفہ نعمان پسر ثابت زوطی پسر ماہ[۳]۔ لیکن امام صاحب کے پوتے اسماعیل نے امام صاحب کا جو شجرہ نسب خود بتایا ہے وہ اس طرح ہے۔ نعمان پسر ثابت نعمان پسر مرزبان[۴]۔ دونوں درست ہیں فرق ہے تو صرف یہ کہ ابن خلکان نے جس شخص کو زوطی اور امام صاحب کے پوتے نے جسے نعمان قرار دیا ہے ایک ہی شخص کے دو نام ہیں کیونکہ جو شخص مسلمان ہونے سے پہلے زوطی ہے وہی مسلمان ہونے کے بعد نعمان ہے۔ اسی طرح جس شخص کا نام ماہ ہے اسی کا لقب مرزبان ہے۔ کچھ بھی ہو آپ

---

[۱] الروض الباسم ج ۱ ص ۱۵۹ [۲] قاضی القضاۃ شمس الدین ابوالعباس احمد بن ابراہیم بن ابی بکر بن خلکان تاریخ پیدائش ۶۰۸ھ ہے۔ صحیح بخاری حافظ ابن مکرم سے پڑھی ہے المویدطوسی بھی ان کے اساتذہ میں سے ہیں علم الفقہ موصل میں الکمال بن یوسف سے اور شام میں ابن شداد سے پڑھا ہے۔ بڑے بڑے جلیل القدر علماء سے استفادہ کیا ہے، شام میں پورے دس سال منصب قضا پر فائز رہے اور ایک عرصہ مصر میں گزارا۔ ان کی تصانیف میں سب سے زیادہ معرکہ کی کتاب وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان ہے لفظ خلکان کی اصلیت اور اس نام سے شہرت کی علماء نے مختلف توجیہات کی ہیں عبدالقادر العیدروس نے النور السافر میں قطب الدین مکی سے نقل کیا ہے کہ لفظ خلکان دو فعلوں سے مرکب ہے اول تخلیہ سے خلِ امر اور دوم کون سے کان فعل ماضی اور تلفظ بکسر لام ہے اور وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ خلکان کا تکیہ کلام یہ تھا کہ کان والدی کذا۔ لوگوں نے تنگ آکر کہا کہ خل کان (کان کو چھوڑ) بس یہیں سے خلکان نام پڑ گیا۔ الیافعی نے مرآۃ الجنان میں تاریخ وفات ۶۸۲ھ بتائی ہے۔

[۳]، [۴] اوجز المسالک ج ۱ ص ۵۶

عجمی اور قبیلہ تیم سے نسبت ولاء کی وجہ سے تیمی ہیں جس طرح امام بخاری کو اسی تعلق کی بنا پر جعفی اور امام ابن ماجہ کو ربعی کہا جاتا ہے ایسے ہی امام صاحب کو تیمی کہتے ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

علامہ نودی[1] نے تہذیب الاسماء واللغات کے مقدمہ میں تصریح کی ہے کہ لفظ مولیٰ[2] زیادہ تر دوستی کے عہد و پیمان یعنی مولی الموالات کے معنے میں استعمال ہوتا ہے تاہم مولی چونکہ غلام کو بھی کہتے ہیں اس لیے امام اعظم کے بارے میں بعض لوگوں کو دھوکہ ہوا ہے اور وہ مولی کے معنے غلام کے سمجھ بیٹھے لیکن چونکہ خود امام صاحب کی اپنی تصریح موجود ہے کہ یہ نسبت دوستی کے عہد و پیمان کی نسبت ہے اس لیے اب دوسرے احتمال کی گنجائش نہیں ہے چنانچہ امام طحاوی مشکل الآثار میں جو فن حدیث میں اپنے موضوع پر بے مثال کتاب ہے عقد موالات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> عبداللہ بن یزید کہتے ہیں میں امام ابوحنیفہ کے پاس گیا انہوں نے مجھ سے پوچھا تم کون ہو، میں نے عرض کیا کہ ایسا شخص جس پر اللہ نے اسلام کے ذریعے احسان کیا یعنی نو مسلم۔ امام صاحب نے فرمایا یوں نہ کہو بلکہ ان قبائل میں سے کسی سے تعلق پیدا کرلو پھر تمہاری نسبت بھی

---

[1] ابوزکریا کنیت، محی الدین لقب، یحییٰ بن اشرف نام ہے تاریخ ولادت محرم الحرام ۶۳۱ھ ہے۔ دمشق کے مضافات میں "نوی" نامی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ نودی اور نواوی دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ ۶۴۹ھ میں دمشق تشریف لے گئے اور علامہ کمال الدین مغربی کے پاس رہے اور ان کے فیض صحبت سے اس درجہ علمی کمال کے مالک ہوگئے کہ فنون میں محقق اور حافظ حدیث تھے۔ ساری عمر بغیر شادی کے گزار دی ایک لمحہ بھی بیکار نہ تھے شب و روز تین ہی کام تھے مطالعہ، تصنیف اور ذکر الٰہی، کھانا چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار نوش فرماتے مدرسہ اشرفیہ میں شیخ الحدیث تھے۔ آپ کی تصانیف میں شرح صحیح مسلم، الروضہ، شرح المہذب، کتاب الاذکار، اور ریاض الصالحین مشہور ہیں۔ تاریخ وفات ۲۴ رجب ۶۷۶ھ ہے۔

[2] حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ مولی صرف غلام ہی کو نہیں کہتے ہیں بلکہ ولاء اسلام، ولاء حلف اور ولاء لزوم کو بھی ولاء کہتے ہیں اور ان تعلقات والوں کو موالی کہا جاتا ہے امام بخاری کو ولاء اسلام کی وجہ سے جعفی، امام مالک کو ولاء حلف کی وجہ سے تیمی اور مقسم کو حضرت عبداللہ بن عباس کے پاس زیادہ رہنے کی وجہ سے مولی ابن عباس کہتے ہیں۔

ان کی طرف ہو گی میں خود بھی ایسا ہی تھا[1]

یہ عبداللہ بن یزید امام اعظم کے شاگرد ہیں چنانچہ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ سمع من ابن عون وابی حنیفہ، یہ ابن عون اور ابوحنیفہ کے شاگرد ہیں[2] فن حدیث میں ان کا شمار امام بخاری کے اساتذہ میں ہے[3]۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بتا یہ رہا تھا کہ امام اعظم کو تیمی غلامی کی وجہ سے نہیں بلکہ دوستی کے عہد و پیمان کی وجہ سے کہتے ہیں۔ الصیمری[4] نے مناقب میں اور الخطیب نے تاریخ بغداد میں امام صاحب کے پوتے اسماعیل بن حماد کا یہ بیان لکھا ہے کہ:

میں اسماعیل پسر حماد پسر نعمان پسر ثابت پسر نعمان پسر مرزبان ابناء فارس سے ہوں اور ہم آزاد ہیں واللہ ہم پر غلامی کا دور کبھی نہیں آیا ہے[5]

اس تاکیدی اور قسم والے بیان سے اس غلط شہرت کی تردید ہوتی ہے جو امام صاحب کے دادا کے بارے میں پیدا ہو گئی ہے کہ وہ بنی تیم کے آزاد کردہ غلام تھے اور اس غلط فہمی کا سرچشمہ ابوحازم[6] عبدالحمید کا وہ بیان ہے جو حافظ ذہبی نے مناقب میں درج کیا ہے لیکن اس بیان کا محور دکر

---

[1] مشکل الآثار ج ۴ ص ۵۴ [2]، [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۴

[4] الصیمری صیمر بروزن حیدر ہے اور اس کی صیمری نسبت ہے صیمر ایک شہر کا نام ہے۔ پورا نام الحسین بن علی بن محمد بن جعفر ہے ابوعبداللہ کنیت ہے۔ صیمری صرف پانچ واسطوں سے امام محمد کے شاگرد ہیں خطیب بغدادی ان کے تلامذہ میں سے ہیں۔ خطیب نے امام صیمری کی زبانی لکھا ہے کہ میں نے حافظ دار قطنی سے ان کی کتاب السنن کا سماع کیا ہے۔ ان کی تاریخ وفات اتوار کا دن ۲۱ شوال ۴۳۶ھ اور ولادت ۳۵۱ھ ہے۔ خطیب نے ان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ صدوق، وافر العقل، جمیل المعاشرۃ، عارف بحقوق اہل العلم، حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں کہ بمقام ربع الکرخ منصب قضا پر تا وفات فائز رہے ہیں۔ امام ابوالولید الباجی فرماتے ہیں کہ بغداد میں ان کو احناف کی امامت حاصل تھی اور لکھا ہے کان قاضیاً عالماً خیراً۔ مولانا عبدالحی نے الفوائد البہیہ میں بتایا ہے کہ صیمری نے امام اعظم کے حالات پر ایک ضخیم کتاب اخبار ابی حنیفہ کے نام سے لکھی ہے۔ الجواہر المضیۃ ج ۱ ص ۲۱۴، الفوائد البہیہ ص ۶۷ [5] التعلیقات علی المناقب ص ۸۔

[6] پورا نام عبدالحمید بن قاضی عبدالعزیز ہے موصوف صرف ایک واسطہ سے امام محمد کے شاگرد ہیں اور حافظ ابوجعفر طحاوی کے استاد ہیں۔ ملا علی قاری نے ان کی تاریخ وفات ۲۹۲ھ لکھی ہے حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ بہترین قاضی اور بلند پایہ فقیہ تھے امانت و دیانت میں بے مثال تھے ابن الجوزی نے المنتظم میں ان کے آثار جمیلہ کے بڑے گن گائے ہیں۔ المحاضر، کتاب ادب القاضی اور کتاب الفرائض ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

جسے قرار دیا گیا ہے وہ بے نام ہے اس لیے گمنام شخص کی بات پر فیصلے کی بنیاد رکھنا قرین انصاف نہیں ہے جب کہ خود امام صاحب اور ان کے پوتے کا بیان اس موضوع پر موجود ہے اور اس باب میں اس سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے جس موالات کا تاریخ میں تذکرہ ہے وہ ولاء محبت و مودت ہے۔ ولاء عتاق نہیں ہے۔ اس زمانے کا دستور تھا کہ جب کوئی نو مسلم مشرف بہ اسلام ہوتا تو وہ جس قبیلہ کے کسی شخص سے عقد موالات یعنی دوستی و قرابت کا عہد و پیمان کرتا اسی قبیلہ کی طرف منسوب ہو جاتا اور اس کا حلیف و مولیٰ کہلاتا۔ بالتصریح تو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ عقد موالات کس نے کیا تھا۔ امام صاحب کے والد کے بارے میں ملا علی قاری فرماتے ہیں:

وُلِدَ اَبُوْهُ ثَابِتٌ عَلَى الْاِسْلَامِ [1]

ان کے والد ثابت مسلمان پیدا ہوئے۔

اس لیے قیاس یہی چاہتا ہے کہ زوطی نے مسلمان ہونے کے بعد یہ تعلق قائم کیا ہوگا۔ زوطی کا اسلامی نام نعمان ہے۔ حضرت امام صاحبؒ کے پوتے اسماعیل بن حماد کا یہ بیان بھی ہے کہ ہمارے پردادا ثابت حضرت علیؓ کے پاس گئے۔ حضرت علیؓ نے ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں دعا کی تھی[2]۔ ابن حجر ہیثمی نے خود اسماعیل کا اس دعا کے بارے میں یہ تاثر لکھا ہے:

ہمیں امید ہے کہ اللہ سبحانہ نے ہمارے بارے میں حضرت علی کی یہ دعا ضرور قبول فرمائی ہے[3]

بالفاظ دیگر امت کو حضرت امام اعظم امیر المومنین علی مرتضیٰ کی دعاؤں کے صدقے میں ملے ہیں۔ ملا علی قاری نے بھی مناقب امام میں اسماعیل بن حماد کا یہ بیان نقل کیا ہے[4]

امام اعظمؒ کے متعلق نبوی پیش گوئی

بہر حال امام اعظم عجمی ہیں۔ ماہ یا مرزبان آپ کے پردادا کا نام فارسی ہے اس لیے آپ کا نسل فارس سے ہونا یقینی ہے۔

فارس کے بارے میں صحیحین اور جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ کے حوالے سے جناب رسول اللہ

---

[1] الجواہر المضیۃ ج ۲ ص ۴۵۲ [2] عمدۃ الرعایہ ص ۳۴
[3] الخیرات الحسان [4] مناقب امام لملا علی قاری مسلکہ الجواہر المضیۃ ج ۲ ص ۴۵۴

صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے اسی صحبت میں سورۃ جمعہ نازل ہوئی جب آپ نے یہ آیت پڑھی۔ وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ حاضرین میں سے کسی نے عرض کیا کہ یہ دوسرے کون ہیں؟ جو ابھی تک ہم سے نہیں ملے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں خاموشی اختیار فرمائی پوچھنے والے نے یہی سوال دوبارہ کیا سہ بارہ کیا تب آپ نے حضرت سلمان فارسی کے کاندھے پر دست مبارک رکھ دیا اور فرمایا کہ لَوْ کَانَ الْاِیْمَانُ عِنْدَ الثُّرَیَّا لَنَالَهٗ رِجَالٌ مِّنْ هٰٓؤُلَاءِ اگر ایمان کہکشاں میں بھی ہوگا تو ان کے کچھ آدمی ضرور اسے پالیں گے۔

مسند احمد میں ایک اور سند کے ساتھ یہ الفاظ آتے ہیں:

لَوْ کَانَ الْعِلْمُ بِالثُّرَیَّا لَتَنَاوَلَهٗ نَاسٌ مِّنْ اَبْنَاءِ فَارِسَ

اگر علم ثریا میں ہو تو فارسی لوگ اسے پالیں گے۔

ابونعیم اصفہانی، الشیرازی، الطبرانی اور امام مسلم نے یہی حدیث بالفاظ مختلفہ روایت کی ہے۔[1]

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیش گوئی کا ایک مصداق شارحین حدیث نے امام اعظمؒ کو قرار دیا ہے حافظ سیوطی فرماتے ہیں فَهٰذَا اَصْلٌ صَحِیْحٌ یُعْتَمَدُ عَلَیْهِ فِی الْبِشَارَةِ[2] (بشارت میں یہ قابل اعتماد اصل صحیح ہے)، حافظ ابن حجر مکیؒ نے حافظ سیوطی کے بعض شاگردوں[3] کے حوالے سے

---

[1] حافظ ابونعیم اصفہانی نے "تاریخ اصفہان" میں اس حدیث کے سارے طرق جمع کر دیے ہیں۔ امام بخاری کے الفاظ آپ پڑھ چکے، امام مسلم نے رجال کی جگہ رجل من ابناء فارس نقل کیے ہیں۔ امام احمد اور ترمذی نے ایمان اور دین کی جگہ العلم روایت کیا ہے۔ [2] تبییض الصحیفہ ص ۱۔

[3] بعض شاگردوں سے مراد سیرت شامیہ کے مصنف حافظ محمد بن یوسف شامی ہیں۔ علامہ ابن عابدین الشامی نے مواہب کے حاشیہ میں لکھا ہے العلامۃ الشامی تلمیذ الحافظ السیوطی، جناب علامہ نواب صدیق حسن خاں نے اتحاف میں یہاں پر حافظ سیوطی اور حافظ محمد بن یوسف پر سخت برہمی کا مظاہرہ کیا کہ انہوں نے اس حدیث کا مصداق خاص امام اعظمؒ کو کیوں قرار دیا ہے اور عون الباری علی ادلۃ البخاری میں اس پیش گوئی

(باقی صفحہ ۱۳۶ پر)

لکھا ہے کہ:

ہمارے استاد نے یقین کیا کہ اس حدیث سے امام ابوحنیفہ ہی مراد ہیں، کیونکہ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ امام صاحبؒ کے زمانے میں اہلِ فارس میں سے کوئی بھی امام صاحبؒ کے علمی مقام کو نہیں پہنچ سکا اور آپ تو آپ بلکہ آپ کے تلامذہ کا بھی کوئی مقام نہ پا سکا[1]

صرف حافظ جلال الدین السیوطی اور حافظ محمد بن یوسف ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ دوسرے محققین نے بھی حدیث کا مصداق امام اعظم ہی کو قرار دیا ہے۔ علامہ حفنی فرماتے ہیں:

حَمَلَہٗ بَعْضُ الْمُحَقِّقِیْنَ عَلٰی اَبِیْ حَنِیْفَۃَ۔[2]

بعض محققین نے اسے امام ابوحنیفہ پر محمول کیا ہے۔

اور علامہ عزیزی لکھتے ہیں کہ:

عَلَی الْاِمَامِ الْاَعْظَمِ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ وَاَصْحَابِہٖ[3]

اس کا مصداق امام اعظم اور ان کے اصحاب ہیں۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث[4] اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں:

ایک روز اس حدیث پر ہم نے گفتگو کی میں نے کہا کہ امام ابوحنیفہ اس حکم میں داخل ہیں کیونکہ اللہ سبحانہٗ نے علمِ فقہ کی اشاعت ان کے ہاتھوں

(ص۱۲۵ کا بقیہ حاشیہ): - کو صرف زمرۂ محدثین تک محدود رکھا ہے لیکن شاہ ولی اللہ نے محدثین کے ساتھ فقہاء کو بھی شامل کر لیا ہے اور شاہ صاحب کے مشہور شاگرد بیہقیِ وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی مرحوم نے اس کو اور زیادہ عام کر کے فقہاء محدثین کے ساتھ مشائخ طریقت کو بھی اس کا مصداق بتایا ہے (مظہری ج ۳ ص ۲۵۸) اگرچہ ارشاد کے الفاظ رجال من ہؤلاء اس سے مانع نہیں ہیں مگر اس بشارت میں داخل ہونے کے لیے صرف توطن کافی نہیں ہے بلکہ نسلِ فارس سے ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ حدیث میں ابناء فارس کی صاف تصریح ہے اور معلوم ہے کہ توطن سے نسل تبدیل نہیں ہوتی ہے۔

[1] الخیرات الحسان ص ۱۴

[2]، [3] السراج المنیر ج ۳ ص ۲۱۸

[4] احمد نام، قطب الدین تاریخی نام، ولی اللہ عرف ہے۔ تیس واسطوں سے نسباً فاروقی ہیں۔ جزء لطیف میں فرماتے ہیں کہ ولادت چہار شنبہ کے روز ۴ شوال المکرم ۱۱۱۴ھ میں ہوئی ہے۔ حفظِ قرآن کے بعد درسی

(باقی ص۱۲۷ پر)

کرائی اور اہلِ اسلام کی اس کے ذریعے اصلاح فرمائی بالخصوص اس آخری
دور میں کہ دولت بس یہی مذہب ہے سارے شہروں میں بادشاہ حنفی
ہیں۔ قاضی حنفی ہیں اور مدرسین حنفی ہیں [1]

نواب صدیق حسن صاحب نے اتحاف النبلاء المتقین میں بہت کچھ چنیں وچناں کے بعد لکھا ہے کہ

ہم امام دراں داخل است وہم جملہ محدثین فرس [2]

لیکن "ہم جملہ محدثین" سے کیا مراد ہے؟ یہ بھی ان ہی کی زبانی سنیئے فرماتے ہیں کہ

بہا بذہ محدثین مثل بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ وامثال
ایشاں۔

کیوں؟ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی ہے کہ

زیراکہ ہمہ ایشاں از عجم و سرزمین فارس بودند [3]

کیونکہ یہ تمام عجمی تھے اور زمین فارس سے تعلق رکھتے تھے۔

حیرت ہے کہ نواب صاحبؒ نے جملہ محدثین کو ارشادِ نبوت کا مصداق بنانے کے شوق میں
عجمی اور فارسی بنا دیا حالانکہ تاریخ سے امام بخاری اور ابن ماجہ کے سوا کسی کا عجمی ہونا ثابت نہیں ہے۔

ط۱۲۶ (کا بقیہ حاشیہ)۔ کتابوں سے پندرہ سال کی عمر میں فراغت حاصل کر لی۔ حدیث پہلے ہندوستان میں الشیخ محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھی ہے۔ سنہ ١١٤٣ھ میں حج کو تشریف لے گئے۔ الشیخ طاہر مدنی سے صحیح بخاری کا سماع کیا۔ موطا، مسند دارمی اور امام محمد کی کتاب الآثار پڑھی۔ شاہ صاحب کی تصانیف علماء کے لیے مشعلِ ہدایت ہیں۔ شاہ صاحب اپنے دور کے مجتہد اور مسائل فرعیہ میں عملاً حنفی تھے اور صرف از خود ہی عملاً حنفی نہ تھے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ ایسا ہی رہنے کی مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی ہے۔ فیوض الحرمین میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت ان لفظوں میں لکھی ہے اِیَّاکَ اَنْ تُخَالِفَ الْقَوْمَ فِی الْفُرُوْعِ (اپنی قوم کے فروع میں اختلاف سے بچ کر رہو)، علامہ نواب صدیق حسن مرحوم نے الحطہ میں ان کے طریق علمی پر ایک جامع تبصرہ کے بعد لکھا ہے کہ طَرِیْقُہٗ کُلُّہٗ حَنَفِیٌّ اور صرف شاہ صاحب ہی نہیں بلکہ پورے خاندان کے بارے میں لکھا ہے کہ خاندان او حنفی بود۔ وہ مجدد تھے تاریخِ وفات "او بود امام اعظم دین"، ١١٧٦ھ ہے۔

[1] مکتوبات ص ١٦٨ [2]، [3] اتحاف النبلاء المتقین ص ٢٢٤

امام مسلمؒ کے متعلق خود امام نووی کی تصریح ہے کہ عَرَبِیٌّ صُلْبِیَّۃٌ کیونکہ وہ نسباً قشیری ہیں خود نواب صاحب فرماتے ہیں،

نِسْبَۃٌ اِلٰی قُشَیْرٍ مُصَغَّرًا قَبِیْلَۃٌ مَعْرُوْفَۃٌ مِّنَ الْعَرَبِ
عرب کے مشہور قبیلہ قشیر کی طرف اسم نسبت ہے۔

اور امام ابوداؤد عربی نژاد ہیں اور عرب کے مشہور قبیلے ازد سے تعلق کی وجہ سے ازدی ہیں۔ ترمذی قبیلہ بنی سلیم کی طرف نسبت کی وجہ سے سُلمی ہیں۔ محدّث حاکم ضبّی اور امام دارمی، بنی دارم کی طرف منسوب ہیں جو قبیلہ تمیم کی مشہور شاخ ہے اور امام المحدثین مالک بن انس خالصاً عربی ہیں اور امام احمد الشیبانی الذہلی ہیں۔ امام ذہبی نے تاریخ الاسلام میں امام احمدؒ کا پورا نسب ان کے صاحبزادے کی زبانی درج کیا ہے۔

انصاف فرمائیے کہ جملہ محدثین میں بخاری اور ابن ماجہ کے سوا کون سا محدث فارسی النسل ہے۔ اگر ایسا ہی ہے اور ایسا نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ تاریخ کی کھلی شہادت موجود ہے تو پھر واقعات کی روشنی میں اس ارشادِ نبوت کا اوّلین مصداق امام اعظمؒ کے سوا کون ہو سکتا ہے؟

امام اعظمؒ اور اعجازِ نبویؐ

بہرحال اگر یہ حدیث صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ صحیحین میں موجود ہے تو پھر

لہ ابوالحسین کنیت، عساکرالدین لقب، مسلم بن الحجاج نام ہے ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۵ سال کی عمر میں نصرآباد میں ۲۶۱ھ کو وفات پائی۔ علمی طلبگاریوں کے سلسلہ میں حجاز، عراق، شام اور مصر آپ کی جولانگاہ رہے ہیں۔ آپ کی تصانیف میں جلیل القدر تصنیف صحیح مسلم ہے۔ آپ نے اس کتاب کا انتخاب تین لاکھ ایسی روایات سے کیا ہے جن کو انہوں نے براہِ راست اپنے شیوخ سے سُنا تھا جیسا کہ محدث حاکم نے خود امام مسلم سے نقل کیا ہے حافظ مسلمہ بن قاسم نے اپنی تاریخ میں صحیح مسلم کے متعلق لکھا ہے کہ اسلام میں کسی نے ایسی کتاب تصنیف نہیں کی۔ (فتح الباری)

لہ کنیت ابوعبداللہ، نام احمد، امام بخاری نے آپ کو تاریخ میں الشیبانی الذہلی لکھا ہے۔ حافظ ذہبی نے تاریخ میں آپ کا پورا حال لکھا ہے اور بتایا ہے کہ آپ مازن بن شیبان بن ذہل کی اولاد سے ہونے کی وجہ سے عربی نژاد ہیں اس لیے آپ ذہلی بھی ہیں اور شیبانی بھی۔ سکونت کے لحاظ سے مروزی اور بغدادی ہیں۔ آپ کے اساتذہ کی فہرست بڑی طویل ہے۔

بتانے والوں نے اگر بتایا ہے کہ امام اعظم اس نبوی پیش گوئی کا مصداق اوّلین ہونے کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک اعجازی کارنامہ ہیں تو اس میں مبالغہ ہی کیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر ہیثمی نے لکھا ہے:

فِیْہِ مُعْجِزَۃٌ ظَاھِرَۃٌ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَخْبَرَ بِمَا سَیَقَعُ۔[1]

اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کھلا معجزہ ہے۔ آپ نے ہونے والی بات کا پتہ دیا ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظم کی برتری کے لیے یہ شرف کافی ہے کہ وہ نبوت کا معجزہ ہیں۔ اور اس سے بڑا شرف ہی کیا ہو سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی مکاتیب میں سے ہر مکتبِ فکر نے امام اعظم کے مناقب کو اپنے لیے زادِ راہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ شوافع میں حافظ جلال الدین السیوطی، حافظ ابن حجر مکی، حافظ ذہبی، ابن خلکان، الیافعی، علامہ نووی، امام غزالی اور حافظ ابن حجر عسقلانی، موالک میں سے حافظ ابن عبد البر اور حنابلہ میں سے علامہ یوسف بن عبد الهادی۔ الغرض اس نادرۃ الدہر کی بے ہمتائیوں کا یہ حال تھا کہ محدثین اور فقہا میں سے کوئی نہیں جس کی زبان ان کے مفاخر اور مآثر کے گیت نہ گا رہی ہو۔

الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء اور مناقب ذہبی سے اگر اس دور کے صرف ایسے علماء کی ایک فہرست تیار کی جائے جنہوں نے امام صاحب کے کمالِ علم و عمل کو سراہا ہے تو ان کی تعداد سو سے متجاوز ہو گی۔ مسعر بن کدام، ایوب السختیانی، سلیمان بن مہران، شعبۃ بن الحجاج، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، حماد بن زید، ابن ابی عروبہ، ابن شبرمہ، یحییٰ بن سعید القطان، ان خوبانِ زمانہ کے حسن و جمال پر کون نام دھر سکتا ہے۔ لیکن وہ سب یک زبان ہیں کہ امام اعظم جیسا جمال ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھا۔

امام اعظمؒ کی محبت سُنّی ہونے کی علامت ہے

یگانے اور بیگانے سب ہی متفق ہیں کہ کہنے والوں نے اس ذات گرامی کو معیارِ سنیت

---

[1] الخیرات الحسان ص ۶

بنا دیا اور برملا کہہ دیا کہ

مَنْ اَحَبَّ اَبَا حَنِیْفَۃَ فَھُوَ سُنِّیٌّ وَمَنْ اَبْغَضَہٗ فَھُوَ مُبْتَدِعٌ [1]

جو ابو حنیفہ سے پیار کرتا ہے وہ سنی ہے اور جو آپ سے بغض رکھتا ہے وہ بدعتی ہے۔

اور ان ہی کی زبانی مسلمانوں کو یہ پیغام ملا ہے کہ

ہمارے اور لوگوں کے درمیان ابو حنیفہ ہیں جو ان سے محبت و تعلق رکھتا ہے ہم جانتے ہیں کہ وہ اہل السنت ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے ہم یقین سے کہتے ہیں کہ وہ بدعتی ہے [2]

معلوم ہے کہ یہ کہنے والے کون ہیں اور کس وقت کہہ رہے ہیں؟ یہ حافظ عبد العزیز بن میمون ہیں۔ حضرت نافع، حضرت عکرمہ اور حضرت سالم کے سامنے ان کو زانوئے تلمذ طے کرنے کا شرف حاصل ہے۔ اور ان کے تلامذہ میں یحییٰ القطان، عبد اللہ بن المبارک، عبد الرزاق اور وکیع بن الجراح جیسے اساطین حدیث ہیں۔ ان کی وفات ۱۵۹ھ میں ہوئی ہے۔ یہ امام اعظم کے ایک معاصر کی شہادت ہے اور معاصر کی شہادت ہی سب سے بڑی شہادت ہوتی ہے۔ اسی بنا پر بڑے بڑے جلیل القدر ائمہ حدیث مسائل میں امام اعظم کا لوہا مانتے ہیں۔ حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم وفضلہ میں امام علی بن المدینی اور ملک الحفاظ یحییٰ بن معین کے استاد امام وکیع بن الجراح کے متعلق لکھا ہے کَانَ یُفْتِیْ بِرَأْیِ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ حافظ ابن کثیر اور امام ذہبی نے یحییٰ بن سعید القطان کے بارے میں بتایا ہے کَانَ یَحْیٰی بْنُ سَعِیْدٍ یَخْتَارُ قَوْلَہٗ فِی الْفَتْوٰی [3] سمجھ دار آدمی کے لیے اس میں یہ بات سوچنے کی ہے کہ یحییٰ القطان کی وفات اگر ۱۹۵ھ میں ہوئی ہے تو امام ابو حنیفہ کی تقلید ۱۹۵ھ سے پہلے شروع ہو چکی تھی عوام تو عوام یحییٰ جیسے اخص الخواص ان کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔ حافظ ابن عبد البر اور حافظ ابن کثیر نے تصریح کی ہے کہ امام یحییٰ القطان نے جامع صغیر باقاعدہ قاضی ابو یوسف سے سبقاً پڑھی ہے۔

---

[1] الجواہر المضیئۃ ج ۲ ص ۲۴۳ [2] الجواہر المضیئۃ ج ۱ ص ۱۸۲

[3] البدایہ ج ۷ ص ۱۵۷، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۲

یحییٰ امام عبدالرحمٰن بن مہدی اور امام احمد کے اُستادِ حدیث ہیں اور حدیث میں ان کی جلالت قدر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ میں نے یحییٰ جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ امام علی بن المدینی کہتے ہیں کہ علمِ رجال میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں۔ عباس دوری نے سید الحفاظ یحییٰ بن معین کے حوالے سے بتایا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

كَتَبْتُ الْجَامِعَ الصَّغِيْرَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَسَنِ [1]

میں نے جامع صغیر امام محمد سے لکھی ہے۔

یحییٰ بن معین کے امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابوزرعہ اور ابویعلیٰ شاگرد ہیں۔

رُخِ انور اور سراپائے امامت

سن آئے ہو کہ امام اعظم کی ولادت ۸۰ھ مطابق ۶۹۹ء بمقام کوفہ ہوئی۔ حافظ مزی نے تہذیب الکمال میں اور ابن خلکان نے تاریخ میں اسے راجح قرار دیا ہے۔ لیکن ایک روایت میں حافظ سمعانی اور ان کے ساتھ حافظ ابن حبان نے کتاب الجرح والتعدیل میں اور ابوالقاسم سمنانی نے روضۃ الصفا میں ۶۱ھ کو راجح بتایا ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر کی رائے میں یہی صحیح ہے ان کا دعویٰ ہے کہ آپ معمرین میں سے ہیں۔

جَاوَزَ التِّسْعِيْنَ فِي الْعُمُرِ [2]

عمر نوّے سے زیادہ ہے۔

حافظ ذہبی نے مشہور محدث ابونعیم الفضل بن دکین سے نقل کیا ہے کہ امام اعظم خوش رو، خوش پوش، خوش مجلس، کریم النفس، خوشبو پسند اور اپنے رفقاء کے بڑے ہی ہمدرد تھے [3]۔
امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ امام صاحب کا قد میانہ تھا نہ بہت لانبے تھے اور نہ کوتاہ، نہایت شیریں زبان، بڑے دلکش اور قادر الکلام تھے [4]۔

امام اعظم کے پوتے اسماعیل بن حماد فرماتے ہیں کہ امام اعظم کسی قدر دراز قد تھے۔ آپ کے رنگ پر گندم گونی غالب تھی، اچھا لباس پہنتے، عام زندگی میں اچھی حالت میں رہتے، خوشبو کا اتنا استعمال کرتے تھے کہ آپ کی نقل و حرکت کا اندازہ خوشبو کی مہک سے ہوتا تھا [5]۔

---

[1] لسان المیزان ج ۵ ص ۱۲۱ [2] الروض الباسم ج ا ص ۱۹۲ [3] المناقب ج ۳ ص ۸ [4] صدر الائمہ مکی
[5] الخیرات الحسان ص ۴۰

امام اعظمؒ تابعی ہیں

اللہ سبحانہ کی مخلوقات میں سب سے برتر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے ۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

آپ کے بعد اولوالعزم[1] من الرسل ہیں ان کے بعد باقی انبیاء کا مقام ہے ۔ انبیاء کے بعد صحابہ کرام اور صحابہ کے بعد تابعین عظام سے اونچا کوئی مقام نہیں ہے ۔

اسلام میں صحابہ کا مقام

صحابہ اور تابعین کو قرآن حکیم میں اللہ سبحانہ نے اپنی دائمی خوشنودی کا پروانہ عنایت فرمایا ہے :

وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ
اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے اور وہ لوگ جنہوں نے ان کی خوبی کے ساتھ پیروی کی ۔ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے ۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے بتایا ہے کہ جن مہاجرین نے ہجرت میں اولیت اور سبقت کا شرف حاصل کیا اور جن انصار نے نصرت و اعانت میں پہل کی اور وہ لوگ جنہوں نے نیکوکاری اور حسن نیت سے ان پیش روان اسلام کی پیروی کی ہے ۔ ان سب کو اللہ سبحانہ کی خوشنودی کا پروانہ مل چکا ہے ۔ قرآن کی یہ آیت صحابہ کی عدالت ، ثقاہت ، صداقت اور دیانت کی کھلی شہادت ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر مدار اسلام ہے اور ان پر جرح کرنا دین کی پوری عمارت گرا دینے کے مترادف ہے ۔

چنانچہ ملا علی القاری فرماتے ہیں :

---

[1] اولوالعزم من الرسل کی تعداد میں علماء کا اختلاف ہے حافظ سیوطی نے قول صحیح کے مطابق پانچ بتائے ہیں نوح ، ابراہیم ، موسیٰ ، عیسیٰ اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۔

اولوالعزم نوح و الخلیل الممجد ۔۔۔ و موسیٰ و عیسیٰ و الحبیب محمد

اَلصَّحَابَۃُ کُلُّہُمْ عُدُوْلٌ مُطْلَقًا بِظَوَاھِرِ الْکِتَابِ وَالسُّنَّۃِ وَاِجْمَاعِ مَنْ یَعْتَدُّ بِہٖ[1]

تمام صحابہ بلا قید عادل ہیں۔ قرآن و سنت اور اُمت کی اجتماعی قوت کا تقاضا یہی ہے۔

امام ابن الاثیر عزالدین علی بن محمد الجزری ۶۳۰ھ فرماتے ہیں :

اَلصَّحَابَۃُ یُشَارِکُوْنَ سَائِرَ الرُّوَاۃِ فِیْ جَمِیْعِ ذٰلِکَ اِلَّا فِی الْجَرْحِ وَالتَّعْدِیْلِ فَاِنَّہُمْ کُلُّہُمْ عُدُوْلٌ۔[2]

صحابہ ان تمام میں راویوں کے شریک ہیں لیکن ان کی جرح و تعدیل سے بحث نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ عادل ہیں۔

---

[1] مرقات ج ۵ ص ۵۱۷۔ [2] عدول عادل کی جمع ہے۔ عدالت عربی زبان کا مصدر ہے اس کے خاص معنے ہیں اس لیے اس کے اصطلاحی اطلاقات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

۱۔ عدل ظلم و جور کے مقابلے میں بولا جاتا ہے اس وقت اس کے معنے معاملات و حقوق میں انصاف برتنے کے ہیں مثلاً سلطان عادل، حکومت عادلہ، یہ علم الاجتماع کی اصطلاحی عدالت ہے۔

۲۔ عدل فسق و عصیان کے مقابلے میں بھی بولا جاتا ہے کہتے ہیں نماز میں امام عادل ہو یعنی متقی ہو فاسق نہ ہو یہ فقہاء کی اصطلاح ہے۔

۳۔ عدل کے معنے اس ملکہ کے بھی آتے ہیں جو گناہوں سے دور رکھے یہ علم کلام کی اصطلاح ہے۔

۴۔ عدل کے معنے گناہوں سے محفوظ ہونے کے بھی آتے ہیں یہ خالص علم تصوف کی اصطلاح ہے۔

۵۔ عدل کے معنے بالارادہ روایت میں جھوٹ سے بچنے کے آتے ہیں یہ اصطلاح محدثین ہے اور یہی معنے اس وقت مراد ہوتے ہیں جب حدیث کے فن میں راویوں کی عدالت کا دعویٰ کیا جاتا ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ پوری تلاش و جستجو کے بعد یہ ثابت ہو چکا ہے کہ صحابہ کرام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جھوٹ کو سخت گناہ اور عیب سمجھتے تھے اور اس سے بہت محتاط رہتے تھے اس لیے عدالت نام ہے روایت میں جھوٹ سے بچنے اور ہر ایسے عمل سے دور رہنے کا جس سے روایت پر کوئی حرف آتا ہو۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر الروض الباسم میں امام شافعی سے نقل کرتے ہیں کہ اگر عادل بے گناہ کو کہتے ہیں تو پھر انبیاء کو مستثنیٰ کرنے کے بعد پورے انسانی معاشرے میں کوئی عادل نہیں ہے اور اگر ہر گنہگار عادل ہے تو پھر مجروح و مقدوح کوئی نہیں اس لیے عادل وہ ہے جس کا دامن

(باقی ص ۱۳۴ پر)

تابعین کی بزرگی

صحابہ کرام کے بعد تابعین بھی اسلام میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ چند ارشادات نبوت ہدیہ ناظرین ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ[۱] فرماتے ہیں۔

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ يَجِيْئُ اَقْوَامٌ تَسْبِقُ شَهَادَةُ اَحَدِهِمْ يَمِيْنَهٗ وَيَمِيْنُهٗ شَهَادَتَهٗ

حضور انور فرماتے ہیں کہ بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں بعد ازیں وہ جو ان کے بعد آئیں گے پھر جو ان کے بعد آئیں گے اس کے بعد ایسی قومیں رونما ہوں گی جن کی شہادت قسم سے آگے اور قسم شہادت سے پیش پیش ہوگی۔[۲]

ص ۱۳۳ کا بقیہ حاشیہ)، کبائر کی آلودگی سے پاک ہو اور جس کی زندگی میں نیکیاں غالب ہوں امام نووی نے روضہ میں یہی معنے نقل کیے ہیں۔ الغرض ارباب حدیث کے یہاں عدالت یہ ہے کہ بیان روایت میں جان بوجھ کر جھوٹ نہ بولے اور اس کے دامن میں نیکیاں زیادہ ہوں۔ امام غزالی فرماتے ہیں عدالت دینی زندگی میں سیرت کی استقامت کو کہتے ہیں۔ حافظ ابن الہمام لکھتے ہیں کہ عدالت کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ دامن کبائر سے اور صغائر پر اصرار سے پاک ہو اور ان چیزوں سے محتاط ہو جو وقار کے منافی ہوں۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں عادل وہ ہے جس میں ایسا ملکہ ہو جو اس کو ملازم تقویٰ و مروت بنا دے۔ علامہ جزائری رقمطراز ہیں کہ عدالت کے بھی مراتب ہیں۔

[۱] عبداللہ نام اور ابو عبدالرحمٰن کنیت ہے والد کا نام مسعود اور ہذیل قبیلہ سے نسبی تعلق رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص اور بدریین میں سے ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو تذکرۃ الحفاظ میں الامام الربانی، الفقیہ اور مقری کے بابرکت القاب سے پکارا ہے روایت حدیث میں حد درجہ محتاط تھے۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ اسلام لانے والوں میں ان کا چھٹا نمبر تھا مکہ میں سب سے پہلے باواز بلند قرآن خوانی کرنے والے یہی تھے۔ ان کو دونوں ہجرتوں حبشہ اور مدینہ کی سعادت حاصل ہے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا تھا کوفہ میں دینی تعلیم کی اساس حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی ہیں حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ امام اعظم کے فقہ کی بنیاد حضرت عبداللہ بن مسعود کے فتاوی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان فیصلوں پر ہے جن کو تلامذہ ابن مسعود مانتے ہوں اور جانتے ہوں۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

[۲] اسد الغابہ ج ۱ ص ۲

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

سَأَلَ رَجُلٌ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّ النَّاسِ خَيْرٌ
قَالَ الْقَرْنُ الَّذِي أَنَا فِيهِ ثُمَّ الثَّانِي ثُمَّ الثَّالِثُ

ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے اچھے لوگ کون ہیں؟ فرمایا میرے زمانے کے پھر دوسرے کے پھر تیسرے کے۔[۱]

حضرت امام محی الدین ابوزکریا النووی خیرالقرون کی حدیث پر نوٹ لکھتے ہیں:

دُرست یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دور صحابہ کا زمانہ ہے دوسرا تابعین کا تیسرا اتباع تابعین کا۔[۲]

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرن سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا زمانہ مراد ہے۔[۳]

جناب علامہ مولانا صدیق حسن خاںؒ فرماتے ہیں:

یہی صدرِ اوّل اور سلف صالح ہیں۔ ان ہی کو ہر موضوع پر بطورِ دلیل پیش کیا جا سکتا ہے ان ہی پر دین کی زندگی میں اعتماد ہے۔ دینی زندگی کے سارے احوال، اعمال، اخلاق اور احکام میں یہی سند ہیں۔[۴]

ان تینوں دوروں میں دورِ اوّل یعنی زمانہ صحابہ (جو ۱۱۰ھ تک ہے) کمالِ علم، کمالِ ایمان کے لحاظ سے دوسرے اور تیسرے دور سے افضل ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

قرنِ اوّل کمالِ علم اور کمالِ ایمان میں ایسے مقام پر تھا کہ قرنِ ثانی اور قرنِ ثالث کی وہاں تک رسائی نہیں ہوئی۔[۵]

ایک دوسرے موقعہ پر لکھتے ہیں:

ان تینوں دوروں میں بہترین دور ان لوگوں کا ہے جن کی نگاہوں

---

[۱] صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۱۰ [۲] شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۰۹
[۳] فتح الباری ج ۱ ص ۴۴ [۴] الحطہ ص ۲۲
[۵] شرح العقیدۃ الاصفہانیہ ص ۱۳۷

نے جمالِ جہاں آرا کا بحالتِ ایمان مشاہدہ کیا ہے۔ یہی لوگ حق و باطل میں فرق کو سب سے زیادہ جاننے والے، حق کے سب سے زیادہ ماننے والے، حق کے سب سے زیادہ فریفتہ، باطل کے بیری اور حق کی خاطر سب سے زیادہ جان کھپانے والے ہیں۔ بعد میں آنے والوں کے مقابلے میں علم و دیانت، سرفروشی و حق آشنائی، حق پذیری اور حق کی خاطر مصائب کے استقبال میں سب سے پیش پیش ہیں۔[1]

حضرت امام اعظم کی پیدائش دورِ نبوت یعنی ۸۰ھ مطابق ۶۹۹ء میں ہوئی ہے۔ آخری صحابی کی وفات کے وقت یعنی ۱۱۰ھ میں آپ کی عمر تیس سال ہے اور اگر حافظ سمعانی، حافظ

---

[1] النبوات ص ۸۵۔ یاد رہے کہ جمہور کا تو یہی خیال ہے کہ قرنِ اول سے زمانہ صحابہ، قرنِ ثانی سے زمانہ تابعین اور قرنِ ثالث سے زمانہ اتباعِ تابعین مراد ہے لیکن ازالۃ الخفاء میں حکیم الامت نے جدید تحقیق فرمائی ہے کہ "قرنِ اول زمانہ آنحضرت ﷺ بود از ہجرت تا وفات و قرنِ ثانی زمانہ شیخین و قرنِ ثالث زمانہ ذی النورین"۔ ایک دوسرے موقعہ پر فرماتے ہیں کہ "قرنِ اول زمانہ ہجرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم است تا زمانِ وفات و قرنِ ثانی از ابتدائے خلافتِ صدیق تا وفات فاروق و قرنِ ثالث قرنِ حضرت عثمان"۔ شاہ صاحب نے جمہور سے الگ اپنے اس دعوے کی توجیہ یہ بتائی ہے کہ قرن لغت میں ان لوگوں کو کہتے ہیں جو عمر میں قریب قریب ہوں اور عرف میں ان لوگوں کو بھی کہتے ہیں جو ریاست و خلافت میں قریب قریب ہوں۔ جب خلیفہ دوسرا ہوا اور وزیر و سردار بھی دوسرا ہو فوجی افسر سپاہی اور شہری بھی اور ہوں تو قرن بدل جاتا ہے (ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۲۸۷) یہ تو لغت اور عرف کے لحاظ سے قرن کی توجیہ ہے اس کے علاوہ جو محدثانہ تحقیق فرمائی ہے وہ بھی گوش گزار فرما لیجئے فرماتے ہیں۔ "جب ہم ان تمام روایات کو جو عبارت میں مختلف اور مقصود میں متحد ہیں دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ قرونِ ثلاثہ سے اسی مدت کی تفصیل کی ہے اور اس مدت کو تین قرنوں میں تقسیم کر کے ان کی تعریف صرف اس لیے کی ہے کہ ان قرنوں کے مدبر اور صاحبانِ حکومت بے حد کمال کو پہنچے ہوئے تھے اور اعمالِ خیر کی اشاعت اور غلبہ اسلام کے بارے میں اللہ سبحانہ کا وعدہ ان قرنوں میں پروان چڑھا (ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۲۶۶) شاہ صاحب کی یہ تحقیق از روئے لغت بالکل جچی تلی ہے اور اس تحقیق کی رو سے جن حدیثوں میں زمانہ صحابہ و تابعین میں فتنوں کی خبر دی گئی ہے ان میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں رہتی ہے اور چونکہ جمہور علماء نے ان تین قرنوں سے وہی کچھ مراد لیا ہے جسے ہم نے کتاب میں اختیار کیا ہے اس لیے ان کو ان تمام حدیثوں میں تاویل کی راہ اختیار کرنی پڑی ہے اور ان تمام حدیثوں کے لیے مطالب کے نت نئے جامے بنائے جن میں صحابہ اور تابعین کے زمانے میں فتنوں کی پیش گوئی کی گئی ہے۔

ابنِ حبان، حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر کی پیش فرمودہ تاریخ ولادت ۶۱ھ پر اعتماد کیا جائے تو آپ کی عمر ۱۵ سال ہوچکی ہے۔ اگر ۸۰ھ ہی کو مان لیا جائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ عمر کی تیس بہاریں دیکھنے کے باوجود آپ نے کسی صحابی کی زیارت نہیں کی جبکہ ابوالطفیل جنگ اُحد والے دن پیدا ہوئے آٹھ سال زمانۂ نبوت پایا کوفہ میں قیام کیا۔ حضرت علیؓ کے ساتھ تمام مشاہد میں شریک رہے اور حافظ ذہبی کی تصریح کے مطابق ۱۱۰ھ میں وفات ہوئی۔ حافظ ابن حجر بھی امام ذہبی کے تقریب میں ہمنوا ہیں۔

مَاتَ سَنَةَ عَشَرَ وَ مِائَةٍ [۱] ۱۱۰ھ میں وفات پائی ہے۔

اس وقت حضرت امام اعظم کی عمر تیس سال تھی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ابوالطفیل شہادت علی مرتضیٰ کے بعد مکہ تشریف لے گئے اور وہیں انتقال ہوا تو حضرت امام اعظم سولہ سال کی عمر میں حج کو تشریف لے گئے وہاں ابوالطفیل موجود تھے زیارت نہ ہونا ایک حیرت والی بات ہے اور اگر یہ درست ہے کہ ابوالطفیل نے کوفہ ہی میں باقی زندگی گزار دی تو کون کہہ سکتا ہے کہ ایک شخص ایک شہر میں پورے تیس سال گزارے اور اس شہر میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی موجود ہوں مگر زیارت نہ ہو۔

محدثین کی زبان میں تابعی

سب مانتے ہیں کہ امام اعظم نے زمانہ صحابہ پایا ہے اور حافظ ذہبی، حافظ عسقلانی، حافظ قسطلانی، حافظ دارقطنی، ابن الجوزی، خطیب بغدادی، ابن سعد، قاضی ابن خلکان، امام یافعی، شیخ ابن حجر مکی، شیخ جزری اور حافظ تورپشتی کی شہادتوں سے ثابت ہے کہ امام اعظم نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت انس بن مالکؓ کو دیکھا ہے اور جیسا صحابی ہونے کے لیے بحالتِ ایمان ذاتِ نبوت کا دیدار کافی ہے ایسا ہی تابعی ہونے کے لیے صرف صحابی کا دیکھ لینا کافی ہے۔ روایت نہ تابعی ہونے کے لیے شرط ہے اور نہ صحابی ہونے کے لیے، خود امام بخاری نے صحیح میں صحابی کی یہ تعریف کی ہے کہ

مَنْ صَحِبَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَوْ رَاٰہُ

---

[۱] تقریب التہذیب ص ۱۸۷

مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ فَھُوَ مِنْ اَصْحَابِہٖ[1]

جسے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت یا دید کا شرف بحالتِ ایمان حاصل ہو وہ صحابی ہے۔

اور یہ تعریف ارشاداتِ نبوت سے لی گئی ہے۔ ترمذی میں ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ کسی ایسے مسلمان کو آگ نہ لگے گی جس نے مجھے دیکھا یا میرے دیکھنے والے کو دیکھا۔[2]

صحیح مسلم میں ایک حدیث حضرت جابرؓ نے بحوالہ حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کی ہے:

حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ ان میں سے لشکر روانہ کیا جائے گا وہ کہیں گے دیکھو کیا تم میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کوئی ہے اگر ہو گا تو اس کی برکت سے ان کو فتح ہو گی۔ پھر دوسرا لشکر روانہ کیا جائے گا وہ کہیں گے ھَلْ فِیْھِمْ مَنْ رَاٰی اَصْحَابَ النَّبِیِّ؟ کیا ان میں کوئی حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو دیکھنے والا ہے پس ان کی فتح ہو گی، پھر تیسرا لشکر روانہ کیا جائے گا کہا جائے گا کیا تم میں کوئی ایسا شخص موجود ہے جس نے اصحابِ نبوت کی زیارت کرنے والوں کو دیکھا ہو۔[3]

اس ارشادِ نبوت سے صحابی اور تابعی کی تعریف واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ نبوت کی دید کا جسے بحالتِ ایمان شرف حاصل ہو وہ صحابی ہے اور اس میں تمام محدثین یک زبان ہیں۔ اس موضوع پر محدثین میں کبھی بھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں ایسے ہی جن آنکھوں نے صحابہ کو مسلمان ہونے کی حالت میں دیکھا ہو وہ تابعی ہے۔[4]

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۲۸۷ [2] ترمذی ص ۲۴۸ [3] صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۲۴

[4] بعض لوگوں کو کتابوں میں تابعی کی یہ تعریف پڑھ کر مَنْ لَقِیَ الصَّحَابِیَ… الخ غلط فہمی ہو گئی ہے اور انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ دیکھنے والا تابعی نہیں بلکہ ملاقات کرنے والا تابعی ہے لیکن وہ اگر لقاء کے

(باقی ص ۱۳۹ پر)

یہ بات کہ امام اعظم کو شرف دید حاصل ہے ایک بے غبار حقیقت ہے اور اسی بنا پر ایک نہیں بلکہ ایک سے زیادہ محدثین کا فیصلہ ہے کہ امام اعظم تابعی ہیں۔ ان اکابر کے نام آپ سن چکے ہیں جنہوں نے صحابہ کی دید کی تصریح کی ہے۔ ان کے اسمائے گرامی سن لیجئے جنہوں نے امام صاحبؒ کے تابعی ہونے کا واشگاف لفظوں میں اقرار کیا ہے۔ امام ابوالبرکات عبد اللہ نسفی، حافظ بدرالدین عینی، حافظ ابن الہمامؒ حافظ ولی الدین العراقی، حافظ زین الدین العراقی، ابومعشر عبدالکریم شافعی، حافظ ابن حجر عسقلانی، حافظ جلال الدین السیوطی، شیخ ابن حجر مکی، علامہ قسطلانی، شیخ عبدالحقؒ دہلوی، امام بزاز کردری، ملا علی القاری حافظ عبدالقادر قرشی وغیرہم نے تصریح کر دی ہے کہ امام اعظمؒ تابعی ہیں۔ سب کا استقصاء تو مشکل ہے لیکن گلے از گلزار چند تصریحات ہدیہ ناظرین ہیں۔

صفحہ ۱۳۸ کا بقیہ حاشیہ)۔ معنے بھی محدثین ہی سے پوچھ لیتے تو پھر اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے۔ حافظ ابن حجر نے شرح نخبہ میں لقاء کے معنے جو بتائے ہیں اس میں بیٹھنا، ساتھ چلنا، ایک دوسرے سے بغیر گفتگو ملنا اور ایک دوسرے کو دیکھنا سب داخل ہے چنانچہ وہ صراحۃً لکھتے ہیں وَيَدْخُلُ فِيهَا رُؤْيَةُ أَحَدِهِمَا الْآخَرَ اس لیے مَنْ لَقِيَ الصَّحَابِيَّ کے معنے یہ ہیں کہ تابعی وہ شخص ہے جو صحابی سے ملا ہو یعنی اس کے پاس بیٹھا، اس کے ساتھ چلا ہو، بغیر گفتگو کے ملا ہو، ایک دوسرے کو باہم دیکھا ہو، شرح نخبہ میں حافظ عسقلانی نے صحابی اور تابعی کی جو تعریف کی ہے سے بھی سن لیجئے، هُوَ مَنْ لَقِيَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُؤْمِنًا بِهٖ وَمَاتَ عَلَى الْإِسْلَامِ جس نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے بحالتِ ایمان ملاقات کی ہو اور ایمان ہی پر اس کی موت ہوئی ہو وہ صحابی ہے۔ اب تابعی کی تعریف بھی پڑھ لیجئے هُوَ مَنْ لَقِيَ الصَّحَابِيَّ كَذٰلِكَ اور ملاقات کا مطلب آپ سن چکے ہیں۔ اسی تعریف کو علامہ نووی نے تقریب میں اظہر بتایا ہے۔ اسی کو علامہ محمد بن اسماعیل الیمانی نے توضیح الافکار میں اختیار کیا ہے۔ یہی امام حاکم کا مسلک ہے حافظ ابن الصلاح نے اسی کو اقرب اور حافظ عراقی نے اسی پر محدثین کی اکثریت کا عمل بتایا ہے۔ امام اعمش کے بارے میں اگرچہ ترمذی کی تصریح یہ ہے کہ انہوں نے کسی صحابی سے کوئی حدیث نہیں سنی مگر اس کے باوجود صرف شرف دید کی وجہ سے امام مسلم اور امام ابن حبان نے امام اعمش کو طبقہ تابعین میں شمار کیا ہے۔ امام عراقی فرماتے ہیں کہ حضور انورؐ نے اس ارشاد میں کہ طُوبىٰ لِمَنْ رَآنِي وَآمَنَ بِي وَطُوبىٰ لِمَنْ رَأىٰ مَنْ رَآنِي صحابی اور تابعی کی تعریف کر دی اور تابعی اور صحابی ہونے کا مدار دید کو قرار دے دیا۔ (تدریب ص ۴۱۶)

حافظ ابنِ حجر عسقلانی کی رائے

حافظ ابن حجر عسقلانی سے کسی نے دریافت کیا کہ امام اعظم تابعی ہیں یا نہیں؟ حافظ صاحب نے اس کا جو جواب دیا ہے حافظ ابن حجر مکی نے الخیرات الحسان ص ۱۲ پر، ملا علی قاری نے شرح مسند امام اعظم ص ۲۸۴ پر اور حافظ جلال الدین السیوطی نے تبییض الصحیفہ ص ۵۰۴ پر نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

امام اعظم نے صحابہ کی ایک جماعت کو پایا ہے کیونکہ آپ کی تاریخ ولادت ۸۰ھ کوفہ میں ہے۔ کوفہ میں اس وقت حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ موجود تھے کیونکہ ان کی وفات بالاتفاق بعد میں ہوئی، بصرے میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ تھے ان کی وفات ۹۰ھ کے بعد ہوئی۔ ابن سعد نے ایک بے غبار سند سے یہ بیان درج کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے انس بن مالک رض کو دیکھا ہے ان دو کے علاوہ اور بھی صحابہ بقیدِ حیات تھے، بعض اکابر نے صحابہ سے امام صاحبؒ کی روایت کے موضوع پر کچھ رسائل بھی لکھے ہیں لیکن ان کی سندیں ضعف سے خالی نہیں ہیں۔ بہرحال اتنی بات معتمد اور طے شدہ ہے کہ آپ نے زمانہ صحابہ پایا ہے اور ابن سعد کی تصریح کے مطابق یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ کچھ صحابہ کرام کی زیارت کا امام ابوحنیفہ کو شرف حاصل ہے اس لحاظ سے امام صاحبؒ کا شمار طبقہ تابعین میں ہے اور یہ شرف امام صاحبؒ کے سوا امام صاحبؒ کے ہم عصروں میں کسی کو نصیب نہیں ہے۔ نہ امام اوزاعی کو شام میں نہ حماد بن زید اور حماد بن سلمہ کو بصرہ میں نہ سفیان ثوری کو کوفہ میں نہ امام مالک کو مدینہ میں نہ امام مسلم بن خالد کو مکہ میں اور نہ لیث بن سعد کو مصر میں۔[1]

---

[1] یہ جو فرمایا کہ ان کی سند ضعف سے خالی نہیں تو اس سے غلط فہمی نہ ہو جائے ضعیف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ضعیف الاسناد ہے یہ نہیں ہے کہ ثابت نہیں ہے تدریب میں حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ اگر بسند ضعیف ہو تو ہم اسے ضعیف الاسناد تو کہہ سکتے ہیں مگر اس کے ہونے کا انکار نہیں کر سکتے اگر اس کے خلاف کوئی شہادت

(باقی ص ۱۴۱ پر)

اسی قسم کا ایک اور سوال حافظ ولی الدین[1] عراقی کی خدمت میں بھی پیش کیا گیا اور پوچھا گیا کہ کیا امام اعظمؒ تابعی ہیں؟ حافظ عراقی نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ حافظ سیوطی نے تبییض الصحیفہ میں نقل کیا ہے۔ اس میں حافظ عراقی نے صاف اقرار کیا ہے کہ اگر صحابی کے دیکھنے کا نام تابعیت ہے تو امام ابوحنیفہ کا شمار بلا ریب تابعین میں ہے اور کوئی نہیں جو اس بنیاد کو مان کر امام اعظم کی تابعیت کا انکار کر سکے۔

حافظ زین الدین عراقی کا تبصرہ

علامہ محی الدین نووی نے تقریب میں نوع الحادی والاربعون میں روایۃ الاکابر عن الاصاغر پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑوں کا چھوٹوں سے استفادہ کی ایک قسم یہ بتاتی ہے کہ ایک شخص تابعی ہو کر کسی ایسے شخص سے روایت لے جو تابعی نہیں ہے جیسے عمرو بن شعیب کہ یہ تابعی نہیں ہیں لیکن تابعین نے ان سے روایات لی ہیں۔ حافظ سیوطی فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے باوجود تابعی ہونے کے عمرو بن شعیب سے استفادہ کیا ہے ان کی تعداد حافظ عراقی نے پچاس سے زائد بتاتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ

وعدھم الحافظ العراقی ابوالفضل نیفا وخمسین[2]

حافظ عراقی نے ان کو پچاس سے زیادہ شمار کیا ہے۔

صفحہ ۱۴۰ کا بقیہ حاشیہ:۔ مذہب تو وہ قابل پذیرائی ہے حافظ ابن القیم نے اعلام میں لکھا ہے کہ الاصل الرابع الاخذ بالمرسل والحدیث الضعیف اذا لم یکن فی الباب شیئ یدفعہ (ص ۱۱۰) سارے دفتر حدیث و رجال میں ایسی کوئی شہادت نہیں جس میں کوئی امام کے متعلق یہ بتائے کہ آپ نے صحابہ کو نہیں دیکھا ہے بلکہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ صحابہ اثبتوہ بالاسانید الصحاح والحسان اور اصولاً یہی راجح ہے۔

[1] پورا نام احمد بن عبدالرحیم بن الحسین ہے ولی الدین لقب ابوزرعہ کنیت ہے اپنے والد زین الدین عراقی کے ہاتھوں پروان چڑھے ہیں ۷۶۲ھ میں ولادت ہوئی ۳ سال کی عمر میں ان کو ان کے والد دمشق لے گئے۔ جوان ہوتے مصر آ گئے یہاں کے مشائخ سے استفادہ کیا دوبارہ دمشق گئے اور وہاں کے مشائخ سے فیض یاب ہوتے ان کو یہ شرف ہے کہ ان کی جملہ مرویات اور مصنفات کا ان سے ان کے اکابر اور بزرگوں نے سماع کیا۔ فقہ، اصول، معانی و بیان ادب عربی میں کمال حاصل تھا۔ نوجوانی ہی میں مسند تدریس پر بیٹھ گئے تھے ان کی تصانیف میں کافی کتابیں ہیں ان کا مبسوط ترجمہ ابن فہد نے لحظ الالحاظ ص ۲۸۴ تا ۲۹۰ لکھا ہے۔ ان کی وفات ۱۷ شعبان ۸۲۶ھ کو ہوئی۔

[2] پورا نام عبدالرحیم بن الحسین بن عبدالرحمٰن الکردی الرازی باقی ہے۔ حافظ ابن فہد نے لحظ الالحاظ میں اور حافظ

(باقی ص ۱۴۲ پر)

اس کے بعد حافظ عراقی کے بیان کردہ تابعین کے ناموں کی یہ فہرست دی ہے ابراہیم بن میسرہ ایوب السختیانی، یحییٰ بن الاشج، ثابت بن عجلان، ثابت البنانی، جریر بن حازم، حبان بن عطیہ حبیب ابن ابی موسیٰ، جریر بن عثمان، الحکم بن عتیبہ حمید الطویل، داؤد بن قیس، داؤد بن ابی ہند الزبیر بن عدی، سعید بن ابی ہلال، سلمہ ابن دینار سلیمان الشیبانی، سلیمان الاعمش، عاصم الاحوال، عبد اللہ ب عبد الرحمٰن الطائفی عبد اللہ بن عون، عبد اللہ بن ابی ملیکہ، عبد الرحمٰن بن حرملہ عبد العزیز بن رفیع عبد الملک بن جریج، عبد اللہ العمری، عطاء ابن ابی رباح عطاء ابن السائب، عطاء الخراسانی، العلا ابن الحارث، علی بن الحکم، عمرو بن دینار، ابو اسحاق السبیعی، قتادہ، محمد بن اسحٰق، محمد بن مجادہ، محمد بن عجلان ابو الزبیر، زہری، مطر الوراق مکحول، موسیٰ ابن ابی عائشہ، ابو حنیفہ النعمان بن ثابت، ہشام بن عروہ، ہشام بن الغاز، وہب بن منبہ یحییٰ ابن ابی کثیر، یزید بن ابی حبیب نے عمرو بن شعیب سے روایت کی ہے ان تابعین میں امام اعظم کا بھی اسم گرامی موجود ہے اس سے معلوم ہوا کہ امام اعظم حافظ عراقی کے نزدیک تابعی ہیں۔ یاد رہے کہ حافظ عراقی فنِ حدیث میں بڑے پائے کی شخصیت ہیں۔

علامہ قسطلانی کی رائے

علامہ قسطلانی نے امام اعظم کو تابعین کے زمرے میں شمار کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

ہذا مذہب الجمہور من الصحابہ کابن عباس وعلی ومعاویہ وانس بن مالک وخالد وابی ہریرہ وعائشہ وام ہانی ومن التابعین الحسن البصری وابن سیرین والشعبی وابن المسیب وعطاء وابوحنیفہ ومن الفقہاء ابو یوسف ومحمد والشافعی ومالک واحمد[1]

ص ۱۴۱ کا بقیہ حاشیہ)۔ سیوطی نے ذیل طبقات الحفاظ میں ان کا مبسوط ترجمہ لکھا ہے عز الدین بن جماعہ فرماتے تھے کہ مصر میں ان کے سوا جو بھی حدیث دانی کا دعویٰ کرتا ہے وہ صرف مدعی ہے علامہ سبکی، العلائی اور ابن کثیر نے ان کی بے حد تعریف کی ہے ان کی تصانیف میں الفیہ اس کی شرح، تخریج احیاء تکملہ شرح الترمذی وغیرہ ہیں۔ ابن فہد لکھتے ہیں کہ تین سال کی عمر میں سایہ پدری سے محروم ہو گئے تھے ۸ سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا علم حدیث انہوں نے الشیخ علاؤ الدین ابن الترکمانی الحنفی سے حاصل کیا اور ان سے ہی حدیث کی دستار فضیلت لی۔ تحصیل علم کے لیے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔ بہت خوبیوں، فضیلتوں اور بزرگیوں کا سرمایہ تھے۔ بدھ کے دن ۸ر شعبان ۸۰۶ھ میں بمقام قاہرہ اللہ کو پیارے ہو گئے تغمدہ اللہ برحمتہ۔ [1] ارشاد الساری ج ۱ ص ۲۸۲

یہ تمام صحابہ تابعین اور فقہا کا مذہب ہے صحابہ جیسے ابن عباسؓ، علیؓ، معاویہؓ، انسؓ، خالدؓ، ابوہریرہؓ، عائشہؓ، ام ہانیؓ، تابعین میں جیسے حسن بصری، ابن سیرین، شعبی، ابن المسیب، عطاء اور ابوحنیفہ اور فقہا میں جیسے ابویوسف، محمد، شافعی، مالک اور احمد۔[1]

اس میں امام اعظم کا تابعین کے زمرے میں صاف تذکرہ موجود ہے۔

محدثین میں سے حافظ ابوعمرو بن عبدالبر کی شخصیت سے کون ناواقف ہے، موصوف نے حضرت انسؓ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے صحابی عبداللہ بن الحارث بن جزءؓ کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے۔

اِنَّ اَبَا حَنِیْفَہ رَأیٰ اَنَسَ ابْنَ مَالِکٍ وَعَبْدَاللّٰہِ ابْنَ الْحَارِثِ بْنِ جَزْءٍ۔

امام ابوحنیفہ کو حضرت انس بن مالک اور حضرت عبداللہ کی دید کا شرف ہے۔[1]

عبداللہ بن حارث کی حدیث پر تفصیلی کلام انشاء اللہ آئندہ آئے گا۔ یہاں صرف یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حافظ ابوبکر الجعابی نے اپنی بیش بہا تصنیف الانتصار میں لکھا ہے کہ

مات عبداللہ بن الحارث بن جزء سنۃ سبع وتسعین۔[2]

یاد رہے کہ حافظ ابوبکر الجعابی اپنے وقت میں علل حدیث اور تاریخ رجال کے بہت بڑے امام گزرے ہیں۔ مشہور محدث دارقطنی ان کے شاگرد ہیں۔ ابوعلی نیشاپوری کہتے ہیں کہ میں نے ان سے زیادہ حافظ حدیث کوئی نہیں دیکھا۔ ان کو چار لاکھ حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ان کے درس حدیث میں اتنا ہجوم ہوتا تھا کہ گھر، گلی، شاہراہوں پر انسان ہی انسان ہو جاتے تھے۔ ابوالفضل القطان کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابوبکر الجعابی کی زبانی سنا ہے کہ میں جب رقہ پہنچا وہاں میرے پاس حدیث کی کتابوں کا گٹھا تھا۔ ایک روز ملازم غمگین صورت بناتے ہوئے آیا، بولا کہ آپ کی ساری کتابیں ضائع ہو گئیں۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں ان میں صرف دو لاکھ حدیثیں تھیں وہ سب مجھے زبانی یاد ہیں۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ علل و رجال کے امام تھے۔

یہ امام اعظم کے بارے میں دید کی شہادت ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ایک مثبت دعویٰ ہے اس کے

---

[1] جامع بیان العلم وفضلہ ج ۲ ص ۲۷۰ [2] المناقب للموفق ج ۱ ص ۲۶

مقابلے میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ ایک منفی چیز ہے۔ اصولی طور پر مثبت کو منفی پر مقدم ہونا چاہیے۔ امام بخاری نے جزء رفع یدین میں بڑے پتے کی بات لکھی ہے کہ ایک بات کے بیان کرنے والے دو شخص ہوں۔ ایک کہے میں نے کرتے دیکھا ہے دوسرا کہے میں نے نہیں دیکھا ہے۔ ان میں مثبت شاہد ہے نافی شاہد نہیں ہے کیونکہ اسے کوئی چیز محفوظ نہیں ہے۔ عبد اللہ بن زبیر کہتے ہیں دو شاہدوں نے گواہی دی ایک نے کہا حمید نے اقرار کیا ہے کہ اس کے ذمہ ایک ہزار روپیہ ہے، دوسرا کہتا ہے کوئی اقرار نہیں کیا جو شخص مثبت کا اظہار کر رہا ہے وہ شاہد ہے اسی کو اپنایا جائے گا۔ یا مثلاً بلال کہتے ہیں کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ میں نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ اور فضل بن عباس کہتے ہیں کہ آپ نے نماز نہیں پڑھی، بلال کی بات کو قبول کیا جائے گا کیونکہ یہ شہادت ہے اور نافی کی بات ناقابل التفات ہے[1]

لیجیے اسی ترازو میں امام اعظم کی تابعیت کے معاملے کو تول کر دیکھ لیجیے۔ ایک طرف حافظ ذہبی اور ابن سعد سیف ابن جابر کی زبانی یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ امام اعظم نے انس بن مالک کو دیکھا ہے اور دوسری طرف یہ کہنے والا کوئی نہیں کہ "نہیں دیکھا" اگر بالفرض ایسی کوئی بات ہوتی بھی ہوتی پھر بھی کہا جا سکتا تھا کہ مثبت شاہد ہے اسی ترازو میں روایت کے مسئلہ کو بھی تول لیجیے۔ ایک طرف کہنے والے کہہ رہے ہیں کہ امام اعظم نے صحابہ سے روایت کی ہے اس کے مقابلے میں دارقطنی صدیاں گزرنے پر کہتے ہیں کہ امام اعظم نے روایت نہیں کی۔ فرمائیے امام بخاری کے پیش کردہ ضابطہ کے مطابق شاہد کون ہے؟ وہ جو وجود کا پتہ دے رہا ہے یا وہ جو نہیں، نہیں کہہ رہا ہے آپ ہی انصاف فرمائیے۔

الغرض امام اعظم کا زمانہ صحابہ میں ہونا اور حضرت انس کا دیکھنا محدثین کے یہاں اتفاقی ہے اس لیے وہ یقیناً تابعی ہیں اور تابعی ہونے کی وجہ سے اللہ سبحانہٗ کے اس ارشاد کا مصداق ہیں۔
والسابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان۔
کیونکہ اس آیت میں مہاجرین وانصار سے جمیع صحابہ مراد ہیں چنانچہ حمید بن زیاد کہتے ہیں کہ ایک روز میں نے محمد بن کعب قرظی سے صحابہ کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اللہ سبحانہٗ نے قرآن حکیم میں تمام صحابہ کی بخشش کا اعلان کیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کہاں؟ فرمایا کیا تم نے

---

[1] جزء رفع الیدین ص ۸

قرآن نہیں پڑھا۔ قرآن میں ہے والسابقون ... تو اس آیت نے تمام صحابہ کرام کو بخشش کا سرٹیفکیٹ دیا ہے البتہ تابعین کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ احسان کے ساتھ صحابہ کے پیروکار ہوں، اس لیے اس آیت نے مسلمانوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک صحابہ دوسرے وہ جو احسان کے ساتھ صحابہ کے تابعین ہوں اور دونوں کے لیے اس آیت میں چار اہم بانشان وعدے کیے گئے ہیں۔

اوّل یہ کہ اللہ سبحانہ ان سے راضی ہو گیا۔

دوم یہ کہ صحابہ اور تابعین اللہ سے راضی ہو گئے۔

سوم یہ کہ وہ جنتی ہیں۔

چہارم یہ کہ وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

امام اعظم تابعی ہونے کی وجہ سے ان تمام وعدوں کے مصداق ہیں اور یہ شرف آپ کے سوا ائمہ اربعہ میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر نے امام اعظم کو دوسرے اماموں پر مقدم کرنے کی وجہ یہ لکھی ہے۔

لِاَنَّہٗ اَدْرَکَ عَصْرَ الصَّحَابَۃِ وَرَأَی اَنَسَ بْنَ مَالِکٍ۔[1]

امام اعظم کا زمانہ طلب علم

امام اعظم کے بچپن کا زمانہ علوم کے لیے نہیں بلکہ فنون کے لیے باغ و بہار کا زمانہ تھا۔ آپ کی عمر چھ سال کی ہوئی تو ۸۶ھ مطابق ۷۰۵ء میں ولید بن عبد الملک سریر آرائے حکومت ہوا بنو امیہ کا آفتاب اقبال اس وقت نصف النہار پر تھا۔ عہد ولید خلافت اموی کے اوج شباب کا زمانہ ہے اور یہ واقعہ ہے کہ فتوحات ملکی اور رفاہ عامہ کے کاموں کی جو سرپرستی ولید نے اپنے دور حکومت میں کی ہے۔ بنو امیہ میں سے کسی نے کم ہی کی ہو گی۔ ولید کی حکومت کا دائرہ مشرق و مغرب، شمال و جنوب میں حجاز و عراق سے افریقہ، شام، ایشیائے کوچک، ترکستان، ایران، افغانستان اور پاکستان میں شہر ملتان تک پھیلا ہوا تھا۔ حسن اتفاق سے ولید کو تین کارآمد اور مفید سپہ سالار مل گئے تھے۔ قتیبہ بن مسلم الباہلی جس کے ذریعے ایشیا کے قلب تک اسلامی فتوحات پہنچیں، موسیٰ بن نصیر جس کے ذریعے اندلس میں بحر الکاہل تک اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۱۰۷

ہوا اور محمد بن قاسم جیسے کے ذریعے پاکستان میں ملتان تک اسلامی فتوحات کا پھریرا لہرایا۔
غرض ایک ہی وقت میں مسلمانوں کی فوجیں مشرق و مغرب، شمال، جنوب میں فتح و نصرت کے پرچم اڑا رہی تھیں اس کے بعد مسلمانوں کو ایسا کامیاب دور دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ ولید کا زمانہ حکومت ۸۶ھ سے ۹۶ھ تک ہے اور یہی دور امام اعظم کے چھٹپنے اور لڑکپن کا دور ہے یہ سارا زمانہ امام اعظم نے کوفہ میں گزارا ہے۔

کوفہ کی مرکزی حیثیت

کوفہ کی علمی حیثیت کیا ہے؟ اس پر تفصیلی بحث تو امام اعظم کے اساتذہ حدیث کے سلسلہ میں آئے گی مگر اتنی بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ وادی دجلہ اور فرات کا جنوبی حصہ جسے علماء جغرافیہ عراق کہتے ہیں ایک خوشگوار، سرسبز و شاداب علاقہ اور تین ہزار سالہ مدنیت و تہذیب کا علمی گہوارہ ہے بابلیوں آشوریوں کلدانیوں فارسیوں اور یونانیوں کی جولانگاہ رہا ہے۔ زمانہ خلافت فاروقی میں اس پر پرچم اسلام لہرایا تو مسلمانوں نے اپنے عہد تمدن میں دو نئے شہر بسائے، کچھ تو اس لیے کہ مدائن دارالخلافہ کی آب و ہوا ان کو راست نہ آئی[1] اور کچھ اس لیے کہ ممالک محروسہ کا تعلق مدینہ طیبہ سے انتظامی طور پر حمل و نقل کے وسائل نہ ہونے کی وجہ سے مشکل رہتا[2] حضرت فاروق اعظم نے شہر بسانے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل فرمائی اس کمیٹی کے حسب ذیل ارکان تھے۔
حضرت سعد بن وقاص اللیثی، حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت حذیفہ بن الیمانؓ۔ ان حضرات نے شہر کے لیے دریائے فرات کا کنارہ تجویز کیا۔ رپورٹ مرکزی حکومت کو پیش ہونے پر شہر بسانے کی اجازت ملی منظوری ہو جانے پر محرم الحرام ۱۷ھ جنوری ۶۳۸ء کو حضرت سعد بن وقاصؓ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں مدائن چھوڑ کر کوفہ آئے اور آپ کے ساتھ چالیس ہزار نفوس کوفہ میں آباد ہوئے۔

عدد ھم اربعون الفا ان کی تعداد چالیس ہزار ہے۔
اولین رہائش کے لیے خیمے اور چھپر اختیار کیے گئے۔ لیکن خیموں اور چھپروں کے یہ گھروندے آئے دن آگ کی تباہ کاریوں کا شکار بنتے تھے اس لیے کچھ عرصہ بعد حضرت فاروق اعظمؓ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۷۱ مں ان الصحابۃ استوخموا المدائن [2] طبری ج ۴ ص ۱۴۱

نے پختہ عمارات کی اجازت دے دی۔ اجازت ملنے پر عراقی تمدن کے مطابق حضرت ابوالہیاج الاسدی کو پورے شہر کا سروے کرنے پر مقرر کیا گیا۔ آپ نے بڑی محنت سے شاہراہوں، کوچوں، گورنمنٹ ہاؤس اور جامع مسجد کے لیے پلاٹ مقرر کیے۔ نقشہ اس طرح ترتیب دیا کہ شہر کے مرکزی مقام پر جامع مسجد ہو، جامع مسجد سے چاروں طرف چوڑی چوڑی سڑکیں ہوں۔ حافظ ابن کثیر نے سڑکوں کی چوڑائی چالیس ہاتھ یعنی ساٹھ فٹ اور گلیوں کی گیارہ فٹ لکھی ہے[1] اور جامع مسجد کے بڑے دروازے کے سامنے کافی فاصلہ پر گورنمنٹ ہاؤس بنایا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ایسی عظیم الشان ترقی کی کہ مدائن کے خزانے، بابل و بصرہ کا تمدن اور عربی تہذیب یہاں اُمنڈ کر آ گئی حتیٰ کہ لفظ عراق کا مفہوم ہی کوفہ بن گیا[2] اور صرف یہی نہیں بلکہ الطبری نے لکھا ہے کہ کوفہ کے تمدن جدید اور تمول کی داستانیں سُن کر تمام عرب میں یہاں آبادکاری کے لیے ایک ولولہ پیدا ہوا۔ حضرت عتبہ نے انس بن حجبہ کو حضرت فاروق اعظم کے پاس روانہ کیا۔ حضرت فاروق نے ان سے پوچھا کہ کوفہ میں مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ اس کا جواب جو انہوں نے دیا وہ سننے کے لائق ہے فرمایا کہ:

انثالت علیہم الدنیا فہم یہیلون الذہب والفضۃ

ان پر دُنیا بر پڑی اس لیے وہ سونا اور چاندی بہا رہے ہیں[3]

یہ تو آپ سُن چکے ہیں کہ کوفہ میں آبادکاری کے وقت حضرت سعد بن ابی وقاص کے ساتھ چالیس ہزار حضرات تھے۔ ان میں صحابہ کس قدر تھے۔ تصریح تو نہیں ملتی ہے مگر حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں مدائن چھوڑنے کے اسباب بتاتے ہوئے جو یہ فقرہ لکھ دیا ہے کہ

ان الصحابۃ استوخموا المدائن صحابہ کو مدائن کی آب و ہوا موافق نہ آئی

تو اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری تعداد ہی صحابہ کرام پر مشتمل تھی لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اس پوری تعداد نے کوفہ کو وطن بنا لیا ہو۔ اگرچہ کوفہ کے تمدن اور تمول کو دیکھ کر زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ صحابہ کا یہ جم غفیر اسی جگہ آباد ہوا ہو، لیکن اس کا بھی احتمال ہے کہ ان میں سے کچھ حضرات واپس ہو گئے ہوں مگر حافظ سخاوی کے بیان سے پہلے احتمال کی تائید ہوتی ہے وہ حافظ ذہبی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۵۷ [2] تاریخ اسلام السیاسی ج ۱ ص ۱۰ انہم فجرالاسلام ص ۱۸۰
[3] تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۴۱

کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت علی ابن ابی طالب جیسے حضرات نیز صحابہ کرام کی ایک خلقت یہاں آکر اُتر ہی[1]

اس موضوع پر ان بزرگوں نے یہ اپنے علم کی حد تک بتایا ہے اور اسی لیے خیالات مختلف ہیں۔

چنانچہ امام حاکم نے اپنی مشہور کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں ان مشاہیر کے نام لکھے ہیں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدینۂ طیبہ سے دوسرے اسلامی شہروں میں منتقل ہو گئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے سب سے پہلے کوفہ سے ابتدا کی ہے اور سب سے زیادہ اسی جگہ آنے والوں کی تعداد بتائی ہے حافظ ابو بشر دولابی نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک ہزار پچاس شخص اور پچاس وہ بزرگ کہ جو غزوۂ بدر میں آپ کے ہمرکاب تھے کوفہ میں فروکش ہوئے[2]

امام ابوالحسن احمد بن عبداللہ نے اپنی تاریخ میں اس سے زیادہ تعداد بتائی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ کوفہ میں ڈیڑھ ہزار صحابہ آکر آباد ہوئے[3]

حافظ ذہبی، حافظ ابن کثیر، حافظ ابو بشر دولابی اور امام ابوالحسن عجلی کے بیانات میں کوئی تضاد نہیں ہے، صحابہ کی تعداد تو زیادہ ہی ہے مگر تعیین عدد ہر شخص نے اپنے علم کے مطابق کی ہے۔ خود صحابہ کی تعداد کے بارے میں علماء کا ایسا ہی اختلاف ہے۔ حافظ ابوزرعہ نے ایک لاکھ چودہ ہزار بتائی ہے حافظ ابن عبدالبر نے حجۃ الوداع میں شریک ہونے والے صحابہ کی تعداد ۹۰ ہزار لکھی ہے۔ حافظ ابن حزم نے ایک لاکھ بتیس ہزار لکھی ہے اور شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں جو تعداد بتائی ہے وہ بھی سن لیجیے:

ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الْحَجِّ وَحَضَرَ مَعَهُ نَحْوٌ مِنْ مِائَةِ أَلْفٍ وَأَرْبَعَةٍ وَعِشْرِينَ أَلْفًا۔[4]

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہر شخص نے اپنے علم کے مطابق تعداد لکھی ہے صحابہ کی اس کثرت کے ساتھ احمد امین نے کوفہ کا علمی نسب نامہ جو لکھ دیا ہے وہ ان کی زبانی سن لیجیے:

کوفہ میں بے حد وحساب صحابہ کرام کا ورود ہوا۔ علم میں ان میں زیادہ مشہور حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت عبداللہ بن مسعود ہیں۔ حضرت

---

[1] الاعلان بالتوبیخ ص ۲۹ [2] کتاب الکنیٰ والاسماء ج ا ص ۱۷۴ [3] فتح القدیر ج ا ص ۲۴
[4] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۲۱۰۔

علی کو علمی نشر و اشاعت کے لیے سیاسی جھمیلوں کی وجہ سے وہ فراعت نہیں ہوئی جو حضرت عبداللہ بن مسعود کو نصیب ہوئی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود کی شخصیت صحابہ میں سب سے بڑی علمی اور اثری شخصیت تھی، مسلمان ہونے میں ان کا چھٹا نمبر تھا۔ مہاجرین حبشہ کے ساتھ حبشہ بھی ہجرت کی اور بعد ازیں مدینہ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ملازم صحبت تھے۔ آپ کو حضور میں جانے کی اجازت تھی۔ قرآن خوانی اور قرآن دانی سے بے حد شغف تھا۔ اسلامی تعلیم تفسیر قرآن میں امتیازی مقام کی وجہ سے آپ کا کبار علماء صحابہ میں شمار تھا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے ان کو کوفہ کے شہریوں کا معلم بنا کر بھیجا تھا۔ اہل کوفہ نے ان سے علم حاصل کیا اور آپ کے سامنے زانوے شاگردی طے کیا۔

اور صرف علم ہی نہیں بلکہ اخلاق و آداب بھی ان سے ہی لیے۔ ان کے شاگردوں کے بارے میں سعید ابن جبیر کا کہنا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ ہی اس شہر کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ لوگوں کو قرآن بھی پڑھاتے، تفسیر بھی سکھاتے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی بیان کرتے اور پیش پا افتادہ حالات میں فتاویٰ بھی کتاب و سنت سے یا پھر اپنے اجتہاد سے دیتے۔ آپ کے مدرسہ کے چھ شاگرد مشہور ہیں۔ علقمہ، اسود، مسروق، عبیدہ، حارث اور عمرو بن شرحبیل۔ یہ حضرات کوفہ میں تعلیم و افتاء میں حضرت عبداللہ کے جانشین ہیں لیکن سب علمائے کوفہ کا علمی مرکز صرف حضرت عبداللہ ہی کی شخصیت نہ تھی بلکہ ان میں سے بہتوں نے مدینہ جا کر حضرت فاروق اعظم، حضرت علی مرتضیٰ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت معاذ بن جبل اور دوسرے صحابہ سے علمی استفادہ کیا ہے اس کے نتیجے میں کوفہ کو ایک علمی گھرانہ کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی۔ کوفہ کے علماء میں شریح، شعبی، نخعی، اور سعید بن جبیر بہت مشہور ہیں۔ اس بستی میں علمی ترقی ہوتی رہی تا آنکہ علم کا یہ تاج امام اعظم کے سر رکھا گیا۔[1]

---

[1] فجر الاسلام ص ۱۸۴

فی الواقع صحابہ کی اس کثرت کے باوجود عُلمارِ کوفہ نے صرف حضرت عبداللہ ہی پر علمی استفادہ میں قناعت نہیں کی بلکہ ان کے شوقِ طلب کا عالم یہ تھا کہ وہ اس کی خاطر مدینے کا سفر کرتے تھے حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :

> ابوعبدالرحمٰن السلمی اور دیگر عُلمارِ کوفہ جیسے علقمہ، اسود، حارث، ذربن جیش کہ جن کے پاس عاصم بن ابی النجود نے قرآن پاک کی قرأت کی ہے۔ ان سب لوگوں نے حضرت ابن مسعود سے قرآن سیکھا۔ نیز یہی حضرات مدینہ جاتے اور حضرت عمر، حضرت عائشہ، سے علم حاصل کرتے تھے اور کوفہ کے قاضی شریح نے فقہ کی تعلیم یمن میں حضرت معاذ بن جبل سے لی تھی [۱]

اور پھر چند اوراق کے بعد لکھتے ہیں :

> حضرت عبداللہ ابن مسعود کے تلامذہ حضرت عمر، علی اور ابوالدردار سے علم حاصل کرتے تھے۔

اس پر تفصیلی تبصرہ آئندہ اوراق میں آرہا ہے یہاں مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ امام اعظم کی یہ بستی علمی بستی ہے۔ خلاصہ کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ فنِ قرأت و تجوید کے اگر سات امام ہیں جن کو قرارِ سبعہ کہتے ہیں تو ان میں سے تین عاصم، حمزہ اور کسائی کوفی ہیں۔ علم التفسیر میں خود عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں کو اعلم الناس بالتفسیر بتایا ہے [۲] حضرت سعید بن جبیر جن کو حضرت قتادہ تفسیر کا سب سے بڑا عالم مانتے ہیں وہ کوفہ ہی کے رہنے والے ہیں۔ عربیت اور نحو کی تدوین بھی کوفہ اور بصرہ ان دو شہروں میں ہوتی ہے۔ چنانچہ لغت اور نحو کی کتابوں میں ان دو شہروں کے سوا کسی اور شہر کے عُلمار کا اختلاف ذکر نہیں کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے کیسی اچھی بات لکھی ہے :

> علمِ نحو نے کوفہ و بصرہ کے ان دو شہروں میں نشو و نما پائی ہے جو پہلی صدی ہجری میں اسلامی ثقافت کا سب سے اہم مرکز تھے جہاں علمِ کلام اور علمِ فقہ کی اساس رکھی گئی ہے اور جہاں ادب اور فنون

---

[۱] منہاج السنہ ج ۴ ص ۱۵۶۔ [۲] الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۱۸۹

کے مدرسے قائم ہوئے[1]

الغرض امام اعظم نے جس بستی میں آنکھ کھولی اور جس میں بچپن اور لڑکپن گزارا ہے۔ وہ صرف تمدن و تمول ہی کا گہوارہ نہیں بلکہ علوم و فنون کی نگری ہے۔

امام اعظمؒ کی علمی طلبگاریوں کا زمانہ

اگرچہ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ امام کی علمی طلب گاریوں کی محرک علامۃ التابعین امام شعبی کی ذات گرامی ہے اور اس سے سمجھنے والوں نے یہی سمجھا ہے کہ امام صاحب نے طلب علم کا سلسلہ بچپنے میں نہیں بلکہ بڑے ہو کر شروع کیا ہے لیکن یہ محض اندازہ اور خیال ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ علمی طلب گاریوں کا آغاز تو بچپنے ہی میں ہوگیا تھا مگر امام شعبی کی ذات گرامی نے امام اعظم کو علم الشرائع کی طرف مائل کیا ہے چونکہ امام اعظم کو دوسرے فنون کے ساتھ علم الکلام سے خاص دلچسپی تھی اور اس دلچسپی کی وجہ یہ بتائی ہے کہ چونکہ علم کلام میں اصول دین سے بحث ہوتی ہے اس لیے یہ علم تمام علوم سے برتر ہے[2] اس علم میں تکمیل کی اور صرف تکمیل ہی نہیں بلکہ اس درجہ امامت اور مہارت پیدا کر لی کہ:

بَلَغَ فِیْہِ مَبْلَغًا یُشَارُ اِلَیْہِ بِالْاَصَابِعِ[3]

اس مقام پر پہنچ گئے کہ انگلیاں ان ہی کی طرف اٹھتی تھیں۔

اور اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جو صدر الائمہ نے یحییٰ ابن بکیر کے حوالہ سے امام اعظم کی زبانی لکھا کہ:

میں ایک روز بازار جاتے ہوئے امام شعبی کے پاس سے گزرا، امام شعبی نے مجھے بلایا اور دریافت کیا کہ کہاں جاتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ بازار، آپ نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ علمی مشغلہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں علماء کے پاس کم جاتا ہوں فرمایا کہ اس بارے میں غفلت کو راہ نہ دو۔ مطالعہ اور اہل علم کی صحبت کو اپنے لیے ضروری کر لو۔ مجھے

---

[1] تاریخ الاسلام السیاسی ج ۲ ص ۳۹۱ [2] مناقب للموفق ج ۱ ص ۶۴
[3] مناقب کردری ج ۱ ص ۶۴ [4] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۲۳۲

تم میں ہونہاری اور بیداری نظر آرہی ہے [1]

یہ واقعہ خود کہہ رہا ہے کہ یہ آغازِ طلب کا مشورہ نہیں بلکہ نظر فی العلم اور مجالستِ علماء کا مشورہ دے رہے ہیں۔ آپ خود ہی سوچیے کہ ایک شخص جو علم کی راہ سے واقف نہیں ہے، علماء سے ربط و ضبط نہیں رکھتا ہے صرف دکاندار ہے۔ اس میں ایک اجنبی شخص کے لیے کون سی کشش ہے جو اسے یہ کہنے پر مجبور کر رہی ہے کہ تم میں مجھے علمی بیداری نظر آتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام شعبی کو امام اعظم کی کلامی مسائل میں ہونہاری اور بیداری کی داستان معلوم تھی۔ اس بنا پر انہوں نے امام اعظم کو الشرائع کی طرف لگنے کا مشورہ دیا۔ اس کے نتیجے میں خود امام صاحب فرماتے ہیں کہ،

امام شعبی کی بات دل میں گھر کر گئی اور بازار چھوڑ کر بس علم ہی کا ہو رہا۔

گویا علم ہی کے ہو رہنے کا معاملہ اب پیش آیا ورنہ طلب علم کا آغاز تو اب سے بہت پہلے ہو چکا ہے خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو ایک غلطی کے ازالہ کی خاطر لکھنا پڑا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظمؒ کے طلبِ علم کی داستان میں علمِ کلام کو بہت بڑی خصوصیت حاصل ہے۔

امام اعظم اور فنونِ عصریہ

قرآن حکیم کی تعلیم سے فراغت کے بعد امام اعظم ان فنونِ عصریہ کی طرف پہلے متوجہ ہوئے جو اس زمانے میں رائج تھے۔ اس کی تائید اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو صدر الائمہ نے امام صاحب کی زبانی لکھا ہے اس میں خود امام صاحب نے ان علوم و فنون کو نام بنام بتایا ہے جن میں امام صاحب نے کمال پیدا کیا تھا۔

جب میں نے علم سیکھنے کا ارادہ کیا تو میں نے تمام علوم و فنون کو پیشِ نظر رکھا۔ اور پھر ان میں سے ایک ایک فن کو پڑھا ہے [2]

اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ علم الشرائع کو اپنانے سے پہلے امام صاحب نے اسی بستی میں جسے خود امام صاحب نے معدن العلم والفقہ کا نام دیا ہے۔ علم ادب، علم الشعر والقافیہ اور علم القرآۃ اور علم الکلام میں سے ایک ایک فن کو باقاعدہ پڑھ لیا تھا اور علم الکلام میں اس درجہ مہارت پیدا

---

[1] مناقب للموفق ج ا ص ۵۹ [2] مناقب صدر الائمہ ج ا ص ۶۱

کر لی تھی کہ خود فرماتے ہیں کہ اس میں میری طرف ہی لوگوں کی انگلیاں اٹھتی تھیں۔ اسی سلسلے میں صدر الائمہ اور خطیب بغدادی کی بیان کردہ داستان بھی گوش گزار کر لیجیے جو یحییٰ ابن شیبان کے حوالے سے ہم تک پہنچی ہے۔

مجھے علم کلام میں کافی دسترس تھی ایک عرصہ اسی میں بیت گیا۔ لوگوں سے مناظرے کرتا۔ اسی فن کی حمایت اور مدافعت میرا مشغلہ تھا۔ بصرہ مختلف مدارس فکر کا گڑھ تھا۔ میں بیس بار سے زیادہ بصرہ گیا ہوں۔ سال بھر یا اس سے زیادہ قیام رہتا تھا۔ اس زمانے میں میری خارجیوں کے فرقوں سے مڈبھیڑ ہوتی۔ میں علم کلام کو افضل ترین علم سمجھتا اور کہا کرتا تھا کہ یہی دین کی بنیاد کی نگرانی ہے۔ عرصہ گزرنے پر میں نے خود اپنے تئیں غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ صحابہ اور تابعین کبار نہ صرف یہ کہ ان چیزوں سے بے بہرہ نہ تھے بلکہ ہم سے زیادہ ان کے علم میں گہرائی تھی۔ حقائق سے واقف تھے مگر اس کے باوجود ان کی زندگیاں مجادلانہ شورشوں سے یکسر خالی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اُن کا مشغلہ نہ تھا بلکہ وہ لوگوں کو اس سے روکتے تھے۔ ان کے غور و فکر کی جولانگاہ علم الشرائع اور ابواب فقہ تھے یہی ان کا موضوع تھا یہی ان کی مجلسی زندگی کی رونق تھی۔ اسی کی لوگوں کو تعلیم دیتے اور اسی کے سیکھنے کی ترغیب دیتے۔ صدر اول ایسے ہی گزرا ہے تابعین بھی ان کے نقش قدم پر تھے۔ اس موقف پر پہنچ کر میں نے علم کلام کو خیر باد کہہ دیا۔ صرف فنی معرفت باقی تھی۔ اور زندگی میں بطور فن سلف کے علوم کو اپنا لیا۔ وہی کام شروع کیا جو وہ کرتے تھے اور اس کے فن کاروں سے رابطہ پیدا کر لیا اور ان کی ہی مجلسوں کو اپنا لیا اور اپنی جگہ یہ یقین ہو گیا کہ متکلمین کا گروہ اسلاف کے نقش قدم سے ہٹا ہوا اور صالحین کے مقام سے دور ہے ان کے دلوں میں قساوت ہی قساوت ہے کتاب و سنت کی مخالفت سے بے پروا بے روح اور تقویٰ سے دور طبقہ ہے[1]

---

[1] مناقب صدر الائمہ ج ۱ ص ۹۱

اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ علمی طلب گاریوں کا سلسلہ بچپنے میں شروع ہوا ہے کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ امام حماد کا انتقال ۱۲۰ھ میں ہوا ہے اور یہ بھی تاریخ بغداد میں ہے کہ امام اعظم فرماتے ہیں کہ میں امام حماد کی خدمت میں پورے اٹھارہ سال رہا ہوں، اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ امام اعظم ایک تلمیذ علم الشرائع کی حیثیت سے تمام علوم میں تکمیل کے بعد امام حماد کی خدمت میں ۱۰۲ھ میں تشریف لے گئے جب کہ امام اعظم کی عمر ۲۲ سال تھی اور یہ بات خود امام اعظم کے بیانوں کی روشنی میں بے غبار ہے کہ امام حماد کی خدمت میں تشریف آوری علم الشرائع کی خاطر تمام علوم و فنون کے پڑھنے کے بعد ہوئی ہے۔

امام اعظم کے زمانے میں علم چار حصوں میں تقسیم تھا

الف: ادبی فنون کے مدرسے

ب: علومِ عقلیہ کے حلقے

ج: مذاکرہ حدیث کی جماعتیں

د: استنباطِ مسائل کے مرکز

اگر ترتیب یوں قائم کی جائے کہ امام اعظم نے

اولاً: قرأتِ عاصم کے مطابق قرآن حفظ کیا۔

ثانیاً: آپ نے نحو، ادب اور شعر پر وقت صرف کیا۔

ثالثاً: آپ نے علم کلام اور علوم عقلیہ میں مہارت پیدا کی۔

رابعاً: آپ نے مذاکرہ حدیث کے حلقوں میں شرکت کی۔

خامساً: آپ نے استنباط و استخراج مسائل اور فقہ و اجتہاد کے لیے حماد کے سامنے زانوے ادب تہ کیا ہے۔

تو صاف پتہ لگ جاتا ہے کہ امام موصوف نے تعلیم کا آغاز بچپن میں کیا ہے اور ابھی بچپن سے گزر کر لڑکپن ہی تھا کہ آپ نے نحو، قرأت، ادب و شعر اور علومِ عصریہ کی تکمیل فرمائی تھی، اس کی وضاحت امام صاحب کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو امام مرغینانی نے نعیم بن عمرو کی زبانی نقل کیا ہے، کہتے ہیں:

> میں نے امام ابوحنیفہ سے سنا ہے فرماتے تھے کہ میں زمانہ حجاج میں لڑکپن کی عمر میں بازار جاتا تھا اور لوگوں سے علم کلام کے ذریعے عقائد پر باتیں

کرتا تھا۔ ایک روز مجھ سے ایک شخص نے دینی فرائض کے بارے ایک مسئلہ
پوچھ لیا مجھے کوئی جواب نہ آیا۔ اس شخص نے مجھ سے کہا کہ ایسے مسائل میں
لب کشائی کرتے ہو جو بال سے بھی زیادہ باریک ہیں اور بظاہر ہو بھی
ہوشمند، مگر تمہیں ایک دینی فریضہ کا پتہ نہیں ہے۔ میں یہ سن کر شرمندہ
ہو گیا[1]

حجاج کی وفات جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ ۹۵ھ میں ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے بھی ۹۴ھ میں امام اعظم کی عمر صرف چودہ سال کی ہوتی ہے اور اسی عمر کے شخص کو عربی زبان میں غلام کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چودہ سال کی عمر میں امام اعظم علم کلام اور علوم عقلیہ کی تکمیل کر چکے تھے۔

امام اعظم اور علوم عقلیہ

قرآن حکیم اور فنون ادب کے بعد امام اعظم نے اپنی پوری توجہ علوم عقلیہ پر مرکوز کر دی تھی اور علوم عقلیہ میں مہارت کا یہ مشغلہ بیس سال کی عمر تک قائم رہا۔ امام زرنگری نے امام ابو عبداللہ ابن ابی حفص کی زبانی جو واقعہ لکھا ہے کہ،

امام اعظم کوفہ میں پیدا ہوئے اور علم الکلام کی تلاش کرتے رہے اور لوگوں
سے اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے تا آنکہ اس میں ماہر ہو گئے۔

تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ علمی طلب گاریوں میں مرکزی مقام علوم عقلیہ کو حاصل تھا اور یہ بھی لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ ایک عرصہ تک اس فن کے زور سے مختلف مدارس کا مقابلہ کیا۔ رائے عامہ کے دماغی سکون کے لیے دلائل کا سامان فراہم کیا۔

آپ کی کلامی اور عقلی علوم کی جولانگاہ صرف کوفہ ہی نہ تھا بلکہ آپ کی اس فن میں اس درجہ شہرت ہو چکی تھی کہ جہمیت اور ارجاء کے استیصال کی خاطر کوفہ سے باہر بھی جانا پڑا۔ شیعہ اور خوارج کے ساتھ امام اعظم نے علوم عقلیہ میں اپنی خداداد علمی صلاحیتوں سے جن جن فرقوں کو ان کے غلط عقائد پر خبردار کیا یہ ہیں جہمیہ اور مرجیہ۔ ان فرقوں کے ظہور سے ایسے مسائل منصہ شہود پر آئے جن کا براہ راست اسلامی عقائد سے تعلق تھا۔ ان مسائل میں جو مسئلے خاص طور پر توجہ علمی کے مستحق رہے ہیں یہ ہیں۔

---

[1] مناقب صدر الائمہ ج ا ص ۶۴

ایمان، تقدیر، صفاتِ الٰہی۔ ان میں سب سے اہم ایمان ہے اور یہ بے حد افسوس اور صدمہ والی بات ہے کہ جو چیز اسلام میں سب سے اہم ہے اُمت میں سب سے پہلا اختلاف اسی میں رونما ہوا۔ حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں،

یہ مسائل یعنی اسلام، ایمان، کفر و ایمان وہ بنیادی مسائل ہیں جن پر شقاوت اور سعادت اور جنتی و ناری ہونے کا دارو مدار ہے مگر اُمت ان ہی میں سب سے زیادہ اختلاف کا نشانہ بنی ہے [۱]

اس اختلاف کی نزاکت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کی بنیاد پر امام اعظم ہی کے زمانے میں ایک سے زیادہ مدارسِ فکر پیدا ہو گئے تھے۔

حافظ ابن تیمیہ شرح العقیدۃ الاصفہانیہ میں فرماتے ہیں کہ جہم بن صفوان کی رائے میں ایمان صرف معرفت کا نام ہے، حافظ ابن حزم نے الفصل فی الملل والاہواء والنحل میں لکھا ہے کہ اس کے نزدیک اگر ایک شخص زبان سے بھی انکار کرے۔ بتوں کی پوجا بھی کرے، قلادۂ یہودیت ڈال لے مگر اسے معرفت قلبی حاصل ہو تو مومن کامل ہے۔

خوارج کا خیال ہے کہ ایمان دل کی تصدیق، زبانی اقرار اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے ان کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب مومن نہیں ہے کیونکہ عمل ایمان کا رکن ہے۔

ان مدارس کے سامنے امام اعظم نے بھی اس مسئلہ پر گفتگو فرمائی۔ اولاً اس لیے کہ ایمان اسلامی زندگی کی بنیادی اینٹ ہے اگر یہی غلط ہو تو اس پر اٹھی ہوئی ساری عمارت غلط ہو کر رہ جائے گی۔ دوسرے اس لیے بھی کہ یہی اسلامی شہریت کے لیے فیصلہ کن چیز ہے۔ اس کا فیصلہ ہونے پر اسلام کا مالیاتی نظام، اقتصادی اور اجتماعی نظام قائم ہو سکتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر امام اعظم کے لیے ناگزیر اور بیحد ناگزیر تھا کہ یہ واضح کریں کہ ایمان کیا ہے اور مسلمان کسے کہتے ہیں؟

مسئلہ ایمان اور امام اعظمؒ

افراط و تفریط کی ان دونوں صورتوں میں کہ ایک فریق صرف قلبی معرفت کو ایمان کہتا ہے اور دوسرا اس کے مقابلے میں عمل کو بھی ایمان بتا رہا ہے۔ امام اعظم نے جو راہ اختیار کی ہے وہ ایک

---

[۱] جامع العلوم والحکم ص ۲۷

طرف اگر قرآن وسنت کی تصریحات کے مطابق ہے تو دوسری طرف عقل کو بھی اپیل کرتی ہے اور خود وجدان بھی اسے باور کرنے میں پس وپیش نہیں کرتا ہے۔ امام اعظم نے بتایا ہے کہ ایمان نام ہے ان تمام باتوں کو جو نبوت محمدیہ لے کر آئی ہے باور کر لینے اور ماننے اور اس کے اقرار کرنے کا۔ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ دراصل یہاں تین چیزیں ہیں۔ دل کی تصدیق، زبان کا اقرار اور اعمال۔ تصدیق ایمان کا رُکن ہے۔ اقرار شرط اور اعمال کی حیثیت مکمل اور متمم کی ہے۔ اگرچہ قرآن وسنت میں ان گنت مقام پر ایمان کا تذکرہ ہے لیکن چونکہ قرآن کا اور نبوت کا طریق تعلیم اور اسلوب بیان دونوں فطری ہوتے ہیں اس لیے وہاں ہر بات فنی اصطلاحات سے بالا ہو کر سادہ طور پر سامنے آتی ہے۔ اسی ایمان کو دیکھ لیجئے جس میں دل کی تصدیق، زبان کا اقرار اور اعمال سب ہی داخل ہیں لیکن ان میں ہر ایک کا مقام الگ ہے۔ دل کی تصدیق اور اعمال میں باہمی ربط، اقرار کی حیثیت اور پھر اعمال میں باہم مراتب کا فرق سمجھانا کس قدر مشکل ہے مگر ذاتِ نبوت نے ان سب کو نہایت سادہ طریق پر سمجھا دیا ہے ارشاد ہے کہ بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ ... الخ اسلام کا محل پانچ ستونوں پر قائم ہے محل میں چھت ہوتی ہے، ستون ہوتے ہیں، در و دیوار ہوتے ہیں اور ان سب کے مجموعہ کا نام محل ہے پھر اس مکان کی کوئی بنیاد بھی ہے جس پر یہ پوری عمارت کھڑی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اتنا بڑا مکان تو آنکھوں سے نظر آتا ہے لیکن بنیاد جس پر محل کی یہ عمارت قائم ہے آنکھوں سے اوجھل رہتی ہے وہ زمین نیچے ہوتی ہے اسی طرح اسلام بھی ایک مجموعہ کا نام ہے اس کے بھی اجزاء ہیں اس کی بھی ایک بنیاد ہے اس کے اجزاء میں ایسا ہی فرق ہے جیسے مکان کے اجزاء میں۔ ظاہر ہے کہ مکان کی قیام کے لیے جس قدر ستونوں کی حاجت ہے اتنی طاق اور روشندان کی نہیں۔ اسی طرح یہاں ارکان خمسہ، اقرار شہادتین، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج اسلام کے ستون ہیں اور یہ پانچوں ستون تصدیق قلبی کی بنیاد پر کھڑے ہیں۔ جس طرح مکان کی بنیاد زمین میں مدفون ہوتی ہے ایسے ہی تصدیق بھی دل میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ ایک موٹی سی مثال سے صاحب نبوت نے جادۂ اہل حق کیسے واضح فرما دیا اور تصدیق وعمل کے باہمی ربط اور پھر اعمال کے باہم فرق مراتب کو کس عمدگی سے سمجھا دیا ہے اسی بات کو امام اعظم نے علوم رسمیہ کے شیدائیوں کے سامنے رکن، شرط اور مکمل کا نام لے کر پیش کیا ہے چونکہ تصدیق کا معاملہ دل سے متعلق ہے اور دل کے حالات کے جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے اس لیے ارکان خمسہ میں سے زبان کے اقرار کو قرآن وسنت میں ضروری بتایا ہے۔ حافظ

ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

اسلام کے ثبوت کا دار و مدار کسی ایسی چیز پر ہونا چاہیے جس کا علم یکساں طور پر سب کو ہو سکے اس لیے توحید کا زبانی اقرار ہی مسلمان ہونے کا معیار قرار دیا گیا اور اسی ایک کلمہ کو جنگ کے آغاز و خاتمہ کا مدار بنا دیا گیا[1]

ایک دوسرے موقعہ پر فرماتے ہیں:

جب تک اقرار نہ ہو ہمارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس کے دل میں تصدیق موجود ہے یا نہیں۔ لہٰذا اگر ایک شخص اقرار نہیں کرتا تو ہم سمجھیں گے کہ اس کو تصدیق قلبی حاصل نہیں ہے۔ اس لیے اقرار کا ہونا نہایت ضروری ہے[2]

اسی لیے امام اعظم ایمان میں دل کی تصدیق کے ساتھ زبان کے اقرار کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں اگرچہ بعد میں آنے والے فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ اقرار کی حیثیت کیا ہے۔ ایک جماعت رکن بتاتی ہے اور دوسری جماعت شرط قرار دیتی ہے۔ شرط ہو یا رکن، صرف تصدیق کا نام ایمان نہیں ہے اس کی پوری وضاحت امام اعظم کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابو عمرو بن عبدالبر نے ابو مقاتل کے حوالے سے نقل کیا ہے:

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ ایمان تصدیق و معرفت کے ساتھ اسلام کے زبانی اقرار کا نام ہے۔ لوگ تصدیق میں تین قسم کے ہیں کچھ زبان و دل دونوں سے مانتے ہیں، کچھ زبان سے مانتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے، کچھ دل سے مانتے ہیں مگر زبان سے نہیں مانتے۔ پہلا طبقہ تو اللہ اور لوگوں کے نزدیک مومن ہے۔ دوسرا طبقہ عنداللہ تو مومن نہیں مگر لوگوں میں مومن ہے کیونکہ لوگوں کو دل کا حال معلوم نہیں اقرار کی بنا پر ان کے ذمہ ان کو مومن ہی کہنا ہے تیسرا طبقہ اللہ کے یہاں مومن ہے مگر عندالناس کافر ہے[3]

---

[1] کتاب الایمان ص ۱۷۲ [2] کتاب الایمان ص ۸۰ [3] الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الفقہاء ص ۱۶۸

یہاں تصدیق کے ساتھ اقرار ہی پر زور دیا ہے اور اسلامی زندگی میں اس کی اہمیت بتائی ہے اقرار کو ایمان میں کس قدر اہمیت ہے اس کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے ہوتا ہے جو صدر الائمہ مکی نے لکھا ہے :

جہم بن صفوان آپ کے پاس آیا اور ایمان کے موضوع پر گفتگو کی ، بولا کہ میں آپ سے ایمان کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، امام صاحب نے فرمایا کہ تا حال تمہیں ایمان کا پتہ نہیں ہے بولا کہ پتہ تو ہے مگر کچھ شک ہے فرمایا کہ ایمان میں شک کا نام کفر ہے ۔ بولا ذرا میری بات تو سن لیجئے فرمایا کہو بولا یہ بتائیے کہ ایک شخص جسے اللہ کی ذات کی معرفت حاصل ہے لیکن زبان سے اقرار نہیں کرتا ہے کیا وہ مومن ہے یا کافر؟ فرمایا کہ جب تک زبان سے اقرار نہ کرے کافر ہے ۔ بولا کافر کیونکر ہو سکتا ہے اسے معرفت حاصل ہے امام صاحبؒ نے فرمایا کہ اگر تم قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہو اور اسے حجت بھی سمجھتے ہو تو دلائل قرآن سے دوں ورنہ غیروں کے انداز پر گفتگو کروں ۔ جہم بن صفوان نے کہا کہ میں قرآن کو اللہ کی کتاب مانتا ہوں، امام صاحبؒ نے فرمایا کہ قرآن میں اللہ سبحانہٗ کا ارشاد گرامی ہے ۔ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا ۔۔ الی ۔۔ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا ۔۔ اس آیت میں اللہ سبحانہٗ نے عَرَفُوْا کے ساتھ يَقُوْلُوْنَ (کہتے ہیں) اور قَالُوْا (انہوں نے کہا) لا کر بتا دیا کہ ایمان کے لیے دل کی معرفت کے ساتھ زبان کا اقرار بھی شرط ہے ۔ اور ایمان قلب و زبان دونوں سے مطلوب ہے ۔ ایک ارشاد ہے قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ایک اور ارشاد ہے وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى یہاں بھی کلمۃ التقوی سے اقرار شہادتین مراد ہے ۔ ایک اور مقام پر ہے هُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ یہاں الطیب من القول سے توحید و رسالت کا اقرار ہی مقصود ہے ۔ نیز فرمایا :

اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ - اور یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡقَوۡلِ الثَّابِتِ - ان آیات میں بھی الکلم الطیب اور القول الثابت سے مراد زبان ہی کا اقرار ہے۔ یہ تو قرآن ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سلسلے میں فرمایا ہے قُوۡلُوۡا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفۡلِحُوۡا اس میں لا الہ الا اللہ کہنے پر فلاح کو موقوف قرار دیا ہے۔ قرآن و حدیث کے بعد خود انسانی بصیرت بھی یہی کہتی ہے کہ اگر ایمان صرف دل کی معرفت کا نام ہوتا اور اقرار کی ضرورت نہ ہوتی تو پھر ہر منکر قلبی معرفت کے بعد مومن ہوتا اور ابلیس کا مومنوں میں شمار ہوتا کیونکہ اسے یہ معرفت تو کہ اللہ ہی اس کا خالق، مالک، محیی، اور ممیت ہے، حاصل ہے اور تمام کافر بھی مومن ہونے چاہئیں کیونکہ قرآن میں ان کی معرفت کا اقرار ہے اس کے بعد متعدد قرآنی آیات پیش فرمائی ہیں [1]

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام اعظم اقرار کو ایمان میں رکنیت کا درجہ دیتے ہیں کیونکہ اقرار بھی ایک قسم کی تصدیق کا نام ہے۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ ماننا دل کی اور اقرار زبان کی تصدیق ہے۔ امام اعظم کے نزدیک ایمان صرف، تصدیق قلبی کا نام نہیں ہے بلکہ اقرار اور التزام طاعت بھی اس کا اہم جزء ہے۔ اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہد وفاداری نہیں کرتا تو وہ مومن نہیں کہلا سکتا۔ ابو مقاتل نے امام اعظم سے جو ایمان کی تعریف نقل کی ہے اس میں اقرار کا متعلق اسلام کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

اَلۡاِیۡمَانُ ھُوَ الۡمَعۡرِفَۃُ وَالتَّصۡدِیۡقُ وَالۡاِقۡرَارُ بِالۡاِسۡلَامِ [2]

ایمان معرفت، تصدیق اور طاعت کے اقرار کا نام ہے۔

الفقہ الاکبر میں اسلام کی حقیقت خود امام اعظم نے جو بتائی ہے یہ ہے:

اَلۡاِسۡلَامُ ھُوَ التَّسۡلِیۡمُ وَالۡاِنۡقِیَادُ لِاَوَامِرِ اللّٰہِ [3]

اسلام ماننے اور احکام الٰہی کی سراپا پیروی کا نام ہے۔

---

[1] المناقب بصدر الائمہ ص ۵۴ تا ۵۸ [2] الانتقاء ص ۱۶۸ [3] الفقہ الاکبر ص ۳۵

اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ ایمان صرف تصدیق کا نام نہیں بلکہ انقیاد اور التزام طاعت بھی اس کا اہم رکن ہے جیسے تصدیق رکھ کر التزام طاعت کا عہد نہ کرنا اسلام نہیں ہے ایسے ہی صرف فرمانبرداری کا التزام رکھ کر قلب و زبان سے تصدیق کے لیے آمادہ نہ ہونا ایمان نہیں ہے ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ زبان و دل تصدیق سے مزین ہوں اور اسلامی دستور حیات کو اپنانے کا عزم صمیم ہو اقرار کا لفظ ایمان میں بے معنی اور بے جان نہیں ہے۔

امام اعظم کے ایمان میں اس قانونی موقف نے کہ ایمان نام ہے اقرار و تصدیق دونوں کا۔ دونوں فرقوں کی تردید کر دی جہمیہ کی بھی اور مرجئہ کی بھی۔

ایمان کی اسی حقیقت کو امام احمد بن حنبل نے اس طرح پیش فرمایا ہے۔

اہل السنۃ والجماعۃ مومن کی تعریف یہ ہے کہ اس کی شہادت دے کہ اللہ سبحانہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں وہ یگانہ ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور شہادت دے کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ نیز دوسرے پیغمبر جو کچھ لائے ہیں ان باتوں کا زبان سے اقرار کرے اور جو کچھ اس کی زبان کہے دل اس کا ساتھ دے ایسے آدمی کے ایمان میں کوئی شک نہیں[1]

امام اعظمؒ کی علم کلام میں تصانیف

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اسی زمانے میں امام اعظم نے علم الکلام کے موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جن میں ان فرقوں کے مقابلے میں اہل السنۃ والجماعۃ کے موقف کو واضح فرمایا ہے۔ یہ بات کہ اس موضوع پر امام اعظم کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ معتزلہ کی اڑائی ہوئی ہے چنانچہ حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں:

هٰذَا كَلَامُ الْمُعْتَزِلَةِ وَدَعْوَاهُمْ أَنَّهُ لَيْسَ لَهُ فِي عِلْمِ الْكَلَامِ لَهُ تَصْنِيفٌ[2]

یہ معتزلہ کی بات ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ امام اعظم کی علم کلام میں کوئی تصنیف نہیں ہے

---

[1] مناقب احمد لابن الجوزی [2] الجواہر المضیۃ ج ۲ ص ۱۶۴

اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس قسم کی افواہوں سے معتزلہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ امام اعظم کو اپنے مزعومات کی اشاعت کے لیے استعمال کر سکیں۔

علامہ بیاضی نے اشارات المرام میں علم الکلام کے موضوع پر امام اعظم کی جن تصانیف کی نشاندہی کی ہے وہ یہ ہیں۔ الفقہ الاکبر، الرسالہ، الفقہ الابسط، کتاب العالم والمتعلم اور الوصیۃ۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کتابوں کی تالیف بھی اس زمانے کے رواج کے مطابق املائی طرز پر ہوئی ہے۔

> اَمْلَاھَا عَلٰی اَصْحَابِہٖ مِنَ الْفِقْہِ الْاَکْبَرِ وَالرِّسَالَۃِ وَالْفِقْہِ الْاَبْسَطِ وَکِتَابُ الْعَالِمِ وَالْمُتَعَلِّمِ وَالْوَصِیَّۃِ[1]

علامہ طاش کبریٰ زادہ نے پوری قوت سے یہ بات بتائی ہے کہ:

> امام اعظم نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ الفقہ الاکبر اور العالم جیسی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ یہ کہنا کہ یہ کتابیں امام اعظم کی نہیں معتزلہ کی اڑائی ہوئی باتیں ہیں[2]

علامہ بزازی نے تصریح کی ہے کہ:

> یہ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے کہ علم کلام میں امام ابوحنیفہ کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ الفقہ الاکبر اور العالم والمتعلم میں نے خود علامہ شمس الدین کی ارقام فرمودہ دیکھی ہیں اور ان پر لکھا ہوا تھا کہ یہ امام اعظم کی تصانیف ہیں[3]

صدر الاسلام ابوالیسر بزدوی نے اپنی مشہور کتاب اصول دین میں جو حال ہی میں مصر میں ڈاکٹر ہانس پیٹر لنس کی تحقیق سے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر آئی ہے اس میں امام اعظم کے بارے میں تصریح کی ہے کہ:

> قَدْ صَنَّفَ فِیْھَا کُتُبًا وَقَعَ بَعْضُھَا اِلَیْنَا[4]
>
> آپ نے علم کلام میں کچھ کتابیں لکھی ہیں جن میں سے کچھ ہمیں ملی ہیں۔

یہ ابوالیسر فروع و اصول میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور لکھا ہے کَانَ اِمَامَ الْاَئِمَّۃِ عَلَی الْاِطْلَاقِ

---

[1] اشارات المرام ص ۲۱ [2] مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۲۹ [3] مناقب کردری ج ۱ ص ۱۰۸
[4] اصول دین بزدوی ص ۴

صرف پانچ واسطوں سے امام محمد کے شاگرد ہیں چنانچہ ان کی سند یہ ہے:

عَنْ اسمٰعیل بن عبد الصادق عن جدہ ابی الیسر عبد الکریم
عن ابی المنصور الماتریدی عن ابی بکر الجوزجانی عن ابی سلیمان
عن محمد [1]

علامہ بیاضی نے امام اعظم کی ان کتابوں کی تاریخی اور روایتی حیثیت کو شرح و بسط سے لکھا ہے وہ فرماتے ہیں:

الفقہ الاکبر، الرسالہ، الفقہ الابسط، العالم والمتعلم اور الوصیۃ کی امام اعظم سے روایت میں مرکزی حیثیت حماد بن ابی حنیفہ، قاضی ابو یوسف، ابو مطیع الحکم بن عبد اللہ اور ابو مقاتل حفص بن مسلم کی ہے۔ ان ائمہ سے ان کتابوں کو اسماعیل بن حماد، محمد بن مقاتل، محمد بن سماعہ، نصیر بن یحییٰ اور شداد بن حکیم نے روایت کیا ہے [2]

آخر میں لکھتے ہیں کہ ان کتابوں کو نصیر بن یحییٰ اور محمد بن مقاتل سے امام ابو منصور ماتریدی نے روایت کیا ہے۔ علامہ زاہد کوثری رقمطراز ہیں:

علم کلام میں امام اعظم کا یہ علمی سرمایہ اُمت کو وراثت میں ملا ہے۔ الفقہ الاکبر، اس کی سند یہ ہے علی بن احمد الفارسی عن نصیر بن یحییٰ عن ابی مقاتل عن عصام بن یوسف عن حماد بن ابی حنیفہ عن ابی حنیفہ۔ الفقہ الابسط، اس کی سند یہ ہے۔ ابو زکریا یحییٰ بن مطرف عن نصیر بن یحییٰ عن ابی مطیع البلخی عن ابی حنیفہ۔ العالم والمتعلم۔ اس کی سند یہ ہے۔ الحافظ احمد بن علی عن حاتم بن عقیل عن الفتح بن ابی علوان و محمد بن یزید عن الحسن بن صالح عن ابی مقاتل عن ابی حنیفہ۔ الرسالہ۔ نصیر بن یحییٰ عن محمد بن سماعہ عن ابی یوسف عن ابی حنیفہ کی سند سے مروی ہے اور اسی سلسلہ سند سے الوصیۃ بھی مروی ہے [3]

تاریخ و روایت کی یہ شہادتیں بتا رہی ہیں کہ علم کلام میں امام اعظم نے جو علمی سرمایہ چھوڑا ہے

---

[1] الفوائد البہیہ ص ۳، [2] اشارات المرام ص ۲۲ [3] مقدمہ اشارات ص ۵ -

وہ امام اعظم ہی کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ اس پر تفصیلی مباحث انشاء اللہ ہماری کتاب "امام اعظم اور علم الکلام" میں آئیں گی۔

علم کلام اور اس کا حکم

علم کلام کے موضوع پر امام اعظم کے بیانات پڑھ کر شاید آپ یہ خلش محسوس کریں کہ امام صاحبؒ علم الکلام کی تعلیم و تعلم کی اشاعت کو اُمت میں پسند نہ کرتے تھے لیکن ایسا نہیں ہے۔ صدر الاسلام ابوالیسر بزدوی نے اپنی کتاب اصولِ دین میں اس کی وضاحت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

> علم کلام دراصل ان مسائل کا نام ہے جن کی حیثیت اسلام میں اُصولِ دین کی ہے اور جن کا سیکھنا فرضِ عین ہے۔ امام ابوحنیفہ نے یہ علم حاصل کیا ہے اور اس کے ذریعے معتزلہ اور تمام اہلِ بدعت سے مناظرہ کیا ہے۔ آغاز میں آپ اپنے اصحاب کو اس کی تعلیم بھی دیتے تھے اور اس علم میں آپ نے کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں جن میں سے کچھ تک ہماری رسائی ہوئی ہے اور کچھ کو اہلِ بدعت نے خورد بُرد کر دیا۔ جو کتابیں امام اعظم کی ہم کو ملی ہیں ان میں العالم والمتعلم اور الفقہ الاکبر ہے۔ العالم والمتعلم میں امام اعظم نے یہ بات کھول کر سمجھائی ہے کہ علم کلام پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ چنانچہ اسی کتاب میں ہے کہ متعلم کہتا ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ علم کلام نہ پڑھنا چاہیے کیونکہ صحابہ کرام نے یہ علم نہیں پڑھا ہے۔ عالم کہتا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ ہاں ٹھیک ہے ہمیں بھی علم کلام نہ پڑھنا چاہیے جیسے صحابہ نے نہیں پڑھا لیکن تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ ہمارے اور صحابہ کے معاشرے میں کیا فرق ہے جن حالات سے ہمیں دین کی زندگی میں دوچار ہونا پڑ رہا ہے ان سے صحابہ دوچار نہیں تھے۔ ہمارا ایسے معاشرے سے سابقہ پڑا ہے جن کی زبانیں مسلکِ حق کے خلاف چھوٹ اور بے لگام ہیں۔ جن کے یہاں ہمارا خون روا ہے کیا اس ذہن کے گرد و پیش میں ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ راست رو اور غلط کار میں ایک حدِ فاصل اور خطِ تمیز قائم کریں۔ یوں

سمجھو کر صحابہ ایسے خوش آئند ماحول میں تھے جہاں جنگ کا نام و نشان نہ تھا
امن و سکون کی زندگی تھی۔ یقیناً ایسے ماحول میں سامان جنگ اور جنگی تیاری
کی ضرورت نہیں ہے اور ہمارا حال یہ ہے کہ ایک جنگجو طبقہ نے حملہ کر کے
ایمان و اعتقاد کی زندگی کا امن و سکون تہ و بالا کر دیا ہے۔ اس لیے
ہمیں ان سے نمٹنے کے لیے سامان جنگ کی ضرورت ہے۔ اور فوجی
ٹریننگ کی بھی۔ ہمارے اکثر فقہاء نے لوگوں کو علم کلام سیکھنے سے
روک دیا ہے لیکن جو امام ابوحنیفہ کے پیروکار ہیں وہ اس کی تعلیم و
تعلم کے جواز کے قائل ہیں البتہ انھوں نے عمر کے آخری حصہ میں اس
میں مناظرے سے روک دیا تھا[1]

گویا امام اعظم کی نظر میں علم کلام کو ایمان کے لیے ایک دفاعی سرمایہ کی حیثیت میں اپنانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ علامہ بیاضی نے اشارات المرام میں بھی امام صاحب کے اس بیان کی وضاحت فرمائی ہے جو بات روز اوّل علم الکلام کے بارے میں امام اعظم نے فرمائی ہے کہ اس کی حیثیت ایک دفاعی سرمایہ کی ہے وہ ہی بات اس علم کے بڑے بڑے شہسواروں نے آخر میں کہی ہے۔ چنانچہ امام الحرمین ابو محمد جوینی نصیحۃ المسلمین میں فرماتے ہیں۔

قرآن کے دلائل غذا کے درجے میں ہیں۔ ہر انسان ان سے فائدہ اٹھا
سکتا ہے۔ کلامی موشگافیاں دوا کی حیثیت میں ہیں کچھ کے لیے سود مند
مگر بہتوں کو اس کے استعمال سے نقصان ہو رہا ہے۔ قرآنی تصریحات
پانی کی طرح ہیں دودھ پیتا بچہ بھی پی سکتا ہے لیکن کلامی کچھ کے
روغنی کھانے صرف طاقتور ہی کھا سکتے ہیں اور وہ بھی زیادہ سے
گاہ گاہ بیمار ہو جاتے ہیں۔

امام غزالی جیسے کلامی محقق نے اپنی زندگی کی آخری تالیف میں اقرار کیا ہے کہ:

اِنَّمَا الْمَقْصُوْدُ مِنْہُ حِفْظُ عَقِیْدَۃِ اَھْلِ السُّنَّۃِ وَحِرَاسَتِھَا
عَنْ تَشْوِیْشِ اَھْلِ الْبِدْعَۃِ[2]

---

[1] اصول دین بزدوی صدر الاسلام ص ۴ [2] المنقذ من الضلال ص ۶۶

علم کلام سے مقصود صرف بدعتیوں سے اہل السنہ کے عقیدہ کی حفاظت اور نگرانی ہے۔

ان اقراروں سے میں تو یہی سمجھا ہوں کہ جو بات اوّلاً امام صاحبؒ کی زبان پر آئی بالآخر وہی وقت کا آوازہ بن گیا۔ امام اعظم نے یہی تو بتایا ہے کہ علم الکلام کا اساسی مقصد اسلامی سوسائٹی کے لیے عقائد کی فراہمی کا کسی خاص عقلی منہج پر سلیبس تیار کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی غایت صرف یہ ہے کہ جن لوگوں نے خود فریبی سے شک وارتیاب کی گود میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ اپنے اس فیصلے پر جمتے ہوئے اسلام پر حملہ آور ہو رہے تھے اور اس حملے کے لیے یونانی فلسفے کے میگزین سے ہتھیار مانگ کر لاتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس طرح وہ اسلام کی عمارت کو گرادیں گے۔ اُصولِ جنگ کے مطابق یہ تو سب ہی کرتے ہیں کہ اپنے ہتھیاروں سے دوسروں کا مقابلہ کریں۔ اپنی قوّت دوسروں کے مقابلے پر صرف کریں لیکن یہ تو انتہائی فراست اور زیرکی کہیے یا وقت کی سیاسی مہارت کہ گھر سے مقابلہ کے ارادے سے نکلے ہیں اور خالی ہاتھ ہیں۔ ارادہ ہے کہ اپنی دولت اور سرمائے کو آنچ نہ آئے اور میدان بھی ہاتھ آجائے چنانچہ ایسا ہی ہوا قرآنی دلائل اپنی جگہ رہے سنّت کی پکار اپنے مقام پر۔ ان ہی کے میگزین سے دلائل کا اسلحہ لے کر ان سے مقابلہ کیا اسی کا تذکرہ کرتے ہوئے امام غزالی نے لکھا ہے:

> لٰکِنَّھُمْ اِعْتَمَدُوْا فِیْ ذٰالِکَ عَلٰی مَا تَسَلَّمُوْھَا مِنْ خُصُوْمِھِمْ
>
> لیکن متکلمین نے اس معاملے میں اپنے مدمقابل کے مسلّمات کا ہی سہارا لیا ہے۔

اور

> وَکَانَ اَکْثَرُ خَوْضِھِمْ فِیْ اِسْتِخْرَاجِ مُنَاقِضَاتِ الْخُصُوْمِ وَمُؤَاخَذَتِھِمْ بِلَوَازِمِ مُسَلَّمَاتِھِمْ۔
>
> ان کی فکری توجہ صرف یہ تھی کہ مدمقابل کا توڑ کیا جائے اور ان کے مسلّمات کے لوازم ہی سے ان کی گرفت کی جائے۔

اس سے مقصود یہی بتانا ہے کہ علم الکلام کا مقصد اصلی اپنوں کو مطمئن کرنا نہیں بلکہ دوسروں کو چپ کرانا ہے۔

الغرض امام اعظم کے بارے میں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ امام موصوف علم کلام کو کسی درجے میں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ امام اعظم کے موقف کو اس روشنی میں سمجھنا چاہیے کہ

علم کی دُنیا نے علم الکلام میں امام اعظم کو متکلم اوّل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ امام عبدالقاہر بغدادی شافعی نے بتایا ہے کہ علم کلام کے موضوع پر اوّلیت کا شرف امام اعظم کو حاصل ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

أَوَّلُ مُتَكَلِّمِيهِمْ مِنَ الْفُقَهَاءِ وَ أَرْبَابِ الْمَذَاهِبِ أَبُو حَنِيفَةَ وَالشَّافِعِيُّ فَإِنَّ أَبَا حَنِيفَةَ لَهُ كِتَابٌ فِي الرَّدِّ عَلَى الْقَدَرِيَّةِ سَمَّاهُ الْفِقْهَ الْأَكْبَرَ وَ لَهُ رِسَالَةٌ أَمْلَاهَا فِي نُصْرَةِ قَوْلِ أَهْلِ السُّنَّةِ أَنَّ الْاِسْتِطَاعَةَ مَعَ الْفِعْلِ [1]

فقہا میں سب سے پہلے متکلم ابوحنیفہ اور شافعی ہیں۔ ابوحنیفہ نے قدریہ کے رد میں فقہ اکبر نامی کتاب تصنیف کی ہے۔ موضوع استطاعت پر اہل السنۃ کے موقف کی نصرت میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے۔

علامہ ابوالمظفر اسفرائنی نے امام اعظم کی کلامی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے [2] ابن الندیم نے بھی ان کتابوں کا پتہ دیا ہے اور آخر میں آپ کی وسعت علمی کے بارے میں لکھا ہے :

اَلْعِلْمُ بَحْرًا وَ بَرًّا شَرْقًا وَ غَرْبًا بُعْدًا وَ قُرْبًا [3]

دور، نزدیک، مشرق، مغرب اور خشکی و تری میں آپ ہی کا علم ہے۔

تاریخ الاسلام السیاسی کے مولف حسن ابراہیم حسن نے بھی ابن الندیم کی ہمنوائی کی ہے۔ الغرض میں بتا یہ رہا تھا کہ امام اعظم کی طلب علم کی داستان میں علوم عقلیہ کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اتنی اہمیت کہ اس میں ناموری اور شہرت کے پیش نظر امام شعبی نے امام اعظمؒ کو ۹۲ھ میں علم الشرائع کے لیے مطالعہ علمی اور مجالست علماء کا مشورہ دیا۔ علم الشرائع کے طالب علم کی حیثیت سے امام اعظم اپنے استاد حماد کے پاس ۱۰۲ھ میں یعنی چوبیس سال کی عمر میں گئے اور پورے اٹھارہ سال کے بعد علم الشرائع کی تعلیم و تمرین سے فراغت کے بعد مجتہد کی حیثیت سے ۱۲۰ھ میں لوگوں میں رونما ہوئے۔ ۹۵ھ سے ۱۰۲ھ تک کا پورا وقت امام اعظم نے علم حدیث پر صرف کیا ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے آپ کو ذرا انتظار کی زحمت گوارا کرنی ہوگی۔ سر دست تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پندرہ سال کی عمر میں علوم عقلیہ

---

[1] اصول الدین عبدالقاہر بغدادی ص ۳۰۸ [2] التبصیر ص ۱۱۳
[3] الفہرست لابن الندیم ص ۲۵۵

اور فنونِ عصریہ میں اتنی مہارت ہوجانا کہ اسی کو فن کی حیثیت سے اپنا لینا اور اسی پر مختلف مدارسِ فکر سے مقابلہ کرنا امام صاحب کا ایک ممتاز کارنامہ ہے۔ جہم سے مقابلہ کی داستان آپ سن چکے ہیں۔ اس کے علاوہ کلامی مسائل میں امام صاحبؒ کے دوسرے فرقوں سے بھی مناظرے ہوتے ہیں مگر ہم ان کو یہاں نظر انداز کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ مسائل بہت طویل الذیل ہیں اندیشہ ہے کہ اپنے موضوع سے دور نہ ہو جائیں۔

امام اعظمؒ طالبعلمِ علمِ حدیث کی حیثیت سے

۹٦ھ میں امام اعظمؒ نے پہلا حج کیا ہے جیسا کہ حافظ ابن عبدالبر اور خوارزمی نے تصریح کی ہے اور اسی حج میں تفقہ فی الدین کے موضوع پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن الحارثؓ کی زبانِ مبارک سے یہ ارشاد سنا ہے یہ گویا علمِ حدیث کی ابجد ہوتی ہے۔

مَنْ تَفَقَّهَ فِي دِيْنِ اللهِ كَفَاهُ اللهُ هَمَّهٗ وَرَزَقَهٗ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔

جس نے اللہ کے دین میں فقاہت پیدا کرلی۔ اللہ اس کے رنج وغم میں کافی ہے اور اس کو ایسے مقام سے رزق دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا[1]

امام شعبی کے کہنے سے دل پہلے ہی مائل ہوچکا تھا۔ اس ارشادِ نبوت سے زخمی ہوگئے اور ۹٦ھ سے ہی علم الشرائع کی طرف رخ کرلیا۔ اور زندگی کے اس موڑ پر آپ نے تمام علوم کا باہم موازنہ کیا مگر علم الشرائع کے لیے چونکہ علم الحدیث ناگزیر تھا اس لیے آغاز یہیں سے کیا اور ۹۸ھ سے علمِ حدیث کے طالب علم کی حیثیت اختیار کرلی اور ۹۸ھ سے شروع ہوکر ۱۰۲ھ تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ اگرچہ کام کا آغاز تو علمِ حدیث میں ۹۸ھ میں ہوچکا تھا مگر پوری باقاعدگی کے ساتھ پورا کا پورا وقت ۱۰۰ھ سے لگایا ہے۔ ۱۰۲ھ تک یہ سلسلہ قائم رہا اور سب سے پہلے اپنے شہر کے مشہور محدث علامۃ التابعین سے استفادہ کیا۔ امام شعبی کی حدیث میں جلالتِ شان کا اندازہ کرنا ہو تو امام زہری کا حسبِ ذیل بیان پڑھیے:

---

[1] جامع بیان العلم

علماء چار ہیں سعید مدینے میں، شعبی کوفہ میں، حسن بصری بصرہ میں اور
مکحول شام میں [1]

فن حدیث میں یہ امام اعظم کے اکابر شیوخ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ تذکرۃ الحفاظ میں
امام ذہبی نے جہاں امام شعبی کے تلامذہ میں امام اعظم کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی تصریح کردی ہے وَهُوَ
اَكْبَرُ شَيْخٍ لِاَبِي حَنِيْفَةَ۔ [2]

اور معلوم ہے کہ امام شعبی متکلم نہ تھے۔ ان سے امام اعظم کا تلمذ صرف ان کے فن ہی میں ہو سکتا
ہے اور ان کا فن علم حدیث کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

امام عبداللہ بن عون البصری ۱۵۱ھ جو امام شعبی کے بھی شاگرد ہیں اور جن کے بارے میں امام
عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں مَا كَانَ بِالْعِرَاقِ اَعْلَمَ بِالسُّنَّةِ عراق میں ان سے زیادہ
حدیث کا عالم کوئی نہ تھا۔ ان کا امام شعبی کے بارے میں بیان ہے:

اِذَا وَقَعَتِ الْفَتْوٰى انْقَبَضَ الشَّعْبِيُّ

جب کوئی فتویٰ آجاتا تو امام شعبی کو گھٹن ہوتی تھی [3]

اس سے معلوم ہوا کہ فقہ بھی امام شعبی کا فن نہ تھا بلکہ ان کا فن خود ان کے اعتراف کے مطابق
حدیث اور صرف حدیث تھا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

اِنَّا لَسْنَا بِالْفُقَهَاءِ وَلٰكِنَّا سَمِعْنَا الْحَدِيْثَ فَرَوَيْنَا الْفُقَهَاءَ

ہم فقہا نہیں ہیں ہم تو احادیث سن کر فقہاء کے سامنے پیش کرتے ہیں [4]

امام شعبی کا اپنا فن حدیث تھا اور اس میں اس قدر جامعیت تھی کہ مشہور محدث عاصم الاحول
جو امام الحفاظ شعبہ بن الحجاج، امام المحدثین یزید بن ہارون، امیر المومنین فی الحدیث عبداللہ
بن مبارک کے استاد ہیں فرماتے ہیں:

مَا رَاَيْتُ اَحَدًا اَعْلَمَ بِحَدِيْثِ اَهْلِ الْكُوْفَةِ وَالْبَصْرَةِ
وَالْحِجَازِ مِنَ الشَّعْبِيِّ۔

میں نے کوفیوں، بصریوں اور حجازیوں کی حدیث کا امام شعبی سے زیادہ عالم کوئی نہیں دیکھا۔ [5]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۵ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۹
[4]، [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۹

اس تمام تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ ناظرین اوراق کے سامنے امام اعظم کی داستان طلب علم حدیث واضح اور صاف ہو کر آجائے۔

آپ چاہیں تو ان تاریخی حقائق کی روشنی میں اس داستان کو اس طرح سمیٹ سکتے ہیں۔

۱۔ حفظ قرآن بقرأت عاصم سنہ ۸۶ھ تا سنہ ۸۸ھ ۲ سال بعمر ۸ سال
۲۔ نحو وادب سنہ ۸۸ھ تا سنہ ۸۹ھ ۲ سال بعمر ۱۰ سال
۳۔ علم الکلام سنہ ۹۰ھ تا سنہ ۹۴ھ ۵ سال بعمر ۱۴ سال
۴۔ مناظرہ سنہ ۹۵ھ تا سنہ ۹۸ھ ۴ سال بعمر ۱۸ سال
۵۔ علم الحدیث سنہ ۹۹ھ تا سنہ ۱۰۳ھ ۵ سال بعمر ۲۳ سال
۶۔ فقہ وعلم الشرائع سنہ ۱۰۴ھ تا سنہ ۱۲۰ھ ۱۷ سال بعمر ۴۰ سال

گویا چالیس سال کی عمر میں امام اعظم اپنے استاد کی جگہ پر بحیثیت ایک متقن، مجتہد، فقیہ، محدث اور مفسر کے تشریف فرما ہوئے۔

بیس سال کی عمر میں علم حدیث پڑھنے کی وجہ

اس عمر میں حدیث کا طالب علم بننے میں کوفہ کے اس رواج کو بہت بڑا دخل ہے جس کی کچھ نشاندہی محدث خطیب بغدادی نے کی ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ کوفہ میں کچھ رواج ہی یہ چل پڑا تھا کہ طلب حدیث کی طرف بیس سال کی عمر میں قدم بڑھایا جائے۔ چنانچہ الخطیب رقمطراز ہیں۔

اِنَّ اَهْلَ الْكُوفَةِ لَمْ يَكُنِ الْوَاحِدُ يَسْمَعُ الْحَدِيْثَ اِلَّا بَعْدَ اِسْتِكْمَالِهِ عِشْرِيْنَ سَنَةً۔

کوفہ والوں میں سے کوئی شخص بیس سال کی عمر سے پہلے حدیث کا طالب علم نہ بنتا تھا[1]

امام الحسن بن عبد الرحمٰن رامہرمزی کہتے ہیں کہ میرے سے ایک سے زیادہ مشائخ نے ذکر کیا ہے کہ محدث موسیٰ بن اسحاق سے جب دریافت کیا گیا کہ تم نے ابو نعیم سے حدیث کیوں نہیں لی؟ تو انہوں نے جواب دیا:

---

[1] الکفایہ فی علم الروایہ ص ۵۵

اہل کوفہ اپنے بچوں کو بچپنے میں علم حدیث کا طالب علم نہ بنانے تھے بلکہ
بیس سال کی عمر میں اس کے لیے روانہ کرتے تھے[1]

موسیٰ بن ہارون کہتے ہیں کہ بصرہ میں حدیث پڑھنے کے لیے دس سال، کوفہ میں بیس سال اور شام میں تیس سال کا طریقہ رائج تھا۔

اوروں کا پتہ نہیں ہے مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ امام اعظم کے اس عمر میں طلب حدیث کے عزم میں کوفہ کے اس رواج کو بہت بڑا دخل ہے۔ الغرض بیس سال کی عمر میں ۹۹ھ میں امام اعظم نے سب سے پہلے اپنے شہر کے جلیل القدر محدث امام شعبی کے سامنے زانوئے شاگردی طے کیا جیسا کہ ملا علی قاری نے حافظ ابوسعد السمعانی کے حوالے سے خود امام صاحب کی زبانی لکھا ہے کہ:

میں دینی علوم میں لوگوں سے گفتگو کرتا تھا ایک بار مجھ سے ایک فریضہ
کے بارے میں پوچھا گیا مجھے جواب نہ آیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ الدین، عقائد،
میں موشگافیاں کرتے ہو اور فرائض کا پتہ بھی نہیں ہے۔ میں شرمندہ
ہو گیا بعد ازیں میں امام شعبی کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا[2]

امام شعبی کی خدمت میں جیسا کہ بتا چکا ہوں صرف حدیث کے لیے آتے تھے اور آنے کی وجہ الکردری نے خود امام صاحب ہی کی زبانی یہ بتائی ہے۔

كَانَ الشَّعْبِيُّ مِنْ اَعْلَمِ النَّاسِ[3]

علم حدیث میں زمانۂ طالب علمی میں امام اعظم کی سبقت

بہر حال ۱۰۰ھ میں امام اعظم نے بیس سال کی عمر میں علم حدیث حاصل کرنا شروع کیا اور جس محنت و کوشش سے انہوں نے اس علم کو حاصل کیا ہے ان کے ہم عصروں میں سے بہت ہی کم نے اس محنت سے حاصل کیا ہوگا۔ حافظ سمعانی لکھتے ہیں:

اِشْتَغَلَ بِطَلَبِ الْعِلْمِ وَبَالَغَ فِيْهِ حَتّٰى حَصَلَ لَهٗ مَا
لَمْ يَحْصُلْ لِغَيْرِهٖ۔
وہ طلب علم میں مشغول ہوئے تو اس درجہ ہوئے کہ جس قدر ان کو حاصل

---

[1] توضیح الافکار ج ۲ ص ۲۹۴ [2] الجواہر المضیۃ ص ۴۶۴ [3] مناقب کردری ج ۲ ص ۲

ہوا دوسروں کو نہ ہو سکا [1]

حافظ ذہبی الامام الحافظ مسعر بن کدام سے جو زمانہ طالب علمی میں کوفہ کے اندر امام صاحبؒ کے رفیق ہیں نقل کرتے ہیں :

میں امام اعظم کا رفیق مدرسہ تھا وہ علمِ حدیث کے طالب علم بنے تو حدیث میں ہم سے آگے نکل گئے یہی حال زہد و تقویٰ میں ہوا اور فقہ کا معاملہ تو تمہارے سامنے ہے [2]

کوفہ ہی میں رہتے ہوتے امام صاحب کا علمِ حدیث میں مسعر بن کدام اور ان کے ساتھیوں سے آگے نکل جانا اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ سب سے پہلے امام اعظم نے کوفہ میں جس قدر علمِ حدیث تھا اس کی تحصیل کی کیونکہ مسعر بن کدام کی علمی رفاقت امام اعظم کو کوفہ ہی میں حاصل ہوتی ہے۔ علم کی خاطر مسعر بن کدام کا کوفہ سے باہر جانا ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ امام مسعر بن کدام نے حدیث کی خاطر کبھی کوفہ سے باہر کا سفر نہیں کیا [3]

امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مسعر بن کدام کا مفصل اور مبسوط چہرہ قلم بند کیا ہے۔ علمِ حدیث میں ان کا پایہ معلوم کرنا ہو تو حافظ ابو محمد الرامہرمزی کا یہ بیان پڑھئے کہ امام شعبہ اور سفیان ثوری میں جب کسی حدیث میں اختلاف ہوتا تو دونوں کہا کرتے تھے۔

ہم دونوں کو مسعر کے پاس لے چلو جو اس علمِ حدیث کی ترازو ہیں [4]

امیر المومنین فی الحدیث امام شعبہ کہتے ہیں کہ ہم نے بہت زیادہ تقدس کی وجہ سے ان کا نام ہی مصحف رکھا ہوا تھا۔

غور فرمایئے کہ امام شعبہ اور سفیان ثوری امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔ ان کا علم جس شخص کے بارے میں یہ فیصلہ دے کہ وہ علمِ حدیث کی ترازو ہے۔ علمِ حدیث میں اس کی جلالت قدر کا کیا حال ہوگا؟ اور پھر خود یہ میزان علمِ حدیث جس شخص کے بارے میں یہ انکشاف کرے کہ وہ علمِ حدیث میں مجھ سے بھی آگے ہے تو پھر اس کا علمِ حدیث میں کیا مقام ہوگا۔ اس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ کوفہ ہی میں جس قدر علمِ حدیث پھیلا ہوا تھا اسے امام اعظم نے سمیٹ لیا تھا۔ اسی بنا پر امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں کہ :

---

[1] کتاب الانساب ص ۱۵۶ [2] مناقب ذہبی ص ۲۷ ، [3] ، [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۹

بخدا امام اعظمؒ اللہ اور اس کے رسُول کی باتوں کے اس دُنیا میں سب
سے بڑے عالم تھے[1]

اور جس کی علمیت کا نہیں بلکہ اعلمیت کا یحییٰ دعویٰ کریں علم حدیث میں اس کی جلالت قدر کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ یاد رہے کہ خطیب نے بحوالہ یحییٰ بن معین تصریح کی ہے کہ یحییٰ بن سعید القطان فتویٰ میں امام اعظمؒ کے قول کو اپناتے تھے اور اہلِ کوفہ میں سے امام صاحب ہی کی رائے کو ترجیح دیتے تھے۔ کبھی فرماتے کہ ابوحنیفہ نے بے شمار باتیں بہترین فرمائی ہیں اور کبھی کہتے کہ بخدا ہم نے ابوحنیفہ سے زیادہ بہتر رائے والا کوئی نہیں سُنا ہے ہم ان کی اکثر و بیشتر باتوں کو اپناتے ہیں[2]

امام اعظمؒ کے حدیث میں اساتذہ

امام اعظمؒ کے اساتذہ حدیث میں صحابہ، تابعین اور اتباعِ تابعین تینوں ہیں۔ ان سے باہر کوئی نہیں ہے۔ یعنی سب اساتذہ اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جس کی خیریت کی زبانِ نبوّت نے شہادت دی ہے۔ حافظ ابوالحجاج المزی نے تہذیب الکمال میں اگرچہ اساتذہ کا شمارہ صرف ۷۴ بتایا ہے جن کی تفصیل حافظ سیوطی نے تبییض الصحیفہ میں پوری درج کر دی۔ لیکن حافظ ذہبی نے عَدَدٌ کَثِیْرٌ مِنَ التَّابِعِیْنَ کہہ کر مشہور محدث ملا علی قاری کے دہانِ قلم سے نکلی ہوئی اس بات کو سچا کر دیا جو انھوں نے شرح مسند امام میں لکھی ہے کہ:

امام اعظمؒ کے اساتذہ صحابہ، تابعین اور اتباعِ تابعین میں سے
بہت ہیں جن کی مجموعی تعداد چار ہزار ہے[3]

اور اس کی حافظ ابن حجر مکی نے بھی یہ لکھ کر تصدیق کی ہے کہ:

ابوحفص کبیر نے ان میں سے چار ہزار اساتذہ حدیث ذکر کیے ہیں۔

حافظ ابوبکر الجعابی نے اپنی کتاب الانتصار میں ان مشائخ کا مبسوط ترجمہ لکھا ہے اور ان سے صدر الائمہ نے مناقب میں نقل کیا ہے۔

امام اعظمؒ کے اساتذہ حدیث کی عظمت

امام اعظمؒ کو اساتذہ کے معاملے میں سب ائمہ حدیث سے ممتاز کرنے والی چیز صحابہ کرام کے سامنے

---

[1] ماتمس الیہ الحاجہ ص ۱۰ [2] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۴۷ [3] شرح مسند احمد ص ۲۰۰

زانوئے ادب طے کرنا ہے۔ یہ اساتذہ ہی کی عظمت ہے جس کا اظہار خود امام صاحب نے سربراہ حکومت عباسیہ ابوجعفر منصور دوانیقی کے سامنے برسرِ دربار کیا ہے۔

ربیع بن یونس کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ امیر المومنین ابوجعفر منصور کے پاس آئے اس وقت دربار میں امیر کی خدمت میں عیسٰی بن موسٰی بھی موجود تھے۔ عیسٰی نے امیر المومنین کو مخاطب کرکے کہا اے امیر المومنین ھٰذَا عَالِمُ الدُّنْیَا الْیَوْمَ۔ یہ آج تمام دنیا کے عالم ہیں۔ ابوجعفر منصور نے امام اعظم سے دریافت کیا کہ اے نعمان! تم نے کن لوگوں کا علم حاصل کیا ہے امام صاحب نے فرمایا کہ امیر المومنین! میں نے فاروق اعظمؓ، علی مرتضیٰؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، اور عبداللہ بن عباسؓ کا علم حاصل کیا ہے۔ ابوجعفر نے کہا کہ آپ آپ تو علم کی ایک مضبوط چٹان پر کھڑے ہیں [1]

تلامذہ کی عظمت کا اندازہ ان کے اساتذہ کی عظمت سے ہوتا ہے۔ اسی بنا پر حافظ ابن حجر عسقلانی نے مقدمہ میں امام بخاری کے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے اوّلین طبقہ تابعین کو قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

اَلطَّبَقَةُ الْاُوْلٰی مَنْ حَدَّثَهٗ عَنِ التَّابِعِیْنَ

اور پھر ان تابعین کے یہ نام بتاتے ہیں۔ مکی بن ابراہیم، ابوعاصم النبیل، عبیداللہ بن موسیٰ، ابونعیم الفضل بن دکین اور خلاد بن یحییٰ، مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ جن اساتذہ پر امام بخاری کے لیے طبقہ اولیٰ ہونے پر حافظ ابن حجر عسقلانی کو فخر ہے وہ خلاد بن یحییٰ کو چھوڑ کر سب کے سب امام اعظم کے شاگرد ہیں [2]

صدر الائمہ مکی شمس الائمہ زرنجری سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابوحفص صغیر کے زمانے میں ایک بار احناف و شوافع میں بحث چھڑ گئی کہ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ میں افضل کون ہے؟ امام ابوحفص صغیر نے فرمایا کہ دونوں کے اساتذہ شمار کرلو۔ چنانچہ امام شافعی کے اساتذہ گنے گئے تو اسّی ہوئے پھر امام اعظم کے مشائخ کا حساب لگایا گیا تو چار ہزار نکلے۔ امام ابوحفص نے فرمایا

---

[1] تاریخ بغداد بجامع المسانید [2] مناقب ذہبی ص ۱۱، ۱۲۔

کھذا ادنیٰ من فضائل ابی حنیفۃ ۔ یہ امام اعظمؒ کی برتری کی ادنیٰ شہادت ہے۔[1]
امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں عبداللہ بن المبارک کی زبانی نقل کیا ہے کہ میں نے چار ہزار اساتذہ سے علم حدیث حاصل کیا ہے اور پھر ایک ہزار سے روایت کی۔ عباس کہتے ہیں کہ ان میں سے آٹھ سو کی روایات مجھے بھی ملی ہیں۔ حافظ کبیر ابوداؤد طیالسی ۲۰۴ھ کا بیان ہے کہ میں نے ایک ہزار اساتذہ سے احادیث لکھی ہیں[2] امام بخاری فرماتے ہیں:

میں نے ایک ہزار اسی حضرات سے حدیث لکھی ان میں ہر ایک محدث تھا[3]

حافظ ابو یوسف یعقوب بن سفیان کا بیان ہے کہ میں نے پورے تیس سال رحلت میں بسر کیے اور ایک ہزار سے زائد اساتذہ سے حدیثیں سنی ہیں جو سب کے سب ثقاہت کی ترازو میں پورے تھے مگر سوچنے کی بات ہے کہ امام بخاری، امام ابوداؤد اور امام یعقوب کے اساتذہ کی یہ تعداد کوئی قابل تعجب نہیں ہے کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ محدثین اطراف و آفاق عالم اسلامی میں پھیل چکے تھے اور جابجا اسناد و روایت کے دفاتر کھلے ہوئے تھے۔ اتباع تابعین میں سے ایک شخص کے ہزارہا شاگرد اور پھر ہر شاگرد کے ہزارہا شاگرد تھے۔ تمام بلاد اسلامیہ میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں درسگاہیں قائم تھیں اور بڑے زور شور سے درس حدیث ہو رہا تھا۔ اس زمانے کی شہری زندگی میں علم حدیث اس قدر رائج تھا کہ ایک ایک محدث کے حلقہ درس میں ہزارہا طلبہ کی شرکت ایک معمولی بات تھی۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مسند عراق امام علی بن عاصم واسطی امام اعظم کے مشہور شاگرد کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے حلقہ درس میں تیس ہزار سے زیادہ طلبہ کا ہجوم ہوتا تھا[4] اور ان ہی کے صاحبزادے امام ابوالحسین عاصم بن علی ۲۲۰ھ جو امام بخاری کے بھی استاد ہیں اور جن سے انہوں نے اپنی صحیح میں روایات بھی لی ہیں ان کے بارے میں حافظ ذہبی نے لکھا ہے ـــ بغداد آئے ان کے املائی درس میں لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ ابوالحسین بن المبارک کا بیان ہے کہ ان کی مجلس درس میں طلبہ کا اندازہ ایک لاکھ انسانوں سے اوپر لگایا جاتا تھا[5] عمر بن حفص کہتے ہیں کہ معتصم باللہ

---

[1]، [2] مناقب موفق ص ۳۸ ۔ [3] مقدمہ فتح الباری ص ۵۲۴ ۔
[4]، [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۵۹ ۔

نے ایک بار اپنے کارندوں کو رحبتہ النخل میں صرف اس مقصد کی خاطر روانہ کیا تھا کہ اندازہ لگائیں کہ امام عاصم کے درس حدیث میں کتنی تعداد ہے؟ امام عاصم چھت پر بیٹھ کر لوگوں کو سناتے تھے میں نے ایک روز سنا ہے کہ فرما رہے تھے حدثنا اللیث بن سعد ہجوم اتنا تھا کہ آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی آپ نے اسی روز ایک کلمہ چودہ بار کہا اس مجلس کے شرکاء کا اندازہ لگایا گیا تو ایک لاکھ بیس ہزار تھے[1] امام اعظم ہی کے ایک اور شاگرد خاص ہیں یزید بن ہارون، جو فن حدیث میں مشہور امام ہیں ان کے متعلق یحییٰ بن طالب کا بیان ہے کہ ان کی مجلس میں ستر ہزار کی حاضری ہوتی تھی[2] بلکہ امام محمد کے بارے میں حضرت امام شافعی کا بیان ہے کہ امام محمد جب کوفہ میں موطا کا درس دیتے تو ان کی فرودگاہ پر لوگوں کا اتنا ہجوم ہوتا تھا کہ جگہ تنگ ہو جاتی اسی زمانے میں امام شافعی تحصیل علم کی خاطر کوفہ تشریف لائے تھے کیونکہ یہ بتانے سے پہلے امام شافعی نے امام محمد کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ امام محمد فرماتے ہیں کہ میں امام مالک کی خدمت میں تین سال رہا ہوں اور اس عرصہ میں میں نے ان سے سات سو حدیثیں سنی ہیں[3] اور یہ ساری داستان امام مالک کی وفات کے بعد کی ہے اس کی پوری تفصیل اسد بن فرات نے اس طرح بتائی ہے کہ:

> ہم ایک روز امام محمد کے حلقہ درس میں موجود تھے دفعۃً ایک شخص گردنیں پھلانگتا ہوا امام محمد کے پاس آیا اور ہم نے امام محمد کی زبان سے یہ الفاظ سنے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ مُصِیْبَۃٌ مَا اَعْظَمَھَا مَاتَ مَالِکُ بْنُ اَنَسٍ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الْحَدِیْثِ اِنَّا للہ کتنی بڑی مصیبت ہے کہ امیر المومنین فی الحدیث امام مالک کی وفات ہو گئی ہے۔ امام محمد جب اس کے بعد امام مالک سے حدیثیں بیان کرتے تو لوگ امام مالک کی حدیثوں کے شوق میں اس کثرت سے آپ کی خدمت میں آتے کہ آپ کے یہاں آنے کے راستے بند ہو جاتے اور جب امام مالک کے سوا کسی اور کی حدیثیں

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۳۵۹ - [2] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۹۲
[3] الانتقاء ص ۵۳ [4] نیل الامانی

بیان کرتے تو خواص ہی خواص آتے [۱]

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس دور میں جب گھر گھر حدیث کا چرچا تھا محدثین کے لیے اساتذہ کی یہ تعداد حیرت انگیز نہیں ہے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس وقت امام اعظم کے لیے اساتذہ کی یہ تعداد کیسے پیدا ہو گئی جبکہ علم حدیث کی ابھی صبح صادق ہی طلوع ہوئی ہے۔ امیر المومنین عمر بن عبد العزیز کی جانب سے ۱۰۱ھ میں سرکلر جاری کیا گیا کہ احادیث جمع کی جائیں جیسا کہ آپ انشاء اللہ آئندہ اوراق میں اس کی تفصیل پڑھیں گے۔ اس سرکلر کے بارے میں حافظ ابو نعیم نے بتایا ہے کہ یہ آفاق یعنی اطراف مملکت میں روانہ کیا گیا۔ اس آفاق سے مراد مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ اور دمشق ہیں۔ کیونکہ اس زمانے میں یہی وہ مقامات تھے جہاں سے علم نبوی کے چشمے ابل ابل کر سارے عالم میں رواں ہو رہے تھے چنانچہ حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں :

> یہ پانچ شہر مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ اور شام ہی ہیں جن سے علوم نبوت یعنی ایمانی، قرآنی اور شرعی علوم نکلے ہیں [۲]

ورنہ علم حدیث کی تدوین فن روایت و اسناد کے لحاظ سے دور تابعین کے آخر میں وجود پذیر ہوئی ہے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں۔

> زمانہ تابعین کے آخر میں تدوین آثار کا کام رونما ہوا ہے۔ [۳]

الغرض اس دور میں جبکہ روایت و اسناد کی فنی طور پر ابھی صبح صادق ہی طلوع ہوئی ہے۔ اساتذہ کی یہ تعداد کثیر اس بات کی شہادت ہے کہ امام اعظمؒ نے علم حدیث حاصل کرنے میں بہت بڑی محنت، عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ الغرض امام اعظمؒ نے علم حدیث میں اس درجہ کمال پیدا کر لیا تھا اور ایسی محنت کی کہ امام علی بن عاصم جیسا نامور محدث امام اعظم کے بارے میں یہ اقرار چھوڑ گیا۔

> اگر ابو حنیفہ کے علم کو دوسروں کے علم کے مقابلے میں تولا جائے تو ابو حنیفہ کا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔ [۴]

---

[۱] نیل الامانی [۲] منہاج السنہ ج ۴ ص ۱۴۲ [۳] مقدمہ فتح الباری ص ۴
[۴] مناقب امام اعظم الذہبی ص ۴۔

امام اعظمؒ کے اساتذہ میں پہلا طبقہ

امام اعظم کے ان اساتذہ میں سب سے پہلا طبقہ صحابہ کرام کا ہے محدثین کے ایک طبقہ نے مثلاً حافظ ولی الدین عراقی، حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ سخاوی نے خالص اسنادی اور روایتی نقطہ نظر سے امام اعظم کے صحابہ کے تلمذ پر لم تصح روایتہ روایت صحیح نہیں ہے لکھ دیا ہے۔ اس سے بہتوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ امام اعظم کو صحابہ سے شرف تلمذ ثابت نہیں بلکہ اس کا عدم ثابت ہے اور صحابہ کے نام سے امام کی روایات موضوع ہیں حالانکہ اصول محدثین کی رُو سے ایسا سمجھنا خطرناک غلطی ہے اور نہ صرف غلطی بلکہ فن روایت کے مسلّمہ اصول و قواعد سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے۔ مولانا عبدالحی فرماتے ہیں کہ،

> محدثین بسا اوقات لا یصح اور لا یثبت کا لفظ بولتے ہیں ناداں اس کا مطلب یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ حدیث محدثین کے یہاں موضوع یا ضعیف ہے ایسا سوچنا ان کی اصطلاح سے جہالت اور ان کی تصریحات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے[1]

مشہور محدث ملا علی قاری نے تذکرۃ الموضوعات میں لکھا ہے کہ صحیح نہیں ہے، کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ بات گھڑی ہوئی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حسن یا ضعیف ہے۔ علامہ نورالدین جواہر العقدین فی فضل الشرفین، میں فرماتے ہیں کہ امام احمد کے حدیث عاشوراء پر لا یصح کے ریمارکس سے یہ لازم نہیں آتا کہ باطل ہے۔ ممکن ہے کہ صحیح تو نہ ہو لیکن قابل استدلال ہو کیونکہ صحیح اور ضعیف کا درمیانی درجہ حسن ہی ہے۔ امام زرکشی نکت علی ابن الصلاح میں فرماتے ہیں کہ محدثین کی دونوں تعبیروں موضوع اور لا یصح میں بہت بڑا فرق ہے۔ موضوع کہنے کا مطلب یہ ہے کہ راوی کا جھوٹ اور بات کا گھڑی ہوئی ہونا ثابت ہو گیا ہے اور لا یصح میں صرف صحیح نہ ہونے کی خبر ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا عدم بھی ثابت ہو۔ حافظ ابن حجر عسقلانی "القول المسدد فی الذب عن مسند احمد" میں لکھتے ہیں کہ حدیث کے صحیح نہ ہونے سے موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔ علامہ محمد بن عبدالباقی شرح مواہب لدنیہ میں حدیث

---

[1] الرفع والتکمیل ص ۸۶

يَطَّلِعُ اللهُ لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَيَغْفِرُ لِجَمِيْعِ خَلْقِهِ اِلَّا
المُشْرِكُ اَوِالمُشَاحِنَ۔

پھر ابن دحیہ کا کلام لم یصح فی لیلۃ نصف شعبان شیئ نقل کر کے رقمطراز ہیں کہ
شاید ابن دحیہ کی مراد اصطلاحی صحت ہے کیونکہ یہ حدیث حسن ہے اگرچہ
درجہ صحت کو نہیں پہنچی [1]

مولانا عبدالحی فرماتے ہیں:
کسی حدیث پر محدثین کا عدم ثبوت اور عدم صحت کا حکم لگانا عرف
محدثین کے مطابق حدیث کے ضعیف اور موضوع ہونے کو لازم نہیں
بلکہ ممکن ہے کہ حدیث حسن لذاتہ یا لغیرہ ہو [2]

اسی بنا پر امام ترمذی اپنی جامع میں ایک حدیث لاتے ہیں اور خود اس کی تضعیف بھی کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ والعمل علیٰ ھٰذا عند اھل العلم۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اسنادی اور روایتی طور پر صحیح نہ ہونے سے اصل بات کا نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ دراصل یہاں حدیث ضعیف بھی دو قسم کی ہیں ایک وہ جس میں شرائط صحت میں سے کوئی شرط نہ ہو اور دوسری وہ جس میں شرائط قبول میں سے کوئی شرط نہ ہو۔ اس لیے امام اعظم کے صحابہ سے تلمذ کے موقعہ پر محدثین کے یہاں لا یصح دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا کہ ان اکابر کے نزدیک یہ داستان گویا بناوٹی ہے بہت بڑی جرأت اور بے باکی ہے۔ مشہور حدیث افتراق اُمت کے متعلق مجدالدین فیروزآبادی نے سفر السعادۃ کے خاتمہ میں یہ لکھا ہے کہ لم یثبت فیہ شیئ (اس موضوع پر کوئی بھی حدیث ثابت نہیں ہے) حالانکہ چند در چند طرق سے آنے کی وجہ سے درجہ صحت کے قریب قریب ہے جیسا کہ امام حاکم لکھتے ہیں کہ ایک سے زیادہ طرق سے اس حدیث کا آنا اس بات کا پتہ دے رہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ مولانا عبدالحی فرماتے ہیں کہ:

صاحب قاموس علامہ مجدالدین نے سفر السعادۃ میں ایک سے زیادہ
احادیث کے بارے میں یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ ثابت نہیں ہیں
اس سے ہمارے زمانے کے ناواقفوں کو دھوکا ہو گیا ہے۔ اور

---

[1] شرح المواہب اللدنیہ ج ۷، ص ۴۰۳ [2] تحفۃ الکملۃ علیٰ حواشی تحفۃ الطلبہ ص ۵

انہوں نے احادیث ثابتہ پر موضوع، ضعیف اور ناقابلِ اعتبار ہونے کا فتویٰ لگادیا[1]

صحابہ سے روایت کا شرف

ذرا اس پر بھی تو غور فرمائیے کہ امام اعظم کی صحابہ سے روایت کی حیثیت واقعات کی دُنیا اور قانون کی نظر میں کیا ہے؟ یہی نا کہ امام اعظم کے لیے ایک جزوی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ وہ فضل و بزرگی ہے جس میں ائمہ میں سے امام اعظم کا شریک کوئی نہیں ہے۔ اگر صرف اتنی بات ہے تو اس میں روایتی و اسنادی کمزوریوں سے صرفِ نظر تو خود محدثین کی طے کردہ پالیسی ہے حلال و حرام میں اسنادی کمزوریوں کو تلاش کرنا محدثین نے ناگزیر بتایا ہے لیکن یہاں تک فضائل اور سیر کا میدان ہے اس میں وہ ضعیف روایات کو بھی شرفِ قبول عطا کر دیتے ہیں مشہور محدث علی الحلبی "انسان العیون فی سیرۃ الامین والمامون" میں رقمطراز ہیں کہ —— سیرت میں صحیح، ضعیف، موضوع، مرسل، منقطع اور معضل سب اسی قسم کی روایات ہوتی ہیں۔ امام احمد نے فرمایا ہے کہ جب ہم حلال و حرام کو موضوع بحث بناتے ہیں تو ہم متشدد ہوتے ہیں اور فضائل میں ہم تساہل ہوتے ہیں خطیب بغدادی نے اس موضوع پر الکفایہ میں ایک مستقل عنوان قائم کر کے ائمہ کی تصریحات جمع کر دی ہیں علامہ ابن سید الناس نے "عیون الاثر فی فنون المغازی والسیر" میں مشہور مؤرخ محمد بن اسحاق کی توثیق پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

> کلبی سے زیادہ تر روایات انساب ایام عرب اور لوگوں کے احوال سے متعلق ہیں اس موضوع پر علماء چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔ ان لوگوں سے بھی روایات لے لیتے ہیں جن کی احکام میں احادیث معتبر نہیں ہوتی ہیں اس میں رخصت ہے اور یہ رخصت امام احمد سے منقول ہے[2]

ملا علی قاری نے مشہور رسالہ "الحظ الاوفر فی الحج الاکبر" میں اس حدیث پر کہ

> اَفْضَلُ الْاَیَّامِ یَوْمُ عَرَفَۃَ اِذَا وَافَقَ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ فَھُوَ اَفْضَلُ مِنْ سَبْعِیْنَ حَجَّۃً

یہ نوٹ لکھا ہے کہ

---

[1] تحفۃ الحکمۃ علی حواشی تحفۃ الطلبہ ص ۵۔ [2] عیون الاثر فی فنون المغازی والسیر ج ۱ ص ۱۵

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ حدیث
ضعیف فضائل میں تمام علماء کے نزدیک قابلِ اعتبار ہے [1]

حافظ سیوطی نے بھی یہ بات طلوع الثریا، التعظیم والمنہ اور المقامۃ السندسیہ میں لکھی ہے۔
حافظ عراقی نے شرح الفیہ میں، امام نووی نے تقریب میں اور سیوطی نے اس کی شرح تدریب
میں اس بات کو بار بار صاف کیا ہے۔ اگر صورتِ حال یہی ہے تو پھر امام اعظم کی اس جزوی فضیلت
کے موضوع پر یہ رد و کد کچھ بے معنی سی بات ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے سب سے
پہلے دارقطنی نے صدیاں گزرنے پر یہ بات لوگوں کو بتائی ہے کہ:

امام ابوحنیفہ نے کسی صحابی سے ملاقات نہیں کی البتہ انہوں نے حضرت
انس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے مگر ان سے کوئی بات نہیں سنی۔

دارقطنی کے بعد خطیب بغدادی نے بھی تاریخ بغداد میں یہی بات دہرائی ہے چنانچہ سعید
بن ابی سعید نیشاپوری کے ترجمہ میں امام اعظم کی ایک حدیث کو بواسطہ امام ابو یوسف بالاسناد
نقل کرنے کے بعد کہ جس میں حضرت انس سے امام اعظم کے سماع کی تصریح موجود ہے لکھتے ہیں:

امام ابوحنیفہ کا حضرت انس سے سماع صحیح نہیں ہے [2]

اور امام ابوحنیفہ کے ترجمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

امام ابوحنیفہ نے انس بن مالک کو دیکھا ہے [3]

اس کے بعد شوافع میں زین الدین عراقی اور ابن حجر عسقلانی بھی ان کے ہی ہم زبان ہو گئے
ورنہ اس سے پہلے اس موضوع پر متقدمین میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا اسی بنا پر ملا علی قاری
شرح مسند امام میں فرماتے ہیں۔

والمعتمد ثبوتہما

پائیدار بات یہی ہے کہ امام اعظم کا صحابہ سے تلمذ ثابت ہے

امام اعظمؒ کا حضرت انس بن مالکؓ سے تلمذ

صحابہ میں جن اکابر کے سامنے امام اعظم نے زانوئے ادب تہ کیا ہے ان میں حضرت انس بن

---

[1] الحظ الاوفر ص ۹ [2] تاریخ بغداد ج ۹ ص ۱۱۱ [3] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۲۴

مالکؓ کا مقام سب سے اونچا ہے ان کی کنیت ابوحمزہ ہے۔ انصارِ مدینہ میں بنی نجار سے تعلق کی وجہ
سے نجاری ہیں۔ ان کی والدہ کا نام ملکہ بنتِ ملحان اور کنیت ام حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے خادمِ خاص ہیں۔ خود فرماتے ہیں کہ آنحضرت مدینہ تشریف لائے میری عمر دس سال تھی حضور
انورؐ رحلت فرمائے دارِ بقا ہوتے تو میں بیس سال کا تھا ان کو ان کی والدہ ہی خدمتِ اقدس میں
لائی تھیں اور عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ! خدمت کے لیے خادم لائی ہوں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم
نے شرفِ قبول عطا فرمایا۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضور انورؐ سے ایک بار دُعا کی درخواست
کی آپ نے دُعا فرمائی اَللّٰھُمَّ اَکْثِرْ مَالَہٗ وَوَلَدَہٗ فرماتے ہیں کہ مال کی اتنی فراوانی ہوئی کہ میرے
نخلستان اور تاکستان میں سال بھر میں دو بار پھل آتا۔ اولاد کا حال یہ ہے کہ میری اولاد اور اولاد کی
اولاد کو اگر اس وقت شمار کیا جائے تو ایک سو کے قریب ہیں۔ حضرت ثابتؓ فرماتے ہیں کہ میں
نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کے ہاتھوں نے حضور انور کے ہاتھوں کو چھوا ہے؟ فرمایا کہ ہاں
حضرت ثابت نے فرمایا ذرا ہاتھ دیجیے میں اس کو بوسہ دوں۔ مسند امام احمد میں ہے نضر بن انس
کہتے ہیں کہ حضرت انس نے روزِ قیامت کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے شفاعت کی درخواست
کی حضور انورؐ نے وعدہ فرمایا حضرت انس نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! میں آپ سے قیامت
کے روز کہاں ملوں؟ فرمایا پل صراط پر دیکھنا وہاں نہ ملوں تو میزانِ عمل پر دیکھنا وہاں بھی نہ ملوں
تو حوضِ کوثر پر ملنا [1]

حافظ ابن کثیر نے ابوبکر بن عیاش کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت انس نے عبدالملک
بن مروان کے پاس حجاج بن یوسف ثقفی گورنرِ حجاز کے متعلق ایک شکایتی خط بھیجا اور لکھا کہ یہود
اور عیسائیوں کو اگر کہیں اپنے نبی کا خادم مل جائے تو وہ اس کا حد درجہ اکرام کریں۔ میں نے پو
دس سال حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گزارے ہیں اور آپ کی خدمت کی ہے لکھا
ہے کہ عبدالملک نے حجاج کو خط لکھا خط میں یہ درج تھا:

> جب میرا خط تم کو ملے، تو ابوحمزہ کے پاس جاؤ اُن کو راضی کرو اُن کے
> ہاتھ اور پاؤں چومو ورنہ تم کو میری جانب سے ایسی سزا ملے گی جس
> کے تم مستحق ہو [2]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۹۷ [2] ایضاً

خط پہنچتے ہی حجاج نے حضرت انسؓ کے پاس جانے کا ارادہ کیا لیکن حجاج ہی کے ایک دوست نے صلح کرا دی۔ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت انس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں عرصہ دراز تک رہے آپ بے شمار احادیث کے امین تھے۔ عمر طویل پائی ہے آپ بصرہ میں دُنیا سے رخصت ہونے والے صحابہ میں آخری صحابی تھے۔ امام بخاری نے ان سے اسی حدیثیں لی ہیں [۱]

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ۹۳ھ میں بصرہ میں آپ کا انتقال ہوا ہے ھذا ھو المشھور و علیہ الجمھور۔ اس وقت امام اعظم کی عمر تیرہ سال تھی۔ علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں، صدر الائمہ مکی نے مناقب میں، حافظ جلال الدین السیوطی نے تبییض الصحیفہ میں حضرت انس کی یہ حدیث بحوالہ امام اعظم درج کی ہے۔

اَبُوْ حَنِیْفَۃَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ [۲]

جیسا کہ امام اعظم کی داستان علم میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ امام اعظم کا زمانہ طلب علم چھٹپنا اور بچپن سے اور آپ کی علمی طلب گاریوں کا آغاز علم کلام سے ہوا ہے۔ بصرہ اس زمانے میں علم کلام کی منڈی تھی۔ علم کلام کی تحصیل کے لیے امام اعظم کا کوفہ سے بصرہ جانا اور بصرہ میں قیام کرنا مشہور

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۴۲

[۲] یہ حدیث حافظ خسرو نے بحوالہ قاضی ابو یوسف عن ابی حنیفہ تین متصل سندوں سے اور قاضی ابوبکر محمد بن عبد الباقی نے اپنے مسند میں دو متصل سندوں سے بیان کی ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی حافظ ابو معشر سے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ میری رائے میں یہ حدیث صحیح کے ہم پلہ ہے کیونکہ میرے علم میں یہ حدیث پچاس طرق سے مروی ہے (تبییض الصحیفہ ص ۶) حافظ سخاوی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے کچھ طرق کی بعض ائمہ نے تصحیح فرمائی ہے۔ حافظ ابو الحجاج المزی کا اعتراف ہے کہ کثرت طرق کی وجہ سے یہ حدیث حسن کے درجے میں ہے اس موضوع پر ان اکابر سے احادیث آتی ہیں۔ ابیؓ، جابرؓ، حذیفہؓ، الحسین بن علیؓ، سلمانؓ، سمرہؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابن مسعودؓ، علیؓ، معاویہؓ، نبیطؓ، ابو سعیدؓ، ابوہریرہؓ، عائشہؓ، ام ہانیؓ وغیرہ وغیرہ۔

ہے امام صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں بصرہ میں بیس سے زیادہ بار گیا ہوں۔ اسی زمانے میں آپ کو حضرت انس کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ حافظ ابو نعیم نے بالتصریح لکھا ہے کہ امام اعظمؒ نے حضرت انس کو دیکھا ہے اور ان سے حدیثیں سُنی ہیں۔

امام اعظمؒ کا حضرت عبداللہ بن الحارث سے تلمذ

یہ بھی جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ ان کی بود و باش مصر میں تھی، ارشادات پیغمبر کے امین تھے۔ اہلِ مصر نے ان سے ارشادات کو سُن کر آگے نقل کیا ہے [1]

حافظ ابن عبد البر نے جامع بیان العلم و فضلہ میں بسند متصل خود امام اعظم کی زبانی نقل کیا ہے:

> امام اعظم فرماتے ہیں کہ میں سولہ سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ حج کو گیا میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ کے ارد گرد لوگوں کا ہجوم ہے میں نے والد محترم سے دریافت کیا کہ یہ بزرگ کون ہیں؟ والد صاحب نے بتایا کہ یہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحابی ہیں۔ ان کا نام نامی عبداللہ بن الحارث ہے میں نے والد صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا فرما رہے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات سُنا رہے ہیں۔ میں نے والد صاحب سے درخواست کی کہ مجھے بھی آگے لے چلیے تاکہ میں بھی ان کی زبانِ مبارک سے ارشاد گرامی سنوں۔ والد محترم لوگوں کو چیرتے پھاڑتے آگے آگے ہو گئے تا آنکہ میں حضرت عبداللہ کے پاس پہنچ گیا میں نے سُنا کہ آپ فرما رہے ہیں کہ میں نے جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا ہے کہ جس شخص نے اللہ کے دین میں فقاہت بہم پہنچائی اللہ اس کو اس کے غم میں کافی ہوگا اور اس کو ایسی جگہ سے روزی پہنچائے گا جہاں کا اس کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا [2]

سبط ابن الجوزی نے الانتصار والترجیح میں حافظ ابو نعیم اصفہانی کے حوالے سے جن صحابہ کرام

---

[1] الاصابہ ج ۲ ص ۵ [2] جامع بیان العلم وفضلہ ج ۱ ص ۴۵

کے بارے میں امام اعظم کی دید وشنید کو مانا ہے ان میں حضرت عبداللہ بن الحارث بن جزء بھی ہیں نیز اس روایت کو الحافظ الاستاذ ابو محمد حارثی، الحافظ ابو عبداللہ الحسین بن محمد اور حافظ ابو بکر محمد بن عبدالباقی نے اپنے مسانید میں باسانید متصلہ درج کیا ہے۔ تاج الاسلام حافظ عبدالکریم سمعانی فرماتے ہیں کہ حافظ ابو بکر الجعابی نے اپنی کتاب الانتصار میں بسند متصل اس کی تخریج کی ہے [1]

حافظ ابن عبدالبر جو خطیب بغدادی کے معاصر بھی ہیں جامع بیان العلم میں حضرت عبداللہ کی یہ حدیث نقل کرنے کے بعد جس میں امام اعظم نے اپنے سماع کی تصریح کی ہے سماع کے ثبوت میں لکھا ہے کہ ابن سعد کا بیان ہے کہ امام اعظم نے حضرت انس بن مالک اور حضرت عبداللہ بن الحارث کو دیکھا ہے اگرچہ حضرت عبداللہ کی وفات کے بارے میں اختلاف ہے اور اختلاف کی وجہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ ہی ہے جو حافظ ذہبی نے اپنی تاریخ کبیر کے مقدمہ میں بتائی ہے کہ متقدمین نے ضبط تاریخہائے وفات کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے صرف اپنے حافظہ پر ہی بھروسہ کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے صحابہ کی تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی اور یہی صورت حال زمانہ شافعی تک تابعین کے بارے میں رہی [2] لیکن حضرت عبداللہ کی اسی حدیث کو حافظ ابو بکر الجعابی نے نقل کرنے کے بعد تصریح کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن الحارث کی تاریخ وفات ۹۷ھ ہے۔ واضح رہے کہ حافظ ابو بکر الجعابی علل حدیث اور تاریخ رجال میں بہت بڑے امام گزرے ہیں۔ حافظ ابو نعیم اصفہانی، حافظ ابو عبداللہ الحاکم اور حافظ دارقطنی نے فن حدیث میں ان کے سامنے زانوئے شاگردی [3] کیا ہے

---

[1] یہ حدیث اگرچہ متعدد سندوں سے آتی ہے لیکن ہم نے جو روایت نقل کی ہے اس کی تخریج حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں بطریق یوسف ابن احمد المکی از ابی جعفر العقیلی و ابی علی الرازی و محمد بن سماعہ از قاضی ابی یوسف امام اعظم سے کی ہے۔ حافظ ابوالحسن علی بن محمد الکنانی نے اس کو ابوالعباس احمد بن الصلت بن المغلس والی روایت کا متابع قرار دیا ہے بلاشبہ احمد بن الصلت پر محدثین کی ایک جماعت نے کچھ کلام کیا ہے مگر حافظ ابو زرعہ حافظ ابو حاتم جیسے ائمہ فن رجال نے ان کی صداقت اور ثقاہت کو سراہا ہے دراصل بعد میں آنے والوں کی برہمی کا باعث یہ ہے کہ احمد صاحب نے ایک ضخیم کتاب امام اعظم کے مناقب پر کیوں لکھی یہ کتاب بعض ارباب ظاہر کے لیے ان کے خلاف برہمی کا باعث ہو گئی حتیٰ کہ دارقطنی کو تو ان پر اس قدر غصہ آیا کہ ان کی اس کتاب ہی کو موضوع قرار دے دیا لیکن حافظ دارقطنی کو جو امام اعظم سے سوء عقیدت ہے اس کی موجودگی میں ان سے کچھ اور توقع ہی بیکار ہے۔

[2] الاعلان بالتوبیخ ص ۱۶۰

چار لاکھ حدیثوں کو نوک زبان کیے ہوئے تھے حافظ ذہبی فرماتے ہیں۔

كَانَ بَارِعًا فِي مَعْرِفَةِ الْعِلَلِ وَ ثِقَاتِ الرِّجَالِ وَ تَوَارِيْخِهِمْ [1]

حدیثوں کی علل شناسی رجال اور ان کی تاریخ میں بڑے ہی ماہر تھے۔

تذکرۃ الحفاظ میں ان کے چہرے کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے۔ الحافظ البارع فرید زمانہ ۔ اگرچہ حافظ ابو بکر الجعابی نے اپنی کتاب الانتصار میں صرف ان دو صحابہ ہی کا تذکرہ کیا ہے مگر امام ابو معشر عبدالکریم نے ان دو کے ساتھ چار کے اور نام بھی بتائے ہیں۔ صدر الائمہ مکی بھی ان کے ہمنوا ہیں حافظ ابو نعیم اصفہانی نے جن کے آگے فن حدیث میں خطیب بغدادی نے بھی زانوئے شاگردی طے کیا ہے لکھا ہے کہ امام اعظم نے صحابہ میں سے حسب ذیل حضرات کو دیکھا اور ان سے حدیثیں سنی ہیں حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن الحارث اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ۔ ملک الحفاظ یحییٰ بن معین جو فن جرح و تعدیل میں مسلّم الثبوت امام اور علم حدیث کے ایک رکن خیال کیے جاتے ہیں اپنی تاریخ میں رقمطراز ہیں،

إِنَّ أَبَا حَنِيْفَةَ صَاحِبَ الرَّأْيِ سَمِعَ عَائِشَةَ بِنْتَ عَجْرَدٍ تَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ أَكْثَرُ جُنْدِ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ الْجَرَادُ لَا أَكُلُهُ وَلَا أُحَرِّمُهُ [2]

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے امام اعظمؒ کا تلمذ

ان کی کنیت کچھ کی رائے میں ابو معاویہ اور کچھ کہتے ہیں کہ ابو ابراہیم ہے۔ حافظ عسقلانی نے لکھا ہے کہ ۸۲ھ میں کوفہ تشریف لائے اور حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ کوفہ کے رہنے والے صحابہ میں یہ آخری صحابی ہیں اور امام بخاری کے حوالے سے ان کی تاریخ وفات ۸۹ھ بتاتی ہے [3] اگر ان کی تاریخ فی الواقع ۸۹ھ ہے تو اس وقت امام اعظم کی عمر نو سال ہے اس عمر میں نہ دیکھنا مستبعد ہے اور نہ سننا۔ اور جب کہ امام اعظم کے خاندان میں اس کا مزید اہتمام بھی تھا کہ بچوں کو صحابہ کی خدمت میں لے جاتے تھے۔ چنانچہ آپ کے والد ماجد ثابت بھی بچپن میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں دعا بھی فرمائی تھی [4] ایسی صورت میں اگر

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۳۰ [2] لسان المیزان ترجمہ عائشہ [3] البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۵ ، [4] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۲۹

امام اعظم نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ کی نو سال کی عمر میں زیارت کی اور حدیثیں سنی ہیں تو اس میں انکار کی کیا بات ہے۔ اس عمر میں جہاں تک روایت سننے کا معاملہ ہے وہ محدثین کے یہاں اتفاقی ہے۔

تحمّلِ روایت کی عمر اور محدثین

تحمّلِ روایت کے لیے نو سال تو بڑی عمر ہے امام بخاری نے کتاب العلم میں متی یصح سماع الصغیر کا عنوان قائم کر کے محمود بن الربیع کی زبانی ایک واقعہ نقل کیا ہے اس واقعہ میں خود ان صحابی کا بیان ہے کہ میری عمر پانچ سال تھی اور الخطیب نے بھی لکھا ہے کہ محمود کی عمر حضور انور کی وفات کے وقت پانچ سال تھی[۱] حافظ ابن عبدالبر نے اس عمر میں روایت لینے پر محدثین کا اتفاق نقل کیا ہے اور حافظ ابن الصلاح نے مقدمہ میں محمود کی اس روایت کی وجہ سے پانچ سال پر محدثین کا عمل بتایا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي اسْتَقَرَّ عَلَيْهِ اَهْلُ الْحَدِيْثِ[۲]

اسی پر محدثین کا عمل ہے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظم کی عمر حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ کے دنیا سے رحلت فرماتے دار البقا ہونے کے وقت نو سال تھی اور یہ محدثین کی قائم کردہ اس تحدید سے کہیں زیادہ ہے جو انہوں نے تحمّلِ روایت کے لیے ضروری قرار دی ہے جیسا کہ حافظ ابن الصلاح نے قاضی عیاض کے حوالے سے بتایا ہے۔

> محدثین نے اس میں ضابطہ یہی بتایا ہے کہ تحمّلِ روایت کی کم از کم عمر محمود کی ہے۔ اس لیے اس کی پذیرائی ہر شک و شبہ سے قطعی طور پر بالا ہے فَاِذَنْ لَا یُنْکَرُ سَمَاعُ الْاِمَامِ مِنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰی[۳]
> اس لیے امام اعظم کا سماع حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے ناقابلِ انکار ہے۔

حافظ ابو معشر عبدالکریم نے اپنے رسالہ میں ان کے حوالے سے امام اعظم کی یہ روایت نقل کی ہے

> امام اعظم فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے سنا ہے وہ کہہ رہے تھے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

---

[۱] الکفایہ فی علوم الروایہ ص ۸۹ [۲] مقدمہ ابن الصلاح [۳] شرح مسند امام اعظم ص ۲۸۹

جس نے مسجد بنائی خواہ وہ چیل کے آشیانے جتنی ہو اللہ اس کے لیے جنت
میں گھر بنائے گا۔

ان مذکورہ صحابہ کے علاوہ حضرت سہل بن سعد الساعدی ۹۱ھ اور ابو الطفیل عامر بن واثلہ ۱۰۲ھ مکہ میں بقید حیات تھے۔ محدثین نے ان سے بھی امام اعظم کی دید و شنید بتاتی ہے۔ اگر امام اعظم نے ان سے بھی کچھ حدیثیں سنی ہیں اور ان کے سامنے بھی چھٹپنے میں زانوئے ادب طے کیا ہو تو اس میں انکار کی کیا بات ہے؟

اتصالِ روایت کی شرط

اتصالِ روایت کی حد تک امام بخاری تو اگرچہ ایک بار ملاقات کو ضروری بتاتے ہیں لیکن امام مسلم کے خیال میں اتصال کے لیے ملاقات ضروری نہیں وہ تو صرف ہم عصر ہونا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ ہم عصری ثابت ہو جانے کے بعد روایت کو بلفظ عن پیش کرنا درست ہے بلکہ امام مسلم تو معاصرت کے ساتھ ملاقات کی شرط کو من گھڑت اور من مانی بات قرار دیتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

اِنَّ اِشْتِرَاطَ اللِّقَاءِ قَوْلٌ مُخْتَرَعٌ لَمْ يُسْبَقْ قَائِلُهُ اِلَيْهِ

ملاقات کی شرط ایک من گھڑت بات ہے اس سے پہلے اس کا کوئی
بھی قائل نہیں ہے۔

اور پھر امام مسلم یہ بھی کہتے ہیں کہ اس دعوے کے پیچھے اجماع کی طاقت ہے۔ یاد رہے کہ امام مسلم کا یہ اختلاف صرف حدیث معنعن میں ہے۔ بہر حال ایسی حالت میں امام اعظم کی احادیث معنعنہ کو جو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں در اصل وہ فن کا منہ چڑاتے ہیں کیونکہ اگر یہ روایات پایۂ ثبوت کو نہ پہنچتیں تو امام یحییٰ بن معین، حافظ ابو نعیم شافعی، حافظ ابن عبد البر مالکی جو حدیث و روایت کے ارکین خیال کیے جاتے ہیں ہرگز اس بات کی تصریح نہ کرتے کہ امام اعظم نے صحابہ سے حدیثیں سنی ہیں۔

الغرض میں اس داستان کو یہیں ختم کرتا ہوں اور بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظم نے علم حدیث کے طالب علم کی حیثیت سے سب سے پہلے اپنے شہر کوفہ کے اساتذہ سے علم حدیث حاصل کیا۔ آیئے پہلے سرراہے کچھ کوفہ میں علم حدیث کا حال سن لیجیے۔

کوفہ میں علم حدیث

فتوح البلدان میں امام احمد بن یحییٰ بغدادی نے بحوالہ نافع بن جبیر بن مطعم حضرت عمر کا کوفہ کے بارے میں یہ تاثر لکھا ہے بِالْكُوفَةِ وُجُوْهُ النَّاسِ (کوفہ میں بڑے لوگ ہیں)

ظاہر ہے کہ حضرت فاروق اعظم یہاں جس وجاہت کا تذکرہ فرما رہے ہیں وہ دینی اور علمی وجاہت کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی تائید خود حضرت فاروق اعظم کے اس خط سے ہوتی ہے جو انہوں نے کوفہ والوں کے نام لکھا ہے اور جسے حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیا ہے:

> میں نے تمہارے پاس عمار بن یاسر کو بحیثیت امیر اور عبداللہ بن مسعود
> کو بحیثیت معلم اور وزیر روانہ کیا ہے۔ یہ دونوں حضور انور صلی اللہ علیہ
> وسلم کے صحابہ میں منتخب اور برگزیدہ ہستیاں ہیں صرف صحابی نہیں
> بلکہ اہل بدر میں سے ہیں تم ان کی اقتداء کرو دیکھو عبداللہ کے معاملے
> میں میں نے تم کو اپنے اوپر ترجیح دی ہے[1]

اس خالص علمی وجاہت کی وجہ سے حضرت فاروق اعظم نے امام ربانی حضرت عبداللہ بن مسعود کو ایک بار کھڑا دیکھ کر فرمایا تھا۔

کُنَیْفٌ مُلِئَ عِلْمًا　　　علم سے بھرا ہوا برتن ہے[2]

اور اسی علمی وجاہت اور جلالت قدر کا اثر تھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی وفات کے بعد جب حضرت علی کوفہ تشریف لائے تو آپ نے یہاں کی فضا کو علم سے معمور پایا۔ چنانچہ مشہور امام ابوبکر عتیق بن داؤد فرماتے ہیں کہ:

> حضرت عبداللہ بن مسعود کی وفات کے بعد جب حضرت علی کوفہ تشریف
> لائے تو حضرت عبداللہ کے تلامذہ لوگوں کو فقہ پڑھانے میں مشغول تھے
> جناب امیر نے کوفہ کی جامع میں آکر دیکھا کہ چار صد کے قریب دواتیں
> رکھی ہوئی تھیں اور طلبہ لکھنے میں ہمہ تن مصروف تھے یہ دیکھ کر حضرت
> علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

---

[1]، [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴

لَقَدْ تَرَكَ ابْنُ اُمِّ عَبْدٍ هٰؤُلَاءِ سُرُجَ الْكُوفَةِ [1]

جب فقہ یعنی علم قانون جو علوم شرعیہ کا آخری درجہ ہے اس کے طلبہ کی تعداد یہ تھی تو ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث کے طلبہ کی تعداد تو اس سے کئی گنا زائد ہوگی۔ چنانچہ امام ابوبکر الجصاص رازی نے احکام القرآن میں حجاج کے خلاف عبدالرحمٰن بن الاشعث کی قیادت میں اٹھی ہوئی تحریک کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

اس تحریک میں نکلنے والوں میں چار ہزار قاریوں کی تعداد تھی [2]

اور حافظ جلال الدین السیوطی نے تدریب الراوی میں امام ابن سیرین سے جو اکابر تابعین سے ہیں حدیث کے طالب علموں کے بارے میں یہ بیان نقل کیا ہے کہ

قَدِمْتُ الْكُوفَةَ وَبِهَا اَرْبَعَةُ الْآفٍ يَطْلُبُوْنَ الْحَدِيْثَ [3]

میں کوفہ آیا تو وہاں چار ہزار حدیث کے طالب علم تھے۔

طبقات ابن سعد کی ایک پوری جلد میں کوفہ کے علماء کا تذکرہ ہے۔ ان میں صحابہ، تابعین، اتباع تابعین کے علماء کا ایک طویل تذکرہ ہے ہم نے سرسری طور پر طبقات میں کوفہ کے علماء کو شمار کیا۔ ان کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ نکلی جبکہ اسی کتاب میں دوسرے شہروں کے علماء کا شمار اس کے عشر عشیر بھی نہیں ہے۔

مشہور محدث حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں اسلامی شہروں کے نامور محدثین کا تذکرہ کیا ہے، مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ تمام شہروں میں یہ شرف صرف کوفہ ہی کو حاصل ہے کہ اس کے ائمہ حدیث کا تذکرہ کتاب کے پورے ساڑھے سات صفحات پر پھیلا ہوا ہے جبکہ دوسرے شہروں میں سے کسی بھی شہر کے محدثین کا تذکرہ اسی کتاب میں ایک صفحہ سے زائد نہیں ہے۔

حافظ ابو محمد رامہرمزی نے اپنی کتاب "المحدث الفاصل" میں کوفہ میں علم حدیث کے موضوع پر مشہور محدث عفان بن مسلم سے بسند متصل نقل کیا ہے:۔

عفان بن مسلم کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہم فلاں کتابیں نقل کر چکے ہیں۔ اس پر فرمانے لگے کہ ہماری رائے میں اس قسم کے لوگ کامیاب نہیں ہوا کرتے۔ ہمارا دستور تو یہ تھا کہ جب ایک استاد کے

---

[1] مناقب موفق ج ۲ ص ۱۳۔ [2] احکام القرآن ج ۱ ص ۱۰۔ [3] تدریب الراوی ص ۲۷۵

پاس جاتے تو اس سے وہ روایتیں سنتے جو کسی اور سے نہ سُنی ہوتیں اور
دوسرے سے وہ سنتے جو پہلے سے نہ سُنی ہوتیں۔ چنانچہ جب ہم کوفہ
آتے تو چار ماہ ٹھہرے اگر ہم چاہتے کہ ایک لاکھ حدیثیں لکھ لیں تو
لکھ سکتے تھے مگر ہم نے صرف پچاس ہزار حدیثیں لکھی ہیں۔ ہم نے
کوفہ میں کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جو عربیت میں غلطی کرتا ہو[1]

اور علامہ تاج الدین سبکی نے الطبقات الشافعیۃ الکبریٰ میں حافظ ابوبکر بن ابی داؤد کی زبانی یہ
بیان لکھا ہے کہ:

میں جب کوفہ میں آیا تو میرے پاس ایک ہی درہم تھا میں نے اس درہم
سے تیس مد باقلا خرید لیا۔ ایک مد کھاتا اور اشج سے ایک ہزار حدیثیں
لکھتا۔ اس طرح ایک ماہ میں میں نے تیس ہزار حدیثیں جن میں مقطوع
اور مرسل بھی شامل تھیں لکھ لیں[2]

ذرا غور فرمایئے اس شہر میں حدیث کی بہتات کا کیا حال ہوگا عفان[3] بن مسلم جیسا امام، عالم، حافظ

---

[1] تقدمہ علی نصب الرایہ ص ۳۵۔ [2] طبقات ص ۱۳۰۔

[3] عفان بن مسلم امام احمد اور امام بخاری کے اُستاد ہیں۔ علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ ان کی عادت تھی کہ اگر حدیث کے کسی بھی لفظ میں ان کو ذرا شبہ ہوتا تو اسے سرے ہی سے چھوڑ دیتے (تقریب) حدیث میں ان کی جلالت شان کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مشہور محدث یحیٰی بن سعید القطان کہتے ہیں کہ جب کسی حدیث میں مجھے عفان کی ہمنوائی حاصل ہو جاتے تو پھر مجھے کسی کی بھی مخالفت کی پرواہ نہیں۔ امام یحیٰی بن معین کہتے ہیں کہ محدثین پانچ ہیں، مالک، ابن جریج، ثوری، شعبہ اور عفان (تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص ۳۴۵) امام احمد فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں عبدالرحمٰن بن مہدی سے زیادہ رسوخ کے مالک ہیں (کتاب الجرح والتعدیل ج ۳ ص ۳۰) ابن ابی حاتم نے ان کے اساتذہ میں حماد بن زید، حماد بن سلمہ اور امام شعبہ کو شمار کیا ہے اور حافظ ابن عبدالبر نے الانتقاء میں حماد بن زید کے بارے میں انکشاف کیا ہے روی حماد بن زید عن ابی حنیفۃ احادیث کثیرۃ (ص ۱۳۰) حافظ ذہبی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہارون الرشید کی جانب سے ان کو سرکاری وظیفہ ملتا تھا۔ خلق قرآن کے مسئلہ میں یہ بھی امام احمد کے ہمنوا تھے۔ سرکار مامون نے ان کو اپنانے کی کوشش کی اسی سلسلے میں ان کا سرکاری وظیفہ بند کرنے کی دھمکی دی گئی تو فرمایا وفی السماء رزقکم الخ خطیب نے وظیفہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کان المامون یجری علی عفان خمسمائۃ درھم کل شھر، امام ذہبی فرماتے ہیں کہ ان کی وفات ۲۲۰ھ میں ہوئی۔ بخاری ابوداؤد کی بھی یہی رائے ہے

چار ماہ میں پچاس ہزار حدیثیں لکھ لے۔ کیا حدیث کی اس بستی کو کوئی ذہین آدمی قلیل الحدیث بستی کہہ سکتا ہے؟
یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبل سے جب ان کے صاحبزادے عبد اللہ نے دریافت کیا کہ آپ کی رائے میں طالب علم کو کیا کرنا چاہیے آیا ایک ہی استاد کی خدمت میں برابر حاضر رہ کر اسی سے حدیثیں لکھتا رہے یا ان مقامات کا رخ کرے جہاں علم کا چرچا ہے اور وہاں جا کر علماء سے استفادہ کرے تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اسے سفر کرنا چاہیے اور دوسرے مقامات کے علماء سے حدیثیں لکھنی چاہئیں اور ان علماء میں سب سے پہلے امام احمد نے کوفیین ہی کا ذکر کیا۔ چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

یَرْحَلُ وَ یَکْتُبُ مِنَ الْکُوفِیِّیْنَ وَ الْبَصْرِیِّیْنَ وَ اَھْلِ الْمَدِیْنَۃِ وَ مَکَّۃَ۔ [1]

سفر کرے اور کوفیوں، بصریوں اور مدینہ اور مکہ والوں سے احادیث لکھے۔

امام بخاری نے طلب حدیث میں بخارا سے لے کر مصر تک تمام اسلامی شہروں کا سفر کیا تھا۔ دو دفعہ جزیرہ گئے چار بار بصرہ جانا ہوا چھ سال تک حجاز میں مقیم رہے مگر اس کے باوجود مکہ و بغداد کو اتنی اہمیت تھی کہ فرماتے ہیں:

میں شمار نہیں کر سکتا کہ محدثین کی ہمرکابی میں کوفہ اور بغداد کتنی بار مجھے جانے کا اتفاق ہوا ہے [2]

آج بھی اگر آپ رجال کی کتابیں کھول کر بیٹھیں تو ہزاروں راوی آپ کو کوفہ کے نظر آئیں گے جن کی روایات سے صحیحین اور غیر صحیحین بھری پڑی ہیں۔ صرف بخاری شریف کو اٹھا لیجیے اور اس میں جس قدر صحابہ سے احادیث منقول ہو کر آئی ہیں ان پر ایک سرسری نظر ڈال لیتے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے بترتیب حروف تہجی مقدمہ فتح الباری میں تمام صحابہ کو نام بنام لکھ دیا ہے۔ ان صحابہ میں سے جو خاص کوفہ میں آکر جاگزیں ہوتے تو ان کے نام پڑھ لیجیے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ امام بخاری کے ان گنت بار کوفہ جانے کا کیا باعث تھا اور پتہ لگ جائے کہ کوفہ کا حدیث میں کیا مقام ہے۔

۱۔ حضرت اشعث بن قیس الکندی رضؓ، ۲۔ حضرت عدی بن حاتم رضؓ، ۳۔ حضرت وہبان بن اوس الاسلمی رضؓ، ۴۔ حضرت عقبہ بن عمرو رضؓ، ۵۔ حضرت بریدہ بن الحصیب رضؓ، ۶۔ حضرت علی بن ابی طالب رضؓ، ۷۔ حضرت جابر بن سمرہ رضؓ، ۸۔ حضرت عمران بن الحصین رضؓ، ۹۔ حضرت جریر بن عبد اللہ رضؓ، ۱۰۔ حضرت عمرو بن حریث رضؓ، ۱۱۔ حضرت

---

[1] تدریب الراوی ص ۲۷۱۔ [2] مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۱

جندب بن عبداللہؓ ۱۲، حضرت مرداس بن مالکؓ ۱۳، حضرت حارثہ بن وہبؓ ۱۴، حضرت مسیب بن حزنؓ،
۱۵۔ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ، ۱۶، حضرت معن بن یزیدؓ، ۱۷۔ حضرت خباب بن الارتؓ ۱۸۔ حضرت مغیرہ
بن شعبہؓ، ۱۹۔ حضرت زید بن ارقمؓ، ۲۰۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ ۲۱۔ حضرت سلمان بن مروؓ ۲۲۔ حضرت
نعمان بن مقرنؓ، ۲۳۔ حضرت سمرہ بن جنادہؓ، ۲۴۔ حضرت نفیع بن الحارثؓ ۲۵، حضرت سنین ابوجمیلہؓ
۲۶۔ حضرت وہب بن عبداللہؓ، ۲۷۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ، ۲۸۔ حضرت عبداللہ بن یزیدؓ،
۲۹۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیؓ۔

یہ ان کوفی صحابہ کے اسمائے گرامی ہیں جن کے حوالے سے امام بخاری نے صحیح میں ارشادات نبوت
لیے ہیں اسی پر تمام صحاح ستہ کو قیاس کر لیجئے۔

ذرا ایک قدم اور آگے بڑھائیے اور بخاری شریف ہی کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ اس کے راویوں
میں سب سے زیادہ تعداد جس شہر کے راویوں کی ہے وہ کوفہ ہی ہے۔ راقم الحروف نے اس ارادے سے
بخاری شریف کے راویوں کا جائزہ لیا تو صرف شہر کوفہ کے راویوں کی تعداد صحیح بخاری میں تین سو سے
زائد ملی ہے۔ اگر کتاب کی ضخامت کے زائد ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم ان کے نام ہدیہ ناظرین کرتے۔

علمائے محدثین نے حفاظ حدیث کے حالات پر مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں صرف ان لوگوں کا
تذکرہ ہے جو اپنے وقت میں حفاظِ حدیث تھے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور کتاب "تذکرۃ الحفاظ" ہے
یہ حافظ شمس الدین الذہبی ۷۴۸ھ کی تصنیف ہے، حافظ موصوف نے اس کتاب میں کسی ایسے شخص
کا تذکرہ نہیں لکھا ہے جس کا شمار حفاظِ حدیث میں نہ ہو۔ چنانچہ علامہ ابن قتیبہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ابن قتیبہ علم کا خزانہ ہیں لیکن حدیث میں ان کا کام تھوڑا ہے اس لیے میں
> نے ان کا تذکرہ نہیں کیا[1]

اور خارجہ بن زید اگرچہ فقہائے سبعہ میں سے ہیں مگر ان کے بارے میں صاف تصریح کر دی ہے کہ

> چونکہ وہ قلیل الحدیث تھے اس لیے میں نے ان کو حفاظِ حدیث میں شمار
> نہیں کیا[2]

ایسے ہی اس کتاب میں ان لوگوں کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے جو حافظِ حدیث تو ہیں مگر محدثین کے
یہاں پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں چنانچہ امام ذہبی نے واقدی اور ہشام کلبی کو اسی لیے حفاظِ حدیث

---

[1]، [2] تذکرۃ الحفاظ

میں شمار نہیں کیا۔

اس کتاب میں سے صرف سنہ ۲۵۶ھ تک کے ان محدثین کا تذکرہ پڑھ لیجیے جن کو امام ذہبی نے کوفی کہا ہے ہم یہاں صرف ان محدثین کا ذکر کریں گے جن کے لیے امام ذہبی نے کتاب میں مستقل عنوان قائم کیا ہے۔

۱۔ علقمہ بن قیس الامام سنہ ۶۲ھ، ۲۔ مسروق الہمدانی سنہ ۶۳ھ، ۳۔ الاسود بن یزید النخعی سنہ ۷۵ھ، ۴۔ عبیدہ بن عمرو السلمانی سنہ ۷۲ھ، ۵۔ سوید بن غفلہ الجعفی سنہ ۸۱ھ، ۶۔ زر بن حبیش ابو مریم الاسدی سنہ ۸۲ھ، ۷۔ ربیع بن خثیم ابو یزید الثوری سنہ ۶۳ھ، ۸۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سنہ ۸۳ھ، ۹۔ ابو عبدالرحمٰن السلمی سنہ ۷۳ھ، ۱۰۔ ابو امیہ شریح بن الحارث سنہ ۸۰ھ، ۱۱۔ ابو مقدام شریح المذحجی سنہ ۷۸ھ، ۱۲۔ ابو وائل شقیق بن سلمہ سنہ ۸۲ھ، ۱۳۔ قیس بن ابی حازم سنہ ۹۷ھ، ۱۴۔ عمرو بن میمون ابو عبداللہ سنہ ۷۵ھ، ۱۵۔ زید بن وہب ابو سلیمان سنہ ۹۶ھ، ۱۶۔ معرور بن سوید ابو امیہ الاسدی سنہ ۱۲۰ھ، ۱۷۔ ابو عمرو سعد بن ایاس الشیبانی سنہ ۹۸ھ، ۱۸۔ ربعی بن حراش سنہ ۱۰۱ھ، ۱۹۔ ابراہیم بن یزید التیمی سنہ ۹۲ھ، ۲۰۔ ابراہیم بن یزید ابو عمران سنہ ۹۵ھ، ۲۱۔ سعید بن جبیر سنہ ۹۵ھ، ۲۲۔ عامر بن شراحیل الہمدانی سنہ ۱۰۴ھ، ۲۳۔ عمرو بن عبداللہ ابو اسحٰق سنہ ۱۲۷ھ، ۲۴۔ حبیب بن ابی ثابت سنہ ۱۱۹ھ، ۲۵۔ الحکم بن عتیبہ ابو عمرو الکندی سنہ ۱۱۵ھ، ۲۶۔ عمرو بن مرہ ابو عبداللہ سنہ ۱۱۶ھ، ۲۷۔ القاسم بن مخیمرہ ابو عروہ سنہ ۱۱۱ھ، ۲۸۔ عبدالملک بن عمیر سنہ ۱۳۶ھ، ۲۹۔ منصور بن المعتمر سنہ ۱۳۲ھ، ۳۰۔ مغیرہ بن مقسم سنہ ۱۲۶ھ، ۳۱۔ حصین بن عبدالرحمٰن سنہ ۱۲۶ھ، ۳۲۔ سلیمان بن فیروز سنہ ۱۳۸ھ، ۳۳۔ اسمٰعیل بن ابی خالد سنہ ۱۴۵ھ، ۳۴۔ سلیمان بن مہران الاعمش سنہ ۱۴۸ھ، ۳۵۔ عبدالملک بن سلیمان سنہ ۱۴۵ھ، ۳۶۔ نعمان بن ثابت سنہ ۱۵۰ھ، ۳۷۔ محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سنہ ۱۴۸ھ، ۳۸۔ حجاج بن ارطاۃ سنہ ۱۴۹ھ، ۳۹۔ مسعر بن کدام الہمدانی سنہ ۱۵۵ھ، ۴۰۔ عبدالرحمٰن بن عبداللہ المسعودی سنہ ۱۶۰ھ، ۴۱۔ سفیان بن سعید الثوری سنہ ۱۶۱ھ، ۴۲۔ اسرائیل بن یونس السبیعی سنہ ۱۶۲ھ، ۴۳۔ زائدہ بن قدامہ سنہ ۱۶۱ھ، ۴۴۔ الحسن بن صالح سنہ ۱۶۷ھ، ۴۵۔ شیبان بن عبدالرحمٰن سنہ ۱۶۴ھ، ۴۶۔ قیس بن الربیع ابو محمد سنہ ۱۶۷ھ، ۴۷۔ ورقاء بن عمر سنہ ۱۶۰ھ، ۴۸۔ شریک بن عبداللہ القاضی سنہ ۱۷۷ھ، ۴۹۔ زہیر بن معاویہ ابو خیثمہ سنہ ۱۷۳ھ، ۵۰۔ القاسم بن معن سنہ ۱۷۵ھ، ۵۱۔ ابو الاحوص سلام بن سلیم سنہ ۱۷۹ھ، ۵۲۔ بشر بن القاسم سنہ ۱۹۳ھ، ۵۳۔ سفیان بن عیینہ ابو محمد سنہ ۱۹۸ھ، ۵۴۔ ابو بکر بن عیاش سنہ ۱۹۳ھ، ۵۵۔ یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ سنہ ۱۸۲ھ، ۵۶۔ عبدالسلام بن حرب سنہ ۱۸۷ھ، ۵۷۔ جریر بن عبدالحمید سنہ ۱۸۸ھ، ۵۸۔ سلیمان بن حیان الاحمر سنہ ۱۹۰ھ، ۵۹۔ ابراہیم بن محمد الفزاری سنہ ۱۸۵ھ، ۶۰۔ عیسیٰ بن یونس السبیعی سنہ ۱۸۷ھ، ۶۱۔ عبداللہ بن ادریس سنہ ۱۹۲ھ، ۶۲۔ یحییٰ بن یمان ابو زکریا سنہ ۱۸۹ھ، ۶۳۔ حمید بن عبدالرحمٰن ابو عوف سنہ ۱۹۰ھ

۶۴- علی بن مسہر ابوالحسن سنہ ۱۸۹ھ، ۶۵- عبدالرحیم بن سلیمان سنہ ۱۹۵ھ، ۶۶- یعقوب بن ابراہیم الانصاری سنہ ۲۰۰ھ، ۶۷- ابومعاویہ محمد بن حازم سنہ ۱۹۵ھ، ۶۸- مروان بن معاویہ سنہ ۱۹۳ھ، ۶۹- حفص بن غیاث النخعی سنہ ۱۹۴ھ، ۷۰- وکیع بن الجراح سنہ ۱۹۷ھ، ۷۱- عبیدہ بن حمید سنہ ۱۹۰ھ، ۷۲- عبیداللہ الاشجعی سنہ ۱۸۲ھ، ۷۳- عبدہ بن سلیمان سنہ ۱۸۸ھ، ۷۴- عبدالرحمٰن بن محمد سنہ ۱۹۵ھ، ۷۵- محمد بن فضیل سنہ ۱۹۵ھ، ۷۶- حماد بن اسامہ سنہ ۲۰۳ھ، ۷۷- محمد بن بشر سنہ ۲۰۳ھ، ۷۸- یحییٰ بن سعید القرشی سنہ ۱۹۴ھ، ۷۹- یونس بن بکیر سنہ ۱۹۹ھ، ۸۰- عبداللہ بن نمیر سنہ ۱۹۹ھ، ۸۱- شجاع الولید ابوبدر سنہ ۲۰۴ھ، ۸۲- محمد بن عبید الایادی سنہ ۲۰۴ھ، ۸۳- عبداللہ بن داؤد سنہ ۲۰۹ھ، ۸۴- الحسین بن علی ابوعلی سنہ ۲۱۲ھ، ۸۵- زید بن الحباب سنہ ۲۰۳ھ، ۸۶- عبیداللہ بن موسیٰ سنہ ۲۱۳ھ، ۸۷- اسحاق بن سلیمان سنہ ۲۰۰ھ، ۸۸- محمد بن عبداللہ سنہ ۲۰۳ھ، ۸۹- یحییٰ بن آدم سنہ ۲۰۳ھ، ۹۰- داؤد بن یحییٰ سنہ ۲۰۳ھ، ۹۱- عبداللہ بن یزید سنہ ۲۱۳ھ، ۹۲- ابونعیم الفضل بن دکین سنہ ۲۱۸ھ، ۹۳- قبیصہ بن عقبہ ابوعامر سنہ ۲۱۵ھ، ۹۴- موسیٰ بن داؤد سنہ ۲۱۷ھ، ۹۵- خلف بن تمیم سنہ ۲۰۶ھ، ۹۶- یحییٰ بن ابی بکیر سنہ ۲۰۳ھ، ۹۷- عبیداللہ سنہ ۲۰۳ھ، ۹۸- زکریا بن عدی سنہ ۲۱۳ھ، ۹۹- احمد بن عبداللہ سنہ ۲۱۷ھ، ۱۰۰- مالک بن اسمٰعیل سنہ ۲۱۷ھ، ۱۰۱- خالد بن مخلد سنہ ۲۱۳ھ، ۱۰۲- یحییٰ بن عبدالحمید سنہ ۲۳۵ھ، ۱۰۳- عبداللہ بن محمد ابوبکر سنہ ۲۳۴ھ، ۱۰۴- محمد بن عبداللہ بن نمیر سنہ ۲۳۴ھ، ۱۰۵- عثمان بن ابی شیبہ سنہ ۲۳۹ھ، ۱۰۶- علی بن محمد بن اسحاق سنہ ۲۳۳ھ، ۱۰۷- احمد بن حمید ابوالحسن سنہ ۲۲۰ھ، ۱۰۸- الحسن بن الربیع سنہ ۲۲۱ھ، ۱۰۹- محمد بن العلاء سنہ ۲۴۸ھ، ۱۱۰- ہناد بن السری سنہ ۲۴۳ھ۔

ان حفاظ کے علاوہ دوسرے بھی کوفہ کے لاتعداد محدثین ہیں لیکن ہم نے صرف "تذکرۃ الحفاظ" سے ان حفاظ حدیث کا ذکر کیا ہے، جو سنہ ۲۴۸ھ تک ہوئے ہیں۔

بتانا صرف یہ چاہتا ہوں کہ جس بستی میں سب سے پہلے امام اعظم نے طلب حدیث کے میدان میں قدم رکھا وہ بستی حدیث کی نعمت سے مالامال تھی اور اس وقت اس میں دنیائے علم حدیث کے وہ آفتاب و ماہتاب تھے جو اپنی تابانیوں سے دنیا کو محو حیرت کر رہے تھے اور جو امام اعظم کے علم حدیث میں اساتذہ ہیں۔ یہاں سب کا استقصاء تو از بس دشوار ہے مگر گلے از گلزار چند گرامی قدر ہستیاں پیش کرتا ہوں۔

علامۃ التابعین امام شعبی سے تلمذ

خطیب بغدادی نے امام علی بن المدینی سے نقل کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا علم

تین پر ختم ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، اور زید بن ثابتؓ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے سارے علوم چھ حضرات کی طرف منتقل ہوئے ہیں۔ علقمہ، اسود، عبیدہ، الحارث، مسروق، عمرو، اور ان اکابر کی علمی میراث صرف دو کو ملی ہے۔ ابراہیم نخعی اور امام شعبی۔ (تلقیح فہوم اہل الاثر ص ۲۳۶)

سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے بعد لوگوں میں محدث کی حیثیت سے صرف دو ہیں امام شعبی اور سفیان ثوری [1]

حافظ ذہبی نے خود امام شعبی کی زبانی یہ انکشاف فرمایا ہے کہ:

اَدْرَکْتُ خَمْسَمِائَۃٍ مِنَ الصَّحَابَۃِ۔ [2]

میں نے پانچ سو صحابہ سے ملاقات کی ہے۔

ان کی علمیت کا اندازہ کرنا ہو تو عبدالملک بن عمیر کا وہ بیان پڑھیے جو حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیا ہے:۔

ایک بار امام شعبی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات بیان فرما رہے تھے حضرت عبداللہ بن عمر پاس سے گزرے سن کر فرمایا کہ میں خود ان غزوات میں شریک ہوا ہوں۔ لیکن شعبی کو غزوات زیادہ محفوظ ہیں اور مجھ سے زیادہ عالم ہیں۔ [3]

امام شعبی کا دور حدیث کی زبانی یادداشت کا زمانہ ہے اس عہد میں حدیثوں کو سن کر زبانی یاد کرنے کا ایسا ہی رواج تھا جیسا کہ اس گئے گزرے آج کے زمانے میں مسلمانوں میں قرآن کو یاد کرنے کا معمول ہے اس دور کے لوگوں کا فیشن ہی یہ تھا کہ سب کچھ زبانی یاد ہو کتابت کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ امام شعبی بھی کتابت حدیث کے قائل نہ تھے خود فرماتے ہیں:

مَا کَتَبْتُ سَوَادًا فِیْ بَیْضَاءَ اِلٰی یَوْمِیْ ھٰذَا۔ [4]

میں نے کبھی بھی روشنائی اور کاغذ سے کام نہیں لیا۔

قوتِ حافظہ اس قدر غضب کی تھی کہ جو کچھ بھی سنتے فوراً یاد ہو جاتا۔ خود ہی فرماتے ہیں کہ روایات شعری مجھے کم یاد ہیں مگر کم یاد ہونے کے باوجود حال یہ ہے۔

---

[1] تلقیح فہوم اہل الاثر ص ۲۳۶۔ [2]، [3]، [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۶ تا ۷۹۔

إِنْ شِئْتُ لَا تُنْشِدُ تُكُمْ شَهْرًا وَلَا أُعِيدُ [۱]

اگر میں چاہوں تو ایک ماہ تک اشعار پڑھتا رہوں اور تکرار نہ ہو۔

ابن شبرمہ کی زبانی منقول ہے کہ امام شعبی فرماتے تھے :

اے شباک میں تم سے دوبارہ حدیث بیان کر رہا ہوں حالانکہ میں نے کبھی کسی سے حدیث سُن کر تکرار کی درخواست نہیں کی۔

لَا اُحِبُّ اَنْ یُعِیْدَہٗ عَلَیَّ مجھے تکرار پسند نہیں ہے [۲]

علم حدیث میں اس قدر اُونچا مقام رکھتے تھے کہ عاصم احول فرماتے ہیں کہ :

میں نے بصرہ، کوفہ اور حجاز والوں کی حدیث کا امام شعبی سے زیادہ عالم کوئی نہیں دیکھا ہے [۳]

خطیب نے لکھا ہے کہ حدیث کے مشہور امام زہری کا کہنا ہے :

علماء چار ہیں مدینے میں سعید بن المسیب، کوفہ میں شعبی، بصرہ میں حسن بصری اور شام میں مکحول [۴]

امام اعظم نے شعبی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے جیسا کہ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ امام اعظم ۱۰۰ھ میں بعمر بیس سال امام شعبی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوئے ہیں۔ حافظ ذہبی نے تذکرہ میں امام شعبی کے تلامذہ میں امام اعظمؒ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور صرف نام ہی نہیں لیا بلکہ یہ بتایا ہے کہ :

هُوَ اَكْبَرُ شَيْخٍ لِاَبِي حَنِيْفَةَ [۵]

اور تو اور دَورِ جدید کے بہت بڑے محقق ڈاکٹر فلپ حتی نے بھی اپنی شہرۂ آفاق کتاب تاریخ العرب میں اس کا اقرار کیا ہے کہ

كَانَ مِنْ اَبْرَزِ الَّذِيْنَ تَخَرَّجُوْا عَلَى الشَّعْبِيِّ الْاِمَامُ اَبُوْ حَنِيْفَةَ الْمَشْهُوْرُ [۶]

امام شعبی کے بلند پایہ تلامذہ میں سے مشہور امام ابوحنیفہ ہیں۔

---

[۱]، [۲]، [۳] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۰ تا ۷۹ - [۴] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۲۲۲

[۵] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۵، [۶] تاریخ العرب مطول ج ۱ ص ۳۱۱

عبداللہ بن داؤد الخریبی کہتے ہیں کہ میں نے امام اعظم سے دریافت کیا کہ کبار تابعین میں سے آپ نے کس کس سے استفادہ کیا ہے؟ فرمایا

قاسم بن محمد، طاؤس، عکرمہ، عبداللہ بن دینار، حسن بصری، عمرو بن دینار، ابوالزبیر، عطاء بن ابی رباح، قتادہ، ابراہیم، شعبی اور امام نافع اور ان جیسوں سے ملا ہوں[1]

مسند امام میں خود ان کے حوالہ سے احادیث آتی ہیں۔ چنانچہ خوارزمی نے جامع المسانید کے نام سے جو مجموعہ ترتیب دیا ہے اس میں بحوالہ امام شعبی ایک سے زیادہ حدیثیں موجود ہیں اور علامہ حصفکی نے اس مسند میں امام شعبی کے حوالہ سے روایات درج کی ہیں جس کی شرح ملا علی قاری نے لکھی ہے:

اَبُوْحَنِيْفَةَ عَنِ الشَّعْبِي عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْسَحُ عَلَى الْخُفَّيْنِ۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم موزوں پر مسح فرماتے تھے۔

اس روایت کی تخریج بحوالہ امام اعظم الحافظ الحارثی کے علاوہ حافظ ابومحمد بخاری، حافظ طلحہ بن محمد، حافظ حسین بن محمد، حافظ ابوبکر بن عبدالباقی اور خود امام محمد نے کتاب الآثار میں کی ہے ویسے تو جیسا کہ حافظ بزار فرماتے ہیں اس حدیث کو روایت کرنے والے حضرات کی تعداد ساٹھ ہے مگر اسی روایت کو جو امام بخاری نے روایت کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

اِنَّہٗ خَرَجَ لِحَاجَتِہٖ فَاتَّبَعَہُ الْمُغِیْرَۃُ بِاِدَاوَۃٍ فِیْھَا مَاءٌ فَصَبَّ عَلَیْہِ حِیْنَ فَرَغَ مِنْ حَاجَتِہٖ فَتَوَضَّاَ وَمَسَحَ عَلَی الْخُفَّیْنِ[2]

آپ ضرورت سے گئے مغیرہ پانی کا برتن پیچھے سے لے کر آئے پانی آپ نے ضرورت سے فراغت کے بعد استعمال کیا۔ وضو فرمایا اور خفین پر مسح فرمایا۔

---

[1] شرح مسند ص ۵۶ [2] الجامع الصحیح ج ۱ ص ۱۲۸

اسی روایت کو امام مسلم نے بھی اپنے مخصوص انداز میں کئی طریقوں سے بیان کیا ہے ان میں سے ایک طریق میں حضرت امام شعبی نے بھی حدیث بحوالہ عروۃ بن مغیرہ اپنے شاگرد عمر بن زائدہ سے بیان کی اس طرح ہے۔

عَنْ اَبِیْہِ اَنَّہٗ وَضَّاَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَتَوَضَّاَ وَمَسَحَ عَلَی الْخُفَّیْنِ فَقَالَ لَہٗ اِنِّیْ اَدْخَلْتُھُمَا طَاھِرَتَیْنِ[1]

حضرت مغیرہ نے حضور انورؐ کو وضو کرایا۔ آپ نے وضو فرمایا خفین پر مسح فرمایا اور فرمایا کہ میں نے موزے بحالت طہارت پہنے تھے۔

واضح رہے کہ حافظ ذہبی نے امام شعبی کو حفاظِ حدیث کے طبقہ ثالثہ میں شمار کیا ہے اس طبقے میں کم و بیش تیس حفاظِ حدیث ہیں۔ امام ذہبی کی تصریح کے مطابق امام اعظم حضرت شعبی کے شاگرد ہیں اور یہ بھی ذہبی نے ہی لکھا ہے کہ وکیع بن الجراح، امام یزید بن ہارون، امام ابو عاصم النبیل، امام عبدالرزاق، امام عبیداللہ بن موسیٰ، امام ابونعیم فضل بن دکین اور امام ابوعبدالرحمٰن المقری جیسے ائمہ حدیث نے امام ابوحنیفہ کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ہے۔ شجرہ علمِ حدیث کے تمام برگ و بار ان ہی اکابر سے نکلے ہوئے ہیں۔ امام عبدالرزاق، امام عبیداللہ بن موسیٰ، امام ابونعیم اور امام ابوعبدالرحمٰن المقری کے تلامذہ میں آپ کو امام احمد اور امام بخاری ملیں گے چنانچہ حافظ ذہبی نے جہاں امام مقری کے ترجمہ میں یہ بتایا ہے کہ

سَمِعَ مِنِ ابْنِ عَوْنٍ وَاَبِیْ حَنِیْفَۃَ[2]

وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ رَوٰی عَنْہُ الْبُخَارِیُّ وَاَحْمَد۔ امام مقری بخاری اور احمد کے اُستاد ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ جیسے مسلم اور ابوداؤد امام احمد کے شاگرد ہیں ایسے ہی ترمذی اور ابن خزیمہ حضرت امام بخاری کے شاگرد ہیں۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ امام شعبی کی ذاتِ گرامی بواسطہ امام اعظم علمِ حدیث میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔

امام حماد بن سلیمان سے تلمذ

والد کا نام مسلم اور کنیت ابوسلیمان ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ حماد حدیث میں حضرت

---

[1] صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۳۴ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۴

انس بن مالکؓ، زید بن وہبؒ، سعید بن المسیبؒ، سعید بن جبیرؒ، عکرمہ مولیٰ ابن عباس، ابو وائل، ابراہیم نخعی، عبداللہ بن بریدہ اور عبدالرحمٰن بن سعد کے شاگرد ہیں اور مشہور محدث عاصم الاحول، امام شعبہ، امام سفیان ثوری، امام حماد بن سلمہ، امام مسعر بن کدام، امام ابوحنیفہ اور سلیمان بن مہران کے اُستاد ہیں۔ امام مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے اپنی کتابوں میں ان سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ حافظ عسقلانی اور حافظ ذہبی دونوں اس پر متفق ہیں کہ حماد ابراہیم نخعی کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔

ابوالشیخ نے تاریخ اصفہان میں لکھا ہے کہ ایک روز ان کو اُن کے اُستاد ابراہیم نخعی نے ایک درہم کا گوشت لانے کے لیے روانہ کیا، زنبیل ان کے ہاتھ میں تھی ادھر اُن کے والد کہیں سے گھوڑے پر سوار آ رہے تھے، صورت حال دیکھ کر حماد کو ڈانٹا اور زنبیل لے کر پھینک دی جب ابراہیم نخعی کی وفات ہو گئی تو حدیث کے طالب علم ان کے گھر آئے، دستک دی ان کے والد چراغ لے کر باہر آئے، طلبہ نے دیکھ کر کہا کہ ہمیں آپ کی نہیں آپ کے صاحبزادے کی ضرورت ہے۔ یہ شرمندہ ہو کر اندر تشریف لے آئے اور حماد سے کہا کہ جاؤ باہر جاؤ۔ اب مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ مقام تمہیں ابراہیم کی زنبیل کے صدقے میں ملا ہے [1]

علامہ خوارزمی نے امام بخاری کے حوالہ سے بسند متصل نقل کیا ہے کہ ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ:

لَقَدْ سَأَلَنِيْ هٰذَا يَعْنِيْ حَمَّادًا مِثْلَ مَا سَأَلَنِيْ جَمِيْعُ النَّاسِ [2]

حافظ عبداللہ بن وہب دینوری کہتے ہیں کہ:

> ایک بار حافظ ابوزرعہ کی خدمت میں حاضر ہوا دیکھا کہ ایک خراسانی ان کے سامنے موضوع حدیثیں بیان کر رہا ہے اور یہ ان روایات کو غلط بتا رہے ہیں۔ وہ شخص ان کی باتوں پر ہنس رہا ہے کہ واہ کیا خوب: جو روایت تم کو یاد نہیں اس کو غلط بتاتے ہو۔ اس پر میں نے اس شخص سے پوچھا ما اسند ابو حنیفۃ عن حماد؟ بتاؤ امام ابوحنیفہ کی بواسطہ حماد کیا روایات ہیں؟ بیچارہ چپ ہو گیا۔ پھر میں نے حافظ ابوزرعہ سے دریافت کیا ماتحفظ لابی حنیفۃ؟ آپ کو حماد کی سند سے

---

[1] تقدمہ نصب الرایہ [2] جامع المسانید ج ۲ ص ۵۲۵

امام ابوحنیفہ کی کتنی حدیثیں یاد ہیں؟ اس پر حافظ ابوزرعہ نے حدیثوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔[1]

یاد رہے کہ امام حسن بن زیاد کا بیان ہے کہ امام اعظم چار ہزار حدیثیں روایت کرتے تھے جن میں دو ہزار حماد کی تھیں، چنانچہ امام حافظ زکریا نیشاپوری بسند متصل امام موصوف سے ناقل ہیں؛

امام ابوحنیفہ کی کل روایات چار ہزار تھیں ان میں دو ہزار حماد کی اور دو ہزار تمام اساتذہ کی ہیں۔[2]

نقد و رجال کے امام حضرت شعبہ امام حماد کی صداقت کا لوہا مانتے ہیں اور سید الحفاظ یحییٰ بن معین ان کی ثقاہت کو سراہتے ہیں۔ امام ابوعبداللہ الحاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں جہاں ان ائمہ حدیث کا تذکرہ کیا ہے جن کی علم حدیث میں امامت مسلّم ہے اور جن کی ثقاہت پر فن حدیث میں اعتماد ہے ائمہ حدیث کی اس فہرست میں حماد بن ابی سلیمان کا بھی ان میں تذکرہ کیا ہے[3] حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں اور حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں ارباب فتویٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت حماد کا بھی ذکر کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان کا تذکرہ باوجود عدالت، صداقت اور ثقاہت کے اس معذرت کے ساتھ کیا ہے۔

لَوْلَا ذِکْرُ ابْنُ عَدِیٍّ فِی الْکَامِلِ لَمَا اَدْرَجْتُہٗ۔[4]

اگر ابن عدی ذکر نہ کرتا تو میں میزان میں ان کا ترجمہ نہ لکھتا۔

دراصل بتانا یہ چاہتے ہیں کہ امام حماد اپنی جلالت قدر کی وجہ سے اس قدر اونچے مقام پر ہیں کہ ان کا ذکر میزان میں نہ آنا چاہیے کیونکہ یہ امام ذہبی کی اس پالیسی کے خلاف ہے جس کا تذکرہ خود امام ذہبی نے کتاب کے دیباچے میں کیا ہے۔

میزان الاعتدال میں ائمہ متبوعین کا ذکر

میرا اشارہ اس وعدے کی طرف ہے جو امام موصوف نے میزان کے مقدمہ میں کیا ہے کہ:

لَا اَذْکُرُ فِیْ کِتَابِیْ مِنَ الْاَئِمَّۃِ الْمَتْبُوْعِیْنَ فِی الْفُرُوْعِ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ص ۲۵۸۔ [2] مناقب الموفق ج ۱ ص ۹۶۔ [3] معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۱۰۔
[4] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۳۷۹۔

اَحَدًا لِجَلَالَتِهِمْ فِي الْاِسْلَامِ وَعَظْمَتِهِمْ فِي النُّفُوْسِ مِثْلُ اَبِيْ حَنِيْفَةَ وَالشَّافِعِيْ [1]

میں اپنی کتاب میں ان اماموں کا ذکر نہ کروں گا جن کی فروع میں تقلید کی جاتی ہے کیونکہ اسلام میں ان کی جلالت اور لوگوں میں ان کی عظمت موجود ہے جیسے ابوحنیفہ اور شافعی۔

ظاہر ہے کہ امام حماد صرف امام نہیں بلکہ امام الائمہ ہیں پھر ان کا میزان میں تذکرہ اس وعدہ کی خلاف ورزی ہے۔ امام ذہبی نے اسی سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ میں نے میزان میں ان کا تذکرہ ان کی ثقاہت، صداقت اور عدالت کے مشتبہ ہونے کی وجہ سے نہیں کیا بلکہ صرف اس لیے کیا ہے کہ امام عدی نے الکامل میں ان کا ذکر کیا ہے۔

تاریخ کا المناک حادثہ

شاید آپ خلش محسوس کریں کہ خیر امام حماد کی حد تک تو یہ بات درست ہے لیکن اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ جن کا نام لے کر کہا جا رہا ہے کہ ان جیسوں کا میزان میں ذکر نہ ہوگا خود ان کا بھی میزان میں ذکر ہے اور ذکر بھی کوئی طویل نہیں بلکہ صرف ایک سطری۔

یہ تاریخ صحافت کا بڑا ہی المناک اور دردناک حادثہ ہے دراصل میزان الاعتدال اولاً جب ہندوستان میں چھپی تو امام صاحب کا تذکرہ تقطیع نون کتاب کے اندر نہیں بلکہ کتاب کے حاشیہ پر پریس والوں نے چھاپ دیا اور خود پریس والوں نے ایسا کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ میزان کے کئی نسخوں میں سے ایک کے حاشیہ پر چونکہ ایسا ہی درج تھا اس لیے اس کو اصل کتاب میں جگہ نہیں دی گئی اس کے بعد مصر کے پریس سے جو میزان چھپ کر آئی تو یار لوگوں نے کتاب کے اندر داخل کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ میزان میں امام اعظم کا کوئی ذکر نہ تھا غالباً کسی نے مطالعہ میں اپنی یادداشت حاشیہ میں درج کر دی تھی اور بعد کو مطابع والوں نے اسے اصل کتاب ہی میں داخل کر دیا۔

مولانا عبدالحی صاحب غیث الغمام میں فرماتے ہیں کہ میزان کے جن نسخوں کا میں نے مطالعہ کیا ہے ان میں اس عبارت کا نام تک نہیں ہے اور نہ ہونے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حافظ

---

[1] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۷۹

عراقی شرح الفیہ میں فرماتے ہیں کہ ابن عدی نے کامل میں ان سب حضرات کا تذکرہ کیا ہے جن پر کسی نہ کسی درجے میں کلام ہے چاہے وہ ثقہ ہی ہوں لیکن امام ذہبی نے میزان اس التزام کے ساتھ لکھی ہے کہ اس میں کسی صحابی اور ائمہ متبوعین میں سے کسی امام کا ذکر نہ ہوگا۔ حافظ سخاوی نے شرح الفیہ میں بھی یہ بات لکھی ہے کہ امام ذہبی نے ائمہ متبوعین کے ذکر نہ کرنے کا التزام کیا ہے اور حافظ سیوطی نے بھی تدریب الراوی میں میزان کی اسی خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔ ان اکابر کی یہ تصریحات کھلے بندوں کہہ رہی ہیں کہ میزان میں امام اعظم کا ترجمہ نہیں ہے۔ مشہور محدث علامہ محمد بن اسمٰعیل یمانی توضیح الافکار میں رقمطراز ہیں کہ امام ذہبی نے میزان میں امام اعظم کا ترجمہ نہیں لکھا ہے لیکن امام نووی نے تہذیب الاسماء میں امام صاحب کا تذکرہ لکھا ہے اور اس سے زیادہ یہ کہ خود حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی لسان المیزان میں امام اعظم کا کوئی ترجمہ نہیں لکھا حالانکہ لسان المیزان الاعتدال ہی کا چربہ ہے۔ یہ اس بات کی صریح شہادت ہے کہ میزان میں امام اعظم کا ترجمہ نہ تھا۔ غیر یہ ایک ضمنی بات تھی۔ بتا یہ رہا تھا کہ امام حماد کی ذات گرامی اپنی ثقاہت کی وجہ سے بہت اونچے مقام پر ہے۔ قلم کو روکنا چاہتا ہوں مگر کیا کروں رکتا نہیں ہے۔ بزرگان دین کی عدالت و ثقاہت تو اپنی جگہ ہے افسوس تو اس پر آتا ہے کہ لوگ اکابر کے منہ سے نکلی ہوئی بات کا منشا خود نہیں سمجھتے اور بات کا خواہ مخواہ بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔ انا للہ فالی اللہ المشتکیٰ۔ ذرا غور فرمایئے کہ ایک بار امام حماد حج کرکے کوفہ واپس آتے لوگ ملاقات کی خاطر حاضر ہوتے۔ آپ نے لوگوں سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ اے کوفہ والو! تم اللہ سبحانہ کا شکر ادا کرو میں عطا بن ابی رباح، طاؤس اور مجاہد سے ملا ہوں لیکن تمہارے بچے اور بچوں کے بچے بھی علم میں ان سے آگے ہیں اس میں کون سی توہین کی بات ہے یہ تو کوفہ میں علم کی بہتات پر تحدیث نعمت ہے۔

امام حماد پر ارجاء کی تہمت

ظلم بالائے ظلم یہ کہ ان کے متعلق رجال کی کتابوں میں یہ فقرہ بھی لکھ دیا گیا ہے۔

تکلم فیہ للارجاء

حالانکہ امام حماد کا دامن اس تہمت سے بالکل پاک ہے صرف امام حماد نہیں بلکہ ان کی طرح بخاری اور مسلم کے کتنے ہی راویان حدیث ہیں جن کی ثقاہت اور عدالت مسلم ہے مگر ان پر صرف فکر ہی اختلاف کی وجہ سے ارجاء کی تہمت جڑ دی ہے۔ خدا بھلا کرے الشہرستانی کا کہ انہوں نے

رجال المرجئہ کے عنوان سے مختلف اکابر مثلاً الحسن بن محمد، سعید بن جبیر، طلق بن حبیب، محارب بن دثار، حماد بن ابی سلیمان، امام اعظم، قاضی ابو یوسف، امام محمد وغیرہ وغیرہ کا نام لکھ کر یہ بات لکھ دی ہے کہ:

هٰؤُلَاءِ كُلُّهُمْ أَئِمَّةُ الْحَدِيثِ [1]

حافظ سیوطی نے تدریب الراوی میں جہاں بخاری و مسلم کے ان راویوں کی فہرست دی ہے جن کو کہنے والے مرجئہ کہہ گئے ہیں وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ ان کی طرف جس ارجاء کی نسبت کی گئی ہے اس سے مقصود مرجئہ کا وہ ارجاء نہیں ہے جو اہل السنۃ کی اپوزیشن ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے:

تَاخِيرُ الْقَوْلِ فِي الْحُكْمِ عَلَى مُرْتَكِبِ الْكَبَائِرِ [2]

اگر ارجاء یہی ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب مومن ہے لیکن اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے خواہ بخش دے خواہ سزا دے۔ تو سب اہل السنۃ ہی ارجاء کے شکار ہیں، سب یہی کہتے ہیں:

مُرْجِيٌّ أَمْرُهُ وَمُفَوَّضٌ مَصِيرُهُ إِلَى رَبِّهِ إِنْ شَاءَ عَذَّبَهُ وَإِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ [3]

امام اعظم، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد سب کا یہی مسلک ہے۔ ابن الجوزی نے مناقب میں امام احمد کی یہی رائے لکھی ہے کہ

اہل توحید میں سے کوئی شخص کافر نہیں ہو سکتا چاہے اس نے کبائر ہی کا ارتکاب کیوں نہ کیا ہو [4]

خود امام بخاری نے صحیح میں یہ عنوان قائم کر کے کہ

اَلْمَعَاصِي مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ لَا يُكَفَّرُ صَاحِبُهَا بِارْتِكَابِهَا إِلَّا بِالشِّرْكِ [5]

یہی بتایا ہے کہ شرک کے سوا گناہ خواہ کیسا ہی سنگین ہو مگر گنہگار کافر نہیں ہوتا اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ حافظ بدرالدین عینی نے امام بخاری کے دعویٰ اور دلائل کی توضیح

---

[1] الملل والنحل ج ۱ ص ۲۳۴۔ [2] تدریب الراوی ص ۲۱۹۔ [3] تدریب الراوی ص ۱۱۲
[4] مناقب ابن الجوزی ص ۹۶۔ [5] صحیح بخاری ج ۱ ص ۸۔

کے بعد لکھا ہے:

هٰذَا هُوَ مَذْهَبُ اَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ [1]

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مرجئہ جو کہتے ہیں کہ گناہ سے کچھ نہیں ہوتا اور خوارج جو کہتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے اور معتزلہ کی رائے میں مرتکب کبیرہ کی ہرگز بخشش نہ ہوگی ان میں سلامتی کی راہ وہی ہے جو اہل السنۃ نے اختیار کی ہے اور جس کی قانونی تعبیر یہ ہے کہ ایمان نام ہے تصدیق قلبی اور اقرار زبانی کا۔ جس طرح ایک تندرست آدمی بیمار ہو سکتا ہے اسی طرح ایک مسلمان سے بھی گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔

اگر اسی کا نام ارجاء ہے جو آپ حافظ سیوطی کی زبانی سن آتے ہیں تو پھر مرجئہ ہونے کی پھبتی کیوں ہے؟ اور زبان و قلم کے یہ سارے ہنگامے کیوں ہیں؟ غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ غصہ صرف اس پر ہے کہ ایمان کے بارے میں قانونی تعبیر فقہاء محدثین نے الگ کیوں اختیار کی ہے۔ اور فقہاء نے اس موضوع پر وہی زبان کیوں اختیار نہیں کی جو بعد میں محدثین نے کی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ جس کسی نے فقہاء کو مرجئہ کہا ہے اس نے عقائد کے لحاظ سے نہیں بلکہ صرف ان الفاظ کی وجہ سے کہا ہے جن سے مرجئہ کی موافقت کی بو آتی ہے [2]

یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں ہے اس پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ آئندہ اوراق میں آئے گی۔ بتانا صرف یہ چاہتا ہوں کہ امام حماد حضرت امام اعظم کے اُستادِ فقہ ہونے کے ساتھ اُستادِ حدیث بھی ہیں۔

قاضی ابو یوسف کی کتاب الآثار میں امام حماد کے حوالہ سے امام ابو حنیفہ کی روایات موجود ہیں۔

عَنْ اَبِیْ یُوْسُفَ عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَةَ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ اِبْرَاهِیْمَ اَنَّهٗ قَالَ لَمْ یَجْتَمِعْ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلٰی شَیْءٍ کَمَا اجْتَمَعُوْا عَلَی التَّنْوِیْرِ بِالْفَجْرِ وَالتَّبْکِیْرِ بِالْمَغْرِبِ وَلَمْ یَتَبَادَرُوْا عَلٰی شَیْءٍ مِنَ التَّطَوُّعِ کَمَا تَبَادَرُوْا عَلٰی اَرْبَعٍ قَبْلَ الظُّهْرِ وَرَکْعَتَیِ الْفَجْرِ [3]

---

[1] عمدۃ القاری ج ۱ ص ۸۰۔ [2] کتاب الایمان ص ۱۶۱ [3] کتاب الآثار ص ۵۶

ابراہیم کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا کسی کام پر اتنا ایکا نہیں ہوا جتنا صبح کی نماز کو چاندنا کر کے پڑھنے اور مغرب کی نماز کو سویرے پڑھنے پر ہوا ہے اور کسی بھی نفل پر اتنی ہمیشگی نہیں کی جتنی کہ ظہر سے پہلے چار سنتوں اور صبح کی نماز سے پہلے دو سنتوں پر کی ہے۔

امام محمد نے مؤطا میں امام مالک کے ساتھ کچھ امام اعظم کی روایات بھی درج کی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

مُحَمَّدٌ اَخْبَرَنَا اَبُوْحَنِیْفَةَ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ اِبْرَاهِیْمَ اَنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ سُئِلَ عَنِ الْوُضُوْءِ مِنْ مَّسِّ الذَّكَرِ فَقَالَ اِنْ كَانَ فَاقْطَعْهُ[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود سے دریافت کیا گیا کہ پیشاب گاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو کا حکم کیا ہے؟ فرمایا اگر ناپاک ہے تو کاٹ دو۔

---

[1] مؤطا امام محمد ص ۴۷۔ نوٹ:- آج مؤطا امام مالک کے دو ہی نسخے متداول ہیں ایک امام یحییٰ بن یحییٰ لیثی کا۔ اور دوسرا امام محمد کا، جن کے متعلق امام ذہبی نے لکھا ہے کان من بحور العلم والفقہ قویا فی مالک (میزان الاعتدال) علم اور فقہ کے سمندر تھے اور امام مالک سے آمدہ بیانات میں بیحد قابل اعتماد ہیں۔ امام مالک کے سارے تلامذہ میں امام محمد کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے امام مالک کی ساری حدیثوں کو امام مالک کی زبان سے سُنا ورنہ عام طور پر امام مالک کے شاگرد پڑھتے اور وہ سنتے۔ یہی وجہ ہے کہ امام محمد کو امام مالک سے مؤطا سننے میں پورے تین سال لگے نیز جتنے لوگوں نے امام مالک سے مؤطا کی روایت کی ہے ان میں کوئی بھی جلالت شان میں امام محمد کا ہمسر نہیں بلاشبہ امام شافعی مؤطا کے رواۃ میں داخل ہیں لیکن قطع نظر اس بات کے کہ ان سے مؤطا کا کوئی نسخہ مروی نہیں ہے ان کو امام محمد سے وہی نسبت ہے جو امام مالک سے ہے کیونکہ امام شافعی نے دونوں اماموں سے یکساں استفادہ کیا ہے اور گو انہوں نے امام محمد سے حدیث کا علم بھی بہت کچھ حاصل کیا ہے جیسا کہ حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے اور الشافعی فاحتج بمحمد بن الحسن فی الحدیث (ص ۵۹) لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ فقہ میں وہ خاص طور پر امام محمد ہی کے تربیت یافتہ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ حد سے زیادہ ان کی تعظیم کرتے تھے خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں امام شافعی سے ناقل ہیں امن الناس علی فی الفقہ محمد بن الحسن اور حافظ سمعانی نے ابو یعلی کی زبانی امام شافعی کے یہ الفاظ لکھے ہیں۔ اعاننی اللہ برجلین بابن عیینۃ فی الحدیث وبمحمد فی الفقہ (بلوغ الامانی ص ۲۳)

امام محمد نے کتاب الآثار میں بھی بحوالہ امام اعظم از حماد بے شمار روایات درج کی ہیں۔

مُحَمَّدٌ عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ اِبْرَاھِیْمَ قَالَ ثَلَاثَۃٌ یُؤْجَرُ فِیْھِنَّ الْمَیِّتُ بَعْدَ مَوْتِہٖ وَلَدٌ یَدْعُوْ لَہٗ بَعْدَ مَوْتِہٖ فَھُوَ یُؤْجَرُ فِیْ دُعَائِہٖ وَ رَجُلٌ عَلَّمَ عِلْمًا یُعْمَلُ بِہٖ وَیُعَلِّمُہٗ لِلنَّاسِ فَھُوَ یُؤْجَرُ عَلٰی مَا عَمِلَ وَعَلَّمَ وَرَجُلٌ تَرَکَ صَدَقَۃً[1]

تین چیزوں سے مرنے کے بعد مرنے والا فائدہ اٹھاتا ہے۔ بیٹا جو مرنے کے بعد اس کے لیے دعا مانگے، عالم جس نے علم حاصل کیا عمل کیا اور لوگوں کو تعلیم دی لوگوں کے علم و عمل کا میت کو بھی فائدہ ہوتا ہے تیسرے وہ زمین جسے خیراتی کاموں کے لیے صدقہ بنا کر چھوڑ دیا گیا۔

ایسے ہی حافظ ابو محمد حارثی نے اپنے مسند میں بحوالہ حماد امام اعظم کی بہت سی روایات درج کی ہیں:

اَبُوْحَنِیْفَۃَ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ اِبْرَاھِیْمَ عَنْ عَلْقَمَۃَ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَمْ یَقْنُتْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الْفَجْرِ اِلَّا شَھْرًا حَارَبَ حَیًّا مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ فَقَنَتَ یَدْعُوْ۔[2]

حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز میں صرف ایک ماہ قنوت کی جبکہ مشرکین کے ایک قبیلہ سے جنگ تھی۔

امام اعظم ہی کا جو مسند بروایت حصفکی موجود ہے اس میں حضرت حماد کے حوالہ سے روایات موجود ہیں۔

اَبُوْحَنِیْفَۃَ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ اِبْرَاھِیْمَ عَنْ عَلْقَمَۃَ وَالْاَسْوَدِ

---

[1] کتاب الآثار امام محمد ص ۱۸۰ [2] مسند خوارزمی ج ۱ ص ۲۱۱

عَنْ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ لَا یَرْفَعُ یَدَیْہِ اِلَّا عِنْدَ افْتِتَاحِ الصَّلٰوۃِ وَلَا یَعُوْدُ لِشَیْئٍ مِّنْ ذَالِکَ [1]

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرتے تھے۔

---

[1] شرح مسند ملا علی قاری ص ۲۰۔ نوٹ: یہ حدیث مختلف الفاظ میں دوسرے محدثین ابوداؤد، ترمذی، اور نسائی نے بھی روایت کی ہے ابوداؤد کی روایت میں اس حدیث کو بیان کرنے والے چھ راوی ہیں عثمان، وکیع، سفیان ثوری، عاصم، عبدالرحمٰن اور علقمہ۔ اور اسی سند کے ساتھ یہ حدیث ترمذی میں موجود ہے مگر اس میں ہناد کی جگہ محمود بن غیلان ہے۔ ابن ابی شیبہ نے اس حدیث کو ان رواۃ کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ وکیع، سفیان، عاصم، عبدالرحمٰن اور علقمہ۔ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں لم یثبت حدیث ابن مسعود۔ دراصل یہ ایک سنگین مغالطہ ہے حدیثیں دو ہیں اور دونوں ابن مسعود کی ہیں ایک یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار کے علاوہ نماز میں رفع یدین نہیں کیا۔ دوسری یہ کہ عبداللہ کہتے ہیں کہ کیا میں تم کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نماز نہ پڑھاؤں۔ عبداللہ نے نماز پڑھائی اور تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کیا۔ دونوں میں فرق ہے۔ پہلی حدیث میں حضور کے بارے میں ہے کہ آپ نے نہیں کیا اور دوسری میں آپ کے عمل کا نہیں بلکہ خود عبداللہ کے عمل کا ذکر ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں پہلی مرفوع ہے اور دوسری موقوف ہے۔ کچھ راویوں نے دونوں کو مخلوط کر دیا تھا۔ عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں کہ روایتی حیثیت سے پہلی بات ثابت نہیں ہے اور ثابت نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس اسناد سے پہلی روایت عبداللہ بن المبارک کو پہنچی ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ثابت نہ ہونے سے مطلقاً نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ صرف اس اسناد کی صحت کی نفی ہے۔ علامہ ابن دقیق العید فرماتے ہیں کہ ابن المبارک کے نزدیک کسی حدیث کا ثابت نہ ہونا اس کو مستلزم نہیں ہے کہ اوروں کے نزدیک بھی ثابت نہیں ہے۔ مشہور محدث یحییٰ القطان اسے صحیح کہتے ہیں۔ حافظ ابن حزم کی رائے میں صحیح ہے اور امام ترمذی نے اس کی تحسین کی ہے۔ یہ موضوع ذرا تفصیل طلب ہے صرف اتنی بات یاد رکھئے کہ حدیثیں دونوں طرح آئی ہیں رفع یدین کرنے اور نہ کرنے کی۔ امام اعظم نے تکبیر تحریمہ کے علاوہ نماز میں رفع یدین نہ کرنے کی سنت کو اولیٰ و افضل قرار دیا ہے کیونکہ صحابہ کی زیادہ تعداد اسی پر عمل پیرا تھی اور محدثین کا بتایا ہوا ضابطہ ہے کہ اِذَا تَنَازَعَ الْخَبَرَانِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نُظِرَ اِلٰی مَا عَمِلَ عَلَیْہِ اَصْحَابُہٗ۔ (ابوداؤد)

بطور نمونے از گلزار چند روایات ہیں۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام حماد حضرت امام اعظم کے استاد حدیث ہیں اور استاد بھی ایسے شفیق کہ حافظ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ امام صاحب کے والد بزرگوار نے امام حماد سے ایک مسئلہ دریافت کیا حماد نے جواب دیا۔ امام صاحب نے جواب پر ایک سوال کر دیا۔ بات لمبی ہو گئی۔ حضرت حماد خاموش ہو گئے۔ امام صاحب جب مجلس سے رخصت ہو گئے تو امام حماد نے فرمایا:

هٰذَا مَعَ فِقْهِهٖ يُحْيِي اللَّيْلَ۔[1]

یہ صرف فقیہ نہیں بلکہ شب زندہ دار بھی ہیں۔

امام حماد کے فرزند کہتے ہیں کہ ایک بار میرے والد محترم سفر میں تشریف لے گئے واپسی پر میں نے دریافت کیا کہ اس دوران میں زیادہ کون یاد آیا؟ میرا خیال تھا کہ وہ یہی فرمائیں گے کہ تو! لیکن انہوں نے امام ابوحنیفہ کا نام لیا اور فرمایا کہ اگر مجھے یہ قدرت ہوتی کہ میں ابوحنیفہ سے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی نظر جدا نہ کروں تو نہ کرتا۔[2]

ابواسحاق السبیعی سے تلمذ

ان کا نام عمرو بن عبداللہ اور کنیت ابواسحاق ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرہ میں ان کو علم حدیث میں امام اعظم کا استاد لکھا ہے یہ خود علم حدیث میں صحابہ کرام یعنی زید بن ارقم، عبداللہ بن عمرو، عدی بن حاتم طائی اور براء بن عازب کے شاگرد ہیں۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ:

حَدَّثَ عَنْ ثَلَاثِمِائَةِ شَيْخٍ[3]

ان کے تین سو استاد ہیں۔

ان میں اڑتیس صحابہ کرام ہیں۔ امام ابوداؤد طیالسی کہتے ہیں کہ حدیث ہمیں چار شخصوں سے ملی ہے۔ زہری، قتادہ، ابواسحاق السبیعی اور امام اعمش۔ پھر سب کے بارے میں ایک ایک فن کی امامت کا ذکر کرتے ہوئے ابواسحاق کے متعلق دعویٰ کیا ہے کہ

اَعْلَمُهُمْ بِحَدِيْثِ عَلِيٍّ وَابْنِ مَسْعُوْدٍ۔[4]

انہوں نے قرآن حکیم امام ابوعبدالرحمٰن السلمی سے پڑھا ہے حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ

---

[1] الانتقاء فی فضائل الثلاثہ ص ۲۔ [2] تاریخ بغداد ترجمہ حماد۔ [3]، [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۸

امام اعمش فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ ان کو دیکھتے تو پکار اُٹھتے۔

هٰذَا عَمْرُو الْقَارِی [1]

ابو عبدالرحمٰن اسلمی حضرت عبداللہ بن مسعود کے جلیل القدر شاگردوں میں سے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

ابو عبدالرحمٰن السلمی اور ان کے علاوہ کوفہ کے دوسرے علماء جیسے علقمہ، اسود، حارث اور زر بن جیش نے قرآن عزیز عبداللہ بن مسعود سے حاصل کیا ہے۔[2]

صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ یہ لوگ مدینے جا کر حضرت عمر، حضرت عائشہ سے بھی استفادہ کرتے تھے۔

ابو اسحاق السبیعی کی وفات ۱۲۷ھ میں ہوئی ہے۔ امام شعبی فرماتے ہیں کہ امام ابو اسحاق السبیعی مجھ سے سال یا دو سال بڑے ہیں ان سے امام اعظم نے بہت احادیث روایت کی ہیں۔ چنانچہ کتاب الآثار میں قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں:

اَبُوْ یُوْسُفَ عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ عَنْ اَبِیْ اِسْحَاقَ السَّبِیْعِیْ عَنْ شُرَیْحٍ اَنَّہٗ قَالَ اِذَا مَضَتْ اَرْبَعَۃُ اَشْہُرٍ بَانَتْ بِالْاِیْلَاءِ۔

شریح کہتے ہیں کہ چار ماہ گزرنے پر عورت ایلاء سے بائنہ ہو جائے گی۔[3]

حافظ ابو محمد حارثی اپنے مسند میں فرماتے ہیں:

اَبُوْ حَنِیْفَۃَ عَنْ اَبِیْ اِسْحَاقَ السَّبِیْعِیْ عَنِ الْاَسْوَدِ عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ لَمْ یَکُنْ بَیْنَ اَذَانِ بِلَالٍ وَابْنِ اُمِّ مَکْتُوْمٍ اِلَّا قَدْرَ مَا یَنْزِلُ ھٰذَا وَیَصْعَدُ ھٰذَا۔

بلال اور ابن اُم مکتوم کی اذانوں میں صرف دونوں مؤذنوں کے اترنے اور چڑھنے کا فرق ہوتا تھا۔[4]

حافظ موسیٰ بن زکریا نے اپنے مسند میں بھی بحوالہ ابو اسحاق السبیعی بہت روایات لکھی ہیں۔

اَبُوْ حَنِیْفَۃَ عَنْ اَبِیْ اِسْحَاقَ السَّبِیْعِیْ عَنِ الْبَرَاءِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۶۶ [2] منہاج السنۃ ج ۴ ص ۱۴۲ [3] کتاب الآثار ص ۸۰
[4] جامع المسانید ص ۳۰۴۔

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُعَلِّمُنَا التَّشَهُّدَ كَمَا يُعَلِّمُ السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْآنِ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تشہد ایسے ہی سکھاتے تھے جیسے قرآن کی سورت[1]

امام ابواسحاق السبیعی کو حافظ ذہبی نے حفاظ کے چوتھے طبقہ میں شمار کیا ہے۔ امام شعبہ، امام اعمش اور امام سفیان ثوری جیسے اجلہ ائمہ حدیث ان کے شاگرد ہیں۔

الامام الحافظ شیبان سے امام اعظمؒ کا تلمذ

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ ان الفاظ سے شروع کیا ہے۔ الامام، الحافظ، الحجہ، اصل میں بصرہ کے رہنے والے ہیں مگر کوفہ میں اقامت فرمائی تھی۔ حکم بن عتیبہ، زیاد بن علاقہ، منصور بن المعتمر، عبدالملک بن عمیر، سماک بن حرب، سلیمان بن مہران اور حسن بصری سے حدیث کی تعلیم پائی ہے۔ سیدالحفاظ یحییٰ بن معین سے ان کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا کہ ہر پہلو سے ثقہ ہیں۔ تمام ائمہ نقد و جرح ان کی ثقاہت وصداقت پر متفق ہیں۔ حافظ عسقلانی نے جن ائمہ فن سے ان کی ثقاہت وصداقت نقل کی ہے ان میں ابوالقاسم البغوی، یعقوب بن شیبہ، ابوحاتم، العجلی، النسائی اور یحییٰ بن سعید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ زائدہ بن قدامہ، ابوداؤد طیالسی، الحسن بن موسیٰ، عبدالرحمٰن بن مہدی علم حدیث میں ان کے شاگرد ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں ان کے شاگردوں کی فہرست میں امام اعظم کا بھی ذکر کیا ہے اور حافظ ذہبی نے امام صاحب کی شاگردی کا ان لفظوں میں تذکرہ کیا ہے۔

حَدَّثَ الْإِمَامُ اَبُوْحَنِيْفَةَ عَنْهُ[2]

حافظ عسقلانی نے لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن بن مہدی کو ان کے سامنے زانوئے ادب طے کرنے پر بڑا ہی ناز تھا منجملہ اور شاگردوں کے مشہور امام المسند علی بن الجعد[3] جوہری بھی ان کے شاگرد ہیں۔ امام بخاری،

---

[1] شرح مسند احمد ص ۱۲۰۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ترجمہ شیبانی۔

[3] علی بن الجعد حدیث کے مشہور امام ہیں۔ امام بخاری اور ابوداؤد کے استاد ہیں اور حدیث میں جیسے ابن ابی ذئب اور شعبہ کے شاگرد ہیں ایسے ہی قاضی ابویوسف سے بھی ان کو شرف تلمذ حاصل ہے اور قاضی صاحب کے اصحاب میں سے ہیں۔ ان کا پورا نام ابوالحسن علی بن الجعد الجوہری ہے ان کی حدیث دانی کا اندازہ کرنا ہو تو مشہور محدثین جزرہ، احمد، اسحاق بن راہویہ اور یحییٰ بن معین کا یہ اتفاقی فیصلہ پڑھیے۔ امام جزرہ کہتے ہیں۔ ہم چار دن ایک روز ان کے

(باقی ص ۲۱۲ پر)

امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے اپنی کتابوں میں ان سے کافی روایات لی ہیں اور امام اعظم کے مسانید میں بھی ان کے حوالہ سے احادیث آتی ہیں۔

اَبُوْحَنِيْفَةَ عَنْ شَيْبَانَ عَنْ يَحْيٰى عَنِ الْمُهَاجِرِ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صَوْمِ الصَّمْتِ وَالْوِصَالِ۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے چپ رہنے اور ہمیشہ کے روزے سے منع فرمایا ہے[1]

یہی روایت بحوالہ عکرمہ الحافظ الحارثی بخاری نے بھی اپنے مسند میں بیان کی ہے۔

الحکم بن عتیبہ سے امام اعظمؒ کا تلمذ

حافظ ذہبی نے ان کو شیخ الکوفہ لکھا ہے۔ قاضی شریح، ابووائل، ابراہیم نخعی، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ اور سعید بن جبیر سے علم حدیث پڑھا ہے۔ خلاصہ میں ان کو احد الاعلام بتایا ہے، امام اوزاعی امام مسعر بن کدام، حمزۃ الزیات، امام شعبہ اور ابوعوانہ نے خلاصہ میں امام اعظم کو ان کا شاگرد قرار دیا ہے ان کے بارے میں سفیان بن عیینہ کا تاثر یہ تھا کہ حکم اور حماد جیسا کوئی نہیں ہے۔ ائمہ اربعہ حدیث نے اپنی کتابوں میں ان کی سند سے حدیثیں لی ہیں۔ امام اعظم نے بھی ان کے حوالہ سے ایک سے زیادہ روایات لی ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ ابراہیم نخعی سے احادیث میں حکم سے زیادہ پائیدار

صفحہ ۲۱۱ کا بقیہ حاشیہ:۔ در دولت پر حاضر ہوتے آپ اپنی کتابیں لے آتے اور واپس اندر چلے گئے ہمیں خیال ہوا کہ کھانا لینے گئے ہیں ہمیں ان کی کتابوں میں کوئی غلطی نہیں ملی، کھانے سے فراغت کے بعد کتابوں میں درج شدہ ساری احادیث ہمیں زبانی سنا دیں۔ محدث خوارزمی فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کے بارے میں ان کا تاثر یہ تھا کہ امام اعظم جب حدیثیں پیش کرتے ہیں وہ موتی کی طرح آبدار ہوتی ہیں۔ (ج ۲ ص ۳۰۸) اگرچہ بخاری، ابوداؤد، اور مسلم سب ہی کو ان کے سامنے زانوئے ادب طے کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ امام مسلم اپنی صحیح میں حدیث ان سے اس لیے نہیں لی ہے کہ یہ بزرگ ان لوگوں میں سے تھے جو خلق قرآن کے مسئلہ میں متشددین میں سے تھے امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ان کا کہنا تھا کہ مَنْ قَالَ الْقُرْاٰنُ مَخْلُوْقٌ لَمْ اُعَنِّفْهُ اسی بنا پر ان پر بدعتی ہونے کی تہمت لگائی گئی ہے۔

[1] کتاب الآثار

کوئی نہیں ہے۔ امام ابو یوسف نے کتاب الآثار میں بحوالہ حکم یہ روایت درج کی ہے:

عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ عَنِ الْحَکَمِ عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُخَیْمِرَۃَ عَنْ شُرَیْحٍ اَنَّہٗ قَالَ سَاَلْتُ عَائِشَۃَ عَنِ الْمَسْحِ فَقَالَ سَلْ عَلِیًّا فَاِنَّہٗ کَانَ یُسَافِرُ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَسَاَلْتُ عَلِیًّا فَقَالَ اِمْسَحْ۔

شریح کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے موزوں پر مسح کے بارے میں پوچھا فرمایا کہ حضرت علیؓ سے پوچھو وہ حضور انورؐ کے رفیق ہوتے تھے۔ میں نے حضرت علیؓ سے دریافت کیا فرمایا کہ مسح کر لو[1]

الامام الحافظ ابو محمد حارثی اپنے مسند میں ایک سے زیادہ حدیثیں لاتے ہیں:

اَبُوْ حَنِیْفَۃَ عَنِ الْحَکَمِ بْنِ عُتَیْبَۃَ عَنِ الْقَاسِمِ عَنْ شُرَیْحٍ عَنْ عَلِیٍّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ قَالَ یَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا یَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رضاعت سے وہ سب رشتے حرام ہیں جو قرابت سے حرام ہیں[2]

کوفہ کے سب اساتذہ کا استقصا منظور نہیں ہے صرف بطور مشتے از خروارے چند کا تعارف ہدیۂ ناظرین ہے ان کے علاوہ کوفہ کے جن محدثین سے امام اعظم نے علم حدیث حاصل کیا ہے۔ ان میں سے خاص خاص کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ اسماعیل بن خالد سنہ ۱۴۶ھ، بیان بن بشر، جامع بن ابی راشد سنہ ۱۴۸ھ، جامع بن شداد المحاربی سنہ ۱۱۸ھ، الحسن بن سعد بن معبد سنہ ھ، زبید بن ابی انیسہ سنہ ۱۲۴ھ، زیاد بن علاقہ سنہ ۱۳۵ھ، زیاد بن حدیر الاسدی سنہ ھ، ابو عبدالرحمٰن، سعید بن مسروق سنہ ۱۲۸ھ، سلمۃ بن کہیل سنہ ۱۲۱ھ، سلیمان بن ابی سلیمان سنہ ۱۴۱ھ، سماک بن حرب سنہ ۱۲۳ھ، عبدالملک بن عمیر سنہ ۱۳۶ھ، ابو الحارث علقمہ بن مرثد سنہ ۱۳۰ھ، ابو روق عطیہ بن الحارث الہمدانی سنہ ھ، عبدالرحمٰن بن عبداللہ سنہ ۱۶۵ھ، ابو عبداللہ عون بن عبداللہ سنہ ۱۲۰ھ، عتبہ بن عبداللہ بن عتبہ سنہ ھ، قاسم بن عبدالرحمٰن سنہ ھ، منصور بن المعتمر سنہ ھ، منصور بن دینار سنہ ھ، یزید بن عبدالرحمٰن ابو داؤد سنہ ھ، خالد بن علقمہ سنہ ھ،

---

[1]، [2] کتاب الآثار

زکریا بن ابی زائدہ[1]

حافظ ابن حبان نے کتاب الثقات میں ان سب کا ترجمہ لکھا ہے۔ مسانید امام اعظم میں ان سب سے روایات موجود ہیں۔

امام اعظمؒ کا طلب علم کے لیے سفر

اس میں شک نہیں ہے کہ امام اعظم کے اپنے گھر میں اتنا ذخیرہ وافر تھا کہ اگر صرف اسی جگہ کا علم حاصل کرتے تو علم میں کمی نہ آتی۔ امام یحییٰ بن معین جو سید الحفاظ اور ناقدِ فن کہلاتے ہیں۔ کوفہ کے مشہور امام مسعر بن کدام کے متعلق فرماتے ہیں کہ

لَمْ یَرْحَلْ مِسْعَرٌ فِی حَدِیْثٍ قَطُّ[2]

لیکن اس کے باوجود صرف کوفہ ہی رہ کر علم حدیث میں ان کی معلومات کا حال یہ تھا کہ امام شعبہ جیسا امام حدیث ان کو علم حدیث کی ترازو کہتا تھا اور محمد بن بشر کہتے ہیں کہ میں نے ان سے دس کم ایک ہزار حدیثیں لکھی ہیں[3] صحابہ و تابعین اگرچہ تمام اسلامی شہروں میں گئے ہیں مگر روایت حدیث کے باب میں جو مرکزیت کوفہ اور مکہ و مدینہ کو حاصل تھی وہ دوسرے شہروں کو نہ تھی۔ حافظ ابن عبدالبر نے بسند متصل امام ابن وہب کی زبانی نقل کیا ہے کہ ایک بار امام مالک سے کسی نے مسئلہ پوچھا۔ آپ نے اس کا جواب دیا اس پر پوچھنے والے کے منہ سے نکل گیا کہ شام والے تو اس مسئلہ میں کچھ اور ہی بتاتے ہیں اور آپ کے خلاف ہیں۔ آپ نے فرمایا مَتٰی کَانَ هٰذَا الشَّانُ فِی الشَّامِ؟ شام والوں کو یہ مقام کب سے ملا ہے؟ اِنَّمَا هٰذَا الشَّانُ وُقِفَ عَلٰی اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ وَاَهْلِ الْكُوْفَةِ یہ شان تو صرف کوفہ اور مدینہ کی ہے۔[4] شاید اسی لیے امام مالک نے بھی کبھی طلب علم کے لیے سفر نہیں کیا کیونکہ مدینہ دار العلم تھا۔ اس کے باوجود امام اعظم نے حدیث کی خاطر رختِ سفر باندھا تاکہ آپ کے خزانہ علمی میں صرف مقامی نہیں بلکہ بیرونی معلومات کا بھی سرمایہ ہو۔

---

[1] تہذیب التہذیب۔ تذکرۃ الحفاظ۔ [2] تذکرۃ الحفاظ

[3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۸

[4] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۵۸

علم کی خاطر اسلام میں سفر کی اہمیت

علم دین حاصل کرنے کے لیے جو سفر کیا جاتا ہے اسے رحلہ کہتے ہیں۔ قرآن و سنت میں اس مبارک سفر کی بہت زیادہ ترغیب ہے۔

ارشاد ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ.

پھر کیوں نہ نکلیں ان کی ہر جماعت میں سے چند لوگ تاکہ تفقہ پیدا کریں دین میں اور تاکہ لوگوں کو بیدار کریں جب پلٹ کر جائیں[1]

---

[1] یہ آیت قرآنی مہمات معارف میں سے ہے اس میں صرف یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ علم دین حاصل کرنا اچھی بات ہے اور اس کے لیے سفر کی سختیں برداشت کرنا ایک امر مستحب ہے کیونکہ یہ تو اس آیت کا ظاہر ہے چنانچہ ابوبکر بن العربی لکھتے ہیں انما یقتضی ظاہر هذه الآیة الحث علی طلب العلم والندب الیه واستحباب الرحلة (ج ۱ ص ۴۲۱) یعنی آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ علم کی طلب گاہی میں سرشاری ہونی چاہیے اور اس کی خاطر سفر مستحب ہے اور ساتھ ہی اس آیت کے منطوق سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں دین سیکھنے کا کام ضرور ہونا چاہیے فی هذه الآیة دلیل علی طلب العلم (ج ۱ ص ۱۹۸) لیکن دین سیکھنے کا یہ بوجھ سب پر نہیں ہے ان الخروج فی طلب العلم لا یلزم الاعیان۔ طلب علم کی خاطر گھر سے بے گھر ہونا سب کے ذمہ نہیں ہے بلکہ کچھ کے ذمہ ہے۔ سیکھنے کے بعد جو سیکھ کر آئیں ان کا کام اس آیت میں لوگوں کو بیدار کرنا (انذار) بتایا ہے یعنی پوری جماعت کی پیش پا افتادہ شہری زندگی میں رہنمائی کا فرض انجام دیں اور جن کی دینی زندگی میں رہنمائی کریں۔ وہ ان کی طاعت کریں الانذار یقتضی فعل المامور به والا لم یکن انذارا (انذار حکم کی تعمیل چاہتا ہے ورنہ انذار ہی نہیں ہے۔ (احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۱۹۹) اسی آیت سے دین استادوں کے لیے صدر اول ہی میں فقہا کی تعبیر پیدا ہو گئی تھی۔ امام ترمذی نے لکھا ہے کہ الفقهاء اعلم بمعانی الاحادیث حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ طائفہ لغت میں ایک شخص کو بھی کہتے ہیں ابوبکر بن العربی نے شیخ ابوالحسن اور قاضی ابوبکر کی بھی یہی رائے لکھی ہے اگر یہ صحیح ہے تو آیت کے مدلول سے نہ صرف تقلید شخصی کا جواز بلکہ وجوب بھی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ حدیث خبر واحد ہونے کی صورت میں دین میں حجت اور واجب العمل ہے۔ الجصاص کہتے ہیں فیه دلالة علی لزوم خبر الواحد (ج ۳ ص ۱۹۸)

قرآن کی اس آیت میں جس مقصد کی خاطر رخت سفر تیار کرنے اور گھر سے بے گھر ہونے کا حکم دیا گیا ہے وہ دین میں تفقہ ہے اسی کو علم الشریعۃ، علم الفقہ اور علم قانون کہتے ہیں علوم شرعیہ میں علم فقہ کا مقام بالکل انتہائی اور آخری ہے۔ ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں کہ یہ آیت فقاہت کی تلاش کے لیے ہے۔ قرآن میں جس موقعہ پر یہ آیت آئی ہے وہاں جہاد کا تذکرہ ہے جہاد اور طلب فقہ میں مناسبت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتائی ہے کہ طالب فقہ اور مجاہد دونوں کا نکلنا اللہ کی راہ میں نکلنا ہے اور دونوں کا مقصد اللہ کے دین کی برتری ہے چنانچہ ترمذی میں ارشاد گرامی ہے۔

مَنْ خَرَجَ فِي طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللهِ حَتَّى يَرْجِعَ

جو شخص علم کی تلاش میں نکلتا ہے وہ واپسی تک اللہ کی راہ میں ہے۔

حدیث اور فقہ کا باہمی تعلق

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی زبان میں اور صحابہ کرام کے محاورات میں علم نام ہی فقہ کا ہے یعنی صدر اوّل میں علم کے نام پر جو چیز معروف تھی وہ روایت حدیث نہیں بلکہ فقاہت تھی، حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں صحابہ و تابعین کا علمی تعارف زیادہ تر فقاہت ہی سے کرایا ہے چنانچہ حضرت امام ربانی حضرت عبداللہ بن مسعود کے بارے میں لکھتے ہیں مِنْ نُبَلَاءِ الْفُقَهَاءِ (ج ۱ ص ۱۲) حضرت معاذ بن جبلؓ کے ترجمہ میں فرماتے ہیں مِنْ نُجَبَاءِ الصَّحَابَةِ وَفُقَهَائِهِمْ۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے ترجمہ میں ہے اَقْرَأُ أَهْلِ الْبَصْرَةِ وَاَفْقَهُهُمْ، حضرت ابوالدرداءؓ کے متعلق لکھا ہے مُقْرِئُ أَهْلِ دِمَشْقَ وَفَقِيهُهُمْ، حضرت عائشہ کے بارے میں تصریح ہے مِنْ اَكْبَرِ فُقَهَاءِ الصَّحَابَةِ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق ہے۔ اَلْفَقِيهُ الْمَدَنِيُّ، حضرت جابرؓ کے ترجمہ میں لکھا ہے اَلْفَقِيهُ الْمُفْتِي۔ اس طبقہ اولیٰ میں سارے صحابہ میں دو کو مستثنیٰ کر کے کسی ایک کا بھی تعارف بحدیث و روایت کے ذریعے نہیں کرایا۔ دو سے میری مراد حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ ہیں، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ رَوٰی حَدِيثًا كَثِيرًا، ورنہ کسی بھی صحابی کا علمی چہرہ پیش کرتے ہوئے حدیث کا نام تک نہیں لیا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ فقہ علوم شرعیہ کا آخری درجہ ہے۔

فقہ اور حدیث میں باہمی ربط کیا ہے؟ یہ بات شاہ ولی اللہ محدث کی زبانی سنیے، شاہ صاحب علم الحدیث کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں:

علم الحدیث کے کچھ طبقات اور اس میں فن کاروں کے کچھ مراتب ہیں۔
علم حدیث کے دو درجے ہیں۔ ایک درجہ چھلکے اور سیپی کا ہے اور دوسرا
درجہ مغز اور موتی کا ہے۔ علماء نے دونوں کی خدمت کی ہے علم حدیث
میں چھلکے اور سیپی کے درجے کی چیز حدیثوں کو صحت و ضعف، غرابت
اور شہرت کی حد تک جاننا ہے یہ خدمت محدثین نے سرانجام دی ہے
علم حدیث ہی کا ایک فن یہ بھی ہے کہ اس کے معانی شرعیہ کو سمجھا جائے
اس سے احکام جزئیہ مستنبط کیے جائیں۔ عبارت، دلالت، اشارہ و مفہوم
کی بناپر منصوص حکم پر غیر منصوص کو قیاس کیا جاتے منسوخ و محکم، مرجوح
و مبرم کا پتہ لگایا جاتے حدیث کا یہ فن موتی اور مغز کی حیثیت رکھتا
ہے اس فن کی خدمت کرنے والے فقہاء اور مجتہدین ہیں[1]

علامہ خطابی نے حدیث و فقہ میں اس سے بھی زیادہ لطیف ربط بتایا ہے وہ فرماتے ہیں کہ
حدیث و فقہ میں باہم وہی تعلق ہے جو مکان کی دیواروں اور اس کی بنیاد میں ہوتا ہے۔ فقہ
حدیث کی بنیادوں پر اٹھی ہوئی عمارت کا نام ہے، لکھتے ہیں:

حدیث کی حیثیت مکان کی اساس و بنیاد کی ہے اور فقہ اس بنیاد
پر اُٹھی ہوئی عمارت کا نام ہے جو عمارت بغیر بنیاد کے بنائی جاتے
اس میں استحکام نہیں ہوتا اور صرف بنیادیں بغیر عمارت کے خراب
اور چٹیل میدان ہوتا ہے[2]

ابو بکر الحازمی نے ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ:

احادیث میں ایک دوسری کو باہم ترجیح دینا یہ فقہاء کا کام ہے کیونکہ
ان کا پیش نہاد احادیث میں احکام کو ثابت کرنا ہوتا ہے اور اس
موضوع پر ان کی جولانگاہ کی وسعتیں اور پہنائیاں بے حد ہیں[3]

الغرض اس آیت میں علم کی خاطر رخت سفر باندھنے کا حکم ہے اور اس کا جیسا مجتہد

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۲
[2] معالم السنن ج ۱ ص ۵ [3] شروط الائمۃ الخمسۃ ص ۳۰

اور فقیہہ مخاطب ہے ایسا ہی محدث بھی ہے کیونکہ قرآن و حدیث ہی فقہ کا سرچشمہ اور مرکز ہیں [1]
قرآن میں علم کی خاطر حضرت موسیٰ کے سفر کا تذکرہ ہے چنانچہ امام بخاری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سفرِ علمی کے لیے اپنی صحیح میں ایک مستقل عنوان قائم کیا اور عنوان کی بنیاد ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس درخواست پر رکھی ہے جو اللہ سبحانہٗ نے قرآن حکیم میں نقل کی ہے۔

هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا [2]

کیا میں تیرے ساتھ رہوں اس بات پر کہ مجھ کو سکھلا دے
کچھ جو تجھ کو سکھلائی ہے بھلی راہ۔

صرف اسی باب پر امام بخاری نے اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے بعد امام صاحب نے ایک اور باب الخروج فی طلب العلم کے عنوان سے قائم کیا ہے اور دونوں میں ایک حدیث یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہی واقعہ کہ آپ نے طلب علم کے لیے مجمع البحرین کا سفر کیا نقل کیا ہے۔ اور ان دو باب کے بعد پھر اغتباط در علم و حکمت کا عنوان لاتے ہیں گویا ان دونوں عنوانوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سفرِ علمی کا تذکرہ چھیڑ کر امام بخاری یہ ترغیب دے رہے ہیں کہ طلب علم کی راہ میں کسی حال میں کسی مشقت سے منہ نہ پھیرنا چاہیے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سیادت و نبوت کے مقامِ اعلیٰ پر پہنچنے کے باوجود بھی طلب علم کے لیے سفر کیا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

لِاَنَّ مُوْسٰى لَمْ يَمْنَعْهُ بُلُوْغُهٗ مِنَ السِّيَادَةِ الْمَحَلَّ الْاَعْلٰى
مِنْ طَلَبِ الْعِلْمِ وَرُكُوْبِ الْبَحْرِ وَالْبَرِّ لِاَجْلِهٖ [3]

---

[1] لیکن یاد رہے کہ حدیث اور روایتِ حدیث دو الگ الگ چیزیں ہیں جیسے قرآن اور روایتِ قرآن الگ الگ ہیں فقہ کی بنیاد قرآن ہے نہ کہ روایتِ قرآن۔ ایسے ہی اساس و بنیاد کی حیثیت میں فقہ کا مدار و مرکز حدیث ہے نہ کہ روایتِ حدیث۔ یہی مطلب ہے۔ امام ابن الماجشون کے اس بیان کا جو حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں عبدالملک بن حبیب کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ سب علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ فقہ میں وہ شخص امام نہیں ہو سکتا جو علم قرآن اور حدیث و آثار کے متون نہ جانے اور ان کے معانی پر قابو نہ پائے۔ حضور انورؐ کے ایک ارشاد کے مختلف طرق چند در چند سندیں محفوظ رکھنا روایت و اسناد ہے اور زمانہ فتن میں ضرورت کے تحت رونما ہوتی ہے۔ حدیث پہلے سے بھی موجود تھی اور آج بھی موجود ہے۔
[2] پارہ ۱۵، سورہ کہف۔ [3] فتح الباری ج ۱ ص ۸۷۔

حضرت موسیٰ کا امامت کے بزرگترین مقام پر پہنچنا طلب علم اور اس کی خاطر بحری و بری سفر سے مانع نہیں ہوا ہے۔

امام مسلم نے صحیح میں حضرت ابوہریرہ کی زبانی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے

مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ بِهِ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ [1]

ترمذی میں حضرت انس بن مالک کے حوالے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے

مَنْ خَرَجَ فِي طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ حَتَّى يَرْجِعَ۔

جو بھی طلب علم کے لیے نکلتا ہے وہ واپسی تک اللہ کی راہ میں ہے

ابو داؤد میں کثیر بن قیس کی زبانی یہ واقعہ آیا ہے،

کثیر بن قیس کہتے ہیں کہ میں حضرت ابوالدرداءؓ کے پاس بیٹھا تھا۔ ایک شخص آیا اور بولا کہ اے ابوالدرداء! میں آپ کے پاس مدینۃ الرسول سے آیا ہوں اور آیا بھی صرف اس لیے ہوں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی بیان کرتے ہیں۔ میرے آنے کا مقصد صرف یہ ارشاد گرامی سننا ہے اور کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ابوالدرداء نے فرمایا کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] حافظ ابن رجب فرماتے ہیں کہ تلاش علم کی خاطر چلنا دو طرح کا ہوتا ہے ایک یہ کہ فی الواقع چلے اور علمی مجلسوں میں شرکت کرے اور دوسرے یہ کہ وہ راہ اختیار کرے جو حصول کا ذریعہ ہو مثلاً یاد کرے یا ہم مدارسہ کرے، مذاکرہ اور مطالعہ میں مشغول رہے لکھے اور سمجھے اور اس کے علاوہ جو بھی علم کے حصول کا طریق ہو اسے اپنائے۔ پہلے چلنے کو حقیقی اور دوسرے کو معنوی کہتے ہیں۔ ارشاد نبوت میں دونوں داخل ہیں (جامع العلوم والحکم ص ۲۹۹) اور یہ جو فرمایا ہے کہ اللہ پاک اس کی برکت سے جنت کا راستہ آسان فرمادے گا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ طلب علم میں اگر رضائے الٰہی مقصود ہو گی تو اللہ پاک طالب علم کے لیے علم سے انتفاع اور اس پر عمل آسان فرمائے گا اور یہ بھی اس کے مدلول میں داخل ہے کہ اس کی برکت سے دوسرے علوم بھی آسان ہو جائیں گے اور یہ علوم بھی جنت کا ذریعہ ہوں گے قرآن عزیز میں اس کی شہادت ہے وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ۔ (جامع العلوم والحکم ص ۳۰۰)

سے سُنا ہے کہ جو شخص طلبِ علم کی خاطر راہ چل کر آئے اللہ پاک اس کو جنت کے راستہ پر چلائے گا اور اللہ کے فرشتے طالبِ علم کی خاطر اپنے بازو بچھاتے ہیں اور آسمان و زمین والے تا آنکہ سمندر کی گہرائی میں مچھلیاں اس کے لیے دُعائے مغفرت کرتی ہیں۔ عالم عابد پر ایسی ہی برتری رکھتا ہے جیسے چودھویں رات کا چاند عام ستاروں پر، اور عُلماء انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء نے میراث میں درہم و دینار نہیں چھوڑے ہیں بلکہ انبیاءؑ کی میراث تو علم ہے جو اسے لیتا ہے خوب لیتا ہے[1]

امام بخاری نے اپنی مشہور کتاب الادب المفرد میں، امام احمد نے اپنے مسند میں اور حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں بحوالہ عبداللہ بن محمد بن عقیل حضرت جابر بن عبداللہ کا طلبِ علم کے لیے سفر اختیار کرنے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے:

مجھے ایک صاحب کے متعلق اطلاع ملی تھی۔ انہوں نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم سے ایک حدیث سُنی ہے۔ میں نے فوراً اونٹ خریدا اس پر کجاوہ کسا اور ان صاحب کی طرف ایک ماہ کا سفر اختیار کر کے سیدھا ملک شام پہنچا۔ یہ صاحب عبداللہ بن انیس تھے۔ میں نے ان کے دربان سے کہا کہ جا کر کہو جابر دروازے پر کھڑا ہے۔ انہوں نے سنتے ہی پوچھا کیا ابن عبداللہ! میں نے کہا کہ ہاں فوراً باہر تشریف لائے اور مجھ سے بغلگیر ہوئے۔ میں نے کہا کہ مجھے ایک حدیث کے بارے میں اطلاع ملی ہے کہ آپ نے اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میری زندگی ایسی حالت میں ختم نہ ہو جائے کہ میں حضورِ انور کے ارشادِ گرامی سے محروم رہوں۔ اس کے بعد عبداللہ بن انیس نے وہ حدیث بیان کی۔ یہ حدیث آخرت میں قصاص سے متعلق ہے۔

ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن بریدہ کے حوالہ سے منقول ہے کہ:

---

[1] جامع العلوم والحکم ج ۱ ص ۳۰۶

ایک صحابی ایک حدیث کی خاطر سفر کر کے فضالہ بن عبید کے پاس گئے
یہ اس وقت اپنی اونٹنی کو چارہ ڈال رہے تھے دیکھتے ہی بولے مرحبا!
مسافر صحابی نے کہا میں ملاقات کے لیے نہیں بلکہ ایک حدیث کی خاطر
آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے وہ حدیث سنی ہے۔ فضالہ
نے پوچھا وہ کون سی حدیث ہے ؟ میں نے کہا کہ فلاں حدیث جس
میں یہ ہے۔

امام دارمی نے بسند صحیح بسر بن عبد اللہ سے روایت کی ہے کہ میں صرف ایک حدیث کی خاطر شہر شہر کا سفر کرتا تھا۔ حضرت سعید بن المسیب کہتے ہیں کہ میں ایک ایک حدیث کے لیے دن رات چلتا تھا۔[۱]

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اسلام میں علمی سفر کا مقام بہت بلند ہے اور اس کے فضائل بے شمار ہیں اور قرآن حکیم کی اس ترغیب کی وجہ سے اس کا رواج صدر اول میں ہو چکا تھا۔ امام شافعی کے حدود سفر میں حافظ ابن حجر نے توالی التاسیس میں حسب ذیل مقامات بتاتے ہیں۔ مدینہ، یمن، عراق اور مصر، امام احمد نے طلب حدیث کے لیے کوفہ، بصرہ، شام اور جزیرہ کا سفر کیا ہے۔[۲] امام ابو یوسف نے عراق، حجاز، شام اور دیگر ممالک کے بہت سے اساتذہ کے سامنے زانوے ادب تہ کیا ہے[۳] اور امام محمد نے کوفہ، بصرہ، مکہ، شام اور بلادِ عراق میں جا کر حدیث سنی تھی[۴] حافظ ذہبی نے مناقب میں خود امام محمد کی زبانی نقل کیا ہے کہ والد محترم نے تیس ہزار درہم چھوڑے تھے ان میں سے میں نے پندرہ ہزار نحو اور شعر کی تحصیل پر خرچ کیے اور باقی پندرہ ہزار حدیث و فقہ کی تکمیل پر۔

بہر حال علم حدیث کے لیے سفر کرنا اور اس کی دھن میں ملک ملک پھرنا سلف کا معمول تھا۔ اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے خلف[۵] بن ایوب سے ایک مسئلہ دریافت کیا وہ کہنے لگے،

۱؎ مناقب احمد ص ۲۲، ۲؎ حسن التقاضی ص ۵۴، ۳؎ نیل الامانی ص ۶، ۴؎ مناقب ذہبی ص ۵۴

۵؎ حضرت خلف بن ایوب اہل بلخ کے امام اور بہت بڑے فقیہ اور محدث تھے حافظ ذہبی نے آپ کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع کیا ہے احد الفقہاء الاعلام محدث حاکم نے ان کو فقیہ بلخ اور حافظ خلیلی نے صدوق مشہور لکھا ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ سلطان بلخ آپ کی زیارت کے لیے آئے تو آپ نے منہ

(باقی ص ۲۲۲ پر)

مجھے تو معلوم نہیں ہے نوواردنے کہا کہ پھر کسی ایسے شخص کا مجھے پتہ بتایئے جسے یہ مسئلہ معلوم ہو فرمایا ایسے تو حسن بن زیاد ہیں جو کوفہ میں ہیں۔ اس پر پوچھنے والے نے کہا کہ کوفہ تو بہت دور ہے۔ امام خلف بن ایوب نے فرمایا کہ مَنْ هَمَّهُ الدِّيْنُ فَالْكُوْفَةُ إِلَيْهِ قَرِيْبَةٌ یعنی جسے دین کی فکر ہو اس کے لیے کوفہ نزدیک ہے اسی بنا پر اصول حدیث کی کتابوں میں اس علمی سفر کے لیے خاص خاص ہدایات آئی ہیں، چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

رحلت یہ ہے کہ اپنے شہر کی حدیثوں کو پہلے معلوم کرے اور ان کو یاد کرے پھر دوسرے شہروں کا سفر کرے سفر میں وہ کچھ حاصل کرے جو اس کے پاس نہ ہو[1]

امام اعظم نے جب علم حدیث پر توجہ کی تو اسی قاعدے کے مطابق سب سے پہلے اپنے شہر کے

---

[1] شرح الفکر ص ۴۰۔

صـ ۲۲۱ کا بقیہ حاشیہ:۔ پھیر لیا۔ امام حاکم نے لکھا ہے کہ آپ نے فقہ کی تعلیم قاضی ابو یوسف اور ابن ابی لیلیٰ سے حاصل کی اور زہد و تصوف حضرت ابراہیم بن ادہم سے حاصل کیا امام حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں خلف بن ایوب کے حوالہ سے یہ حدیث لکھی ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلَّى خَلْفَ إِمَامٍ فَإِنَّ قِرَاءَتَهُ لَهُ قِرَاءَةٌ۔

حافظ ابن حبان نے کتاب الثقات میں ان کا ذکر کیا ہے اور حاکم نے تاریخ نیشاپور میں ان کا مفصل ترجمہ لکھا ہے۔ حدیث کا سماع آپ کو امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر اور ابن ابی لیلیٰ کے علاوہ عوف اعرابی، قیس بن الربیع، اسرائیل بن یونس، اسد بن عمرو، جریر بن عبد الحمید اور دیگر علماء کی ایک جماعت سے حاصل ہے۔ امام ذہبی نے لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبل، ابو کریب اور رہبت سے اکابر محدثین نے آپ کے سامنے زانوئے ادب طے کیا ہے امام حاکم لکھتے ہیں کہ آپ ۲۰۵ھ میں نیشاپور تشریف لائے تو ہمارے یہاں کے مشائخ نے آپ سے حدیثیں لکھیں، آپ کے شاگردوں میں امام احمد کے علاوہ رئیس المحدثین یحییٰ بن معین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ امام ترمذی نے بھی اپنی سنن میں ابو کریب محمد بن العلاء کے حوالہ سے ایک حدیث نقل کی ہے مگر افسوس ہے کہ امام ترمذی کو حضرت خلف کے حالات کا علم نہ ہو سکا اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے حافظ ابن حزم اپنی جلالت قدر کے باوجود امام ترمذی سے ناواقف ہیں حافظ سخاوی نے الاعلان بالتوبیخ میں لکھا ہے کہ ابن حزم صرف ترمذی سے نہیں بلکہ مشہور امام ابو القاسم بغوی، اسمٰعیل الصفار اور ابو العباس الاصم سے بھی ناآشنا ہیں جیسا امام ترمذی کو ابن حزم کا نہ جاننا کوئی قیمت نہیں رکھتا ایسے ہی ترمذی کی خلف بن ایوب سے ناواقفیت بھی کوئی وزن نہیں رکھتی۔

ساتذہ فن کے سامنے زانوے ادب تہ کیا اور ایک عرصہ تک وطن عزیز ہی میں تحصیل علم میں مصروف رہے اور جن جن اساتذہ سے کوفہ میں استفادہ کیا اس کا ایک دھندلا سا خاکہ آپ کے سامنے آچکا ہے جب آپ کوفہ سے سیراب ہو چکے تو دوسرے مقامات کا رُخ کیا۔

رحلتِ علمیہ کی تاریخ

امام اعظم کی رحلتِ علمیہ کی تاریخ تو معلوم نہیں ہوسکی۔ البتہ جامع بیان العلم و فضلہ میں حافظ ابن عبد البر نے خود امام صاحب کا جو بیان درج کیا ہے اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پہلا سفر اپنے والد محترم کی معیت میں مکہ کا کیا ہے اور اسی سفر میں آپ کی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن الحارث سے ملاقات ہوتی ہے اس میں تصریح ہے:

میری عمر سولہ سال تھی کہ میں نے ۹۶ھ میں اپنے والد کی ہمرکابی میں حج کا سفر کیا[1]

حج اس زمانے میں افادہ و استفادہ کا سب سے بڑا ذریعہ تھا کیونکہ ممالک اسلامیہ کے گوشہ گوشہ سے بڑے بڑے اہل کمال حرمین میں آکر جمع ہوتے تھے اور درس و افتاء کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ابوالحسن مرغینانی نے بسندِ متصل نقل کیا ہے کہ امام اعظم نے ایک بار نہیں بلکہ ۵۵ بار حج کیا ہے[2] نیز آپ نے طلبِ علم کی خاطر بصرہ کا بیس مرتبہ سے زیادہ سفر کیا ہے اور اکثر پورا پورا سال وہاں قیام بھی کیا ہے[3]

ان تاریخی روایات سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے طلب علم کی خاطر مکہ، مدینہ اور بصرہ کا سفر کیا ہے لیکن آغازِ سفر کے بارے میں جامع بیان العلم کی روایت کے علاوہ کوئی مثبت تصریح نہیں ہے اس لیے قیاس یہی ہے کہ آغاز اگرچہ ۹۶ھ میں ہو چکا تھا مگر ان علمی سفروں میں باقاعدگی اور تسلسل ۱۰۴ھ کے بعد ہوا ہے۔ الیافعی کی تصریح کے مطابق امام شعبی کا سال وفات ۱۰۴ھ ہے۔ اسی کے بعد آپ نے سفر کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا ہے کیونکہ آپ یہ پہلے سُن چکے ہیں کہ امام صاحب امام حماد کے پاس علم الشرائع کی خاطر اٹھارہ سال رہے ہیں امام حماد کی تاریخِ وفات ۱۲۰ھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امام اعظم نے ۱۰۴ھ سے

---

[1] جامع بیان العلم و فضلہ ج ا ص ۴۳۔ [2] صدر الائمہ ج ا ص ۷۴۔ [3] الجواہر المضیئہ ج ا ص ۵۳۔

مسلسل علمی سفر کیے ہیں اور آخر عمر تک حج سے تو کوئی سال بھی خالی نہیں ہے کیونکہ اگر آپ نے ۵۵ حج
کیے ہیں جیسا کہ امام ابو الحسن مرغینانی نے بیان کیا ہے تو پہلا حج ۹۶ھ میں ہی آتا ہے اور یہ وہی حج
ہے جب آپ اپنے والد محترم کے ساتھ پہلی بار حج کو تشریف لے گئے ہیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلّم کے صحابی حضرت عبد اللہ بن الحارث کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں اس کے بعد آپ
کی عمر کا کوئی سال بھی حج سے خالی نہیں ہے -

اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ذہبی نے امام لیث بن سعد کی ملاقات کے
سلسلے میں لکھا ہے کہ :

امام لیث فرماتے ہیں کہ میں امام اعظم کی شہرت سنتا تھا ملنے کا بے حد
مشتاق تھا۔ حسن اتفاق سے مکہ میں اس طرح ملاقات ہوئی کہ میں نے
دیکھا کہ لوگ ایک شخص پر ٹوٹے پڑے جا رہے ہیں۔ مجمع میں میں
نے ایک شخص کی زبان سے کلمہ سنا کہ اے ابو حنیفہ! میں نے جی میں
کہا کہ لو تمنا بر آئی یہی امام ابو حنیفہ ہیں [1]

تذکرۃ الحفاظ میں حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ امام لیث بن سعد انیس سال کی عمر میں حج کو تشریف
لے گئے اور یہ بھی بتایا ہے کہ امام لیث کی اکاسی سال عمر تھی۔ ۱۷۵ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے [2]
یہ ان کا اتفاقی حج ہے ورنہ اس کے بعد بھی صرف امام اعظم کی ملاقات ہی کے لیے لیث بن سعد
حج کو گئے ہیں۔ چنانچہ اسی سلسلے کا ایک واقعہ الحافظ ابو محمد الحارثی بسند متصل فقیہ مصر عبد الرحمٰن بن
القاسم کی زبانی نقل کرتے ہیں :

میں نے لیث بن سعد سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ مجھے ایک بار
امام اعظم کا براستہ حج آنے کا علم ہوا میں صرف امام اعظم سے ملاقات
کی خاطر حج کو گیا۔ مکہ میں آپ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے آپ سے
مختلف عنوانوں پر بہت سے مسائل دریافت کیے۔ میں نے آپ سے
دیوانی و فوجداری مسائل میں قتل خطا اور شبہ عمد کے بارے میں پوچھا۔ [3]

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ انیس سال کی عمر میں یعنی ۱۱۳ھ میں امام لیث نے پہلا حج کیا ہے جیسا کہ

---

[1] مناقب ابی حنیفہ الذہبی ص ۲۲ - [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۸ - [3] صدر الائمہ ج ۲ ص ۱۵۳

امام ذہبی نے لکھا ہے [1] اور امام اعظم کو اس موقعہ پر اس طرح پایا کہ

اَلنَّاسُ مُتَقَصِّفِیْنَ عَلَیْہِ ، لوگ اُن پر ٹوٹے پڑے ہیں ۔

اور بعد کو نام لینے پر معلوم ہوا کہ یہی امام اعظم ہیں ۔

۱۱۳ھ میں ہجوم کا یہ ٹوٹا پڑنا بتا رہا ہے کہ یہ امام اعظم کا پہلا سفر نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے متعدد بار آچکے ہیں اور ذات گرامی جانی پہچانی ہے ورنہ ایک اجنبی کے گرد یہ ہجوم کہاں ہوتا ہے اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ آپ نے امام شعبی کی وفات کے بعد حجوں کا لگاتار سلسلہ شروع کر دیا تھا اور امام لیث نے تو یہ بات جلوت کے متعلق بتائی ہے کہ :

رَأَیْتُ النَّاسَ مُتَقَصِّفِیْنَ عَلَیْہِ ۔

مگر امام ابو عاصم النبیل نے جو مکہ ہی کا واقعہ بتایا ہے اس میں تو بات یہاں تک کھول دی ہے کہ لوگوں کی عقیدت امام اعظم کو مکہ میں صرف جلوت ہی میں نہیں بلکہ گھر کی خلوت میں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی اور صرف اصحاب حدیث نہیں بلکہ ارباب فقہ کا بھی آپ کے اردگرد ہجوم رہتا تھا چنانچہ امام ابو جعفر طحاوی نے بکار بن قتیبہ کے حوالہ سے امام ابو عاصم کی زبانی نقل کیا ہے کہ

ہم مکہ میں امام اعظم کے پاس رہتے تھے آپ کے پاس ارباب فقہ اور
اصحاب حدیث کا ہجوم ہو گیا ۔ آپ نے فرمایا کہ کیا ایسا کوئی شخص نہیں
ہے جو صاحب خانہ کو کہہ کر ہم سے ان لوگوں کو ہٹواتے [2]

اس سے ایک طرف اگر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ امام اعظم مستقل طور پر مکہ جاتے تھے اور وہاں آپ نے بود و باش بھی اختیار کی تھی تو دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں امام اعظم سے دونوں مدرسے یکساں فائدہ اٹھاتے تھے اور امام صاحب کی علم الفقہ اور علم الحدیث دونوں فنون میں لوگوں کو جلالت قدر کا یکساں اقرار تھا اس مقصد کی خاطر لوگ دُور دُور سے چل کر آتے ۔

حج کے عام سفروں کے علاوہ اُموی حکومت کے آخری دَور میں حکومت کے جور و ستم اور ظلم و تعدی سے تنگ آکر آپ نے حجاز کا رُخ کیا ۔ کردری رقمطراز ہیں ،

فَھَرَبَ اِلٰی مَکَّۃَ وَاَقَامَ بِھَا سَنَۃَ مِائَۃٍ وَّ ثَلَاثِیْنَ ۔ [3]

مکہ روانہ ہو گئے اور وہاں ۱۳۰ھ تک قیام فرمایا ۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۸ ، [2] مقدمہ اعلاء السنن ص ۲۷ ، [3] مناقب ابی حنیفہ ابن بزاز ص ۲۷

اسی زمانے میں اموی حکومت کے خلاف سازش ہوتی ہے عباسیوں کے اشارے سے ابومسلم نے بغاوت کرائی جب تک عباسی تحریک اُموی حکومت کا خاتمہ کر کے عباسیوں کو تخت حکومت دلانے میں کامیاب نہیں ہوتی امام اعظم حجاز ہی میں رہے اور بالآخر

قَدِمَ اَبُوحَنِیْفَۃَ اَلْکُوْفَۃَ فِی زَمَنِ اَبِی جَعْفَرِ الْمَنْصُوْرِ[1]

امام ابوحنیفہ ابوجعفر منصور کے زمانے میں کوفہ آتے۔

اس کا حاصل یہی ہے کہ سفاح کی حکومت کا پورا زمانہ چار سال نو ماہ امام اعظم نے کوفہ سے باہر حجاز میں گزارے۔

حجاز میں امام اعظمؒ کے مشاغل

امام اعظم کو اس زمانے کے دستور کے مطابق حجاز کے علماء محدثین سے فائدہ اٹھانے کا یہ زریں موقعہ ملا اور صرف استفادے کا نہیں بلکہ حجاز میں لوگوں نے امام کو افادے کی مجلسیں قائم کرنے پر مجبور کر دیا۔ وزیر بن عبداللہ کا بیان ہے:

میں نے مکہ میں یاسین زیات کو دیکھا کہ سامنے ایک جماعت ہے اور وہ چلا چلا کر کہہ رہے ہیں لوگو! ابوحنیفہ کے پاس آیا جایا کرو اور ان کی مجلس کو غنیمت سمجھو ان کے علم سے فائدہ اٹھاؤ کیونکہ ایسا آدمی پھر بیٹھنے کے لیے تمہیں ملے گا اور حلال و حرام کے ایسے عالم کو پھر نہیں پاؤ گے اگر اس شخص کو تم نے کھو دیا تو علم کی بہت بڑی مقدار کھو دو گے[2]

اسلام کے اس سب سے بڑے مرکز میں ایک ممتاز عالم، محدث یاسین الزیات کی طرف سے اس قسم کے اعلان کا اس کے سوا کیا نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا کہ امام اعظم پر مکہ میں دنیا ٹوٹ پڑے۔ الموفق نے ان کی یہ روایت نقل کی ہے:

ابوحنیفہ حرم کعبہ کی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان پر خلقت کا ہجوم تھا ہر علاقے کے لوگ ہوتے تھے سب کو جواب دیتے اور فتویٰ بتاتے۔

امام عبداللہ بن المبارک نے امام اعظم کے اس علمی افادے کے تماشے کو مکہ میں اپنی آنکھوں سے

---

[1] صدر الائمہ ج ۱ ص ۲۴ [2] صدر الائمہ ج ۱ ص ۳۸

دیکھا ہے ان کا خود بیان ہے :

میں نے حرم کعبہ میں ابوحنیفہ کو دیکھا کہ بیٹھے ہوتے ہیں اور مشرق و مغرب کے باشندوں کو فتویٰ دے رہے ہیں[1]

امام اعظم کی اس مجلس میں کس قسم کے لوگ شریک ہوتے تھے ۔ یہ عبداللہ بن المبارک ہی کی زبانی سنیے :

وَالنَّاسُ یَوْمَئِذٍ نَاسٌ

صدرالائمہ نے عبداللہ بن المبارک کے اس جملے کا مطلب یہ بتایا ہے کہ

یَعْنِی الْفُقَهَاءَ الْكِبَارَ وَخِیَارَ النَّاسِ

عبداللہ کی مراد یہ ہے کہ بڑے بڑے فقہاء اور بہترین لوگوں کا مجمع تھا

الغرض حجاز میں امام اعظم کی ذات گرامی سے دونوں مدرسے محدثین اور فقہاء مستفید ہو رہے تھے ۔ یہ دونوں مدرسے الگ الگ ہیں دونوں میں بڑا جوہری فرق ہے ۔

محدث اور فقیہ میں فرق

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث کی زبانی آپ فقہ اور حدیث کا باہمی فرق سن چکے ہیں لیجیے ۔ سردست محدث اور فقیہ کا فرق بھی شاہ صاحب ہی کی زبانی معلوم کر لیجیے ۔

محدث اور فقیہ میں فرق ہے ۔ محدث کا کام صرف حدیث کی روایت ہوتا ہے اور اس سلسلے میں وہ یہ دیکھتا ہے کہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف، محرف ہے یا غیر محرف، عربی زبان میں الفاظ غریبہ کے معانی کیا ہیں؟ راویوں کی لڑی عدالت کی ترازو میں پوری اترتی ہے یا نہیں، حدیث کے توابع و شواہد کیا ہیں ۔ حدیث اپنے بیان کرنے والوں کے لحاظ سے شہرت اور غرابت میں کیا مقام رکھتی ہے ۔ جو محدث علم حدیث میں یہ باتیں جانتا ہے وہ ضابط، حافظ اور متقن کہلاتا ہے ۔

فقیہ کا کام مشتبہ الفاظ کی تحدید اور حدیث میں رکن، شرط اور ادب کی تعیین کرتا ہے ۔ وہ امر کے صیغوں کو دیکھ کر استحباب اور وجوب

---

[1] صدر الائمہ ص ۵۷۔

کا فیصلہ کرتا ہے۔ اور نواہی میں مکروہ اور حرام کے درجات مقرر کرتا ہے
وہ پیش پا افتادہ مسائل کی علتیں اور دلائل جانتا ہے اور علتوں کے
لحاظ سے کسی حکم کے مطلق اور مقید ہونے کی نشاندہی کرتا ہے وہ
اپنی فقاہت کے زور سے احترازی اور اتفاقی قیود واضح کرتا ہے اور
اطلاق و تقیید کی روشنی میں وہ زندگی کے مختلف مسائل کے بارے
میں ہر موضوع پر قوانین و ضوابط کلیہ بتاتا ہے اور پھر ان قوانین سے
حالات و کوائف میں اٹھتے ہوئے سوالات کا جواب دیتا ہے دلائل میں
تعارض ہو تو تطبیق دینا، باہم مفاہمت کرانا، منسوخ بتانا اور تعارض کے
وقت ترجیح دینا فقیہ کا کام ہے [1]

اس پر تفصیلی گفتگو آئندہ اوراق میں آئے گی۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ مکہ میں آپ سے استفادہ کرنے والے دونوں فنون حدیث اور فقہ میں استفادہ کرتے تھے۔ یہی حال آپ کا کوفہ میں بھی تھا کہ آپ دونوں فنوں میں ایک امام کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے تھے۔

صدر الائمہ نے اسی سلسلے میں مکی بن ابراہیم کے متعلق لکھا ہے کہ

أَنَّهُ دَخَلَ الْكُوفَةَ وَلَزِمَ أَبَا حَنِيفَةَ وَسَمِعَ مِنْهُ الْحَدِيثَ وَالْفِقْهَ [2]

کوفہ آئے اور امام ابو حنیفہ کے پاس رہ کر ان سے حدیث و فقہ کی سماعت کی۔

اسی بنا پر حافظ ابن تیمیہ نے الرد علی البکری میں امام اعظم کو امام المحدثین والفقہاء لکھا ہے۔ بہر حال امام اعظم کے اسفار علمیہ میں سب سے اونچا مقام مکہ کا ہے اور آپ نے امام شعبی کی وفات کے بعد ۱۰۴ھ میں رخت سفر باندھا ہے۔

حدیث اور روایتِ حدیث

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ تدوینِ حدیث کے لیے امیر المومنین عمر بن عبد العزیز کی جانب سے ۱۰۰ھ میں باقاعدہ سرکلر جاری ہوا ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ ابھی حدیث میں روایت و اسناد

---

[1] مصفی شرح موطا ج ۱ ص ۴۴، [2] مناقب ابی حنیفہ للموفق ص ۶۲ -

کا عام چرچا نہ تھا کیونکہ صحابہ اور تابعین موجود تھے اور سنن عام شہری زندگی میں رائج تھیں۔ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں طبقہ خامسہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ

اسلام اور مسلمانوں میں عزت و شوکت اور علم اپنے اوج کمال پر تھا
دین کی خاطر جدوجہد اور محنت ہو رہی تھی اور سنتیں پر سر عام تھیں۔
بدعات سرنگوں تھیں اور اعلان حق کرنے والے کافی تھے۔[1]

خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمایئے "والسنن مشہورۃ" کہ اس دور میں سنن شہری زندگی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ پھیلی ہوئی سنتوں کو سمیٹنا کوئی مشکل کام نہ تھا اور اس کے لیے اسناد و روایت کا سلسلہ چنداں درکار نہ تھا۔ چنانچہ قاضی ابوبکر بن حزم نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم کی تعمیل میں ایک نہیں بلکہ متعدد کتابیں لکھیں۔ حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ امام زہری کو بھی خاص طور پر تدوین حدیث کے کام پر سرکاری طور پر مامور کیا گیا تھا۔ امام زہری کا خود اپنا بیان ہے:

اَمَرَنَا عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِیْزِ بِجَمْعِ السُّنَنِ فَکَتَبْنَاهَا دَفْتَرًا دَفْتَرًا[2]
ہمیں عمر بن عبدالعزیز نے جمع سنن کا حکم دیا ہم نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے

امام زہری کے ان دفاتر کا معمر نے بھی تذکرہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

ولید بن یزید قتل ہوا تو امام زہری کی لکھی ہوئی تصانیف کو ولید کے خزانہ سے جانوروں پر لاد کر لایا گیا۔[3]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ روایت و اسناد کا فن رونما ہونے سے پہلے علم حدیث یا السنن کا اندازہ کیا تھا؟ کیونکہ حدیث تو دراصل نبوت کے اقوال، افعال اور احوال کا نام ہے اس کے سوا روایت و اسناد پر حدیث کا اطلاق محدثین کی اپنی اصطلاح ہے۔ امام ذہبی لکھتے ہیں:

بخدا طلب حدیث، حدیث سے الگ ہے کیونکہ طلب حدیث تو چند در چند امور زائدہ کے لیے ایک عرفی نام ہے اور یہ امور زائدہ ماہیت حدیث سے الگ ہیں۔[4]

حافظ ابن تیمیہ اس موقعہ پر بڑے پتے کی بات فرما گئے ہیں:

لوگوں کو پتہ نہیں ہے کہ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۴ ۲۲ [2] جامع بیان العلم وفضلہ ج ا ص ۷۹، [3] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۰۶ [4] ایضاً ص ۱۹۱

ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی روایت
کی وجہ سے صحیح ہوئی ہے نہیں ہرگز نہیں بلکہ بخاری و مسلم کی احادیث
کو روایت کرنے والے اور بھی بے شمار علماء محدثین ہوتے ہیں بخاری و
مسلم سے پہلے اور بعد میں ان احادیث کو بیان کرنے والے روایت کرنے
والے اَن گنت لوگ ہوئے۔ اگر بخاری و مسلم پیدا نہ ہوتے تو نہ دین
میں کوئی کمی آتی اور نہ احادیث کے وجود پر کوئی حرف آتا جب ہم
کہتے ہیں کہ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے تو اس کی
حیثیت اس سے کوئی مختلف نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ قرآن کو قراء
سبعہ نے روایت کیا ہے۔ قرآن بتواتر منقول ہے، قرآن کا
قرآن ہونا قراء سبعہ پر موقوف نہیں ہے۔ ایسے ہی احادیث کا صحیح
ہونا اور ان کا حدیث ہونا بخاری و مسلم کی روایت پر موقوف
نہیں ہے بلکہ یہ احادیث بخاری و مسلم کے وجود پذیر ہونے سے
پہلے ہی صحیح اور اُمت میں مقبول تھیں[1]

اسی بنا پر روایت و اسناد کے رونما ہونے سے پہلے زمانہ تابعین میں ایسی تمام روایات جنہیں تابعی حضور انور کے نام سے پیش کرے قابلِ قبول سمجھی جاتی تھیں۔ اور حافظ ابن جریر کا تو یہاں تک دعویٰ ہے کہ تابعین کا ایسے ارشادات اپنانے پر اتفاق رہا ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر لکھتے ہیں۔

ابو عمر بن عبد البر نے تمہید کے آغاز میں تصریح کی ہے کہ امام ابن جریر
کہتے ہیں کہ مرسل روایات کے قبول کرنے پر تابعین کا اجماع ہے[2]

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ اسناد و روایت کے وجود میں آنے سے پہلے بھی حدیث موجود تھی اصل تو حدیث ہی ہے روایت و اسناد تو حدیث کی حفاظت کی خاطر فتنوں کے زمانے کی پیداوار ہے۔ چنانچہ امام مسلم مقدمہ میں امام ابن سیرین کے حوالہ سے رقمطراز ہیں:

لَمْ يَكُونُوا يَسْئَلُونَ عَنِ الْاَسْنَادِ فَلَمَّا وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ

---

[1] منہاج السنۃ ج ۴ ص ۵۸۔ [2] الروض الباسم ج ۱ ص ۱۸، توضیح الافکار ج ۲ ص ۸۲

قَالُوْا سَمُّوْا لَنَا رِجَالَكُمْ فَيُنْظَرُ إِلَى أَهْلِ السُّنَّةِ فَيُؤْخَذُ حَدِيْثُهُمْ وَيُنْظَرُ إِلَى أَهْلِ الْبِدَعِ فَلَا يُؤْخَذُ مِنْهُمْ [1]

لوگ اسناد کے بارے میں پوچھ گچھ ہی نہ کرتے تھے۔ جب فتنے رونما ہوئے تو لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ اپنے آدمی بتاؤ۔ اگر راوی اہل السنۃ ہوتا تو روایت لیتے اور اگر بدعتی ہوتا تو روایت اس سے نہ لیتے۔

جوں جوں زمانہ صحابہ و تابعین سے دُور ہی ہوتی گئی اسناد و روایت کے فن میں وسعت آتی گئی حتیٰ کہ جو حدیث زمانہ تابعین میں امام اعظم کو صرف ایک واسطہ اور دو واسطوں سے مل جاتی وہی بخاری و مسلم کے زمانے میں اسناد و روایت کے بازار میں چھ واسطوں کی محتاج ہو گئی۔ مثلاً امام اعظم فرماتے ہیں:

عَنْ عَطَاءٍ عَنْ حُمْرَانَ أَنَّ عُثْمَانَ تَوَضَّأَ ثَلَاثًا وَقَالَ هٰكَذَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَوَضَّأُ [2]

حمران کہتے ہیں کہ حضرت عثمان نے وضو میں ایک ایک عضو کو تین تین بار دھویا اور فرمایا کہ میں نے ایسے ہی حضور انور ﷺ کو وضو کرتے دیکھا ہے۔

آئیے یہی حدیث امام بخاری کی زبانی بھی سُن لیجئے:

حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ الْأُوَيْسِيُّ قَالَ حَدَّثَنِيْ إِبْرَاهِيْمُ بْنُ سَعْدٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّ عَطَاءَ بْنَ يَزِيْدَ أَخْبَرَهُ أَنَّ حُمْرَانَ مَوْلَى عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ رَأَى عُثْمَانَ دَعَا بِإِنَاءٍ فَأَفْرَغَ عَلَى كَفَّيْهِ ثَلَاثَ مِرَارٍ فَغَسَلَهُمَا ثُمَّ أَدْخَلَ يَمِيْنَهُ فِي الْإِنَاءِ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا وَيَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ ثَلَاثًا ثُمَّ مَسَحَ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ ثَلَاثًا إِلَى الْكَعْبَيْنِ ثُمَّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوْئِيْ هٰذَا ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ فِيْهِمَا نَفْسَهُ غُفِرَ لَهُ

---

[1] صحیح مسلم ج ص ۱۱۔ [2] مسند امام ابو حنیفہ ص ۲۲

مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ [1]

جیسے آج تدوین کتب کے بعد ان کتابوں کے مصنفین پر حد درجہ اعتماد ہے کہ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ

اَنَّ نِسْبَۃَ الْکِتَابِ اِلٰی مُصَنِّفِہٖ مَعْلُوْمَۃٌ فِی الْجُمْلَۃِ بِالضَّرُوْرَۃِ فَاِنَّا نَعْلَمُ اَنَّ مُحَمَّدَ بْنَ اِسْمَاعِیْلَ الْبُخَارِیَّ اَلَّفَ کِتَابًا فِی الْحَدِیْثِ وَاَنَّہٗ ھٰذَا الْمَوْجُوْدُ فِیْ اَیْدِی الْمُحَدِّثِیْنَ [2]

کتاب کی نسبت مصنف کی طرف بداہتہً معلوم ہے کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ امام بخاری نے حدیث میں ایک کتاب لکھی ہے اور وہی محدثین کے ہاتھوں میں موجود ہے۔

ایسے ہی دور اسناد و روایت سے پہلے صحابہ اور تابعین پر ان ائمہ دین کو اعتماد تھا۔ ہم بھی آج جو حدیثیں ان کتابوں سے بیان کرتے ہیں اور برملا کہہ دیتے ہیں کہ امام بخاری و مسلم اور ابو داؤد وغیرہ نے فرمایا ہے تو یہ اصول محدثین کے مطابق روایات مرسلہ ہیں کیونکہ نہ ہم نے بخاری سے سنا ہے اور نہ مسلم سے بلکہ ہمارے اور امام بخاری کے درمیان ایک سے زیادہ وسائط ہیں جن کے نام سے بھی ہم واقف نہیں سب کے سب مجاہیل ہیں جیسا کہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے لکھا ہے:

اِنَّ اَقْصٰی مَا فِی الْبَابِ اَنْ یُّرْوَی الْحَدِیْثُ عَنِ الْمَجَاھِیْلِ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمَجَاھِیْلِ مِنَ الْعُلَمَاءِ [3]

زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ حدیث مجاہیل مسلمان اور مجاہیل علماء سے روایت کی جا رہی ہے۔

لیکن ہمیں اس پر کوئی قدح نہیں کیونکہ ہمیں ان بزرگوں کی دیانت، صداقت اور ثقاہت و عدالت پر پورا پورا اعتماد ہے ٹھیک ٹھیک ایسا ہی اعتماد روایت و اسناد کا سلسلہ پیدا ہونے سے پہلے اس دور کے لوگوں کو تابعین کرام پر تھا۔ اس اعتماد کی وجہ سے آج ہم ان علماء کے مراسیل کو قوی نہیں بلکہ قوی تر بتاتے ہیں:

---

[1] اس روایت کو امام مسلم اپنی صحیح میں نو طریقوں سے لائے ہیں ہر طریق میں سات افراد ہیں اور دارقطنی نے سات طریقوں سے درج کیا ہے مگر کوئی طریق آٹھ افراد سے خالی نہیں ہے۔

[2]، [3] الروض الباسم ص ۱۸

إِنَّ أَقْوَى الْمَرَاسِيْلِ مَا أَرْسَلَهُ الْعُلَمَاءُ مِنْ أَحَادِيْثِ هٰذِهِ الْكُتُبِ۔[1]

مراسیل میں قوی تر ان کتابوں کی حدیثوں میں علماء کے مراسیل ہیں۔

اور جیسے ان بزرگوں کی کتابوں کو آج ترجیح، دوسری کتابوں کے مقابلے میں شہرت اور قبول کی بنا پر ہے اور اس لیے یہ کتابیں بجائے خود ایک دلیل صحت بن گئی ہیں ایسے ہی دوسری صدی کے لوگ تابعین کو دوسروں کے مقابلے میں ان کی علمی شہرت اور قبول کی بنا پر ترجیح دیتے تھے اور اس لیے تابعین کی ہستی بجائے خود ان کے یہاں صحت کی ضمانت تھی۔ بہت بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہم تو اپنے بزرگوں کی دیانت کے اتنے متوالے ہوں کہ ان کی راہ سے آتی ہوئی حدیثوں کو قطعی قرار دیں اور تابعین کے مقام پر ہم انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیں فاناللہ والی اللہ المشتکی۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ حدیث اور ہے اور روایتِ حدیث اور — امام اعظم کے زمانہ طالبعلمی میں فنِ روایت واسناد شاہراہِ عام پر نہ آیا تھا اور نہ اس کے تیسری صدی کی طرح عام شہروں میں دفاتر کھلے تھے اور نہ ہی اس دَور میں کبار تابعین کا دور ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ حافظ شمس الدین سخاوی رقمطراز ہیں:

وَلَا يَكَادُ يُوْجَدُ فِي الْقَرْنِ الْأَوَّلِ الَّذِيْ انْقَرَضَ فِي الصَّحَابَةِ وَكِبَارِ التَّابِعِيْنَ ضَعِيْفٌ۔[2]

وہ قرنِ اوّل جس میں صحابہ اور بڑے تابعین ہیں اس میں ضعیف کوئی نہیں ہے

سنہ ۱۲۰ھ یحییٰ بن سعید القطان کی تاریخ ولادت ہے جن کے بارے میں حافظ ذہبی نے انکشاف کیا ہے کہ فنِ رجال میں سب سے پہلے مصنف یہی ہیں اور کوفہ میں امام شعبہ موجود تھے جن کے بارے میں امام احمد فرماتے ہیں:

كَانَ شُعْبَةُ أُمَّةً وَحْدَهُ فِيْ هٰذَا الشَّأْنِ۔[3]

اس فن میں حضرت شعبہ یگانہ امام ہیں۔

الغرض امام اعظم نے علم کی خاطر سفر کیا اور آپ کے اسفار علمیہ میں مرکزی حیثیت مکہ مکرمہ کو حاصل ہے۔

---

[1] الروض الباسم ص ۱۰۸ [2] الاعلان بالتوبیخ ص ۱۶۴ - [3] الاعلان بالتوبیخ ص ۱۳۶۔

مکہ مکرمہ کی علمی حیثیت

وہ حرم پاک جہاں سے علم وحی و نبوت کا آغاز ہوا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے رسول ہونے کے بعد تیرہ سال کا عرصہ گزارا۔ امام اعظم کے زمانہ میں یہ بھی کوفہ کی طرح دار العلم تھا۔ حافظ ذہبی الامصار ذوات الآثار میں فرماتے ہیں:

عہد صحابہ میں یہاں علم کم تھا پھر صحابہ کے آخری دور میں علم کی کثرت ہوئی اور اسی طرح عہد تابعین میں مجاہد، عطار، سعید بن جبیر اور ابن ابی ملیکہ اور پھر ان کے شاگردوں کے دور میں عبد اللہ بن ابی نجیح، قاری ابن کثیر، حنظلہ بن ابی سفیان اور ابن جریج اور ہارون رشید، کے وقت میں مسلم زنجی، فضیل بن عیینہ، ابو عبد الرحمٰن ازرقی، حمیدی اور سعید بن منصور جیسے علماء ہوئے ہیں۔[1]

امام بخاری کو حرمین کے عمل پر اتنا اعتماد تھا کہ انہوں نے اپنی صحیح میں اس موضوع پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے۔

باب ماذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم وحض علی اتفاق اھل العلم و ما اجتمع علیہ الحرمان مکۃ والمدینۃ

علامہ کرمانی شارح صحیح بخاری لکھتے ہیں:

امام بخاری کا انداز بیان کہہ رہا ہے کہ اہل حرمین کا اتفاق و اجتماع حجت ہے۔

مگر حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ

لَعَلَّہٗ اَرَادَ التَّرْجِیْحَ لَا الْاِجْمَاعَ۔[2]

غالباً مراد ترجیح ہے اجماع نہیں۔

امام بخاری کی عبارت کا خواہ مطلب کچھ ہو مگر اتنا معلوم ہے کہ اختلافی مسائل میں ان کے نزدیک

---

[1] الاعلان بالتوبیخ ص ۱۳۶۔
[2] فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۵۷۔

وہی مسئلہ قابلِ ترجیح ہے جس پر علمار حرمین متفق ہوں [1]

بہرحال دوسری صدی کے آغاز میں اور پہلی صدی کے آخر میں مکہ مکرمہ علم کی منڈی تھا اور تمام بلادِ اسلامیہ میں مکہ کے علمی جلال کا لوہا مانا جاتا تھا اتنا کہ علامہ سحنون نے تصریح کی ہے کہ اگر ابن عباس اہلِ مدینہ سے کسی مسئلہ میں اختلاف کر جائیں تو مدینہ کی اجماعی طاقت علمی بھی بے جان ہوجاتی تھی۔

اِذَا خَالَفَ ابْنُ عَبَّاسٍ اَهْلَ الْمَدِيْنَةِ لَمْ يَنْعَقِدْ لَهُمْ اِجْمَاعٌ [2]

جب اہلِ مدینہ کی ابن عباس مخالفت کریں تو اہلِ مدینہ کا اجماع منعقد نہیں ہوتا۔

مکہ میں امام اعظم نے جن حفاظِ حدیث سے علمی استفادہ کیا ہے ان کی تفصیل بتانا تو دشوار ہے یہاں صرف چند گرامی قدر ہستیوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین کو مکہ کے گلستان کی باغ و بہار کا کچھ اندازہ ہوسکے۔

امام اعظم کا عطا بن ابی رباح سے تلمّذ

حافظ ذہبی نے ان کے ترجمہ کا آغاز مفتی اہلِ مکہ، محدثِ مکہ، القدوۃ اور العلم کے زریں القاب سے کیا ہے اور ان کو علمِ حدیث میں امام اعظم کا استاد بتایا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

عنہ ایوب وحسین المعلم وابن جریج وابن اسحاق والاوزاعی وابوحنیفہ [3]

عطا کے تلامذہ میں ایوب، حسین ابن جریج، ابن اسحاق، اوزاعی اور ابوحنیفہ ہیں۔

---

[1] یہ مسئلہ بھی مہماتِ مسائل میں سے ہے۔ اہلِ مکہ کا دوسرے اسلامی شہروں کے مقابلے میں اپنی قوت اجماع سے قابلِ ترجیح ہونا بظاہر اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ جس پائے کے علماء یہاں موجود تھے دوسرے مقامات پر بھی موجود تھے نیز مہاجرین جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدیم صحبت یافتہ تھے ان میں سے پھر کسی ایک نے بھی مکہ میں آکر دوبارہ قیام نہیں کیا ان کو اس کی شرعاً اجازت نہ تھی۔ مکہ کی جو علمی رونق تھی وہ عبداللہ بن عباس کے تلامذہ کے دم خم سے تھی اور بس۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔

[2] عمدۃ القاری ج ۲۵ ص ۲۰۲۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۲۔

بلکہ امام ذہبی نے اپنی مشہور تاریخ کے خلاصہ میں بالتصریح یہ بھی لکھا ہے کہ:

أَكْبَرُ شُيُوخِهِمْ عَطَاءُ بْنُ أَبِي رَبَاحٍ [1]

ابوحنیفہ کے اساتذہ میں سب سے بڑے عطاء ابن ابی رباح ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حیثیت امام مالک کی اسانید میں مالک عن نافع عن ابن عمر کی ہے جسے امام بخاری وغیرہ اجل الاسانید اور اصح الاسانید کہتے ہیں۔ یہی حیثیت امام اعظم کی اسانید میں ابوحنیفۃ عن ابن عباس کی ہے۔ چنانچہ امام شعرانی نے اس کو اسی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے مناقب میں لکھا ہے۔

وَسَمِعَ الْحَدِيثَ مِنْ عَطَاءٍ بِمَكَّةَ [2]

حضرت عطاء بن ابی رباح کی جلالت قدر کا اندازہ کرنا ہو تو ان اکابر کے یہ بیانات پڑھیے حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اے اہل مکہ تم میرے پاس بھیڑ رکھتے ہو حالانکہ تمہارے پاس تو عطاء موجود ہیں۔ بعینہ یہی الفاظ حافظ ذہبی نے حضرت عبداللہ بن عمر سے بھی نقل کیے ہیں۔ حضرت سعید فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ مکہ میں تشریف لائے۔ لوگوں نے ان سے مسائل دریافت کیے آپ نے فرمایا کہ مسائل کی خاطر تم میرے پاس جمع ہوتے ہو حالانکہ تم میں عطاء موجود ہیں [3]

ذرا غور فرمایئے کہ اس شخص کی جلالت علمی کا کیا حال ہوگا جس کی علمیت کا لوہا ابن عباس اور ابن عمر جیسے جلیل القدر اور اساطین حدیث صحابہ مانتے ہوں۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ:

عطاء بن ابی رباح نے ستر حج کیے ہیں۔ اموی دور حکومت میں زمانہ حج آتا تو سرکاری طور پر منادی ہوتی۔

لا يفتي الناس في الحج الا عطاء [4]

حافظ ابن کثیر ہی نے سعید بن سلام البصری کے حوالہ سے ان سے امام اعظم کی پہلی ملاقات کا پورا حال لکھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

میں نے خود امام اعظم سے سنا ہے کہ جب امام موصوف سے ان کی ملاقات

---

[1] دول الاسلام ص ۷۴۔ [2] مناقب ذہبی ص ۱۱۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۳

[4] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۳۰۶۔

ہوئی تو انہوں نے عطاء سے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ دریافت کرتے ہی، جواب دینے سے پہلے امام صاحب کی طرف مخاطب ہوکر بولے بتاؤ کہاں کے رہنے والے ہو۔ امام صاحب نے فرمایا کہ کوفہ کا شہری ہوں۔ فرمایا کہ اس بستی کے جہاں دینی فرقہ بندی کی بنیاد پڑی۔ امام صاحب نے جواباً فرمایا جی ہاں! فرمایا اچھا بتاؤ کہ کن لوگوں سے تعلق رکھتے ہو؟ یعنی کس مدرسۂ خیال کے ہو۔ امام صاحب نے جواباً کہا کہ الحمدللہ ان لوگوں سے تعلق رکھتا ہوں جو سلف کو بُرا نہیں کہتے یعنی نہ رافضی ہوں نہ خارجی اور نہ قدری۔ اور اہلِ قبلہ کی بربنائے معصیت تکفیر نہیں کرتے یعنی نہ مرجیہ ہوں نہ جہمی اور نہ معتزلی، حضرت نے جواب باصواب سن کر فرمایا عَرَفْتُ فَالْزَمْ پہچان گیا ہوں رہو[1]۔

الغرض امام عطاء بن ابی رباح اپنے وقت میں جلالتِ علمی کا سب سے بڑا نمونہ تھے۔ محدثین میں حفاظِ حدیث کو ان کی بارگاہِ علمی میں زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل ہے مثلاً امام بحر محمد بن مسلم بن شہاب الزہری، قتادہ بن دعامہ، یحییٰ بن کثیر، مالک بن دینار، سلیمان مہران اور امام ایوب السختیانی، حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

كَانَ مِنْ سَادَاتِ التَّابِعِيْنَ عِلْمًا وَّ فِقْهًا[2]

صرف علم و فقہ ہی میں نہیں بلکہ زہد و تقویٰ، پاکبازی اور پارسائی میں بھی آپ کی زندگی ایک مثالی نمونہ تھی۔ اور ہر شخص کے لیے آپ کا یہی وعظ ہوتا تھا۔ حافظ ابن کثیر نے یعلیٰ بن عبید کے حوالے سے جو واقعہ لکھا ہے اس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ یعلیٰ بن عبید کہتے ہیں کہ:

ہم محمد بن سوقہ کے پاس گئے انہوں نے ہم سے مخاطب ہوکر کہا آؤ میں تمہیں ایک مفید بات سناؤں مجھے عطاء بن ابی رباح نے بتایا ہے کہ عزیز من! بزرگانِ سلف لایعنی اور فضول باتوں کو بہت ہی ناپسند کرتے تھے بلکہ فضول کو گناہ سمجھتے تھے۔ صرف اللہ کی کتاب

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۳۰۷۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۰۳۔

کی تلاوت، نیکی کا پرچار، بُرائی پر روک ٹوک یا پھر اپنی ضروریات معیشت سے متعلق باتیں کہتے تھے۔ کیا تم اللہ پاک کے اس ارشاد گرامی کو نہیں مانتے وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحَافِظِیْنَ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ اور مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ۔ اگر تمہارے سامنے تمہارا وہ اعمال نامہ آجائے جس میں وہ باتیں درج ہیں جو نہ دُنیا سے متعلق ہیں اور نہ دین سے کیا تمہیں اس پر شرم نہ آئے گی؟[1]

امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام ابن ماجہ اور امام نسائی نے اپنی کتابوں میں ان سے روایات لی ہیں۔

قاضی ابویوسف نے بحوالہ امام اعظم ان سے احادیث نقل کی ہیں۔ مثلاً

عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ عَنْ عَطَاءٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّہٗ قَالَ لَیْسَ فِی الْقُبْلَۃِ الْوُضُوْءُ۔

بوسہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ عَنْ عَطَاءٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مِثْلَہٗ

ایسے ہی امام موسیٰ بن زکریا الحصکفی نے اپنے مسند میں، حافظ ابو محمد حارثی نے اپنے مسند میں اور امام محمد نے مؤطا اور کتاب الآثار میں حضرت عطاءؒ سے بحوالہ امام اعظم روایات کی تخریج کی ہے۔

ایک ضروری تنبیہہ

یہاں یہ بات یاد رکھئے کہ امام عطاء بن ابی رباح کو حافظ ذہبی نے حفاظِ حدیث کے طبقہ ثالثہ میں شمار کیا ہے۔ اور یہ بات پہلے صاف ہو چکی ہے کہ موصوف مکہ میں حضرت امام اعظمؒ کے علم الحدیث میں سب سے بڑے اور مہربان شفیق استاد ہیں۔ شفقت کا اور شفقت کے ساتھ اکرام و اجلال کا اندازہ کرنا ہو تو وہ واقعہ پڑھیے جو حافظ ابن عبد البر نے بسندِ متصل بحوالہ حارثی

[1] البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۳۰۸

لکھا ہے:۔

ہم عطا بن ابی رباح کے پاس ہوتے کچھ ہم میں سے کچھ کے پیچھے ہوتے
جب امام ابوحنیفہ مجلس میں آتے تو حضرت عطا امام صاحب کے لیے
جگہ بناتے اور ان کو اپنے قریب کر لیتے۔[1]

عطا بن ابی رباح نے کن صحابہ کے علوم سے خوشہ چینی کی ہے اس کی ایک معمولی سی جھلک حافظ ابن حجر کی تہذیب التہذیب کے مطالعہ سے نظر آتی ہے۔ حافظ صاحب موصوف نے پورے ایک صفحہ پر ان کے اساتذہ میں اجلہ صحابہ کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں حضرت عطا کا اپنا بیان نقل کیا ہے کہ:

اَدْرَکْتُ مِائتَیْ صَحَابِیٍّ[2]

اس کا مطلب یہ ہے کہ حرم پاک میں صحابہ کا پھیلا ہوا علم حضرت عطا کے ذریعے امام ابوحنیفہ میں منتقل ہوا ہے۔ اسی بنا پر امام خلف بن ایوب کا امام اعظم کے بارے میں یہ تاثر تھا کہ علم کی دولت اللہ سبحانہ کی جانب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ حضور انور سے یہ دولت صحابہ کو وراثت میں ملی اور صحابہ سے تابعین کو اور تابعین سے امام ابوحنیفہ کو ملی ہے۔ رواہ الحافظ خسرو۔

حافظ عمرو بن دینار سے امام اعظم کا تلمذ

حافظ ذہبی نے ان کا تعارف لکھتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ الامام، الحافظ، عالم الحرم، حافظ جلال الدین السیوطی نے حافظ جلال الدین المزی کے حوالے سے بتایا ہے کہ عمرو بن دینار امام اعظم کے علم حدیث میں شاگرد ہیں۔ حافظ ذہبی، حافظ کردری اور صدر الائمہ نے بھی تصریح کی ہے خزرجی نے ان کو خلاصہ میں احد الاعلام لکھا ہے۔ مشہور محدث سفیان بن عیینہ متوفی ۱۹۸ھ کی ان کے بارے میں رائے یہ تھی کہ ہمارے نزدیک عمرو بن دینار سے زیادہ فقیہ زیادہ عالم اور زیادہ حافظ کوئی نہیں ہے۔[3]

امام عمرو بن دینار ان لوگوں میں سے ہیں جو وقت کی ناپسندیدہ حکومت سے کسی ڈر سے ہیں

---

[1] الانتقاء فی فضائل الائمۃ الفقہاء۔ ص ۱۲۷۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۰۳۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ص ۱۰۴

تعاون نہ کرتے تھے یعنی ان کے نزدیک حکومت میں عدالت ضروری تھی۔ چنانچہ اموی حکومت کے سربر ہشام کا واقعہ حافظ کردری نے لکھا ہے کہ سرکاری طور پر ان کو یہ پیش کش کی گئی کہ منصب افتا سنبھ سرکاری خزانہ سے تنخواہ ملے گی۔ صاف اور کھلے طور پر انکار کر دیا۔[1]

حکومت اور عدالت

یہ موضوع بہت طویل الذیل ہے مگر یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ الامام ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں زیر آیت لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ۔ سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس آیت کے منطوق اور مدلول سے اس مسئلہ کے دونوں مثبت و منفی پہلو واضح کیے ہیں۔ مثبت پہلو کے بارے میں فرماتے ہیں

أَفَادَتِ الْاٰیَۃُ أَنَّ شَرْطَ جَمِیْعِ مَنْ کَانَ فِیْ مَحَلِّ الْاِھْتِمَامِ بِہٖ فِیْ أَمْرِ الْعَدَالَۃِ وَالصَّلَاحِ۔[2]

آیت نے بتایا ہے کہ ایسے تمام عہدوں کی جن کا تعلق قیادت سے ہو بنیادی شرط امیدوار میں صلاحیت اور عدالت کا ہونا ہے۔

اور منفی پہلو کو اسی آیت کے مدلول سے ثابت کرتے ہوتے رقمطراز ہیں۔

فَثَبَتَ بِدَلَالَۃِ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ بُطْلَانُ إِمَامَۃِ الْفَاسِقِ وَأَنَّہٗ لَا یَکُوْنُ خَلِیْفَۃً۔[3]

اس آیت سے فاسق کی امامت کا غلط ہونا معلوم ہو گیا اور یہ بات بھی کہ فاسق تخت خلافت کا اہل نہیں ہے۔

اسی سلسلے میں الجصاص نے اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا ہے جو بعض معتزلہ کی جانب سے امام اعظم کے بارے میں پھیلائی گئی ہے اور بتایا ہے کہ

لَا فَرْقَ عِنْدَ أَبِیْ حَنِیْفَۃَ بَیْنَ الْقَاضِیْ وَبَیْنَ الْخَلِیْفَۃِ فِیْ أَنَّ شَرْطَ کُلِّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا الْعَدَالَۃُ۔[4]

ابوحنیفہ کے نزدیک خلیفہ اور قاضی کے درمیان بلحاظ عدالت شرط ہونے

---

[1] مناقب کردری ج ۲ ص ۷۹۔ [2] احکام القرآن ج ۱ ص ۸۰
[3] احکام القرآن ج ۱ ص ۸۰۔ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۱

میں کوئی فرق نہیں ہے۔

یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں ہے بہرحال امام عمرو بن دینار نے سرکاری منصب افتاء قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ انکار افتاء سے نہیں افتاء کا کام تو وہ پہلے بھی کرتے تھے انکار تو حکومت کا رجسٹر بننے سے ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں اجلہ صحابہ کو ان کا استاد بتایا ہے مثلاً ابن عباس، ابن الزبیر، ابن عمر، ابن عمرو بن العاص، ابو ہریرہ، جابر بن عبداللہ، ابو الطفیل اور سائب بن یزید۔ اور تابعین کی ایک بڑی تعداد کا بھی اسی سلسلے میں تذکرہ کیا ہے۔ ان کے شاگردوں میں امام اعظم کے ساتھ امام شعبہ، امام ابن جریج، حماد بن زید، حماد بن سلمہ، امام سفیان ثوری اور امام اوزاعی کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔

امام عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ مجھ سے خود امام شعبہ نے بتایا ہے کہ میں نے عمرو بن دینار جیسا کوئی نہیں دیکھا[1]

امام سفیان ثوری کہتے ہیں کہ میں کوفہ آیا تو امام ابو حنیفہ نے میرے تعارف میں یہ جملہ بول کر مجھے معاشرے میں کہیں کا کہیں پہنچا دیا کہ

هٰذَا اَعْلَمُهُمْ بِحَدِيْثِ عَمْرِو بْنِ دِيْنَارٍ[2]

لوگوں نے میرے پاس آمد و رفت شروع کر دی۔ امام اعظم نے عمرو بن دینار سے دو حدیثیں بلا واسطہ روایت کی ہیں۔ امام علی بن المدینی کے حوالہ سے خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کی علمی وراثت چھ حضرات کو ملی ہے۔ سعید بن جبیر، عطا بن ابی رباح، عکرمہ، جابر، زید، طاؤس۔ اور ان چھ اکابر کا علم حضرت عمرو بن دینار کو وراثت میں ملا ہے[3] ـــــ ائمہ ستہ نے ان سے روایات لی ہیں۔

عمرو بن دینار مکی اور عمرو بن دینار بصری

مشہور محدث ملا علی قاری حدیث و رجال میں معلوماتی شخصیت ہونے کے باوجود ایک سنگین غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں:

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۸۔ [2] تلقیح فہوم اہل الاثر ص ۲۳۶۔ [3] صدر الائمہ ج ۱ ص ۸۲

عمرو بن دینار کی کنیت ابو یحییٰ ہے۔ سالم بن عبداللہ وغیرہ کے شاگرد ہیں
حماد بن زید، حماد بن سلمہ اور معمر نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا
ہے اور محدثین نے ان کی تضعیف کی ہے [۱]

یہ غلط ہے اور بہت بڑا سہو ہے۔ غلط فہمی کا سر چشمہ یہ ہے کہ ملا علی قاری نے امام عمرو بن دینار مکی کو عمرو بن دینار بصری سمجھ لیا ہے۔ اوّل الذکر صحاح کے راویوں میں سے ہیں۔ امام اعظم کے شیخ اور کبار تابعین میں سے امام اور مجتہد ہیں۔ اور موخر الذکر طبقہ سادسہ میں سے ہیں اور ان کا شمار ضعفاء میں ہوتا ہے۔ الغرض امام کے شیوخ میں عمرو بن دینار مکی ہیں۔ عمرو بن دینار بصری نہیں ہیں۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الآثار میں بحوالہ امام اعظم ان سے روایات لی ہیں۔

عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ عَنْ عَمْرِو بْنِ دِیْنَارٍ عَنْ جَابِرٍ عَنْ زَیْدٍ اَنَّہٗ
قَالَ اِذَا اخْتَارَتِ الْمَرْاَۃُ نَفْسَھَا فَقَامَتْ مِنْ مَّجْلِسِھَا قَبْلَ اَنْ
تَخْتَارَ فَلَیْسَ بِشَیْئٍ [۲]

حضرت زید فرماتے ہیں کہ جب عورت اپنے لیے اختیار کرے پھر وہ اپنی
جگہ سے اختیار ملنے سے پہلے کھڑی ہو جائے تو کچھ نہیں ہے۔

حافظ ابو الزبیر محمد بن مسلم سے امام اعظمؒ کا تلمذ

حافظ ذہبی نے ان کو حفاظ حدیث کے طبقہ رابعہ میں شمار کیا ہے۔ حافظ جلال الدین نے اسعاف المبطأ برجال الموطأ میں، علامہ جزری اور امام ذہبی نے مناقب میں ان کو امام اعظم کا علم حدیث میں استاد قرار دیا ہے۔ یعلیٰ بن عطاء فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن مسلم حدیث بیان کرتے تھے ہمارا اندازہ ان کے بارے میں تھا کہ سب سے زیادہ زیرک اور سب سے زیادہ قوت حافظہ کے مالک ہیں۔ عطاء بن ابی رباح یہ کہہ کر ان کو خراج تحسین ادا کرتے تھے کہ ہم سب حضرت جابر بن عبداللہ کے پاس جا کر حدیثیں سنتے، سننے کے بعد باہم مذاکرہ کرتے تو حضرت ابو الزبیر کو سب سے زیادہ احادیث یاد ہوتی تھیں۔ امام ایوب السختیانی جب ان کے حوالے سے کوئی ارشاد نبوت نقل کرتے تو فرماتے کہ ہم سے ابو الزبیر نے بیان کیا اور ابو الزبیر تو ابو الزبیر ہی ہیں [۳]

---

[۱] شرح مسند امام ص ۱۸۸، [۲] کتاب الآثار ص ۸۸، [۳] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۱۹۔

سب ائمہ حدیث نے ان سے روایات لی ہیں۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الآثار میں بحوالہ امام اعظم ان کی روایات کو پیش کیا ہے۔

اَبُوْ حَنِیْفَۃَ عَنْ اَبِی الزُّبَیْرِ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ سُرَاقَۃَ بْنَ مَالِكٍ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَرَاَیْتَ عُمْرَتَنَا ھٰذِہٖ لِعَامِنَا اَمْ لِلْاَبَدِ قَالَ لِلْاَبَدِ[1]

سراقہ کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ یہ عمرہ ہمارا اسی سال کے لیے ہے یا ہمیشہ کے لیے، فرمایا ہمیشہ کے لیے ہے۔

حافظ ابو الزبیر کے اساتذہ میں عبادلہ اربعہ، حضرت عائشہ، حضرت جابر، ابو الطفیل صحابہ ہیں۔ ان کے علاوہ باقی جلیل القدر ائمہ تابعین ہیں۔ ان کے شاگردوں میں امام اعظم کے علاوہ بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً امام زہری، امام اعمش، امام یحییٰ بن سعید الانصاری، امام ابراہیم بن طہمان، امام حماد بن سلمہ، امام ہشیم، امام سفیان ثوری، امام سفیان بن عیینہ شامل ہیں[2]

امام مالک نے بھی ان سے روایات لی ہیں۔ امام اعظم نے ان سے جس قدر احادیث سنی ہیں ان سب کا مرکز حضرت جابر بن عبد اللہ ہے۔ سید الحفاظ امام یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ امام شعبہ نے حافظ محمد بن مسلم کو رکن و مقام کے درمیان اس بات پر قسم دی تھی کیا تم نے یہ احادیث حضرت جابر بن عبد اللہ سے سنی ہیں؟ فرمایا:

وَاللّٰہِ اِنِّیْ سَمِعْتُھَا مِنْ جَابِرٍ

بخدا میں نے یہ احادیث حضرت جابر سے سنی ہیں۔ ایک بار نہیں بلکہ یہی جملہ آپ نے تین بار دہرایا۔[3]

مکہ میں امام اعظم کے دوسرے شیوخ کو ان ہی پر قیاس کر لیجیے کچھ کے اسما یہ ہیں۔ عبد اللہ بن ابی زیاد، ابو الحسین المکی سنہ ۱۵۰ھ، حمید بن قیس الاعرج ابو صفوان القاری المکی سنہ ۱۳۰ھ، ابو عثمان عبد اللہ بن عثمان القاری المکی سنہ ۱۲۴ھ، عبد اللہ بن عبد الرحمٰن النوفلی المکی، ابراہیم بن میسرہ الطائفی نزیل مکہ سنہ ۱۳۲ھ، اسماعیل بن امیہ بن عمرو بن سعید الاموی سنہ ۱۴۴ھ، اسماعیل بن مسلم ابو اسحاق المکی، ابو عبد اللہ عبد العزیز بن رفیع الاسدی المکی سنہ ۱۳۰ھ، حافظ ابن حبان نے کتاب الثقات

---

[1] کتاب الآثار ص ۱۲۶۔ [2]، [3]۔ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳۔

میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے حوالہ سے حافظ عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں نقل کیا ہے۔

المدینۃ المکرمہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دار الہجرۃ اور آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔ علوم نبوت کا اصلی مخزن اور منبع ہونے کا اسی شہر کو فخر حاصل ہے۔ مکہ کے ساتھ اس کو بھی حرم کہا جاتا ہے وہ بنائے خلیل ہے یہ بنائے حبیب ہے۔ عہد نبوی سے لے کر حضرت علی مرتضیٰ کے ابتدائی زمانے تک ساری دنیائے اسلام کا علمی مرکز یہی تھا۔ ۳۶ھ تک مدینے کی علمی بہار پر فقہاء سبعہ آفتاب و ماہتاب بن کر تاباں رہے ہیں۔ یہ سات شخصیتیں یعنی سعید بن المسیب، عروۃ بن الزبیر، قاسم بن محمد، خارجہ بن زید، عبید اللہ بن عبد اللہ، سلیمان بن یسار، ساتویں شخصیت کی تعیین میں علماء کا قدرے اختلاف ہے۔ حافظ عبد القادر قرشی اور علامہ نووی نے تین شخصیتوں کا ذکر کیا ہے۔

سالم بن عبد اللہ، ابوبکر بن عبد الرحمٰن، ابوسلمۃ بن عبد الرحمٰن۔

مدینہ کے فقہاء سبعہ

امام ذہبی نے ابوبکر بن عبد الرحمٰن کو ہی احد الفقہاء السبعۃ لکھا ہے[۱] اور حافظ ابن حجر عسقلانی بھی ان کے ہم زبان ہیں[۲] اسی رائے کے مطابق محمد بن یوسف شاعر نے ان ساتوں کو دو شعروں میں جمع کر دیا ہے۔

الا کل من لا یقتدی بائمۃ ... فقسمتہ ضیزیٰ عن الحق خارجہ

فخذھم عبید اللہ عروۃ قاسم ... سعید ابوبکر سلیمان خارجہ[۳]

ابن العماد حنبلی نے ان کو ہی قابلِ اعتماد قرار دیا ہے[۴]۔ حافظ ابن حزم اندلسی نے ان ہی اکابر کو ابوبکر کے ساتھ فقہاء سبعہ بتایا ہے فرماتے ہیں:

هٰؤُلَاءِ هُمُ الْفُقَهَاءُ السَّبْعَةُ الْمَشْهُوْرُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ۔[۵]

حافظ ابن القیم الجوزی نے مدینہ کے مفتیوں کے تذکرے میں ان اکابر کا ذکر کرنے کے بعد

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۵۹۔ [۲] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۱۲ [۳] الجواہر المضیۃ ص ۴۲۳
[۴] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۱۴۔ [۵] الاحکام فی اصول الاحکام ج ۵ ص ۲۶۸۔

لکھا ہے :

هُوَ لَاءِ هُمُ الْفُقَهَاءُ[1]

فقہاء سبعہ کے نام پر تو تاریخ میں شہرت کا شرف ان ہی اکابر کو حاصل ہے لیکن مؤرخین میں سے ابوالفداء نے فقہاء مدینہ کی تعداد دس بتائی ہے۔ جرجی زیدان مؤرخ ابوالفداء کے حوالے سے رقمطراز ہے:۔

وَبَعْضُ الْمُؤَرِّخِينَ يَحْسِبُهُمْ عَشَرَةً[2]

لیکن یہ محض اختلاط ہے اور شاید اس اختلاط و التباس کی وجہ یہ ہے جیساکہ ابوحنیفہ دینوری نے تصریح کی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے زمانہ گورنری میں مدینہ میں جن اکابر پر مشتمل مشاورتی کونسل بنائی تھی۔ اس کے اراکین کی تعداد دس تھی اور اس میں ان فقہاء میں سے چھ کو رکن بنایا گیا تھا[3]

حافظ ابن کثیر نے اس مشاورتی کونسل کے ارکان کے نام یہ بتائے ہیں۔

عروۃ بن الزبیر، عبیداللہ بن عبداللہ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، ابوبکر بن سلیمان، سلیمان بن یسار، قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ، عبیداللہ بن عمر، عبیداللہ بن عامر، خارجہ بن زید[4]

ان کا کام پیش پا افتادہ معاملات میں مشورہ دینا اور شہریوں کی پیدا شدہ شکایات کو گورنر تک پہنچانا تھا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان سے کہا تھا کہ

إِنِّي لَا أُرِيدُ أَنْ أَقْطَعَ أَمْرًا إِلَّا بِرَأْيِكُمْ۔

میں نہیں چاہتا کہ تمہارے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ کروں۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ مشاورتی کونسل کے افراد ہیں۔ تاریخ میں فقہاء مدینہ کے نام سے جو مشہور ہوتے ہیں وہ صرف سات ہی ہیں۔

ابن العماد حنبلی نے ان اکابر کو فقہاء سبعہ کہنے کی وجہ یہ لکھی ہے:

یہ فقہاء سبعہ ہیں کیونکہ یہ سب ایک ہی دور میں ہوتے ہیں۔ مدینہ میں ان کے ذریعے علم و فتویٰ کی بیش از بیش نشر و اشاعت ہوتی ہے حالانکہ

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۹۔ [2] ابوالفداء ج ۱ ص ۲۰۹ بحوالہ تاریخ اللغۃ العربیہ ج ۱ ص ۹۰۔
[3] الاخبار الطوال ص ۳۳۶۔ [4] البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۷۱۔

ان کے ہی زمانے میں دوسرے فقہاء تابعین بھی موجود تھے۔ لیکن
ان کا علم کی اشاعت میں وہ حصہ نہیں ہے جو فقہاء سبعہ کا ہے [۱]

حافظ سخاوی نے ان ہی سات کے بارے میں عبداللہ بن المبارک کا یہ بیان نقل کیا ہے:

جب کوئی مسئلہ در پیش آتا یہ سب ایک ساتھ مل کر اس پر غور
کرتے اور جب تک وہ ان کے سامنے پیش ہو کر طے نہ ہو جاتا عدالت
اس کی بابت کوئی فیصلہ صادر نہ کرتی [۲]

اس دور میں مدینہ کی علمی بہار ان ہی فقہاء کے دم قدم سے قائم تھی۔ علم حدیث کا سارا دارومدار
یہی فقہاء سبعہ ہیں۔ ان میں خارجہ بن زید کو چھوڑ کر کہ ان کو امام ذہبی نے قلیل الحدیث لکھا ہے
باقی چھ کا نام سرفہرست ہے۔ امام ذہبی نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔ مشہور استاد علامہ
ابومنصور عبدالقاہر بغدادی نے فقہاء سبعہ کو ائمہ حدیث بتایا ہے فرماتے ہیں:

وَالْفُقَهَاءُ السَّبْعَةُ مِنَ التَّابِعِيْنَ مِنْ هٰذِهِ الْجُمْلَةِ فَاِنَّهُمْ
كَانُوْا مَعَ فِقْهِهِمْ اَئِمَّةً فِي الْحَدِيْثِ [۳]

اس دور میں مختلف شہروں میں حدیث کے مدرسے کھل گئے تھے ان مدرسوں کا اجمالی خاکہ یہ ہے
مدینے میں مدرسہ حدیث کے مشہور امام سعید بن المسیب سنہ ۹۴ھ،
عروۃ بن الزبیر سنہ ۹۴ھ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن سنہ ۹۴ھ، عبیداللہ بن عبداللہ
سنہ ۱۰۶ھ، سلیمان بن یسار سنہ ۹۳ھ، قاسم بن محمد سنہ ۱۱۲ھ، نافع مولیٰ ابن
عمر سنہ ۱۱۷ھ، امام زہری سنہ ۱۱۴ھ، ابوالزناد سنہ ۱۳۰ھ۔ مکے میں حدیث
کے مشہور امام عکرمہ سنہ ۱۰۵ھ، عطاء بن ابی رباح سنہ ۱۱۵ھ، ابوالزبیر سنہ ۱۲۸ھ۔
کوفہ میں امام شعبی، عامر بن شراحیل سنہ ۱۰۴ھ، ابراہیم نخعی سنہ ۹۶ھ، علقمہ
سنہ ۶۲ھ، بصرہ میں حسن بصری سنہ ۱۱۰ھ، ابن سیرین سنہ ۱۱۰ھ، شام
میں عمر بن عبدالعزیز سنہ ۱۰۱ھ، مکحول سنہ ۱۱۳ھ، اور قبیصہ سنہ ۸۶ھ [۴]

---

[۱] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۰۴۔ [۲] فتح المغیث ص ۳۹۹ - [۳] اصول الدین ص ۳۱۴
[۴] الحدیث والمحدثون ص ۱۲۲ -

مدینے کے علم وعمل پر اعتماد

مدینے کے علم وعمل پر کتنا اعتماد ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حافظ ابن القیم نے لکھا ہے کہ

عَمَلُ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ الَّذِيْ يُحْتَجُّ بِهٖ مَا كَانَ فِيْ زَمَنِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ [1]

زمانہ خلافت راشدہ میں اہل مدینہ کا عمل دین میں حجت ہے۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اہل مدینہ کا کسی مسئلہ پر جمع ہونا یقیناً تمام مسلمانوں کے نزدیک اس مسئلہ کو بھاری بنا دیتا ہے لیکن بحث اس میں ہے کہ جب صحابہ کرام بڑی کثرت کے ساتھ دوسرے شہروں میں جا بسے اس وقت بھی کسی مسئلہ کے متعلق مدینے والوں کا عمل حجت ہے یا نہیں۔ اس موضوع پر امام بخاری کی رائے پہلے بتائی جا چکی ہے کہ بقول حافظ ابن حجر امام بخاری کے نزدیک حرمین کے اتفاق سے ترجیح ہو سکتی ہے حافظ صاحب فرماتے ہیں:

وَفَضْلُ الْمَدِيْنَةِ ثَابِتٌ لَا يَحْتَاجُ اِلٰى اِقَامَةِ دَلِيْلٍ خَاصٍّ [2]

مدینہ کی بزرگی اور فضیلت کے ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

اگر مقصد صرف یہ ہے کہ مدینہ والوں کی علمی برتری دوسروں پر ثابت ہو تو اگر کسی خاص زمانے میں ان کی فوقیت مقصود ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانہ نبوت اور صحابہ کے اس دور میں جب کہ صحابہ مدینہ سے دوسرے شہروں میں نہ گئے تھے مدینے کو یہ شرف حاصل ہے اور اگر یہ مراد ہے کہ وہاں کے رہنے والوں کو ہر زمانے میں علمی لحاظ سے فوقیت حاصل ہے تو یہ بات محل تامل ہے اور اس قسم کے جذباتی نعروں کی تحقیق کے بازار میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔[3]

حافظ ابن القیم نے اس موضوع پر تفصیلی بحث فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

---

[1] زاد المعاد ج ۱ [2]، [3] فتح الباری ج ۳ ص ۲۶۳۔

جمہور کی رائے میں مدینہ اور دوسرے شہروں کے عمل میں کوئی فرق نہیں ہے اصل یہ ہے کہ جن کے پاس سنت ہے اس ہی مقام کا عمل بھی قابل اتباع ہے ورنہ اختلاف کے وقت ایک کا عمل دوسروں کے لیے حجت نہیں ہے حجت تو صرف اتباعِ سنت ہے سنت کو صرف اس لیے نہیں چھوڑا جائے گا کہ کسی شہر کا عمل اس کے خلاف ہے اگر اسے مان لیا جائے تو بہت سی سنتیں متروک ہو جائیں گی اور سنت کی معیاری حیثیت ختم ہو جائے گی کسی بھی شہر کو عظمت کا مقام حاصل نہیں ہے۔ دیواروں، مکانوں اور زمینوں کا کسی بات کے راجح قرار دینے میں کوئی دخل نہیں ہے۔ مؤثر تو شہروں کے مکین ہیں اور معلوم ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام ہی دوسروں پر علم و عمل میں مقدم ہیں جیسا کہ وہ فضیلت اور دین میں مقدم ہیں۔ اور صحابہ کا عمل ہی ناقابلِ مخالفت ہے اور صحابہ کرام کی اکثریت مدینہ سے رختِ سفر باندھ کر دوسرے شہروں میں چلی گئی بلکہ صحابہ کے اکثر علماء کوفہ، بصرہ اور شام چلے گئے مثلاً علی بن ابی طالب، ابی موسیٰ اشعری، عبد اللہ بن مسعود، عبادۃ بن الصامت، ابی الدرداء، عمرو بن العاص، معاویہ بن ابی سفیان اور معاذ بن جبل۔ بلکہ کوفہ، بصرہ میں تقریباً تین سو سے زائد صحابہ آ گئے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ اکابر جب تک مدینے میں رہے ان کا عمل حجت تھا اور جب یہی لوگ وہاں سے رخصت ہو گئے تو ان کا عمل حجت نہ رہا۔[1]

بہر حال زمانہ نبوت سے لے کر خلافت راشدہ تک مدینہ کو علم میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ حضرت علی مرتضیٰ کے زمانے میں دار الخلافہ کے کوفہ اور پھر دمشق منتقل ہو جانے پر گو اس کی وہ علمی شان باقی نہ رہی تھی تاہم امام مالک کے زمانے تک مدینے کی علمی رونق برقرار تھی۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

مدینہ طیبہ در زمان او بیشتر از زمان متاخر مرجع علماء و محط رجال علماء است[2]

حافظ ذہبی کے حوالے سے حافظ سخاوی نے لکھا ہے کہ:

---

[1] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۳۰۱۔ [2] مصفّٰی شرح مؤطا ج ۱ ص ۷۔

مدینہ دارالہجرۃ میں عہدِ صحابہ میں قرآن وسنّت کا علم بہت زیادہ تھا اور
زمانۂ تابعین میں فقہاءِ سبعہ جیسے حضرات موجود تھے اور صغار تابعین کے
دَور میں بھی قرآن وسنّت کا علم تھا۔ عبداللہ بن عمر، ابن ابی ذئب، ابن
عجلان، جعفر صادق، مالک، امام نافع قاری، ابراہیم بن سعد، سلیمان بن
بلال اور اسماعیل بن جعفر سب کے سب مدنی ہیں۔

اس کے بعد امام ذہبی فرماتے ہیں کہ:

پھر ان کے بعد وہاں علم بہت کم ہوگیا اور بعد ازیں تو بالکل ہی ناپید ہوگیا۔

مدینہ طیبہ میں علم کب ناپید ہوا، یہ بھی امام ذہبی کی زبانی سُن لیجئے:

خصوصًا اس وقت جبکہ روافض کی ایک جماعت نے مدینہ میں ڈیرا لگا
لیا اور مدینہ پر ان کی حکومت ہوگئی [1]

امام عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں:

اَلسُّنَّةُ الْمُتَقَدِّمَةُ مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ خَيْرٌ مِّنَ الْحَدِيْثِ [2]

مدینہ کی علمی وسعتوں کی اس سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ امام مالک فرماتے ہیں کہ امیرالمومنین
عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ میں قاضی ابوبکر بن حزم کو جمع سنن کے کام پر مامور کیا۔ اس وقت مدینہ میں
علمی شخصیتیں موجود تھیں جن کے بارے میں امیرالمومنین نے خصوصی ہدایات دی تھیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں لکھا ہے کہ امیرالمومنین نے لکھا تھا کہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن،
اور قاسم بن محمد کے پاس جو علم ہے اسے قلم بند کر کے روانہ کیا جاتے اور ابن سعد نے طبقات میں
لکھا ہے:

كَتَبَ عُمَرُ اِلٰى ابْنِ حَزْمٍ اَنْ يَّكْتُبَ لَهٗ اَحَادِيْثَ عَمْرَةَ

عمر نے ابوبکر بن حزم کو عمرہ کی احادیث قلم بند کرنے کے لیے لکھا۔

قاضی ابوبکر بن حزم مدینہ طیبہ میں اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ امام مالک فرماتے
ہیں کہ ہمارے یہاں قضا کے بارے میں جس قدر ان کو علم تھا اتنا کسی کو نہ تھا۔ بڑے عابد شب زندہ دار
تھے۔ صرف قاضی ابوبکر نہیں بلکہ ان کے علاوہ مدینے ہی کے دوسرے اکابر کو بھی عمر بن عبدالعزیز

---

[1] الاعلان بالتوبیخ ص ۱۳۶، [2] تزیین الممالک ص ۵۲۔

نے یہ کام کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں آ رہی ہے یہاں تو میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مدینے میں علمی دستوں کی وجہ سے عمر نے یہ حکم روانہ کیا تھا۔ بہرحال امام اعظم کے زمانہ طالبعلمی تک مدینہ کا علمی جلال ماند ہوا تھا اور امام اعظم کو فقہاء سبعہ کی علمی بہاروں سے متمتع ہونے کا موقعہ ملا ہے کیونکہ فقہاء سبعہ میں سے قاسم بن محمد کی وفات ۱۱۲ھ میں ہوئی اور امام اعظم نے حجوں کا سلسلہ ۹۶ھ سے شروع کیا ہے۔ واضح یہ ہے کہ امیرالمومنین عمر نے تدوینِ حدیث کے لیے یہ کلر ۱۰۰ھ میں جاری کیا تھا اور امام اعظم نے علمِ حدیث کے طالب علم کی حیثیت سے اسفار علمی کا آغاز ۱۰۲ھ میں کیا تھا۔

امام مالک کو مدینے کے علم پر اس قدر اعتماد تھا کہ ان کے نزدیک عمل اہلِ مدینہ مستقل حجت ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ مدینہ اسلامی آبادیوں کی روح اور شہروں کا دل تھا علماء یہاں آتے رہتے تھے اور اپنے علوم کو اہلِ مدینہ کے سامنے پیش کر کے استصواب کرتے تھے کیونکہ اب تک مدینہ کے علوم بیرونی معلومات کی آمیزش سے بالکل صاف تھے[۱]

سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اسناد و روایت میں اطمینان چاہتا ہے اسے مدینہ والوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

امام اعظم حج کے علمی سفروں میں مدینہ طیبہ تشریف لے جاتے تھے۔ آپ نے اگر پچپن حج کیے ہیں تو پچپن ہی بار مدینہ طیبہ تشریف لے گئے ہیں۔ اولاً اس لیے کہ چونکہ امام صاحب کے یہ سفر علمی ہوتے تھے اور مدینہ اپنی علمی بزرگی میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ ایوب بن زید سے حافظ سخاوی نے نقل کیا ہے کہ علم کو مدینے میں رسوخ حاصل ہوا ہے اور یہیں سے اس کا ظہور ہوا ہے[۲]

خوابگاہِ نبوت کی زیارت اور مسجدِ نبوی میں عبادت

مدینہ طیبہ میں خوابگاہِ نبوت کی زیارت اور مسجدِ نبوی میں نماز کو اسلام میں بہت بڑی اہمیت ہے۔ وفاء الوفاء میں ہے کہ

عمر بن عبدالعزیز صرف سلام کی خاطر دمشق سے مدینہ قاصد روانہ کرتے

---

[۱] مقدمہ مسویٰ ص ۳۳۔ [۲] الاعلان بالتوبیخ ص ۱۲۷۔

ہے علامہ السبکی فرماتے ہیں کہ یہ بات امیرالمومنین سے روایتی لحاظ سے درجہ شہرت کو پہنچی ہوتی ہے [1]

حضرت عبداللہ بن عمر سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی منقول ہے۔

مَنْ جَاءَنِیْ زَائِرًا لَا یَهُمُّهٗ اِلَّا زِیَارَتِیْ کَانَ حَقًّا عَلَیَّ اَنْ اَکُوْنَ لَهٗ شَفِیْعًا۔

جو شخص میری زیارت کو آیا اور میری زیارت اس کا مقصد ہو۔ مجھ پر حق ہے کہ میں اس کی شفاعت کروں۔

یہ حدیث طبرانی میں ہے۔ علامہ عراقی نے حافظ ابوالسکن کے حوالہ سے اس کی تصحیح فرمائی ہے [2]

حضرت عبداللہ بن عمر سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد آیا ہے۔

مَنْ زَارَ قَبْرِیْ وَجَبَتْ لَهٗ شَفَاعَتِیْ۔

جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی میری شفاعت کا وہ حقدار ہو گیا۔

علامہ شوکانی نے اس حدیث کی تصحیح حافظ عبدالحق، حافظ تقی الدین السبکی اور حافظ ابن السکن سے نقل کی ہے [3]

---

[1] وفاء الوفاء ص ۴۰۹۔ [2] شرح الاحیاء، العلامۃ العراقی ج ۴ ص ۴۱۶۔

[3] نیل الاوطار ج ۴ ص ۳۲۵۔ اس حدیث کے راویوں میں موسیٰ بن بلال العبدی کو دارقطنی نے مجہول قرار دیا ہے مگر حافظ سخاوی نے دارقطنی کی طرف نسبت کرکے یہ لکھا ہے کہ من روی عنه ثقتان فقد ارتفعت جهالته (فتح المغیث ص ۱۳۷) الرفع والتکمیل میں ہے کہ موسیٰ سے صرف دو ثقہ ہی نے روایت نہیں کی بلکہ ان سے ایک سے زیادہ ثقات نے روایت کی ہے حافظ تقی الدین السبکی نے یہاں ایک مفید بات لکھی ہے وہ بھی گوش گذار فرما لیجئے جہالت دو طرح کی ہوتی ہے جہالت عین، جہالت وصف۔ اگر مجہول کہنے سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ میں جہالت عین ہے تو یہ سر تا سر غلط ہے کیونکہ موسیٰ سے روایت کرنے والے احمد بن حنبل، محمد بن جابر المحاربی، محمد بن اسماعیل الاحمسی، ابوامیہ محمد بن ابراہیم، عبید بن محمد وراق، الفضل بن سہل اور جعفر بن محمد بزودی جیسے اکابر ثقہ ہیں۔ جہالت تو دو کی روایت سے پامال ہو جاتی ہے اور یہ تو یکدم دو نہیں سات ہیں۔ اور اگر جہالت سے جہالت وصف مراد ہے، تو یہ بھی بے بنیاد ہے کیونکہ احمد بن حنبل جیسا فنکار اور نا قد رجال جس سے روایت کرے اس کی شان کے کیا کہنے ہیں۔ (شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام) اس پر مبسوط بحث الرفع والتکمیل میں ہے۔

حافظ طلحہ بن محمد نے مسند ابی حنیفہ میں زیارت کا مسنون طریق بھی حضرت عبداللہ بن عمر سے بحوالہ امام اعظم روایت کیا ہے:

اَبُوحَنِیْفَۃَ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مِنَ السُّنَّۃِ اَنْ تَاْتِیَ قَبْرَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ قِبَلِ الْقِبْلَۃِ وَتَجْعَلَ ظَھْرَکَ اِلَی الْقِبْلَۃِ وَتَسْتَقْبِلَ الْقَبْرَ بِوَجْھِکَ ثُمَّ تَقُوْلُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔

زیارت کا مسنون طریق یہ ہے کہ تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر آؤ قبلہ کی جانب سے اور پشت قبلہ کی طرف کرکے چہرہ قبر کی طرف کرو اور یوں کہو اسلام علیک ... الخ

مشہور محدث ملا علی قاری لکھتے ہیں۔

اِعْلَمْ اَنَّ زِیَارَۃَ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ بِاِجْمَاعِ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ اَعْظَمِ الْقُرُبَاتِ وَاَفْضَلِ الطَّاعَاتِ وَاَنْجَحِ السَّاعِیْ لِنَیْلِ الدَّرَجَاتِ قَرِیْبَۃٌ مِنْ دَرَجَۃِ الْوَاجِبَاتِ لِمَنْ لَہٗ سَعَۃٌ وَتَرْکُہٗ غَفْلَۃٌ وَجَفْوَۃٌ کَبِیْرَۃٌ۔[1]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت مسلمانوں کے متفقہ فیصلہ کے مطابق بہت بڑی قربت بزرگترین طاعت حصول درجات کی بہترین کوشش ہے بشرطیکہ اس کی گنجائش ہو اسے چھوڑنا غفلت ہے۔

بہرحال امام اعظم حج کے موقعہ پر مدینہ طیبہ تشریف لے جاتے اور امام مالک سے بھی ملاقات آپ کی ہوتی چنانچہ انتصار السالک للامام الکبیر مالک میں ہے کہ جب امام اعظم سے مدینہ کی علمی حیثیت کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے اس بستی میں علم پھیلا اور بکھرا ہوا دیکھا ہے اگر اسے کوئی سمیٹے گا تو یہ سرخ و سپید رنگ کا لڑکا ہے یعنی امام مالک ہے۔[2]

---

[1] لباب المناسک ص ۴۴۴۔ [2] التعلیق علی الانتقاء فی فضائل الثلاثہ

اس بستی میں جس میں علم پھیلا ہوا ہے امام اعظم نے جن مشائخ حدیث کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے ان کی تفصیل تو از بس دشوار ہے لیکن میں یہاں بطور مُشتے از خروارے چند گرامی قدر ہستیوں کا تعارف ہدیہ ناظرین کرتا ہوں تاکہ اندازہ کرنے والے اندازہ کر سکیں ۔

الحافظ ابو عبداللہ نافع العدوی سنہ ۱۱۷ھ

آپ علم حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عائشہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ام سلمہ، حضرت رافع بن خدیج اور حضرت ابو لبابہ کے شاگرد ہیں اور آپ کے سامنے الثقات النبلاءُ اور الائمۃ الاجلۃ مثلاً امام اعظم، امام مالک، امام لیث بن سعد، قاضی ابو بکر بن حزم اور امام زہری نے زانوئے ادب طے کیا ہے[۱] حافظ عسقلانی نے آپ کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست دی ہے[۲] حضرت عبداللہ بن عمر کی پورے تیس سال خدمت کی ہے[۳] حضرت عبداللہ امام نافع کو اپنے لیے اللہ سبحانہٗ کا انعام فرماتے تھے[۴] ان کی علم میں جلالت قدر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کو بھی امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانۂ حکومت میں سنن کی تعلیم کے لیے سرکاری طور پر مصر روانہ کیا تھا[۵] سید الحفاظ امام یحییٰ بن معین سے جب دریافت کیا گیا کہ آپ کے نزدیک نافع عن ابن عمر اور سالم عن ابن عمر میں کون سا طریق دلربا ہے ؟ تو آپ نے دونوں میں سے کسی ایک کو بھی راجح نہ بتایا[۶] حافظ ابن الصلاح اور حاکم کے حوالہ سے حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے امام بخاری کے متعلق تو تنقیح الانظار میں حتمًا یہ دعویٰ کیا ہے کہ امام بخاری کی رائے ہے کہ جس قدر اسانید موجود ہیں ان میں سب سے زیادہ صحیح صرف وہ سلسلہ سند ہے جو بحوالہ امام مالک از نافع از عبداللہ بن عمر آتا ہے بلکہ علامہ محمد بن اسماعیل الیمانی نے توضیح الافکار میں حافظ ابن الصلاح کی بیان فرمودہ قید اصح الاسانید کلہا سے یہ بات پیدا کر لی ہے کہ " کل سند فی الدنیا " یعنی دُنیا میں جس قدر روایتی اور تاریخی سلاسل موجود ہیں ان میں سب سے زیادہ معتبر نافع از ابن عمر ہے ۔ حافظ ذہبی نے یونس بن یزید کی زبانی نقل کیا ہے کہ امام نافع کو امام زہری سے یہ شکایت تھی کہ زہری بھی

---

[۱] اسعاف المبطا ص ۷۰۔ [۲] تہذیب ج ۱۱ ص ۴۱۲۔ [۳] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۴۔ [۴] تہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۴۔ [۵] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۴ و [۶] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۴ ۔

عجیب شخص ہیں میرے پاس آتے ہیں اور بحوالہ ابن عمر مجھ سے احادیث سنتے ہیں اور یہاں سے سالم ابن عمر کے پاس جاتے ہیں اور ان سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا آپ نے اپنے والد سے یہ بات سنی ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہاں۔ ان سے تصدیق کے بعد میری بیان کردہ حدیثوں کو ان کے نام سے پیش کرتے ہیں اور مجھے درمیان سے حذف کر دیتے ہیں[۱]۔ امام خلیلی فرماتے ہیں نافع ائمہ تابعین میں ہیں علم میں ان کی امامت پر اتفاق ہے[۲]

ائمہ ستہ کے علاوہ امام مالک نے موطا میں امام محمد نے کتاب الآثار میں اور قاضی ابو یوسف نے ان سے روایات کی تخریج کی ہے۔

عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ یَقْتُلُ الْمُحْرِمُ الْفَارَۃَ وَالْعَقْرَبَ وَالْحُدَاۃَ وَالْکَلْبَ الْعَقُوْرَ وَالْحَیَّاتِ اِلَّا الْجَانَّ[۳]

ابن عمر کہتے ہیں کہ احرام والا چوہے، بچھو، چیل، ہڑکے کتے اور سانپوں کو علاوہ سٹک کے مار سکتا ہے۔

امام محمد نے کتاب الآثار میں یہ روایت درج کرکے لکھا ہے کہ وبہ ناخذ وھو قول ابی حنیفۃ اور موطا میں بھی امام موصوف نے یہ روایت بحوالہ مالک عن نافع ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ خَمْسٌ مِنَ الدَّوَابِّ لَیْسَ عَلَی الْمُحْرِمِ فِیْ قَتْلِھِنَّ جُنَاحٌ اَلْغُرَابُ وَالْفَارَۃُ وَالْعَقْرَبُ وَالْحُدَاۃُ وَالْکَلْبُ الْعَقُوْرُ۔[۴]

یہی روایت بالکل ان ہی الفاظ کے ساتھ بروایت یحییٰ موطا امام مالک میں بھی موجود ہے، اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں اسی روایت کا بحوالہ مالک عن نافع صرف اس قدر حصہ پیش فرمایا ہے۔

خمس من الدواب لیس علی المحرم فی قتلھن جناح

اور بحوالہ یونس بن شہاب از سالم پوری روایت نقل کی ہے اور پھر اسی کی تائید میں

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۹۴۔ [۲] تہذیب التہذیب ج ۱۰۔ [۳] کتاب الآثار ص ۸۲
[۴] موطا امام محمد ص ۲۱۰۔

امام ابوبکر محمد بن شہاب الزہری از عائشہ سے بھی یہی حدیث اس طرح نقل کی ہے ۔

خمس من الدواب کلھن فاسق یقتلن فی الحرم

روایت میں راویوں کا تعبیری اختلاف

یہاں عموماً یہ خلش محسوس کی جاتی ہے کہ جن الفاظ میں محدثین کی معروف کتابوں میں روایات ہوتی ہیں امام اعظم کی روایات میں وہ الفاظ نہیں ہوتے ۔ لوگ تعبیر کے اس اختلاف کو دیکھتے ہیں تو رک جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ بات نبوت کی ہے اور تعبیری جامہ بیان کرنے والوں کا اپنا اپنا ہے امام محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ :

میں دس شخصوں سے حدیث سنتا تھا بات ایک ہوتی تھی مگر الفاظ مختلف ہوتے تھے المعنی واحد واللفظ مختلف [1]

حافظ ذہبی نے سفیان ثوری جیسے امام المحدثین کا قول نقل کیا ہے کہ

ہم اس کا ارادہ کریں کہ جس طرح ہم نے حدیث سنی ہے بعینہٖ وہ ہی تم کو سنادیں تو شاید ہم ایک حدیث بھی بیان نہ کرسکیں [2]

اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سفیان ثوری کی حدیث میں روایت لفظی نہیں ہے بلکہ معنی شیخ کے ہیں اور الفاظ ان کے ۔ ابوحاتم جیسا امام تصریح کرتا ہے میں نے کسی محدث کو نہیں دیکھا کہ وہ حدیث کو ایک لفظ میں ادا کرتا ہو بجز قبیصہ کے ۔ حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں ۔

وَذَالِکَ نَادِرٌ جِدًّا وَّ اِنَّمَا یُوْجَدُ فِی الْاَحَادِیْثِ الْقِصَارِ عَلٰی قِلَّتِہٖ اَیْضًا فَاِنَّ غَالِبَ الْاَحَادِیْثِ رُوِیَ بِالْمَعْنٰی [3]

روایت باللفظ سے بالکل نادر ہے چھوٹی چھوٹی حدیثوں میں بھی بہت کم ہے احادیث کا زیادہ حصہ روایت بالمعنی پر مشتمل ہے ۔

شاید اسی بنا پر حکیم الامت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں یہ فرما گئے :

کَانَ اِھْتِمَامُ جُمْھُوْرِ الرُّوَاۃِ عِنْدَ الرِّوَایَۃِ بِالْمَعْنٰی بِرُؤُسِ الْمَعَانِیْ دُوْنَ الْاِعْتِبَارَاتِ الَّتِیْ یَعْرِفُھَا الْمُتَعَمِّقُوْنَ [4]

---

[1] الکفایہ فی علم الروایہ ص ۲۰۶ ، [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۹۲ ، [3] توجیہ النظر ص ۲۲۴ ، [4] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۵۶

عام راوی روایت بالمعنے کے وقت میں صرف معانی کا اہتمام کرتے تھے۔

ان جزئیات کو پیش نظر نہ رکھتے جن کو تعمق پسند ملحوظ رکھتے ہیں۔

اور اسی لیے روایات سے استدلال کرتے وقت صرف مدلول کلام پر نظر ہوتی ہے اسلوب کلام سے کوئی استدلال نہیں ہو سکتا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

فَاسْتِدْلَالُهُمْ بِنَحْوِ الْفَاءِ وَالْوَاوِ وَتَقْدِيمِ حَرْفٍ وَتَاخِيرِهَا وَنَحْوِ ذَالِكَ مِنَ التَّعَمُّقِ [1]

اس لیے حدیث میں فا، واو حرف کی تقدیم و تاخیر اور اس قسم کی چیزوں سے استدلال کرنا سرتاسر تعمق ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ محدثین جب روایت بالمعنے کو جائز سمجھتے ہیں بلکہ بقول حافظ سیوطی احادیث کا زیادہ ذخیرہ روایت بالمعنی ہی کی حیثیت رکھتا ہے تو ایسی صورت میں الفاظ کے اختلاف سے بدک کر کسی حدیث کا انکار کرنا فن حدیث کی کوئی خدمت نہیں ہے بلکہ میں یہاں تک کہتا ہوں کہ محدثین کے یہاں جن روایات کو مرفوع کہا جاتا ہے وہ سب فقہاء کے یہاں سنن اور فتاویٰ کی شکل میں موجود تھیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے یہ بات لکھ کر سمجھنے والوں کے لیے کچھ اس طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ:

اَصْلُ مَذْهَبِهٖ فَتَاوٰى عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ وَقَضَايَا عَلِيٍّ وَفَتَاوَاهُ وَقَضَايَا شُرَيْحٍ [2]

ابوحنیفہ کے مذہب کی اساس عبداللہ کے فتاویٰ اور حضرت علی کے فیصلے ہیں۔

احادیث فقہ اور روایات حدیث

اسی بنا پر محمد بن سماعہ کا کہنا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے ستر ہزار سے زیادہ حدیثیں بیان کی ہیں[3]۔ یعنی فقہ کے وہ سارے مسائل جو امام صاحب کے شاگردوں نے اپنی کتابوں میں درج کیے ہیں ان سب کا مقام فتاویٰ صحابہ ہونے کی وجہ سے روایات حدیث کا ہے اور ان کا نام احادیث فقہ ہے۔ شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفاء میں جس دفتر کا پتہ دیا ہے کہ اس میں فاروق اعظم، علی بن ابی طالب

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۵۶، [2] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۰، [3] مقدمہ ص ۷۰

ابن مسعود کی مرویات صحیحہ مدون ہیں وہ فقہ کے سوا اور کون سا ہے بلکہ قرۃ العینین میں شاہ صاحب نے جو یہ بات لکھ دی ہے کہ:

> قرآن حکیم کے بعد اصل دین اور سرمایۂ یقین علم حدیث ہے جیسا کہ خود قرآن میں ہے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ اور علم حدیث جو کچھ بھی اُمت کے پاس موجود ہے یہ ابوبکر و عمر کی محنتوں کا نتیجہ ہے کیونکہ جن جن بزرگوں نے ان دونوں سے حدیثیں روایت کی ہیں اور ان کے نام سے روایات بیان کی ہیں وہ صرف اسی قدر نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مکثرین کی بیشتر احادیث مرفوعہ ابوبکر و عمر کی حدیثیں ہیں۔ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس اور ابوہریرہ نے ان کی بیان کردہ روایات کو مرفوعاً پیش کیا ہے اور اہل مسانید نے ظاہر حال کے پیش نظر ان بزرگوں کے مسانید میں جمع کردی ہیں۔ یہ بات فن حدیث کے ماہر سے پوشیدہ نہیں ہے [1]

تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ احادیث دراصل ان بزرگوں کے فتاوی ہیں احادیث اور روایات حدیث کے فرق پر یہاں بحث کرنا مقصود نہیں ہے صرف یہ بتانا ہے کہ اگر روایات فقہ اپنے مصنفین سے متواتر ہیں جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ میں لکھا ہے [2] تو پھر

---

[1] قرۃ العینین ص ۵۵۔ [2] منہاج السنۃ میں ہے قد نقل ذالک سائر اصحابہ وھم خلق کثیر يعلمون مذھبه بالتواتر (ج ۲ ص ۵۰) امام اعظم سے مسائل فقہ بتواتر منقول ہیں۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے شیخ الاسلام ملک العلماء عزالدین بن عبدالسلام سے ایک سوال کا جواب کتب فقہ کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ کتب فقہ پر اعتماد کرنا علماء میں متفق ہے اور اس بارے میں کبھی دو رائیں نہیں ہوتی ہیں کہ روایات فقہ بالکل صحیح ہیں۔ (تدریب الراوی ص ۵۸) استاد ابواسحاق اسفرائنی فرماتے ہیں کہ معتمد کتابوں سے نقل کرنا درست اور اس پر اجماع ہے اور اس کے لیے ان کے مصنفین تک اتصال سند شرط نہیں ہے خواہ یہ کتابیں حدیث کی ہوں یا فقہ کی (تدریب ص ۵۸) اسی بنا پر علماء کے مراسیل کو سب سے زیادہ قوی اور معتبر بتایا ہے حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں علم ان اقوی المراسیل ما ارسله العلماء من اهل هذا الكتب اور یہ بھی لکھا ہے اجمعت الامة على تواتر اسناد ما فی الکتب الصحیحة الی اهلها بعد سماعها اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس معاملہ میں حدیث اور دوسری

(باقی ص ۲۵۰ پر)

احادیثِ فقہ قوت و ثاقت میں بہت زیادہ قوی اور قابلِ اطمینان ہیں کیونکہ فقہ کے نام پر جو کچھ ہے وہ امام اعظم کا خود ساختہ نہیں بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے جو کچھ علقمہ نے سنا اور علقمہ سے جو کچھ ابراہیم نخعی نے سنا اور ابراہیم سے جو کچھ حماد نے اور حماد سے جو کچھ امام اعظم نے سنا اسی کا نام فقہ ہے۔

بہرحال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ راویوں کی اصل نظر روایت میں مدلول کلام پر ہوتی ہے۔ اسی لیے کتاب الآثار میں جو بات حضرت ابن عمر کی جانب سے بصورت فتویٰ تھی وہ ہی چیز کتب روایت میں حدیث مرفوع بن کر آئی ہے اور بس ورنہ بات ایک ہے۔ خیر یہ تو درمیان میں ایک جملہ معترضہ تھا یہ اس کتاب کا موضوع نہیں اللہ نے توفیق دی اور انفاس حیات باقی ہے تو انشاءاللہ اس کی تفصیلات امام اعظم اور علم الفقہ میں آئیں گی۔

الحافظ ابوبکر محمد بن مسلم ابن شہاب الزہری ۱۲۴ھ

یہ بھی صحابہ کرام اور کبار تابعین کے شاگرد ہیں اور بڑے بڑے ائمہ حدیث مثلاً امام اوزاعی، امام لیث، امام مالک وغیرہ ان کے شاگرد ہیں۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے اسعاف المبطا میں، حافظ جمال الدین ابوالحجاج المزی نے تہذیب الکمال میں اور حافظ ذہبی نے مناقب میں تصریح کی ہے کہ یہ امام اعظم کے اُستاد ہیں۔ حافظ عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں ان کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے ان کا تعارف ان لفظوں میں پیش کیا ہے:

احد الاعلام من ائمۃ الاسلام تابعی جلیل۔[1]

صفحہ ۲۵۷ کا بقیہ حاشیہ:-) کتابوں میں کوئی فرق نہیں ہے لا فرق فیما ذکرہ من علم الحدیث وبین سائر علوم الاسلام ومصنفات العلماء الاعلام (الروض الباسم ص ۱۷،۱۶) اس لیے جیسے آج ائمہ حدیث کی کتابوں کو بے اصل بتانا جہل اور حمق ہے ایسے ہی فقہ کی کتابوں کو غیر معتبر کہنا علم کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ امام محمد کی چھ کتابوں جامع صغیر، جامع کبیر، زیادات، مبسوط، السیر الصغیر، السیر الکبیر اور قاضی ابویوسف کی کتابوں الرد علی سیر الاوزاعی، اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلیٰ، الامالی اور کتاب الخراج میں یہی مسائل ہیں بلکہ اس سے بھی ترقی کر کے کہتا ہوں کہ حضرت عبداللہ بن المبارک اور امام وکیع کی تصانیف میں بھی یہی مسائل ہیں اور امام سفیان ثوری کی جامع کا بھی یہی ماخذ ہے حافظ ابن عبدالبر نے الانتقاء میں لکھا ہے کہ قاضی ابویوسف فرماتے ہیں سفیان الثوری اکثر متابعۃ لابی حنیفۃ منی (ص ۱۲۸)

[1] البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۳۴۰

اور امام ذہبی فرماتے ہیں :

اعلم الحفاظ المدنی الامام[1]

قوت حافظہ اللہ پاک کی جانب سے بے پایاں ارزانی ہوئی تھی۔ صرف اسی روز میں قرآن عزیز نوک زبان کر لیا تھا۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ :

اُموی خاندان کے مشہور سربراہ ہشام بن عبدالملک نے امام زہری سے درخواست کی کہ میرے لڑکوں کے لیے کچھ حدیثیں قلم بند کر دیجئے۔ امام زہری نے منشی کو چار سو حدیثیں املا کرائیں باہر تشریف لائے، اور محدثین کو ان کا درس دیا۔ کچھ روز کے بعد ہشام نے امام زہری سے کہا کہ وہ آپ کی چار سو حدیثوں والی دستاویز تو ضائع ہو گئی ہے فرمایا کوئی مضائقہ نہیں ہے پھر وہی تمام حدیثیں منشی کو بلا کر املا کرائیں۔ ہشام پہلی کتاب نکال کر لایا اور دونوں کا مقابلہ کیا۔ واقعہ نگار کہتا ہے کہ فاذا ھو لم یغادر حرفاً ایک حرف کا بھی دونوں میں فرق نہ تھا[2]

ان کی علمی جلالت قدر کا یہ حال تھا کہ امیرالمومنین عمر بن عبدالعزیز فرماتے تھے کہ امام زہری سے استفادہ کرو اور وجہ یہ بتلاتے تھے کہ امام زہری سے زیادہ سنت کا عالم کوئی نہیں رہا۔ سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ محدثین تین ہیں۔ زہری، یحییٰ بن سعید انصاری اور ابن جریج۔

سب سے صحیح سند

فن روایت و اسناد میں سب سے معتبر، سب سے مستند اور سب سے زیادہ صحیح اسناد کے متعلق آپ امام بخاری کی رائے سن چکے ہیں۔ لیجئے دوسرے علماء کے خیالات بھی سن لیجئے۔ امام عبدالرزاق جو امام بخاری کے استاذ الاساتذہ ہیں فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ صحیح طریق الزہری عن علی بن الحسین عن الحسین عن علی ہے۔ مشہور محدث محمد بن سلیمان نے امام اسحاق بن ابراہیم کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اصح الاسانید الزہری عن سالم عن ابن عمر ہے۔ امام یحییٰ بن معین کہتے ہیں عن عبدالرحمٰن عن القاسم عن عائشہ کو سب سے زیادہ پائیدار اور معیاری سند کہتے ہیں۔ فضیل بن عیاض منصور عن ابراہیم

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۲۔ [2] البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۳۴۰

عن علقمہ عن عبداللہ بن مسعود مقرر کرتے ہیں اور امام بخاری کے مشہور استاذ عبداللہ بن المبارک سفیان عن منصور عن ابراہیم عن علقمہ عن عبداللہ کی سند کو اتنی پائیدار اور صحیح قرار دیتے ہیں کہ اس طریق سے روایت کا آنا گویا ذات نبوت سے سننے کے مترادف ہے۔ اور بھی علماء کے اس موضوع پر خیالات ہیں[1]

ایک لطیف نکتہ

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز نے تدوین سنن کے کام پر زہری کو بھی مقرر کیا تھا اس کی وجہ خود امام زہری کے بیان سے معلوم ہوتی ہے جو حافظ ذہبی نے ان کے حوالے سے لکھا ہے کہ مجھے قاسم بن محمد نے کہا کہ میں تم کو علم کا حریص دیکھتا ہوں کیا میں تم کو علم کا مرکز نہ بتا دوں زہری نے فرمایا کہ ہاں۔ فرمایا کہ پھر عمرہ بنت عبدالرحمٰن کے پاس جاؤ کیونکہ یہ حضرت عائشہ کی آغوش میں پرورش پائی ہیں۔ امام زہری کہتے ہیں کہ میں ان سے ملا ہوں میں نے ان کو علم کا دریا ناپید اکنار پایا ہے[2]

عمرہ بنت عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد یہ دونوں حضرت عائشہ کے شاگردوں میں سے تھے۔

قاسم بن محمد کی شانِ علمی

قاسم بن محمد تو حضرت عائشہ کے برادرزادے اور فقہاء سبعہ میں سے ہیں۔ امام بخاری نے ان کے متعلق تصریح کی ہے :

قتل ابوہ فربی یتیماً فی حجر عائشۃ فتفقہ بھا۔[3]

ان کے والد قتل ہو گئے۔ انہوں نے یتیمی کا عرصہ حضرت عائشہ کی آغوش میں گزارا اور ان سے علم حاصل کیا۔

قاسم بن محمد مدینہ طیبہ میں اپنے وقت کے بہترین عالم شمار کیے جاتے ہیں، امام یحییٰ بن سعید انصاری نے اپنا اور اس دور کے دوسرے علماء کا ان کے بارے میں یہ تاثر بتایا ہے کہ :

ہم نے اپنے زمانے میں مدینہ میں علم و فضل میں قاسم سے بڑھ کر

---

[1] الکفایہ فی علوم الروایہ ص ۳۹۷، [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۶، [3] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۲۴

کوئی نہیں دیکھا۔[1]

مشہور فقیہ حضرت ابوالزناد ان کے متعلق فرماتے تھے :

میں نے کسی نوجوان کو فقہ و سنت کا اتنا بڑا عالم اور ذہنی طور پر پختہ تر نہیں پایا جتنا قاسم بن محمد کو۔[2]

خالد بن نزار اور ابن عیینہ کا متفقہ بیان ہے کہ :

دُنیا میں حدیثِ عائشہ کے سب سے بڑے عالم تین ہیں۔ قاسم، عروہ، اور عمرہ۔[3]

امام ابن عون بصرہ کے مشہور امام اور حفاظ میں سے ہیں اور جن کو حضرت قاسم سے شرف تلمذ حاصل ہے اور جن کے بارے میں عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں پورے عراق میں ابن عون سے زیادہ دانائے سنت کوئی نہ تھا (تذکرۃ الحفاظ) وہ اپنے استاد کے بارے میں فرماتے ہیں :

تین آدمی ایسے ہیں کہ مجھے ان جیسا کوئی نہیں ملا۔ میں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ انہوں نے اکٹھے ہو کر علم و فضل کو سمیٹا ہے عراق میں ابن سیرین، حجاز میں قاسم بن محمد اور شام میں رجاء بن حیوہ۔[4]

حافظ ابونعیم اصفہانی نے حلیۃ الاولیاء میں تنادا قرانہ علیہ بالعلم کا عنوان قائم کر کے ان کی علمی حیثیت کے بارے میں ان کے معاصرین کے جو اقوال نقل کیے ہیں ان کو دیکھ کر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔

علوم میں قاسم بن محمد کو صرف فضل و کمال ہی حاصل نہ تھا بلکہ اللہ سبحانہ نے ان کو خاص مجتہدانہ شان سے بھی نوازا تھا۔ الذہبی نے ابن عیینہ کی طرف نسبت کر کے ان کے متعلق جو بات لکھی ہے کہ کان القاسم اعلم اھل زمانہ تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ اپنے دور کی بے مثال علمی شخصیت تھے ان کی علمیت کا اندازہ خود ان کے اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ :

زمانہ ابوبکر و عمر ہی سے عائشہ مسند افتاء پر فائز تھیں میں ان کے پاس ہی رہا۔ عبداللہ بن عباس سے میں نے استفادہ کیا

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۱ - [2] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۳۴

[3] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۵۵ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۷ -

ابن عمر اور ابوہریرہ کے علوم سے بہت زیادہ بہرہ یاب ہوا ہوں[1]
الغرض ان کی علمی جلالت اور شانِ امامت پر سب یک زبان ہیں۔

عمرہ بنت عبدالرحمٰن کا علمی مقام

عمرہ بنت عبدالرحمٰن قاضی ابوبکر بن حزم کی والدہ کبشہ کی بہن تھیں اس لیے قاضی صاحب کی خالہ ہوتی ہیں یہ بھی فقاہت میں بہت بڑی شانِ جلالت کی مالک تھیں۔ امیرالمومنین عمر بن عبدالعزیز کا ان کے بارے میں تاثر یہ تھا کہ مَا بَقِیَ اَحَدٌ اَعْلَمُ بِحَدِیْثِ عَائِشَۃَ مِنْ عَمْرَۃَ "حضرت عائشہ کی حدیثوں کو عمرہ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں"[2] قاسم بن محمد نے امام زہری کو عمرہ سے استفادے کا مشورہ دیا تھا امام زہری کا ان سے ملاقات کے بعد ان کے بارے میں تاثر یہ تھا۔

فَوَجَدْتُھَا بَحْرًا لَا یَنْزِفُ[3]

میں نے ان کو بحرِ بیکراں پایا ہے۔

چونکہ امام زہری کے پاس قاسم اور عروہ دونوں کا علم تھا اور حدیثِ عائشہ کا ان دونوں سے بڑھ کر عالم کوئی نہ تھا اس لیے عمر بن عبدالعزیز نے امام زہری کو بھی قاضی ابوبکر کے ساتھ تدوینِ سنن کا حکم دیا تھا۔

امام زہری صرف احادیث مرفوعہ ہی نہیں بلکہ آثارِ صحابہ بھی قلم بند فرماتے تھے۔ چنانچہ معمر کہتے ہیں کہ مجھے صالح بن کیسان نے بتایا ہے کہ میں اور امام زہری طلب علم میں دونوں ہمسفر تھے۔ ہم دونوں مرفوع حدیثیں لکھتے تھے مجھ سے امام زہری نے کہا کہ آثارِ صحابہ بھی لکھیں کیونکہ وہ بھی سنت ہیں میں نے کہا کہ نہیں لیکن امام زہری نے آثارِ صحابہ بھی لکھے اور میں نے نہیں لکھے[4] امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ :

ان کی مرویات ۲۲۰۰ ہیں جو کچھ سنتے تھے قلم بند کرتے جاتے تھے[5]

ارشاداتِ نبوت پر ان کا لکھا ہوا قلمی سرمایہ کس قدر تھا اس کا اندازہ امام معمر کے اس بیان سے ہو سکتا ہے جو حافظ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں بحوالہ امام عبدالرزاق نقل کیا ہے کہ

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۵۵۔ [2]، [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۱۶
[4] البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۳۴۴۔ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۳۔

ولید بن یزید کے قتل ہونے کے بعد امام زہری کا علمی سرمایہ جانوروں پر لاد کر سرکاری کتب خانہ سے نکالا گیا۔ علمی توجہ اور طلب علم میں ذوق و لگن اور شوق کا حال یہ تھا کہ امام لیث بن سعد[1] کہتے ہیں۔

ایک بار کھانے میں امام زہری کے سامنے پلیٹ رکھی گئی کھانے کے لیے
ہاتھ بڑھایا۔ اس اثنا میں کوئی حدیث یاد آگئی اس قدر محو ہوئے کہ آپ
کا ہاتھ پلیٹ میں رہا اور صبح ہو گئی[2]

ان کا بھی قلمی سرمایہ ان کے شاگردوں کی وساطت سے آج ذخیرہ حدیث کی زینت ہے گویا یہ علم حدیث کا زمانہ تابعین یعنی پہلی صدی کے آخر میں کتابی ذخیرہ ہے۔

قاضی ابویوسف نے کتاب الآثار میں حافظ طلحہ بن محمد اور حافظ موسیٰ بن زکریا نے اپنی مسند میں ان سے روایات لی ہیں۔

عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ عَنِ الزُّهْرِیْ عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ

---

[1] امام لیث بن سعد کو اکثر اہل علم نے علماء احناف میں شمار کیا ہے چنانچہ قاضی ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں اور شیخ الاسلام زکریا انصاری نے شرح بخاری میں ان کے حنفی ہونے کی تصریح کی ہے امام لیث امام اعظم کے شاگرد ہیں۔ ان کا معمول تھا کہ اکثر حج کے موقعہ پر امام اعظم کی خدمت میں استفادے کی غرض سے حاضر ہوتے اور فقہ کی تحصیل کرتے چنانچہ اسی سلسلے کا ایک واقعہ امام ابو محمد حارثی نے فقیہ مصر عبدالرحمٰن بن القاسم کی زبانی نقل کیا ہے کہ میں نے لیث بن سعد سے سنا فرماتے تھے کہ مجھے اطلاع ملی کہ امام اعظم کا حج کا ارادہ ہے میں بھی امام صاحب سے استفادے کے خیال سے حج کے لیے چل پڑا۔ آخر مکہ مکرمہ میں میری ان سے ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے مختلف ابواب کے بہت سے مسائل دریافت کیے مفتی حجاز علامہ ابن حجر مکی نے الخیرات الحسان میں امام اعظم کے فضائل میں لکھا ہے کہ مشائخ ائمہ مجتہدین اور علماء راسخین میں سے بڑے بڑے لوگوں نے امام اعظم کے سامنے زانوے ادب تہ کیا ہے جیسے امام عبداللہ بن المبارک جن کی جلالت شان پر اتفاق ہے اور امام لیث بن سعد اور امام مالک بن انس، امام اعظم کی جلالت قدر کو سمجھنے کے لیے یہی ائمہ کافی ہیں۔ امام لیث نے امام اعظم کی بعض حدیثوں کو امام ابویوسف کے حوالے سے روایت کیا ہے چنانچہ امام طحاوی نے مشہور حدیث من کان له، امام فقراءة الامام له قراءة کو شرح معانی الآثار میں اسی طریق سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو امام حاکم نے معرفتہ علوم الحدیث میں بھی ذکر کیا ہے اس سند کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں چار ائمہ مجتہدین جمع ہیں۔ عبداللہ بن وہب، لیث بن سعد، ابویوسف اور ابوحنیفہ۔ [2] البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۳۴۴۔

وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الْمُتْعَةِ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ سے منع فرمایا ہے۔

ایک دوسری حدیث ہے:

عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَةَ عَنِ الزُّهْرِیِّ عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ[1]

جو شخص مجھ سے جھوٹ بولتا ہے جان کر اسے اپنا ٹھکانا دوزخ بنا لینا چاہیے۔

یہ روایت امام اعظم نے یحییٰ بن سعید کے حوالہ سے بھی روایت کی ہے۔ اس حدیث کو عشرہ مبشرہ اور ستر صحابہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ شیخین، امام احمد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے بحوالہ حضرت انس، امام احمد، امام بخاری، امام ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے بحوالہ زبیر، امام ترمذی نے بحوالہ حضرت علی مرتضیٰ اور دوسرے محدثین نے مختلف صحابہ سے یہ روایت کی ہے حتیٰ کہ امام نووی نے اس کے تواتر کا دعویٰ نقل کیا ہے[2]

ان کے علاوہ مدینے کے باقی شیوخ جن کے سامنے امام اعظم نے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے یہ ہیں۔ ابوعبداللہ محمد بن المنکدر سنہ ۱۳۰ھ، الحافظ یحییٰ بن سعید الانصاری سنہ ۱۴۳ھ، ہشام بن عروہ سنہ ۱۴۶ھ، واصل بن داؤد، ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص، موسیٰ بن طلحہ بن عبیداللہ سنہ ۱۰۳ھ، ابوعبداللہ عکرمہ مولیٰ ابن عباس سنہ ۱۰۷ھ، عبداللہ بن دینار، عطا بن یسار، عبدالرحمٰن بن ہرمز سنہ ۱۱۷ھ، عطا بن السائب سنہ ۱۳۶ھ، عدی بن ثابت، عبداللہ بن علی بن الحسین، سالم بن عبداللہ سنہ ۱۰۶ھ،

امام اعظمؒ نے امام مالکؒ سے روایت لی ہے

مدینہ طیبہ کے مشائخ میں بعض علماء نے امام مالک کے شاگردوں میں حضرت امام اعظم کو بھی شمار کیا ہے اور بتایا ہے کہ امام ابوحنیفہ بھی امام مالک کے تلامذہ میں سے ہیں۔ اس موضوع پر تزیین الممالک میں حافظ سیوطی کو بہت زیادہ اصرار معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں انہوں نے کچھ شہادتیں بھی فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ،

امام مالک کے اُستاد ہونے کا ذکر دارقطنی نے کتاب المدبج میں،

---

[1] جامع المسانید، [2] فتح الباری ج ۱ ص ۱۶۴۔

ابن خسرو بلخی نے مسند ابی حنیفہ میں اور خطیب بغدادی نے کتاب الروایت
میں کیا ہے [1]

دراصل حافظ سیوطی نے دارقطنی اور خطیب بغدادی کی جن دو روایتوں کا حوالہ دیا ہے - یہ دونوں خود روایتی نقطۂ نظر سے محدثین کے نزدیک محل نظر ہیں۔ دونوں روایتیں یہ ہیں:۔

عن محمد بن مخزوم عن جده محمد بن ضحاك ثنا عمران بن عبدالرحيم
ثنا بكار بن الحسن ثنا حماد بن ابی حنيفة عن ابی حنيفة عن
مالك بن انس عن عبدالله بن الفضل عن نافع بن جبير عن
ابن عباس عن النبی صلی الله عليه وسلم قال الايم احق
بنفسها من وليها والبكر تستامر وصمتها اقرارها۔

اخرجه ابن الشاهين والدارقطنی۔ رانڈ عورت اپنی زیادہ حقدار ہے اپنے
ولی کی نسبت اور نوجوان سے دریافت کیا جائے اس کی خاموشی اقرار ہے۔

خطیب کی روایت یہ ہے:

عن محمد بن علی الصلی الواسطی ثنا ابوزرعة احمد بن الحسين
ثنا علی بن محمد بن مهرويه ثنا المجبر بن الصلت ثنا القاسم
بن الحكم العرنی ثنا ابوحنيفة عن مالك عن نافع عن
ابن عمر قال اتی كعب بن مالك النبی صلی الله عليه وسلم
فساله عن راعيته كانت ترعی فی غنمه فتخوفت علی شاة
الموت فذبحتها بحجر فامر النبی باكلها۔

اقوم المسالک میں ہے کہ تمام دفتر حدیث میں ان مذکورہ بالا دو روایتوں کے علاوہ کوئی حدیث نہیں ہے جس سے امام اعظم کا امام مالک سے تلمذ ثابت ہو لیکن ان دونوں کی تاریخی حیثیت محدثین کے یہاں ثابت نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان دونوں روایتوں کی روایتی حیثیت کو محل کلام قرار دیتے ہوئے النکت علی ابن الصلاح میں یہ فیصلہ دیا ہے کہ:

لَمْ تَثْبُتْ رِوَايَةُ اَبِیْ حَنِیْفَةَ عَنْ مَالِكٍ وَ اِنَّمَا

---

[1] تزیین الممالک ص ۵

اَدْرَدَهَا الدَّارَقُطْنِیُّ ثُمَّ الْخَطِیْبُ لِرِوَایَتَیْنِ وَقَعَتَا لَهُمَا
بِاَسْنَادَیْنِ فِیْهِمَا مَقَالٌ۔

امام اعظم کی امام مالک سے روایت ثابت نہیں ہے۔ دارقطنی اور
خطیب نے اس بات کا دعویٰ ان دو روایتوں کی وجہ سے کیا ہے جن
کی اسناد محل کلام ہے[1]

حافظ صاحب نے ان روایات کی جس اسنادی کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ دارقطنی کی روایت میں عمران بن عبدالرحیم راوی ہے۔ یہی شخص اس من گھڑت کہانی کا ذمہ دار ہے۔ حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں حافظ سلیمانی کے حوالہ سے اس کا نام لے کر یہ انکشاف کیا ہے

هُوَ الَّذِیْ وَضَعَ حَدِیْثَ اَبِیْ حَنِیْفَةَ عَنْ مَالِكٍ[2]

یہی شخص ہے جس نے ابوحنیفہ از مالک کی حدیث بنائی ہے۔

دراصل روایت صرف اس قدر تھی کہ حماد بن ابی حنیفہ نے امام مالک سے سنا مگر عمران نے درمیان میں ابوحنیفہ کا اپنی جانب سے اضافہ کر دیا۔ چنانچہ حافظ ابوعبداللہ محمد بن مخلد نے اپنے رسالہ نامی "ما رواہ الاکابر عن مالک" میں اس کی سند اس طرح بیان کی ہے:

حدثنا ابو محمد القاسم بن هارون ثنا بكار بن الحسن الاصبهانی
ثنا حماد بن ابی حنیفة ثنا مالك بن انس الحدیث[3]

یہ بھی اس کی تائید ہے کہ اصل سند میں حماد بن ابی حنیفہ عن مالک ہے۔ ابوحنیفہ عن مالک نہیں ہے اور جامع المسانید میں بھی سند اس طرح ہے۔ حافظ سیوطی نے اسی سلسلے میں مسند ابی حنیفہ لابی الضیاء کا بھی حوالہ دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ثُمَّ وَقَفْتُ عَلٰی مُسْنَدِ اَبِیْ حَنِیْفَةَ لِاَبِی الضِّیَاءِ الَّذِیْ
جَمَعَہٗ مِنْ خَمْسَةَ عَشَرَ مُسْنَدًا وَفِیْہِ مِنْ رِوَایَةِ
اَبِیْ حَنِیْفَةَ عَنْ مَالِكٍ[4]

مجھے مسند ابی حنیفہ ابن الضیاء کا نسخہ ملا ہے لیے مؤلف نے پندرہ

---

[1] التعلیقات علی الانتقاد۔ [2] میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۸۰۔ [3] التعلیقات علی الانتقاد۔
[4] تزیین الممالک ص ۵۹۔

مسندوں سے جمع کیا ہے اور اس میں ابوحنیفہ از مالک کی روایت ہے۔

یہ مسند ابی حنیفہ دراصل جامع المسانید کا خلاصہ ہے۔ جامع المسانید اب زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ اس میں کتاب الآثار کے حوالہ سے یہ روایت ضرور ہے مگر اسے امام محمد بحوالہ امام اعظمؒ عن نافع عن ابن عمر روایت کرتے ہیں۔ البتہ امام محمد نے اپنے مؤطا میں یہی روایت بحوالہ مالک عن نافع عن ابن عمر پیش فرمائی ہے۔

دوسری روایت خطیب کی ہے اس میں محمد بن الصلت کو غلط فہمی ہوئی۔ اس نے عبدالملک کی جگہ مالک کہہ دیا کیونکہ اس روایت کی جن محدثین نے تخریج کی ہے اس کی تفصیل علامہ خوارزمی نے دی ہے ان تمام روایات میں کوئی طریق بھی ایسا نہیں ہے جس میں ابوحنیفہ از مالک آیا ہو۔ اس میں اول تو محمد بن المغیرہ بحوالہ قاسم از ابی حنیفہ ہے اور قاسم کے علاوہ دوسرے طرق میں بحوالہ امام محمد اور قاضی ابویوسف ابوحنیفہ از عبدالملک بن عمیر آیا ہے کسی بھی طریق میں ابوحنیفہ از مالک نہیں ہے۔[1]

اشہب کی روایت سے غلط فہمی

زیادہ تر غلط فہمی اشہب کی اس روایت سے ہوئی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہ کو امام مالک کے سامنے اس طرح دیکھا ہے جیسے بچہ باپ کے سامنے۔ اشہب کا یہ بیان بھی اصول روایت کے مطابق صحیح نہیں ہے کیونکہ اشہب کا سن ولادت حسب بیان ابن یونس ۱۴۵ھ ہے یعنی امام اعظم کی وفات والے سال ان کی عمر صرف پانچ سال کی ہے۔ اس عمر میں ان کا مصر سے مدینہ جانا اور امام ابوحنیفہ کو امام مالک کے سامنے دیکھنا انسانی عقل باور نہیں کرتی۔

کوثری لکھتے ہیں:

> امام ذہبی نے امام مالک کے ترجمہ میں جو واقعہ بیان کیا ہے صحیح نہیں ہے ہاں اگر امام ابوحنیفہ کے صاحبزادے حماد کے متعلق ہو تو شاید درست ہو کیونکہ اشہب کی تاریخ پیدائش ۱۴۵ھ ہے۔[2]

تعلیقات میں ہے:

---

[1] جامع المسانید ج ۲ ص ۲۲۶۔
[2] اقوم المسالک ص ۷۔

امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اشہب کی زبانی جو کہانی بیان کی ہے وہ
تاریخی طور پر صحیح نہیں ہے کیونکہ اشہب امام شافعی کی عمر کے لگ
بھگ ہیں یا محتاط سے محتاط اندازے کے موافق امام ابوحنیفہ کی
وفات کے وقت ان کی عمر زیادہ سے زیادہ دس سال ہوتی ہے
ان کی ملاقات امام مالک سے اس دور میں ثابت نہیں ہے اور ہو
بھی کیسے سکتی ہے امام مالک معلم الاطفال نہ تھے کہ اس عمر کے بچے
ان کے پاس ہوں۔ دراصل واقعہ کا تعلق ابوحنیفہ سے نہیں بلکہ
ان کے صاحبزادے حماد سے ہے۔[1]

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام ابوحنیفہ کی امام مالک سے روایت حدیث محتاج ثبوت ہے اور جن راہوں سے اسے ثابت کرنے کی کوشش سیوطی اور دارقطنی نے کی ہے وہ محدثین کے یہاں ناقابلِ اعتبار ہیں۔ ورنہ امام اعظم کے لیے یہ خبر قطعاً قابلِ عار نہیں ہے کہ وہ امام مالک سے حدیثوں کا سماع کریں بلکہ محدثین کا کہنا ہے کہ ایک محدث اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک وہ اعلیٰ، ہم سر اور کمتر تینوں طبقوں سے روایت نہ کرے۔ امام مالک تو امام اعظم کے اقران میں سے ہیں۔ امام اعظم نے تو اپنے تلامذہ تک سے حدیثیں بیان کی ہیں چنانچہ امام خراسان ابراہیم بن طہمان کے متعلق امام ذہبی نے تصریح کی ہے کہ:

حَدَّثَ عَنْهُ اَبُوْ حَنِيْفَةَ[2]

ابن ابی حاتم نے تقدمۃ الجرح والتعدیل میں ابراہیم کے حوالہ سے امام مالک سے روایات سننے کا تذکرہ کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

ابراہیم بن طہمان کہتے ہیں میں مدینہ آیا اور حدیثیں لکھی ہیں۔ وہاں
سے کوفہ گیا اور امام اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا سلام کیا آپ نے
پوچھا مدینہ میں کس سے استفادہ کیا؟ میں نے نام بتایا۔ آپ نے
دریافت کیا کہ کیا مالک بن انس سے بھی کچھ لکھا ہے؟ میں نے
کہا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ دکھاؤ۔ بعد ازیں آپ نے قلم دوات

---

[1] التعلیقات علی الانتقاء ص ۲۵۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۹۷۔

منگا کر نقل کیا۔[1]

لیکن روایت اقران کے لیے حلقہ درس میں شامل ہونا ضروری نہیں ہے۔ مذاکرے کے ضمن میں بھی روایت ہو سکتی ہے۔ پھر یہاں خود امام ابوحنیفہ کی امام مالک سے روایت کرنا محققین سے ثابت نہیں ہے۔

حافظ مغلطائی کی تحقیق

اگر تاریخی طور پر یہ صحیح ثابت ہو جاتے اور حافظ دار قطنی، خطیب بغدادی اور حافظ سیوطی کی بات ہی اپنالی جائے تو پھر حافظ علاء الدین مغلطائی کا یہ دعویٰ صحیح ہو جائے گا کہ اسانید و روایت کی دُنیا میں سب سے زیادہ جلیل القدر یہ سلسلہ سند ہے اَبُوْحَنِیْفَۃَ عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ، آپ اصح الاسانید کے سلسلہ میں امام بخاری کی رائے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ مالک عن نافع عن ابن عمر کا طریق سلسلۃ الذہب ہے۔ اسی پر قدم جماتے ہوئے حافظ ابو منصور عبد القاہر تمیمی نے شافعی از مالک از نافع از ابن عمر کو اجل الاسانید لکھا ہے اس پر حافظ مغلطائی نے حافظ عبد القاہر کا تعاقب کیا اور بتایا کہ اگر صحت روایت کا مدار جلالتِ شان اور عظمتِ قدر پر ہے تو پھر تاریخ کی دُنیا میں اجل الاسانید

ابوحنیفۃ عن مالک عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہ

ہے اور اگر جلالت شان نہیں بلکہ اس کا مدار اتقان و ضبط ہے تو پھر ابن وہب[2] عن مالک الخ یا القعنبی[3] عن مالک کا طریق بزرگترین ہونا چاہیے۔ حافظ بلقینی[4] نے محاسن الاصطلاح میں

---

[1] تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۳ ۔ [2] نام عبداللہ بن وہب بن مسلم اور کنیت ابو محمد ہے۔ ان کا مولد و مسکن مصر ہے چار سو ائمہ حدیث کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ ابن عدی، ابن یونس ان کی جلالت علمی کا لوہا مانتے ہیں فقہ، حدیث اور عبادت کا ایک مثالی نمونہ تھے ۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے ۷۲ سال کی عمر میں ۱۹۷ھ میں وفات پائی ان کے حالات اتحاف النبلاء میں ہیں۔

[3] نام عبداللہ بن سلمہ بن قعنب الحارثی ہے مشہور قعنبی ہے اصلاً مدنی ہیں مگر بود و باش بصرے میں تھی آخر عمر میں مکہ تشریف لے آئے بہت سے شیوخ وقت سے استفادہ کیا۔ مؤطا کے راویوں میں سے ایک ہیں۔ اتحاف میں ہے کہ از جملہ اصحاب مالک و فضلاء و ثقات و خیار ایشاں بود یحییٰ بن معین

(باقی ص ۲۷۰ پر)

حافظ مغلطائی کے اس فیصلہ کی صحت اور قوت کو مانتے ہوئے لکھا ہے کہ

اما ابوحنیفۃ فھو وان روی عن مالک کما ذکرہ الدارقطنی
لکن لم یشتھر روایتہ عنہ کاشتھار روایۃ الشافعی

یعنی اگر ابوحنیفہ عن مالک کو شافعی عن مالک جیسی شہرت ہوتی تو پھر امام بلقینی کے خیال میں امام ابوحنیفہ کی جلالت قدر کی وجہ سے ابوحنیفہ عن مالک الخ ہی سب سے صحیح اور سب سے بزرگتر سلسلہ سند ہوتا اور دنیائے روایت میں اسی کو سلسلۃ الذہب کہا جاتا۔ حافظ عراقی نے حافظ مغلطائی اور حافظ بلقینی دونوں کے بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

امام اعظم کی امام مالک سے روایت جو دارقطنی نے غرائب میں
لکھی ہے اس کا سلسلہ سند نافع عن ابن عمر نہیں ہے [1]

یعنی اگر روایت کا سلسلہ فی الواقع یہ ہو کہ ابوحنیفہ عن مالک عن نافع عن ابن عمر اور روایتی نقطہ نظر سے اس کی صحت ثابت ہو جاتے تو پھر حافظ عراقی کی رائے میں اسے ہی اصح الاسانید اور اجل الاسانید ہونا چاہیے۔ یہی بات حافظ عسقلانی نے فرمائی ہے۔

اما اعتراضہ بابی حنیفۃ فلا یحسن لان اباحنیفۃ لم
تثبت روایتہ عن مالک

حافظ مغلطائی کا یہ کہنا صحیح نہیں کیونکہ امام اعظم کی امام مالک سے روایت
ثابت نہیں ہے [2]

اس کا مدلول بھی یہی ہے کہ اگر ابوحنیفہ کی امام مالک سے روایت ثابت ہو جائے تو پھر

ص ۲۶۹ کا بقیہ حاشیہ :) کہتے ہیں کہ حدیث میں ملاحت میں نے صرف دو میں دیکھی ہے وکیع بن الجراح اور قعنبی۔ سنہ ۱۳۰ھ تاریخ ولادت ہے اور سنہ ۲۲۰ھ میں وفات پائی۔

[1] قاضی القضاۃ علم الدین صالح بن سراج الدین البلقینی پورا نام ہے اپنے زمانے میں مذہب شافعی کے زعیم ہیں اصول میں عزالدین بن جماعہ کے شاگرد ہیں۔ حافظ سیوطی نے بھی ان سے اجازت حدیث لی ہے ان کا سن ولادت سنہ ۷۹۱ھ ہے اور وفات سنہ ۸۶۸ھ میں ہوئی ہے۔

[1] التعلیق الممجد ص ۱۶ ۔ [2] مقدمہ فتح الملہم ص ۳۰

تاریخ و اسناد کی دُنیا میں حافظ عسقلانی کے خیال میں اصح الاسانید یہی ہے۔ اس تمام تفصیل اور رد و کد سے ضمنی طور پر یہ بات بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آگئی ہے کہ بارگاہِ محدثین اور روایت و اسناد کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کی نظر میں امام اعظم کا مقام سب سے اونچا ہے۔ اتنا اونچا کہ محدثین کے یہاں آپ کی ذات کو اصح الاسانید کے موقعہ پر بطور استدلال پیش کیا جاتا ہے۔ اگر معاذ اللہ حضرت امام کی ذات گرامی کسی درجے میں بھی محدثین کے نزدیک مجروح و مقدوح ہوتی یا کوئی بات بھی آپ میں قابل گرفت ہوتی تو اصح الاسانید جیسے نازک ترین موقعہ پر نہ کوئی آپ کا نام لیتا اور نہ بلقینی، عراقی اور عسقلانی جیسے اساطین حدیث ایسے مقام پر خاموش رہتے۔ دراصل یہ ان لوگوں کے لیے سرمۂ چشم بصیرت ہے جو امام موصوف کی شان جلالت پر حرف گیری ہی کو پروانۂ محدثیت قرار دیتے ہیں۔

امام مالکؒ کی نظر میں امام اعظمؒ کا مقام

اصل یہ ہے کہ امام مالک امام اعظم کا غایت درجہ اکرام کرتے تھے۔ چنانچہ محمد بن اسماعیل بن فدیک کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک اور امام اعظم دونوں کو مدینہ میں دیکھا ہے۔ دونوں باہم ہاتھ پکڑے جا رہے تھے جب دونوں مسجد نبوی کے دروازے پر پہنچے تو امام مالک نے ادباً امام اعظم کو آگے کر دیا۔ امام اعظم یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے بسم اللہ ھذا موضع الامان فآمنی من عذابك ونجنی من عذاب النار[1]

حافظ ابن ابی العوام نے عبد العزیز بن محمد دراوردی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ امام اعظم نے فرمایا ہے کہ میں نے مدینہ طیبہ میں علم پھیلا ہوا دیکھا ہے اگر کوئی سمیٹ سکتا ہے تو یہ سرخ و سفید لڑکا ہے یعنی امام مالک[2]

ظاہر ہے کہ یہ بات امام اعظم نے امام مالک کے بارے میں اس وقت کہی ہے جبکہ عمر چودہ پندرہ سال ہے۔ اس وقت لامحالہ امام اعظم کی عمر پچیس سال کی ہوتی ہے گویا یہ بات امام اعظم نے ۱۰۵ھ میں فرمائی ہے اور میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہی سال امام اعظم کے اسفار علمیہ کا پہلا سال ہے۔ خود امام مالک امام ابو حنیفہ کا بیحد اکرام کرتے تھے اور اکرام اس لیے نہیں کرتے تھے کہ عمر

---

[1] صدر الائمہ ج ۱ ص ۳۲۔ [2] التعلیقات ص ۱۲

میں بڑے تھے بلکہ اس لیے کہ امام مالک کو امام اعظم کی فقاہت اور مجتہدانہ شان کا اقرار تھا۔ اور اتنا اقرار تھا کہ اپنے اعمال میں امام اعظم کے کردار کی کاپی کو اپنے لیے فخر محسوس کرتے تھے چنانچہ امام لیث بن سعد فرماتے ہیں کہ:

> میں مدینہ میں امام مالک سے ملا۔ ان سے میں نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے کہ آپ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہیں فرمایا کہ امام ابوحنیفہ کے سامنے عرق آلود ہو جاتا ہوں کیونکہ وہ فقیہ ہیں۔ امام لیث کہتے ہیں کہ بعد ازیں میں امام ابوحنیفہ کے پاس گیا میں نے ان سے عرض کیا کہ امام مالک کی نظر میں آپ کا مقام بہت بلند ہے امام اعظم نے فرمایا کہ میں نے سچے اور کھرے جواب میں مالک سے زیادہ تیز اور کھرا کوئی نہیں دیکھا[1]

الغرض امام مالک امام اعظم کے استاد نہیں چنانچہ جمال الدین المزی نے تہذیب الکمال میں اور امام ذہبی نے اپنی تصانیف میں امام اعظم کے مشائخ میں امام مالک کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر المضیئہ میں، علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں اور حافظ ابن حجر نے امام صاحب کے "تلامذہ میں شمار کیا ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ حضرت امام شافعی نے عبدالعزیز بن محمد دراوردی کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا ہے کہ

> كَانَ مَالِكٌ يَنْظُرُ فِي كُتُبِ اَبِي حَنِيْفَةَ وَ يَنْتَفِعُ بِهٖ[2]
> امام مالک امام اعظم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور ان سے استفادہ فرماتے۔

بصرہ

مشہور اسلامی شہر جو تیسری صدی تک علوم اسلامیہ کا گہوارہ رہا اور وسعت علم، کثرت حدیث اور دوسری خوبیوں کے لحاظ سے اس کا ایک امتیازی مقام تھا۔ امام حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں بصرے کے اندر سکونت اختیار کرنے والے صحابہ کی ایک فہرست دی ہے اور ایسے ہی کتاب کی نوع ۴۹ میں جہاں امام حاکم نے مختلف شہروں کے ان ائمہ ثقات کا تذکرہ کیا ہے

---

[1] التعلیقات ص ۱۴۔ [2] اقوم المسالک ص ۲۲

جن کی احادیث پر حفظ و مذاکرہ کی حدود میں اعتماد کیا جا سکتا ہے بصرہ کے ائمہ ثقات اور حفاظِ حدیث کا بھی ایک طویل تذکرہ کیا ہے اور تقریباً نصف صد سے زیادہ حفاظِ حدیث کے نام بتائے ہیں حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

بصرے میں حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت عمران بن حصین، حضرت ابن عباس اور متعدد صحابہ آکر فروکش ہوئے ان میں سب سے آخری حضرت انس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص، ان کے بعد حسن بصری، ابن سیرین، ابوالعالیہ، پھر قتادہ، ایوب، ثابت البنانی یونس بن عون، پھر حماد بن سلمہ، حماد بن زید اور ان کے تلامذہ ہوئے ہیں۔

اس کے بعد امام ذہبی نے لکھا ہے:

مازال ھذا الشان وافرا الی راس المائۃ الثالثۃ وتناقص جدا الی ان تلاشی[1]

بصرے میں حدیث کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ حافظ ذہبی نے حماد بن سلمہ بصری کے تذکرے میں حافظ ابن المدینی کے حوالے سے لکھا ہے:

کان عند یحییٰ بن ضریس عن حماد عشرۃ آلاف حدیث[2]

بصرے میں محدثین کی اس قدر فراوانی تھی کہ مسند وقت حافظ مسلم بن ابراہیم بصری کہتے ہیں کہ میں نے آٹھ سو شیوخ سے حدیثیں قلم بند کیں اور دجلہ کا پل جو بصرہ سے دس میل ہے اتر کر نہیں گیا[3]۔ ائمہ مجتہدین میں سے امام حسن بصرہ ہی کے رہنے والے ہیں جن کے متعلق امام اعظم فرماتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق سے سنا ہے کہ عراق میں حسن بصری جیسا کوئی نہیں ہے[4] اور الامام الربانی محمد بن سیرین جو علم الرویا کے امام ہیں۔ بصرہ کے رہنے والے ہیں اور جن کے پاس امام اعظم نے اپنے ایک خواب کی تعبیر دریافت کرنے کے لیے ایک دوست کو روانہ فرمایا۔ چنانچہ امام ذہبی فرماتے ہیں:

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ نے خواب میں دیکھا کہ

---

[1] الاعلان بالتوبیخ بحوالہ الامصار ذوات الآثار۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ترجمہ حماد بن سلمہ۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ترجمہ مسلم بن ابراہیم۔ [4] کتاب الآثار ص ۲۰۹۔

آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی قبر کھود رہے ہیں، کھود کر آپ کی ہڈیوں
کو جمع کر رہے ہیں اور ان کو جوڑ رہے ہیں۔ آنکھ کھلی تو آپ بہت
گھبرائے۔ آپ نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ بصرہ جاؤ تو امام ابن
سیرین سے خواب کی تعبیر دریافت کرنا اور جا کر خواب کی تعبیر پوچھی آپ
نے فرمایا کہ یہ خواب دیکھنے والا شخص احیائے سنّت کا کام کرے گا۔[1]

امام اعظم ابوحنیفہ طلب علم حدیث کے لیے بصرہ تشریف لے گئے ایک بار نہیں بلکہ بیس مرتبہ سے زیادہ، آپ کو بصرہ جانے کا اتفاق ہوا ہے اور وہاں سال بھر قیام کیا ہے۔ چنانچہ حافظ عبدالقادر قرشی نے بحوالہ یحییٰ بن شیبان خود امام صاحب کا یہ بیان نقل کیا ہے:

میں بیس بار سے زیادہ بصرہ گیا ہوں اور اکثر سال سے زیادہ وہاں
قیام بھی کیا ہے[2]

حضرت امام اعظم کے اسفارِ علمیہ میں بصرہ ابتدائی اور آخری منزل ہے جیسا کہ آپ پہلے حافظ ابن تیمیہ کی زبانی سن چکے ہیں کہ اسلامی مملکت میں علومِ نبوّت کے لیے پانچ شہروں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کوفہ میں عبداللہ بن مسعود کے شاگرد، بصرہ میں عبداللہ بن عباس کے شاگرد، مکہ و مدینہ میں فاروق اعظم کے تلامذہ علومِ نبوّت کے حامل تھے۔ بصرہ میں عبداللہ بن عباس کے علوم کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ خود ابوبکر بصری کا بیان ہے کہ:

ابن عباس بصرہ تشریف لائے تو تمام عرب میں جسم، علم، بیان، جمال
اور کمال میں کوئی ان کی مثال نہ تھا[3]

علامہ کمال الدین البیاضی نے امام اعظم کے علوم کی سند اور ان کے علمی سفرنامے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

فهو اخذ عن اصحاب عمر عن عمر و عن اصحاب ابن مسعود
عن ابن مسعود عن اصحاب ابن عباس عن ابن عباس ممن
يبلغ العدد المذكور بالكوفة والبصرة والحجاز في حجة سنة
ست وتسعين وبعده

---

[1] مناقب امام للذہبی ص ۲۲۔ [2] الجواہر المضیۃ ص ۴۶۸۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۸۔

امام اعظم کے علوم کا ماخذ بواسطہ اصحاب عمر، حضرت فاروق اعظم اور
بواسطہ اصحاب ابن مسعود، خود حضرت عبداللہ بن مسعود اور بحوالہ
تلامذۂ ابن عباس حضرت عبداللہ بن عباس ہیں ان ہی لوگوں کی
مذکورہ بالا تعداد سے امام اعظم نے کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ میں ۹۶ھ
اور اس کے بعد علوم حاصل کیے [1]

بصرہ میں جن حفاظِ حدیث سے امام اعظم نے علم حدیث حاصل کیا ہے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں

الامام ابوبکر ایوب بن ابی تمیمہ السختیانی

علم حدیث کے مشہور امام ہیں۔ امیر المومنین فی الحدیث امام شعبہ نے ان کو سید العلماء کہا ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ ہم ان کے پاس جاتے تھے جب ان کے سامنے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد گرامی بیان کیا جاتا تو بے اختیار رو پڑتے۔ امام ذہبی نے ان کو الحافظ، احد الاعلام لکھا ہے۔ امام اشعث ان کو جہبذ العلماء فرماتے ہیں۔ ہشام بن عروہ کہتے ہیں کہ میں نے بصرہ میں ان جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ ہشام بن حسان کہتے ہیں کہ انہوں نے ۴۰ حج کیے ہیں۔ علم حدیث میں جن اساتذہ کے سامنے انہوں نے زانوئے ادب تہ کیا ہے وہ بڑے بڑے جلیل القدر امر ہیں۔ مثلاً عمرو بن سلمہ، القاسم بن محمد، نافع، عطاء، عکرمہ، عمرو بن دینار، اور جن تلامذہ نے ان سے علمی استفادہ کیا ہے ان میں سے حماد بن زید، حماد بن سلمہ، امام اعمش، امیر المومنین فی الحدیث امام شعبہ، امام مالک اور حضرت امام اعظم خاص طور پر قابل ذکر ہیں [2]

امام شعبہ نے ایک بار ان کی طرف نسبت کر کے حدیث بیان کی تو فرمایا حدثنی ایوب وکان سید الفقہاء [3] ابو یعمر کہتے ہیں کہ ایک بار آپ حج کو تشریف لے گئے۔ راستہ میں رفقاءِ سفر کو پیاس کی سختیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت ایوب نے فرمایا کہ دوستو! کسی سے نہ کہنا، وعدہ کرو سب نے ہاں کی۔ ہاتھ سے زمین پر گول دائرہ بنایا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے دیکھتے آنکھوں پانی کا چشمہ اُبل پڑا۔ خوب پیا، جانوروں کو سیراب کیا۔ بعد ازیں حضرت ایوب نے اس پر ہاتھ پھیر دیا زمین ہموار ہو گئی اور پانی ختم ہو گیا۔ ابو الربیع کہتے ہیں کہ میں نے ابو یعمر کی زبانی یہ واقعہ سن کے ہیں

---

[1] اشارات المرام ص ۲۰۔ [2] تذکرۃ الحفاظ و تہذیب التہذیب۔ [3] تہذیب الاسماء واللغات۔

سناتھا۔ بصرہ آیا تو حماد بن زید سے بیان کیا۔ حماد کہتے ہیں کہ میرے لیے عبدالواحد بن زیاد نے بھی
اس طرح بیان کیا[1]

حافظ ابن المدینی فرماتے ہیں کہ حدیث کے ذخیرے میں ان کی آٹھ سو حدیثیں ہیں۔ حافظ ا
عبدالبر لکھتے ہیں کہ امام حماد بن زید فرماتے ہیں کہ میں نے حج کا ارادہ کیا حج کی خاطر رخصت ہونے
لیے امام ایوب کے پاس گیا۔ آپ نے مجھے بتایا کہ معلوم ہوا ہے کہ امام اعظم بھی حج کو جا رہے
تمہاری ان سے ملاقات ہو تو ان سے میرا سلام کہنا[2]

علامہ نودی نے تہذیب الاسماء واللغات میں لکھا ہے کہ امام ایوب کی علمی جلالت، امام
حافظہ، ثقاہت، علمی مہارت، فہم و فراست اور سیادت پر تمام اہلِ علم کا اتفاق ہے۔ امام
نے ان سے جو حدیثیں سُنی ہیں وہ قاضی ابو یوسف نے کتاب الآثار میں اور اصحابِ مسانید میں
حافظ طلحہ بن محمد اور حافظ ابو عبداللہ الحسین نے درج کی ہیں۔ مثلاً

ابوحنیفۃ عن ابی بکر ایوب البصری ان امرأۃ ثابت بن
قیس بن شماس اتت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت
لا یجمعنی و ثابتًا سقف ابدًا فقالت اختلعین منہ
بحد یقتہ التی اصدقک قالت اجل و زیادۃ قال
صلی اللہ علیہ وسلم اما الزیادۃ فلا و اشار الی ثابت
ففعل[3]

امام ایوب کا تذکرہ امام حاکم نے ان ائمہ حدیث میں کیا ہے جن پر حدیث کے معاملے
بھروسہ کیا جا سکتا ہے[4]

مجھے تفصیل میں جانا مقصود نہیں ہے صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ امام اعظم کی علمی طلبگاری
کے وقت ان شہروں کی رونق کا کیا حال تھا۔

امام ایوب کے علاوہ بصرہ کے جن محدثین سے امام اعظم نے علم حدیث حاصل کیا ہے ان
نام یہ ہیں بہز بن حکیم، بکر بن عبداللہ المزنی، عطا بن عجلان، قتادہ بن دعامہ، مبارک بن فضالہ

---

[1] الانتقاء [2] الانتقاء ص ۱۲۵ [3] کتاب الآثار
[4] معرفۃ علوم الحدیث ص ۹۲۔

یزید بن ابی یزید، محمد بن الزبیر، شداد بن عبدالرحمٰن، ابوسفیان طریف بن سفیان، نصر بن سعد، یزید بن ابی حبیب۔

حدیث میں امام اعظمؒ کا نمایاں مقام

امام اعظم کی علمی رحلتوں سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ امام موصوف نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی شیفتگی اور آپ کی حدیثوں کے فراہم کرنے میں محنت اور جانفشانی اس وقت کی جبکہ ابھی تدوین حدیث یعنی تاریخ سنت کی صبح صادق ہی ہوئی تھی اور اس کے لیے کوفہ، کوفہ سے باہر جو تگ و دو کی ہے اس کا اندازہ امام صاحب کے اساتذہ سے ہو سکتا ہے۔

امام اعظم کوفہ سے باہر تلاش حدیث کے لیے اس وقت تشریف لے گئے جبکہ پہلے اپنے گھر کی تمام حدیثیں سمیٹ چکے تھے اور کوفہ میں پھیلا ہوا سارا علمی سرمایہ آپ کی ذات گرامی میں جمع ہو چکا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن القیم الجوزی نے مشہور محدث یحییٰ بن آدم کے حوالے سے لکھا ہے۔

کان نعمان قد جمع حدیث بلدہ کلہ

اور علمی سفروں سے فراغت کے بعد بھی باایں وسعت نظر ہمیشہ اس بات کے متلاشی رہتے تھے کہ کوفہ میں کوئی نامور محدث آئے تو اس کی محدثانہ معلومات سے اپنے علم میں اضافہ کریں۔

چنانچہ مشہور محدث امام النضر[1] بن محمد مروزی جو امام عبداللہ بن المبارک کے گہرے دوست ہیں فرماتے ہیں :

---

[1] ان کا پورا نام نضر بن محمد کنیت ابو عبداللہ ہے مرو کے رہنے والے ہیں ابواسحاق الشیبانی عبدالعزیز بن رفیع العلاء بن المسیب، محمد بن المنکدر، امام اعمش، امام مسعر بن کدام، ابوحنیفہ، یزید بن ابی زیاد اور ابی جناب الکلبی کے شاگرد ہیں اور مشہور محدث امام اسحاق بن راہویہ، حسان بن موسیٰ اور علی بن الحسن کے استاد ہیں۔ محمد بن سعد کہتے ہیں کہ نضر بن محمد علم، فقہ، عقل اور فضل میں پیش پیش تھے۔ امام عبداللہ بن المبارک کے گہرے دوست تھے امام نسائی اور دارقطنی نے ان کی ثقاہت کو مانا ہے افسوس ہے کہ ایسے بلند پایہ حافظ حدیث اور امام وقت بھی اہل ظاہر کے حملوں سے نہ بچ سکے اور بعض محدثین نے محض اختلاف خیال کی بنا پر ان پر جرح کر ڈالی۔ ان کی تاریخ وفات ۱۸۳ھ ہے۔ تقریب، تہذیب اور الجواہر المضیئۃ میں ان کا ترجمہ ہے۔

لم ار رجلاً الزم للاثر من ابی حنیفۃ قدم علینا یحییٰ
بن سعید و ہشام بن عروۃ و سعید بن ابی عروبۃ
فقال لنا ابوحنیفۃ انظروا اتجدون عند
ھؤلاء شیئاً نسمع

میں نے امام ابوحنیفہ سے زیادہ حدیث سے وابستہ کوئی نہیں دیکھا
ہے ۔ ایک بار کوفہ میں یحییٰ بن سعید، ہشام بن عروہ اور سعید
بن عروبہ تشریف لائے تو ہم سے امام صاحب نے فرمایا دیکھو
ان حضرات کے پاس کوئی حدیث ایسی ہے جو ہم سنیں[1]

اس کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہے کہ اگرچہ مستقل طور پر آپ تکمیلِ حدیث بصرہ، مکہ
مدینہ، اور کوفہ کے اساتذہ سے کر چکے تھے اور تکمیل کے بعد مسندِ درس پر جلوہ افروز ہو
تھے لیکن گاہ گاہ دوسرے شیوخ حدیث بھی سے استفادہ اس خیال سے کرتے تھے کہ
ممکن ہے ان کے علمی سرمایہ میں کوئی چیز ایسی ہو جو ہمیں معلوم نہ ہو۔ امام النضر بن محمد
جو نام بتاتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی یہ تلاش و جستجو ان اساتذۂ فن حدیث
تک ہوتی تھی جو فن روایت اور جمع حدیث میں ممالک اسلامیہ کے اندر شہرت علمی کے مدا
طے کر چکے تھے۔ اس کا صحیح اندازہ حافظ عبدالعزیز بن ابی رزمہ کے اس بیان سے بھی ہوتا ہے
جو حافظ حارثی[2] نے داؤد بن ابی العوام کے حوالہ سے نقل کیا ہے :

---

[1] الجواہر المضیۃ للحافظ عبدالقادر القرشی ج ۲ ص ۱۰۲ ۔ [2] یہ امام ابو محمد عبداللہ حارثی بخاری ہیں فقہ کی تحصیل
آپ نے امام ابو حفص صغیر سے کی تھی اور انہوں نے اپنے والد ماجد امام ابو حفص کبیر سے جو امام محمد کے شاگرد ہیں
علم حدیث کے لیے آپ نے خراسان، عراق اور حجاز کے مختلف شہروں کا سفر کیا تھا اور بہت سے شیوخ سے اس
فن کی تحصیل کی تھی۔ حافظ سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے کہ خراسان، عراق اور حجاز گئے اور اساتذہ
علم حاصل کیا۔ حافظ خلیلی فرماتے ہیں کہ استاد کے لقب سے مشہور ہیں اور علم حدیث میں معرفت کے مالک
ہیں۔ سمعانی نے مکثر من الحدیث لکھا ہے۔ حافظ ذہبی نے قاسم بن اصبغ کے ترجمہ میں ان کا ذکر ان
لفظوں میں کیا ہے ماوراء النہر کے عالم، محدث، امام، علامہ ابو محمد عبداللہ جو الاستاذ کے لقب سے مشہور ہیں
ان کی تاریخ وفات ۳۴۰ھ ہے ۔

عبدالعزیز بن ابی رزمہ نے ایک بار امام ابوحنیفہ کے علم کا تذکرہ چھیڑا
اور اسی سلسلے میں یہ بھی بتایا کہ ایک بار کوفہ میں محدث آئے تو امام
ابوحنیفہ اپنے اصحاب سے فرمانے لگے دیکھو تو ان کے پاس حدیث
میں کوئی ایسی چیز ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے عبدالعزیز فرماتے
ہیں دوبارہ ایک اور محدث ہمارے پاس آتے آپ نے پھر اپنے
اصحاب سے یہی فرمایا۔[1]

حافظ ابن ابی العوام قاضی مصر نے امام ابو یوسف کے حوالہ سے امام اعظم کی دستوریہ کا ضابطہ بتایا ہے کہ :

امام اعظم کے سامنے جب کوئی بھی مسئلہ درپیش آتا تو اپنے اصحاب سے
سب سے پہلے یہ فرماتے بتاؤ اس موضوع پر احادیث و آثار کیا کہتی ہیں[2]

ان تصریحات سے ایک معمولی فہم کا آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ امام اعظم نہ صرف حدیث کے وافر سرمایہ اور تاریخ السنۃ کے عظیم الشان ذخیرے کے مالک تھے بلکہ مقام اجتہاد پر فائز ہونے اور باوجود تمام علمی پہنائیوں کے آپ ارشادات کے جویا رہتے تھے اور اپنے اصحاب کو ہر نووارد محدث کے علوم سے خوشہ چینی کی ہدایت فرماتے تھے اور اس دعوے کے ساتھ فرماتے کہ دیکھو شاید ان کے پاس کوئی ایسی حدیث ہو جو ہمیں معلوم نہ ہو۔ اس سے اس طلب و جستجو کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جو قدرت کی بخشائشوں نے امام صاحب میں ودیعت فرمائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی ذات گرامی کو اپنے زمانے میں ان تمام احادیث کے لیے جن کا تعلق احکام و فقہ اور اجتہاد سے ہے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ مشہور مورخ خطیب بغدادی حافظ اسرائیل بن یونس کے حوالہ سے رقمطراز ہیں :

نعم الرجل نعمان ماکان احفظہ لکل حدیث
فیہ فقہ[3]

گویا وقت کے حفاظ حدیث اس معاملے میں امام اعظم کے علمی جلال کا لوہا مانتے تھے اور صرف اسرائیل بن یونس ہی نہیں بلکہ یگانے اور بیگانے نے امام صاحب کے بارے میں یہی

---

[1] صدر الائمہ مکی ج ۱ ص ۸۳ - [2] تانیب ص ۱۵۲ - [3] تاریخ بغداد ترجمہ امام اعظمؒ

تاثر رکھتے تھے حافظ محمد بن یوسف الصالحی شافعی مؤلف السیرۃ الکبریٰ اپنی مشہور کتاب عقود الجمان میں رقمطراز ہیں :

امام ابوحنیفہ کبار حفاظ اور ناموروں میں سے تھے اگر آپ کی علمی توجہ کا مرکز حدیث نہ ہوتی تو مسائل فقہیہ کا استنباط ہی ممکن نہ تھا۔[1]

یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔ آئندہ اوراق میں یہ بات آپ کے سامنے کھل کر آئے گی۔

مجہول اور ضعیف راویوں سے روایت

شاید آپ یہ خلش محسوس کریں کہ امام اعظم نے جن سے روایات لی ہیں ان میں کچھ مجہول ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کی بعد میں آنے والے محدثین نے تضعیف کی ہے۔ اسے بنیاد بنا کر کہنے والوں نے مختلف باتیں بنائی ہیں۔

آج سے بہت پہلے شیعی حلقوں کی جانب سے یہ آواز اٹھائی گئی کہ چونکہ امام اعظم ضعیف راویوں سے روایت کرتے ہیں اس لیے ان کی ذات گرامی حدیث و روایت کے بازار میں کوئی معیاری حیثیت کی مالک نہیں ہے اور یہ امام موصوف کی قلت حدیث کی دلیل ہے۔ خود ان کے الفاظ یہ ہیں :

اما الحديث فلانه كان يروي عن المضعفين وما ذاك الا لقلة علمه بالحديث[2]

چونکہ یہ دعویٰ جس بنیاد پر کیا گیا ہے وہ بہت بڑا دھوکہ اور فریب ہے اس لیے میں پہلے اس فریب کا دامن چاک کر کے ناظرین کو اصل حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔

اصل یہ ہے کہ راویوں کی تضعیف و توثیق ایک اجتہادی چیز ہے۔ ایک شخص ایک کی رائے میں ضعیف ہے اور وہی دوسرے کے خیال میں ثقہ ہے۔ اسی بنا پر حافظ سخاوی نے حافظ ذہبی کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے۔

اس فن کے علماء میں دو کا کبھی کسی ایک ضعیف کے ثقہ ہونے پر یا ایک ثقہ کے ضعیف ہونے پر اتفاق نہیں ہوا ہے۔[3]

---

[1] تانیب ص ۱۵۶۔ [2] الروض الباسم ج ۱ ص ۱۵۸۔ [3] الاعلان بالتوبیخ ص ۱۶۷۔

بادی النظر یہ ایک مبالغہ آمیز دعویٰ ہے لیکن دو سے عدد مراد نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ
ب کا اتفاق مشکل ہے اور یہ ایسا ہے جیسے ہم اُردو میں بولتے ہیں کہ اس مسئلہ پر کبھی دو رائیں
یں ہوئی ہیں۔ یہاں دو سے عدد مراد نہیں اختلاف کی نفی ہے۔ تضعیف و توثیق کے اجتہادی
نے کی وجہ سے حافظ ذہبی نے اس فن میں لب کشائی کرنے والوں کی ایک سے زیادہ
میں قرار دی ہیں۔ فرماتے ہیں ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو تخریج میں متشدد ہیں مگر توثیق
ں معتدل ہیں۔ ایک دو غلطیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں یہ لوگ جب کسی شخص کی توثیق کریں تو
ے دانتوں سے دبا لینا چاہیے اور اگر کسی کی تضعیف کریں تو دیکھنا چاہیے کہ اس معاملہ میں
ں کا کوئی ہمنوا ہے اگر ہے اور اہلِ فن میں سے کسی نے اس کی توثیق نہ کی ہو تو یہ راوی بہرحال
عیف ہے اور اگر کسی نے توثیق کی ہے تو پھر ایسے شخص کے بارے میں جرح مبہم ہرگز قبول
ی جائے[1] اور اسی بنا پر حافظ سخاوی نے امام نسائی کا یہ زریں فیصلہ نقل کیا ہے۔

لا یترك حدیث الرجل حتیٰ یجتمع الجمیع علیٰ ترکہ۔[2]

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ تضعیف و توثیق اگر منصوص نہیں بلکہ اجتہادی ہیں تو اس میں اختلاف
ے کی گنجائش ہے اور جب امام اعظم کے متعلق محدثین نے تصریح کی ہے کہ آپ فنِ جرح و
دیل کے امام ہیں جیسا کہ آپ آئندہ اوراق میں پڑھیں گے۔ تو یہ کہنا کہاں تک درست ہو سکتا
ے کہ امام اعظم کا علمِ حدیث میں پایہ اس لیے کم ہے کہ ان کی روایت کردہ حدیثوں میں کچھ راوی
عیف بھی ہیں۔ یہ تو فکر و نظر کا اختلاف ہے ایک شخص ایک محدث کی نظر میں اگر ضعیف
و ضروری نہیں ہے کہ وہ سب کی نظر میں ضعیف ہو۔ یہ رجال کا سارا دفتر موجود ہے۔ اسے
ٹھا لیے اور دیکھ لیجیے کہ راویوں کے بارے میں ائمہ جرح و تعدیل کیسے کیسے مختلف خیال
کھتے ہیں۔

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں کہ:

> امام اعظم کا مذہب یہ ہے کہ روایت مجہول قابلِ پذیرائی ہے اور
> یہ صرف امام اعظم کا نہیں بلکہ اور بھی بہت سے اکابر کا یہی مسلک
> ہے۔[3]

---

[1] فتح المغیث ص ۴۹۲۔ [2] الرفع والتکمیل ص ۳۳۔ [3] الروض الباسم ج ۱ ص ۱۵۸۔

علمِ اسناد و روایت میں مجہول کا مسئلہ

مجہول کا مسئلہ علمِ اسناد و روایت کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے اس لیے ہم اس کے بارے میں اپنے ناظرین کی ضیافتِ طبع کی خاطر ذراسی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ مجہول کی تعریف خطیب بغدادی نے یہ کی ہے کہ:

> محدثین کی زبان میں مجہول وہ شخص ہے جو علمی طلبگاریوں میں کوئی شہرت نہ رکھتا ہو، جس سے اہلِ علم روشناس نہ ہوں اور اس کی حدیث صرف ایک آدھ راوی کی وساطت سے آئی ہو۔ اگر ایک کی جگہ اس سے روایت کرنے والے دو ہوں تو جہالت تو ختم ہو جائے گی مگر عدالت ثابت نہ ہوگی۔[1]

حافظ ابن الصلاح نے خطیب کی اس تعریف پر اعتراض کیا ہے کہ اگر مجہول وہی ہے جس سے روایت کرنے والا ایک آدھ راوی ہو تو پھر صحیح بخاری میں ایک سے زیادہ ایسی حدیثیں ہیں جن کا راوی ایک کے سوا کوئی نہیں ہے مثلاً مرداس اسلمی کہ ان سے قیس بن حازم کے سوا کوئی اور راوی نہیں ہے۔ مسلم میں بھی ایسی بے شمار حدیثیں ہیں کہ ایک کے علاوہ ان کا راوی کوئی نہیں۔ صحیحین کے مولفین کا یہ طرزِ عمل بتا رہا ہے کہ اگر ایک بھی روایت کنندہ ہو تو مجہول مجہول نہیں رہتا۔

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے خطیب کی تعریف پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محدثین نے راوی کی ذات اور اس کی عدالت کے بارے میں نہ علم کی شرط لگائی اور نہ وہ یہ ضروری قرار دیتے ہیں کہ عدالت کو بتانے والوں کی تعداد درجہ تواتر کو پہنچی ہوئی ہو۔ اگر وہ ایسی کوئی شرط لگاتے تو دلائل ان کا قطعاً ساتھ نہ دیتے اور یہ شرط بے دلیل ہوتی۔ کیونکہ خبرِ واحد ظنی ہوتی ہے اور طبقات میں علمی مقدمات کی شرطیں بے سود اور بے محل ہیں۔ قوتِ دلیل کی روح تو یہی ہے کہ اگر اس سے ایک بھی روایت کرے اور وہ اس کی توثیق کر دے تو راوی سے جہالت کا دھبہ ہٹ جائے گا اور یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ خطیب نے مجہول کی تعریف میں دو چیزیں بلا دلیل اضافہ کر دی ہیں۔ ایک مجہول کی طلبِ علم میں شہرت اور دوسرے اہلِ علم میں سے دو کا اس سے روایت کرنا۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے خطیب اور ابن الصلاح کے اختلاف کا تذکرہ

---

[1] الکفایہ فی علوم الروایت ص ۸۸۔

کر کے خطیب کی ہم نوائی کی ہے اور ابن الصلاح کی بات کو یہ کہہ کر بے وقار کر دیا ہے کہ جن حضرات کو ابن الصلاح نے مثالاً پیش کیا ہے وہ صحابہ ہیں اور صحابہ کی عدالت اتفاقی ہے۔ علامہ نووی بھی سیوطی کے ہم زبان ہیں۔ حافظ عراقی فرماتے ہیں کہ سیوطی اور نووی نے جس تار پر انگلی رکھی ہے یعنی یہ کہ یہ صحابہ ہیں اور صحابہ کی عدالت مسلّم ہے، یہ خود ایک مستقل مسئلہ ہے کہ کیا صحبت کے ثبوت کے لیے صرف ایک کا روایت کرنا کافی ہے یا اس کے لیے ضروری ہے کہ روایت کرنے والے دو ہوں۔ اس سے ہٹ کر پھر بھی بات اپنی جگہ رہتی ہے یعنی اگر غیر صحابی سے روایت کرنے والا ایک ہو تو پھر بھی راوی معروف ہے یا مجہول۔ صحیح بخاری میں خود غیر صحابہ کی ایسی بے شمار مثالیں ہیں جن سے روایت کرنے والے ایک ہیں۔

اگر خطیب ہی کی بات صحیح ہو تو پھر بھی بخاری و مسلم جیسی شخصیتیں بھی اس سے محفوظ نہیں۔ حافظ عسقلانی نے اصل اعتراض کی طرف توجہ نہیں فرمائی صرف عراقی کی مثالوں کی توجیہ کر کے خاموش ہو گئے۔

مجہول کی دو قسمیں

دراصل مجہول کی دو قسمیں ہیں۔ مجہول العین اور مجہول الوصف۔

مجہول الوصف دو طرح کا ہوتا ہے۔

ایک وہ جو ظاہر و باطن میں مجہول العدالۃ ہو۔ دوسرے وہ جو باطن میں مجہول اور ظاہر میں معروف ہو۔ ان میں ہر ایک کا حکم الگ الگ ہے۔

حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں — مجہول محدثین کے یہاں چند قسموں پر منقسم ہے۔

مجہول العدالۃ ظاہراً و باطناً۔ اس کی روایت جماہیر محدثین کے نزدیک نا قابلِ قبول ہے دوسرا وہ جو باطن میں مجہول العدالۃ ہو مگر ظاہر میں معروف ہو اسی کا نام محدثین کی زبان میں مستور ہے۔ اس کی روایت قابلِ قبول ہے۔ امام سلیم رازی کی بھی یہی رائے ہے اور حدیث کے مشہور مؤلفین کا راویوں کے بارے میں اسی رائے پر عمل بھی ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں کہ اگر راوی ظاہراً و باطناً مجہول العدالۃ ہو تو جمہور کے نزدیک اس کی روایت نا قابلِ قبول ہے مگر محدثین ہی کی ایک جماعت اسے قبول کر لیتی ہے۔ روایتِ مستور کچھ محدثین کے یہاں قابلِ قبول ہے۔ ابن الصلاح نے اسی کو اپنایا ہے اسے اور نووی نے شرح المہذب میں اسی کی تصحیح کی ہے۔

جمال الدین رسنوی فرماتے ہیں جب کسی شخص کے بارے میں بلوغ اور اسلام کا علم ہو جاتے اور اس کی عدالت کا پتہ نہ ہو تو اس کی روایت قابلِ اعتماد نہیں ہے جیسا کہ امام شافعی فرماتے ہیں اور امام ابوحنیفہ کا فیصلہ ہے کہ ایسے شخص کی روایت قابلِ پذیرائی ہے لیکن ضروری ہے کہ وہ اپنے فسق میں معروف نہ ہو کیونکہ معروف الفسق بالاجماع مردود ہے۔

ابن السبکی نے جمع الجوامع میں لکھا ہے کہ مستور کی روایت امام ابوحنیفہ کے نزدیک قابلِ قبول ہے اور دوسرے محدثین کا خیال اس کے برعکس ہے۔

صاحب فواتح الرحموت فرماتے ہیں کہ مستور کی روایت جمہور کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے لیکن امام ابوحنیفہ نے غیر ظاہر روایت میں اس کو قبول کیا ہے یہی ابن خلکان کا مختار ہے۔

اختلاف عصر و زمان

اگرچہ ہمارے لئے یہ مسئلہ اختلاف عصر و زمان سے تعلق رکھتا ہے جن کے زمانے میں جو بن عدالت غالب ہے وہ مستور کی روایت کو قبول کرتے ہیں۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے امام اعظم کے دور کے بارے میں لکھا ہے:

ولا شك ان الغالب على حملة العلم النبوي في ذالك الزمان العدالة۔

اسی لیے موصوف نے العواصم، الروض الباسم اور تنقیح الانظار میں اور امیر محمد بن اسماعیل یمانی نے توضیح الافکار میں لسے پوری وضاحت اور دلائل سے ثابت کیا ہے مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ اس مسئلہ کی اساس یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں عدل اصل ہے یا فسق؟ اور اگر عدل ہی اصل ہے تو پھر عدالت کیا ہے؟

حافظ ابن تیمیہ نے عدالت کو بھی اختلاف عصر و زمان کا مسئلہ قرار دیا ہے جیسا کہ الجزائری نے ان سے نقل کیا ہے ان کا پہلا فقرہ ہی یہ ہے۔

العدل في كل زمان ومكان وقوم بحسبه

الغرض یہ موضوع بڑا طویل الذیل ہے کچھ ہر اتنی بات اتفاقی ہے کہ راوی کے لیے عدالت شرط ہے اور کفر مانع روایت ہے۔ کلام صرف اس میں ہے کہ جن کی عدالت کا علم نہ ہو اس پر فیصلہ کن بات یہی ہے کہ اگر راوی اس دور سے تعلق رکھتا ہو جس میں عدالت غالب ہو تو اس

کی روایت قابلِ اعتماد ہوگی۔ فخر الاسلام لکھتے ہیں:

لان العدالة اصل فی ذالك الزمان[1]

امام اعظم کا زمانہ عدالت کا زمانہ ہے حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں:

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ زمانہ امام اعظم میں راویوں پر عدالت
غالب تھی اور اس کی شہادت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے اس ارشاد سے ملتی ہے خیر القرون قرنی ثم الذین
یلونھم ثم الذین یلونھم[2]

امام اعظمؒ کی ضعفا سے روایت ان کی تعدیل ہے

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امام احمد کو اگر کسی مسئلہ پر حدیث صحیح نہ ملتی تھی تو ضعیف ہی پر عمل کرتے تھے اور اپنے مسند میں بھی اس قسم کی حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ امام موصوف کا یہ طرزِ عمل حدیث سے ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ غایتِ احتیاط کی وجہ سے ہے۔ حافظ ابن مندہ فرماتے ہیں کہ امام ابوداؤد کو جب کسی موضوع پر کوئی صحیح حدیث نہ ملتی تو ضعیف راویوں سے روایت لیتے ہیں (الروض الباسم) ان محدثین کا یہ طرزِ عمل اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ ضعیف راویوں سے روایت لینا علم حدیث سے ناواقف ہونے کی نہیں بلکہ فن کار ہونے کی علامت ہے۔ جس حدیث کو یہ اکابر روایت کرتے ہیں اور جن کے راویوں کو ضعیف کہا جاتا ہے۔ یہ راوی کذاب اور فاسق نہیں ہیں اور نہ ان کی روایات کا درجہ باطل، موضوع، ساقط اور متروک کا ہے۔ ضعیف وہ کہلاتی ہے جس کا راوی صادق تو ہو مگر حافظہ اور ضبط کی دولت سے مالامال نہ ہو یا روایت کے رفع میں یا اسناد میں اضطراب ہو۔ یہی وہ حدیث ہے جس کے بارے میں علماء کے خیالات مختلف ہیں۔ اس میں تضعیف کا مدار راوی کا حافظہ ہے اس لیے امام اعظم کا ضعفا سے روایت لینا فن ناآشنائی نہیں بلکہ فن کار ہونے کی دلیل ہے۔

بات آئندہ اوراق میں تفصیل سے آئے گی کہ امام اعظم صرف فقہ و حدیث کے امام نہیں بلکہ امام الجرح والتعدیل بھی ہیں اس لیے جن راویوں سے امام اعظم روایت کرتے ہیں۔ یہ ان

---

[1] اصول فخر الاسلام [2] الروض الباسم ص ۱۶۲۔

راویوں کی تعدیل ہے بعد میں آنے والے لوگوں نے اگر امام موصوف سے اپنے علم کی بنا پر ان راو
کے بارے میں جرح کر کے اختلاف کیا ہے تو یہ ایسی کوئی وزنی بات نہیں ہے جس کو حدیث
ناواقفیت کی بنیاد قرار دیا جاتے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے اسے ذرا کھول کر سمجھایا ہے۔

جن راویوں سے امام اعظم نے روایات لی ہیں اور ان میں سے جن کی
تضعیف کی گئی ہے ان کا ضعف اختلافی ہے اور ان کے بارے میں
امام اعظم کا مسلک یہ ہے کہ یہ ضعیف نہیں ہیں اس لیے ان سے روایت
میں کوئی قباحت نہیں اور اس معاملے میں امام اعظم منفرد نہیں ہیں
دوسرے محدثین کا بھی طرز عمل کچھ ایسا ہی ہے اور تو اور امام بخاری
اور مسلم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ امام احمد کی حدیث میں جلالت
شان سے کون واقف نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ ضعیف
راویوں سے حدیثیں روایت کرتے ہیں [1]

بلکہ خود امام بخاری بھی ایسے حضرات سے روایت کرتے ہیں جن کی توثیق و تضعیف خود ائمہ ح
کے نزدیک اختلافی ہے۔ حسن بن عمارہ کے حوالہ سے صحیح بخاری کی کتاب المناقب میں حد
موجود ہے حالانکہ بتلانے والوں نے بتایا ہے کہ:

اطبقوا علیٰ ترکہ۔ [2]

ایک اور راوی اسید بن الجمال ہیں۔ ان سے امام بخاری نے کتاب الرقاق میں ایک حد
روایت کی ہے مگر ان کا حال یہ ہے کہ نسائی متروک کہتے ہیں۔ یحییٰ بن معین نے ان پر جھوٹی ح
بنانے کی تہمت لگائی ہے۔ حافظ ابن حبان کا دعویٰ ہے کہ یہ نہ صرف مناکیر لاتا ہے بلکہ اجا
کی چوری بھی کرتا ہے حتیٰ کہ مقدمہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے صاف لکھ دیا ہے کہ:

لم ار لاحد توثیقاً۔ [3]

اور امام مسلم اپنی صحیح میں لیث بن سلیم جیسے ضعیف راویوں سے حدیث لاتے ہیں۔ ا
بنیاد پر کیا کوئی عقل مند امام بخاری اور امام مسلم کو علم حدیث سے بے بہرہ اور نا آشنائے فن کہہ
ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ انصاف۔ انصاف۔

---

[1] الروض الباسم ج ا ص ۱۶۲۔ [2] مقدمۃ فتح الباری۔ [3] مقدمۃ فتح الباری۔

ذرا معاملے کے اس پہلو پر بھی غور فرمائیے کہ امام اعظم کے یہاں قرآن کے بعد اصل چیز سنت ہے
سائل کے اثبات کے لیے وہ سنت ہی کو استعمال کرتے ہیں اور سنت ہی کو وہ احادیث کی
ت کا معیار قرار دیتے ہیں اور جو حدیث سنت کے خلاف ہو اسے وہ شاذ قرار دیتے ہیں ۔
بہ امام ابو یوسف ایک مقام پر اس معیار کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں :

> احادیث میں بہتات ہو رہی ہے اور ایسی روایات نمایاں ہو رہی
> ہیں جو نہ معروف ہیں نہ ان کو فقہاء جانتے ہیں اور نہ وہ قرآن و
> سنت کے موافق ہیں اس لیے ایسی شاذ روایات سے بچ کر رہو
> اور ان حدیثوں کو اپناؤ جن کی پشت پر جماعتی عمل کی تائید ہو جو فقہاء
> کے یہاں معروف ہوں اور جو کتاب و سنت کے موافق ہوں [1]

ف روایات کا درجہ شواہد اور توابع کا ہے

اگر ایک مسئلہ امام اعظم کے یہاں سنت سے اس دور میں ثابت ہے جبکہ امام ذہبی کی تصریح کے
ت السنن مشھورۃ والبدع مکبوبتہ ۔ سنتیں معاشرے میں عام ہیں تو پھر ان
یث کی حیثیت امام اعظم کے یہاں صرف توابع اور شواہد کی ہے ۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر
نے ہیں :

> امام اعظم نے ضعفاء سے جو روایات لی ہیں ان کا درجہ شواہد اور متابعات
> کا ہے ورنہ نفس مسئلہ تو قرآنی عموم ، سنت یا قیاس سے ثابت ہے
> ثابت شدہ مسائل کے لیے ان روایات کو بطور شواہد پیش فرمایا
> ہے ۔ یہی طرز عمل امام مالک کا بھی ہے ۔ چنانچہ امام موصوف نے
> عبدالکریم بن ابی المخارق البصری کی روایت سے استدلال کیا ہے ۔
> حافظ ابن عبدالبر تمہید میں رقمطراز ہیں کہ عبدالکریم کا مجروح ہونا اتفاقی
> ہے ۔ ایسے ہی امام شعبہ نے باوجود جلالت قدر کے ابان بن ابی
> عیاش سے روایت لی ہے حالانکہ موصوف نے خود ابان کی پوزیشن

---

[1] الرد علی سیر الاوزاعی ۔

یہ بیان کی ہے کہ ان کی روایت کے مقابلے میں مجھے گدھے کا پیشاب پی لینا گوارا ہے۔ امام سفیان ثوری نے بعض لوگوں کے بارے میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ ان سے روایت نہ لی جائے اور جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ تو ان سے روایت لیتے ہیں۔ فرمایا میں ان ہی احادیث کی ان سے روایت کرتا ہوں جن سے میں خود واقف ہوں۔ امام مسلم کی صحیح کو اٹھا کر دیکھیے وہ گاہ گاہ علو اسناد کی خاطر صحیح سند کو چھوڑ کر ضعیف سند سے روایت لیتے ہیں۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ علم حدیث کے فن کاروں کا ضعفاء سے روایت لینا ناآشنائے فن ہونے کی نہیں بلکہ امام فن ہونے کی علامت ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس بنیاد پر امام اعظم کو ناآشنائے فن قرار دیتے ہیں۔ وہ خود علم حدیث کی گہرائیوں سے ناآشنا ہیں اگر ان کو فنی واقفیت ہوتی تو ان کی زبان قلم پر ایسی غیر ذمہ دارانہ بات ہرگز نہ آتی۔ یہاں بھی حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر پتے کی بات فرما گئے ہیں:

امام اعظم اس فن کے مشہور حفاظ میں سے تھے۔ صرف اتنی بات ہے کہ عمر رسیدہ ہونے کے بعد آپ کے حافظہ میں پہلے جیسی قوت نہ تھی اور آخر عمر میں حافظہ میں قوت نہ رہنا صرف امام اعظم کی خصوصیت نہیں ہے اس میں دوسرے ائمہ بھی امام اعظم کے شریک ہیں۔ یہ نہ کوئی عیب ہے اور نہ ان کی شان اجتہاد اور محدثانہ مقام پر کوئی حرف ہے۔ امام الحسن البصری، ابوقلابہ، ابوالعالیہ اور امام عطاء کے مقابلے میں سعید بن المسیب، محمد بن سیرین اور ابراہیم نخعی کی حدیثیں زیادہ صحیح ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے سوا اوروں کا علم مخدوش ہے امام اعظم کی احادیث پر جن محدثین نے کلام کیا ہے اس کا منشا بھی قوت حفظ ہے۔ نادان سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے علم حدیث اور اجتہاد پر حرف گیری ہے۔ زیادہ سے زیادہ

---

[1] الروض الباسم ج ۱ ص ۱۶۹۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مقابلے میں فلاں کا حافظہ تیز ہے[1]
لیکن صرف حافظہ کی قوت نہ سرمایہ فضیلت ہے اور نہ علمی تفوق و
برتری کی نشانی ہے آخر صحابہ میں ابوہریرہ سے زیادہ حافظِ حدیث
کون ہوگا لیکن صحابہ میں اعلم، افقہ اور افضل حضرت ابوہریرہ نہ تھے[2]

حافظہ پر حافظ ابن القیم نے الوابل الصیب میں ایک مفید اور کار آمد نصیحت لکھی ہے
فرماتے ہیں:

حضرت ابن عباس اور حضرت ابوہریرہ کا باہم فتاویٰ میں کیا مقابلہ
— حضرت ابوہریرہ بے شک حافظِ حدیث ہیں اور تمام اُمت
میں علی الاطلاق حافظ ہیں حدیث کو جیسے سُنا بیان کر دیا۔ ان کی
ساری تگ و دو کا مرکز صرف حفظِ روایات تھا۔ برخلاف حضرت
ابن عباس کے کہ ان کی تمام تر ہمت تفقہ اور استنباطِ مسائل پر
مرکوز تھی[3]

اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس حبر الامۃ اور ترجمان ہیں مگر ان کی ساری ان
حدیثوں کی تعداد جن میں دید وشنید کی تصریح ہے شاید بیس سے زیادہ نہ ہو لیکن حدیث و
قرآن سے ان کے فقہ و استنباط کا حال یہ ہے کہ ان کے علم و تفقہ سے دُنیا بھرپور ہے۔ حافظ
ابن حزم نے دعویٰ کیا ہے۔

---

[1] واضح رہے کہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر کے اس فکر کی بنیاد کہ عمر رسیدہ ہونے پر حافظہ میں پہلے جیسی
قوت نہ رہی تھی اس پر ہے کہ موصوف کی تحقیق میں امام اعظم نے نوّے سال سے زیادہ عمر پائی ہے
چنانچہ لکھتے ہیں وقد جاوز التسعین فی العمر، شاید حافظ صاحب موصوف امام اعظم کی ولادت ابن زواد کی روایت
کے مطابق ۶۱ھ مانتے ہیں سمعانی نے انساب میں ۸۰ھ لکھا ہے۔ ابن حبان کی کتاب الجرح والتعدیل
اور ابوالقاسم سمنانی کے روضۃ الصفا میں بھی یہی تاریخ ولادت ہے بلا ریب ولادت اگر ۶۱ھ اور
وفات ۱۵۰ھ ہے تو عمر نوّے سال ہوتی ہے۔ بعض محدثین کے نزدیک راجح یہی ہے۔

[2] الروض الباسم ج ۱ ص ۱۶۹۔

[3] الوابل الصیب ص ۲۸۔

جمعت فتاواہ فی سبعۃ اسفار کبار

حالانکہ جس طرح اور لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا حضرت ابن عباس نے بھی سُنا یہاں الجزائری نے جو امام ترمذی سے اسی موضوع پر نقل کیا ہے وہ بھی نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے فرماتے ہیں:

کچھ محدثین نے اجلّہ اہل علم پر کلام کر دیا ہے اور صرف حافظہ کی بنا پر ان کی تضعیف کی ہے اگرچہ اوروں نے ان کی جلالت شان اور صداقت کے پیش نظر ان کی توثیق کی ہے[1]

الجزائری نے یہ نقل کرنے کے بعد جو اس کے متعلق آخری بات بتائی ہے وہ بھی سُن لیجئے:

لَمْ يَسْلَمْ مِنَ الْخَطَاءِ وَالْغَلَطِ اَحَدٌ مِّنَ الْاَئِمَّةِ مَعَ حِفْظِهِمْ[2]

خطا اور غلطی سے کوئی پاک نہیں

یہ واقعہ ہے کہ علم و تحقیق کے میدان میں غلطی اور خطا کے دھبے کچھ نہ کچھ سب کے دامنوں پر ہیں حافظ ذہبی نے سچ لکھا ہے:

انا لا ندعی العصمۃ من السھو والخطاء فی الاجتھاد فی غیر الانبیاء[3]

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ امام ابو زرعہ اور امام ابو حاتم نے تاریخ و رجال کے سلسلے میں امام بخاری کی بہت سی غلطیاں نکالی ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن ابی حاتم نے امام بخاری کے تاریخی اوہام پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام "کتاب خطاء البخاری" ہے۔ اس کتاب میں ابن ابی حاتم نے ان دونوں حضرات سے بیشتر استفادہ کیا ہے۔ حافظ زین الدین عراقی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

جمع فیہ اوھامہ فی التاریخ

علامہ سخاوی فرماتے ہیں:

لابن ابی حاتم جزء کبیر عندی انتقد فیہ علی البخاری[4]

---

[1] توجیہ النظر [2] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۔ ایسے ہی خطیب نے لکھا ہے لم یکونوا معصومین من الزلل و آمنین مفارقۃ الخطاء والخطل (موضح اوہام الجمع والتفریق ج ۱ ص ۶)

[3] التقیید والایضاح لما اطلق واغلق من مقدمۃ ابن الصلاح ص ۱۲۴ [4] الاعلان بالتوبیخ ص ۱۱۰۔

خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

قد جمع عبدالرحمٰن بن ابی حاتم الرازی الاوہام التی اخذ ابو
زرعۃ فی کتاب مفرد[1]

وجہ یہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی کتاب بالکل نو عمری میں مرتب کی تھی جب کہ امام موصوف کی
رف اٹھارہ سال تھی اس لیے اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے
م موصوف کو ایسے نوشتوں سے نقل کرنے پڑے کہ جن پر نہ نقطے لگے ہوئے تھے۔ اور نہ
ضبط کیا گیا تھا۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے ابو علی صالح بن محمد کے بارے میں لکھا ہے کہ:

ایک بار ابو زرعہ رازی نے ان سے فرمایا کہ اے ابو علی! اسماء الرجال پر
محمد بن اسماعیل بخاری کی کتاب میری نظر سے گزری اس میں تو بڑی
غلطیاں ہیں میں نے ان سے عرض کیا مصیبت یہ ہے کہ ان کے پاس
بخارا کا جب کوئی شخص عراق سے ہو کر آتا تھا یہ اس کی کتاب لے کر
دیکھتے تھے۔ اہل بخارا کی عادت ہے کہ نہ تو وہ اسماء کو ضبط کرتے ہیں
اور نہ ان پر نقطے لگاتے ہیں۔ لہٰذا جب ان کی نظر سے کوئی ایسا نام گزرتا
کہ جس سے یہ پہلے واقف نہ ہوتے اور نہ وہ ان کی اپنی کتابوں میں
موجود ہوتا تو یہ اسے غلط طور پر اپنی کتاب میں نقل کر دیتے۔ ورنہ
خراسانیوں میں ان سے زیادہ سمجھدار میں نے کسی کو نہیں پایا۔[2]

خطیب بغدادی نے موضح اوہام الجمع والتفریق میں امام بخاری کے ان اوہام و اغلاط کا تفصیلی
رہ کیا ہے۔ اور کتاب مذکور میں ۲۱۲ صفحات اسی تذکار پر مشتمل ہیں۔ مگر نہایت افسوس ہے
مام بخاری کے بعض حامیوں نے بجائے اس کے کہ ان تنقیدات و تعصبات کا کوئی علمی اور تحقیقی جواب
ے۔ امام ابو زرعہ، امام ابو حاتم اور امام مسلم پر نہایت ہی گری ہوئی زبان میں حملے کیے اور الزامات
ئے۔ چنانچہ کہنے والے یہاں تک کہہ گئے۔

تاریخ میں محمد بن اسماعیل کی کتاب ایسی ہے کہ اس پر کوئی کتاب سبقت
نہ لے جا سکی اور ان کے بعد جس نے بھی تاریخ یا اسماء الرجال پر کچھ

---

۱ موضح اوہام الجمع والتفریق ج ۱ ص ۸۔ ۲ موضح اوہام الجمع ج ۱ ص ۷۔ تہذیب التہذیب ترجمہ امام بخاری

لکھا ہے وہ اس سے بے نیاز نہیں ہے کچھ لوگوں نے اس کتاب کو اپنی
ہی بنالیا ہے جیسے ابوزرعہ، ابوحاتم اور مسلم۔ اور کچھ نے ان کے حوالے سے
نقل کیا ہے۔

یہ حاکم کبیر کی رائے ہے جسے علامہ تاج الدین السبکی نے الطبقات الشافعیۃ الکبریٰ میں ان کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ حاکم کبیر کو زیادہ غصہ امام مسلم پر ہے وہ فرماتے ہیں:

جو شخص بھی امام مسلم کی کتاب الاسماء والکنیٰ کا غور سے مطالعہ کرے گا۔
اسے پتہ لگ جائے گا کہ امام مسلم کی کتاب بالکل امام بخاری کی کتاب
کی کاپی ہے۔

لیکن یہ حاکم کبیر کی غلطی اور محض بدگمانی ہے جو سرتاسر واقعہ کے خلاف ہے۔ تعجب ہے کہ کچھ بزرگوں نے خود امام بخاری پر بھی یہی الزام لگایا ہے چنانچہ ان ہی حاکم کبیر کے معاصر حافظ مُسلمہ بن قاسم اندلسی کتاب الصلہ میں لکھتے ہیں کہ:

امام بخاری نے اپنے استاد علی بن المدینی کی کتاب العلل کو ان کی
غیر حاضری میں ان کے صاحبزادے کو مال کی طمع دے کر حاصل کیا اور
پھر اسی کتاب کی عبارتوں کو اپنی طرف سے علی بن المدینی کے
سامنے پیش کرتے رہے اور آخر اسی کی وجہ سے درس سے بے نیاز
ہوکر خراسان کی راہ لی۔

یہ واقعہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے۔

فن جرح و تعدیل اور اسماء الرجال میں امام ابوزرعہ، ابوحاتم اور امام مسلم کا جو پایہ ہے اس کو دیکھتے ہوئے ان بزرگوں کی نسبت اس قسم کی خیانت علمی اور سرقہ کا کون گمان کر سکتا ہے غور فرمایئے تاریخ و رجال میں راویوں کے نام ان کے شیوخ و تلامذہ، اوطان، سنین ولادت و وفات اور جرح و تعدیل کا بیان ہوتا ہے۔ اب راویوں کے نام وہی، شیوخ و تلامذہ وہی، وطن وہی، سنین ولادت و وفات وہی اور جرح و تعدیل میں اکثر و بیشتر اتفاق رائے۔ پھر ایسی صورت میں جب کہ یہ سب امور یکساں اور متحد ہیں معاصرین ائمہ فن کی تصنیفات میں اکثر و بیشتر معلومات کا ایک جیسا ہو جانا کون سے تعجب کی بات ہے۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ ان ائمہ نے اپنی تصانیف میں امام بخاری کی تاریخ کو اپنے سامنے رکھا ہے

ورنہ ظاہر ہے کہ اگر کتاب سامنے نہ ہوتی تو تنقید کس پر کرتے بلکہ ترتیب بھی وہی اختیار کی ہے اور اسی لیے حاکم کبیر کو شبہ ہوگیا کہ امام مسلم وغیرہ امام بخاری کی کتاب کو اپنے نام سے منسوب کر رہے ہیں چنانچہ خطیب بغدادی ان ہی حاکم کبیر سے ناقل ہیں :

مجھ سے حاکم کبیر ابو احمد محمد بن محمد نیشاپوری کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں رَے میں تھا کہ ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ لوگ ابو محمد بن ابی حاتم کے پاس کتاب الجرح والتعدیل پڑھ رہے ہیں پھر جب وہ پڑھنے سے فارغ ہوئے تو میں نے ابن عبدویہ وراق سے کہا کہ یہ کیا ہنسی کر رکھی ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ محمد بن اسمٰعیل بخاری کی کتاب التاریخ کو اس کتاب کی شکل میں اپنے استاد کے سامنے پڑھ رہے ہو حالانکہ تم اسے ابوزرعہ اور ابوحاتم کی بتاتے ہو۔ اس پر وراق نے کہا کہ اے ابو احمد تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس وقت ابوزرعہ اور ابوحاتم کے پاس یہ کتاب لائی گئی تو ان بزرگوں نے کہا کہ یہ علم خوب ہے اس سے بے پروائی نہیں برتی جا سکتی اور ہم لوگوں کے لیے یہ زیبا نہیں کہ ہم اسے دوسرے سے نقل کریں اس لیے ان دونوں حضرات نے ابو محمد عبدالرحمٰن رازی کو بٹھایا۔ وہ پیچھے بعد دیگرے ایک ایک راوی کے متعلق ان سے پوچھتے گئے اور پھر یہ دونوں حضرات کہیں اس کتاب سے زیادہ اور کہیں اس سے کم بیان کرتے چلے گئے اور اسے عبدالرحمٰن نے ان دونوں کی طرف منسوب کر دیا۔[1]

حاکم کبیر کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ امام بخاری کی تاریخ امام ابوزرعہ اور امام ابو حاتم کے سامنے آئی ان بزرگوں کے علمی جلال نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ان کے وطن کا علمی معاشرہ اس فن میں باہر کا دست نگر رہے۔ انہوں نے اسی ڈھنگ اور اسی اسلوب پر عبدالرحمٰن رازی کو ایک مستقل کتاب املا کرائی جو معلومات کے سرمایہ میں امام بخاری کی کتاب سے زیادہ ہے۔

---

[1] موضح اوہام الجمع والتفریق ج ۱ ص ۸۔

اسی کتاب کا نام الجرح والتعدیل ہے۔ امام ذہبی رقمطراز ہیں :

کتاب فی الجرح والتعدیل یقضی لہ بالمرتبۃ العلیا فی الحفظ۔[1]

بہرحال خطا اور غلطی سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے اور خطا اور غلطی سے فن آشنائی پر کوئی حرف نہیں آتا۔

خیر یہ بات توضیحی تھی۔ گفتگو تو امام اعظم کے اساتذہ کے متعلق ہو رہی تھی اور درمیان میں یہ بات آگئی تھی کہ کہنے والے کہتے ہیں کہ :

۱۔ امام اعظم نے مجاہیل سے روایت کی ہے۔

۲۔ امام اعظم نے ضعفاء سے روایت کی ہے۔

۳۔ امام اعظم کے حافظہ میں قوت نہ رہی تھی۔

اس لیے امام اعظم کا علم حدیث میں کوئی مقام نہیں ہے ان ہی وساوس اور ہواجس کو دُور کرنے کی میں نے ان صفحات میں کوشش کی ہے۔

تذکرۃ الحفاظ میں امام اعظمؒ کے مشائخ

آئیے اب امام اعظم کے مشائخ میں ان اکابر پر ایک نظر ڈال لیجیے جن کو حافظ ذہبی نے حفاظِ حدیث میں شمار کیا ہے۔

۱۔ ایوب بن ابی تمیمہ ابوبکر السختیانی	طبقہ رابعہ	سنہ ۱۳۱ھ
۲۔ الحکم بن عتیبہ ابومحمد الکوفی	"	سنہ ۱۱۵ھ
۳۔ ربیعہ بن عبدالرحمٰن	"	سنہ ۱۳۶ھ
۴۔ زید بن ابی انیسہ	"	سنہ ۱۲۵ھ
۵۔ سالم بن عبداللہ	طبقہ ثالثہ	سنہ ۱۰۶ھ
۶۔ شیبان بن عبدالرحمٰن ابومعاویہ	طبقہ خامسہ	سنہ ۱۶۴ھ
۷۔ طاؤس بن کیسان ابوعبدالرحمٰن الیمانی	طبقہ ثالثہ	سنہ ۱۰۶ھ
۸۔ عامر الشعبی ابوعمر الہمدانی	"	سنہ ۱۱۰ھ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ترجمہ ابن ابی حاتم

۹۔ عبداللہ بن دینار ابو عبدالرحمٰن	طبقہ رابعہ	سنہ ۱۲۷ھ
۱۰۔ عبدالرحمٰن بن ہرمز	طبقہ ثالثہ	سنہ ۱۱۷ھ
۱۱۔ عبدالملک بن عمیر	"	سنہ ۱۳۶ھ
۱۲۔ عطاء بن ابی رباح	"	سنہ ۱۱۴ھ
۱۳۔ عطاء بن یسار	"	سنہ ۱۱۳ھ
۱۴۔ عکرمہ مولیٰ ابن عباس	"	سنہ ۱۰۷ھ
۱۵۔ عمرو بن دینار الحافظ ابو محمد	طبقہ رابعہ	سنہ ۱۲۶ھ
۱۶۔ عمرو بن عبداللہ ابو اسحاق	"	سنہ ۱۲۷ھ
۱۷۔ القاسم بن معن بن عبدالرحمٰن	طبقہ خامسہ	سنہ ۱۷۵ھ
۱۸۔ قتادہ بن دعامہ	"	سنہ ۱۱۷ھ
۱۹۔ مبارک بن فضالہ القرشی	"	سنہ ۱۶۴ھ
۲۰۔ محمد بن المنکدر ابو عبداللہ القرشی	"	سنہ ۱۳۰ھ
۲۱۔ مسلم بن قدوس ابو الزبیر المکی	طبقہ رابعہ	سنہ ۱۲۸ھ
۲۲۔ محمد بن مسلم بن شہاب الزہری	"	سنہ ۱۲۴ھ
۲۳۔ منصور بن المعتمر ابو عتاب الکوفی	"	سنہ ۱۳۲ھ
۲۴۔ نافع مولیٰ ابن عمر ابو عبداللہ	طبقہ ثالثہ	سنہ ۱۱۷ھ
۲۵۔ ہشام بن عروہ القرشی	طبقہ رابعہ	سنہ ۱۴۶ھ
۲۶۔ یحییٰ بن سعید الانصاری	"	سنہ ۱۴۳ھ

یہ وہ حفاظِ حدیث ہیں جن کے تراجم حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھے ہیں۔

تذکرۃ الحفاظ کا مقام

یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہے اور دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی ہے یہ صحابہ سے لے کر امام ذہبی کے زمانے تک کے حفاظِ حدیث کا تذکرہ ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

هذه تذكرة باسماء معدلي حملة العلم النبوي ومن يرجع الى
اجتهادهم في التوثيق والتضعيف والتصحيح والتزييف۔

یہ ان حاملانِ علم نبوی کا تذکرہ ہے جن کی بارگاہِ علم سے راویانِ حدیث کو ثقاہت اور عدالت کا سرٹیفکیٹ ملتا ہے اور جن کی رائے راویوں کے ثقہ ہونے، ضعیف ہونے، کھرا ہونے اور کھوٹا ہونے میں فیصلہ کن ہے۔

حافظ صاحب نے اس کتاب میں یہ اصول پیشِ نظر رکھا ہے اور اس کتاب میں کسی ایسے شخص کا تذکرہ نہیں کیا جس میں ان کی بیان فرمودہ حیثیت موجود نہ ہو بلکہ کم از کم درجے میں کسی ایسے شخص کا بھی ترجمہ نہیں لکھا جو عالم فقیہ ہونے کے باوجود حافظ نہیں ہے۔ چنانچہ خارجہ بن زید اگرچہ فقہاءِ سبعہ میں سے ہیں مگر ان کے متعلق صاف لکھ دیا۔

إِنَّهُ قَلِيلُ الْحَدِيثِ فَلِهٰذَا لَمْ اَذْكُرْهُ فِي الْحُفَّاظِ[1]

یہ قلیل الحدیث ہیں اسی لیے میں نے ان کا حفاظ میں تذکرہ نہیں کیا۔

اسی طرح امام ذہبی نے اس کتاب میں ان لوگوں کا بھی تذکرہ نہیں کیا جو اگرچہ حافظِ حدیث تھے مگر اربابِ حدیث کی بارگاہ میں متروک الروایہ خیال کیے جاتے تھے چنانچہ ہشام بن محمد کلبی کے بارے میں جو بہت بڑے محدث اور حافظ تھے لکھتے ہیں:

هشام بن محمد الكلبي الحافظ احد المتروكين ليس بثقة فلهذا لم ادخله بين حفاظ الحديث[2]

یہ متروک ہیں، ثقہ نہیں ہیں اسی لیے میں نے ان کو حدیث کے حفاظ میں داخل نہیں کیا۔

ان تصریحات سے آپ کے سامنے یہ نتائج خود بخود آجائیں گے۔

الف: امامِ اعظم کے تمام اساتذہ ان ائمہ حدیث میں سے ہیں جن کی حیثیت صرف محدث کی نہیں بلکہ ان معدلین کی ہے جن کی گرامی قدر رائے راویانِ حدیث کی توثیق و تضعیف میں محدثین کے یہاں میزان و معیار ہے۔

ب: یہ قلیل الحدیث نہیں بلکہ کثیر الحدیث ہیں۔ اگر یہ قلیل الحدیث ہوتے تو پھر امام ذہبی ان کا ذکر نہ کرتے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۸۲ [2] تذکرۃ الحفاظ

یہ :۔ یہ وہ حفاظ ہیں جن کا مقام علم حدیث میں اعتباری اور استدلالی ہے اگر وہ متروک ہوتے تو مسلم کی طرح تذکرۃ الحفاظ ان کے تراجم سے خالی ہوتا۔ اور اگر ایک طرف ان تصریحات سے امام اعظم کے اساتذہ کے متعلق یہ ثابت ہو رہا ہے تو دوسری طرف خود امام اعظم کے بارے میں بھی یہ حقائق بے نقاب ہو کر سامنے آگئے ۔

امام اعظم کا حفاظِ حدیث میں مقام

اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ امام اعظم کا ترجمہ تذکرۃ الحفاظ میں موجود ہے تو پھر امام ذہبی کے اصول کے مطابق امام اعظم کی ذات گرامی ارباب حدیث کے نزدیک ان معدلین رواۃ کی ہے جن کی رائے پر راویوں کی ثقاہت، عدالت اور صداقت کا فیصلہ ہوتا ہے اور یہ صرف نظریہ نہیں ہے بلکہ عمل کی دنیا میں امام ذہبی نے اسے واقعہ بنا کر پیش کیا ہے چنانچہ فقیہ مدینہ حضرت عبداللہ بن ذکوان مدنی کے متعلق تذکرہ میں جہاں سفیان ثوری نے امام احمد سے توثیق کے الفاظ نقل کیے ہیں وہاں سب سے پہلے امام اعظم کے الفاظ کو نمایاں طور پر پیش کر کے فقیہ مدنی کی تعدیل کی ہے ۔

قال ابو حنیفۃ رأیت ربیعۃ وابا الزناد وابو الزناد افقہ الرجلین ۔

ابو حنیفہ نے کہا ہے کہ میں نے ربیعہ اور ابو الزناد دونوں کو دیکھا ہے لیکن ابو الزناد زیادہ فقیہ ہیں ۔

امام جعفر الصادق کی ذات گرامی سے کون واقف نہیں ہے نامی گرامی شخصیت ہیں۔ امام مالک، سفیان ثوری جیسے اساطین حدیث کے استاد ہیں۔ امام ذہبی نے جہاں ان کی توثیق بعد کے محدثین سے نقل کی ہے تو وہاں پہلے امام اعظم کی جانب سے ان کو عدالت کا سرٹیفکیٹ ان الفاظ میں پیش کیا ہے ۔

عن ابی حنیفۃ قال ما رأیت افقہ من جعفر بن محمد

بالفاظ دیگر امام ذہبی نے امام اعظم کی معدلانہ حیثیت کو خود اپنے عمل سے علی رؤس الاشہاد ثابت کر دیا اور بتا دیا کہ یہ صرف فکر و نظر کا تراشا ہوا پیمانہ نہیں بلکہ امر واقعہ ہے۔ اور اگر یہ حقیقت ہے کہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں غیر ثقہ اور متروکین میں سے کسی کا تذکرہ نہیں کیا جیسا کہ

خود آپ امام ذہبی سے سن چکے ہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ امام ذہبی کی میزان الاعتدال میں امام اعظم
تذکرہ الحاقی ہے جیسا کہ پہلے آپ تفصیلاً پڑھ چکے ہیں۔ اور امام ذہبی کے تذکرۃ الحفاظ میں
التزام نے کہ قلیل الحدیث کو تذکرے میں جگہ نہ دی جائے گی یہ بات بھی صاف کر دی اور اسے
بنا دیا کہ حافظ ذہبی کے نزدیک امام اعظم کی ذات گرامی قلیل الحدیث نہیں بلکہ کثیر الحدیث ہے
خارجہ[1] کی طرح جو فقہاء سبعہ میں سے ہیں۔ امام اعظم بھی فقیہ ہونے کے ساتھ قلیل الحدیث ہو
تو ذہبی ان کا تذکرۃ الحفاظ میں ذکر نہ کرتے۔ اس تمام تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ امام ذہبی کی نگاہ
امام اعظم کی ذات گرامی محدث، حافظ، امام الحدیث، کثیر الروایت، امام متبوع، الامام الناقد صاحب
ثبت، متقن، حجۃ، معدل ہونے کے ساتھ مجتہد اور فقیہ تھے۔ اسی بنا پر حافظ محمد بن ابراہیم الوز
نے یہ کھلا اقرار کیا ہے۔

---

[1] خارجہ بن زید قلیل الحدیث ہیں یہ امام ذہبی کی رائے ہے ان کے الفاظ تذکرۃ الحفاظ میں یہ ہیں۔ احد الفقہاء
السبعۃ من کبار العلماء، الا انہ قلیل الحدیث (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۶) ابن سعد نے طبقات میں ذہبی سے
اختلاف کیا ہے اور ابن سعد ذہبی سے مقدم ہیں وہ فرماتے ہیں کان کثیر الحدیث (طبقات ج ۵ ص ۲۶۲) النو
رقمطراز ہیں کان بارعاً فی العلم (تہذیب الاسماء ص ۱۷۲)، امام ذہبی کے خارجہ کو قلیل الحدیث کہنے کی وجہ یہ معلوم
ہے کہ خارجہ نے دوسرے تابعین کی طرح روایت کا زیادہ کام نہیں کیا اس لیے وہ قلیل الروایت ہیں اور قلت رو
کی بنا پر ان کو ذہبی نے قلیل الحدیث کہہ دیا ہے ورنہ نفس حدیث کی حد تک وہ کثیر الحدیث ہیں جیسا کہ ابن سعد کی رائ
ہے۔ حدیث نبوت کے علم اور حدیث نبوت کی روایت میں جوہری فرق ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ جسے ارشادات
کا علم ہو اسے حدیث کی روایت بھی ہو صحابہ میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ ہیں جن سے روایت حدیث کم ہے وجہ ا
کی یہی ہے کہ ان کو اس کا موقعہ ہی نہیں ملا ہے جیسا کہ ابن سعد رقمطراز ہیں انما قلت الروایۃ عن الاکابر من اصحاب رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لانہم ہلکوا قبل ان یحتاج الیہم (ج ۲ ص ۳۰۲)، اس لیے امام ذہبی کا یہ کہنا کہ خارجہ قلیل الحدیث
ہیں بلحاظ روایت حدیث ہے اور ابن سعد کا یہ بتانا کان خارجہ کثیر الحدیث بلحاظ علم حدیث ہے۔ ان دونوں باتوں میں
کوئی تعارض نہیں ہے حافظ ابو نعیم نے ان کے قلیل الروایت ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ تعفہ لم الفرد و آثر العزلۃ
ولم ینتشر عنہ من کلامہ کثیر شیئ (حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۱۹۰) اس عزلت گزینی، انفراد اور خلوت پسندی کو
خارجہ نے ان سیاسی حالات کی بنا پر اختیار کیا جو اس وقت پوری امت اسلامیہ کو درپیش تھے تفصیل کے لیے
طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۲۶۴ دیکھو۔)

قد تواتر علمہ وفضلہ واجمع علیہ[1]

یعنی یہ ایک ایسی بنیادی حقیقت ہے جس کے لیے روایت واسناد کے کسی بھی سہارے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ تواتر سے ثابت ہے اور اس موضوع پر اُمت کی پوری علمی طاقت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوتی ہیں اور علم سے مراد علم حدیث ہی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

قد کان الحافظ المشهور بالعنایۃ فی ھذا الشان[2]

حافظ محمد بن یوسف الصالحی الشافعی مؤلف السیرۃ الشافعیۃ الکبریٰ عقود الجمان میں فرماتے ہیں:

کان ابوحنیفۃ من کبار حفاظ الحدیث واعیانھم[3]

اسی بنا پر امام حاکم نے معرفۃ الحدیث کی نوع تاسع والاربعین میں امام اعظم ابوحنیفہ کا بھی دوسرے محدثین کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس نوع کو شروع کرتے ہوتے اس کی پیشانی پر لکھا ہے کہ۔ یہ نوع تابعین اور اتباع تابعین میں سے ان ائمہ حدیث کے تذکار پر مشتمل ہے جن کی حدیثوں کو حفظ، مذاکرہ اور تبرک کی خاطر فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ ائمہ حدیث ثقات اور مشہور ہیں۔ اس کے بعد مختلف شہروں کے محدثین کا ذکر کیا ہے۔ مدینہ، مکہ، مصر، شام، یمن، یمامہ، بصرہ، الجزیرہ اور کوفہ کے محدثین میں ابوحنیفہ النعمان بن ثابت التیمی کا کھلے اور واشگاف الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

امام اعظم اور اسنادِ عالی

آپ پڑھ چکے ہیں کہ امام اعظم کے اساتذہ حدیث میں صحابہ اور تابعین کی وہ عظیم المرتبت اور

---

[1]، [2] الروض الباسم ج ۱ ص ۱۹۲،۲۶۶۔ واضح رہے کہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر محقق ہیں۔ اتحاف النبلاء میں نواب صاحب لکھتے ہیں کہ واصل مرتبہ اجتہاد مطلق گردید اور ان کے تعارف میں نواب صاحب نے تین سطروں پر مشتمل القاب لکھے ہیں اس لیے امام اعظم کی شان محدثانہ پر ان کی شہادت کسی عقیدت کے بوجھ سے دبی ہوئی نہیں بلکہ امر واقعہ اور حقیقت کا اظہار ہے۔ نواب صاحب نے جو القاب لکھے ہیں یہ ہیں: السید السند الامام العلامہ، المحدث الاصولی، المتکلم، الفقیہ، البلیغ الرحلہ، الحجۃ۔ فرید العصر، نادرۃ الدہر، خاتمۃ النقاد، حامل لواء الاسناد، بقیۃ اہل الاجتہاد، کشاف اصداف الفرائد، خطاف ازہار الفوائد، فاتح اقفال اللطائف، مائح انفال الطرائف مصیب شواکل المشکلات، مطبق مفاصل المعضلات، مضحک کمائم النکت، عزالدین، محی السنہ۔ (اتحاف ص ۳۷۴) [3] تانیب ص ۱۵۶۔

جلیل القدر ہستیاں ہیں جو اسلامی علوم میں مرکزی حیثیت کی مالک ہیں ان مشائخ کی جلالت قدر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جس قدر قرب امام اعظم کو حاصل ہے بعد کے محدثین اور ائمہ اربعہ میں سے کسی کو نہیں ہے۔ بڑے بڑے محدثین آخر عمر تک سند عالی کی جستجو میں رہے اور اس کی تلاش میں بہتوں نے سفر کی بڑی بڑی محنتیں اور قربانیاں گوارا کیں۔

حافظ ابن حزم نے ایک قابل قدر تحقیق فرمائی ہے جس میں اقوام دنیا کی تاریخ میں مسلمانوں کی اسنادی خصوصیت پر ایک جامع تبصرہ کر کے بتایا ہے:۔

> نقل و روایت کا یہ سلسلہ صرف مسلمانوں کی خصوصیت ہے اور زمانے کی ساری کرد‌‌ٹوں کے باوجود اللہ نے مسلمانوں میں یہ سلسلہ باقی رکھا ہے کتنے اللہ کے بندے اس کی خاطر کتنی مسافتیں طے کرتے ہیں یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے[1]

جیسے روایت و تاریخ میں اسناد مسلمانوں کی خصوصیت ہے ایسے ہی اسناد میں اسناد عالی وہ ممتاز سنت ہے جس کی علماء ہمیشہ جستجو کرتے رہے ہیں کیونکہ سند جس قدر عالی ہوگی اسی قدر خطا اور علت کے شائبہ سے پاک ہوگی۔

امام ابو عبداللہ الحاکم نے جو سب سے پہلی قسم بتائی ہے اس کا عنوان ہی معرفۃ عالی الاسناد ہے اور لکھا ہے کہ:

> طلب الاسناد العالی سنۃ صحیحۃ

علامہ نووی نے لکھا ہے کہ:

> طلب العلو فیہ سنۃ[2]

---

[1] الفصل فی الملل والنحل ج ۲ ص ۸۲۔ ابو علی الجیانی کہتے ہیں کہ اللہ نے اس امت کو تین خصوصیتوں سے نوازا ہے ایک اسناد دوسرے انساب تیسرے اعراب۔ اسناد بلا ریب دین ہے اور یہ سنت میں سنت مؤکدہ ہے عبداللہ بن المبارک فرماتے ہیں کہ اسناد میرا مردین ہے اگر اسناد نہ ہوتی تو اس کے منہ میں جو آتا کہہ دیتا۔ سفیان ثوری کا کہنا ہے کہ اسناد مومن کا ہتھیار ہے سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ ایک روز امام زہری نے ایک حدیث بیان کی میں نے کہا کہ بغیر سند کے ہے فرمایا کیا تم کوٹھے پر بغیر سیڑھی کے چڑھنا چاہتے ہو۔ تعلیقات علی توضیح الافکار محمد محی الدین عبدالحمید۔ ج ۱ ص ۲۹۶۔

[2] تقریب ص ۱۸۲۔

حافظ سیوطی کہتے ہیں کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ

اسناد عالی کی تلاش سلف کی سنت ہے کیونکہ اصحاب ابن مسعود کوفہ سے مدینہ جاتے تھے اور حضرت عبداللہ کی پیش فرمودہ احادیث کو حضرت عمر سے سنتے تھے[1]

امام نووی فرماتے ہیں کہ:

اسی بنا پر اس کے لیے سفر کرنا مستحب ہے[2]

امام حاکم نے اس کے مستحب ہونے کا اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو صحیح مسلم میں بحوالہ حضرت انس بن مالک اس طرح آئی ہے۔

حضرت انس فرماتے ہیں کہ ہمیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کی اجازت نہ تھی ہمیں یہ بات بھی بھلی معلوم ہوتی تھی کہ کوئی بیرونی شخص آتے اور آپ سے پوچھے اور ہم سنیں۔ چنانچہ ایک روز ایک شخص آیا اور یوں گویا ہوا۔

نووارد: ہمارے پاس آپ کا قاصد آیا اس نے آپ کی جانب سے بتایا ہے کہ آپ کو اللہ سبحانہ نے رسول بنایا ہے۔

حضور انور: ہاں یہ ٹھیک ہے واقعی میں اللہ کا رسول ہوں۔

نووارد: آسمان کس نے بنایا ہے؟

حضور انور: اللہ سبحانہ نے۔

نووارد: اور زمین کس نے بنائی؟

حضور انور: اللہ سبحانہ۔

نووارد: آسمان وزمین اور پہاڑوں میں منافع کس نے رکھے؟

حضور انور: اللہ پاک نے۔

نووارد: اچھا بتائیے آپ کو اس اللہ کی قسم جس نے آسمان وزمین اور پہاڑ بنائے کیا آپ کو اس نے رسول بنایا ہے؟

---

[1] تدریب الراوی ص ۱۸۳۔ [2] تقریب ص ۱۸۲۔

حضورانور: ہاں۔

نووارد: آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں؟

حضورانور: میرے قاصد نے ٹھیک بتایا ہے۔

نووارد: آپ کو اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنایا ہے کیا آپ کو اللہ نے اس کا حکم دیا ہے؟

حضورانور: ہاں۔

نووارد: آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ ہمارے مالوں میں صدقہ ضروری ہے؟

حضورانور: ٹھیک ہے۔

نووارد: آپ کو اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنایا ہے کیا یہ حکم آپ کو اسی نے دیا ہے؟

حضورانور: ہاں اسی نے دیا ہے۔

نووارد: آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ ہم پر سال بھر میں ایک ماہ کے روزے فرض ہیں؟

حضورانور: ہاں ٹھیک ہے۔

نووارد: آپ کو آپ کے روانہ کرنے والے کی قسم کیا آپ کو روزہ کا اس نے حکم دیا ہے؟

حضورانور: ہاں مجھے روزے کا اسی نے حکم دیا ہے۔

نووارد: آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ بشرطِ استطاعت حج فرض ہے؟

حضورانور: ہاں ٹھیک ہے۔

نووارد: آپ کو روانہ کرنے والے کی قسم کیا آپ کو اسی نے حج کا حکم دیا ہے؟

حضورانور: ہاں۔

نووارد: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر روانہ کیا میں اس میں کمی نہ کروں گا اور نہ زیادتی ـــــ یہ کہہ کر وہ چلا گیا حضور انور نے فرمایا کہ اگر سچا ہے تو ضرور جنت میں جائے گا۔

امام ابو عبداللہ الحاکم نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے [1]

---

[1] معرفۃ علوم الحدیث ص ۵۔

فیہ دلیل علیٰ طلب اجازۃ المرأ لعلو من الاسناد[1]

اور استدلال کی توضیح کرتے ہوتے لکھتے ہیں کہ دیہاتی کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کی زبانی فرائض اور اسلامی زندگی کا علم ہوگیا تھا لیکن اس کے باوجود بدوی سفر کی تکلیف برداشت کرکے بالمشافہ دریافت کرنے کے لیے خدمت گرامی میں آیا۔ اگر بدوی کا یہ عمل ناپسندیدہ ہوتا تو حضور انور اس پر ضرور گرفت فرماتے۔

حافظ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ حضرت ابوایوب انصاری مدینہ سے عقبہ بن عامر کے پاس صرف ایک حدیث کی خاطر مصر تشریف لے گئے۔ چنانچہ جب وہ مصر پہنچے۔ لوگوں نے ان کی آمد سے عقبہ بن عامر کو مطلع کیا۔ اطلاع ملنے پر فوراً باہر تشریف لاتے۔ ملے حضرت ابوایوب نے فرمایا وہ حدیث سنایئے جو مسلمان کی پردہ پوشی کے بارے میں حضور انور سے سُنی ہے کیونکہ اس ارشاد کا حضور سے سننے والا میرے اور آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ حضرت عقبہ نے فرمایا ہاں میں نے حضور سے سُنا ہے۔

من ستر مسلماً علی خزیۃ سترہ اللہ یوم القیامۃ[2]

حضرت ابوایوب انصاری حدیث سنتے ہی سواری پر سوار ہوگئے اور مدینہ طیبہ روانہ ہوگئے اور واپسی میں اتنی جلدی کی کہ اونٹنی کا کجاوہ تک نہ کھولا[3]

امام ابوعبداللہ الحاکم بسند متصل بیان فرماتے ہیں کہ ایک خراسانی حضرت امام شعبی کے پاس آیا اور بولا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں جس کے پاس کنیز ہو اس نے آزاد کی اور پھر اس سے نکاح کرلیا۔ امام شعبی نے فرمایا کہ ہم سے ابوبردہ نے اپنے والد کے حوالہ سے بتایا کہ ان کے والد کہتے تھے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس کے پاس کنیز ہو اس نے اس کو باادب اور باسلیقہ بنایا ہو اور تعلیم دی اور خوب تعلیم دی ہو۔ پھر اسے آزاد کرکے اس سے نکاح کیا ہو اسے دگنا اجر ملے گا اور جس غلام نے اللہ سبحانہٗ اور اپنے آقا کا حق پورا کیا اسے دوہرا اجر ملے گا۔ امام شعبی نے یہ حدیث بیان فرمانے کے بعد نووارد خراسانی سے کہا تمہیں حدیث مفت ہی بتادی ورنہ اس سے بھی کمتر کے لیے مدینہ کا سفر کرنا پڑتا تھا[4]

---

[1] معرفۃ علوم الحدیث ص ۶۔ [2] اللہ سبحانہٗ اس شخص کی قیامت کے دن پردہ پوشی کرے گا جو کسی رسوائی پر مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا۔ [3] جامع بیان العلم وفضلہ۔ [4] معرفۃ علوم الحدیث۔

الغرض محدثین نے علو اسناد کو ہمیشہ ایک قابلِ فخر چیز سمجھا ہے کیونکہ روایت میں جس قدر وسائط کم ہوں گے اسی قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قرب ہوگا۔ حافظ ابن الصلاح رقمطراز ہیں:

لِاَنَّ قُرْبَ الْاِسْنَادِ قُرْبٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالْقُرْبُ اِلَیْہِ قُرْبٌ اِلَی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ۔[1]

یہی علو اسناد کی پانچ قسموں میں سے سب سے اعلیٰ قسم ہے۔ چنانچہ حافظ جلال السیوطی فرماتے ہیں،

اَجَلُّھَا الْقُرْبُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ حَیْثُ الْعَدَدِ بِاِسْنَادٍ صَحِیْحٍ نَظِیْفٍ۔[2]

اسی لیے اہلِ فن کے نزدیک صحت اور علو اسناد کا جس قدر اہتمام ہوتا ہے اور کسی چیز کا نہیں ہوتا بلکہ امام مسلم تو علوِ سند کی خاطر گاہ گاہ سندِ صحیح چھوڑ کر سندِ ضعیف سے حدیث لاتے ہیں۔ چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں:

رُبَّمَا اَخْرَجَ مُسْلِمٌ الْاِسْنَادَ الضَّعِیْفَ وَاقْتَصَرَ عَلَیْہِ لِعُلُوِّہٖ وَتَرَکَ الْاِسْنَادَ الصَّحِیْحَ لِنُزُوْلِہٖ۔[3]

اور یہی وجہ ہے کہ ائمہ حدیث کے تذکرے میں ان کے علو اسناد کا ذکر خصوصیت سے ملتا ہے بلکہ خاص خاص اسانید عالیہ کو علماء نے مستقل اجزاء میں علیحدہ مدوّن کر دیا ہے۔

امام اعظم کی احادیات

ائمہ اربعہ میں چونکہ تابعی ہونے کا فخر امام اعظم کو حاصل ہے اور یہ وہ فخر ہے کہ بقول حافظ ابن حجر عسقلانی امام صاحب کے معاصرین میں سے کسی کو نصیب نہیں ہے نہ امام اوزاعی کو شام میں، نہ حماد بن زید اور حماد بن سلمہ کو بصرہ میں، نہ سفیان ثوری کو کوفہ میں، نہ امام مالک کو مدینہ میں، نہ امام مسلم بن خالد کو مکہ میں اور نہ امام لیث بن سعد کو مصر میں[4] اور اس کے نتیجے میں امام اعظم ابو حنیفہ ائمہ اربعہ میں اس شرف خاص میں بھی امتیازی مقام رکھتے ہیں کہ ان کو بارگاہِ رسالت

---

[1] مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۰۶۔ [2] تدریب الراوی ص ۱۸۳۔ یعنی علو اسناد کی بزرگ ترین قسم یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بلحاظِ عدد بسندِ صحیح نزدیکی حاصل ہو۔ [3] الروض الباسم ص ۱۶۵۔
[4] الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۲۲۔

سے براہ راست صرف بیک واسطہ تلمذ حاصل ہے۔ امام صاحب کی ان روایات کو جو آپ نے صحابہ سے سُنی ہیں احادیات یا وحدان کہتے ہیں یعنی وہ روایات جو آنحضرت سے بیک واسطہ منقول ہوں۔ چنانچہ علامہ سخاوی فتح المغیث میں فرماتے ہیں۔

وَالثُّنَائِیَّاتُ فِی الْمُوَطَّا لِلْاِمَامِ مَالِكٍ وَالْوُحْدَانُ فِی حَدِیْثِ الْاِمَامِ اَبِیْ حَنِیْفَةَ۔[1]

امام اعظم کے یہ وحدان مندرجہ ذیل صحابہ سے آئے ہیں:

حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن الحارث بن جزء، حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ، حضرت واثلہ بن الاسقع، حضرت عبداللہ بن انیس حضرت عائشہ بنت عجرد۔

اس لیے ان روایات کی تعداد چھ ہے:

۱۔ عن ابی حنیفہ عن انس بن مالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۲۔ عن ابی حنیفہ عن عبداللہ بن الحارث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۳۔ عن ابی حنیفہ عن عبداللہ بن ابی اوفیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۴۔ عن ابی حنیفہ عن واثلہ بن الاسقع عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۵۔ عن ابی حنیفہ عن عبداللہ بن انیس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۶۔ عن ابی حنیفہ عن عائشہ بنت عجرد عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

متقدمین میں سے بہت سے علماء نے امام صاحب کی ان احادیات پر رسالے لکھے ہیں۔ علامہ زاہد کوثری نے اس موضوع پر مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ رسائل تصنیف کرنے والوں میں حافظ ابو حامد محمد بن ہارون الحضرمی جو فن حدیث میں حافظ دار قطنی کے استاد ہیں، حافظ ابو الحسین علی بن احمد بن عیسٰی، النہفقی، حافظ ابو معشر عبدالکریم بن عبدالصمد الطبری الشافعی، اور حافظ ابوبکر عبدالرحمن بن محمد السرخسی کے رسائل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور حفاظ کی مرویات میں داخل ہیں۔ چنانچہ حافظ حضرمی، الحافظ النہفقی اور حافظ طبری کے رسالے حافظ ابن حجر عسقلانی نے المعجم المفہرس میں اور حافظ ابن طولون نے الفہرست الاوسط میں پوری روایت

---

[1] فتح المغیث ص ۲۴۱۔

روایت کیے ہیں۔ اور حافظ ابو بکر السرخسی کا رسالہ مشہور محدث سبط بن الجوزی نے الانتصار والترجیح میں اپنی مرویات میں شمار کیا ہے[1]

حافظ ابو معشر طبری کے رسالہ کو حافظ جلال الدین السیوطی نے بھی تبییض الصحیفہ میں نقل کیا ہے

اسنادِ عالی کی دوسری قسمیں

اسناد عالی کی قسم اعلیٰ تو آپ پڑھ چکے ہیں۔ اصولِ حدیث کی کتابوں میں اس کی چار قسمیں اور بتائی گئی ہیں۔

الف: یہ کہ مشہور امام حدیث سے قرب حاصل ہو چاہے اس امام کے بعد راویوں کی تعداد زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔

ب: حدیث کی معتمد کتابوں میں سے کسی سے قرب حاصل ہو۔ حافظ عسقلانی نے اس کی چار صورتیں بتائی ہیں۔ موافقت، بدل، مساوات اور مصافحہ۔

ج: یہ کہ علو کا سبب کسی راوی کی وفات کا تقدم ہو خواہ دوسری سندوں اور راویوں کی تعداد برابر ہی کیوں نہ ہو۔

د: یہ کہ ایک راوی حدیث سننے میں دوسرے راوی سے پہلے ہو دونوں نے ایک حدیث ایک ہی استاد سے سنی ہو مگر ایک نے پہلے دوسرے نے بعد میں سنی ہو۔

دراصل علو حقیقی تو پہلی ہی قسم ہے۔ ان قسموں میں اسنادی علو صرف نسبتی اور اضافی ہے۔ ان چار قسموں میں سے امام ابو عبداللہ الحاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں پہلی قسم کو جس میں کسی مشہور امام حدیث سے قرب حاصل ہو راجح قرار دیا ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے ان مشہور ائمہ حدیث ہیثم، اوزاعی، مالک، اعمش، ابن جریج اور شعبہ کے نام بتاتے ہیں[2] اور الجزائری نے امام حاکم کے حوالے سے یہ ضابطہ لکھا ہے کہ:

> کل اسناد یقرب من الامام المذکور منہ فاذا صحت الروایۃ
> الی ذالک الامام بالعدد الیسیر فانہ عالی[3]
> ہر اسناد جس میں امام مذکور سے قرب ہو جائے جب عدد یسیر کے

---

[1] التعلیقات ص ۔ التانیب ص ۱۲ [2] تدریب الراوی ص ۳۶۳ ۔ [3] توجیہ النظر للجزائری ۔

ذریعے اس امام تک روایت صحیح ہو جاتے تو بس یہی اسناد عالی ہے۔
اس کے بعد اسی ضابطہ کی مثال میں یہ روایت پیش کی ہے۔

حدثنا علی بن الفضل حدثنا الحسن بن عرفة حدثنا
هیثم عن یونس بن عبید عن نافع عن ابن عمر قال
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مطل الغنی ظلم[۱]

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

یہ ہم جیسوں کے لیے تمام اسانید میں عالی ہے۔ اس کی سند میں
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تک سات راوی ہیں اور اس کے عالی
ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ ہیثم بن بشیر امام حدیث سے
قریب تر ہے[۲]

مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ جن کے قرب سے محدثین کے یہاں اسناد عالی ہوتی ہے اور جس علو پر ان کو فخر ہے ان کا حال یہ ہے کہ ان میں بیشتر امام اعظم کے تلامذہ ہیں۔ دور کیوں جاتے ہو یہی امام ہشیم بن بشیر جن کے قرب سے یہ اسناد عالی ہوتی ہے امام اعظم کے مشہور تلامذہ میں ہیں چنانچہ امام بخاری نے تاریخ کبیر میں امام اعظم کے ترجمہ میں جن ائمہ حدیث کے بارے میں تصریح کی ہے کہ وہ حدیث میں امام اعظم کے تلامذہ ہیں۔ ان میں ان کا نام بھی ہے یہ بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ امام ذہبی نے ان کو الحافظ الکبیر، محدث العصر لکھا ہے ہشیم ۱۰۴ھ میں پیدا ہوئے انہوں نے تابعین سے علم حدیث حاصل کیا مثلاً امام ابو حنیفہ، امام عمرو بن دینار اور زہری، حضرت ابن عمر اور ابن عباس کے فتاویٰ پر ان کی نظر وسیع تھی۔ درس میں تہلیل، تسبیح اور تحمید ورد زبان ہوتی تھی جب وہ لا الٰہ الا اللہ کہتے تو فرط تاثر سے ان کی آواز بلند ہو جاتی۔ حافظ ہشیم بخارا کے رہنے والے تھے ان کے والد واسط میں مقیم تھے۔ واسط میں قاضئ وقت حافظ ابو شیبہ ابراہیم[۳] بن عثمان کے درس میں پابندی سے حاضر ہوتے

---

[۱]، [۲] توجیہ النظر للجزائری۔ [۳] ابراہیم بن عثمان ابو شیبہ اگرچہ ائمہ جرح و تعدیل نے ان کو جرح کی تیروں سے بری طرح زخمی کیا ہے لیکن یحییٰ بن معین نے یزید بن ہارون کی طرف نسبت کر کے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ ابراہیم سے زیادہ اپنے زمانے میں عادل کوئی نہ تھا۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ یزید ابراہیم کے اس وقت

(باقی ص ۳۰۹ پر)

اور فقہ کی تحصیل و تکمیل کرتے تھے۔ ایک بار ہشیم بیمار ہو گئے اور مجلس درس میں حاضر نہ ہو سکے

صفحہ ۳۰۷ کا بقیہ حاشیہ) : منشی تھے جبکہ وہ واسط میں نکمۂ قضا میں مقرر تھے۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ احادیثہ صالحۃ (تہذیب ص ۴۴) یہ ابو اسحاق السبیعی، ولید بن مسلم، زید بن الحباب، یزید بن ہارون، علی بن الجعد اور اپنے ماموں حکم بن عتیبہ کے شاگرد ہیں، ائمہ نقد و رجال نے ان کو خواہ کچھ کہا ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ یہ ابن ماجہ اور ترمذی کے راویوں میں سے ہیں اسی بنا پر حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں ان کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ ان کا ذکر تہذیب التہذیب میں کیا ہے تہذیب میں جن لوگوں کا تذکرہ ہے وہ اما ائمۃ موثوقون واما ثقات مقبولون واما قوم ساء حفظھم ولم یطرحوا واما قوم ترکوا وجرحوا۔ حافظ صاحب نے تقریب میں ان کو متروک الحدیث کہہ کر طبقہ سابعہ میں شمار کیا ہے اور معلوم ہے کہ متروک حافظ صاحب اسے کہتے ہیں من لم یوثق البتۃ وضعف مع ذلک بقادح (ص ۳) اس سے معلوم ہوا کہ ابراہیم حافظ صاحب کے نزدیک اس لیے ضعیف نہیں کہ ان پر جھوٹ کی تہمت ہے ان پر دوسرے ناقدین کی جانب سے اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ضعیف ہیں اور منکر الحدیث ہیں یہ ایک مبہم جرح ہے حافظ عسقلانی نے لکھا ہے کہ کذبہ شعبۃ فی قصۃ۔ یہ قصہ کیا ہے حافظ ذہبی نے اسے بھی بے نقاب کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ابراہیم نے بحوالہ حکم عن ابی لیلیٰ بتایا ہے کہ صفین کی جنگ میں ستر بدری شریک تھے امام شعبہ کہتے ہیں کہ ابراہیم جھوٹ کہتے ہیں کیونکہ میں خود ابراہیم کے استاد حکم سے ملا ہوں انھوں نے مجھے بتایا کہ صفین میں بدر والوں میں سے صرف حضرت خزیمہ شریک تھے۔ حافظ ذہبی کہتے ہیں کہ اگر ابراہیم کا یہ کہنا غلط ہے کہ صفین میں ستر بدری شریک تھے تو امام شعبہ کا یہ بتانا بھی سرتاسر غلط ہے کہ صفین میں حضرت خزیمہ کے سوا کوئی بدری نہ تھا کیا حضرت علی اور حضرت عمار بدری نہیں ہیں۔ اس لیے ابراہیم کے جھوٹا ہونے کی کہانی صرف ایک افسانہ ہے جس کی تاریخ کے بازار میں کوئی قیمت نہیں ہے اور صرف ضعیف ہونے کی بنا پر اگر ابراہیم کی روایت قابل قبول نہیں ہے تو پھر ایسی روایات تو بخاری میں بھی موجود ہیں جن کے راویوں کے بارے میں بالاتفاق متروک ہونے کا اعلان ہے مثلاً بخاری کی کتاب المناقب میں حسن بن عمارہ کے حوالے سے حدیث آئی ہے جن کے بارے میں لکھا ہے کہ طبقوا علی ترکہ۔ ایک اور راوی اسید بن الجمال ہے ان سے امام بخاری نے کتاب الرقاق میں حدیث روایت کی ہے حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ لم ار لاحد فیہ توثیقاً۔ اس سے معلوم ہوا کہ ارباب فن کے یہاں صرف راوی کا ضعیف ہونا ہی روایت کے ضعیف ہونے کا معیار نہیں ہے روایت ضعیف ہونے کے باوجود بھی مقبول ہوتی ہے۔ اگر بخاری کی یہ روایات ضعیف ہونے کے باوجود تلقی امت بالقبول کی وجہ سے صحیح ہیں تو ابراہیم کی ابن عباس والی وہ روایت جس میں تراویح کی تعداد بیس بتائی ہے تلقی الخلفاء بالقبول، تلقی العلماء بالقبول، تلقی الائمۃ بالقبول اور تلقی الامۃ بالقبول کی وجہ سے بھی صحیح ہے۔

ابوشیبہ کو فکر ہوئی انہوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ بیمار ہوگئے ہیں اپنے شاگردوں سے کہا چلو ہشیم کی عیادت کو چلیں۔ تمام اہل مجلس کھڑے ہوگئے اور قاضی صاحب کے ساتھ ہشیم کی عیادت کو ان کے والد بشیر کے گھر پہنچے۔ جب قاضی صاحب فرض عیادت سے فارغ ہو کر اپنے شاگردوں کے ساتھ چلے تو بشیر نے اپنے بیٹے سے کہا بیٹا! میں تمہیں طلب حدیث سے روکتا تھا لیکن آج سے اپنی ممانعت واپس لیتا ہوں۔ قاضی ابوشیبہ جیسا شخص اور میرے دروازے پر آئے[1] واضح رہے کہ واسطہ میں امام اعظم کے تلامذہ میں سے صرف ہشیم نہیں بلکہ کردری نے صرف واسطہ میں امام اعظم کے جو تلامذہ بتاتے ہیں ان کی تعداد تیس ہے ان میں سے ایک امام ہشیم ہیں۔ امام احمد بن حنبل پانچ سال تک ان کے درس حدیث میں شریک رہے اور فن حدیث میں عبور حاصل کیا۔

امام اعظم کی ثنائیات

امام ابوحنیفہ اگرچہ خود تابعی ہیں مگر ان کو بڑے بڑے تابعین سے حدیث پڑھنے کا موقعہ ملا ہے چنانچہ حافظ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں امام شعبی کو الامام، علامۃ التابعین کہہ کر بتایا ہے کہ ھو اکبر شیخ الامام ابی حنیفۃ امام محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ امام شعبی کے پاس رہ کر میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے کہ لوگ ان سے مسائل پوچھتے تھے اور الصحابۃ متوافرون حالانکہ صحابہ بہت سے تھے۔ خود امام شعبی فرماتے ہیں کہ میں نے پانچ سو صحابہ کو پایا ہے۔ ایسے ہی امام ذہبی نے دول الاسلام میں مشہور تابعی عطا بن ابی رباح کے متعلق تصریح کی ہے کہ اکبر شیوخہ عطاء بن ابی رباح۔ امام اعظم کے سب سے بڑے استاد ہیں۔ اس لیے احادیات کے بعد امام اعظم کی مرویات میں ثنائیات کا درجہ ہے یعنی وہ حدیثیں جو آپ نے "تابعین سے سنی ہیں اور تابعین نے صحابہ کرام سے۔ امام مالک چونکہ تابعی نہیں ہیں اس لیے ان کی مرویات میں سب سے عالی مرویات ثنائیات ہی ہیں۔

امام محمد کی کتاب الآثار میں ثنائی روایات حسب ذیل اسانید سے آئی ہیں۔

۱۔ ابوحنیفہ عن ابی الزبیر عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

۲۔ ابوحنیفہ عن نافع عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۸۷۔

۳- ابوحنیفہ عن عبداللہ بن ابی حبیبۃ قال سمعت ابا الدرداء قال قال رسول اللہ
۴- ابوحنیفہ عن عبدالرحمٰن عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
۵- ابوحنیفہ عن عطیۃ عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
۶- ابوحنیفہ عن شداد عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
۷- ابوحنیفہ عن عطاء عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
۸- ابوحنیفہ عن عاصم عن رجل من اصحابہ صلی اللہ علیہ وسلم۔
۹- ابوحنیفہ عن عون عن رجل من اصحابہ صلی اللہ علیہ وسلم۔
۱۰- ابوحنیفہ عن محمد بن عبدالرحمٰن عن ابی امامۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
۱۱- ابوحنیفہ عن مسلم الاعور عن انس بن مالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔
۱۲- ابوحنیفہ عن محمد بن قیس عن ابی عامرۃ، کان یہدی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

امام اعظم کی ثلاثیات

امام شافعی، امام احمد کی کسی تابعی سے ملاقات نہ ہو سکی اس لیے ان کی مرویات میں سب سے اونچا مقام ثلاثیات کا ہے یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات جن کو ان بزرگوں نے اتباع تابعین سے۔ انہوں نے تابعین سے اور تابعین نے صحابہ کرام سے سُنا ہے۔

صحاح ستہ کے مؤلفین میں سے امام بخاری، امام ابن ماجہ، امام ابوداؤد، امام ترمذی نے بعض اتباع تابعین کو دیکھا ہے اور ان سے حدیثیں روایت کی ہیں اس لیے اسناد عالی کے بازار میں یہ اکابر بھی امام شافعی اور امام احمد کے ہم پلہ ہیں۔ حالانکہ امام شافعی کی وفات کے وقت امام بخاری کی عمر دس سال تھی اور امام ابوداؤد صرف دو سال کے تھے اور امام ابن ماجہ تو ابھی پیدا ہی نہ ہوئے تھے۔ چنانچہ امام بخاری کی ثلاثی روایات کی تعداد صرف اکیس ہے اور یہ ان کی مرویات میں سب سے اونچی روایات ہیں۔ امام بخاری کو جن ذرائع سے یہ روایات ملی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱- امام مکی بن ابراہیم	گیارہ احادیث
۲- ابوعاصم النبیل	پانچ احادیث
۳- محمد بن عبداللہ الانصاری	تین احادیث

۴۔ خلاد بن یحییٰ — ایک حدیث

۵۔ عصام بن خالد — ایک حدیث

ان میں سے دو اوّل الذکر حضرت مکی بن ابراہیم اور امام ابو عاصم النبیل جن سے ثلاثیات کی تعداد بالترتیب گیارہ اور پانچ ہے اور جو امام بخاری کے مشائخ میں طبقہ اولیٰ کی حیثیت رکھتے ہیں دونوں امام اعظم کے شاگرد ہیں۔ ہم اپنے ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے یہاں ان کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں۔

امام مکی بن ابراہیم

مکی بن ابراہیم بلخ کے رہنے والے ہیں حافظ ذہبی سے علامہ سخاوی ناقل ہیں:

بلخ میں دوسری صدی کے اواخر میں علماء پیدا ہوئے جیسے کہ عمر بن ہارون، مکی بن ابراہیم، خلف بن ایوب، قتیبہ بن سعید، محمد بن ابان، عیسیٰ بن احمد، محمد بن علی بن طرخان۔ پھر وہاں علم حدیث گھٹ کر ناپید ہو گیا۔[1]

موصوف امام اعظم کے تلامذہ میں سے ہیں چنانچہ صدر الائمہ مکی رقمطراز ہیں کہ:

مکی بن ابراہیم بلخی بلخ کے امام ہیں ۱۳۰ھ میں کوفہ میں آئے اور امام ابو حنیفہ کی خدمت میں ملازمت اختیار کی اور آپ سے حدیث و فقہ کا سماع کیا اور بکثرت روایتیں کی ہیں۔[2]

امام مکی فن حدیث کے بہت بڑے امام گزرے ہیں حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے۔

مکی بن ابراهیم الحافظ الامام شیخ خراسان ابو السکن التمیمی[3]

بڑے بڑے ائمہ حدیث ان کے شاگرد تھے۔ امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین، امام ذہلی اور امام بخاری نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ امام بخاری نے بیشتر ثلاثی حدیثیں ان ہی سے روایت کی ہیں۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ میں نے ساٹھ حج کیے دس سال تک حرم محترم میں ڈیرہ رکھا اور سترہ تابعین سے احادیث لکھیں۔ ان کا بیان ہے کہ اگر مجھے

---

[1] الاعلان بالتوبیخ ص ۸۲۔ [2] مناقب الامام ج ۱ ص ۲۰۳۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۲۔

علم ہوتا کہ لوگوں کو میری ضرورت پڑے گی تو سوائے تابعین کے اور کسی سے حدیثیں نہ لکھتا۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں ۱۲۶ھ میں پیدا ہوا اور سترہ سال کی عمر میں حدیث کی تحصیل شروع کی۔

مکی بن ابراہیم کو تحصیل علم کی طرف امام ابوحنیفہ نے ہی متوجہ کیا تھا چنانچہ امام حارثی عبدالصمد بن فضل کی زبانی ان سے ناقل ہیں کہ،

میں بخارا میں تجارت کرتا تھا ایک بار امام صاحب کی خدمت میں آنا ہوا تو فرمانے لگے، مکی تم تجارت کرتے ہو لیکن تجارت میں جب تک علم نہ ہو بڑی خرابی رہتی ہے علم تم کیوں نہیں حاصل کرتے ہو اور احادیث قلم بند کیوں نہیں کرتے۔ امام ابوحنیفہ مجھے برابر اس طرف متوجہ کرتے رہے تاآنکہ میں تحصیل علم میں مشغول ہو گیا۔ آخر اللہ سبحانہ نے مجھے بہت کچھ عطا کیا۔ اسی لیے میں ہر نماز میں اور جب بھی ان کا ذکر آتا ہے ان کے حق میں دعا کرتا ہوں لان اللہ تعالیٰ ببرکتہ فتح لی باب العلم[1]

مکی بن ابراہیم کو امام اعظم سے خاص عقیدت تھی ایک بار امام صاحب کا ذکر کیا تو فرمانے لگے کہ کان اعلم زمانہ[2]

اسماعیل بن بشیر ناقل ہیں کہ ایک بار ہم امام مکی کی مجلس درس میں حاضر تھے۔ انہوں نے روایت شروع کی حدثنا ابوحنیفۃ حاضرین میں سے ایک اجنبی شخص نے چلا کر کہا کہ حدثنا عن ابن جریج ولا تحدثنا عن ابی حنیفۃ اس پر امام مکی کو اس قدر غصہ آیا کہ چہرے کا رنگ بدل گیا فرمانے لگے۔

انا لا نحدث السفہاء حرمت علیک ان تکتب عنی قم من مجلسی

ہم بیوقوفوں سے حدیث نہ بیان کریں گے مجھ سے حدیثیں نہ لکھو میری مجلس سے کھڑے ہو جاؤ۔

چنانچہ جب تک اس شخص کو مجلس سے نہیں اٹھایا گیا آپ نے حدیث بیان نہیں کی اور جب اس کو نکال دیا گیا تو پھر وہی حدثنا ابوحنیفہ کا سلسلہ شروع کر دیا[3]

---

[1] مناقب الامام ج ۲ ص ۱۶۱ [2] تاریخ بغداد ترجمہ امام اعظم۔ [3] مناقب امام ج ۱ ص ۲۰۴

الضحاک بن مخلد ابوعاصم النبیل

مشہور ائمہ حدیث میں سے ہیں۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا ترجمہ لکھا ہے۔ علامہ صیمری نے ان کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر المضیئہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ نام تو ان کا الضحاک ہے کنیت ابوعاصم اور نبیل ان کا لقب ہے۔ نبیل کے معنے معزز کے ہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان کو اس لقب سے کیوں پکارا گیا ہے۔ تذکرہ نویسوں نے اس سلسلے میں بہت سی باتیں نقل کی ہیں۔ امام طحاوی اور حافظ دولابی نے خود ان کا بیان اس سلسلے میں جو نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ امام زفر کے یہاں اکثر ان کی حاضری ہوا کرتی۔ اتفاق سے امام موصوف کے یہاں اسی نام کے ایک شخص اور بھی آیا کرتے جن کی وضع قطع بالکل گری ہوتی تھی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ انہوں نے حسب معمول امام زفر کے دروازے پر دستک دی۔ لونڈی نے آکر پوچھا کون؟ جواب ملا ابوعاصم، لونڈی نے اندر جا کر اطلاع دی کہ ابوعاصم دروازے پر ہیں۔ امام زفر نے دریافت کیا کہ کون سے ابوعاصم، لڑکی نے بے ساختہ کہہ دیا کہ النبیل منہما۔ ابوعاصم اجازت لے کر اندر آئے تو امام زفر نے کہا کہ اس لونڈی نے تمہیں وہ لقب دیا ہے جو میرے خیال میں تم سے کبھی بھی جدا نہ ہوگا۔ ابوعاصم کا بیان ہے کہ اس روز سے میرا یہ لقب پڑ گیا۔ حافظ ابن ابی العوام نے بھی اس واقعہ کو بسند متصل بیان کیا ہے ابوعاصم کی وفات ۲۱۲ھ میں ہوئی اس وقت آپ کی عمر نوّے سال تھی۔ امام بخاری ان کے شاگرد ہیں۔ فقہاء میں بھی بڑے نامور تھے۔ ابن سعد رقمطراز ہیں کہ کان ثقۃ فقیہاً۔ امام عجلی کہتے ہیں ثقۃ کثیر الحدیث وکان لہ فقہ۔ ابوداؤد کہتے ہیں کہ ابوعاصم کو ایک ہزار حدیثیں نوک زبان تھیں [1]

الغرض ان ہی دونوں مکی بن ابراہیم اور ابوعاصم النبیل کے حوالے سے امام بخاری کو بالترتیب گیارہ اور پانچ ثلاثیات ملی ہیں۔

دوسرے محدثین میں ابوداؤد اور ترمذی کی ثلاثیات میں صرف ایک ایک روایت ہے مگر ابن ماجہ کی ثلاثی روایات کی تعداد پانچ ہے۔

حضرت امام اعظم کی روایات میں ثلاثیات کا مقام تیسرے درجے پر ہے یعنی جو روایات امام

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، تہذیب التہذیب، الجواہر المضیئہ۔

بخاری، امام ابن ماجہ، امام ابوداؤد اور امام ترمذی کی درجہ اوّل میں ہیں وہ امام اعظم کے یہاں بلحاظ مقام
تیسرے درجہ پر ہیں۔ اس قسم کی روایات کا امام صاحب کے یہاں وافر ذخیرہ ہے مثلاً۔

عن ابی حنیفۃ عن بلال عن وہب عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

عن ابی حنیفۃ عن موسیٰ بن ابی عائشۃ عن عبداللہ عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

عن ابی حنیفۃ عن عبداللہ عن ابی نجیح عن عبداللہ بن عمر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

امام اعظمؒ کی رُباعیات

امام مسلم اور امام نسائی کی کسی تبع تابعی سے بھی ملاقات نہ ہو سکی اور اس درجہ سے ان کو ان سے
کوئی حدیث سننے کا موقعہ نہیں ملا اس لیے ان دونوں امامانِ حدیث کی سب سے عالی روایات رباعیات
ہیں جن کو ان کے اساتذہ نے اتباع تابعین سے اور انہوں نے تابعین سے اور انہوں نے صحابہ کرام
سے سُنا ہے مثلاً امام مسلم کی رُباعیات میں ہے :

حدثنا سوید بن سعید قال حدثنا مروان الفزاری عن ابی
مالک سعد بن طارق عن ابیہ قال سمعت رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم یقول من قال لا الٰہ الا اللہ وکفر
بما کان یعبد من دون اللہ حرم مالہ ودمہ وحسابہ علی اللہ

اور امام نسائی کی رباعیات میں ہے :

اخبرنا حمید قال حدثنا عبدالوارث قال حدثنا شعیب عن
انس بن مالک ۔

امام اعظم کی مرویات میں رباعیات بالکل آخری درجہ پر ہیں جو روایات نبوت سے قرب میں امام مسلم اور
اور امام نسائی کے یہاں درجہ اوّل پر ہیں ان کی امام اعظم کے یہاں آخری درجہ کی حیثیت ہے چنانچہ امام
محمد نے کتاب الآثار میں ایسی روایات نقل کی ہیں مثلاً :

ابو حنیفۃ عن حماد عن ابراہیم عن الاسود بن یزید عن عمر بن الخطاب

ابو حنیفۃ عن حماد عن ابراہیم عن علقمۃ عن عبداللہ

اس ساری تفصیل کو پڑھ کر یہ بات پورے طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ ارشادات اور حدیثِ نبوت
کے سلسلے میں ائمہ اسلام میں سے قرب کا جو شرف خاص بارگاہِ رسالت سے امام اعظم کو حاصل ہے

ہ کسی دوسرے کو نہیں ہے۔ وحدانیات میں ان کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ ثنائیات میں امام
لک کو مستثنیٰ کرنے کے بعد ان کا ہمسر کوئی نہیں۔ ثلاثیات اور رباعیات تو ان کے یہاں ایک
ام درجہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ایخ تدوینِ حدیث

آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں کہ حدیث تاریخ سنت کا نام ہے تاریخ سنت یا حدیث پر تین دور
زرے ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے اپنے استادِ حدیث شیخ عبداللہ بن سالم کے تذکرے میں
کھا ہے:

> صحتِ حدیث میں جس ضبط کا اعتبار ہے اُمت مرحومہ اس میں تین دوروں
> سے گزر کر آئی ہے۔
> صحابہ و تابعین کے زمانے میں ضبطِ حدیث کی صورت یہ تھی کہ زبانی یاد
> کرتے تھے۔ اتباع تابعین اور اوائل محدثین کے زمانے میں ضبطِ
> حدیث کی یہ صورت تھی کہ لکھتے تھے۔ اس کے بعد حفاظِ حدیث نے
> اسماء الرجال غریب احادیث اور ضبطِ الفاظ کے لیے تصانیف کیں
> اور تشریحات کا دور شروع ہو گیا[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین کے زمانے تک حدیثوں کو سن کر زبانی یاد رکھنے کا
واج تھا اور اہلِ علم میں یہی چیز باعثِ فخر سمجھی جاتی ہے۔ اور یہ رواج ٹھیک اسی طرح تھا جیسا
ج کل ہماری سوسائٹی میں قرآن حکیم کے لیے ہے بلکہ ان علماء پر جو کتاب وغیرہ پاس رکھتے تھے
ر لکھی ہوئی حدیثیں بیان کرتے تھے ان پر ایک طرح کی رجل صحفی کی پھبتی کسی جاتی تھی۔
ریا اس معاشرے میں علم صحیح کا اصلی دار و مدار ہی حفظ اور زبانی یادداشت تھا۔ اساتذہ کی
انب سے تلامذہ کو ہدایت ہوتی تھی کہ لکھو مت بلکہ جیسے ہم نے احادیث زبانی یاد کی ہیں تم بھی
بانی ہی یاد کرو۔ چنانچہ ایک بار حضرت ابو موسیٰ اشعری نے دریافت کیا کہ کیا تم لکھتے ہو؟ شاگردوں
ے کہا جی ہاں! فرمایا احفظوا عنا کما حفظنا زبانی یاد کرو جیسے ہم نے زبانی یاد کی ہیں[2] بہرحال یہ

---

[1] انفاس العارفین ص ۱۸۹۔ [2] جامع بیان العلم و فضلہ ج ۱ ص ۶۶۔

واقعہ ہے کہ جیسے اس وقت تک قرآن کی ۶۲۳۶ آیتوں کو گھوٹنے اور نوک بیان کرنے کا رواج مسلمانوں میں باقی ہے۔ اتباع تابعین کے زمانے تک قرآن کے ساتھ احادیث کو بھی زبانی یاد کرنے کا ایسا ہی دستور رہا ہے۔

طرق واسانید حدیث کی تعداد

اگر یہ صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ امام احمد فرما رہے ہیں کہ احادیث کی کل تعداد سات لاکھ سے کچھ زائد ہے تو یہ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نہیں ہیں بلکہ آپ کے افعال، اخلاق، احوال اور آپ کی موجودگی میں لوگوں کے کیے ہوئے وہ کام جن پر آپ نے گرفت نہیں فرمائی اور اس کے ساتھ صحابہ کے اقوال، ان کے مفتیوں کے فتاویٰ، زمانہ خلافت میں ان کی عدالتوں کے فیصلے بلکہ تابعین کے فتاویٰ اور جج ہونے کی حیثیت میں ان کے فیصلے اور قرآنی آیات پر تشریحی نوٹس بھی ان سات لاکھ میں شمار کیے گئے ہیں۔ یہ خیال بالکل عامی ہے کہ صرف ارشادات نبوت ہی کا نام حدیث ہے۔ الجزائری لکھتے ہیں:

إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْمُتَقَدِّمِينَ كَانُوا يُطْلِقُونَ اِسْمَ الْحَدِيثِ عَلَى مَا يَشْمَلُ آثَارَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِينَ وَتَابِعِيهِمْ وَفَتَاوَاهُمْ۔

متقدمین کی اکثریت آثار صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین اور ان کے فتاویٰ پر لفظ حدیث بولتی ہے[1]

اور یہ تعداد بھی سات لاکھ متون حدیث کی نہیں بلکہ طرق کی ہے یعنی سات لاکھ ان اسانید کی تعداد ہے جن کے ذریعے احادیث کے یہ متون ہم تک پہنچے ہیں۔ ایک حدیث اگر چار سندوں سے آئے تو یہ محدثین کی اصطلاح میں چار حدیثیں ہیں چنانچہ علامہ طاہر الجزائری لکھتے ہیں:

وَيَعُدُّونَ الْحَدِيثَ الْمَرْوِيَّ بِإِسْنَادَيْنِ حَدِيثَيْنِ۔

علامہ ابن جوزی نے تمام ذخیرہ حدیث کے متعلق کھلے لفظوں میں لکھا ہے کہ

اَلْمُرَادُ بِهٰذَا الْعَدَدِ الطُّرُقُ لَا الْمُتُونُ[2]

نواب علامہ صدیق حسن خاں نے الحطہ میں میر سید شریف سے بھی یہی جملہ نقل کیا ہے[3]

---

[1] توجیہ النظر ص ۹۲۔ [2] تلقیح فہوم اہل الاثر۔ [3] الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ

واضح رہے کہ محدثین کے متعلق جو اُصول کی کتابوں میں لکھا ہے کہ امام بخاری فرماتے ہیں کہ الجامع الصحیح کی موجودہ احادیث چھ لاکھ حدیثوں کا انتخاب ہے یا امام مسلم فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم کی حدیثوں کو میں نے تین لاکھ حدیثوں سے منتخب کیا ہے۔ امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں ان کا انتخاب سنن ابوداؤد میں ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ مسندِ احمد سات لاکھ پچاس ہزار حدیثوں کا انتخاب ہے[1] اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ارشاداتِ نبوت کی یہ تعداد ہے بلکہ یہ ارشادات جن طرق اور اسانید سے آتے ہیں ان کی تعداد ظاہر کرنی مقصود ہے اور تاریخ حدیث میں یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے بلکہ جہاں تک طرق و اسانید کا معاملہ ہے وہ اس سے بھی کہیں زائد ہیں یہ تو صرف وہ ہیں جو ان بزرگوں نے اپنی عرق ریزیوں اور دست پیمائیوں کے بعد فراہم کیے ہیں ان کے علاوہ اگر دوسرے محدثین کی محنتوں اور یادداشتوں کو یکجا کیا جائے تو یہ سلسلہ بے حد و بے حساب ہے۔ کیونکہ تابعین کے زمانے میں اگر طرق و اسانید کی تعداد صرف چالیس ہزار تھی تو اتباع تابعین کے دور میں یہی تعداد لاکھوں تک جا پہنچی کیونکہ ایک شیخ نے کسی حدیث کو مثلاً دس شاگردوں سے بیان کیا اب وہ محدثین کی اصطلاح میں دس اسانید اور طرق ہو گئے۔

احادیثِ صحیحہ کی اصلی تعداد

شاید آپ بے چین ہوں اور ذہنوں میں یہ خلش محسوس کر رہے ہوں کہ اگر یہ طرق و اسانید کی تعداد ہے تو پھر احادیثِ صحیحہ کی تعداد کیا ہے؟

محدثین و حفاظِ حدیث کی بدولت ہم کو طرق و اسانید کے ساتھ متونِ احادیثِ صحیحہ کی تعداد کا بھی علم ہو گیا ہے۔ امام ابوجعفر محمد بن الحسین بغدادی نے کتاب التمیز میں امام سفیان ثوری، امام شعبۃ بن الحجاج، امام یحییٰ بن سعید القطان، امام عبدالرحمٰن بن مہدی اور امام احمد بن حنبل جیسے اکابر کا متفقہ بیان نقل کیا ہے:

ان جملۃ الاحادیث المسندۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
یعنی الصحیحۃ بلا تکریر اربعۃ آلاف واربع مائۃ حدیث

---

[1] الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند اور صحیح بلا تکرار ارشادات کی تعداد
صرف چار ہزار چار سو ہے [1]

یہی وجہ ہے کہ ارباب صحاح میں سے ہر ایک نے اپنی کتابوں میں اسی تعداد کے لگ بھگ احادیث کی تخریج کی ہے۔ چنانچہ حافظ زین الدین عراقی نے مکررات کو نکال کر صحیح بخاری میں آئی ہوئی حدیثوں کی تعداد چار ہزار بتائی ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں:

عدد احادیث البخاری باسقاط المکرر اربعۃ آلاف [2]

اور امام نووی نے صحیح مسلم کی حدیثوں کی تعداد بھی صرف چار ہزار ہی بتائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

ومسلم باسقاط المکرر نحو اربعۃ آلاف [3]

امام زرکشی نے سنن ابی داؤد کی حدیثوں کی تعداد چار ہزار آٹھ سو بتائی ہے امام محمد بن اسماعیل یمانی فرماتے ہیں:

قال الزرکشی ان عدۃ احادیث ابی داؤد اربعۃ آلاف وثمانمائۃ [4]

خود امام ابوداؤد نے اس خط میں جو انہوں نے اہل مکہ کے نام لکھا ہے تصریح کی ہے کہ سنن میں احادیث کی تعداد صرف چار ہزار آٹھ سو ہے اور ان میں چھ سو مراسیل ہیں۔

ابن ماجہ کے متعلق علامہ یمانی نے ابوالحسن بن القطان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

عدتہ اربعۃ آلاف حدیث [5]

مؤطا امام مالک جو ذخیرۂ حدیث میں قدیم ترین کتاب ہے ابوبکر الابہری فرماتے ہیں کہ اس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ اور تابعین کے تمام آثار صرف ایک ہزار سات سو بیس ہیں ان میں ارشادات نبوت کی تعداد چھ سو ہے مرسل ۲۲۰ موقوف ۶۱۳ اور تابعین کے فتاویٰ ۲۸۵ ہیں [6] یہی حال حدیث کی دوسری کتابوں کا ہے۔

قرآن کی ۶۲۳۶ آیتیں اور ۴۴۰۰ احادیث

اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ جو لوگ قرآن کی ۶۲۳۶ آیتوں کو زبانی یاد کر سکتے ہیں ان کو چار ہزار

---

[1] توضیح الافکار ج ۱ ص ۶۲۔ [2] تنقیح الانظار ج ۱ ص ۵۶۔ [3] التقریب ص ۵۱
[4] توضیح الافکار ج ۱ ص ۶۱۔ [5] توضیح الافکار ج ۱ ص ۶۲۔ [6] توضیح الافکار ج ۱ ص ۶۲۔

چار سو حدیثوں کو یاد رکھنا کون سی مشکل بات ہے۔ آخر یہ کیوں نہیں یاد کیا جاتا؟ کیا صرف اس لیے کہ ہمارے معاشرے میں قرآن کے ساتھ صحابہ اور تابعین کی طرح سنت کی تاریخ کو زبانی یاد کرنے کا رواج نہیں ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں:

اگلے لوگ لکھتے نہ تھے صرف زبانی یاد کرتے تھے اور اگر کوئی لکھتا تو یاد کرنے ہی کے لیے لکھتا تھا اور جب زبانی یاد کر لیتا تو اسے مٹا دیتا۔[1]

قرآن کی طرح حدیث کے یاد کرنے کے جس رواج کا میں نے ذکر کیا ہے یہ صرف میری ذاتی رائے نہیں ہے بلکہ اکابر سے اس موضوع پر ایسی مثبت تصریحات منقول ہیں جن کی بنا پر میں نے یہ دعویٰ کیا ہے چنانچہ حافظ ابن عساکر نے اسماعیل بن عبیدہ محدث سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

يَنْبَغِيْ لَنَا اَنْ نَّحْفَظَ حَدِيْثَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا نَحْفَظُ الْقُرْاٰنَ[2]

حافظ ابن عبدالبر نے معتمر بن الریان کے حوالے سے لکھا ہے:

ابو نضرہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو سعید خدری سے حدیث لکھنے کی درخواست کی آپ نے فرمایا کہ ہم نہیں لکھائیں گے تم ہم سے ایسے ہی لو جیسے ہم نے نبی سے لی ہے یعنی زبانی یاد کرو۔[3]

ایک دوسری روایت میں صریح الفاظ ہیں کہ:

ان نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم یحدثنا فنحفظ فاحفظوا کما کنا نحفظ[4]

سید بن ہلال نے ابو بردہ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

حضرت ابو موسیٰ اشعری ہم سے حدیثیں بیان کرتے ہم ان کو لکھنے کے لیے جاتے آپ نے فرمایا کہ کیا مجھ سے سُن کر قلم بند کرتے ہو ہم نے کہا جی ہاں۔ فرمایا میرے پاس لاؤ آپ نے پانی سے سب کو دھو دیا اور فرمایا کہ زبانی یاد کرو جیسے ہم نے زبانی یاد کیا ہے۔[5]

---

[1] جامع بیان العلم وفضلہ۔ [2] تذکرۃ الحفاظ۔
[3]، [4]، [5] جامع بیان العلم وفضلہ۔

امام ذہبی نے اسرائیل بن یونس کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ اپنے دادا ابو اسحاق کی روایات کے بارے میں کہتے تھے۔

کنت احفظ حدیث ابی اسحاق کما احفظ السورۃ من القرآن[1]

حافظ ابن حجر عسقلانی نے شہر بن حوشب کے حالات میں لکھا ہے کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ شہر بن حوشب کو عبدالحمید بن بہرام کے حوالہ سے ساری حدیثیں اس طرح زبانی یاد تھیں گویا کوئی قرآن کی سورت پڑھ رہا ہے[2] اور امام ابوداؤد طیالسی کے متعلق مشہور محدث عمر بن فلاس کا مشاہدہ بتایا ہے کہ میں نے محدثین میں ابوداؤد سے زیادہ حافظ کوئی نہیں دیکھا۔ خود ان کو کہتے سُنا ہے کہ فخر نہیں مگر تیس ہزار حدیثیں نوک زبان ہیں[3] مشہور تابعی قتادہ بن دعامہ کے بارے میں امام معمر فرماتے ہیں کہ انہوں نے سعید بن ابی عروبہ سے کہا کہ قرآن کھول کر بیٹھ جاؤ میں سورہ بقر سناتا ہوں۔ سعید کہتے ہیں کہ میں نے اول سے آخر تک سُنا ایک حرف کی بھی غلطی نہ تھی۔ پھر قتادہ نے کہا کہ:

لانا لصحیفۃ جابر احفظ من سورۃ البقرۃ[4]

یاد رہے کہ جابر کا صحیفہ وہ ہی ہے جس کا تذکرہ آپ آغاز کتاب میں پڑھ چکے ہیں حضرت قتادہ قرآن کے ساتھ اس کے بھی حافظ تھے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ صدر اول میں قرآن کی طرح سنت کو بھی زبانی یاد کرنے کا رواج تھا۔ اور اس رواج کے بنیادی اسباب میں سے ایک سبب یہ تھا کہ اہلِ عرب کو اپنی خداداد قوتِ حافظہ پہ ناز تھا۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبر نے اس طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ

کانوا مطبوعین علی الحفظ مخصوصین بذالک[5]

صرف یہی نہیں بلکہ ان کو قوتِ حافظہ پر اس قدر اعتماد تھا کہ لکھنا تو بڑی بات ہے وہ سُن کر دوبارہ نہ پوچھنے کو بڑے طمطراق اور ناز سے بیان کرتے تھے چنانچہ تذکرۃ الحفاظ میں خود امام زہری کا بیان ہے کہ:

ما استعدت علما قط

---

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۷۱۔ [3] تہذیب ص ۱۸۳
[4] تہذیب ج ۸ ص ۳۵۳۔ [5] جامع بیان العلم و فضلہ۔

سنن دارمی میں ابن شبرمہ کی زبانی منقول ہے کہ امام شعبی فرمایا کرتے تھے کہ اے شباک! میں تم سے حدیث دوبارہ بیان کر رہا ہوں حالانکہ میں نے کبھی کسی حدیث کے دوبارہ اعادے کی درخواست نہیں کی۔ تذکرے ہی میں امام شعبی کا یہ بھی بیان ہے کہ ماکتبت سوادا فی بیاض میں نے کبھی لکھی نہیں ہے ولا استعدت حدیثاً من الانسان اور نہ کبھی کسی شخص سے حدیث سُن کر تکرار کی درخواست کی ہے۔ بہرحال یہ ایک واقعہ ہے کہ حدیث نبوی پر قرآن ہی جیسا ایسا دور گزرا ہے جس میں سارا زور صرف زبانی یاد پر ہی تھا۔ حافظ ابن عبدالبر نے اس موضوع پر کراہیتہ کتابتہ العلم کے نام سے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے اور ساری بحث کا اس پر خاتمہ کیا ہے۔

> جن حضرات نے کتابت کو ناپسند فرمایا ہے جیسے حضرت ابن عباس، امام شعبی، امام زہری، امام نخعی اور قتادہ وغیرہ یہ سب کے سب وہ ہیں جو طبعی طور پر قوت حافظہ رکھتے تھے ان میں سے ایک ایک شخص صرف ایک بار سننے پر اکتفا کرتا تھا۔ امام زہری سے منقول ہے کہ میں جب بقیع سے گزرتا ہوں تو اپنے کان بند کر لیتا ہوں کہ شاید کہیں کوئی بُری بات اس میں نہ پڑ جائے کیونکہ خدا کی قسم کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی بات میرے کان میں پڑی ہو اور اس کو بھول گیا ہوں۔ امام شعبی سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ یہ سب لوگ عرب تھے اور یہ مشہور ہے کہ عربوں کو زبانی یاد رکھنے میں خاص خصوصیت حاصل ہے ان میں سے ایک ایک شخص اشعار کو ایک بار سُن کر ہی یاد کر لیتا تھا۔ حضرت ابن عباس کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے عمر بن ربیعہ کے پورے قصیدے کو ایک ہی بار سُن کر یاد کر لیا تھا اور آج کوئی شخص بھی اس قسم کا حافظہ نہیں رکھتا۔[1]

تدوینِ حدیث اور عمر بن عبدالعزیز

خلافتِ راشدہ میں اگرچہ حضرت فاروق اعظم نے سنت کی تدوین کا کام حکومت کی جانب سے

---

[1] جامع بیان العلم وفضلہ۔

کرنے کا ارادہ کیا صحابہ سے مشورہ لیا اور ان سب نے تدوین ہی کا مشورہ دیا لیکن آپ نے کچھ مصلحت کی بنا پر یہ کام یہ کہہ کر ملتوی کر دیا کہ:

> میں سنن لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا مجھے اس قوم کا خیال آگیا جو ہم سے پہلے ہوئی ہے اور جس نے خود کتابیں لکھیں اور اس کی طرف ہمہ تن اس قدر متوجہ ہو گئے کہ اللہ کی کتاب ہی کو چھوڑ بیٹھے بخدا میں اللہ کی کتاب میں کسی چیز کی آمیزش نہ کروں گا۔ یہ کہہ کر آپ نے ارادہ ملتوی کر دیا۔[1]

یہاں بھی التباس اور اختلاط کا وہی اندیشہ بول رہا ہے جو حدیث ابی سعید خدری میں بیان ہوا اس پر تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔

جمع قرآن اور صحابہ

دراصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوتے تو قرآن لوگوں کے سینوں میں عرب رواج کے مطابق محفوظ تھا آج کے رواج کے موافق کتابی شکل میں نہ تھا۔ امام خطابی رقمطراز ہیں:۔

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن کتابی شکل میں مرتب اس لیے نہ تھا کہ ہمہ وقت حضور انور کو نسخ کا انتظار رہتا تھا۔ زمانہ نزول ختم ہونے پر یہ کام خلافتِ راشدہ نے کیا[2]

حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ کتابی صورت میں نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن خاص کتابی شکل میں ایک جگہ بترتیبِ سورۃ مرتب نہ تھا کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ:

> قد کان القرآن کتب کلہ فی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکن غیر مجموع فی موضع واحد ولا مرتب السور[3]

دراصل قرآن کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پر موجودہ شکل و صورت تک پہنچنے کے لیے تین کروٹیں آئی ہیں۔ اوّل زمانۂ نبوت، دوم زمانۂ صدیق و فاروق، سوم زمانۂ عثمان غنی۔ زمانۂ نبوت میں قرآن لکھا ہوا تھا مگر ایک جگہ نہ تھا اور نہ سورتوں میں ترتیب تھی۔ زمانۂ صدیق میں

---

[1] مقدمہ تنویر الحوالک ص ۴۔ [2]، [3] الاتقان فی علوم القرآن ص ۵۷، ۵۸۔

فاروقِ اعظم کے کہنے پر قرآن کو یکجا کیا گیا اور اس کے لیے زید بن ثابت کو مقرر کیا حضرت زید کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ صرف زبانی یادداشت کے سہارے قرآن کو جمع نہ کیا جائے جب تک آیت سنانے والا لکھی ہوئی آیت نہ سنائے۔ علامہ ابوشامہ نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے:

وکان غرضھم الّا یکتب الا من ماکتب بین یدی النبی لا من مجرد اللفظ [۱]

بلکہ حضرت ابوبکر نے زید اور عمر سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ:

من جاء بشاھدین علی کتاب اللہ فاکتباہ [۲]

علامہ ابوعبداللہ الزنجانی نے تاریخ القرآن میں اس شہادت کا پس منظر بتایا ہے:

گواہ اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ قرآن کا جو حصہ پیش کر رہے ہیں اس کو انہوں نے حضورِ انور کے سامنے وفات والے سال پیش کیا ہے اور آپ کے سامنے لکھا گیا ہے [۳]

اس طرح قرآن عزیز نے اوراق میں کتابی صورت اختیار کی۔ امام زہری سے حافظ سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں نقل کیا ہے:

جمع علی عھد ابی بکر فی الورق

اور حضرت سالم بن عبداللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

جمع ابوبکر فی قراطیس

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا جو مجموعہ زمانۂ نبوت میں کاغذوں اور اوراق میں نہیں بلکہ عُسُب یعنی کھجور کی ٹہنیوں، لخاف چھوٹے چھوٹے پتھروں یعنی ٹھیکروں، رقاع کھال کے ٹکڑوں، اکتاف، اونٹ کی ہڈیوں اور اقتاب کجاوے کی لکڑیوں میں لکھا ہوا تھا وہ زمانۂ ابوبکر میں کاغذ کے اوراق میں اکٹھا ہو کر کتاب کی صورت میں سرکاری طور پر محفوظ کر دیا گیا۔ چونکہ قرآن کے نسخے عام شائع نہ ہوتے تھے ادھر اسلام دور دراز ممالک میں پھیلتا جا رہا تھا اور نئی نئی قومیں اسلام میں داخل ہو رہی تھیں اس لیے الفاظِ قرآن کے اعراب اور وجوہ قرأت میں کچھ اختلاف رونما ہوا اور یہ اختلاف بڑھنے لگا۔ حضرت حذیفہ نے اس معاملہ کی صورتِ حال

---

[۱]، [۲] الاتقان فی علوم القرآن ص ۵۸، ۵۸۔ [۳] الاتقان فی علوم القرآن۔

سے حضرت عثمان کو آگاہ کیا[1] حضرت ابوبکر کا مرتب کردہ قرآن حضرت حفصہ کے گھر میں موجود تھا حضرت عثمان نے منگایا۔ زید بن ثابت، عبداللہ بن الزبیر، سعید بن العاص اور عبدالرحمٰن بن الحارث سے اس کی نقلیں کرائیں اور مختلف صوبوں میں یہ قرآن روانہ کیے گئے۔

جامع القرآن کا حضرت عثمان کے لیے لقب

یہ عجیب بات ہے کہ حضرت عثمان کا لقب جامع القرآن مشہور ہو گیا حالانکہ ان کا جمع قرآن میں کوئی دخل نہیں ہے۔ انہوں نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ صدیق اکبر کے مرتب کردہ قرآن کی چند نقلیں کرائیں اور ملک کے مختلف حصوں میں روانہ کر دیں۔ الاتقان میں ہے:

المشہور عند الناس ان جامع القرآن عثمان ولیس کذالک
انما حمل الناس عثمان علی القرأۃ بوجہ واحد

لوگوں میں مشہور یہی ہے کہ عثمان جامع القرآن ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے عثمان نے تو صرف یہ کام کیا ہے کہ لوگوں کو ایک طرز پر پڑھنے کی راہ بتائی۔

بہر حال قرآن نہ صرف تواتر کتابت کے ذریعے آج اُمت میں حضرت زید بن ثابت[2] کے صدقے موجود ہے بلکہ تواترِ اسناد، تواترِ حفظ، تواترِ روایت، تواترِ قرأت اور تواتر تعلیم کے ذریعے بھی محفوظ ہے۔

اس تمام تفصیل سے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس اندیشے کی وجہ سے حضرت فاروق اعظم نے

---

[1] تاریخ الاسلام السیاسی ج ۲ ص ۳۸۰۔ [2] یہ بات کہ اس کام کے لیے زید بن ثابت ہی کو کیوں منتخب کیا اس سوال کا جواب عثمان بن سعید دانی نے اپنی کتاب المقنع میں جو دیا ہے اور جسے ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے تاریخ الاسلام السیاسی ج ا ص ۳۸۰ پر نقل کیا ہے وہ ہی پیش کرتا ہوں۔ زید بن ثابت کو اس کام کے لیے چند وجوہ سے منتخب کیا گیا۔ اول یہ کہ زید حضور انور کے کاتب وحی تھے دوم یہ کہ آپ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا قرآن پڑھ کر سنایا تھا۔ سوم یہ کہ آپ نے ہی حضور انور کی زندگی میں آخری طور پر جامع قرآن کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ یہ تین خوبیاں زید بن ثابت کے سوا کسی دوسرے صحابی میں نہ تھیں اس لیے دونوں بار زمانہ صدیق اور زمانہ عثمان میں کام کے لیے زید ہی کے نام پر قرعۂ فال نکلا۔

تدوینِ سنن کا کام ملتوی کر دیا تھا وہ اندیشہ حضرت عثمانؓ کے قرآن کی متعدد نقلیں کرانے اور اطرافِ مملکت میں روانہ کرنے کے بعد بالکل ختم ہو گیا۔ اب قرآن کتابی شکل میں آنے کے بعد اس خطرے سے بالا ہو گیا کہ غیر قرآن کی قرآن سے آمیزش ہو جاتی۔

سنہ ۹۹ھ تک سنت تین راہوں سے مسافت طے کرتی رہی۔ ایک سینہ دوسرے محدود اور خاص سفینہ اور تیسرے عمل کا محسوس پیمانہ۔

فرق صرف یہ ہے کہ حفظ و روایت اور عمل اس وقت معاشرے میں عام اور کتابت کا کام خاص خاص تک محدود تھا۔ ایک بار اس خاص کام پر جو زمانۂ نبوت اور زمانۂ خلافتِ راشدہ میں خدمتِ سنت کے نام پر ہوا ہے اس پر پہلے ایک مجموعی نظر ڈال لیجئے تاکہ اس سلسلے میں آئندہ اقدامات کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

سنہ سے ۹۸ھ تک موضوع حدیث پر علمی سرمایہ

۱۔ کتاب عمرو بن حزم	عمرو بن حزم نے اپنی دستاویز کے ساتھ حضور انورؐ کے اکیس فرامین یکجا کیے ہیں۔
۲۔ کتاب الصدقہ	یہ نوشتہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے پاس تھا۔
۳۔ صحیفہ صادقہ	عبداللہ بن عمروؓ نے زمانۂ نبوت میں احادیث قلم بند کی ہیں۔
۴۔ صحیفہ جابر	یہ حج کے موضوع پر جابر بن عبداللہ کا لکھا ہوا رسالہ ہے۔
۵۔ صحیفہ علی	قصاص حرم، زکوٰۃ، قیدیوں کی رہائی پر حضرت علیؓ کا رسالہ ہے۔
۶۔ صحیفہ صدیقی	یہ صدیق اکبرؓ کی لکھی ہوئی صدقات کی تفصیل ہے۔
۷۔ رسالہ	سمرہ بن جندب کا ترتیب دادہ رسالہ ہے۔
۸۔ صحیفہ صحیحہ	بروایت ہمام بن منبہ ابوہریرہ کی تالیف ہے۔

نبوت اور خلافت کے زمانے میں انفرادی طور پر کچھ حضرات نے حدیث کا کتابی سرمایہ جو چھوڑا ہے اس کا خاکہ آپ کے سامنے ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ تدوینِ حدیث کے لیے خلافتِ راشدہ میں ان خاص وجوہ و اسباب کی وجہ سے جن کی تفصیل صفحات بالا میں دی گئی ہے وہ اہتمام نہیں کیا گیا جو قرآن عزیز کے لیے عمل میں آیا ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سوچتا ہوں کہ شروع ہی سے دونوں میں فرق مراتب کو

ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور سوچا گیا ہے کہ سنت کا سرمایہ بلحاظ ثبوت قطعیت میں قرآن کے برابر نہ ہو تاکہ کلام الٰہی اور کلام رسول کا وہ جوہری فرق قائم رہے جسے خود وحی الٰہی نے روز اول ہی سے قائم رکھا ہے۔ اسی بنا پر اصولیین نے سنت کا مرتبہ قرآن کے بعد رکھا ہے۔ شاطبی لکھتے ہیں:

رتبۃ السنۃ التاخر عن الکتاب فی الاعتبار [1]

اس کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہے کہ اگر بظاہر قرآن اور حدیث میں معارضہ ہو جائے تو قرآن کو مقدم اور حدیث کو مؤخر کیا جائے گا۔

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن سے ثابت شدہ احکام کا درجہ فرض کا اور سنت سے معلوم شدہ مسائل کی حیثیت وجوب، سنت، استحباب اور ندب سے زیادہ نہیں ہوتی۔

آپ ایک لمحہ کے لیے سوچئے کہ اگر سارا سرمایہ قرآن ہی کی طرح قطعیت رکھتا تو اسلام میں ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی حیثیت بھی فرض سے کم نہ ہوتی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر ترکِ فرض کی عقوبت کا اندیشہ ہوتا۔ پوری زندگی اجیرن ہو جاتی اور اس کے نتیجے میں وہ اسلامی معاشرہ وجود میں نہ آسکتا جو آج اسلام کے نام پر موجود ہے اور وہ سہولت اور آسانی یکسر ختم ہو جاتی جو قرآن نے قائم کی تھی۔

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر

افراط و تفریط کے درمیان راہِ اعتدال یہی ہے کہ نہ تو سارے علمی سرمایہ کی قطعیت قائم کر کے ایک ایک چیز کو فرض قرار دیا جائے اور نہ سارے ہی کو بالکل ختم کر کے فکر و عمل کی ایسی آوارگی اور آزادی پیدا کی جائے کہ اسلامی زندگی ناپید ہو کر رہ جائے اس لیے ارادۃً حدیث کے ساتھ ایسا طرزِ عمل اختیار کیا گیا کہ اس کا درجہ قرآن سے دوسرا ہو گیا۔ بہرحال حدیث نے اسی طرح سینہ اور سفینہ سے گزر کر قرنِ اول کو عبور کیا اور صفر ۹۹ھ میں خلیفہ صالح حضرت عمر بن عبدالعزیز سریر آرائے خلافت ہوئے۔ آپ نے اپنے ممالک محروسہ میں سرکلر جاری کیا کہ حدیثِ نبوی کو جمع کیا جائے جیسا کہ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے صرف اہل مدینہ کو نہیں بلکہ تمام اطراف مملکت میں حکم نامہ روانہ کیا تھا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے حافظ ابو نعیم اصفہانی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

کتب عمر بن عبدالعزیز الی الآفاق انظروا احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاجمعوہ [2]

---

[1] الموافقات ج ۴ ص ، [2] فتح الباری ج ۱ ص ۳۰۔

حضرت عمر نے اطراف میں خط روانہ کیا کہ حدیث کو تلاش کرو اور یکجا کرو۔
مدینہ منورہ کے قاضی ابوبکر کو جو سرکاری حکم اس سلسلے میں ملا تھا اس کا اجمالی تذکرہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں امام بخاری نے اگرچہ قاضی ابوبکر کے اس حکم کا صرف اتنا ہی حصہ درج کیا ہے کہ :

انظر ما کان من حدیث رسول اللہ فاکتبہ فانی خفت
دروس العلم وذھاب العلماء [1]

لیکن ابن سعد نے طبقات میں یہ اضافہ بھی کیا ہے :

انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
او سنۃ ماضیۃ او حدیث عمر فاکتبہ فانی خفت
دروس العلم و ذھاب العلماء [2]

حدیث رسول اللہ ، سنۃ ماضیہ ، حدیث عمر کو لکھو کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہے۔

امام محمد نے مؤطا میں یہ خط اس طرح درج کیا ہے کہ

انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
او سنۃ او حدیث عمر او نحو ھذا فاکتبہ لی فانی
قد خفت دروس العلم وذھاب العلماء [3]

بعض روایات میں عمرہ کے ساتھ قاسم بن محمد کا نام بھی آیا ہے۔ چنانچہ امام مالک فرماتے ہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر کو یہ بھی لکھا ہے کہ عمرہ اور قاسم کے پاس جو علم ہے اس کو لکھ کر بھیجیں۔ [4]

ان تمام بیانات کو پڑھ کر تاریخ کا طالب علم اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ

الف : امیر المومنین نے صرف ایک ابوبکر کے نام ہی نہیں بلکہ تمام ممالک محروسہ میں مختلف اطراف میں ایک سے زیادہ حضرات کے نام یہ پیام بھیجا۔ چنانچہ علامہ سیوطی امام زہری سے ناقل ہیں کہ :

---

[1] بخاری شریف جلد اول ۔ [2] طبقات ابن سعد۔ [3] مؤطا امام محمد ص ۳۹۱ ۔
[4] تہذیب التہذیب ۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سالم بن عبداللہ کو لکھا تھا کہ صدقات کے
بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جو معمول رہا ہے وہ ان کو لکھ
کر بھیجیں چنانچہ سالم نے جو کچھ انہوں نے پوچھا تھا وہ ان کو لکھ بھیجا۔[1]

اور امام زہری کو بھی خاص طور پر تدوین سنن کے کام پر مامور فرمایا۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبر نے امام زہری کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

ہم کو عمر بن عبدالعزیز نے تدوین سنن کا حکم دیا تو ہم نے دفتر کے
دفتر لکھ ڈالے اور پھر انہوں نے ہر اس زمین پر کہ جہاں ان کی حکومت
تھی ایک دفتر بھیج دیا۔[2]

ان کے علاوہ دمشق میں اس وقت شام کے مشہور امام اور فقیہ مکحول دمشقی موجود تھے۔ ابن الندیم نے الفہرست میں ان کی تصانیف کے سلسلے میں کتاب السنن کا ذکر کیا ہے۔ غالباً یہ کارنامہ بھی امام مکحول نے امیرالمومنین کے حکم ہی کی تعمیل میں انجام دیا ہے۔ نیز علامۃ التابعین امام شعبی کے متعلق جو حافظ سیوطی نے حافظ ابن حجر عسقلانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

اما جمع حدیث الی مثلہ فقد سبق الیہ الشعبی فانہ روی
عنہ انہ قال ھذا باب من الطلاق جسیم[3]

چونکہ امام شعبی بھی قاضی ابوبکر کی طرح کوفہ میں عمر بن عبدالعزیز ہی کے زمانے میں منصب قضا پر تھے جیسا کہ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں یحییٰ بن معین کے حوالہ سے تصریح کی ہے اس لیے خیال ہے کہ امام شعبی نے کوفہ میں احادیث جمع کرنے کا کام سرکاری حکم کے تحت کیا ہوگا امام موصوف چونکہ بالغ النظر یگانہ روزگار فاضل تھے اس لیے آپ نے اس تالیفی کارنامہ میں صرف احادیث جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کو ابواب پر بھی تقسیم کیا۔ امام زہری امام سالم، امام مکحول اور امام شعبی کے علمی کارناموں کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ آئیے اب قاضی ابوبکر کے کارنامے کا بھی کچھ حال سن لیجئے۔

اتنی بات تو آپ سن چکے ہیں کہ قاضی ہونے کی حیثیت میں آپ کے نام بھی سرکاری حکم آیا تھا۔ آپ نے اس حکم کی بجا آوری کس حد تک کی؟۔

---

[1] تاریخ الخلفاء ص ۱۶۱۔ [2] جامع بیان العلم وفضلہ۔ [3] تدریب الراوی ص ۴۰

حافظ ابن عبد البر نے تمہید میں امام مالک کی زبانی یہ انکشاف کیا ہے کہ

فتوفی عمر و قد کتب ابن حزم کتبا قبل ان یبعث الیہ۔[1]

عمر بن عبد العزیز کی وفات کے وقت ابن حزم کتابیں لکھ چکے تھے لیکن ابھی روانہ نہیں کی تھیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قاضی صاحب موصوف نے امیر المومنین کے حکم کی تعمیل میں حدیث کی ایک سے زیادہ کتابیں لکھیں مگر قاضی صاحب کا یہ علمی کام پایہ تکمیل کو پہنچا تو عمر بن عبد العزیز اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔

ب: دوسری بات اس خلافت کے فرمان میں یہ سمجھنے کی ہے کہ فرمان خلافت میں صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث جمع کرنے کا نہیں بلکہ اس کے ساتھ سنت ماضیہ اور فاروق اعظم کے فیصلے بھی لکھنے کا حکم دیا تھا سنت سے مقصود اسلام کا وہ محسوس نظام عمل ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں چھوڑا تھا اور جس پر اُمت عمل پیرا تھی۔

السنۃ ھی الطریقۃ المسلوکۃ لجماعۃ المسلمین المتوارثۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم[2]

حدیث سے روایت سنت کا وہ سرمایہ مراد ہے جو لوگوں نے بڑی محنتوں اور عرق ریزیوں کے بعد فراہم کیا۔ یاد رہے کہ اسناد و روایت کی باتیں اسلام کے علمی سرمایہ میں سنت کے لیے نہیں بلکہ تاریخ سنت حدیث کے لیے ہیں۔ سنت تو تواتر اور توارث کے ذریعے ہمیشہ سے موجود ہے۔ فخر الاسلام بزدوی نے دین کے اسی حصے یعنی سنت کے متعلق لکھا ہے:

اس کی ایسی حالت ہے جیسے خود کسی معائنہ اور براہ راست شنید کی ہوتی ہے۔

انہوں نے اس راہ سے آنے والی چیزوں کو گنواتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

مثل نقل القرآن والصلوات الخمس واعداد الرکعات ومقادیر الزکوۃ۔

---

[1] تنویر الحوالک مقدمہ ص ۴۔ [2] التانیب ص ۷

تواتر کا علم الاسناد کے مباحث سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ملا محب اللہ فرماتے ہیں:

ان التواتر لیس من مباحث علم الاسناد

بلکہ اس سے بھی آگے قدم بڑھا کر مولانا بحرالعلوم نے یہ انکشاف کیا ہے:

التواتر کالمشافہۃ فی افادۃ العلم [1]

حافظ ابن حزم نے اس موقعہ پر ایک تفصیلی بیان قلم بند فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں۔

اسلام کا علمی سرمایہ جو نبوت سے اُمت کو ملا ہے صرف یہ ہے۔

۱۔ قرآن، نمازیں، رمضان کے روزے، حج اور زکوٰۃ اور سارے اسلامی شرائع، یہ سب بطور تواتر منقول ہو کر اُمت کو ملا ہے۔ اس کو بیان کرنے والے اور پیش کرنے والے ہمیشہ زمانۂ نبوت سے مشرق و مغرب میں اس قدر ہوتے ہیں کہ ان پر کوئی بھی شک نہیں کر سکتا۔

۲۔ نقل عام جیسے آیات و معجزات جو خندق اور تبوک میں نمایاں ہوتے۔ احکام حج اور مقادیر زکوٰۃ ان کو نبوت سے نقل کرنے والے اتنی تعداد میں ہوتے ہیں اور ہمیشہ رہے ہیں کہ ہر دور کے علماء اور اہلِ تحقیق نے اسے قبول کیا ہے اسے مشہور کہتے ہیں۔

۳۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، صحابہ کے فیصلے اور تابعین کے فتاویٰ۔ یہ اُمت کو خبرِ واحد کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں ان کے نقل کرنے والے ذاتِ نبوت تک ثقہ اور معتبر اشخاص ہیں۔ ان کا نام و نسب معلوم اور ہر ایک کا حال، زمان، مکان اور عدالت معروف ہے۔ اس طریق سے جو معلومات آئی ہیں ان میں بیان کرنے والے متعدد ہوتے ہیں گاہ واسطہ بواسطہ اور نام بنام بات ذاتِ نبوت تک پہنچتی ہے کبھی صحابہ تک اور کبھی کسی ایسے تابعی تک جسے صحابی کی دید کا شرف حاصل ہوا ہو۔ [2]

اس ساری تفصیل کو ہم اپنے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا علمی سرمایہ جو اُمت کو نبوت سے وراثت میں تواتر، شہرت اور خبرِ واحد کے ذریعے ملا ہے یہ ہے۔ قرآن، سنت، حدیث۔ قرآن و سنت دونوں متواتر ہیں فرق صرف یہ ہے کہ قرآن کا تواتر علمی اور سنت کا تواتر عملی ہے اور سنت کی تاریخ جس ذریعے سے ہم کو پہنچی ہے یعنی خبرِ واحد یا خبرِ خاصہ اس کا نام حدیث ہے۔ حافظ سیوطی نے حدیث کی یہ تعریف کی ہے۔

---

[1] فواتح الرحموت ج ۲ ص ۱۱۹۔ [2] الفصل فی الملل والاہواء والنحل ج ۲ ص ۸۲۔

نقل السنة ونحوھا واسناد ذالك الی من عزی الیہ بتحدیث او اخبار او غیر ذالک[1]

زمانِ خلافت میں حدیثِ عمرؓ کا اضافہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فرمان میں حدیثِ عمر کا اضافہ یہ سمجھانے کے لیے کیا گیا ہے کہ پورے اسلام کی تاریخ نبوت اور خلافت کے مجموعہ کا نام ہے جیسا کہ اس کے متعلق کچھ اشارات پہلے ہو چکے ہیں۔ حدیثِ عمر کے ساتھ اس فرمان میں او نحو ھذا کا اضافہ پورے نظام خلافت کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی نے التعلیق الممجد میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

من احادیث بقیۃ الخلفاء[2]

اسلام میں خلفاء راشدین کی سنّت

یہاں ذہنوں میں ایک خلش محسوس ہوتی ہے کہ خلفاء راشدین کی سنّت دین میں حجت اور دلیل نہیں ہے کیونکہ امام بخاری نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فرمان میں یہ بات صراحۃً بتائی ہے چنانچہ امام بخاری فرماتے ہیں۔

وکتب عمر بن عبدالعزیز الی ابی بکر بن حزم انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبہ لی فانی خشیت دروس العلم وذھاب العلماء ولا یقبل الاحدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولیفشوا ولیجلسوا حتی یعلم من لا یعلم فان العلم لا یھلک حتی یکون سرًا۔[3]

یہ وسوسہ اس لیے پیدا ہوا کہ اس پوری عبارت کو عمر بن عبدالعزیز کی عبارت تصور کر لیا گیا حالانکہ فرمان کی عبارت صرف ذھاب العلماء تک ہے۔ حافظ ابونعیم اصفہانی نے مستخرج میں اس کی تصریح کی ہے اور لا یقبل سے امام بخاری کی اپنی عبارت شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ حافظ عینی

---

[1] تدریب الراوی ص ۲۲۔ [2] التعلیق الممجد ص ۳۹۲۔ [3] صحیح بخاری۔

سے رقمطراز ہیں۔

فاذا کان کذالک یکون ھذا من کلام البخاری اوردہ عقیب کلام عمر بن عبدالعزیز بعد انتھائہ[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ عبارت مذکورہ کے بعد جب اس فرمان کی سند پیش کی تو تصریح کردی کہ یہ تعلیق صرف ذھاب العلماء تک ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

حدثنا العلاء بن عبدالجبار حدثنا عبدالعزیز بن مسلم عن عبداللہ بن دینار بذالک یعنی حدیث عمر بن عبدالعزیز الی قولہ ذھاب العلماء[2]

علامہ کرمانی فرماتے ہیں کہ :

والمقصود منہ ان العلاء روی کلام عمر بن عبدالعزیز الی قولہ ذھاب العلماء فقط[3]

اس لیے اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ فرمان میں حدیث رسول کے سوا کچھ اور لکھنے سے منع کیا گیا تھا ایک سنگین غلط فہمی ہے۔ اس موضوع پر جمہور اُمت کی ہمیشہ سے یہ طے شدہ پالیسی رہی ہے جیسا کہ آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ خلافت راشدہ کی حیثیت دین میں معیار حق اور حجت و دلیل کی ہے اور اسلام میں سنت کا اطلاق نبوت اور خلافت دونوں کے اعمال پر ہوا ہے۔ قرآن میں یہ بات دلالۃً اور ارشادات نبوت میں صراحۃً آئی ہے۔ قرآنی آیات آپ پہلے سن چکے ہیں۔ آئیے خاص اسی موضوع پر ارشادات نبوت بھی گوش گزار فرمالیجئے :

حضرت عرباض بن ساریہ کی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین عضوا علیھا بالنواجذ وایاکم ومحدثات الامور فان کل محدثۃ بدعۃ[4]

تم میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت کو لازم جانو اور اس کو دانتوں سے

---

[1] عمدۃ القاری ج ا ص ۱۳۰۔ [2] صحیح بخاری۔ [3] عمدۃ القاری ج ا ص ۱۳۰
[4] مستدرک حاکم ج ا ص ۹۶۔

دبالو۔ نئی نئی باتوں سے بچ کر رہو۔ یاد رکھو کہ ہر نئی بات بدعت ہے۔
ملا علی قاری اس حدیث کی شرح میں ارقام فرماتے ہیں:

اس لیے کہ خلفاء راشدین نے دراصل آپ ہی کی سنت پر عمل کیا ہے اور ان کی طرف سنت کی نسبت یا تو اس لیے ہوئی کہ انہوں نے اس پر عمل کیا اور یا اس لیے کہ انہوں نے خود قیاس اور استنباط کرکے اس کو اختیار کیا۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ خلفاء راشدین نے جو کام اپنے تفقہ و قیاس اور اجتہاد و استنباط سے سمجھ کر اختیار کیا ہے وہ بھی سنت ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد کے تحت اُمت کو اس کے تسلیم کرنے سے بھی چارہ نہیں ہے۔

بعض حضرات کو یہ شبہ ہوا ہے کہ خلفاء راشدین کی سنت صرف وہی ہو سکتی ہے جو بعینہٖ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے مروی ہو اور جو چیز آپ سے مروی نہ ہو اور خلفاء راشدین میں سے کسی نے اس پر عمل کیا ہو یا اس کے متعلق حکم دیا ہو تو وہ سنت نہ کہلائے گی چنانچہ مشہور عالم امیر یمانی محمد بن اسماعیل لکھتے ہیں:

قواعد شرعیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ راشد کو کوئی ایسا طریقہ رائج کرنے کا حق نہیں ہے جس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم عامل نہ تھے۔[2]

لیکن یہ تحقیقی بات نہیں ہے کیونکہ

خلفاء کی سنت ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے موبمو موافق ہو اور اس سے ذرا بھی مخالف نہ ہو کیونکہ جو حکم انہوں نے اپنے قیاس و اجتہاد سے جاری کیا ہے وہ بھی سنت ہے حالانکہ یہ ایک بیّن حقیقت ہے کہ ان کا اپنا ذاتی قیاس و استنباط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے منقول نہیں ہے۔ اگرچہ اصل مقیس علیہ منقول ہو۔ مثلاً دیکھئے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم نے اور حضرت ابوبکرؓ نے شرابی کو چالیس چالیس کوڑے سزا دی اس سے زیادہ ان سے ثابت نہیں ہے مگر حضرت عمرؓ نے اسی کوڑے سزا دی ہے یہ بھی سنت ہے حضرت علی فرماتے ہیں کہ:

---

[1] مرقاۃ المفاتیح ج ا ص ۳۰۔ [2] سبل السلام ج ۲ ص ۱۲۔

جلد النبی صلی اللہ علیہ وسلم اربعین وابوبکر اربعین وعمر
ثمانین وکل سنۃ [1]

امام حاکم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عثمان کا بھی ذکر کیا ہے ۔

واتمہا عثمان ثمانین وکل سنۃ [2]

روایت صحیح مسلم کی ہے جس کے صحیح ہونے کے بارے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا اور کہنے والے حضرت علی خلیفہ راشد ہیں جو سنت اور بدعت کے مفہوم کو بخوبی جانتے ہیں اور اس میں حضرت عمر، حضرت عثمان کے اس فعل کو بھی وہ سنت ہی کہتے ہیں جو بظاہر حضور انور صلی اللہ وسلم کے عمل کے خلاف ہے چنانچہ امام نووی لکھتے ہیں :

ھٰذا دلیل ان علیاً کان معظماً لآثار عمر وان حکمہ وقولہ سنۃ وامرہ حق وکذالک ابوبکر [3]

اسی بنا پر حافظ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ :

قول الشیخین حجۃ اذا اتفقا لایجوز العدول عنہ وان اتفاق الائمۃ الاربعۃ ایضاً حجۃ [4]

ابوبکر وعمر کا قول حجت ہے جب دونوں متفق ہو جائیں تو اس سے ہٹنا جائز نہیں ہے ۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

عمل اھل المدینۃ الذی یحتج بہ ماکان فی زمن الخلفاء الراشدین ۔[5]

اہل مدینہ کا وہ عمل حجت ہے جو زمانہ خلفاء راشدین میں ہوا ہو ۔

یہ تصریحات بتا رہی ہیں کہ اسلام کا پورا نقشہ نبوت اور خلافت سے مل کر بنتا ہے ۔ خیر یہ بات تو حدیث وسنت میں فرق بتانے کے لیے ضمناً آگئی ہے بتا یہ رہا تھا کہ امیر المومنین عمر بن عبد العزیز نے تدوین حدیث کا حکم تمام اطراف مملکت میں روانہ کیا ان میں مدینہ کے قاضی ابوبکر، امام زہری، امام سالم اور کوفہ میں امام شعبی، دمشق میں امام مکحول کا ذکر ہو چکا ہے ۔ اگرچہ

---

[1] صحیح مسلم ج ۲ ص ۷۲ ۔ [2] معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۸۱ ۔ [3] شرح مسلم ج ۲ ص ۷۲ ۔
[4] منہاج السنۃ ج ۳ ص ۱۶۲ ۔ [5] زاد المعاد ج ۱ ص ۱۶۸ ۔

تاریخ میں امام نافع کے بارے میں کوئی مثبت تصریح نہیں ہے لیکن اگر ہم ان دو باتوں کو ملالیں کہ
آپ نے یہ حکم تمام اطراف مملکت میں روانہ کیا تھا۔
اور ساتھ ہی امام نافع کے بارے میں امام ذہبی کی یہ تصریح بھی پڑھیں کہ
بعث عمر بن عبدالعزیز نافعاً الی اهل مصر لیعلمهم السنن
عمر نے حضرت نافع کو مصر والوں کے لیے معلم سنن بنا کر روانہ فرمایا۔
تو پھر یہ یقین آجاتا ہے کہ امام نافع کو بھی مصر میں یہ حکم ضرور پہنچا ہوگا اور انہوں نے بھی اس حکم کی تعمیل میں ضرور تدوین سنن کا کام کیا ہوگا بلکہ میں تو جزیرہ کے مشہور قاضی میمون بن مہران کو بھی اسی میں داخل کرتا ہوں۔

ان تمام تصریحات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ۹۹ھ سے ۱۰۱ھ تک حدیث کے نام پر امیرالمومنین کے اس فرمان کے نتیجے میں یہ علمی سرمایہ منصۂ شہود پر آگیا۔

۱۔ کتب قاضی ابوبکر بن حزم۔
۲۔ دفاتر امام زہری
۳۔ ابواب امام شعبی
۴۔ کتاب السنن امام مکحول
۵۔ کتاب الصدقات امام سالم

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ۲۵ رجب ۱۰۱ھ کو رحلت فرمائی۔ آپ کی مدت خلافت کل دو سال پانچ ماہ ہے۔ یہ تصانیف اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ صحابہ کی تصانیف کو بھی اگر ان کے ساتھ ملا لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۰۱ھ تک خالص حدیث کے موضوع پر نیرہ کتابیں منصۂ صحافت پر آچکی تھیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں جن بزرگوں نے کتابیں تالیف کی ہیں۔ یہ سب کبار تابعین ہیں۔ ان میں امام نافع، امام سالم، امام زہری اور امام شعبی حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے اساتذہ ہیں اور امام شعبی کے متعلق تو حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ یہ فن حدیث میں امام اعظم کے شیوخ میں شمار کیے جاتے ہیں چنانچہ امام ذہبی نے جہاں امام شعبی کے تلامذہ فن حدیث میں امام ابوحنیفہ کا نام لیا ہے ساتھ ہی یہ لکھ دیا ہے۔

وهو اکبر شیخ لابی حنیفة ۔[1]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ترجمہ امام شعبی

جمع قرآن، بیان قرآن پر ایک اہم نکتہ تفسیری

یہاں یہ سوچنے کی بات ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے یہ کام کیوں کیا۔
یہ بات تو آپ سن چکے ہیں کہ دورِ خلافت میں جمع قرآن، قرأت قرآن کے ساتھ تدوین سنن کا کام کیوں نہیں ہوا۔
دراصل جہاں تک میں سمجھا ہوں جمع قرآن، قرأت قرآن یا تدوین سنن تینوں کام اپنے اپنے وقت میں منشأ الٰہی کے مطابق منصۂ شہود پر آتے ہیں۔
منشأ الٰہی سے میری مراد یہ ہے کہ جو کچھ اور جیسا کچھ ہوا ہے۔ یہی قرآن کا وعدہ تھا۔ آپ پڑھ آئے ہیں کہ سورۂ قیامہ کی آیت

اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ۔

میں ان علینا بیانہ سے قرآن کی دوسری آیت

اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ

کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان مراد ہے کیونکہ سورۂ قیامہ کی مذکورہ بالا آیت میں اللہ سبحانہٗ نے حضور انور کو نزول وحی کے وقت یہ حکم دیا ہے۔

لَا تُحَرِّکْ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ

اس کا منشأ یہ ہے کہ آپ نزول وحی کے وقت سنا کریں حضرت جبریل کے ساتھ پڑھا نہ کریں اور مستقبل میں قرآن کے بارے میں تین وعدے فرماتے ایک جمع قرآن دوم قرأۃ قرآن، سوم بیان قرآن۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ

اللہ سبحانہٗ نے اس آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آپ قرآن کے بارے میں بالکل مطمئن رہیں اس کو جمع کرنا، پڑھوانا اور پھر اس کا بیان ہمارے ذمہ ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں اگرچہ حضرت عبداللہ بن عباس سے یہ تشریح آئی ہے:
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ وحی کے وقت بڑی مشقت سے

دو چار ہوتے اور آپ ہونٹوں کو ہلاتے تھے۔ یعنی وحی سنتے جاتے اور پڑھتے جاتے مگر باآوازِ بلند نہیں بلکہ صرف ہونٹوں کو ہلاتے تھے اس پر اللہ پاک نے یہ حکم نازل کیا لا تحرک بہ... الخ جمع سے مراد سینہ میں جمع کرنا ہے اور قرآن سے مراد حضور کا پڑھنا ہے۔ فاتبع قرآنہ کا مطلب یہ ہے کہ چپ رہو اور کان لگا کر سنو ثم ان علینا بیانہ میں بیان کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر ہم تمہیں پڑھاویں گے۔

اس روایت کے بارے میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

اس روایت میں مرفوع حدیث صرف اسی قدر ہے جس قدر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت کے متعلق ہے باقی آیت کی تفسیر حضرت ابن عباس کی رائے ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے اس آیت کی تفسیر ابن عباس پر یہ تنقید کی ہے :

فقیر کہتا ہے کہ یہ تفسیر محلِ نظر ہے کیونکہ اس تفسیر پر تینوں الفاظ جمع، قرآن اور بیان کا منشا ایک ہے تینوں الفاظ کو ایک ہی معنے کا جامہ پہنانا شانِ بلاغت نہیں ہے۔ پھر ثم ان علینا بیانہ کا ایسا مطلب بتانا جو بغیر معقول تاخیر کے واقع ہوا ہو اور بھی شانِ بلاغت کے منافی ہے کیونکہ لفظ ثم کلامِ عرب میں تراخی کے لیے آتا ہے[1]

اس کے بعد شاہ صاحب نے اس آیت کی جو تشریح فرمائی ہے وہ بھی ان ہی کی زبان سے سُن لیجئے :

زیادہ اچھی تفسیر یہ ہے کہ ان علینا جمعہ کا یہ مطلب لیا جائے کہ قرآن کو کتابی صورت میں یکجا کرنے کا وعدہ ہمارے ذمہ ہے۔ قرآنہ کا مطلب یہ ہے کہ امت کے قاریوں کو اور نیز رائے عامہ کو تلاوت کی توفیق دینا ہمارا کام ہے تاکہ سلسلۂ تواتر قائم رہے بالفاظِ دیگر حق سبحانہ کا ارشاد ہے کہ اے پیغمبر تم فکر نہ کرو اور اس کے یاد کرنے کی مشقت نہ اٹھاؤ

---

[1] ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۱۹۲۔

دیکھو ہم نے قرآن کے لیے وہ بات اپنے ذمہ کر لی ہے جو تمہارے فرض منصبی سے بھی کئی درجہ پیچھے ہے یعنی قرآن کو مصاحف میں جمع کرا دینا اور اس کو امت سے پڑھا دینا۔ لہٰذا تم اپنا دل اس کے یاد کرنے میں نہ لگاؤ بلکہ جب ہم بزبان جبریل پڑھیں اسے سنو۔ پھر ہمارے ذمہ ہے قرآن کی توضیح۔ ہم ہر زمانے میں قرآن کی تشریح اور اس کے شان نزول کو بیان کرنے کی ایک جماعت کو توفیق دیں گے تاکہ وہ لوگ قرآن کا مصداق بتائیں۔[1]

جمع قرآن اور قرأت قرآن دونوں ایک وقت میں ہوتے ہیں اور تاریخی لحاظ سے یہ شیخین کا زمانہ ہے کیونکہ قرآن میں ان دونوں کو واو عطف کے ذریعے جمع کیا گیا ہے ان علینا جمعہ وقرآنہ جیسے جمع کا کام فاروق اعظم کے مشورے سے صدیق اکبر کے زمانے میں ہوا ایسے ہی پورے قرآن کے حفظ وقرأت کا سلسلہ بھی فاروق اعظم کے زمانے میں ہوا۔ چنانچہ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

اول شروع حفظ آں از جانب ابی بن کعب وعبداللہ بن مسعود بودہ است در زمان عمر۔[2]

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جمع قرآن یعنی قرآن کو کتابی صورت میں کرنے کے بعد حفظ قرأت قرآن کی طرف فاروق اعظم نے رمضان میں قرآن کی سالگرہ منا کر اقدام فرمایا تھا بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ فاروق اعظم نے حفظ ہی کی خاطر سرکاری خزانے سے وظائف اور معلمین قرآن کی تنخواہیں مقرر کیں جیسا کہ ابن الجوزی نے سیرۃ العمرین میں لکھا ہے۔ خانہ بدوش بدوؤں کے لیے قرآن حکیم کی جبری تعلیم کا قانون نافذ کیا۔ چنانچہ ایک شخص کو جس کا نام ابوسفیان تھا چند آدمیوں کے ساتھ اس کام پر لگایا کہ قبائل میں پھر کر ہر شخص کا امتحان لے اور جسے قرآن حکیم کا کوئی حصہ یاد نہ ہو اسے سزا دے۔[3]

ظاہر ہے کہ امتحان کی منزل اسی وقت درپیش آتی ہے جبکہ پہلے اس مقصد کی خاطر پوری آبادی میں تعلیم قرآن کا ایک ہمہ گیر نظام قائم کر دیا گیا ہو۔ جن صحابہ کو پورا قرآن یاد ہو گیا تھا۔

---

[1]، [2] ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۱۹۳۔ [3] الاغانی ج ۶ ص ۵۸، الاصابہ

فاروق اعظم نے ان کو بلا کر فرمایا۔ شام کے مسلمانوں کو قرآن کی تعلیم دیں۔ چنانچہ حضرت ابوالدرداء حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عبادۃ بن الصامت کو اس مشن پر روانہ کیا۔ حضرت عمر نے ان کو ہدایت کی کہ پہلے حمص جائیں وہاں کچھ روز قیام کر کے جب قرآن کی تعلیم عام ہو جائے تو ایک اسی جگہ قیام کرے۔ باقی دو میں سے ایک دمشق اور ایک فلسطین جائے۔ حافظ ذہبی نے طبقات القرّا میں لکھا ہے کہ حضرت ابوالدرداء کا دمشق میں معمول یہ تھا کہ صبح کی نماز کے بعد جامع مسجد میں تشریف فرما ہوتے اردگرد قرآن پڑھنے والوں کا ہجوم ہوتا۔ حضرت ابوالدرداء دس دس آدمیوں کی الگ الگ جماعت بنا دیتے اور ہر جماعت پر ایک قاری مقرر کر دیتے اور خود ٹہلتے رہتے جب طالب علم پورا قرآن یاد کر لیتا تو حضرت ابوالدرداء اسے اپنی شاگردی میں لے لیتے۔ ایک بار حضرت ابوالدرداء کی خاص کلاس کے طلبہ کا شمارہ کیا گیا تو ان کی تعداد سولہ سو حفاظ پر مشتمل تھی۔

حضرت عمر نے قرآن کے حفظ و قرأت کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کے لیے اور بہت سے وسائل اختیار کیے ضروری سورتوں مثلاً البقرہ، النسار، المائدہ، الحج اور النور کی نسبت حکم دیا کہ ہر ایک عامہ کو اس قدر قرآن ضرور یاد ہونا چاہیے [1]

سرکلر جاری کر دیا کہ جو لوگ قرآن سیکھ لیں ان کی تنخواہیں مقرر کر دی جائیں فوجیوں کو ہدایت تھی کہ قرآن شریف یاد کریں۔ گاہ گاہ دفاتر سے قرآن خواں حضرات کے رجسٹر منگاتے رہتے تھے ان تدابیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان گنت لوگ قرآن پڑھ گئے اور حافظوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ ایک بار فوجی افسروں کو خط لکھا کہ حفاظِ قرآن کو میرے پاس روانہ کیا جائے تاکہ میں ان کو قرآن کی تعلیم کے لیے مختلف جگہ روانہ کروں تو حضرت سعد نے جواب دیا کہ صرف میری فوج میں تین سو حافظ ہیں [2]

الغرض کتابی صورت میں جمع کے ساتھ فاروق اعظم نے حفظ و قرأت کا ایک بندھا ٹکا نظام قائم کر دیا۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے صحیح فرمایا ہے :

امروز ہر کہ قرآن می خواند از طوائف مسلمین منتِ فاروق در گردن اوست [3]

آج جو بھی قرآن پڑھتا ہے اس کی گردن پر فاروق اعظم کا احسان ہے ۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ جمع قرآن در مصاحف اور قرأتِ قرآن کا وعدہ الٰہی زمانہ خلافت راشدہ

---

[1] ، [2] کنز العمال ج ۱ ص ۲۱۰، ۲۲۴ ۔ [3] ازالۃ الخفاء

میں پورا ہوا۔ اور ان علینا جمعہ و قرآنہ کی عملی تفسیر ہو گئی لیکن آخری وعدہ قرآن کے متعلق جو اسی آیت میں ثم ان علینا بیانہ کے ذریعے کیا گیا ہے وہ خلافت راشدہ میں نہیں بلکہ دیر کے بعد خلافت عمر بن عبدالعزیز میں پورا ہوا۔ کیونکہ یہ وعدہ ثم کے ذریعے آیت میں آیا ہے اور آپ سن آئے ہیں کہ عربی زبان میں ثم تراخی کے لیے ہی آتا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے ثم ان علینا بیانہ کی تشریح یہ کی ہے :

> ہمارے ذمہ ہے قرآن کی توضیح یعنی ہر زمانے میں ہم ایک جماعت کو قرآن کی لغوی تشریحات اور اس کی شان نزول بیان کرنے کی توفیق دیں گے تاکہ وہ لوگ احکام قرآنی کا مصداق بیان کریں اور یہ بات یاد کرنے اور تمہاری تبلیغ کے بعد ہوگی۔ کیونکہ قرآن کی آیات میں تشابہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن عزیز کے مبیّن ہیں [1]

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مبیّن ہونے کی حیثیت کو قرآن نے بتایا ہے کہ :

> أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۔

چونکہ حضور انور قرآن کے مبیّن ہیں اس لیے حضور کی سنت ہی قرآن کا بیان ہے۔ اس بیان کی تدوین کے لیے ضروری ہے کہ حفظ قرآن کے دیر بعد ہو۔ کیونکہ اللہ پاک نے اول تو جمع قرآن کے بعد بیان قرآن کا ذکر کیا ہے۔ اور پھر اس کو ثم کے ذریعے پیش کیا ہے جو عربی زبان میں قطعاً تراخی کے لیے آتا ہے۔ اس کا واضح اور صاف مطلب یہ ہے کہ بیان قرآن سے مراد بیان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور جمع قرآن کی طرح اس بیان کی بھی تدوین ہوتی ہے لیکن ایک عرصہ بعد اور یہ حضور انور کے دنیا سے روانہ ہونے کے پورے نناسی سال بعد ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ :

> در وعد بیان کلمہ ثم کہ برائے تراخی است ذکر نمودن می فہماند کہ در وقت جمع قرآن در مصاحف اشتغال بتلاوت آں شائع شد و تفسیر آں من بعد بظہور آمد و در خارج ہم چنیں متحقق شد [2]

---

[1] ازالۃ الخفاء جلد دوم۔ [2] ازالۃ الخفاء ص ۱۹۳۔

لہٰذا تدوین سنن یعنی بیانِ قرآن کا کام زمانۂ خلافتِ راشدہ میں نہیں بلکہ قانونی طور پر عمر بن عبدالعزیز کے ایما سے خلافتِ راشدہ کے بعد ہوا۔

عمر اول اور عمر ثانی کے عمل میں ہم آہنگی

اللہ اکبر! دونوں کے عمل میں کس قدر ہم آہنگی ہے۔ جنگ یمامہ میں صحابہ کی ایک جماعت جامِ شہادت نوش کر گئی۔ قرآن کے حافظوں کے اس قدر اچانک نقصان سے قرآن کی حفاظت میں رخنہ پڑنے کا اندیشہ ہوا۔ فاروقِ اعظم نے اس خطرے کو محسوس کیا اور فرمایا۔

یمامہ کے دن قاری قرآن جامِ شہادت نوش کر گئے مجھے اندیشہ ہے کہ اگر قرامہ قرآن ایسے ہی جامِ شہادت نوش کرتے رہے تو قرآن کا زیادہ حصہ چلا جائے گا اس لیے جلد ہی قرآن کو یکجا کرنے کا حکم دیجیے۔

یہ تو یمامہ کے دن قاریوں کی شہادت سے حضرت عمر کو اندیشہ ہوا۔ آیئے اب دنیا سے وہ رخصت ہو رہے ہیں جنہوں نے قرآن کے بیان کو مدینے کی گلیوں میں چلتے پھرتے دیکھا ہے اور جنہوں نے قرآن کی ہدایات پر اٹھی ہوئی کامل ترین، مؤثر ترین اور محبوب ترین زندگی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔ انہوں نے قرآن مجید سے اقامت صلوٰۃ کا حکم سنا تھا مگر انہوں نے اس کی عملی تصویر اور اس کی صحیح کیفیت اسی وقت معلوم کی جب آپ کے ساتھ نمازیں پڑھیں اور آپ کے رکوع و سجود کی کیفیت دیکھی جس کو انہوں نے

نسمع له ازیزا کازیز المرجل

کے لفظوں سے تعبیر کیا ہے اور اب ان کی جگہ وہ آ رہے ہیں جنہوں نے جمال جہاں آرا کو نہیں دیکھا اس لیے عمر بن عبدالعزیز کو نبوت کی اداؤں اور اعمال کے حافظوں کو جاتا دیکھ کر اندیشہ ہوا کہ کہیں محبوب عالم کی ادائیں ان کے رُخِ انور کے نظارہ کرنے والوں کے ختم ہونے سے داستانِ تاریخ بن کر نہ رہ جائیں اور اس اندیشے کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا۔

خشیت دروس العلم و ذهاب العلماء

حضرت عمر کو قاریوں کے اور عمر ثانی کو علماء کے اُٹھ جانے کا یکساں اندیشہ ہوا۔ دونوں کے تاثرات کو ایک ترازو میں رکھ کر تولیے۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ دونوں جگہ ایک ہی روح کام کر رہی ہے۔

تدوینِ حدیث کی اوّلیت کا شرف

امیرالمومنین حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جمع حدیث کا جو حکم دیا اور جن جن اکابر نے اس حکم کی تعمیل میں کام کیا اس کی داستان تو آپ پڑھ چکے ہیں۔

ان میں قاضی ابوبکر کے علاوہ زہری، شعبی اور مکحول بھی ہیں چونکہ یہ چاروں معاصر ہیں اس لیے یقین سے یہ فیصلہ کرنا بے حد مشکل ہے کہ سب سے پہلے اس موضوع پر کس نے تدوین کا کام انجام دیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں عمر بن عبدالعزیز کے اس خط کی شرح کرتے ہوئے جو قاضی ابوبکر کے نام امام بخاری نے درج کیا ہے لکھا ہے۔

یستفاد منہ ابتداء تدوین الحدیث [1]

علامہ قسطلانی نے بھی شرح بخاری میں اس کی ہمنوائی کی ہے۔ اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ابوبکر مدونِ اوّل ہیں لیکن چونکہ قاضی صاحب کا کارنامہ شاہراہِ عام پر نہیں آیا اس لیے ان کا نام مدونین میں زیر بحث نہیں آتا۔ تہذیب التہذیب میں امام مالک سے منقول ہے کہ میں نے ان کتابوں کے بارے میں قاضی صاحب کے صاحبزادے عبدالرحمٰن بن ابی بکر سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ضائع ہو گئیں۔ اس لیے حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں، جلال الدین السیوطی نے الفیہ اور تدریب میں اور امام مالک اور عبدالعزیز دراوردی نے مدونِ اوّل کی حیثیت سے امام زہری کا نام پیش کیا ہے۔ لیکن اوّلیت کا یہ شرف امام زہری کو صرف تدوین میں ہے ورنہ جہاں تک حدیث کی تبویب کا تعلق ہے اس کی اوّلیت کا شرف کوفہ میں امام شعبی کو حاصل ہے۔ بالفاظِ دیگر حدیث کی تدوین کا شرف اگر اہلِ مدینہ کو حاصل ہے تو اس کی تبویب پر کوفہ والوں کو فخر ہے۔

دوسری صدی ہجری میں علم حدیث

پہلی صدی کے آخر میں خلیفہ راشد کے حکم سے جمع و تدوین حدیث کی جو صبح صادق طلوع ہوئی اسے دوسری صدی میں اتنی ترقی ہوئی کہ تصنیف و تالیف کا آفتاب نکل آیا اور احادیث مرفوعہ کے

---

[1] فتح الباری ج ۱ ص ۸۶۔

ساتھ صحابہ کے آثار اور تابعین کے فتاویٰ بھی اس دور کی تصانیف میں مرتب و مدون کر دیے گئے۔

دوسری صدی میں جن اکابر نے موضوع حدیث پر تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ہم سب کا ذکر کریں لیکن یہ بھی مشکل ہے کہ ہم بالکل ان کو نظر انداز کر دیں کیونکہ یہی وہ اکابر ہیں جو دورِ اوّل کے مصنفین کے جانشین اور ترکۂ علم حدیث کے وارث ہوئے ہیں۔ تحریر و تالیف کے لحاظ سے بھی اور اپنی جلالتِ علمی کے اعتبار سے بھی۔

اس لیے ہم یہاں چند گرامی قدر ہستیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ محدثین اور مؤرخین نے اس دور کے مصنفین میں ایک سے زیادہ اکابر کا نام لیا ہے ان کے متعلق تصریح ہے کہ ان اکابر نے اپنے اپنے وقت میں تصنیف کا کام کیا ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ ان میں سے اوّلیت کا شرف دوسری صدی میں کسے حاصل ہے؟

امام اعظم کے بارے میں حافظ سیوطی نے تصریح کی ہے:

انہ اول من دون الشریعۃ ورتبہ ابوابا[1]

سعید بن ابی عروبہ کے متعلق حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ:

ھو اول من صنف الابواب بالبصرۃ[2]

ربیع بن صبیح کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے رامہرمزی کی مشہور کتاب المحدث الفاصل کے حوالے سے انکشاف کیا ہے کہ:

انہ اول من صنف بالبصرۃ[3]

امام عبدالملک بن عبدالعزیز کو امام ذہبی نے صاحب التصانیف لکھ کر بتایا ہے کہ امام احمد کا بیان ہے کہ:

اول من صنف الکتب[4]

امام معمر بن راشد کا حافظ ذہبی نے تعارف پیش کرتے ہوئے یہ تبصرہ کیا ہے کہ:

کان اول من صنف بالیمن[5]

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے نام کے ساتھ اوّلیت چسپاں ہے۔ ان تصریحات

---

[1] تبییض الصحیفہ ص ۳۶۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۷۔ [3] تہذیب ج ۲ ص ۲۴۸
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۹۔ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۹۔

کو دیکھ کر ایک ناواقف حیرت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بہتوں نے یہ کہہ کر اس مشکل کا یہ حل تلاش کیا ہے کہ مدوّنین کے نام میں جن جن کا نام لیا جاتا ہے سب صحیح ہے اور اس کا تعلق مختلف ائمہ اور شہروں سے ہے — مکہ شہر میں تالیف کا کام ابن جریج نے شام کے شہر بیروت میں امام اوزاعی نے کوفہ میں سفیان ثوری نے بصرہ میں حماد بن سلمہ نے، واسط میں ہشیم نے یمن میں معمر نے خراسان میں عبداللہ بن المبارک نے رَے میں جریر بن عبدالحمید نے انجام دیا ہے لیکن حافظ عسقلانی فرماتے ہیں:

> یہ سب اکابر ایک ہی زمانے میں ہوئے ہیں اس لیے حتماً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقع اوّلیت کا شرف کسے حاصل ہے [1]

دراصل بات یہ ہے کہ یہاں تدوین اور تصنیف میں کچھ اختلاط ہو گیا ہے۔ ان دونوں کو اگر الگ الگ رکھ کر عقدہ کو حل کیا جائے تو آسانی سے معاملہ پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ مدوّنین کی فہرست میں تو آپ امام زہری، امام شعبی، امام مکحول اور قاضی ابوبکر کے اسمائے گرامی سن چکے ہیں۔ یہ دور دورِ تدوین ہے اور اس کا آغاز سنہ ۱۰۰ھ سے شروع ہو کر سنہ ۱۲۴ھ کے ختم پر ہے۔ اس کے بعد دورِ تصنیف شروع ہوا ہے۔ دورِ تصنیف میں پہل کا سہرا کس کے سر ہے اس سلسلے میں عبدالملک بن جریج سنہ ۱۵۰ھ، ابوحنیفہ سنہ ۱۵۰ھ، محمد بن اسحاق سنہ ۱۵۱ھ، سعید بن ابی عروبہ سنہ ۱۵۶ھ، الربیع بن صبیح سنہ ۱۶۰ھ، امام مالک سنہ ۱۷۹ھ، حماد بن سلمہ سنہ ۱۷۶ھ، سفیان ثوری سنہ ۱۶۱ھ اوزاعی سنہ ۱۵۶ھ ہیثم سنہ ۱۸۳ھ عبداللہ بن مبارک سنہ ۱۸۱ھ معمر بن راشد سنہ ۱۵۳ھ جریر بن عبدالحمید سنہ ۱۸۸ھ اور سفیان بن عیینہ سنہ ۱۹۸ھ لیث بن سعد سنہ ۱۷۵ھ اور شعبۃ بن الحجاج سنہ ۱۶۰ھ۔ یہ اکابر اگرچہ معاصر ہیں مگر ان کا تعلق مختلف ائمہ سے ہے اور یہ اسلامی مملکت میں متفرق شہروں مکہ، مدینہ، بصرہ، کوفہ، دمشق، واسط، خراسان، یمن، رَے اور مصر میں کام کر رہے ہیں اور ان کا یہ کام ایک منہج پر نہیں بلکہ مختلف مناہج پر ہوا ہے۔ جمع حدیث کی حد تک اس دور کے مصنفین میں اوّلیت بلاریب مکہ میں ابن جریج، بصرہ میں ربیع بن صبیح اور سعید بن ابی عروبہ کو حاصل ہے اور ان کا کام صرف یہ تھا کہ مختلف احادیث کو صرف کتاب کا لبادہ پہنا دیا جائے۔ ڈاکٹر السباعی نے درست لکھا ہے کہ:

---

[1] مقدمہ فتح الباری ص ۵۔

ان کا کام حضور انور کے ارشادات، احوالِ صحابہ، فتاویٰ تابعین کو یکجا کرنا تھا۔
حافظ ابن حجر نے یہ بھی انکشاف کیا کہ

كانوا يصنفون كل باب على حدة [1]

امام اعظم شرائع کے مدوّنِ اوّل ہیں

لیکن ابھی تک کسی ترتیب اور تبویب کے ساتھ یہ کام نہیں ہوا۔ چونکہ تصنیف کی بالکل ابتدا تھی اس لیے کیف ما اتفق حدیثوں کو سمیٹنا ہی ان بزرگوں کے پیشِ نظر تھا اور اس اوّلیت کا شرف حتماً ابن جریج، ربیع بن صبیح اور سعید بن ابی عروبہ کو حاصل ہے لیکن جہاں تک احکام کو پیشِ نظر رکھ کر تبویب اور ترتیبِ فقہی کا تعلق ہے اس میں اوّلیت کا شرف یقیناً امام اعظم کو حاصل ہے جیساکہ حافظ سیوطی نے تصریح کی ہے۔

انه اول من دون الشريعة ورتبه ابواباً [2]

اور یہ بھی اسیوطی نے بتایا ہے کہ ابوحنیفہ صرف مدوّنِ اوّل ہی نہیں بلکہ اس میں وہ یگانہ بھی ہیں۔ لکھا ہے:

انفرد بها لم يسبق اباحنيفة احده [3]

چونکہ دورِ اوّل میں تبویب کا سہرا بھی کوفہ میں امام شعبی کے سر ہے اس لیے اس دورِ ثانی میں بھی تبویب و ترتیبِ احکام کا سہرا کوفہ ہی میں امام شعبی کے شاگرد ابوحنیفہ کے سر رہا۔
حافظ عسقلانی فرماتے ہیں:

اما جمع حديث الى مثله فى باب واحد فقد سبق اليه الشعبى
فانه روى عنه انه قال هذا باب من الطلاق جسيم [4]

مدینہ میں اس کا آغاز امام مالک سے ہوا ہے چنانچہ السیوطی رقمطراز ہیں:

ثم تبعه مالك بن انس فى ترتيب الموطا [5]

یعنی تدوینِ شرائع اور ان کی ترتیب و تبویب میں امام اعظم مدوّنِ اول ہیں بلکہ وہ اس میں

---

[1] مقدمہ فتح الباری ص ۴۔ [2] تبییض الصحیفہ ص ۳۶۔ [3] تبییض الصحیفہ ص ۳۶
[4] السنہ ص ۱۲۴۔ [5] تبییض الصحیفہ ص ۳۶۔

یکتا ہیں اور مؤطا میں امام مالک ان کے مقتدی ہیں۔ یہ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے اس کی تائید اس سے ہوتی ہے۔

۱- حافظ ابن حزم نے تصریح کی ہے کہ امام مالک نے مؤطا کی تالیف یقیناً یحییٰ بن سعید انصاری کی وفات کے بعد کی ہے اور یحییٰ کی وفات ۱۴۳ھ میں ہوئی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ان المؤطا الفہ مالک بعد موت یحیی بن سعید الانصاری
بلا شک وکانت وفاۃ یحیی فی سنۃ ثلاث واربعین ومائۃ[1]

۲- مشہور مؤرخ علامہ ابن فرحون نے ابو مصعب احمد بن عوف الزہری سے جو امام مالک کے شاگرد ہیں اور امام مالک سے مؤطا کے راوی ہیں نقل کیا ہے کہ خلیفہ منصور عباسی نے امام مالک سے فرمائش کی تھی کہ:

ضع للناس کتاباً احملہم علیہ

امام مالک نے اس سلسلے میں کچھ کہا تو ابو جعفر منصور نے جواب دیا کہ

ضعہ فما احد الیوم اعلم منک

آخر امام موصوف نے مؤطا کی تصنیف شروع کی مگر ابھی کتاب ختم نہ ہوئی تھی کہ ابو جعفر سربراہ مملکت عباسی کا انتقال ہو گیا[2]

اس سے معلوم ہوا کہ مؤطا کی تصنیف منصور کی فرمائش پر خود اس کے زمانے میں شروع ہوئی اور اس کی وفات کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ منصور کی وفات ۶ ذی الحجہ ۱۵۸ھ میں ہوئی ہے اور اس کی جگہ اس کا فرزند محمد المہدی مسندِ خلافت پر متمکن ہوا اور اسی کی خلافت کے ابتدائی زمانے میں مؤطا کی تصنیف مکمل ہوئی۔

۳- امام اعظم کی تصانیف سے امام مالک کے استفادے کا ذکر کتب تاریخ میں صراحت سے مذکور ہے۔ قاضی ابو العباس احمد بن محمد بن عبد اللہ بن ابی العوام اخبار ابی حنیفہ میں بسندِ متصل عبد العزیز بن محمد دراوردی سے روایت کرتے ہیں کہ امام مالک امام اعظم کی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے جیسا کہ پیچھے پڑھ آئے ہیں۔

یہ شہادتیں کہہ رہی ہیں کہ مؤطا بعد میں تصنیف ہوا ہے اور مؤطا سے پہلے یعنی ۱۴۰ھ

---

[1] توجیہ النظر ص ۱۱۷۔ [2] الدیباج المذہب ص ۵۵۔

اور ۱۵۰ھ کے درمیانی عرصہ میں امام اعظم کی تصانیف منصۂ شہود پر آچکی تھیں اس لیے ابواب و احکام کے موضوع پر تصنیف کے میدان میں اولیت کا شرف امام اعظم ہی کو حاصل ہے ۔

حدیث میں امام اعظم کی تصنیف

امام اعظم ۱۲۰ھ میں جامع کوفہ کی اس مشہور علمی درسگاہ میں جلوہ افروز ہوئے جو حضرت عبداللہ بن مسعود کے زمانے سے باقاعدہ چلی آ رہی تھی تو آپ نے جہاں فقہ کا عظیم الشان فن اجتماعی محنت سے مدون کیا وہیں فقہ کے ابواب پر مشتمل حدیثوں کا ایک مجموعہ بھی صحیح اور معمول بہ روایات سے انتخاب فرماکر مرتب کیا اور اس کو اپنے تلامذہ کے سامنے لیکچر کی صورت میں پیش کیا اسی کا نام کتاب الآثار ہے اور آج امت اسلامیہ کے علمی سرمایہ میں احادیث صحیحہ کی سب سے قدیم کتاب یہی ہے جو دوسری صدی کے ربع ثانی کی تالیف ہے ۔ امام اعظم سے پہلے حدیث نبوی کے جتنے مجموعے اور صحیفے تھے ان کی ترتیب فنی نہ تھی بلکہ ان کے جامعین نے کیفما اتفق حدیثوں کے مجموعے تیار کیے تھے ۔ گویا جس کام کی ابتدا بقول حافظ ابن حجر عسقلانی، امام شعبی نے کی تھی اسی کو امام اعظم نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ مکمل فرمایا اور بعد کے آنے والوں کے لیے ترتیب و تبویب کی شاہراہ قائم کر دی ۔

کتاب الآثار اس دور کی تمام تصانیف سے پہلے کی تصنیف ہے اس دور کے تمام مصنفین ابن جریج کو چھوڑ کر امام اعظم کے بعد ہیں ۔ سب اگرچہ قرن ثانی کی پیداوار اور معاصر ہیں ۔ مگر امام اعظم سے کسی نہ کسی درجے میں متاخر ہیں اور صرف متاخر نہیں بلکہ امام اعظم کی جلالت علمی کے قدرداں ہیں ۔

کتاب الآثار کا طریق تالیف

کتاب الآثار کا طریق تالیف، تعلیم کتب اور تعلیم روایات کا نہیں بلکہ تعلیم علوم و فنون کا ہے ۔ یعنی بذریعہ درس و املا شیوخ سے علم حاصل کرنا ۔ تمام علوم اور مہمات فنون عربیہ کے لیے صدر اول میں یہی طریق رائج تھا ۔ آغاز میں اس طرز تالیف کی بنیاد یوں پڑی کہ تلامذہ اپنے حفظ و یادداشت کے لیے اساتذہ کے تمام امالی یا ان کا خلاصہ لکھ لیا کرتے تھے ۔ لیکن آگے چل کر یہ چیز اس قدر مقبول ہوئی کہ اقسام تصنیف میں ایک خاص قسم بن گئی اور

خود اساتذہ اور علمائے فن اپنی مرویات بطور تصنیف مرتب کرتے لگے اس طرح کہ حلقۂ درس میں مطالب و مسائل املا کراتے اور ساتھ ساتھ خود بھی لکھتے جاتے یا پہلے مجموعہ مرتب کر لیتے اور پھر اسی کو املا کراتے۔ حدیث میں یہ طریق تمام علوم سے زیادہ رائج اور مقبول ہوا اور محدثین کے یہاں اسے ایک خصوصی مقام حاصل ہو گیا چنانچہ محدثین نے سماع من لفظ الشیخ کی دو مختلف صورتوں میں سے ایک قسم املا کو قرار دیا ہے اور یہ محدثین کی بیان کردہ ان تمام قسموں میں سے جو تحمل روایت کے لیے مشہور ہیں ایک اور اعلیٰ قسم ہے۔ چنانچہ علامہ یمانی نے توضیح الافکار میں حافظ زین الدین عراقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ

سواء احدث من کتابہ او من حفظہ باملاء او بغیر املاء وھو ارفع الاقسام [۱]

محدثین نے اس انداز تالیف کی خاطر تلامذہ کے لیے جو تعبیری زبان مقرر کی ہے ان میں سب سے اعلیٰ و ارفع اگرچہ خطیب بغدادی کے خیال میں تو سماع ہی ہے لیکن ابن الصلاح حدثنا کو اور ابن کثیر حدثنی کو ارفع بتاتے ہیں۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں کہ عبدالملک بن عبدالعزیز ۱۵۰ھ جو ابن جریج کے نام سے مشہور ہیں اور جن کے بارے میں حافظ عسقلانی نے انکشاف کیا ہے کہ حدیث کے پہلے مصنف یہی ہیں ان سے حجاج بن محمد مصیصی نے ان کی کتابیں اسی طرح روایت کی ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

لاسیما من عرف انہ لا یروی الا ما سمعہ کحجاج بن محمد فروی کتب ابن جریج بلفظ قال ابن جریج فحملھا الناس عنہ واحتجوا بھا [۲]

علامہ محی الدین عبدالحمید نے اس طریق کو بے حد سراہا ہے اور اسے تالیف و تدریس میں سب سے اعلیٰ قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

حدیث حاصل کرنے کے طریقوں میں سب سے اونچا، ترقی یافتہ اور قوی ترین طریق یہ ہے کہ راوی شیخ کے الفاظ سے خواہ شیخ کسی دستاویز سے املا کرا رہا ہو یا زبانی یادداشت سے، املا کرانا تحدیث من غیر املا سے

---

[۱]، [۲] تنقیح الانظار ج ۲ ص ۲۹۸۔

اونچا ہے [1]
حافظ ابن الصلاح نے بھی نقلِ حدیث اور تحملِ روایات میں اسے سب سے اونچی قسم قرار دیا ہے
چنانچہ فرماتے ہیں :

ھٰذا القسم ارفع الاقسام عند الجماھیر [2]

کتاب الآثار بھی اسی قسم کا املائی مجموعہ ہے اور امام اعظم کا قائم کردہ یہ طریق تصنیف کچھ ایسا مقبول ہوا ہے کہ بعد کو امام کے تلامذہ نے بھی اپنی تصانیف میں اسے ہی اپنایا ہے۔ چنانچہ حافظ قاسم بن قطلوبغا منیۃ الالمعی کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں :

ان المتقدمین من علمائنا کانوا یملون المسائل الفقہیۃ و ادلتھا من الاحادیث النبویۃ باسانیدھم کابی یوسف فی کتاب الخراج والامالی ومحمد فی کتاب الاصل والسیر وکذا الطحاوی والخصاف والرازی والکرخی [3]

کتاب الآثار کے نسخے

جیسے مؤطا کو امام مالک سے ایک سے زیادہ اصحاب مالک نے روایت کیا ہے ایسے ہی کتاب الآثار کو بھی امام اعظم سے ان کے ایک سے زیادہ اصحاب نے روایت کیا ہے اور اس روایت کے ایک سے زیادہ ہونے کی وجہ سے جیسے مؤطا اور حدیث کی دوسری کتابوں کے نسخے متعدد ہو گئے ایسے ہی کتاب الآثار کے بھی راویوں کے متعدد ہونے کی وجہ سے نسخے ایک سے زیادہ ہو گئے ہیں۔

کتاب الآثار کو امام اعظم سے جن تلامذہ نے روایت کیا ہے ان کی تعداد تو زیادہ ہے لیکن ان میں مشہور چار ہیں :

۱۔ کتاب الآثار	بروایت امام محمد
۲۔ کتاب الآثار	بروایت امام ابو یوسف
۳۔ کتاب الآثار	بروایت امام زفر

---

[1] تعلیقات علی التوضیح ج ۲ ص ۲۹۵۔ [2] مقدمہ ابن الصلاح [3] منیۃ الالمعی ص ۸۔

۴۔ کتاب الآثار
بروایت امام حسن بن زیاد

یہ چاروں امام اعظم سے کتاب الآثار کے راوی ہیں ۔

کتاب الآثار بروایت امام محمدؒ

یہ امام محمد کا روایت کردہ نسخہ ہے اور یہ نسخہ تمام نسخوں میں سب سے زیادہ مقبول اور مشہور ہے ۔ اسی کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے تعجیل المنفعۃ بزوائد رجال الاربعہ کے مقدمہ میں لکھا ہے ۔

والموجود من حدیث ابی حنیفۃ مفرداً انما ھو کتاب الآثار التی رواھا محمد بن الحسن عنہ[1]

اس نسخے میں جن راویوں سے حدیثیں مروی ہیں ۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کے حالات پر دو کتابیں لکھی ہیں ۔ پہلی تصنیف جو مستقل طور پر رجال کتاب الآثار سے متعلق ہے اس کا نام الایثار بمعرفۃ رواۃ الآثار ہے ۔ اس کا ذکر نواب علامہ صدیق حسن خاں نے اتحاف النبلاء المتقین میں کیا ہے مگر نام غلط درج ہو گیا ۔ الایثار بمعرفۃ معانی الآثار نہیں بلکہ الایثار بمعرفۃ رواۃ الآثار ہے ۔ اتحاف میں مصنف کا بھی ذکر نہیں ہے اس کے مصنف حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں ۔ اس کتاب کا ذکر خود حافظ عسقلانی نے تعجیل المنفعۃ کے مقدمہ میں بھی کیا ہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں نے کتاب الآثار کے رجال پر علیحدہ مستقل کتاب لکھی ہے کیونکہ بعض حنفی ماہر بزرگوں میں سے ایک بزرگ نے میرے سے درخواست کی کہ میں کتاب الآثار کے رجال پر مستقل کتاب لکھوں ۔ میں نے ان کی یہ درخواست قبول کی اور کتاب الآثار کے رجال پر کتاب لکھی اس میں جو اکابر تہذیب میں آ چکے ہیں ان کا تو صرف نام ہی ذکر کر دیا اور تہذیب کا حوالہ دے دیا ہے اور ان کے علاوہ کے حالات لکھے ہیں[2] دوسری تصنیف کتاب تعجیل المنفعۃ بزوائد رجال الاربعہ ہے ۔ یہ کتاب اب حیدر آباد میں چھپ چکی ہے ۔ اس میں حافظ ابن حجر نے صرف ان راویوں کا تذکرہ کیا ہے جن سے ائمہ اربعہ امام اعظم ، امام مالک ، امام شافعی اور امام احمد نے اپنی اپنی تصانیف میں حدیثیں نقل کی ہیں مگر صحاح ستہ میں ان کے حوالے سے کوئی حدیث منقول نہیں ہے دراصل حافظ ابو عبداللہ محمد بن علی بن حمزہ الحسینی نے ایک کتاب التذکرہ

---

[1] تعجیل المنفعۃ برجال الائمۃ الاربعہ ص ۴ ۔ [2] تعجیل المنفعۃ ص ۹ ۔

برجال العشرہ کے نام سے لکھی تھی اور اس میں حافظ ابوعبداللہ نے ائمہ ستہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کے ساتھ ائمہ اربعہ ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد کی تصانیف کے راویوں اور رجال کا تذکرہ لکھا اور اس کا نام التذکرہ برجال العشرہ رکھا اور ائمہ ستہ کے ساتھ ائمہ اربعہ کے رجال لکھنے کی وجہ خود ہی یہ بتاتی ہے کہ :

ذکرت رجال الائمۃ الاربعۃ المقتدی بھم لان عمدتھم فی الاستدلال لھم لمذاھبھم فی الغالب علی ما رووہ فی مسانیدھم باسانیدھم فان المؤطا لمالک ھو مذھبہ الذی یدین اللہ بہ اتباعہ ویقلدونہ مع انہ لم یرو فیہ الا الصحیح عندہ وکذالک مسند الشافعی موضوع لادلتہ علی ما صح عندہ من مروياتہ وکذالک مسند ابی حنیفہ واما مسند احمد فانہ اعم من ذالک واشمل [1]

علامہ ابوجعفر الکتانی نے ائمہ ستہ فی الحدیث اور ائمہ اربعہ فی المذہب کی کتابوں کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ :

فھذہ ھی کتب الائمۃ الاربعۃ وباضافتھا الی الستۃ الاولیٰ تکمل الکتب العشرۃ التی ھی اصول الاسلام وعلیھا مدار الدین [2]

حافظ ابن حجر عسقلانی نے چونکہ تہذیب التہذیب اور تقریب کے نام سے ائمہ ستہ کی کتابوں کے رجال پر دو کتابیں لکھی ہیں اس لیے حافظ عسقلانی نے ائمہ اربعہ کی تصانیف کے راویوں کے لیے ایک مستقل کتاب تعجیل المنفعۃ کے نام سے اور اس میں جیسا کہ خود حافظ صاحب نے تصریح کی ہے صرف ان اشخاص کے حالات لکھے ہیں جو ائمہ اربعہ کی کتابوں میں آتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں :

فلذالک اقتصرت علی رجال الاربعۃ وسمیتہ تعجیل المنفعۃ بزوائد رجال الائمۃ الاربعۃ [3]

---

[1] تعجیل المنفعۃ ص ۴ - [2] الرسالۃ المستطرفۃ ص ۱۸ - [3] تعجیل المنفعۃ ص ۸ -

حیرت ہے کہ مشہور علامہ نواب صدیق حسن خاں نے اتحاف النبلاء المتقین میں علامہ شوکانی کے حوالہ سے کتاب کا نام تعجیل المنفعۃ برجال الاربعہ لکھ کر الاربعہ کو سنن اربعہ کا مصداق قرار دیا ہے اور صاحب کشف الظنون کی اس بات میں تغلیط کی ہے کہ اربعہ سے ائمہ اربعہ مجتہدین مراد ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

کشف الظنون گفتہ بروایت رجال الائمۃ الاربعہ یعنی المذاہب و این مسامحت است از وے[1]

حالانکہ خود حافظ صاحب کی تصریح سے یہ بات معلوم ہے کہ اربعہ سے مراد ائمہ اربعہ ہیں یعنی ابوحنیفہ، شافعی، مالک اور احمد نہ کہ ابوداؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ — علامہ ابوجعفر الکتانی نے مسند امام ابوحنیفہ پر تبصرہ کرتے ہوئے صاف لکھا ہے کہ:

والذی اعتبرہ الحافظ ابن حجر فی کتابہ تعجیل المنفعۃ بزوائد رجال الاربعۃ ھو ما اخرجہ الامام الذکی الحافظ ابو عبداللہ الحسین بن محمد بن خسرو[2]

غالباً نواب صاحب نے خود تعجیل المنفعۃ کا مطالعہ نہیں فرمایا ورنہ زبان قلم پر یہ بات نہ آتی۔ الغرض بتانا یہ چاہتا ہوں کہ حافظ عسقلانی نے رجال ائمہ اربعہ کے ذیل ہی میں کتاب الآثار کے بھی رجال لکھے ہیں۔ مشہور محدث حافظ سخاوی نے الاعلان بالتوبیخ میں کتاب الآثار کے رجال پر ایک اور کتاب کی بھی نشان دہی کی ہے۔ فرماتے ہیں:

وللزین قاسم الحنفی رجال کل من الطحاوی والموطا لمحمد بن الحسن والآثار ومسند ابی حنیفۃ لابن المقری[3]

حافظ زین الدین قاسم بن قطلوبغا کی اس کتاب کا علامہ الکتانی نے الرسالۃ المستطرفہ میں بھی تذکرہ کیا ہے۔ ملا کاتب چلپی نے کشف الظنون میں کتاب الآثار امام محمد پر حافظ ابوجعفر طحاوی کی شرح کا بھی ذکر کیا ہے۔ حافظ سخاوی نے الضوء اللامع میں علامہ تقی الدین احمد بن علی مقریزی کی کتاب العقود فی تاریخ العہود کے حوالہ سے حافظ قاسم کی تصانیف میں التعلیقات علی کتاب الآثار بھی لکھی ہے۔

---

[1] اتحاف النبلاء ص ۱۰۔ [2] الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۶۔
[3] الاعلان بالتوبیخ ص ۱۱۷

امام محمد سے اس کتاب کو ان کے متعدد شاگردوں نے روایت کیا ہے مطبوعہ نسخہ امام ابوحفص کبیر اور ابوسلیمان[1] جوزجانی کا روایت کردہ ہے۔

کتاب الآثار بروایت امام ابویوسفؒ

کتاب الآثار کا یہ نسخہ قاضی ابویوسف سے ان کے صاحبزادے یوسف بن یعقوب نے روایت کیا ہے اس نسخہ کے راوی قاضی ابویوسف کی جلالت قدر کا حدیث میں اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ امام احمد بن حنبل نے جب تحصیل حدیث شروع کی تھی تو سب سے پہلے قاضی ابویوسف ہی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے احادیث لکھیں، حافظ ابن الجوزی مناقب میں بسند متصل ناقل ہیں:

اخبرنا ابومنصور عبدالرحمٰن بن محمد القزاز قال اخبرنا ابوبکر احمد بن علی بن ثابت قال اخبرنا الازہری قال ثنا عبدالرحمٰن بن عمر قال ثنا محمد بن یعقوب قال حدثنا جدی قال سمعت احمد بن حنبل یقول اول من کتبت عنہ الحدیث ابویوسف[2]

اور حافظ ذہبی مناقب ابی حنیفہ میں حافظ عباس دوری سے نقل کرتے ہیں:

سمعت احمد بن حنبل یقول اول ما کتبت الحدیث اختلفت بعد

---

[1] ان کا نام موسیٰ بن سلیمان اور کنیت ابوسلیمان ہے۔ حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں کہ مامون نے ان کے سامنے عہدۂ قضا کی پیش کش کی فرمایا امیرالمومنین عدالتی معاملہ میں حقوق الٰہی کی نگرانی کیجئے۔ اور اپنی امانت مجھ جیسے کو سپرد نہ فرمائیے۔ مجھے غصہ میں رہنے پر قابو نہیں رہتا۔ میں اپنے اللہ کے بندوں میں فیصلہ کرنے کے کام کو پسند نہیں کرتا۔ مامون نے یہ سُن کر کہا کہ آپ دُرست کہتے ہیں۔ امام محمد اور قاضی ابویوسف کے تلامذہ میں سے ہیں اور ان سے ان کی کتابوں کے راوی بھی ہیں۔ دینداری پارسائی، فقہ و حدیث میں معلی بن منصور کے رفیق رہے ہیں۔ معلی بن منصور امام مالک، لیث بن سعدؒ حماد اور ابن عیینہ کے شاگرد ہیں۔ ان کی تصانیف میں السیر الصغیر، کتاب الصلوٰۃ اور کتاب الرہن جیسی کتابیں ہیں ۲۰۰ھ کے بعد ان کی وفات ہوئی ہے۔ فرماتے تھے کہ میں نے حماد بن زید سے سُنا ہے وہ فرماتے تھے میں ابوحنیفہ سے محبت کرتا ہوں کیونکہ وہ ایوب سختیانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یاد رہے کہ ایوب سختیانی امام اعظم کے اساتذہ میں سے ہیں۔ [2] مناقب ابن الجوزی ص ۲۲۔

الی الناس [1]

یہ واقعہ ۱۸۰ھ کا ہے جب امام احمد کی عمر سولہ سال تھی [2]

امام احمد نے امام ابو یوسف اور امام محمد سے تین قمطر (وہ صندوق جس میں کتابیں رکھی جاتی ہیں) بھر کر علم دین کی کتابت کی تھی۔ چنانچہ حافظ ابو الفتح بن سید الناس یعمری شافعی لکھتے ہیں:

قال ابراهيم بن جعفر حدثني عبدالله بن احمد بن حنبل قال كتب ابي عن ابي يوسف ومحمد ثلاثة قماطر قلت له كان ينظر فيها قال كان ربما نظر فيها [3]

امام احمد بن حنبل کا خود قاضی صاحب موصوف کے متعلق حسب تصریح علامہ سمعانی یہ تاریخی اقرار موجود ہے:

ابو يوسف الامام يقول فيه احمد بن حنبل انه ابصر الناس بالآثار [4]

ان تصریحات کی موجودگی میں خلال کی اس رائے کی کوئی قیمت نہیں کہ امام احمد نے پہلے پہل اہل الرائے کی کتابیں لکھیں اور پڑھیں اور ان کے مسائل ازبر کیے لیکن پھر ان کی طرف کوئی التفات نہیں رہا۔

یہ ایسی بات ہے جسے باور کرنے کی ہمیں مذکورہ تصریحات اجازت نہیں دیتی ہیں۔ الغرض کتاب الآثار کے امام اعظم سے دوسرے راوی قاضی ابو یوسف، امام احمد بن حنبل کے استاد ہیں ان کے اس نسخہ کا تذکرہ حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر المضیئہ میں کیا ہے۔ چنانچہ امام یوسف بن ابی یوسف کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

روى كتاب الآثار عن ابيه عن ابي حنيفة

پروفیسر الشیخ محمد ابو زہرہ لیکچرر فواد یونیورسٹی نے ابو حنیفہ نامی کتاب میں اس پر جو عالمانہ تبصرہ کیا وہ بھی پڑھ لیجئے:

یہ کتاب علمی طور پر تین وجہ سے قیمتی ہے۔ اول یہ کہ امام ابو حنیفہ کی

---

[1] مناقب ذہبی ص ۴۰۔ [2] مناقب ابن الجوزی ص ۳۳۔ [3] عیون الاثر ج ۱ ص ۲۰۔
[4] التعلیق الممجد ص ۲۲۔

مرویات کا ذخیرہ ہے اور اس کے ذریعے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ امام موصوف نے استخراج مسائل میں احادیث کو کیسے دلائل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ دوم یہ کہ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ امام موصوف کے یہاں مواقع استدلال میں فتاویٰ صحابہ اور احادیث مرسلہ کا کیا مقام تھا۔ سوم یہ کہ اس کتاب کے ذریعے تابعین فقہاء کوفہ کے خصوصاً اور فقہاء عراق کے عموماً فتاویٰ تک ہماری رسائی ہو جاتی ہے[1]

کتاب الآثار بروایت امام زفرؒ

پورا نام زفر بن الہذیل العنبری ہے ان سے کتاب الآثار کی روایت ان کے تین شاگردوں نے کی ہے۔ ابو وہب محمد بن مزاحم، شداد بن حکیم، حکیم بن ایوب۔

محمد بن مزاحم اور شداد بن حکیم کے حوالہ سے جو کتاب الآثار مروی ہے اس کا مشہور محدث ابو عبداللہ الحاکم نے اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

نسخۃ لزفر بن الہذیل الجعفی تفرد بہا عنہ شداد بن حکیم البلخی و نسخۃ ایضا لزفر بن الہذیل الجعفی تفرد ابو وہب محمد بن مزاحم المروزی[2]

ایک نسخہ زفر کا جسے ان سے شداد نے صرف روایت کیا ہے۔ ایک نسخہ زفر کا اور جسے ان سے صرف ابو وہب محمد بن مزاحم نے روایت کیا۔

حدیث کے مشہور امام محمد بن نصر مروزی نے اپنی کتاب قیام لیل و قیام رمضان و کتاب الوتر میں امام اعظم کی جس کتاب کا

زعم النعمان فی کتابہ — امام ابوحنیفہ کا اپنی کتاب میں خیال ہے۔

کے بیرائے میں تذکرہ کیا ہے وہ بھی ابو وہب محمد بن مزاحم والی کتاب الآثار ہے جو امام مروزی کو ان کے شاگرد ابوالنضر محمد بن محمد کے حوالہ سے ملی ہے۔ یہ نیشاپور کے نامی گرامی قاضی ہیں ان سے حافظ ابو عبداللہ الحاکم نے حدیث پڑھی ہے۔ امام حاکم نے تاریخ نیشاپور میں لکھا ہے

---

[1] ابوحنیفہ ص ۲۰۰۔ [2] معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۶۴۔

کہ ان کے لیے ۲۲۵ھ میں حرمین میں باقاعدہ مجلس درس لگتی تھی۔ ان کی وفات ۳۲۰ھ میں ہوئی ہے۔ حافظ سمعانی نے الانساب میں ابو وہب محمد بن مزاحم کو احمد بن بکر بن یوسف کا استاد قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

یروی عن ابی وھب محمد بن مزاحم المروزی عن زفر عن ابی حنیفۃ کتاب الآثار[۱]

کتاب الآثار احمد بن بکر اپنے استاد محمد بن مزاحم سے بحوالہ زفر از ابی حنیفہ روایت کرتے ہیں۔

حکیم ابن ایوب کی کتاب الآثار کا ذکر حافظ ابو الشیخ ابن حبان نے اپنی کتاب طبقات المحدثین میں احمد بن رستہ کے ترجمہ میں لکھا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

احمد بن رستۃ بن بنت محمد بن المغیرۃ کان عندہ السنن عن محمد عن الحکم عن زفر عن ابی حنیفۃ[۲]

احمد بن رستہ کے پاس بحوالہ محمد از حکم از زفر از ابی حنیفہ کتاب السنن تھی۔

امام طبرانی نے معجم صغیر میں اس نسخہ کی ایک حدیث روایت کی ہے:

حدثنا احمد بن رستۃ بن عمر الاصفہانی ثنا المغیرۃ الحکم بن ایوب عن زفر بن الھذیل عن ابی حنیفۃ[۳]

حافظ ابن ماکولا نے بھی الاکمال میں احمد بن بکر کے تذکرے میں لکھا ہے:

احمد بن بکر بن سیف ابو بکر الجصینی ثقۃ یمیل میل اھل النظر روی عن ابی وھب عن زفر بن الھذیل عن ابی حنیفۃ کتاب الآثار[۴]

ان تصریحات کی موجودگی میں الشیخ محمد ابو زہرہ لیکچرر فواد یونیورسٹی قاہرہ کا ابو حنیفہ نامی کتاب میں یہ کہنا درست نہیں ہے:

زفر لم یوثر عنہ کتب ولم تعرف لہ روایۃ لمذھب شیخہ[۵]

امام زفر سے کتابیں مروی نہیں ہیں اور ان کی اپنے استاد سے کوئی روایت

---

[۱] لمحات النظر، الجواہر المضیۃ ج ۱ ص ۹۲ [۲] امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۴۳۔
[۳] معجم صغیر طبرانی ص ۲۳ [۴] امام ابن ماجہ اور علم الحدیث ص ۱۴۲۔ [۵] ابو حنیفہ ص ۱۱۸۔

مشہور نہیں ہے۔

کتاب الآثار بروایت امام حسن بن زیادؒ

کتاب الآثار کے تمام نسخوں میں یہ نسخہ غالباً سب سے بڑا ہے کیونکہ امام حسن بن زیاد نے امام اعظم کی احادیث مرویہ کی تعداد چار ہزار بتائی ہے۔ چنانچہ امام حافظ ابو یحییٰ زکریا بن یحییٰ نیشاپوری اپنی اسناد کے ساتھ امام حسن سے ناقل ہیں کہ:

کان ابو حنیفۃ یروی اربعۃ آلاف حدیث الفین لحماد والفین لسائر المشیخۃ [1]

قرین قیاس یہی ہے کہ امام لؤلؤی نے امام اعظم کی ان تمام حدیثوں کو اپنے نسخہ میں روایت کیا ہوگا۔

اس نسخہ کا ذکر حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان میں کیا ہے۔ چنانچہ وہ محمد بن ابراہیم بن جیلش بغوی کے ترجمہ میں رقمطراز ہیں۔

محمد بن ابراهیم جیش البغوی روی عن محمد بن شجاع الثلجی عن الحسن بن زیاد عن ابی حنیفۃ کتاب الآثار [2]

محدث علی بن عبد المحسن دوالیبی حنبلی نے اپنے مثبت میں اس نسخہ سے ساٹھ حدیثیں نقل کی ہیں جن کو محدث شیخ محمد زاہد کوثری نے الامتاع میں نقل کیا ہے۔

محدث خوارزمی نے جامع مسانید میں اس نسخہ کو مسند ابی حنیفہ للحسن بن زیاد کے نام سے پیش کیا ہے۔ خوارزمی نے اس نسخہ کی اسناد میں امام حسن تک اپنے چاروں اساتذہ یعنی شیخ ابو محمد یوسف بن عبد الرحمٰن، شیخ ابو محمد ابراہیم بن محمود، شیخ ابو نصر الاعز بن ابی الفضائل اور شیخ ابو عبد اللہ محمد بن علی کے حوالہ سے اس طرح نقل کی ہے:

اخبرنا الحافظ ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علی الجوزی قال اخبرنا ابو القاسم اسماعیل بن احمد السمرقندی قال اخبرنا ابو القاسم عبد اللہ بن الحسن قال اخبرنا ابو الحسن عبد الرحمٰن بن عمر قال

---

[1] مناقب موفق ج ۱ ص ۹۶ [2] لسان المیزان۔

اخبرنا ابوالحسن محمد بن ابراهیم بن جیش لبغوی قال حدثنا
ابوعبداللہ محمد بن شجاع البلخی قال حدثنا الحسن بن زیاد
اللؤلؤی عن ابی حنیفۃ[1]

خوارزمی کی طرح دیگر محدثین بھی اس کو مسند ابی حنیفہ کے نام سے روایت کرتے ہیں۔ خود حافظ ابن حجر عسقلانی کی مرویات میں بھی یہ نسخہ موجود تھا۔ اس نسخہ کی اسانید اجازت کو محدث علی بن عبدالمحسن الدوالیبی حنبلی نے اپنے مثبت میں، محدث ایوب الخلوتی نے اپنے مثبت میں اور خاتمۃ الحفاظ محمد عابد سندھی نے حصر الشارد فی اسانید الشیخ محمد عابد میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور شیخ محمد زاہد کوثری نے ان کو الامتاع بسیرۃ الامامین الحسن بن زیاد و محمد بن شجاع میں نقل کردیا ہے

ایک ضروری توضیح

جامع المسانید اور لسان المیزان میں اس روایت کے ناموں میں کچھ تصحیف ہوگئی اصل سند تو اس طرح ہے کہ:

محمد بن ابراہیم بن جبیش البغوی روی عن محمد بن شجاع الثلجی عن الحسن بن زیاد عن ابی حنیفہ کتاب الآثار۔

لیکن جامع المسانید میں خوارزمی نے محمد بن ابراہیم بن جیش اور لسان المیزان میں حافظ ابن حجر نے محمد بن ابراہیم بن حسن لکھا ہے دونوں غلط ہیں۔ اسی طرح جامع المسانید میں محمد بن شجاع البلخی اور لسان المیزان میں محمد بن بخیح البلخی طبع ہوگیا ہے یہ بھی غلط ہے ——
اور لسان المیزان میں عن الحسن بن زیاد عن محمد بن الحسن عن ابی حنیفہ میں محمد بن الحسن کا اضافہ یقیناً غلط ہے۔ محمد بن ابراہیم بن جبیش لبغوی اور امام محمد بن شجاع الثلجی دونوں نہایت معروف و مشہور عالم ہیں۔ دونوں کا مبسوط حال خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے حافظ بدرالدین عینی نے شرح ہدایہ میں لکھا ہے کہ محمد بن شجاع الثلجی میں نسبت نسب کی ہے اور محمد بن شجاع کو ثلج بن عمرو بن مالک بن عبد مناف سے نسبی تعلق کی وجہ سے ثلجی کہتے ہیں۔ امام ذہبی نے سیر النبلاء میں ان کے اساتذہ میں ابن علیہ، وکیع، یحییٰ بن آدم اور حسن

---

[1] جامع المسانید ج ۱ ص ۷۳۔

بن زیاد کا نام لیا ہے[1] اور حافظ عبد القادر قرشی نے یحییٰ بن اکثم کو ان کا شاگرد دیکھا ہے[2]
حافظ ابن القیم جوزی نے اپنی مشہور کتاب اعلام الموقعین عن رب العالمین میں ایک موقعہ پر امام حسن بن زیاد کی اسی کتاب الآثار کی حدیث سے استدلال کیا ہے ان کا موقعہ استدلال میں اس کا ذکر کرنا صرف اس بات کی دلیل نہیں کہ کتاب الآثار کا نسخہ ان کے مطالعہ میں رہا ہے بلکہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس کتاب کا ابن القیم کے یہاں اعتباری اور استدلالی مقام ہے وہ فرماتے ہیں:

قال الحسن بن زیاد اللؤلؤی ثنا ابو حنیفۃ قال کنا عند محارب بن دثار فتقدم الیہ رجلان فادعی احدھما علی الآخر مالا فجحدہ المدعی علیہ فسالہ البینۃ فجاء رجل فشھد علیہ فقال المشھود علیہ لا واللہ الذی لا الہ الا ھو ما شھد علی بحق وما علمتہ الا رجلا صالحا غیر ھذہ الذلۃ فانہ فعل ھذا الحقد کان فی قلبہ علی وکان محارب متکئا فاستوی جالسا ثم قال یا ذا الرجل سمعت ابن عمر یقول سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لیاتین علی الناس یوم تشیب فیہ الولدان وتضع الحوامل ما فی بطونھا وتضرب الطیر باذنابھا وتضع ما فی بطونھا من شدۃ ذالک الیوم ولا ذنب علیھا وان شاھد الزور لا یقار قدماہ علی الارض حتی یقذف بہ فی النار فان کنت شھدت بحق فاتق اللہ واقم علی شھادتک وان کنت شھدت بباطل فاتق اللہ وغط راسک واخرج من ذالک الباب[3]

ان چار بزرگوں کے حوالے اور وساطت سے امام اعظم کی کتاب الآثار آج امت کے ہاتھوں میں ہے۔ ان کی تخمینیں امت میں معروف و مشہور ہیں۔

---

[1] الفوائد البہیۃ ص ۶۲۔ [2] الجواہر المضیئۃ ص ۲۱۴ ج ۱۔ [3] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۱۲۰۔

کتاب الآثار کی روایتی صحت

امام ابوحنیفہ سے احادیث کو اگرچہ ہزاروں آدمیوں نے روایت کیا ہے لیکن امام موصوف کے جن تلامذہ سے کتاب الآثار کی روایت کا سلسلہ چلا ہے وہ یہ مذکورہ بالا چار بزرگ ہیں۔ علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں اپنا سلسلہ سند ان چاروں حضرات تک بیان کر دیا ہے۔ ایسے ہی علامہ مسند محمد سعید نے اوائل السنبلیہ میں یہی اپنا سلسلہ سند بتایا ہے۔ ہم ان بزرگوں کے علاوہ چند اور محدثین کا تذکرہ کرتے ہیں جنہوں نے امام ابوحنیفہ سے کتاب الآثار کا باقاعدہ سماع کیا ہے۔

امام عبداللہ بن المبارک کے بارے میں مشہور محدث خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں حمیدی شیخ بخاری کی زبانی نقل کیا ہے:

سمعت عبداللہ بن المبارک یقول کتبت عن ابی حنیفۃ اربعمائۃ حدیث [1]

عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہ سے چار صد حدیثیں لکھی ہیں۔

امام حفص بن غیاث سے حافظ حارثی نے بسند متصل نقل کیا ہے:

سمعت من ابی حنیفۃ حدیثاً کثیراً [2]

میں نے امام ابوحنیفہ سے بہت حدیثیں سنی ہیں۔

شیخ الاسلام عبداللہ بن یزید مقری کے بارے میں علامہ کردری فرماتے ہیں:

سمع من الامام تسعمائۃ حدیث [3]

انہوں نے امام ابوحنیفہ سے نو سو حدیثیں سنی ہیں۔

حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں امام وکیع بن الجراح کے متعلق سید الحفاظ یحییٰ بن معین کی زبانی انکشاف کیا ہے:

ما رأیت احداً اقدمہ علی وکیع وکان یفتی برای ابی حنیفۃ وکان یحفظ حدیثہ کلہ وکان قد سمع من ابی حنیفۃ حدیثاً کثیراً [4]

---

[1] تاریخ بغداد۔ [2] مناقب موفق ج ۱ ص ۴۰۔ [3] کردری ج ۲ ص ۲۳۱۔ [4] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۹۔

ہیں وکیع پر کسی کو مقدم نہیں کرتا وکیع امام ابوحنیفہ کی رائے پر فتویٰ دیتے تھے
اور ان کو ابوحنیفہ کی ساری حدیثیں یاد تھیں وکیع نے ابوحنیفہ سے بہت
حدیثیں سُنی ہیں۔

حافظ موصوف ہی نے اپنی ایک دوسری کتاب میں امام حماد بن زید کے بارے میں لکھا ہے :

روی حماد بن زید عن ابی حنیفۃ حدیثاً کثیراً۔[1]

حماد بن زید نے امام ابوحنیفہ سے بہت حدیثیں روایت کی ہیں۔

حافظ ابن عبدالبر نے خالد الواسطی محدث کے متعلق انکشاف کیا ہے کہ :

روی عنہ خالد الواسطی احادیث کثیرۃ۔[2]

خالد نے ابوحنیفہ سے بہت حدیثیں روایت کی ہیں۔

یہ وہ اکابر محدثین ہیں کہ جن میں سے ہر ایک علم حدیث وفقہ کا آفتاب وماہتاب ہے یاد رہے کہ بجز مؤطا امام مالک کے اور کسی کتاب کے راوی اس قدر جلالت علمی کے مالک نہیں ہیں اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ صرف ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے امام اعظم سے کتاب الآثار کا سماع کیا ہے ورنہ امام اعظم سے احادیث روایت کرنے والے تو اس قدر زیادہ ہیں کہ بقول حافظ ذہبی۔

روی عنہ من المحدثین والفقہاء عدۃ لا یحصون۔[3]

امام ابوحنیفہ سے محدثین وفقہاء میں سے بے شمار نے روایت کی ہے۔

کتاب الآثار کی علمی حیثیت

علمی طور پر کتاب الآثار کا مقام اور اس کی مرویات کی فنی حیثیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ قاضی ابوالعباس محمد بن عبداللہ بن ابی العوام اپنی کتاب اخبار ابی حنیفہ میں بسند متصل لکھتے ہیں :

حدثنی یوسف بن احمد المکی ثنا محمد بن حازم الفقیہ ثنا محمد
بن علی الصائغ بمکۃ ثنا ابراھیم بن محمد عن الشافعی عن
عبدالعزیز الدراوردی قال کان مالک ینظر فی کتب ابی

---

[1] [2] الانتقاء ص ۱۳۰ [3] مناقب ذہبی ص ۱۱

حنیفۃ و ینتفع بہا ۔

امام مالک امام ابوحنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور ان سے نفع اندوز ہوتے تھے ۔

غور فرمائیے کہ جب امام مالک مؤطا کی تالیف میں امام اعظم کی کتابوں سے استفادہ فرماتے ہیں تو پھر کتاب الآثار کی رفعت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا ۔ اگر یہ واقعہ ہے اور واقعہ نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ شاہ عبدالعزیز لکھ رہے ہیں کہ مؤطا کا درجہ صحیحین کے لیے بمنزلہ ماں کے ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ اس لحاظ سے کتاب الآثار کا مقام بھی مؤطا امام مالک کے لیے یہی ہے یعنی جو نسبت بخاری و مسلم کی کتابوں کو مؤطا امام مالک سے ہے وہ ہی نسبت مؤطا کو کتاب الآثار سے بھی ہے ۔

تنویر الحوالک میں ہے :

حافظ مغلطائی فرماتے ہیں کہ پہلے جس نے صحیح تصنیف کی وہ مالک ہیں حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ مالک کی کتاب خود ان کے نزدیک اور ان کے مقلدین کے نزدیک صحیح ہے [1]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علامہ مغلطائی کے نزدیک اس بارے میں اوّلیت کا شرف امام مالک کو حاصل ہے لیکن کتاب الآثار مؤطا سے پہلے کی تصنیف ہے جس سے خود مؤطا کی تالیف میں استفادہ کیا گیا ہے ۔ چنانچہ حافظ سیوطی رقمطراز ہیں :

من مناقب ابی حنیفۃ التی انفرد بہا انہ اول من دوّن الشریعۃ ورتبہ ابوابًا ثم تبعہ مالک فی ترتیب المؤطا و لم یسبق اباحنیفۃ احد [2]

ابوحنیفہ کی ان بزرگیوں میں سے جن میں وہ یگانہ روزگار ہیں یہ ہے کہ قانونِ اسلامی کے اولین مدوّن اور مرتب ہیں امام مالک ان کے تابع ہیں ۔

کتاب الآثار میں جو حدیثیں ہیں وہ مؤطا کی روایات سے قوت و صحت میں کم نہیں ہیں ۔

---

[1] تنویر الحوالک ص ۴ ۔ [2] تبییض الصحیفہ ص ۳۶ ۔

جس طرح مؤطا کے مراسیل کے توابع وشواہد موجود ہیں اسی طرح اس کے مراسیل کا حال ہے اس لیے صحت کے جس معیار پر حافظ مغلطائی اور حافظ ابن حجر کے نزدیک مؤطا صحیح ہے ٹھیک اسی معیار پر کتاب الآثار صحیح اترتی ہے۔ مؤطا کو کتاب الآثار سے وہی نسبت ہے جو صحیح مسلم کو صحیح بخاری سے ہے۔

کتاب الآثار کا تاریخی مقام

اسناد و روایت کے لحاظ سے کتاب الآثار کا کیا مقام ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کتاب الآثار چالیس ہزار حدیثوں کے مجموعہ کا انتخاب ہے۔ امام بخاری کا زمانہ چونکہ اتباع تابعین کے بعد ہے زمانے کی دوری کی وجہ سے ایک ایک حدیث کے ہزاروں طرق رونما ہو چکے تھے اس لیے ان کی کتاب خود ان کے اقرار کے مطابق

اخرجته من نحو ست مائة الف [1]

چھ لاکھ حدیثوں سے میں نے یہ انتخاب کیا ہے

لیکن امام ابوحنیفہ کا زمانہ صحابہ اور کبار تابعین کا زمانہ ہے اس لیے یہاں طرق میں اتنی وسعت اور پھیلاؤ نہیں ہے اس کے باوجود چالیس ہزار حدیثوں سے کتاب الآثار کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ چنانچہ امام ابوبکر بن محمد زرنجری فرماتے ہیں۔

انتخب ابوحنیفة الآثار من اربعین الف حدیث [2]

امام ابوحنیفہ کی کتاب الآثار ۴۰ ہزار حدیثوں کا انتخاب ہے

امام حافظ ابویحییٰ زکریا بن یحییٰ نیشاپوری جو ارباب صحاح ستہ کے معاصر ہیں۔ امام اعظم سے بالسند ناقل ہیں:۔

میرے پاس حدیث کے صندوق بھرے ہوتے موجود ہیں مگر میں نے ان میں سے تھوڑی حدیثیں نکالی ہیں جن سے لوگ نفع اندوز ہوں [3]

اور حافظ ابونعیم اصفہانی نے مسند ابی حنیفہ میں بسند متصل یحییٰ بن نصر کی زبانی نقل کیا ہے کہ

میں امام ابوحنیفہ کے یہاں ایسے مکان میں داخل ہوا جو کتابوں سے اٹا ہوا تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے فرمایا کہ یہ سب احادیث ہیں

---

[1] الحطہ ص ۷۰ [2] [3] مناقب للموفق ج ۲ ص ۹۵۔

اور ہیں نے ان میں سے تھوڑی حدیثیں بیان کی ہیں [۱]

امام اعظم کی حدیث میں احتیاط کا بڑے بڑے محدثین نے اقرار کیا ہے چنانچہ حافظ ابو محمد عبداللہ حارثی بسند متصل امام وکیع سے جو حدیث کے بہت بڑے امام ہیں نقل کرتے ہیں،

جیسی احتیاط امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے حدیث میں پائی گئی کسی دوسرے سے نہیں پائی گئی [۲]

اسی طرح علی بن جعد جوہری سے جو حدیث کے بہت بڑے حافظ اور امام بخاری و ابوداؤد کے شیخ ہیں نقل کیا ہے :

قال علی بن الجعد ابوحنیفۃ اذا جاء بالحدیث جاء بہ مثل الدر [۳]

ابوحنیفہ جب بھی حدیث پیش کرتے ہیں تو موتی کی طرح آبدار ہوتی ہے۔

اور امام یحییٰ بن معین جن پر فن جرح و تعدیل کا دار و مدار ہے فرماتے ہیں :

ابوحنیفہ ثقہ ہیں جو حدیث ان کو یاد ہوتی ہے وہی بیان کرتے ہیں اور جو حفظ نہیں ہوتی اس کو بیان نہیں کرتے [۴]

امام عبداللہ بن المبارک جن کی جلالتِ شان پر محدثین کا اتفاق ہے انہوں نے امام اعظم کی شان میں جو مدحیہ اشعار کہے ہیں ان میں بھی کتاب الآثار کی نباہتِ شان کا ذکر ہے۔

روی آثارہ فاجاب فیہا	کطیران الصقور من المنیفۃ

انہوں نے آثار کو روایت کیا تو اتنی تیزی سے چلے جیسے بلندی سے پرندے شکاری اڑتے ہوں۔

فلم یک بالعراق لہ نظیر	ولا بالمشرقین ولا بکوفۃ

نہ تو عراق میں ان کی نظیر تھی نہ مشرق و مغرب میں اور نہ کوفہ میں [۵]

اسی طرح مشہور امام ابویحییٰ غسان بن محمد نے اپنی ایک نظم میں بھی کتاب الآثار کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے امام ابوحنیفہ کی شان میں لکھی ہے :

وبنی علی الآثار بنائہ	فاتت غوامضہ علی الاساس

---

[۱] عقود الجواہر المنیفہ ج ۱ ص ۲۳۔ [۲] المناقب للموفق ج ۱ ص ۱۹۷۔ [۳] جامع المسانید ج ۲ ص ۳۰۵۔
[۴] تاریخ بغداد، تہذیب التہذیب۔ [۵] المناقب ج ۲ ص ۱۹۰۔

وانا س یتبعون فیہا قولہ　　　لما ستبان ضیاءہ للناس [1]

اسی طرح امام اہل سمرقند ابو مقاتل سمرقندی اپنی ایک نظم میں فرماتے ہیں:

روی الآثار عن نبل ثقات غزار العلم مشیخۃ حسیفۃ۔ [2]

کتاب الآثار کی امتیازی حیثیت

چونکہ کتاب الآثار کا موضوع صرف احادیث ہیں جن سے فقہی مسائل کا استنباط ہوتا ہے اور جن کی حیثیت سنن کی ہے اس لیے وہ سینکڑوں ابواب جو صحیحین اور جامع ترمذی جیسی حدیث کی کتابوں میں پھیلے ہوتے ہیں وہ کتاب الآثار میں نہیں ہیں کیونکہ ان ابواب کا تعلق فقہیات سے نہیں ہے اس لیے بعض محدثین نے کتاب الآثار کو کتاب السنن کے نام سے پکارا ہے۔ کتاب الآثار کا ایک نمایاں امتیاز یہ ہے کہ اس کی مرویات اس دور کی دیگر تصانیف کی طرح اپنے ہی شہر اور اقلیم کی روایات میں محدود نہیں بلکہ اس میں مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، غرض کہ حجاز، عراق دونوں جگہ کا علم تحریر و تدوین میں یکجا موجود ہے۔

حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:۔

> دین و فقہ و علم کی اشاعت اُمت میں اصحاب عبداللہ بن مسعود، اصحاب زید بن ثابت، اصحاب عبداللہ بن عمر اور اصحاب عبداللہ بن عباس سے ہوئی ہے اور لوگوں کا عام علم ان چار ہی کے ساتھیوں سے لیا ہوا ہے چنانچہ مدینہ والوں کا علم زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمر کے اصحاب سے اور مکہ والوں کا علم عبداللہ بن عباس کے اصحاب کا اور عراق والوں کا علم عبداللہ بن مسعود کے ساتھیوں اور شاگردوں کا ہے [3]

امام مالک نے مؤطا کی تالیف مدینے میں کی ہے اور اس میں مدنی شیوخ کے علاوہ اور لوگوں سے برائے نام روایتیں ہیں لیکن کتاب الآثار کے راویوں میں حجازی یا عراقی کی کوئی تخصیص نہیں ہے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۵۰ - امام اعظم نے اپنی عمارت کی بنیاد آثار پر رکھی تو آپ کے دقیق مسائل درست ہوگئے۔ لوگ ان مسائل میں آپ کی بات کی پیروی اس لیے کرتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے آپ کے ارشادات کی تابانی آگئی ہے۔ [2] المناقب ج ۲ ص ۱۹۰۔ [3] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۸ -

بلکہ حجاز، عراق اور تمام جملہ بلادِ اسلامیہ کے علماء سے اس میں روایتیں موجود ہیں۔ آپ صرف امام محمد کے حوالے سے آئی ہوئی کتاب الآثار کا مطالعہ کیجئے۔ اور امام اعظم کے تمام شیوخ کو پڑھ لیجئے تو آپ کو ایک سو پانچ میں سے تیس کے قریب ایسے مشائخ ملیں گے جن کا وطن کوفہ نہیں ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر سمجھنے کی ہے کہ صحابہ میں جن بزرگوں میں سے مسائل منقول ہیں ان کی تعداد حافظ ابن القیم نے یہ بتائی ہے۔

والذین حفظت عنھم الفتوی من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مائۃ ونیف وثلاثون نفسا ما بین رجل وامرأۃ۔[1]

اصحاب میں سے اربابِ فتویٰ مرد و زن تقریباً ایک سو تیس سے کچھ اوپر نفوس قدسی ہیں۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان میں فرقِ مراتب بھی تھا۔

ان میں کثیر الفتاویٰ، قلیل الفتاویٰ اور متوسط بھی تھے[2]

سب سے زیادہ کثیر الفتاویٰ یہ حضرات ہیں:

کان المکثرون منھم سبعۃ عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، عبد اللہ بن مسعود، عائشۃ ام المومنین و زید بن ثابت و عبد اللہ بن عمر، و عبد اللہ بن عباس[3]

کثیر الفتاویٰ سات بزرگ ہیں عمر، علی، عبد اللہ، عائشہ، زید بن ثابت، عبد اللہ ابن عمر، عبد اللہ بن عباس۔

ان سات میں بھی چار بزرگ بہت زیادہ ممتاز گذرے ہیں۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

واکابر ھذا الوجہ عمر و علی و ابن مسعود و ابن عباس[4]

ان میں بزرگترین عمر، علی، ابن مسعود اور ابن عباس ہیں۔

حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ ان میں سے ایک ایک بزرگ کے فتاویٰ کو اگر جمع کیا جائے تو مستقل ایک ایک ضخیم کتاب تیار ہو جاتے اور ابوبکر محمد بن موسیٰ کے بارے میں حافظ ابن القیم کی تصریح ہے کہ احد ائمۃ الاسلام فی العلم والحدیث۔ انہوں نے حضرت

---

[1]، [2]، [3] اعلام الموقعین ص ۵۔ [4] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۳۳

ابن عباس کے فتاوی کو یکجا کیا تو

جمع فی عشرین کتابا[۱] بیس کتابوں میں جمع کیا

مؤطا میں حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت ابن عباس سے بہت کم روایات ہیں، شاہ ولی اللہ مصفیٰ کے مقدمہ میں فرماتے ہیں۔

امام مالک نے حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت ابن عباس سے کم روایات لی ہیں۔ ہارون الرشید نے امام مالک سے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ لم یکونا ببلدی ولم الق رجالھما یعنی یہ دونوں بزرگ میرے شہر میں نہ تھے اور میری ان کے اصحاب سے ملاقات نہیں ہوئی۔[۲]

اس کے برعکس کتاب الآثار میں جس مقدار میں حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایات ہیں اسی کے قریب قریب حضرت عمر، حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس کی بھی روایات ہیں۔

کتاب الآثار کی مقبولیت

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ

مسند ابی حنیفہ و آثار محمد بنائے فقہ حنفیہ است[۳]

اس کا مطلب یہ ہے کہ امت مرحومہ کا سواد اعظم جس کی تعداد تمام عالم کے مسلمانوں میں دو تہائی ہے اس کے مذہب کا علمی سرمایہ امام ابوحنیفہ کی کتاب الآثار ہے اور اسے امت کی اکثریت کی تلقی بالقبول کا شرف حاصل رہا ہے صرف اور صرف احناف ہی کی نہیں بلکہ ہر دور میں شروع ہی سے ائمہ نے بھی اس کتاب کی جلالت کو مانا ہے۔

امام مالک کے بارے میں آپ پہلے پڑھ آئے ہیں کہ عبدالعزیز دراوردی فرماتے ہیں کہ امام موصوف امام ابوحنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور ان سے نفع اندوز ہوتے تھے امام شافعی نے تصریح کی ہے کہ:

من لم ینظر فی کتب ابی حنیفۃ لم یتبحر فی الفقہ[۴]

---

[۱] الاحکام فی اصول الاحکام [۲] مصفیٰ ج ا ص ۱۳۔ [۳] قرۃ العینین ص ۱۸۵
[۴] مناقب

خطیب نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ ایک بار ابو مسلم مستملی نے شیخ الاسلام یزید بن ہارون جبکہ وہ بغداد میں منصور بن المہدی کے پاس فروکش تھے ہم بالاخانے میں پہنچ گئے۔ ابو مسلم نے دریافت کیا کہ

ما تقول یا ابا خالد فی ابی حنیفۃ والنظر فی کتبہ

اے ابو خالد تمہاری ابو حنیفہ اور ان کی کتابوں کے مطالعہ کے بارے میں کیا رائے ہے۔

آپ نے فرمایا:

انظروا فیہا ان کنتم تریدون ان تفقہوا فانی ما رأیت احدا من الفقہاء یکرہ النظر فی قولہ[1]

اگر تم فقیہ بننا چاہتے ہو تو ان کا مطالعہ کرو میں نے کسی بھی فقیہ کو ان سے بے نیاز نہیں دیکھا۔

ایک اور موقع پر جب یزید بن ہارون حدیث کا درس دے رہے تھے طلبہ کو خطاب کر کے کہنے لگے:

تمہارا پیش نہاد تو بس حدیث سننا اور جمع کر لینا ہے اگر علم تم لوگوں کا مقصد ہوتا تو حدیث کی تفسیر اور اس کے معانی کی تلاش کرتے اور ابو حنیفہ کی تصانیف اور ان کے اقوال میں غور کرتے تب حدیث کی حقیقت تم پر واضح ہوتی۔[2]

اور حافظ عبد اللہ بن داؤد الخریبی فرماتے ہیں:

جو شخص چاہتا ہے کہ نابینائی اور جہالت کی ذلت سے نکلے اور فقہ کی لذت سے آشنا ہو اس کو چاہیے کہ ابو حنیفہ کی کتابیں دیکھے۔[3]

ان ہی حافظ عبد اللہ بن داؤد الخریبی کا بیان خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے:

عبد اللہ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنی نمازوں میں امام ابو حنیفہ کے لیے دعا کیا کریں کیونکہ انھوں نے مسلمانوں کے لیے فقہ اور سنن کو

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۴۲۔ [2] مناقب ملا علی قاری ج ص ۴۵۵۔ [3] مناقب الموفق ج ۲ ص ۸۴

محفوظ کر دیا ہے[1]

حافظ ابو یعلی خلیلی نے کتاب الارشاد میں امام مزنی کے ترجمہ میں لکھا ہے۔ امام مزنی امام شافعی کے بڑے تلامذہ میں سے ہیں اور امام طحاوی کے رشتہ میں ماموں ہوتے ہیں۔ ایک بار ان سے محمد بن احمد شرطی نے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے ماموں کے خلاف ابو حنیفہ کا مذہب کیوں اختیار کیا۔ امام طحاوی نے فرمایا اس لیے کہ:

میں اپنے ماموں کو دیکھا کرتا تھا کہ وہ ہمیشہ ابو حنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے ہیں لہٰذا میں نے بھی ان کے مذہب کو اختیار کر لیا[2]

یہ ائمہ فقہ و حدیث کی تصریحات اور امام اعظم کی تصانیف کے بارے میں ان کے طرز عمل کی داستان ہے۔ اس سے آپ کتاب الآثار کی ان ائمہ میں جلالت قدر اور مقبولیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

کتاب الآثار کا محدثین پر اثر

کتاب الآثار نے محدثین پر کیا اثر ڈالا اور امام اعظم کے بعد آنے والے محدثین امام اعظم سے اس فن کی تدوین میں کس قدر اثر پذیر ہوئے اس کا ایک معمولی اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ روایات کی ترتیب اور تبویب کے سلسلے میں امام اعظم نے کتاب الآثار میں جو طریقہ اختیار کیا تھا۔ بعد کے تمام مؤلفین نے اسی کو اپنایا۔ السیوطی کی تصریح کے مطابق موطا کی ترتیب اسی کو پیش نظر رکھ کر کی گئی۔ اسی طرح روایات کی صحت کے بارے میں امام اعظم نے جو معیار قائم کیا تھا بعد کے ارباب صحاح نے اختلاف مذاق کے باوجود اس کا پورا پورا خیال رکھا۔ حافظ ابن عدی نے بسند متصل امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ:

ما ادخلت فی کتابی الا ما صح[3]

امام مسلم نے اپنی صحیح میں لکھا ہے کہ میں نے صحیح میں وہ ہی حدیثیں درج کی ہیں جن کی صحت پر اور مشائخ وقت کا بھی اتفاق تھا۔ چنانچہ خود ان کا بیان ہے۔

انما وضعت ھٰھنا ما اجمعوا علیہ[4]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۴۴۔ [2] وفیات الاعیان۔ [3] مقدمہ فتح الباری ص ۵۔ [4] صحیح مسلم۔

امام اعظم نے روایت سے احتجاج کے بارے میں ان بزرگوں سے پہلے یہ طرزِ عمل بنایا تھا کہ:

انی اٰخذ بکتاب اللہ اذا وجدتہ فمالم اجدہ اخذت بسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والاٰثار الصحاح عنہ التی فشت فی ایدی الثقات[۱]

میں مسئلہ کو جب کتاب اللہ میں پاتا ہوں تو وہاں سے لیتا ہوں اگر وہاں نہ ملے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کی صحیح حدیثوں سے لیتا ہوں کہ جو ثقات کے ہاتھوں شائع ہو چکی ہیں۔

امام سفیان ثوری نے امام اعظم کے اس طرزِ عمل کی شہادت ان الفاظ میں دی ہے۔

یاخذ بما صح عندہ من الاحادیث التی کان یحملھا الثقات و بالاٰخر من فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

جو حدیثیں ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہیں اور جن کو ثقہ روایت کرتے ہیں اور جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ہوتا ہے وہ ہی لیتے ہیں[۲]

کتاب الآثار میں ان ہی آثار صحیحہ کو جن کی اشاعت ثقات کے ہاتھوں عمل میں آئی ہے جمع کر دیا ہے۔ امام اعظم نے اس کتاب میں جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا بعینہٖ وہی طرزِ عمل امام اعظم کی پیروی میں السیوطی کی تصریح کے مطابق امام مالک نے مؤطا میں اختیار فرمایا ہے جیسا کہ پیچھے اشارہ پڑھ آئے ہو کہ مؤطا کو شاہ عبد العزیز نے اصل و ام صحیحین قرار دیا ہے۔ شاہ صاحب نے عجالہ نافعہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ

صحیح بخاری و مسلم اگرچہ تفصیل کے لحاظ سے مؤطا سے دس گنی ہے لیکن روایت احادیث کا طریقہ، رجال کی تمیز اور اعتبار و استنباط کا ڈھنگ مؤطا ہی سے سیکھا ہے[۳]

اگر بخاری و مسلم نے مؤطا سے سیکھا ہے تو امام مالک نے مؤطا میں امام اعظم کی کتاب الآثار کی پیروی کی ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ روایات کی ترتیب و تبویب اور صحت کے بارے میں جو معیار امام اعظم نے قائم کر دیا تھا اس کی سب نے پیروی کی ہے۔ اس لحاظ سے کتاب الآثار

---

[۱] مناقب ملا علی قاری [۲] الانتقاء ص ۱۴۲ - [۳] عجالہ نافعہ ص ۵ -

جین کی ام الام ہوتی ہے۔

تبویب اور ترتیب تو بڑی بات ہے محدثین نے نام تک تجویز کرنے میں امام اعظم کی تقلید کی ہے، چنانچہ امام طبری نے اپنی کتاب کا نام تہذیب الآثار، حافظ ابوجعفر طحاوی نے معانی الآثار، مشکل الآثار، امام شلبی نے تصحیح الآثار رکھا۔

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ کتاب الآثار سے پہلے حدیث کی کوئی کتاب الابواب پر مرتب نہیں ہوئی۔ کتاب الآثار تصنیف ہوئی تو حدیث کی تبویب کا رواج شروع ہوا اور چونکہ اس میں تبویب کے ساتھ صحیح روایات درج کرنے کا التزام تھا اس لیے بعد میں ابواب پر تصنیف کے لیے بھی ضروری ہو گیا کہ صحیح روایات درج کتاب کی جائیں۔ چنانچہ حافظ سیوطی رقمطراز ہیں:

ان المصنف علی الابواب انما یورد اصح ما فیہ لیصلح الاحتجاج

ابواب پر تصنیف کرنے والا اس مضمون کی صحیح تر وہ روایات لاتا ہے جو لائق استدلال ہوں۔[1]

ان تصریحات سے آپ کو اتنی بات کا ضرور اندازہ ہو گیا ہو گا کہ حسن ترتیب، جودت تالیف، صحت روایات اور ان کے انتخاب میں کتاب الآثار نے بعد میں آنے والے مصنفین کے لیے کیسا اچھا نقش قدم چھوڑا ہے۔

کتاب الآثار کی علمی خدمت

حدیث کی دوسری کتابوں کی طرح کتاب الآثار کی بھی علمی خدمت کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ امام اعظم کے اساتذہ میں سے ہر استاد کی مرویات کو یکجا کر کے اس کو مسند ابی حنیفہ کے نام سے موسوم کر دیا ہے اور علامہ خوارزمی نے ان سب مسانید کو یکجا کر کے جامع المسانید نام رکھا ہے ورنہ یہ مسانید امام اعظم کی تصنیف نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ حافظ ابوعبداللہ محمد بن علی بن حمزہ الحسینی نے التذکرہ برجال العشرہ میں لکھا ہے کہ

مسند الشافعی موضوع للادلۃ علی ما صح عندہ من مرویاتہ و کذالک مسند ابی حنیفۃ[2]

---

[1] تدریب الراوی ص ۵۶۔ [2] تعجیل المنفعۃ ص ۴

مسند امام شافعی ان دلائل پر مشتمل ہے جو امام موصوف کی روایات میں ان کے نزدیک صحیح ہیں اور یہی حال مسند ابی حنیفہ کا ہے۔

یعنی مسند شافعی کی طرح مسند ابی حنیفہ بھی ان دلائل پر مشتمل ہے جو امام ابو حنیفہ کی روایات میں ان کے نزدیک صحیح ہیں۔ یہ حسینی حنفی نہیں بلکہ مسلک کے لحاظ سے شافعی ہیں اور ان کا شمار محدثین میں نہیں بلکہ حفاظِ وقت اور ناقدینِ فن میں ہے۔ ان کا مبسوط ترجمہ حافظ ابن فہد نے لحظ الالحاظ میں اور حافظ سیوطی نے ذیل طبقات الحفاظ میں لکھا ہے۔ حافظ ابنِ فہد نے لکھا ہے۔

کان رضی النفس حسن الاخلاق من الثقات الاثبات، اماماً مؤرخاً حافظاً له قدر کبیر [1]

حافظ مغلطائی، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن رافع اور حافظ حسینی معاصر ہیں۔ حافظ حسینی کی کتاب التذکرہ برجال العشرہ بڑے پایہ کی کتاب ہے۔ اس میں جن دس کتابوں کے رجال مذکور ہیں وہ ائمہ اربعہ فقہ مجتہدین اور ائمہ ستہ حدیث کی کتابیں ہیں، چنانچہ حافظ سیوطی فرماتے ہیں۔

الف التذکرة فی رجال العشرة الکتب الستة والموطا والمسند ومسند الشافعی وابی حنیفة [2]

مشہور محدث محمد بن جعفر الکتانی رقمطراز ہیں:

فهذه کتب الائمة الاربعة وباضافتها الی الستة الاولی تکمل الکتب العشرة التی هی اصول الاسلام وعلیها مدار الدین [3]

الغرض مسانید امام اعظم کی تالیف نہیں بلکہ ان کی حیثیت وہی ہے جو فی الواقع محدثین کے عرف میں مسند کی ہوتی ہے جیسے مسند ابی بکر، مسند فاروق اعظم۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ بستان المحدثین میں فرماتے ہیں۔

پس نسبت ایں مسند بحضرت امام اعظم ازیں باب است کہ مثلاً مسند ابی بکر را از مسند احمد نسبت بحضرت ابی بکر نمائیم [4]

---

[1] لحظ الالحاظ ص ۱۵۔ [2] ذیل طبقات الحفاظ ص ۳۶۵۔ [3] الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۸
[4] بستان المحدثین ص ۴۳۔

ابواب اور مسانید میں فرق

ابواب اور مسانید میں فرق یہ ہے کہ ترتیب کی صورت میں احادیث کو مضامین کی رعایت سے بابوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ نماز کی جداگانہ، روزہ کی علیحدہ، زکوٰۃ کی الگ حدیثیں الگ بابوں میں بیان کی جاتی ہیں۔ اور مسانید میں حدیث کا تعلق خواہ کسی موضوع سے ہو ہر صحابی کی ساری روایات کو بلالحاظِ مضمون ایک جگہ بیان کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابوبکر کی ساری حدیثیں مسند ابی بکر میں درج کی جاتی ہیں۔ چاہے ان حدیثوں کا کسی بھی موضوع سے تعلق ہو۔

ابواب و مسانید میں ایک یہ بھی لطیف فرق ہے۔ مصنفینِ ابواب کے پیشِ نظر وہ روایات ہوتی ہیں جن کی حیثیت روایتی طور پر اعتباری اور استدلالی ہو یعنی عموماً ان روایات کا ذکر کرتے ہیں جو مسئلہ کے لیے احتجاج یا استشہاد کے قابل ہوں۔ اس کے برعکس اربابِ مسانید کا کام صرف روایات کو جمع کرنا ہوتا ہے اس لیے وہ بہ نسبت مصنفینِ ابواب کے میدانِ تصنیف میں ذرا آزاد رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسانید میں صحیح اور غیر صحیح روایات کا انبار نظر آتا ہے۔ محدث حاکم نیشاپوری لکھتے ہیں :

> ابواب و مسانید میں فرق یہ ہے کہ مسانید کی صورت میں شرط یہ ہے کہ مصنف اس طرح عنوان قائم کرے۔ ذکر ما روی عن ابی بکر عن النبی۔ اس صورت میں مصنف کا فرض ہے کہ حضرت ابوبکر کی ساری حدیثوں کی تخریج کرے چاہے وہ صحیح ہوں یا ضعیف ــــ اور ابواب کا مصنف عنوان اس طرح لکھے گا۔ ذکر ما صح و ثبت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الطہارۃ او الصلوٰۃ او غیر ذالک[1]

حافظ ابن حجر عسقلانی ارقام فرماتے ہیں :

> ابواب پر حدیث کی تصنیف کا اصول یہ ہے کہ اس کو صرف ان روایات تک محدود رکھا جاتا ہے جن میں احتجاج و استشہاد کی صلاحیت ہو۔ برخلاف مسانید کے کہ ان میں پیش نہاد صرف احادیث کی فراہمی ہوتا ہے۔[2]

---

[1] المدخل فی اصول الحدیث ص ۵۱،۴ ۔ [2] تعجیل المنفعۃ ص ۲

بہرحال یہ شرف امام اعظم ہی کو حاصل ہے کہ صحابہ اور تابعین کے انداز پر ان کے مسانید ترتیب دیے گئے ہیں یوں تو محدثین اور حفاظ حدیث بہت گزرے ہیں مگر بہت کم ایسے خوش قسمت ہیں جن کی احادیث و روایات توجہ کا ایسا مرکز رہی ہوں اور اس کثرت سے ان کی مرویات پر قلم حرکت میں آئے ہوں۔ اسی حقیقت کی طرف جناب علامہ نواب صدیق حسن خاں نے اشارہ کیا ہے:۔

این مسند درحقیقت تالیف او نیست بلکہ دیگراں بعد ایشاں مرویات ایشاں را جمع نمودہ اند[1]

درحقیقت یہ مسند ان کی تصنیف نہیں ہے بلکہ آپ کے بعد اوروں نے ان کی مرویات کو یکجا کیا ہے۔

جن محدثین و حفاظ حدیث نے امام اعظم کی مرویات کو یکجا کیا اور ان کے نام سے مسانید ترتیب دیے ہیں وہ خود بھی جگہ اتنا اونچا مقام رکھتے تھے کہ ان کی سندیں لکھی جاتیں مگر اس کے باوجود انہوں نے امام اعظم کی مرویات کو جمع کرنے کا کام سنبھالا۔

انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو مشہور عارف عبدالوہاب کا مسانید امام کے بارے میں یہ بیان پڑھیے:۔

مجھ پر اللہ سبحانہ کا بڑا ہی احسان ہے کہ مجھے امام اعظم کے مسانید کا ان کے صحیح نسخوں سے مطالعہ کرنے کی توفیق ملی۔ ان نسخوں پر حفاظ حدیث کے قلم سے تحریریں تھیں جن میں آخری شخص حافظ دمیاطی ہیں، مطالعہ میں میں نے محسوس کیا کہ امام ممدوح ان تابعین کبار سے حدیثیں روایت کرتے ہیں جو اپنے وقت کے بزرگ ترین عادل اور ثقہ تھے اور جو حدیث نبوی کی تصریح کے مطابق خیر القرون کے لوگ تھے مثلاً اسود، علقمہ، عطاء، مجاہد اور حسن بصری وغیرہ۔ اس لیے وہ تمام حضرات جو امام ابو حنیفہ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واسطہ ہیں سب کے سب عادل اور برگزیدہ ہیں ان میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو کذاب ہو

---

[1] اتحاف النبلاء المتقین ص ۱۲۳۔

یا جس پر کذب کی تہمت ہو۔ اے برادر! ان کی عدالت کے لیے تو یہی کافی ہے کہ امام ممدوح نے باوجود بے حد ورع و احتیاط ان کے حضرات کو اس غرض کے لیے منتخب کیا ہے[1]

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:۔

اذ کل حدیث وجدنا ہ فی مسانید الامام الثلاثۃ فھو صحیح۔

امام اعظم کے مسانید سہ گانہ کی ہر حدیث ہمارے نزدیک صحیح ہے[2]

ان تصریحات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسانید امام کا محدثین و حفاظ کے یہاں کیا مقام ہے اور خود امام اعظم حدیث میں کس حیثیت کے مالک ہیں؟

آئیے کچھ ان حفاظِ حدیث کو بھی پڑھ لیجئے جنہوں نے امام اعظم کی مرویات کو مسند کی صورت میں مدون کیا ہے۔

۱:۔ حافظ محمد بن مخلد دوری

ان کی کنیت ابو عبداللہ اور والد کا نام مخلد ہے تذکرۃ الحفاظ میں مخلد کی جگہ احمد غلط طبع ہو گیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں اور حافظ ذہبی نے دول الاسلام میں مخلد ہی بتایا ہے۔ عطاء کی نسبت سے مشہور ہیں۔ حدیث میں ابو حذافۃ السہمی، الحسن بن عرفہ، یعقوب دورقی، امام مسلم اور دوسرے محدثین کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے بہت زیادہ صاحب التصانیف ہیں منجملہ دیگر تصانیف کے امام اعظم کی مرویات کو مستقل کتابی صورت میں علیحدہ جمع کیا ہے اور اس کا نام بھی "جمع حدیث ابی حنیفۃ" رکھا ہے۔ اس تالیفی کارنامہ کا تذکرہ محدث خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

روی عنہ محمد بن مخلد الدوری فی جمعہ حدیث ابی حنیفۃ۔[3]

ان سے محمد بن مخلد نے اپنے مجموعہ میں حدیث ابی حنیفہ روایت کی ہے

یہ مشہور محدث امام دارقطنی کے استاد حدیث ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کی شہرت

---

[1]، [2] المیزان الکبریٰ ج ۱ ص ۶۸۔ [3] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۸۸۔

کا بار بار اعلان کیا ہے اور لکھا ہے کہ فی تاریخ بغداد لہ ترجمۃ ملیحۃ تاریخ بغداد میں ان کا شاندار ترجمہ ہے[1] حافظ ذہبی نے ان کو حفاظِ حدیث میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ صرف کثیر التصانیف محدث ہی نہیں بلکہ تین چیزوں میں خاص شہرت رکھتے ہیں :

کان معروفا بالثقۃ والصلاح والاجتہاد فی الطلب۔

ثقاہت، صلاحیت اور تلاش و جستجو کے لیے محنت میں مشہور تھے[2]

امام ابوداؤد کے بھی بلا واسطہ شاگرد ہیں سنن ابوداؤد کے بارے میں ان کا ایک بیان حافظ عسقلانی نے تہذیب میں نقل کیا ہے فرماتے ہیں کہ :

امام ابوداؤد کی ایک لاکھ حدیثوں کا مذاکرہ کرنے کے لیے جب آپ نے کتاب السنن تصنیف کی اور اس کو لوگوں کے سامنے پڑھا تو محدثین کے لیے ان کی کتاب قرآن کی طرح قابلِ اتباع ہو گئی اور اس دور کے سب ہی محدثین نے امام موصوف کو حافظِ وقت مانا ہے[3]

ان کی تاریخِ وفات حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ اور دول الاسلام میں اور حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں ۳۳۱ھ لکھی ہے۔ ستانوے سال کی عمر پائی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ اسنادِ حدیث میں اپنے دور کے سب سے بڑے عالم تھے[4]

۲۰۔ حافظ ابوالعباس احمد بن محمد بن سعید

حافظ ابن عقدہ کے نام سے مشہور ہیں۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا مبسوط ترجمہ لکھا ہے اور ان کے چہرے کا آغاز ان لفظوں سے کیا ہے۔

الیہ المنتہی فی قوۃ الحفظ وکثرۃ الحدیث[5]

قوتِ حافظہ اور حدیث کی بہتات میں بس ان پر خاتمہ ہے۔

ان کے حافظ ہونے کے بارے میں حافظ دارقطنی کا تاثر یہ تھا کہ کوفہ کے تمام شہری اس پر متفق ہیں کہ زمانہ ابن مسعود سے آج تک ابن عقدہ سے زیادہ حافظ کوئی نہیں ہوا ہے

---

[1] تہذیب التہذیب ترجمہ محمد بن مخلد۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۰۔ [3] تہذیب ج ۴ ص ۲، [4] تہذیب ج ۹ ص ۴۷۲۔ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵۵۔

حافظ ابن الجوزی رقمطراز ہیں کہ ابن عقدہ اکابر حفاظ میں سے تھے اور ان کے سامنے اکابر محدثین
حافظ ابوبکر الجعابی، حافظ عبداللہ بن عدی، امام طبرانی، ابن المظفر، دارقطنی اور ابن شاہین
نے زانوئے ادب تہ کیا ہے[1] حافظ عسقلانی رقمطراز ہیں کہ امام ابوعلی الحافظ فرماتے ہیں۔ میں
نے ابوالعباس سے زیادہ کوفیوں میں کوئی حافظ نہیں دیکھا ہے آپ سے دریافت کیا گیا کہ
کچھ لوگ تو اور ہی کچھ کہتے ہیں فرمایا ابن عقدہ اس سے کہیں بالا ہیں وہ امام ہیں۔ ان کا
مقام یہ ہے کہ ان سے تابعین اور اتباع تابعین کے بارے میں دریافت کیا جاتے
ان کے متعلق کسی کو یارائے سخن نہیں ہے[2] خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ زعفرانی کا
بیان ہے کہ ابن عقدہ کے زمانے میں بغداد میں ابن صاعد نے ایک حدیث غلط سند سے
پیش کردی۔ حافظ ابن عقدہ نے اس پر گرفت کی ابن صاعد کے ساتھیوں نے ہلڑ مچا دیا
بات حکومت تک پہنچ گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ابن عقدہ نذر زندان ہو گئے۔ لیکن علی بن عیسٰی وزیر
نے دونوں فریق کو اس پر راضی کرلیا کہ اس معاملہ میں کسی کو حج تسلیم کرلیا جائے فریقین کی
رضامندی سے ابن ابی حاتم تجویز ہو گئے معاملہ کی پوری روداد لکھ کر ابن ابی حاتم کو بھیج
دی گئی وہاں سے جو فیصلہ آیا وہ وہی تھا جو حافظ ابن عقدہ فرما رہے تھے۔ معاملہ رفع دفع
ہوا اور رہائی ہوئی[3] امام بخاری کی کتاب التاریخ کے اس قدر دلدادہ تھے فرماتے تھے کہ اگر
ایک شخص تیس ہزار احادیث بھی لکھ لے پھر بھی وہ محمد بن اسماعیل کی کتاب التاریخ سے
بے نیاز نہیں ہو سکتا[4] حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ان سے ایک بار دریافت کیا گیا کہ بخاری
اور مسلم میں زیادہ حافظ کون ہے۔ فرمایا دونوں ہی عالم ہیں۔ پھر یہی بات بار بار دہرائی گئی
فرمایا کہ امام بخاری سے شام والوں کے بارے میں غلطیاں ہوئی ہیں کیونکہ انہوں نے ان کی
کتابوں سے مدد لی ہے اس لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک جگہ کنیت کے ساتھ ایک شخص کا
ذکر ہوتا ہے اور دوسرے مقام پر اس کا نام آتا ہے تو امام موصوف اس کو دو شخص سمجھ لیتے
ہیں لیکن امام مسلم کے علل میں غلطی بہت ہی کم ہے کیونکہ انہوں نے صرف مسند حدیثیں لکھی ہیں[5]
حافظ بدر الدین عینی نے تاریخ کبیر میں ان کے بارے میں یہ نفیس انکشاف کیا ہے۔

---

[1] المنتظم تاریخ الملوک والامم ج ۶ ص ۲۳۷۔ [2] لسان المیزان ج ۱ ص ۲۶۵۔ [3] تاریخ بغداد ترجمہ ابن عقدہ
[4] الاعلان بالتوبیخ ص ۲۱۸۔ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۵۰۔

ان مسند ابی حنیفہ لابن عقدۃ یحتوی وحدہ علی ما یزید علی الف حدیث۔

صرف ابن عقدہ والے مسند ابی حنیفہ کی احادیث ایک ہزار سے زیادہ ہیں[1]

ان کی تاریخ وفات حافظ ذہبی نے دول الاسلام تذکرۃ الحفاظ میں اور حافظ ابن الجوزی نے المنتظم میں ۳۳۲ھ قرار دی ہے۔

۱۰۳۔ حافظ عبداللہ الحارثی

امام علامہ حافظ الحدیث حارثی بخاری جن کو دربار علم سے فن حدیث میں عبداللہ الاستاذ کا ممتاز خطاب ملا تھا۔ علم حدیث کے لیے آپ نے خراسان، عراق اور حجاز کے مختلف شہروں کا سفر کیا اور بہت سے شیوخ وقت سے علم حاصل کیا۔ حافظ سمعانی نے الانساب میں لکھا ہے کان شیخا مکثرا من الحدیث بڑے کثیر الحدیث شیخ تھے اور حافظ خلیلی فرماتے ہیں یعرف بالاستاد له معرفة بهذا الشان استاد سے مشہور ہیں اور علم الحدیث کی ان کو معرفت حاصل ہے۔ اور حافظ ذہبی نے قاسم بن اصبغ کے ترجمہ میں بضمن وفیات ۳۴۰ھ ان کا ذکر شاندار لفظوں میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

فیھا مات عالم وراء النھر ومحدثہ الامام العلامہ ابو محمد عبداللہ بن محمد بن یعقوب الحارث الحارثی البخاری الملقب بالاستاد جمع مسند ابی حنیفۃ الامام[2]

یہ کس شان کی مسند ہے؟ اس کے متعلق خوارزمی جامع المسانید میں لکھتے ہیں:

من طالع مسندہ الذی جمعہ للامام ابی حنیفۃ علم تبحرہ فی علم الحدیث واحاطتہ بمعرفۃ الطرق والمتون[3]

جس شخص نے ان کی مسند ابی حنیفہ کا مطالعہ کیا ہے اسے ان کے علمی تبحر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اس مسند کا تذکرہ کیا ہے۔

---

[1] تانیب الخطیب ص ۱۵۹۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ترجمہ قاسم بن اصبغ۔ [3] جامع المسانید خوارزمی

قد اعتنی الحافظ ابو محمد الحارثی وکان بعد الثلاثمائۃ بحدیث ابی حنیفۃ فجمعہ فی مجلدۃ ورتبہ علی شیوخ ابی حنیفۃ [1]

حافظ ابو محمد حارثی نے توجہ فرمائی اور ۳۰۰ھ کے بعد حدیث ابی حنیفہ جمع کی ہے اور ان کو شیوخ ابی حنیفہ پر ترتیب دیا ہے۔

بڑے بڑے حفاظ جیسے حافظ ابن مندہ، حافظ ابن عقدہ، حافظ جعابی فن حدیث میں آپ کے شاگرد ہیں۔ حافظ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ ان کی تصانیف میں مسند ابی حنیفہ کے ساتھ کشف الآثار فی مناقب ابی حنیفہ بھی ہے۔ اس دور کی علمی دلچسپیوں کے بارے میں یہ بات آج بڑی حیرت سے سنی جائے گی کہ موصوف جب اپنی مشہور تصنیف کشف الآثار املا کراتے تھے تو آپ کی مجلس املا میں چار سو مستملی ہوتے تھے۔ خیال فرمایئے کہ جب امام اعظم کے مناقب کے املا میں یہ تعداد ہوتی تھی تو آپ کی مسند کے درس میں خدا جانے یہ تعداد کہاں سے کہاں جا پہنچی ہوگی۔

امام حارثی کی اس مسند کا شاہ عبدالعزیز نے بستان المحدثین میں ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے اول مسند حافظ الحدیث عبداللہ بن محمد بن یعقوب الحارثی۔ حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں اس مسند کا تذکرہ کیا ہے کہ جمع مسند الابی حنیفۃ [2]

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے مشہور رسالہ الانتباہ میں حافظ حارثی کو اصحاب الوجوہ میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ اپنے زمانے میں فقہاء احناف کا مرجع تھے۔ اصحاب الوجوہ کا درجہ مجتہد فی المذہب اور مجتہد منتسب کے درمیان ہوتا ہے۔ فقہ کی تحصیل آپ نے امام ابوحفص صغیر سے کی تھی۔

علامہ خوارزمی ان کی مسند کی روایتی اور تاریخی حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ ـــ

روایتی طور پر مجھے باقاعدہ وقت کے چار اماموں کی وساطت سے یہ مسند ملی ہے۔

اول: خطیب جمال الدین ابوالفضائل عبدالکریم بن عبدالصمد الانصاری۔

دوم: شیخ صفی الدین اسماعیل بن ابراہیم۔

سوم: شمس الدین یوسف بن عبداللہ۔

چہارم: شیخ ابوبکر بن محمد بن عمر فرغانی۔

---

[1] تعجیل المنفعۃ ص ۴۔ [2] لسان المیزان ص ۳۴۹۔

۴۔ حافظ محمد بن ابراہیم الاصفہانی

محمد بن ابراہیم نام اور ابوبکر کنیت ہے۔ ابن المقری کرکے مشہور ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو تذکرۃ الحفاظ میں محدث اصفہان الامام الرحال الحافظ الثقہ کے القاب سے ان کا ترجمہ شروع کیا ہے بڑے پائے کے محدث ہیں چار مرتبہ مشرق و مغرب کا صرف حدیث کی خاطر سفر کیا ہے۔ اصفہان، موصل، حران، عسقلان، کوفہ، تستر، مکہ، قدس، دمشق، صیدا، بیروت، عکا، رملہ، واسط، حمص، مصر وغیرہ تمام ہی شہروں میں حافظ ذہبی نے ان کے اساتذہ کی نشاندہی کی ہے ان کے سامنے بڑے بڑے اجلہ محدثین نے زانوئے شاگردی تہ کیا ہے مثلاً ابوالشیخ اصفہانی، ابوبکر بن مردویہ، حمزۃ السہمی، ابونعیم الاصفہانی وغیرہ وغیرہ۔ حافظ ابونعیم اصفہانی کی ان کے بارے میں رائے ہے۔

محدث کبیر ثقۃ صاحب مسانید سمع مالا یحصی کثرۃ[1]

حافظ ذہبی نے ان کے طلب علم حدیث کی داستان کا خود ان کی زبانی یہ واقعہ لکھا ہے کہ میں، طبرانی اور ابوالشیخ مدینے میں قیام پذیر تھے۔ تنگ حالی کے ہاتھوں لاچار تھے۔ پورا دن گزر گیا کھانے کو کچھ نہ ملا میں عشاء کے وقت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! بھوک لگی ہوئی ہے۔ طبرانی نے میرے سے کہا کہ بیٹھ جاؤ اب کھانا آئے گا یا موت آئے گی۔ میں اور ابوالشیخ کھڑے تھے کہ دروازے پر شیخ علوی نے دستک دی ہم نے دروازہ کھولا۔ تو ان کے ساتھ کھانے کے دو ناشتہ دان دو لڑکے لیے ہوئے آرہے تھے۔ فرمانے لگے تم نے میری حضور انور سے شکایت کی ہے۔ میں نے حضور انور کو ابھی خواب میں دیکھا ہے آپ نے مجھے کھانا پہنچانے کا حکم دیا ہے۔

حافظ ابن مقری الصاحب بن عباد کے لائبریرین رہ چکے ہیں۔ کسی نے الصاحب سے دریافت کیا کہ آپ ادیب ہو کر ابن المقری جیسے محدث سے محبت رکھتے ہیں۔ فرمایا دو وجہ سے۔ اوّل اس لیے کہ ان کے میرے والد سے دوستانہ تعلقات تھے۔ دوسرے اس لیے کہ میں ایک روز سو رہا تھا میں نے خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ تو سو رہا ہے اور دروازے پر ایک اللہ کا ولی کھڑا ہے۔ میں بیدار ہوا اور ملازم کو آواز دے کر کہا کہ دیکھو

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۰۲۔

دروازے پر کون ہے؟ ملازم نے جواب دیا کہ ابوبکر بن المقری ہیں۔ حافظ ذہبی نے ہی یہ بھی بتایا ہے۔

قد صنف مسند ابی حنیفۃ[1]

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی ان کے مسند کا تذکرہ کیا ہے۔

وکذالک خرج المرفوع منہ الحافظ ابوبکر بن المقری۔[2]

اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کی یہ مسند حارثی کی مسند سے چھوٹی ہے۔ حافظ سخاوی نے الاعلان بالتوبیخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ حافظ زین الدین قاسم بن قطلوبغا نے حافظ ابن مقری کی اس مسند کے رجال پر ایک کتاب لکھی ہے[3] ماہ شوال ۳۸۱ھ میں بعمر ۹۶ سال ان کا انتقال ہوا ہے۔[4]

۵:۔ حافظ ابوالحسین محمد بن المظفر

عراق، جزیرہ، مصر اور شام کے اساتذہ مشائخ سے چودہ سال کی عمر ہی میں علم حدیث حاصل کرنا شروع کر دیا۔ حافظ ابن شاہین، حافظ دارقطنی، حافظ ابونعیم، حافظ مالینی اور حافظ برقانی جیسے اساطین و ارکان علم حدیث نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں ایسا نمایاں حصہ لیا کہ حافظ ذہبی نے بھی ان کی فن کاری کا اعتراف کیا۔

جمع والف عن مطابق ھذا الفن لم یتخلف[5]

خطیب بغدادی نے ان کی صداقت اور فہم و حفظ کو سراہا ہے۔ دارقطنی نے ان سے ہزارہا حدیثیں لکھی ہیں۔ قاضی محمد بن عمر کا بیان ہے کہ حافظ دارقطنی حافظ ابن المظفر کا بیحد اکرام کرتے تھے ان کی موجودگی میں سہارے سے نہ بیٹھتے تھے۔[6]

حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ حدیث کے لیے رخت سفر باندھا تو اس سفر میں حافظ ابوجعفر طحاوی سے حدیث کا سماع کیا[7] ابن ابی الفوارس کہتے ہیں کہ ان کی ثقاہت، امانت اور حسن حافظہ ہی قابل داد نہیں بلکہ لکھا ہے کہ انتھی الیہ الحدیث وحفظہ وعلمہ حدیث حدیث کا علم، حدیث کا حفظ بس ان پر ختم ہے۔[8] حافظہ کا عالم یہ تھا کہ حافظ ابن ابی الفوارس

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۸۲۔ [2] تعجیل المنفعۃ ص ۶۔ [3] الاعلان بالتوبیخ ص ۱۱۷۔
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۸۳۔ [5] تذکرۃ الحفاظ ص ۱۷۸۔ [6] تذکرۃ الحفاظ۔
[7] لسان المیزان ج ۵ ص ۳۸۳۔ [8] تذکرۃ الحفاظ ص ۷۸۔

سے ایک بار ان سے ایک روایت کے بارے میں دریافت کیا۔ اس روایت کا تعلق حدیث یا غنذی از ابن زید از عمرو بن عاصم سے تھا فرمایا میرے پاس نہیں۔ سائل نے عرض کیا کہ دیکھ لیجیے شاید ہو فرمایا اگر ہوتی تو مجھے یاد ہوتی۔ میرے پاس اس راوی کی صرف ایک لاکھ حدیثیں ہیں لیکن ان میں یہ سلسلہ سند نہیں ہے۔[1]

حافظ عسقلانی نے ان کی تصانیف میں مسند ابی حنیفہ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔[2] ان کی تاریخ وفات ۳۷۹ھ ہے۔ علامہ خوارزمی رقمطراز ہیں کہ اس مسند کی مجھے ان مشائخ سے اجازت ملی ہے۔ اوّل محی الدین ابو محمد یوسف بن عبدالرحمٰن بن الجوزی، دوم شیخ ابوالمظفر یوسف بن علی بن حسین، سوم علی بن معالی، چہارم شیخ عبداللطیف، علم حدیث اور حفظ حدیث میں اپنے دور کی ایک مثالی شخصیت تھے۔

۶۔ حافظ ابوعبداللہ حسین بن محمد

پورا نام حسین بن محمد بن خسرو بلخی ہے۔ حافظ ابن عساکر کے اساتذہ میں سے ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو محدث مکثر کہا ہے۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ حافظ سمعانی نے جو تاریخ بغداد کا ذیل لکھا ہے۔ اس میں ایک مبسوط ترجمہ ہے اور بتایا ہے کہ امام موصوف مفید بغداد ہیں۔ بہت سے مشائخ وقت سے حدیث کا استفادہ کیا ہے پھر مشائخ کے نام گناتے ہیں اور تفصیل کے بعد لکھا ہے:

> وبالغ فی الطلب حتی سمع من طبقۃ دون ھؤلاء وکتب الکثیر من الکتب لنفسہ ولغیرہ وکان مفید الغرباء وجمع مسند ابی حنیفۃ۔

> طلب وتلاش میں بڑی محنت کی ہے تا آنکہ ان سے کم طبقہ سے روایت کیا اور بہت سی کتابیں اپنی اور دوسروں کی لکھیں اور غرباء کے لیے مفید تھا اور مسند ابی حنیفہ جمع کیا۔

حافظ عبدالقادر قرشی نے ان کے بارے میں ابن النجار کے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ اپنے وقت

---

[1] لسان المیزان ج ۵ ص ۳۸۲۔ [2] تعجیل المنفعہ ص ۶۔

کے بغداد میں اہل عراق کے فقیہ تھے[1] حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ ان کی مسند امام حارثی اور حافظ ابن مقری کی مسند سے بڑی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

وفی کتبہ زیادات علی ما فی کتابی الحارثی و ابن المقری۔[2]

اور ان کی کتاب میں حارثی اور ابن المقری کی کتابوں کے مقابلے میں زیادتی ہے۔

حافظ شمس الدین ابو المحاسن محمد بن علی حسینی نے صحاح ستہ، مسند شافعی، مسند احمد، مسند ابی حنیفہ کے رجال پر جو کتاب لکھی ہے جس کا نام التذکرہ برجال العشرہ ہے اس سلسلے میں حافظ حسینی نے جس مسند کا انتخاب کیا ہے وہ بھی حافظ خسرو بلخی کی مسند ہے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں:

اما الذی اعتمدہ الحسینی علی تخریج رجالہ فھو مسند ابن خسرو[3]

جس مسند پر تخریج رجال پر اعتماد کیا ہے وہ مسند ابی حنیفہ ہے

ان کی تاریخ وفات ۵۲۲ھ ہے۔

۷۔ حافظ ابو نعیم الاصفہانی

پورا نام احمد بن عبد اللہ بن احمد الاصفہانی الصوفی ہے وقت کے مشائخ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے جن اساتذہ نے ان کو پروانۂ تحدیث مرحمت فرمایا ہے ان میں واسط، نیشاپور، شام اور بغداد کے محدثین کرام ہیں، حافظ ذہبی نے ان کے اساتذہ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ جملہ لکھا ہے کہ

اجاز لہ مشائخ الدنیا[4]

دنیا کے سارے اساتذہ نے ان کو اجازت دی ہے۔

اور اس پر لطف یہ ہے کہ ان کی تاریخ ولادت اگر ۳۳۶ھ ہے تو یہ اجازت نامے ان کو ۳۵۰ھ سے پہلے ہی چوبیس سال کی عمر میں مل گئے۔ جتنے اکابر سے ان کو ملاقات کا شرف حاصل ہے کسی محدث کو نہیں ہے۔ ان کے سامنے حفاظ حدیث میں سے خطیب بغدادی،

---

[1] الجواہر المضیہ ص ۲۱۸۔ [2]، [3] تعجیل المنفعہ ص ۶۔ [4] تذکرۃ الحفاظ۔

ابوصالح المؤذن، ابوعلی الوحشی، ابوالفضل احمد حداد اور ان کے برادر ابوعلی الحسن الحداد المقری نے زانوئے شاگردی تہ کیا ہے۔ حافظ ابن مردویہ کہتے ہیں ہر سمت سے لوگ سمٹ سمٹ کر حدیث کی خاطر ان کے پاس آتے۔ ان کے وقت میں ان سے زیادہ حافظ دنیا کے کسی گوشہ میں نہ تھا۔ صاحب تصانیف ہیں۔ ان کی کتاب حلیۃ الاولیاء کے بارے میں حافظ ذہبی لکھتے ہیں۔ لم یصنف مثلہ اس جیسی پہلے کوئی تصنیف نہیں ہے۔ علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں ان کے اس مسند کو جو انہوں نے مسند ابی حنیفہ کے نام سے تالیف کیا ہے۔ حافظ ابوعلی الحسن المقری الحداد کی وساطت سے روایت کیا ہے۔ حافظ ابوعلی اور ان کے برادر حافظ ابوالفضل کا حافظ ذہبی نے تذکرے میں حافظ ابونعیم کے تلامذہ میں ذکر کیا ہے۔ حافظ ابونعیم کے اس مسند ابی حنیفہ کا تقدمہ میں علامہ زاہد کوثری نے تذکرہ کیا ہے۔

۰۸:- حافظ ابن ابی العوام

حافظ ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن ابی العوام السعدی ان کا پورا نام ہے۔ حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ امام نسائی اور حافظ ابوجعفر طحاوی کے شاگرد ہیں۔ مصر میں عہدۂ قضا پر فائز رہے امام ابوحنیفہ کے مناقب میں ایک مبسوط کتاب لکھی ہے۔ مسند ابی حنیفہ اسی کتاب کا ایک حصہ ہے۔ ان کی تاریخ وفات ۳۳۵ھ ہے۔ علامہ خوارزمی نے جامع المسانید میں ان کے مسند کا تذکرہ کیا ہے اور دوسرے مسانید کے ساتھ اس کی بھی تخریج کی ہے۔

۰۹:- حافظ ابن عدیؒ

پورا نام ابواحمد عبداللہ بن عدی الجرجانی المعروف بابن القطان ہے ۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۶۵ھ میں وفات پائی ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے چہرے کا آغاز الامام الحافظ الکبیر کہہ کر کیا ہے۔ فن جرح و تعدیل میں ان کی بڑی شہرت ہے۔ اس فن میں ان کی کتاب الکامل فی الجرح والتعدیل اس پایہ کی کتاب ہے کہ محدث حمزہ نے ایک بار امام دارقطنی سے درخواست کی کہ آپ ضعفاء پر ایک کتاب لکھ دیجئے۔ دارقطنی نے کہا کیا تمہارے پاس ابن عدی کی کامل نہیں ہے فرمایا کہ ہے جواب دیا کہ بس اس پر اضافہ نہیں ہو سکتا۔[1]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۳۔

جرح و قدح میں ان کے قلم کی بے باکی سے اکثر نالاں ہیں اور بہتوں کو ان کی اس باب میں بے انصافیوں کی شکایت بھی ہے۔ مولانا عبدالحی نے الرفع والتکمیل میں اس پر تفصیلی کلام کیا ہے احناف ان کے مذہبی تعصب کے نشتروں کا خاص طور پر نشانہ بنے ہیں چنانچہ امام اعظمؒ اور ان کے ساتھیوں پر بڑی دلیری سے جو کچھ منہ میں آیا ہے لکھ دیا ہے۔ اس کے باوجود امام اعظم کے مسند کے راوی ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کا اولین حال یہی تھا لیکن حافظ ابوجعفر طحاوی سے شرفِ تلمذ کے بعد ان میں انقلاب آگیا۔ شاید اسی کے کفارہ میں مسند ابی حنیفہ تصنیف کی لے حدیث میں امام نسائی اور امام یعلی موصلی کے شاگرد ہیں اور ان سے بڑے بڑے اجلہ محدثین نے استفادہ کیا ہے مثلاً حافظ ابن عقدہ اور حافظ حمزہ السہمی وغیرہ۔ مشہور ملک عیسٰی بن ابی بکر ایوبی نے حافظ ابن عدی کی مسند کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے ۔

ذکی ابن عدی صاحب کتاب الجرح والتعدیل فی مسند ابی حنیفۃ فی صدر الکتاب فی مناقب ابی حنیفۃ باسنادلہ۔[2]

۱۰۔ حافظ ابوالحسن اشتانی

قاضی ابوالحسن عمر بن الحسن بن علی پورا نام ہے حافظ اشتانی سے شہرت رکھتے ہیں بڑے پایہ کے جلیل القدر محدث اور حافظِ حدیث تھے۔ حافظ ابوعلی جو دارقطنی کے شیخ تھے۔ ان کی ثقاہت کا لوہا مانتے تھے۔ انہوں نے امام اعظم کی جو مسند لکھی ہے محدث خوارزمی نے اس سے جامع المسانید میں حدیثیں نقل کی ہیں۔ ان کی تاریخ وفات ۳۳۹ھ ہے۔

۱۱۔ حافظ ابوبکر بن عبدالباقی

قاضی ابوبکر محمد بن عبدالباقی بن محمد الانصاری الحلبی البزاز المعروف بقاضی المرستان۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں شیخ الاسلام ابوالقاسم اسماعیل اصفہانی کے تذکرے میں ۵۳۵ھ کی وفیات کے سلسلے میں ان کا ذکر مذکورہ بالا الفاظ میں کیا ہے۔ طبقات الحنابلہ میں ان کا مفصل تذکرہ موجود ہے۔ حافظ ابن النجار نے تاریخِ بغداد کے ذیل میں ان کے حالات لکھے ہیں اور ان کے

---

[1] تانیب الخطیب ص ۱۶۹ ۔ [2] السہم المصیب ص ۱۰۵ ۔

اساتذہ کے تذکرے میں بتایا ہے کہ طلب علم کی خاطر مکہ اور مصر بھی تشریف لے گئے اور مکہ میں مشہور محدث ابومعشر عبدالکریم بن عبدالصمد المقری الشافعی سے بھی حدیث کا سماع کیا ہے۔ یاد رہے کہ ابومعشر عبدالکریم ان محدثین میں سے ہیں جنہوں نے امام اعظم کی احادیث پر مستقل تصنیف چھوڑی ہے چنانچہ الکتانی رقمطراز ہیں:

جزء الاستاذ ابی معشر عبدالکریم بن عبدالصمد المقری الشافعی صاحب التصانیف المجاور بمکۃ المتوفی ۴۷۸ھ ذکر فیہ ما رواہ ابوحنیفۃ من الصحابۃ [1]

اور یہ رسالہ المعجم المفہرس میں حافظ عسقلانی کی مرویات میں سے ہے۔ محدث خوارزمی نے جامع المسانید میں لکھا ہے کہ:

ھو جمع مسند الابی حنیفۃ [2]

اگرچہ حافظ عسقلانی نے لسان المیزان میں حافظ ابن خسرو کے ترجمہ میں اس کے ماننے سے انکار کیا ہے لیکن ان کے نامور شاگرد حافظ شمس الدین السخاوی ان کی مسند کو بسند ذیل روایت کرتے ہیں:

عن التدمری عن المیدومی عن النجیب عن ابن الجوزی عن جامع المسند قاضی المرستان [3]

اور حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر المضیۃ میں نصر بن سیار کے تذکرے میں حافظ سمعانی سے نقل کیا ہے:

کتاب الاحادیث التی رواھا ابوحنیفۃ جمع عبداللہ بن محمد الانصاری لجدہ القاضی صاعد بروایتہ عنہ [4]

ان کی تاریخ ولادت ۴۳۲ھ اور تاریخ وفات رجب ۵۲۵ھ ہے یعنی آپ دنیا سے ۹۴ سال کی عمر میں رحلت فرماتے دار بقا ہو گئے۔

---

[1] الرسالۃ المستطرفہ ص ۸۴۔ [2] جامع المسانید ج ۲ ص ۲۹۳۔

[3] تقدمہ نصب الرایہ

[4] الجواہر المضیۃ ج ۲ ص ۱۹۱۔

۱۰۔ حافظ طلحہ بن محمد

پورا نام طلحہ بن محمد بن جعفر الشاہد ابوجعفر ہے۔ مشہور محدث ہیں۔ محدث خطیب بغدادی نے
ریخ بغداد میں ان کے حالات قلم بند کیے اور ان کے اساتذہ کی لمبی فہرست دی ہے۔ حافظ عسقلانی
، لسان المیزان میں لکھا ہے مشہور فی زمن الدارقطنی صحیح السماع[1] ابن ابی الفوارس نے
ن کی تاریخ وفات ۳۸۰ھ بتاتی ہے۔ لسان المیزان میں ان کی تاریخ وفات مطبع کی غلطی سے
طبع ہو گئی ہے۔ جامع المسانید میں ۳۸۰ھ ہے اور زمانہ دارقطنی از ۳۰۶ھ تا ۳۸۵ھ ہے
دث خوارزمی فرماتے ہیں،

کان مقدم العدول والثقات الاثبات فی زمانہ صنف
المسند لابی حنیفۃ[2]

حافظ تقی الدین السبکی نے ان کی سند سے ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے،

فی مسند الامام ابی حنیفۃ تصنیف ابی القاسم طلحۃ بن محمد
بن جعفر الشاھد۔[3]

۱۱۔ حافظ ابن عساکر دمشقی محدث

ابوالقاسم علی بن الحسن بن ہبۃ اللہ نامور محدث اور مورخ ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو الامام الحافظ
بیر، محدث الشام، فخر الائمہ کے القاب سے نوازا ہے۔ تیرہ سو سے زائد اساتذہ سے علم حدیث
صل کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں ان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ محدث
رزمی نے حافظ ابن النجار کے حوالہ سے ان کی علمی رحلتوں کے تذکرے میں عراق، مکہ، مدینہ،
ر، دمشق، خراسان، آذربائیجان، نیشاپور، سرخس، طوس، مرو، اصفہان، ہمدان، بسطام،
مغان، سمنان، رَے، زنجان شمار کرائے ہیں۔ علمی سفروں کا آغاز ۵۲۰ھ میں اور اختتام
۵۳۰ھ میں بتایا ہے ان کی تصانیف میں تاریخ دمشق الاشراف اور المعجم قیمتی تصانیف ہیں۔
م اعظم کے مسند کا ذکر ڈاکٹر کرد علی نے تاریخ دمشق کے مقدمہ میں بھی کیا ہے۔ نیز علامہ زاہد

---

[1] لسان المیزان ج ۳ ص ۲۱۲۔ [2] جامع المسانید ج ۲ ص ۴۷۷۔ [3] شفاء السقام ص ۵۵۔

کوثری نے تبییض کذب المفتری فیما نسب الامام الاشعری لابن عساکر کے مقدمہ میں کیا ہے۔ ان کی
تاریخ وفات ۱۱ رجب ۵۸۱ھ ہے۔

۱۱۴۔ محدث امام عیسیٰ جعفری مغربی

یہ عیسیٰ مغربی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے استاد الاساتذہ ہیں۔ ۱۰۸۰ھ میں ان کی وفات ہوئی
شاہ صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں۔ وے استاد جمہور اہل حرمین است۔ مقالید الاسانید کے نا
سے ایک معجم تصنیف کیا ہے اور ساتھ ہی امام اعظم کی ایک مسند تالیف کی۔ یہ مسند جس شان
ہے اور اس میں جن شرائط کو ملحوظ رکھا گیا ہے اس کا اندازہ شاہ صاحب کے اس بیان سے
ہو سکتا ہے۔

مسندے برائے امام ابوحنیفہ تالیف کردہ دراں جا عنعنہ متصلہ ذکر کردہ در حدیث
انہوں نے امام ابوحنیفہ کی ایسی مسند تالیف کی ہے جس میں اپنے سے لے
کر امام صاحب تک عنعنہ ذکر کیا ہے۔[1]

ذرا غور فرمایئے کہ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ جب دیگر محدثین کی حدیثوں سے
پے کتابوں میں آجانے کے بعد سندی اتصال باقی نہیں رہ سکا اور سب کی احادیث نے
روایات مرسلہ کی حیثیت اختیار کر لی اور خود محدثین نے اسے ارسال العلماء کہہ کر شرف پذیرا
بھی دے دیا۔ چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے یہ مان کر کہ فی الواقع حدیث کی کتابوں کا
روایتی اتصال نہیں ہے بلکہ ارسال ہے لکھا ہے کہ:

امت کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کتابوں میں آئی ہوئی ان کے مصنفین کی
طرف نسبت درست ہے کیونکہ علماء کی عادت یہی ہے کہ کتاب کا حوالہ
دے دیا جاتے اور کہہ دیا جاتے کہ اخرجہ البخاری۔ اپنا بخاری تک سلسلہ
سند بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

مراسیل میں قوی تر وہ مراسیل علماء ہیں جو ان کتابوں کے سلسلے میں علماء

---

[1] انسان العین ص ۱۸۳۔

کرتے ہیں[1]

اس سے معلوم ہوا کہ یہ صرف امام اعظم ہی کی خصوصیت ہوئی کہ ان کی روایات میں آج تک عنعنہ متصلہ قائم ہے۔ اس طرح شاہ صاحب ہی کے لفظوں میں ان لوگوں کی غلط فہمی دور ہو گئی جو کہتے ہیں کہ حدیث کے سلسلہ سند میں آج کل اتصال نہیں۔ فرماتے ہیں:

آزانجا بطلان زعم کسانیکہ گویند کہ سلسلہ حدیث امروز متصل نماندہ واضح تر مے شود۔

یہاں سے ان لوگوں کا دعویٰ بھی غلط ہونا ثابت ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حدیث کا سلسلہ آج کل متصل نہیں رہا ہے[2]

سوچیے کہ اگر امام اعظم سے حدیث کا سلسلہ جاری نہ ہوتا تو یہ حدیث کا سماع متصل امام صاحب سے لے کر شاہ صاحب تک کیسے وجود میں آگیا ہے۔

یہ وہ مشاہیر حفاظ اور محدثین ہیں جنہوں نے امام اعظم کی احادیث کو مستقل تصانیف میں اپنی اسانید کے ساتھ کتابی صورت میں جمع کیا تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی حفاظ ہیں جن کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے بھی امام اعظم کے مسند پر قلم اٹھایا ہے۔ مشہور محقق زاہد کوثری نے تقدمہ نصب الرایہ میں اسی سلسلے میں امام دارقطنی اور حافظ ابن شاہین کا بھی نام لیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

وکان مع الخطیب عند ما حل دمشق مسند ابی حنیفۃ للدار قطنی و مسند ابی حنیفۃ لابن شاھین[3]

یہ دونوں مسندیں ان مسانید کے علاوہ ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ محدث خوارزمی نے جن نامور محدثین کے مسانید کو جامع المسانید میں یک جا کرنے کی کوشش کی ہے وہ ان کی تصریح کے مطابق حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ مسند امام حافظ ابو محمد عبداللہ الحارثی المدنی۔
۲۔ مسند حافظ ابو القاسم طلحہ بن محمد
۳۔ مسند امام حافظ ابوالحسین محمد بن المظفر

---

[1] الروض الباسم ج ۱ ص ۱۸۔ [2] انسان العین ص ۱۸۳۔ [3] تقدمہ نصب الرایہ ص ۴۰

۴۔ مسند حافظ ابو نعیم الاصفہانی
۵۔ مسند امام ابو بکر محمد بن عبد الباقی
۶۔ مسند حافظ عمر بن الحسن الاشنانی
۷۔ مسند امام ابو احمد عبد اللہ بن عدی
۸۔ مسند امام ابو عبد اللہ حسین بن محمد خسرو
۹۔ مسند امام ابو القاسم عبد اللہ بن ابی العوام

اصل میں مسانید تو صرف یہی ہیں ان کے علاوہ جو دوسرے مسانید کا اس مجموعے میں تذکرہ ہے مثلاً

۱۔ مسند امام حافظ محمد بن الحسن
۲۔ مسند امام حافظ قاضی ابو یوسف
۳۔ مسند امام حسن بن زیاد
۴۔ مسند امام حماد بن ابی حنیفہ

دراصل یہ مسانید نہیں بلکہ کتاب الآثار کے نسخے ہیں جس کی تفصیلات آپ پڑھ چکے ہیں۔ ایسے ہی حافظ ابو بکر کلاعی کی مسند بھی جامع المسانید میں مسند ہی بنا کر داخل کر دی گئی ہے حالانکہ یہ کوئی مستقل مسند نہیں بلکہ کتاب الآثار ہی کا ایک نسخہ ہے جس کو وہ اپنے جد امجد محمد بن خالد سے روایت کرتے ہیں۔

اطراف حافظ ابن القیسرانی

محدثین میں اطراف پر کتابیں لکھنے کا پرانا رواج ہے ان کے عرف میں اطراف یہ ہیں کہ متن حدیث کے ابتدائی ٹکڑے لکھ کر اس کی ساری اسانید کو یکجا کر دیا جائے۔ الکتانی رقمطراز ہیں:

هي التي يقتصر فيها على ذكر طرف الحديث الدال على بقيه مع الجمع لاسانيده [1]

جیسے حدیث کی دوسری کتابوں کے محدثین نے اطراف لکھے ہیں مثلاً اطراف صحیحین حافظ ابو مسعود

---

[1] الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۲۷ یعنی اطراف یہ ہے کہ حدیث کا ایک ٹکڑا لکھ کر اس کی ساری سندوں کو یکجا کر دیا جائے۔

اور حافظ ابو محمد خلف بن محمد، حافظ ابو نعیم اصفہانی اور حافظ ابن حجر عسقلانی۔ ایسے ہی امام اعظم کی روایات پر حافظ ابن القیسرانی نے اطراف لکھے ہیں یعنی امام اعظم کے مختلف مسانید سے ان کی حدیثوں کو لے کر جمع کر دیا ہے۔ چنانچہ کتاب الجمع بین رجال الصحیحین جو حافظ قیسرانی کی تصنیف ہے اور حیدرآباد سے طبع ہوئی ہے اس کے آخر میں حافظ ابن القیسرانی کی تصانیف میں اطراف احادیث ابی حنیفہ کا ذکر ہے۔ موصوف بہت بڑے حافظ حدیث ہیں۔ ابن الجوزی نے المنتظم میں ان پر بہت لے دے کی ہے لیکن سمعانی نے ان کی صفائی بھی پیش کی۔ ابن کثیر نے البدایہ میں، ابن الجوزی نے المنتظم میں، ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں اور حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں ان کا مبسوط ترجمہ لکھا ہے۔ حافظ صاحب نے لکھا ہے وھو فی نفسہ صدوق لم یتہم وہ ذاتی طور پر غیر متہم راست گو ہیں۔ حافظ ابن عساکر کہتے ہیں کہ اسماعیل تیمی کا ان کے بارے میں تاثر یہ تھا کہ میں نے سب سے بڑا حافظ ابن طاہر کو پایا ہے یحیٰی بن مندہ کہتے ہیں کہ:

حفاظ میں یگانہ، اچھے کردار والے راست گو، صحیح اور غلط سے واقف اور صاحب تصانیف عالم تھے[1]

ان کی تاریخ وفات ۵۰۷ھ ہے۔

مسانید امام اعظم کی شرحیں

چونکہ جامع المسانید میں امام ابو حنیفہ کی متعدد مسانید کی روائتیں موجود ہیں۔ اس لیے متاخرین میں اس کتاب کی بڑی شہرت ہو گئی بڑے بڑے اجلہ محدثین نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔ ان میں سے مشہور حافظ زین الدین قاسم المتوفی ۸۷۹ھ ہیں۔ موصوف نے ایک نہایت ضخیم شرح لکھی ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے بھی اس کی شرح لکھی ہے۔ اس کا نام التعلیقۃ المنیفۃ علی مسند ابی حنیفہ ہے۔ متعدد محدثین نے جامع المسانید کا اختصار بھی کیا ہے۔

امام شرف الدین اسماعیل بن عیسٰی بن دولہ المکی کے اختصار کا نام اختیار اعتماد المسانید فی اختصار اسماء بعض رجال الاسانید ہے۔

امام ابو البقا احمد بن ابی الضیاء محمد القرشی نے اس کا جو مختصر لکھا ہے اس کا نام المستند فی

---

[1] لسان المیزان ج ۵ ص ۲۰۸۔

قبصر المسند ہے۔ ایک اور مسند کا مختصر شیخ ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل نے بھی لکھا ہے۔

علامہ حافظ الدین محمد بن محمد الکرمدری نے زوائد مسند ابی حنیفہ کے نام سے ان روایات کو جو مسند ابی حنیفہ میں صحاح ستہ سے زائد ہیں جمع کیا ہے۔

امام ابو حفص زین الدین عمر بن احمد الشجاع نے بھی ایک اختصار لفظ المرجان من مسند ابی حنیفہ النعمان کے نام سے کیا ہے[1]۔

متاخرین میں علامہ السید مرتضیٰ زبیدی محدث نے جامع المسانید سے امام اعظم کی ان احادیث احکام کا انتخاب کیا کہ جن کی روایت میں مصنفین صحاح بھی امام صاحب کے شریک ہیں اس کتاب کا نام عقود الجواہر المضیئۃ فی ادلۃ مذہب الامام ابی حنیفہ ہے۔ اس کی ترتیب ابواب فقہ پر ہے۔

بہر حال احادیث ابی حنیفہ کی جو خدمت کی گئی ہے یہ اس کی ایک جھلک ہے جو ناظرین کے سامنے بطور ہدیہ پیش کی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ سارا ذخیرہ آج آثار قدیمہ کی نظر ہے۔ اللہ کرے کوئی صاحب علم بزرگ اس علمی خدمت کے لیے آمادہ ہو جائیں وماذالک علی اللہ بعزیز۔

حدیث کا دوسرا مجموعہ موطا امام مالکؒ

کتاب الآثار کے بعد حدیث کا دوسرا مجموعہ جو اس وقت اُمت کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ امام دارالہجرۃ مالک بن انس کی مشہور تصنیف مؤطا ہے۔ یہ اہل مدینہ کی روایات اور فتاویٰ کا بہترین مجموعہ ہے۔ مؤطا میں بھی کتاب الآثار کی طرح مسائل و احکام کے لیے احادیث صحیحہ کو نقش اوّل اور آثار صحابہ و تابعین کو نقش ثانی قرار دیا ہے۔ حکیم الاُمت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

جاننا چاہیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے چاہے وہ مسند ہو یا

---

[1] حافظ شمس الدین سخاوی کے بارے میں ازہر کے کلیہ شرعیہ کے استاد عبدالوہاب نے المقاصد الحسنہ کے مقدمہ میں بتایا ہے کہ انہوں نے بھی امام اعظم کی حدیثوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ اس مجموعہ کا نام "التحفۃ المنیفۃ فیما وقع لہ من حدیث ابی حنیفۃ" ہے۔ حافظ سخاوی ان مشہور اکابر علماء میں سے ہیں جن کے علم عمل پر خود اہل علم کو اس قدر اعتماد ہے کہ علامہ شوکانی نے قسم کھا کر کہا ہے ولقد واللہ العظیم لم ارمن الحفاظ المتاخرین مثلہ۔ (البدر الطالع ج ۲ ص ۱۸۵)۔

مرسل. نیز حضرت عمر کے اثر اور عبداللہ بن عمر کے عمل سے استدلال کرنا اور صحابہ و
تابعین مدینہ کے فتاوی سے اخذ کرنا خصوصاً جبکہ ان تابعین کی ایک جماعت
کسی مسئلہ پر متفق ہو امام مالک کے مذہب کا اصول ہے[1]

فتح الباری کے مقدمہ میں حافظ عسقلانی لکھتے ہیں:

پھر امام مالک نے مؤطا تصنیف کیا اور اہل حجاز کی حدیثوں میں سے قوی اور
صحیح روایتوں کو تلاش کر کے اس کے ساتھ صحابہ کے اقوال اور تابعین اور
ان کے بعد والے علماء کے فتاویٰ کو بھی اس میں مدغم کر دیا[2]

مؤطا کے بارے میں امام شافعی کی رائے یہ ہے:

ما علی ظهر الارض کتاب بعد کتاب الله اصح من کتاب مالك

روئے زمین پر قرآن حکیم کے بعد مؤطا امام مالک سے زیادہ صحیح کوئی کتاب
نہیں ہے[3]

حافظ سیوطی نے تنویر الحوالک کے مقدمہ میں امام شافعی کے اس ارشاد کو مختلف الفاظ میں
پیش کیا ہے۔ اگرچہ بعد کو شافعی مدرسۂ فکر کے کچھ علماء نے امام شافعی کے اس ارشاد کی یہ توجیہ کی ہے:

اما قول الشافعی هذا فذلك قبل وجود الکتابین[4]

دراصل اس توجیہ کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خیال میں چونکہ مؤطا میں مرسل، منقطع اور بلاغات ہیں
اس لیے مؤطا کا درجہ اب بخاری و مسلم کے بعد ہے لیکن حافظ مغلطائی فرماتے ہیں:

لافرق بین الموطا والبخاری فی ذالك لوجوده ایضاً فی البخاری
من التعالیق ونحوها۔

اس معاملے میں مؤطا اور بخاری میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ بخاری میں بھی
تعلیقات موجود ہیں[5]

حافظ جلال الدین السیوطی نے حافظ ابن حجر کی زبانی حافظ مغلطائی کے اس اعتراض کا یہ
جواب دیا ہے کہ:

---

[1] مصفیٰ ج ۱ ص ۱۷۔ [2] ہدی الساری ص ۴۔ [3] تزئین الممالک ص ۴۳۔
[4] تنقیح الانظار ج ۱ ص ۴۹۔ [5] تزئین الممالک ص ۴۹۔

مؤطا اور بخاری دونوں کی منقطع روایات میں فرق یہ ہے کہ مؤطا میں اس قسم
کی جو روایتیں ہیں ان میں سے اکثر کا سماع امام مالک نے ایسا ہی کیا ہے
اور یہ ان کے خیال میں حجت ہے۔ لیکن بخاری میں اس قسم کی جو روایات
ہیں ان کی سندیں ان وجوہ کی بنا پر عمداً حذف کی گئی ہیں جن کی تعلیقات
کے سلسلے میں تشریح کر دی گئی ہے[1]

اور اس موضوع پر خود حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں یہ توضیح فرمائی ہے
کچھ ائمہ نے مؤطا کے مقابلے میں صحیح بخاری کی اصحیت ثابت کرنے میں گنجلک
ڈال دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ صحت اور احتیاط اور وثوق سے کام لینے
میں بخاری اور مالک دونوں برابر ہیں۔ باقی بخاری میں حدیثوں کا زیادہ ہونا
تو اس کا صحت سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ یہ صحت کا لازمہ ہے۔ دراصل
اس مشکل کا حل یہ ہے کہ بخاری کی اصحیت صرف شرائط صحت کی وجہ سے
ہے۔ امام مالک کے خیال میں چونکہ انقطاع اسناد منافی صحت نہیں ہے
اس لیے ان کی کتاب میں مراسیل، منقطعات اور بلاغات آجاتے ہیں۔
اور امام بخاری انقطاع کو چونکہ ایک علت خارجہ قرار دیتے ہیں اس لیے
وہ ایسی روایات کو موضوع کتاب سے الگ ہو کر دوسرے سلسلے میں
لاتے ہیں مثلاً تراجم میں۔ اور اس میں شک نہیں کہ منقطع روایات اگرچہ
کچھ کے نزدیک قابل احتجاج ہیں لیکن پھر بھی روایات متصلہ زیادہ قوی ہیں
بشرطیکہ دونوں کے بیان کرنے والے حفظ اور عدالت میں یکساں ہوں۔
بس یہی بخاری کی اصحیت کی وجہ ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ امام شافعی
نے مؤطا کی اصحیت کا دعویٰ اپنے زمانہ میں موجود تالیفات کے مقابلے
میں کیا ہے۔ ان کے سامنے جامع سفیان ثوری اور مصنف حماد بن سلمہ
جیسی کتابیں تھیں اور ان پر مؤطا کی فضیلت میں کبھی دو رائیں نہیں
ہوئی ہیں[2]

---

[1] تزیین الممالک ص ۵۔ [2] ہدی الساری مقدمہ فتح الباری ص ۸۔

علامہ محمد بن جعفر الکتانی نے علامۃ الشیخ صالح کے حوالے سے حافظ ابن حجر عسقلانی کی اس تقریر کا یہ جواب دیا ہے:

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بلاغات مؤطا اور تعلیقات بخاری میں جو فرق بیان کیا ہے وہ محل نظر ہے۔ اگر حافظ صاحب مؤطا کا بھی اسی طرح بنظر غائر مطالعہ کرتے جیسے انہوں نے صحیح بخاری کا کیا ہے تو ان کو پتہ لگ جاتا کہ واقعی ان دونوں کتابوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ جو وہ فرماتے ہیں کہ امام مالک نے ان روایات کا اسی صورت میں سماع کیا ہے تو یہ ناقابلِ تسلیم ہے کیونکہ مؤطا کی ایک حدیث مثلاً یحیٰی کی روایت اگر بلاغاً ہے تو دوسرے لوگ اسی حدیث کو امام مالک سے مسنداً بھی روایت کرتے ہیں اور حافظ صاحب کی یہ بات بھی قابلِ پذیرائی نہیں ہے کہ مراسیل امام مالک اور ان کے پیروکاروں کے نزدیک حجت ہیں اس لیے خود امام شافعی اور محدثین کے یہاں بھی مرسل حجت ہے بشرطیکہ اس کی تقویت پر کسی مسند کی تائید ہو جیسا کہ ابن عبد البر اور سیوطی وغیرہ نے بتایا ہے اور عراقی کا یہ کہنا کہ بلاغات مالک غیر معروف ہیں درست نہیں کیونکہ ابن عبد البر نے مؤطا کے تمام بلاغات، مراسیل اور منقطعات میں صرف چار کو چھوڑ کر وصل ثابت کر دیا ہے اور ان چار کو بھی موصول ثابت کرنے کے لیے ابن الصلاح نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جو میرے پاس موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مؤطا اور بخاری میں کوئی فرق نہیں ہے۔

شاہ صاحب محدث دہلوی مؤطا کو حدیث کی تمام کتابوں میں مقدم اور افضل سمجھتے ہیں۔ اپنی کتابوں میں اس کے دلائل لکھے ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ:

امام شافعی فرماتے ہیں کہ قرآن کے بعد سب سے صحیح کتاب مؤطا ہے محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ مؤطا کا سارا علمی ذخیرہ مالک اور ان کے ہمنواؤں کے خیال میں صحیح ہے اس کا ہر مرسل اور منقطع دوسرے طرق سے متصل السند ہے اس لیے اس حیثیت سے مؤطا بالکل صحیح ہے خود امام مالک کے زمانے ہی میں مؤطا کی روایات کی تخریج کے لیے ان گنت

مؤطا لکھے گئے مثلاً ابن ابی ذئب، ابن عیینہ، سفیان ثوری اور معمر وغیرہ نے
ان لوگوں سے حدیثیں روایت کی ہیں جو امام مالک کے شیوخ ہیں۔ پھر
مؤطا سب لوگوں کی علمی وتعلیمی توجہات کا مرکز رہا ہے۔ فقہاء میں سے
امام شافعی، امام محمد بن الحسن، ابن وہب اور ابن القاسم۔ محدثین میں سے
یحییٰ بن سعید القطان، عبدالرحمٰن بن مہدی اور عبدالرزاق، خلفاء وامراء
میں سے ہارون رشید، امین، مامون، حتیٰ کہ مؤطا امام مالک ہی کے زمانے میں
درجہ شہرت حاصل کر چکا ہے اور پھر ہر دور میں اس کی شہرت میں اضافہ ہی
رہا۔ اسی پر فقہاء امصار نے اپنے مذاہب کو قائم کیا ہے حتیٰ کہ کچھ عراقیوں
میں کچھ مسائل میں اسی کو پیش نظر رکھا۔ ہمیشہ سے ہر زمانے میں علماء مؤطا کی
حدیثوں کی تخریج کرتے رہے اس کے توابع اور شواہد بناتے رہے[1]

اس کے علاوہ شاہ صاحب نے اپنی شہرۂ آفاق مصفی شرح مؤطا کے مقدمہ میں مؤطا کی ترجیح
کے دلائل اور وجوہ کے ساتھ نہایت تفصیل سے بیان فرماتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ صحت کے لحاظ سے صحیحین اور مؤطا میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ بعض اور وجوہ
سے بھی مؤطا کو صحیحین پر ترجیح ہے۔

الف:۔ امام مالک کی زیادہ روایات کا مرکز و منبع اہل مدینہ ہیں۔ علم الفقہ و فتاویٰ کے لیے
زمانۂ خلافت راشدہ میں مرکزی شخصیت حضرت فاروق اعظم کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت
عائشہ، حضرت ابن عباس، حضرت ابوہریرہ، حضرت انس، اور حضرت جابر مدنی علمی دائرے
کی اہم شخصیتیں ہیں۔ ان کے علوم کی وراثت مدینہ میں فقہاء سبعہ کو ملی ہے۔ امام مالک کو براہ راست
ان فقہاء سبعہ کے تلامذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا شرف حاصل ہے۔ امام مالک کے
ان اساتذہ میں امام زہری، امام یحییٰ بن سعید انصاری، زید بن اسلم، ابوالزناد اور نافع۔ یہ کبار
تابعین ہیں جن سے استفادے کا امام مالک کو موقعہ ملا ہے۔ امام مسلم اور امام بخاری کو یہ شرف
حاصل نہیں ہے۔

ب:۔ آپ آئندہ اوراق میں پڑھیں گے کہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۳۴

کسی رافضی سے خواہ وہ کیسا ہی پاکباز کیوں نہ ہو حدیث کی روایت کے روادار نہ تھے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں:

سئل مالک عن الرافضۃ فقال لا تکلمھم ولا تروعنھم فانھم یکذبون۔

رافضیوں سے کوئی علمی گفتگو نہ کرو اور نہ ان سے روایت لو کیونکہ وہ جھوٹ بولتے ہیں[1]

برخلاف اس کے مسلم و بخاری میں ان سے روایات موجود ہیں۔ چنانچہ السیوطی نے صراحۃً لکھا ہے جیسا اس پر آپ آئندہ اوراق میں تفصیلی بحث ان شاء اللہ پڑھیں گے۔ یہاں خلاصہ کلام کے طور پر صاحب تعلیقات کے حوالہ سے صرف امام حاکم کا ایک بیان ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

مبتدعین اور اہل اہواء کی روایات اکثر محدثین کے یہاں مقبول ہیں بشرطیکہ یہ لوگ راستباز ہوں۔ امام بخاری نے عباد بن یعقوب سے حدیث روایت کی ہے حالانکہ اس کے بارے میں ابوبکر محمد بن اسحاق کی تصریح ہے کہ دین میں متہم ہے اور محمد بن زیاد اور جریر بن عثمان سے بخاری میں روایتیں آئی ہیں۔ حالانکہ دونوں ناصبی ہیں۔ بخاری اور مسلم دونوں نے محمد بن حازم اور عبید اللہ بن موسیٰ سے حدیث لی ہے حالانکہ دونوں غالی شیعہ تھے[2]

ج ۳: مؤطا کے نسخے تیس سے زائد ہیں لیکن ان میں سے قوی تر اور مشہور ترین جن کی روایت کا سلسلہ امام مالک سے پھیلا ہے بارہ ہیں۔

السند الغا فی کتاب المؤطا بروایۃ اثنی عشر من اصحاب مالک

حافظ ابن عبد البر نے استذکار اور تمہید میں ان ہی بارہ نسخوں کو پیش نظر رکھا ہے جبکہ بخاری کے تلامذہ میں سے جن بزرگوں سے سلسلۂ روایت چلا وہ صرف چار ہیں۔ شاہ عبد العزیزؒ نے بستان المحدثین میں ان کی تعداد سولہ بتائی ہے۔

جن بزرگوں سے مؤطا کا روایتی سلسلہ دنیا میں پھیلا ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ یحییٰ بن یحییٰ المسعودی الاندلسی سنہ ۲۰۴ھ ۔ ۲۔ ابو محمد عبد اللہ بن وہب بن سلمہ سنہ ۱۹۷ھ
۳۔ ابو عبد اللہ عبد الرحمن بن القاسم سنہ ۱۹۱ھ ۔ ۴۔ معن بن عیسیٰ بن دینار ابو یحییٰ المدنی سنہ ۱۹۸ھ

---

[1] المنتقیٰ ص ۲۱ ۔ [2] التعلیقات علیٰ توضیح الافکار ج ۲ ص ۲۱۶۔

۵- ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن مسلم بن قعنب ۱۲۲ھ۔ ۶- ابومحمد عبداللہ بن یوسف الدمشقی ۲۱۸ھ
۷- یحییٰ بن عبداللہ بن بکیر القرشی ابوزکریا ۲۳۱ھ ۸- سعید بن کثیر بن عقیر بن مسلم الانصاری ۲۲۶ھ
۹- احمد بن ابی بکر القاسم بن الحارث ۲۴۲ھ ۱۰- مصعب بن عبداللہ الزبیری ۲۳۶ھ
۱۱- محمد بن الحسن الشیبانی الامام ۱۸۹ھ ۱۲- سوید بن سعید بن سہل الہروی ۲۴۰ھ
۱۳- یحییٰ بن یحییٰ بن بکر بن عبدالرحمٰن ۲۴۶ھ ۱۴- احمد بن اسماعیل بن محمد ابوحذافہ ۲۵۹ھ
۱۵- محمد بن المبارک بن یعلیٰ القرشی ۲۲۵ھ ۱۶- سلیمان بن برد ۲۴۶ھ۔
الغرض مؤطا کتاب الآثار کے بعد احادیث صحیحہ کا مجموعہ ہے۔

جامع معمر بن راشد

اسناد و روایت کے بہت بڑے امام ہیں۔ علی بن المدینی اور ابوحاتم نے ان کو اپنے دور میں علم روایت کا مرکز قرار دیا ہے ابھی سبزہ کا آغاز نہیں ہوا کہ علم حدیث کے لیے تگ و دو شروع کر دی تھی خود ان کا اپنا بیان ہے کہ :

مجھے قتادہ سے چودہ سال کی عمر میں استفادے کا موقعہ ملا ہے جو کچھ بھی سنتا سینہ میں نقش ہو جاتا تھا۔[1]

امام احمد کا بیان ہے کہ جب بھی ہم نے معمر سے کسی کا مقابلہ کیا تو معمر کو طلب علم حدیث میں پیشرو پایا۔ معمر اپنے زمانے میں علم کے بڑے جویا تھے۔ ابن جریج کہتے تھے معمر سے استفادہ کرو کیونکہ اپنے زمانے میں ان سے بڑا عالم کوئی نہیں ہے۔ معمر بن راشد بھی امام مالک کے معاصر ہیں اور دوسری صدی کے بڑے پائے کے مؤلفین میں سے ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں نے اس دور کے مصنفین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

سفیان بن عیینہ، مالک بن انس نے مدینہ منورہ میں، عبداللہ بن وہب نے مصر میں اور معمر و عبدالرزاق نے یمن میں تصنیف کا کام کیا۔[2]

حافظ جلال الدین السیوطی لکھتے ہیں :

اسی عہد میں علمائے اسلام نے حدیث، فقہ اور تفسیر کی تدوین شروع کی

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۴۴۔ [2] الحطہ ص ۱۵۔

چنانچہ مکہ میں ابن جریج نے مدینہ میں مالک نے شام میں اوزاعی نے بصرہ میں ابی عروبہ نے یمن میں معمر نے کوفہ میں سفیان ثوری نے تصانیف کیں۔[1]

امام ذہبی سے حافظ سخاوی نقل کرتے ہیں کہ:

یمن میں حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابو موسیٰ اشعری فروکش ہوئے یمن سے بہت سے تابعین ائمہ ہوئے۔ اس میں تابعین میں علماء کی ایک جماعت ہوتی ہے۔ امام منبہ کے دونوں صاحبزادے وہب بن منبہ اور ہمام بن منبہ ہوتے امام طاؤس اور ان کے صاحبزادے ہوتے بعد ازیں معمر بن راشد اور ان کے اصحاب ہوتے پھر عبدالرزاق اور ان کے ساتھی ہوتے۔[2]

حافظ سیوطی فرماتے ہیں:

مکہ میں تصنیف کا کام ابن جریج نے مدینہ میں مالک اور محمد بن اسحاق نے بصرہ میں ربیع بن صبیح اور حماد بن سلمہ نے کوفہ میں سفیان ثوری نے شام میں اوزاعی نے واسط میں ہشیم نے اور یمن میں معمر بن راشد نے کیا ہے۔[3]

حافظ ابن الجوزی نے تلقیح فہوم اہل الاثر میں جہاں مصنفین متقدمین کا تذکرہ کیا ہے وہاں دوسرے مصنفین کے ساتھ معمر بن راشد کا نام بھی لیا ہے۔

معمر بن راشد نے ۵۸ سال کی عمر میں ۱۵۳ھ میں وفات پائی ہے ان کے شیوخ و اساتذہ میں ثابت البنانی، قتادہ، زہری، عاصم الاحول، ایوب السختیانی، الجعد، زید بن اسلم، صالح بن کیسان، عبداللہ بن طاؤس، جعفر بن برقان، الحکم بن ابان، اشعث بن عبداللہ، اسماعیل بن امیہ، ہمام بن منبہ، ہشام بن عروہ، محمد بن المنکدر اور ان کے علاوہ دوسرے ائمہ تابعین کے نام ملتے ہیں۔

معمر بن راشد نے علمی استفادہ یمن میں ہمام بن منبہ سے کیا ہے۔ ہمام کو حضرت ابوہریرہ

---

[1] تاریخ الخلفاء۔ [2] الاعلان بالتوبیخ ص ۱۴۰۔ [3] تدریب الراوی ص ۴۰

کے سامنے زانوئے تلمّذ تہ کرنے کا شرف حاصل ہے۔ ان سے حدیثیں سُنی ہیں جو تقریباً ایک سو چالیس ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں :

معمر کو ان سے استفادے کا موقعہ ہمام کی کبرسنی کے زمانے میں ملا ہے۔ حضرت ابوہریرہ کی مرویات ان کے پاس لکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے معمر کو سنانی شروع کیں تو تھک گئے معمر نے ان سے رسالہ لے لیا اور باقی خود پڑھ کر سنایا [1]

یہ لکھی ہوئی مرویات ابوہریرہ حدیث کا وہ ہی رسالہ ہے جو صحیفہ ہمام بن منبہ کے نام سے مشہور ہے ہمام سے اس رسالہ کے راوی معمر بن راشد ہیں۔ الذہبی لکھتے ہیں۔

لھمام عن ابی ھریرۃ نسخۃ مشھورۃ رواھا عنہ معمر

معمر نے نہ صرف یہ کہ ہمام کی ان حدیثوں کو بعینہٖ محفوظ رکھا بلکہ الجامع نامی ایک کتاب خود بھی تصنیف کی ہے :

ابوطالب مکی نے قوت القلوب میں لکھا ہے :

ثم کتاب معمر بن راشد بالیمن فیہ سنن

دوسرے مقام پر الکتانی لکھتے ہیں :

جامع معمر بن راشد الازدی مولاھم البصری نزیل الیمن المتوفی ۱۵۳ھ [2]

جیسا کہ نام بتا رہا ہے اس میں آپ نے وہ تمام احادیث یکجا کی ہیں جو آپ نے مختلف اساتذہ سے سُنی ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا اہل علم کو شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے جامع معمر کا نسخہ ترکی سے بڑی تگ و دو اور تحقیق و جستجو کے بعد نکالا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ :

علم کی خوش قسمتی ہے کہ یہ کتاب اب تک محفوظ ہے اور حال ہی میں ترکی سے دستیاب ہو گئی ہے اس کا ایک نسخہ جامعہ انقرہ کے شعبہ تاریخ کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور ناقص و دریدہ لیکن بہت قدیم ہے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۶۷۔ [2] الرسالۃ المستطرفہ ص ۹

یعنی ۴۶۴ھ میں اندلس کے شہر طلیطلہ میں لکھا گیا ہے دوسرا نسخہ کامل ہے اور استنبول کے کتب خانہ فیض اللہ آفندی میں ہے اور ۶۰۰ھ کا لکھا ہوا ہے اس کتاب پر استنبول یونیورسٹی کے نوجوان فاضل استاد ڈاکٹر فواد نے "ترکیات مجموعہ سی" نامی رسالے کی بارھویں جلد میں ص ۱۰۵ تا ص ۱۳۴ پر ایک دلچسپ مقالہ بھی لکھا ہے لیکن ترکی زبان میں ہے اس کا عنوان یہ ہے "حدیث مصنفا تنک مبدئی دمعمر بن راشدک جامعی" یہ کتاب راوی وار نہیں بلکہ موضوع وار مرتب ہوئی ہے سرسری مطالعہ پر اس میں ہمام بن منبہ کا بھی آٹھ دس بار ذکر آیا ہے لیکن معمر کی کوشش یہ معلوم ہوتی ہے کہ تکرار نہ ہو۔ چنانچہ صحیفہ ہمام کی روایت کو بھی خود ہی سے متعلق ہونے کی وجہ سے کتاب الجامع میں مکرر نقل نہیں کیا۔ البتہ ہمام کے رسالہ کی حدیثیں ہمام کے علاوہ کسی اور راوی سے ملیں تو اس جدید سند کے ساتھ ان کو الجامع میں ضرور ذکر کیا ہے اس طرح ایک ہی حدیث چند در چند ماخذوں سے معلوم ہونے کی وجہ سے معتبر سے معتبر ہو جاتی ہے جامع معمر دو سو صفحات سے کچھ زائد پر مشتمل ہے ممکن ہے کہ اس کی اشاعت کی جلدی ہی نوبت آجاتے۔[1]

مشہور امام یحییٰ بن معین زہریات میں ابن عیینہ، صالح بن کیسان کے مقابلے میں معمر کو بہت زیادہ سراہتے تھے۔[2]

امام معمر کو امام اعظم ابوحنیفہ سے خاص عقیدت تھی اور آپ امام اعظم کی جلالت علمی کے بہت گن گاتے تھے چنانچہ حافظ عبدالقادر لکھتے ہیں :-

> امام اسفرائنی نے امام علی بن المدینی حافظ ابوالحسن کے حوالے سے جو امام بخاری کے استاد ہیں اور حدیث کے ناقدین کے ناقد ہیں لکھا ہے کہ ابن المدینی کہتے ہیں کہ امام عبدالرزاق فرماتے تھے کہ امام معمر کہا کرتے

---

[1] مقدمہ صحیفہ ہمام بن منبہ ص ۵۵۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۶۷

تھے کہ حسن بصری کے بعد فقہ میں حسن معرفت ابوحنیفہ جیسی میرے علم میں کسی کو حاصل نہیں ہے [1]

جامع سفیان الثوری

امام سفیان ثوری کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ فقہ میں ان کا اور امام اعظم کا عموماً ایک مذہب ہے امام ترمذی اپنی سنن میں اکثر امام سفیان ثوری کا مذہب نقل کرتے ہیں جو اکثر امام ابوحنیفہ کے موافق ہوتا ہے۔
امام ابو یوسف فرماتے ہیں:-

سفیان الثوری اکثر متابعة لابی حنیفة منی [2]

امام زفر جب بصرہ تشریف لائے اور ان کے سامنے جامع سفیان لائی گئی تو اسے مطالعہ کے بعد امام زفر کا تاثر یہ تھا:-

ھٰذا کلامنا ینسب الی غیرنا

یہ بات تو ہماری ہے لیکن منسوب اوروں سے ہے

امام زفر نے جامع سفیان کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ اس کے فقہی مسائل سے متعلق ہے۔ بعض ان فقہی مسائل کو جو ائمہ کے مابین اختلافی ہیں اور جن میں اختلاف محض افضلیت اور اولیت کا ہے ان کو اہمیت دیتے تھے اور اتنی اہمیت کہ ان کو اہل السنت ہونے کا معیار قرار دیتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے جو حافظ ذہبی نے لالکائی کی السنۃ کے حوالے سے لکھا ہے:-

شعیب بن جریر کہتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوری سے عرض کیا کہ السنۃ" کے موضوع پر کوئی بات ایسی بتائیے جو میرے لیے نفع بخش ہو اور ایسی پختہ ہو کہ جناب الٰہی میں اگر آپ کے حوالہ سے کہوں تو بچ جاؤں اور آپ کی گرفت ہو جائے فرمایا کہو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں ہے اللہ ہی اس کا مبدا اور معاد ہے۔ جو شخص اس کے خلاف کہے وہ کافر ہے اور ایمان قول و عمل اور نیت کا نام ہے بڑھتا اور گھٹتا ہے اور شیخین کو مقدم رکھو۔۔۔ یہ کہہ کر فرمایا کہ شعیب! صرف اتنی

---

[1] الجواہر المضیۃ ج ۲ ص ۲۲۴ تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۳۹۔ [2] الجواہر المضیۃ

بات سے فائدہ نہ ہوگا جب تک تم مسح علی الخفین کو نہ مانو گے اور جب تک نماز میں بسم اللہ کے آہستہ پڑھنے کو بلند آواز سے پڑھنے کے مقابلے میں افضل نہ مانو گے اور جب تک تقدیر پر ایمان نہ لاؤ گے اور جب تک ہر نیک و بد کے پیچھے نماز نہ پڑھو گے اور جب تک جہاد کو قیامت تک ضروری اور ہر ظالم و عادل حکومت کے تحت نہ رہو گے۔ شعیب نے دریافت کیا کہ سب نمازیں ان لوگوں کی امامت میں پڑھنی ضروری ہیں فرمایا جمعہ اور عیدین تو ہر ایک کی امامت میں پڑھ لو ان کے علاوہ میں تمہیں اختیار ہے صرف اس کے پیچھے پڑھو جسے تم جانتے ہو کہ اہل السنت سے ہے۔ جب تم خدا کی جناب میں جاؤ اور تم سے دریافت کیا جائے تو کہہ دینا خداوندا مجھ سے یہ بات سفیان ثوری نے کہی ہے[1]

امام سفیان ثوری اگرچہ خود بھی امام اعظم کی مجلس درس میں حاضر ہوتے ہیں اور ان سے حدیثیں روایت کی ہیں مگر امام صاحب کی فقہ کو انہوں نے علی بن مسہر سے حاصل کیا ہے جو امام اعظم کے شاگرد ہیں۔ امام سفیان ثوری نے اپنی جامع کی تصنیف میں زیادہ تر ان ہی سے مدد لی ہے خود علی بن مسہر کا بیان ہے کہ:

امام سفیان میرے پاس عشاء کی نماز کے بعد آتے اور میرے سے امام اعظم کی کتابیں عاریۃً لے گئے[2]

امام سفیان کی جامع ایک زمانے میں محدثین کے یہاں بڑی مقبول اور متداول رہی ہے امام بخاری نے جب علم حدیث کی تحصیل شروع کی تو سب سے پہلے جن کتابوں کی طرف توجہ کی وہ سفیان ثوری کی جامع اور عبد اللہ بن المبارک اور وکیع بن الجراح کی تصانیف تھیں۔ امام بخاری نے جامع ثوری کا سماع اپنے وطن ہی میں امام ابوحفص کبیر سے کیا تھا خطیب بغدادی رقمطراز ہیں:

محمد بن اسماعیل البخاری فرماتے ہیں کہ میں امام ابوحفص کبیر کے پاس جامع سفیان کا سماع کر رہا تھا کہ ایک حرف کتاب میں جو میرے یہاں نہ تھا میں نے ان سے دریافت کیا انہوں نے وہی بتایا میں نے ان سے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۹۳۔ [2] کردری ص ۲۱۶۔

پھر پوچھا انہوں نے پھر وہی بتایا آخر میں تیسری بار مراجعت کی تو ذرا
چپ ہو رہے اور دریافت فرمایا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ اسماعیل
کا لڑکا محمد ہے فرمایا اس نے صحیح بتایا ہے یاد رکھو یہ لڑکا ایک روز مرد
میدان ہوگا[۱]

حافظ سیوطی فرماتے ہیں کہ اسحاق بن راہویہ سے کسی نے دریافت کیا کہ جامع سفیان اور مؤطا میں کون سی کتاب زیادہ اچھی ہے فرمایا کہ کتاب مالک[۲] ___ لیکن امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ لوگوں نے اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں جامع سفیان سب سے اچھی ہے[۳]

اس دَور کی اور کتابیں

اس دور میں ان کے علاوہ دوسرے ارباب علم نے میدان علم میں دادِ تحقیق دی ہے۔ مؤرخین نے اور کتابوں کی نشاندہی کی ہے اور بتایا ہے کہ مختلف علوم و فنون میں اتنا علمی سرمایہ اُمت کے لیے وراثت میں چھوڑا ہے کہ اُمت ان کے اس احسانِ عظیم سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں:-

علمائے کبار نے سنن کی تدوین، فقہ کی تالیف اور زبان و ادب پر کتابیں لکھی
ہیں۔ ہارون رشید کے زمانے میں اس کی بہتات ہوئی اور بکثرت تصانیف
مدون ہوگئیں[۴]

حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ

امام مالک نے حدیث اہلِ حجاز اقوالِ صحابہ و فتاویٰ تابعین پر مشتمل مؤطا، ابن
جریج نے مکہ میں، امام اوزاعی نے شام میں، امام سفیان ثوری نے کوفہ میں
حماد بن سلمہ نے بصرہ میں کتابیں لکھی ہیں[۵]

حافظ سیوطی تاریخ الخلفاء میں ۱۴۳ھ کے حوادث میں حافظ ذہبی کی اعلام سے نقل کرتے ہیں

قال الذهبی شرع علماء الاسلام فی هذا العصر فی تدوین الحدیث

---

[۱] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۱۔ [۲] تزیین الممالک ص ۴۴۔ [۳] رسالہ ابی داؤد ص ۷۔
[۴] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۱۔ [۵] الهدی الساری ص ۵۔

والفقه والتفسير فصنف ابن جريج بمكة ومالك الموطا بالمدينة والاوزاعي بالشام وابن ابي عروبه وحماد بن سلمه وغيرهما بالبصرة ومعمر باليمن وسفيان الثوري بالكوفة وصنف ابن اسحاق المغازي وصنف ابوحنيفة الفقه والرأى ثم بعد يسير صنف هيثم والليث وابن لهيعة ثم ابن المبارك وابويوسف وابن وهب وكثر تدوين العلم وتبويبه ودونت كتب العربية واللغة والتاريخ وايام الناس ۔

علماء اسلام نے اس زمانے میں حدیث، تفسیر، فقہ، مغازی، آداب عربیہ، لغت اور تاریخ کی تدوین شروع کی [۱]

مؤرخین نے اس اجمال کی کچھ شرح فرمائی ہے ۔

کتاب السنن ابن جریج

یہ کتاب محدثین کے یہاں سنن ابی الولید کے نام سے مشہور ہے ۔ الکتانی نے اس نام سے اس کا تذکرہ کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

نیز سنن کی کتابوں میں سے سنن ابی الولید ہے ۔ لوگ ان کو ابوخالد بھی کہتے ہیں ان کا نام عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج ہے کہا جاتا ہے کہ اولین مصنف ہیں ان کی وفات ۱۵۰ھ یا ۱۵۱ھ میں ہوئی [۲]

حافظ ذہبی نے ان کا چہرہ لکھتے ہوئے "تذکرۃ الحفاظ" میں بتایا ہے کہ صاحب التصانیف ، احد الاعلام اور علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ ان کے پاس ایک کتاب تھی خالد بن نزار کہتے ہیں کہ ۱۵۰ھ میں میں ابن جریج کی کتابیں لے کر ان کی خدمت میں بالمشافہ قرأت کے لیے حاضر ہوا مگر افسوس کہ ان کی وفات ہو چکی تھی [۳] ابن الندیم نے ان کی کتاب السنن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے

له من الکتب کتاب السنن ویحتوی مثل مایحتوی علیه کتب السنن

---

[۱] تاریخ الخلفاء ص ۲۶۳ ۔ [۲] الرسالہ المستطرفہ ص ۳۰ ۔
[۳] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۰ ۔

ان کی کتابوں میں کتاب السنن ہے اس کے مضامین بھی سنن جیسے ہیں[1]

امام حسن بن زیاد کو بھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔ حافظ ذہبی نے تاریخ کبیر میں خود امام حسن کی زبانی نقل کیا ہے۔

میں نے ابن جریج سے بارہ ہزار حدیثیں وہ لکھی ہیں جن کی فقہاء کو ضرورت ہوتی ہے[2]

ابن جریج کے اس بیان سے جو حافظ ذہبی نے روح بن عبادہ سے نقل کیا ہے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے امام اعظم سے کس قدر استفادہ کیا ہے حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ:

روح بن عبادہ کہتے ہیں کہ جب ان کو امام اعظم کی وفات کی خبر ملی تو ان کے تعزیتی کلمات یہ تھے واللہ لقد ذھب علم کثیر بخدا دنیا سے بہت بڑا علم کوچ کر گیا[3]

کتاب الفرائض لابن مقسم ۱۸۶ھ

مغیرہ بن مقسم کوفہ کے نامور محدثین سے ہیں۔ امام شعبہ جیسے رئیس المحدثین کا ان کے بارے میں تاثر یہ تھا کہ حماد سے زیادہ حافظ ہیں۔ امام احمد ان کو ذکی، حافظ اور صاحب سنت فرماتے تھے۔ رواۃ صحاح ستہ میں سے مشہور امام حدیث و فقہ ہیں، ابوبکر بن عیاش کا بیان ہے کہ میں نے ان سے زیادہ افقہ کسی کو نہیں دیکھا اس لیے ان ہی کی خدمت میں رہ پڑا۔ خود فرماتے تھے کہ جو چیز میرے کان نے سن لی کبھی بھولا نہیں ہوں۔ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ امام ذہبی نے ان کو امام اعظم کا شاگرد بتایا ہے۔ جریر بن عبدالحمید کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا مقسم مسائل میں گفتگو کرتے تھے اور جب کسی مسئلہ پر ان سے کوئی اختلاف کرتا تو فرما دیتے کہ امام ابوحنیفہ یہی فرماتے ہیں[4]

اللہ اکبر اعلم ابی حنیفہ! کتنی جلالتِ قدر ہے کہ اختلاف کے وقت ان کو بطورِ استدلال پیش کیا جاتا ہے۔ ابن الندیم نے لکھا ہے کہ

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۳۲۰۔ [2] الامتاع ص ۵۰۔ [3] مناقب للذہبی ص ۱۸ تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۳۸۔ [4] الجواہر المضیۃ ج ۲ ص ۱۷۸۔

له من الكتب كتاب الفرائض[1]

کتاب السنن لزائدة بن قدامه

زائدہ بن قدامہ کوفہ کے مشہور محدث ہیں۔ امام ذہبی نے ان کو امام شعبہ کا ہمسر بتایا ہے۔ ان کی علمی جلالتِ قدر کا اندازہ کرنا ہو تو ترمذی میں امام احمد کا یہ بیان پڑھیے۔

ابو اسحاق کی حدیث کے سوا جب تم زائدہ اور زہیر سے کوئی حدیث سن لو
تو اسے دوسرے سے سننے کی فکر ہی نہ کرو[2]

علامہ ابن الندیم نے ان کی تصانیف میں کتاب السنن، کتاب القرأت، کتاب التفسیر، کتاب الزہد اور کتاب المناقب کا پتہ دیا ہے[3]

حافظ ذہبی نے زائدہ بن قدامہ کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ حافظ عبد القادر نے الجواہر المضیئة میں بھی ان کا تذکرہ کیا ہے۔

کتاب السنن یحییٰ بن زکریا ۱۸۲ھ

ان کو بھی حافظ ذہبی نے کان اماما صاحب التصانیف لکھا ہے اور ابن الندیم نے ان کی لیفات میں کتاب السنن کا تذکرہ کیا ہے[4]

ان کی کنیت ابو سعید اور نام یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ ہمدانی ہے۔ حافظِ حدیث، ثقہ، فقیہ، ندین، متورع اور ان اکابر اہلِ علم وفضل میں سے تھے جنہوں نے فقہ و حدیث پر نمایاں کام کیا ہے فظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں امام ابو الحسن علی بن المدینی سے نقل کیا ہے کہ سفیان ثوری کے بعد کوفہ میں آپ سے زیادہ ثبت کوئی نہ تھا۔ خطیب بغدادی رقمطراز ہیں کہ آپ پورے سال تک روزانہ ایک قرآن حکیم ختم کیا۔ بغداد میں ایک مدت دراز تک درس حدیث دیتے ہے۔ آپ کے تلامذہ میں امام احمد، ابن معین، قتیبہ اور ابو بکر بن ابی شیبہ ہیں۔ امام ابن المدینی کہتے کہ علم یحییٰ پر ان کے زمانے میں ختم تھا[5] یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ کوفہ میں ابن زکریا سے

---

[1] فہرست لابن الندیم ص ۳۳۰۔ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ [3] فہرست ص ۳۳۰۔
[4] فہرست ص ۳۳۰۔ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۴۶۔

زیادہ کسی کی مخالفت مجھ پر بھاری نہیں ہے۔ یحییٰ بن زکریا امام اعظم کے صرف ان تلامذہ میں سے نہیں جنہوں نے امام اعظم کی نگرانی میں تدوینِ کتب کا کام کیا ہے بلکہ ان دس اشخاص میں سے ہیں جن کا شمار تلامذہ متقدمین میں ہوتا تھا۔ چنانچہ حافظ ابوجعفر طحاوی نے بسندِ متصل اسد بن الفرات سے روایت کی ہے۔

کان اصحاب ابی حنیفۃ الذین دونوا الکتب اربعین رجلا وکان فی العشرۃ المتقدمین ابویوسف وزفر وداؤد الطائی واسد بن عمرو ویوسف بن خالد السمتی ویحیی بن زکریا بن ابی زائدۃ۔

امام اعظم کے وہ اصحاب جنہوں نے تدوینِ کتب کا کام کیا وہ چالیس تھے اور ان میں جو درجہ قیادت رکھتے تھے وہ دس تھے۔

بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ یحییٰ بن زکریا ہی اس مجلس تدوین میں پورے تیس سال تک کتابت کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں چنانچہ اسد بن فرات ہی فرماتے ہیں:۔

وھو الذی کان یکتبھا لھم ثلاثین سنۃ[1]

کتاب السنن وکیع بن الجراح ۱۹۷ھ

ابن الندیم نے ان کی تصانیف میں کتاب السنن کا ذکر کیا ہے[2] الکتانی نے بھی اس سنن کے مصنف کا وکیع کے نام سے تعارف کرایا ہے[3] حافظ ذہبی نے ان کی تصانیف کے بارے میں امام احمد کا یہ اعتباری ارشاد نقل کیا ہے کہ:

علیکم بمصنفات وکیع[4]

اور ان کا چہرہ امام ذہبی نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔ الامام الحافظ، الثبت، محدث العراق، احد الائمۃ الاعلام۔ وکیع بن الجراح اصحاب صحاح ستہ کے شیوخ و رواۃ میں ہیں۔ فقہ وحدیث کے امام، عابد، زاہد، اکابر اتباع تابعین، امام شافعی و امام احمد کے شیخ۔ ابوسفیان کنیت تھی۔ امام اعظم سے فقہ میں درجہ تخصیص حاصل کیا اور حدیث میں امام اعظم، امام

---

[1] الجواہر المضیئۃ ج ۲ ص ۲۱۱۔ [2] الفہرست ص ۳۳۰۔ [3] الرسالۃ المستطرفہ ص ۳۲
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۶۔

ابویوسف، امام زفر، ابن جریج، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، اوزاعی، اعمش وغیرہ ان کے اساتذہ ہیں اور عبداللہ بن المبارک، امام احمد، یحییٰ بن معین، علی بن مدینی، اسحاق بن راہویہ، احمد بن منیع اور یحییٰ بن اکثم جیسے کبار محدثین آپ کے تلامذہ ہیں۔ یحییٰ بن اکثم فرماتے ہیں کہ میں سفر و حضر میں آپ کی رفاقت میں رہا آپ ہمیشہ روزہ رکھتے ہر رات قرآن حکیم ختم کرتے تھے۔ ابن معین کہتے ہیں کہ میں نے ان سے افضل کوئی نہیں دیکھا[1] امام اعظم کی خدمت میں کافی عرصہ رہے ہیں اور علم کا بہت بڑا حصہ ان سے حاصل کیا ہے امام اعظم کی مجلس تدوین فقہ کے رکن بھی ہیں۔ الصیمری نے لکھا ہے کہ فتویٰ میں امام ابوحنیفہ ہی کی رائے کو اپناتے تھے[2] عبداللہ بن المبارک کا بیان ہے کہ امام اعظم کے قول پر فتویٰ دیتے اور امام اعظم سے بہت زیادہ حدیثوں کا سماع کیا ہے[3]

کتاب السنن سعید بن ابی عروبہ ۱۵۶ھ

امام ذہبی نے ان کو بصرہ میں اولین مصنف بتایا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

اول من صنف الابواب بالبصرة[4]

علامہ ابن الندیم نے ان ہی ابواب کو ان کی تصانیف میں کتاب السنن لکھا ہے[5] حافظ ابن عبدالبر نے بسند متصل ایک واقعہ لکھا ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سعید بن ابی عروبہ کے یہاں امام اعظم کا کیا علمی مقام تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> سعید بن ابی عروبہ سے ایک بار ایک مسئلہ دریافت کیا گیا۔ مسئلہ کا تعلق طلاق سے تھا جواب دیا اور فرمایا بکذا قال ابو حنیفۃ امام ابوحنیفہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ بعد ازیں ارشاد فرمایا کہ امام ابوحنیفہ تمام عراق کے عالم ہیں[6]

اس سے معلوم ہوا کہ سعید امام اعظم کے علوم سے کیسے استفادہ کرتے تھے اور یہ کہ امام اعظم کی شخصیت صرف علمی نہیں بلکہ استدلالی ہے۔ حافظ ابن عبدالبر ہی نے بسند متصل سعید بن ابی عروبہ کی زبانی جو دوسرا واقعہ لکھا ہے کہ سعید بن ابی عروبہ امام اعظم کے درس میں شریک ہو کر ان

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۲۔ [2] الجواہر المضیہ ج ۲ ص ۲۰۸۔ [3] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۹
[4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۷۔ [5] فہرست ص ۳۳۱۔ [6] الانتقاء ص ۱۳۰۔

کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

> میں کوفہ آیا تو امام اعظم کے درس میں حاضری دیتا تھا ایک روز امام اعظم نے حضرت عثمان کے ذکر پر رحمہ اللہ فرمایا۔ میں چونک گیا عرض کیا کہ آپ پر بھی اللہ رحم کرے میں نے تو اس بستی میں آپ کے سوا حضرت عثمان کے لیے دعائے رحمت کرنے والا نہیں دیکھا یہیں سے مجھے امام اعظم کا مقام فضل معلوم ہو گیا [1]

یہ تصریحات بتا رہی ہیں کہ سعید بن ابی عروبہ نے امام اعظم سے کس قدر علمی استفادہ کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے حماد بن سلمہ کو بھی ان کا رفیق تصنیف بنا کر پیش کیا ہے :

هو اوّل من صنف مع سعيد [2]

ابن الندیم نے بھی حماد کے مؤلفات میں کتاب السنن کا نام لیا ہے غالباً یہ ایک ہی کتاب ہے چونکہ کام دونوں نے ایک جگہ کیا ہے اس لیے ایک ہی کتاب دونوں کی طرف منسوب ہے۔

کتاب التفسیر ہیثم بن بشیر ۱۸۳ھ

امام بخاری نے ان کو بھی امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

روى عنه عباد بن العوام و ابن المبارك و هيثم

ان کی تصانیف میں علامہ ابن الندیم نے مندرجہ ذیل تین کتابیں بتائی ہیں۔ کتاب السنن، کتاب التفسیر اور کتاب القرآت [3]

امام حماد بن زید نے فرمایا کہ میں نے محدثین میں ان سے زیادہ بلند مرتبہ نہیں دیکھا۔ محدث خوارزمی فرماتے ہیں کہ ہیثم امام اعظم کے تلامذہ حدیث میں ہیں۔ عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے تھے کہ ہیثم سفیان ثوری سے بھی زیادہ حافظ تھے۔ ان کے تلامذہ میں بڑے بڑے جلیل القدر محدثین ہیں۔

کتاب الزہد عبداللہ بن المبارک

حافظ ذہبی نے ان کے ترجمہ میں ان کو صاحب التصانیف النافعہ لکھا ہے۔ علامہ ابن الندیم نے

---

[1] الانتقاء ص ۱۳۰۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۳۱۔ [3] الفہرست ص ۳۲۱۔

ن کی تصانیف میں متعدد کتابوں کا ذکر کیا ہے مثلاً کتاب الزہد، کتاب السنن، کتاب التفسیر، کتاب التاریخ
رکتاب البر والصلہ[1]

مشہور محدث امام یحییٰ بن آدم کہتے ہیں کہ جب مجھے دقیق اور مشکل مسائل سے سابقہ پڑتا ہے تو تلاش و
تجو میں اگر ابن المبارک کی کتابوں میں یہ نہ ملیں تو مجھ پر مایوسی چھا جاتی ہے۔ یحییٰ بن معین نے
ن کی کتابوں میں مندرج احادیث کی تعداد بھی بتائی ہے فرماتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں مندرج
یثوں کی تعداد بیس ہزار تھی[2]

یہاں یہ بتانا بے جا نہ ہوگا کہ ابن الندیم نے عبداللہ بن المبارک کا ذکر کرتے ہوئے ان کے وہ
شعار بھی درج کیے جو انہوں نے امام اعظم کی مدح میں لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں:

لقد زان البلاد ومن علیہا — امام المسلمین ابا حنیفہ
باثار و فقہ فی حدیث — کایات الزبور علی الصحیفہ
فما فی المشرقین لہ نظیر — ولا بالمغربین ولا بکوفہ
رایت العائبین لہ سفاھا — خلاف الحق مع حجج ضعیفہ

حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں کہ ایک بار عبداللہ بن المبارک کے کچھ تلامذہ ایک مجلس میں
ع تھے باہم گفتگو کرتے ہوتے کہا کہ آؤ ابن المبارک کی خوبیاں شمار کریں۔ سب کا فیصلہ یہ تھا
عبداللہ میں علم، فقہ، ادب، نحو، لغت، زہد، شعر، فصاحت، پارسائی، انصاف، شب بیداری،
لامت رائے، تقلیل کلام اور ساتھیوں سے قلت اختلاف جیسی ساری خوبیاں جمع تھیں[3]
طیب بغدادی نے عباس بن مصعب کا بھی ایسا ہی تاثر لکھا ہے۔

باوجود ان مناقب و مآثر کے عبداللہ بن المبارک امام اعظم کے اصحاب اور تلامذہ میں سے
ے۔ فرماتے ہیں اگر اللہ سبحانہ میری ابوحنیفہ اور سفیان ثوری سے مدد نہ فرماتے تو میں بھی عام لوگوں
طرح ہوتا اور ان کا اقرار ہے۔

تعلمت الفقہ الذی عندی من ابی حنیفۃ
امام اعظم کے تلمذ پر فخر کرتے ان کی مدح فرماتے تھے[4]

---

[1] الفہرست ص ۳۲۱۔ [2] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۱۶۴ [3] الجواہر المضیۃ ج ۱ ص ۲۸۱
[4] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۶۵۔

سیرت و مغازی

ان کے علاوہ بھی دوسرے محدثین نے حدیث کے موضوع پر کتابیں مدون کی ہیں اور ساتھ ہی دوسرے موضوعات پر بھی علمی سرمایہ منصۂ شہود پر آیا مثلاً سیرت و تاریخ، فقہ و شرائع، ادب و شعر پر اس دور میں کتابیں لکھی ہیں۔

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن لکھتے ہیں کہ:

سیرت کے موضوع پر سب سے پہلے عروۃ بن الزبیر نے قلم اٹھایا۔ بعدازیں ابان بن عثمان ۱۰۵ھ نے کام کیا۔ ابان کی علمی تحقیقات کو ان کے شاگرد عبدالرحمٰن بن المغیرہ نے سیرۃ الرسول کے نام سے یکجا کیا اور محمد بن شہاب الزہری، موسیٰ بن عقبہ نے ان کے بعد مغازی لکھے ہیں۔ بالآخر محمد بن اسحاق نے ان سب کو سیرۃ الرسول کا نام رکھ کر یکجا کیا ہے[1]

الذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں اور ابن الندیم نے الفہرست میں ان کا جستہ جستہ تذکرہ کیا ہے

فقہ و شرائع

اس موضوع کی تفصیلات ہم یہاں نہیں پیش کر سکتے۔ اس پر سیر حاصل مباحث کے لیے آپ کو ہماری دوسری کتاب "امام اعظم اور علم الشرائع" کا انتظار کرنا چاہیے لیکن ہم یہاں تاریخی ربط قائم رکھنے کے لیے چند اشارات کریں گے۔

علمی حیثیت سے کتاب و سنت اگر دلائل ہیں تو فقہ ان دلائل سے پیدا شدہ نتائج کا نام ہے یا جیسا کہ الخطابی نے معالم السنن میں لکھا ہے کہ قرآن و سنت اگر اساس اور بنیاد ہیں تو فقہ ان بنیادوں پر اٹھی ہوئی عمارت کا نام ہے یا جیسا حکیم الامت نے بتایا ہے کہ قرآن و سنت اگر سیپی ہیں تو فقہ کی حیثیت اس سیپی کے اندر موتی کی ہے۔

زمانۂ نبوت میں خود ذات نبوت فقہ و فتاویٰ کا مرکز تھی آپ کے بعد اکابر صحابہ جو شریعت کے رازداں اور احکام اسلامی کے محرم تھے فقہ و فتاویٰ میں آپ کے جانشین تھے حافظ ابن عبدالبر

---

[1] تاریخ الاسلام السیاسی ج ۱ ص ۳۹۶۔

اور حافظ ابن القیم نے امام مزنی سے نقل کیا ہے۔

فقہاء زمانۂ نبوت سے آج تک فقہ میں اور تمام احکام میں قیاس سے کام لیتے رہے ہیں[1]

حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں، حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں اور حافظ ابن حزم نے احکام الاحکام میں فقہ کی تاریخ پر جامع تبصرہ کیا ہے۔

مشہور جرمن مؤرخ بروکلمان نے اقرار کیا ہے:

اسلام کا دامن جزیرہ عرب سے باہر پھیلا۔ تو علماء نے زندگی کے اس مرحلے پر ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے اجتہاد شروع کیا۔ اس طرح اسلام میں فقہ کا ظہور ہوا۔ یعنی اس عقلی تصرف وعمل نے جو معاشرے میں مختلف فیصلے معلوم کیے ان کا نام فقہ وتشریع ہو گیا[2]

گولڈزیہر کی رائے ہے۔

فقہ واجتہاد پر اسلام کے شروع ہی سے کام شروع ہو گیا تھا لیکن اس دور کی علمی حیثیت کچھ نمایاں نہ تھی۔

ان تصریحات سے مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ فقہ وشرائع کا تاریخی رشتہ ذات نبوت اور صحابہ سے وابستہ ہے بلکہ جیسا کہ ڈاکٹر فیلپ حتی نے کہا ہے کہ فقہ اسلامی کا دستوری ضابطہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یہ کہہ کر بتایا تھا کہ

اے معاذ! پیش پا افتادہ معاملات کو حل کیسے کرو گے؟ بولے کہ قرآن سے، حضور نے دریافت فرمایا اگر قرآن میں تمہیں معاملہ کا حل نہ ملے تو پھر کیا کرو گے؟ بولے کہ حضور آپ کی سنت سے، حضور نے پھر پوچھا کہ اگر سنت میں بھی نہ ملے تو پھر کیا کرو گے؟ بولے کہ اجتہاد کروں گا، حضور نے یہ سن کر فرمایا الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضاہ[3]

یہ درست ہے کہ جیسے سارے صحابہ حفاظ حدیث نہ تھے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ میں سے

---

[1] جامع بیان العلم وفضلہ، اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۰۰۔ [2] تاریخ الادب العربی ج ۳ ص ۲۲۲

[3] تاریخ العرب ج ۲ ص ۴۸۳۔

حدیث نبوت کو نقل کرنے والے صحابہ مرد و زن کی تعداد کے بارے میں امام حاکم نے المدخل میں لکھا ہے کہ :

فقد روی عنه صلی اللہ علیه وسلم من الصحابة اربعة الاف رجل وامرأة [1]

یعنی صرف چار ہزار مرد و زن صحابہ نے احادیث روایت کی ہیں ایسے ہی سارے صحابہ فقہاء بھی نہ تھے بلکہ ان کی تعداد جیسا کہ حافظ ابن القیم نے اعلام میں بتائی ہے ۔

والذی حفظت عنهم الفتوی من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم مائة ونیف وثلاثون نفسا ما بین رجل وامرأة [2]

یعنی صرف ایک سو تیس مرد و زن سے کچھ زائد ہے اور یہ تعداد بھی ایک جگہ نہیں بلکہ حضرت عمر کے زمانے میں حضرت عمر کی کوششوں کے صدقے مختلف شہروں میں پھیلی ہوئی تھی ۔ اسی بنا پر زمانۂ صحابہ ہی میں مختلف شہروں میں فقہ کے ایک سے زیادہ علمی ادارے قائم ہو گئے تھے ۔ ان شہروں میں مشہور ترین شہر یہ ہیں ۔ مدینہ ، کوفہ ، دمشق ، مکہ —— مدینہ کے فقہاء کا حافظ ابن حزم نے تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

مدینے میں صحابہ کے بعد فقہاء میں سعید بن المسیب ہیں ۔ ان کا ازدواجی تعلق ابو ہریرہ کی صاحبزادی سے ہوا ۔ انہوں نے ابو ہریرہ اور سعد بن ابی وقاص سے علمی استفادہ کیا ۔ دوسرے عروۃ بن الزبیر بن العوام تیسرے القاسم بن محمد ۔ یہ دونوں حضرت عائشہ کے تلامذہ خاص میں سے ہیں ، چوتھے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود ۔ یہ ابن مسعود کے خاص شاگرد ہیں پانچویں خارجہ بن زید ، انہوں نے اپنے والد زید بن ثابت سے علمی استفادہ کیا ۔ چھٹے ابو بکر بن عبد الرحمٰن ۔ ساتویں سلیمان بن یسار ، یہ حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ کے خاص شاگرد ہیں ۔ یہی لوگ فقہاء سبعہ کے نام سے مدینہ میں مشہور ہیں [3]

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے فقہ کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے مدینہ کی فقہی اکادمی کا اس طرح تعارف کرایا ہے ۔

---

[1] المدخل ص ۰ ۔ [2] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۲ ۔ [3] احکام الاحکام ج ۲ ص ۵۱۷ ۔

علم الفقہ اور فتاویٰ کا دار و مدار خلفاء راشدین کے زمانے میں حضرت فاروق اعظم کی ذات گرامی تھی۔ پھر فقہاء صحابہ حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر وغیرہ اس دائرہ علمیہ کے مرکز تھے۔ صحابہ کے بعد اس عمل جلیل کی ذمہ داری کا بار فقہاء سبعہ کے کاندھوں پر تھا۔ ان کے بعد ان کے تلامذہ نے اس دائرہ علمیہ میں کام کیا جیسے امام زہری، یحییٰ بن سعید الانصاری، زید بن اسلم وغیرہ۔ ان سب کی علمی وراثت امام مالک کو ملی انہوں نے ان کی حدیثوں اور فتاویٰ کو سینوں سے نکال کر صحیفوں میں جمع و مدون کر دیا۔[1]

مدینہ کی طرح کوفہ میں بھی فقہ کا دائرہ علمیہ زمانہ صحابہ ہی سے کام کر رہا تھا۔ عہد مرتضیٰ سے لے کر بغداد کی تعمیر تک وسعت اور کثرت فقہ و حدیث میں تمام بلاد اسلامیہ میں کوفہ ممتاز تھا۔ علامہ نووی نے اسے دار الفضل والفضلاء، مجد الدین فیروز آبادی نے قبۃ الاسلام لکھا ہے حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

> اہل کوفہ نے حضرت علی کے آنے سے پہلے سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن مسعود، عمار بن یاسر اور ابو موسیٰ اشعری سے علم حاصل کیا تھا۔ نیز کوفہ والوں نے قرآن کا عبداللہ بن مسعود سے استفادہ کیا ہے۔ یہ لوگ مدینہ جا کر حضرت عائشہ اور حضرت عمر سے بھی علم حاصل کرتے تھے۔[2]

کوفہ کا یہ دائرہ علمیہ صحابہ کے بعد جن حضرات پر مشتمل تھا حافظ ابن القیم اور حافظ ابن حزم نے ان کے نام لکھے ہیں:

> علقمہ بن قیس النخعی، اسود بن یزید النخعی، عمرو بن شرحبیل الہمدانی، مسروق بن الاجدع الہمدانی، عبیدۃ السلمانی، شریح بن الحارث القاضی، سلیمان بن ربیعہ الباہلی، زید بن صوحان، سوید بن غفلہ، الحارث بن قیس الجعفی، عبدالرحمٰن بن یزید النخعی، عبداللہ بن عتبہ بن مسعود القاضی، خیثمہ بن عبدالرحمٰن سلمۃ بن صہیب، مالک بن عامر، عبداللہ بن سنجرہ زر بن حبیش، خلاس

---

[1] مسوی ص ۲۸۔ [2] منہاج السنہ ج ۴ ص ۱۲۲۔

بن عمرو، عمرو بن میمون الاودی، ہمام بن الحارث، الحارث بن سوید، یزید
بن معاویہ النخعی، الربیع بن خثیم، عتبہ بن فرقد، صلۃ بن زفر، شریک، رخثیل،
ابووائل شقیق بن سلمہ، عبید بن نضلہ۔

یہ نام لکھنے کے بعد حافظ ابن حزم اور حافظ ابن القیم نے ان سب کے بارے میں لکھا ہے کہ

هؤلاء اصحاب علی وابن مسعود

اور ان میں اکثر کے بارے میں یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ:

اکثرهم اخذ عن عمر وعائشۃ وعلی

ان کے بعد کوفہ ہی کے فقہا میں ابراہیم نخعی، امام شعبی، سعید بن جبیر، القاسم بن عبدالرحمٰن، ابوبکر
بن ابی موسیٰ، محارب بن دثار، حکم بن عتبہ اور جبلۃ بن سحیم کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ کوفہ میں فقہ و افتاء
میں ان کی جانشینی کا شرف

حماد بن ابی سلیمان، سلیمان بن المعتمر، سلیمان بن الاعمش، مسعر بن کدام

کو حاصل ہے اور پھر حماد و سلیمان کی وراثت علمی اس شہر میں ابن ابی لیلیٰ، عبداللہ بن شبرمہ، سعید
بن اشوع، قاضی شریک، القاسم بن معن، سفیان ثوری اور ابوحنیفہ اور الحسن بن صالح کو ملی ہے
اور امام ابوحنیفہ کے بعد ان کے اور سفیان ثوری کے جانشین یہ ہیں:

حفص بن غیاث، وکیع بن الجراح، قاضی ابویوسف، زفر بن الہذیل، حماد
بن ابی حنیفہ، الحسن بن زیاد، محمد بن الحسن عافیہ، اسد بن عمرو، نوح بن دراج
اور امام ثوری کے ساتھی الشجعی معافی بن عمران، یحییٰ بن آدم[1]

یہ گویا کوفہ میں علماء کوفہ کا وہ فقہی نسب نامہ ہے جو حافظ ابن حزم اور حافظ ابن القیم نے
درج کیا ہے۔ شاید اسی نسبی جلالت قدر کی وجہ سے امام اعظم نے برسر دربار عباسی حکومت کے
سربراہ ابوجعفر منصور کے اس پوچھنے پر کہ اے ابوحنیفہ تم نے کن لوگوں سے علم حاصل کیا ہے؟
امام اعظم نے سربراہ مملکت کو جواب دیا تھا کہ میرا علمی نسب نامہ یہ ہے کہ بحوالہ حماد از ابراہیم میں
فاروق اعظم، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس کے علمی چشموں سے
سیراب ہوا ہوں۔ امام اعظم کا یہ جواب سن کر ابوجعفر نے کیا کہا۔ یہی سننا چاہتا ہوں۔ بلاداوہ

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۵-۲۶۔ احکام الاحکام ص ۶۸۱۔

تم نے تو ابوحنیفہ اپنا علمی رشتہ الطیبین الطاہرین اور المبارکین صلوات اللہ علیہم اجمعین سے مضبوط قائم کیا ہوا ہے[1]

اس کے بعد حافظ ابن حزم اور حافظ ابن القیم نے دوسرے شہروں کے مدارس فقہ کا بھی تذکرہ کیا ہے لیکن ہم نے مدینہ اور کوفہ کو خصوصیت سے اس لیے ذکر کیا ہے کہ ان دونوں شہروں کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں بسند متصل امام ابن وہب کی زبانی یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک بار امام مالک سے کسی نے مسئلہ دریافت کیا آپ نے اس کا جواب دیا اس پر پوچھنے والے کی زبان سے نکل گیا کہ شام والے تو آپ سے اس مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ

متی کان ھذا الشان بالشام؟ انما ھذا الشان وقف علی اھل المدینۃ والکوفۃ[2]

یہ شان شام والوں کی کب سے ہوئی؟ یہ شان تو صرف مدینہ اور کوفہ والوں کی ہے۔

ان دونوں شہروں کے فقہاء سبعہ مدینہ اور فقہاء کوفہ اصحاب ابن مسعود کے دور کا کوئی قلمی سرمایہ ہماری معلومات میں نہیں ہے اور بروکلمان کی یہ بات درست ہے:۔

ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ جس کی مدد سے ہم اس دور میں فقہ کی کتابی خدمت کا پتہ لگا سکیں[3]

لیکن موصوف نے ابن سعد کے حوالے سے یہ انکشاف کیا ہے کہ:

فقہاء سبعہ میں سے عروہ نے فقہ و تشریع کے موضوع پر قلمی کام کیا ہے[4]

عروہ کے صاحبزادے ہشام کا بیان ہے کہ:

میرے والد کی حرہ والے دن فقہ کی کتابیں نذر آتش ہو گئیں۔ ہشام افسوس سے کہتے ہیں کہ اگر میرے پاس یہ کتابیں ہوتیں تو مجھے اپنے مال اور اہل و عیال سے زیادہ محبوب ہوتیں[5]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۳۴۔ [2] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۵۸
[3]، [4] تاریخ الادب العربی ج ۳ ص ۲۳۲۔ [5] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۱۷۹، جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۵
واضح رہے کہ ہم نے کتاب میں جامع کی روایت لی ہے۔ یہ زیادہ واضح اور صاف ہے۔

علامہ ابن الندیم نے عبدالرحمٰن بن ابی الزناد ۱۷۴ھ کے بارے میں پتہ دیا ہے کہ انہوں نے رای الفقہاء السبعہ کے نام سے کتاب لکھی ہے لیکن یہ دورِ تصنیف ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ اور حافظ عسقلانی نے تہذیب میں اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ یہ کتاب ہی ان پر امام مالک کی گرفت کا باعث بنی ہے لیکن عبدالرحمٰن کے اس کارنامے کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ مختلف نہیں ہے جو ابوبکر محمد بن موسیٰ نے عبداللہ بن عباس کے فتاویٰ کتابی صورت میں جمع کرکے انجام دی ہے یا اس دور کا کارنامہ نہیں ہے بلکہ بعد کا ہے۔

فقہ و شرائع میں امام اعظمؒ کی تصانیف

دورِ تابعین میں فقہ و شرائع پر جیسا کہ آپ پہلے سن چکے ہیں سب سے پہلے کام امام اعظم نے کیا ہے ڈاکٹر فلپ حتی نے علم حدیث میں امام اعظم کے بارے میں یہ بتانے کے بعد کہ

کان من ابرز الذین تخرجوا علی الشعبی الامام ابو حنیفۃ المشہور[1]۔

امام شعبی کے تلامذہ میں سے مشہور امام ابو حنیفہ ہیں۔

یہ بھی لکھا ہے کہ جہاں تک فقہ و شرائع کی تاریخ کا تعلق ہے اس کی اساس و بنیاد قائم کرنے کا سہرا امام اعظم ابو حنیفہ کے سر ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

الامام ابو حنیفۃ المتوفی سنہ ۱۵۰ھ الذی وضع الاساس لاول مدارس الشرع الاربع فی الاسلام۔

ابو حنیفہ ہی کی وہ ذات گرامی ہے جس نے فقہ و شریعت کی اسلام میں اولین اساس رکھی ہے[2]

فقہ کے موضوع پر ابو حنیفہ کے نام سے اگرچہ کوئی تالیف نہیں ہے اور اس سے کچھ کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ فی الواقع اس موضوع پر امام اعظم کا کوئی سرمایہ علمی نہیں ہے لیکن دراصل امام اعظم کے مذاق تالیف پر غور نہ کرنے کی وجہ سے دوستوں کو یہ غلط فہمی ہوئی۔ اگر ان کو یہ علم ہوتا کہ تالیف میں امام اعظم کا مذاق کیا تھا تو وہ یہ کہنے کی جرأت نہ کرتے۔ ان کا طریقہ املائی تھا۔ زبانی بولتے تلامذہ لکھتے۔ امام محمد کے نام سے جو کتابیں ہیں ان کی اصل امام اعظم ہی کا سرمایہ علمی ہے۔

---

[1] تاریخ العرب ج ۱ ص ۳۱۱۔ [2] تاریخ العرب ج ۱ ص ۳۱۶۔

فقہ کے موضوع پر امام اعظم کی قدیم ترین کتاب کتاب السیر ہے۔ آپ نے اسے اپنے تلامذہ الحسن بن زیاد، محمد بن الحسن، ابو یوسف، زفر، اسد بن عمرو، حفص بن غیاث، عافیہ بن یزید وغیرہ کو املا کرائی۔ امام اعظم کی یہ کتاب جب امام عبدالرحمٰن الاوزاعی کے مطالعہ میں آئی تو امام اوزاعی نے اس کا جواب لکھا۔ قاضی ابو یوسف نے امام اوزاعی کی کتاب کا رد لکھا جو الرد علی سیر الاوزاعی کے نام سے مشہور ہے اور طبع ہو چکی ہے۔ امام شافعی نے کتاب الام میں قاضی ابو یوسف کی کتاب الرد علی سیر الاوزاعی کو روایت کیا ہے۔[1]

امام اعظم نے فقہ میں اختلاف الصحابہ کے نام سے بھی کتاب تالیف کی ہے۔ امام اعظم کی اس تالیف کے بعد ان کے شاگردوں نے اس میدان میں جو علمی خدمت انجام دی ہے وہ سب کے سامنے عیاں ہے۔

ان میں قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج، کتاب الامالی، الرد علی سیر الاوزاعی مشہور ہیں۔

امام محمد کی تصانیف میں السیر الصغیر، السیر الکبیر، الجامع الکبیر، کتاب الرد علی اہل المدینہ، الجامع الصغیر، زیادات، مبسوط مشہور ہیں۔

امام حسن بن زیاد کے بارے میں علامہ ابن الندیم نے طحاوی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک سے زیادہ کتابیں تالیف کی ہیں مثلاً کتاب آداب القاضی، کتاب الخصال، کتاب معانی الایمان، کتاب النفقات، کتاب الفرائض، کتاب الخراج۔[2]

ابن ابی لیلیٰ کے بارے میں ابن الندیم نے انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے کتاب الفرائض لکھی ہے نیز محمد بن عبدالرحمٰن جو ابن ابی ذئب کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی فقہی تالیفات میں بھی کتاب السنن کا ذکر آیا ہے۔

الغرض اس دور میں تصنیف و تالیف کے کام میں کافی ترقی ہوئی اور بہت سے علماء نے مختلف علوم و فنون پر کتابیں مدون کیں۔

دورِ صحابہ ۱۰۲ھ سے ۲۰۰ھ تک حدیث

یہ تو آپ پہلے سن آئے ہیں کہ علمِ حدیث کے نام سے جو علمی ذخیرہ آج دنیا میں موجود ہے وہ حسب تصریح امام حاکم۔

---

[1] کتاب الام۔ [2] الفہرست ص ۳۰۲۔

فقد روی عنہ صلی اللہ علیہ وسلم من الصحابۃ اربعۃ الاف
رجل وامرأۃ[1]

یعنی صرف چار ہزار مرد و زن صحابہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ جن تابعین نے صحابہ کرام سے یہ علم حاصل کیا اور بعد کی نسلوں کی طرف منتقل کیا ہے ان کی تعداد کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف طبقات ابن سعد میں چند مرکزی شہروں کے جن تابعین کے حالات ملتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

مدینہ	۴۰۴	کوفہ	۴۱۳
مکّہ	۱۳۱	بصرہ	۱۶۴

شاید کوفہ اور مدینہ میں ائمۂ تابعین کی اس کثرتِ تعداد پر آپ حیران ہوں لیکن حیرت کی کوئی بات نہیں ان دو شہروں کو ہی فقہ و حدیث میں مرکزیت حاصل تھی۔ آپ پیچھے امام مالک کا بیان پڑھ چکے ہیں کہ علم کی دُنیا میں صرف ان ہی دو شہروں کو یہ حق حاصل ہے کہ علمی مباحث میں ان کا ذکر کیا جائے۔ علامہ یاقوت حموی نے سفیان بن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ:

خذوا القرأۃ عن اھل المدینۃ وخذوا الحلال والحرام عن
اھل الکوفۃ[2]

قرأت مدینہ والوں سے اور حلال و حرام کی باتیں کوفہ والوں سے لو۔

یہی دو شہر ہیں جہاں کے اتفاق کو کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے جیسے اہل مدینہ کے اتفاقی مسا کا تذکرہ امام مالک مؤطا میں اس طرح کرتے ہیں السنۃ التی لا اختلاف فیھا عندنا۔ ایسے ہی اہل کوفہ کے اجماعی مسائل کو بتانے کے لیے ایسے مواقع پر امام محمد یہ فرماتے ہیں ھو قول ابی حنیفۃ والعامۃ من فقھائنا۔ اور اگر مدینہ والوں کو کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو امام مالک فرماتے ہیں ھذا احسن ما سمعت۔ اور امام محمد اہل کوفہ کے اختلاف کی طرف یہ کہہ کر اشارہ فرماتے ہیں ھو احب الینا۔ الغرض مدینہ اور کوفہ میں ائمۂ تابعین کی یہ کثرت کوئی حیر والی بات نہیں ہے۔ ان ائمۂ تابعین کے حالات کتابوں میں پڑھیے آپ کو پتہ لگ جائے گا ان لوگوں نے صحابہ کے زمانے کا بہت بڑا حصّہ پایا ہے ان میں سے بیشتر وہ ہیں جنہوں نے صحا کے گھروں اور صحابیات کی گود میں پرورش پائی ہے۔

---

[1] المدخل ص ۷۔ [2] معجم البلدان ج ۲ ص ۶۴۔

مدینہ میں تابعین میں حدیث و آثار کا سرچشمہ اگر سعید بن المسیب، عروۃ بن الزبیر اور قاسم بن محمد ہیں تو کوفہ میں مسروق، علقمہ اور اسود بن یزید نخعی ہیں۔

سعید کو حضرت ابو ہریرہ جیسے راوی کبیر کے داماد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ عروہ حضرت عائشہ کے بھانجے اور قاسم ان کے بھتیجے ہیں اور ان دونوں کی حضرت عائشہ نے ہی پرورش کی ہے کوفہ کے مسروق بن الاجدع حضرت عائشہ کے متبنیٰ اور بے پاک ہیں۔ علقمہ کی حضرت عبداللہ بن مسعود نے علمی تربیت فرمائی ہے اور ان کو براہ راست فاروق اعظم، علی مرتضیٰ، ابو الدرداء اور عثمان غنی سے استفادے کا موقعہ ملا ہے۔ اسود بھی علقمہ کے بھائی اور ابراہیم نخعی کے ماموں ہیں۔ یہ ایک نمونہ ہے، ورنہ سارا گلستان ہی سدا بہار ہے۔ ان تابعین کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک ایک شخص نے صحابہ سے مل کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم کیے ہیں اور آپ کے ارشادات، خلفاء راشدین کے عدالتی فیصلوں اور فتاویٰ کے متعلق واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ احادیث کا اکثر و بیشتر ذخیرہ ان ہی تابعین کی وساطت سے ان کے تلامذہ کے ذریعے امت کو وراثت میں ملا ہے۔ یہ ان ہی کے تلامذہ ہیں جنہوں نے اپنے ان اساتذہ کے علوم کو سینوں سے صحیفوں میں منتقل کیا ہے۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ جن کی تفصیل ہم اوپر پڑھ چکے ہیں ذرا ایک نظر اس نقشہ پر بھی ڈال لیجیے تاکہ اس دور کی تالیفات کا پورا اندازہ ہو سکے۔ یہ نقشہ ہم نے الکتانی کی کتاب الرسالۃ المستطرفہ سے تیار کیا ہے ہم یہاں صرف مصنفین کے اسمائے گرامی پیش کرتے ہیں۔

سنہ ۱۵۰ھ	امام اعظم ابو حنیفہ	کتاب الآثار
سنہ ۱۷۹ھ	امام مالک بن انس	موطا
سنہ ۱۵۱ھ	عبدالملک بن عبدالعزیز	کتاب السنن
سنہ ۱۹۶ھ	وکیع بن الجراح	کتاب السنن
سنہ ۱۶۷ھ	حماد بن سلمہ	کتاب السنن
سنہ ۱۶۱ھ	سفیان الثوری	جامع
سنہ ۱۹۸ھ	سفیان بن عیینہ	جامع
سنہ ۱۵۳ھ	معمر بن راشد	جامع
سنہ ۱۸۹ھ	محمد بن الحسن الشیبانی	کتاب الآثار

سنہ	مؤلف	کتاب
سنہ ۱۸۲ھ	عبداللہ بن المبارک	کتاب الجہاد
سنہ ۱۸۲ھ	قاضی ابو یوسف	کتاب الذکر والدعاء
سنہ ۱۵۳ھ	محمد بن اسحاق	کتاب السیرت
سنہ ۱۴۱ھ	موسیٰ بن عقبہ	المغازی
سنہ ۱۸۷ھ	المعتمر بن سلیمان	المغازی

ان کے علاوہ علامہ ابن الندیم نے جن مؤلفین کی نشاندہی کی ہے ان پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجئے

سنہ	مؤلف	کتاب
سنہ ۱۵۹ھ	محمد بن عبدالرحمٰن ابن ابی ذئب	کتاب السنن
سنہ ۱۷۰ھ	عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم	کتاب الناسخ والمنسوخ
سنہ ۱۷۶ھ	عبدالملک بن محمد بن ابی بکر الانصاری	کتاب المغازی
سنہ ۱۹۵ھ	محمد بن الفضل بن غزوان	کتاب السنن
سنہ ۱۱۶ھ	اسماعیل بن علیہ	کتاب التفسیر
سنہ ۱۵۹ھ	عبدالرحمٰن الاوزاعی	کتاب السنن
سنہ ۱۹۴ھ	الولید بن مسلم القرشی	کتاب السنن
سنہ ۱۹۵ھ	اسحاق الازرق	کتاب القرآت
سنہ ۱۶۳ھ	ابراہیم بن طہمان	کتاب السنن، کتاب التفسیر

الغرض اس دوسری صدی میں علم حدیث میں بکثرت تصانیف مدون ہوکر عالم اسلامی میں پھیل چکی تھیں اور امام اعظم، امام مالک کے تلامذہ نے تمام عالم اسلامی کو فقہ وحدیث سے معمور کردیا تھا۔ اسی صدی میں فقہ حنفی اور مالکی کی تدوین ان احادیث و آثار کی روشنی میں مکمل ہوئی کہ جن پر فقہاءِ صحابہ و تابعین اور ارباب فتویٰ کا عمل درآمد چلا آرہا تھا۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

اور جو شخص کہ ان مذاہب کے اصول پر مطلع ہے وہ اس بارے میں کوئی شک نہیں کرے گا کہ ان مذاہب کی اصل فاروق اعظم کے اجماعی مسائل ہیں اور یہ ان مذاہب میں ایک امر مشترک ہے۔ اس کے بعد اہل مدینہ میں سے فقہاءِ صحابہ جیسے کہ حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ ہیں اور کبار تابعین فقہاءِ سبعہ اور صغار تابعین مدینہ میں سے زہری اور ان جیسے حضرات پر اعتماد امام مالک کے مذہب کی بنیاد ہے اور اسی طرح حضرت

عبداللہ بن مسعود کے اکثر حالات میں اعتماد اور حضرت علی کے فیصلوں پر بعض حالات میں بشرطیکہ ان فیصلوں کو حضرت عبداللہ بن مسعود کے اصحاب روایت کرتے اور مانتے ہوں اور اس کے بعد ابراہیم نخعی اور شعبی کی تحقیقات اور ان کی تخریجات پر اعتماد امام ابوحنیفہ کے مذہب کی بنیاد ہے[1]

مصنفین اور تلامذہ امام اعظمؒ

آپ اس صدی میں علم حدیث پر مصنفین کے حالات رجال کی کتابوں میں پڑھیں آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان میں بیشتر امام اعظم کے تلامذہ ہیں یا پھر وہ ہیں جو امام اعظم کے علمی جلال سے بے حد متاثر ہیں کیونکہ اس زمانے میں امام اعظم کے تلامذہ اسلامی دنیا کے چپہ چپہ پر پھیلے ہوئے تھے اور ہر جگہ علوم اسلامی کی نشر و اشاعت کر رہے تھے۔

حافظ عبدالقادر قرشی نے کتاب التعلیم کے حوالہ سے امام اعظم کے تلامذہ کی تعداد چار ہزار بتائی ہے اور امام حافظ الدین محمد بن محمد الکردری نے امام اعظم کے خاص تلامذہ کا ذکر کرنے کے بعد من روی عنہ الحدیث والفقہ کا عنوان قائم کرکے ان کا شہروار تذکرہ کیا ہے۔ ان شہروں کو آپ دیے ہوئے نقشہ سے معلوم کر سکتے ہیں۔

امام طحاوی نے ان چار ہزار میں سے چالیس کو مدونین اور مصنفین کتب میں شمار کیا ہے حافظ عبدالقادر نے اسد بن عمرو کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ:

كان من اصحاب ابى حنيفة الذين دوّنوا الكتب اربعين رجلاً[2]

اصحاب ابوحنیفہ میں جو ارباب تصنیف ہیں ان کی تعداد چالیس ہے۔

اسد بن عمرو کا بھی شمار ان چالیس میں ہے ان کے بارے میں حافظ ابونعیم کی تصریح ہے کہ ـــ اول من كتب كتب ابى حنيفة اسد بن عمرو[3] ـــ حافظ ابوجعفر طحاوی نے چالیس کی جو تعداد بسند متصل اسد بن الفرات[4] کے حوالہ سے بتائی ہے ان میں سے قاضی ابو یوسف، امام

---

[1] قرۃ العینین ص ۱۰۱۔ [2] الجواہر المضیۃ ج ا ص ۱۴۰ [3] ایضاً ج ۲ ص ۲۴۰۔
[4] یہ بزرگ قیروان کے مشہور قاضی ہیں امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوتے دوران درس پوچھتے بہت زیادہ تھے امام مالک نے ان کو کوفہ جانے کا مشورہ دیا، کوفہ میں امام ابو یوسف اور امام محمد سے استفادہ کیا، علامہ

(باقی صفحہ ۴۲۴ پر)

محمد، امام زفر[3]، وکیع[4] بن الجراح، یحییٰ[5] بن زکریا، اور عبداللہ[6] بن المبارک کے بارے میں تو آپ پڑھ چکے ہیں کہ یہ ارباب تصنیف ہیں —— باقی کے حالات پر تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ آپ کو امام اعظم اور علم الشرائع میں ملے گا۔ یہ اوراق اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اس لیے صرف ان کے اسمائے گرامی پیش کرتا ہوں۔

امام داؤد[7] نصیر الطائی سنہ ۱۶۰ھ، امام حفص[8] بن غیاث سنہ ۱۹۴ھ، امام یوسف[9] بن خالد التیمی سنہ ۱۸۹ھ، امام عافیہ[10] بن یزید سنہ ۱۸۰ھ، امام حبان[11] بن علی سنہ ۱۷۲ھ، امام مندل[12] بن علی سنہ ۱۶۸ھ، امام علی[13] بن مسہر سنہ ۱۸۹ھ، امام القاسم[14] بن معن سنہ ۱۷۵ھ، امام اسد[15] بن عمرو سنہ ۱۸۸ھ، امام فضل[16] بن موسیٰ السینانی سنہ ۱۹۲ھ، امام علی[17] بن ظبیان سنہ ۱۹۲ھ، امام ہشام[18] بن یوسف سنہ ۱۹۷ھ، امام یحییٰ[19] بن سعید القطان سنہ ۱۹۸ھ، امام شعیب[20] بن اسحاق دمشقی سنہ ۱۹۸ھ، امام حفص[21] بن عبدالرحمٰن بلخی سنہ ۱۹۹ھ، امام حکم[22] بن عبداللہ بلخی سنہ ۱۹۹ھ، امام خالد[23] بن سلیمان بلخی سنہ ۱۹۹ھ، امام عبدالحمید[24] بن عبدالرحمٰن سنہ ۲۰۲ھ، امام ابو عاصم[25] ضحاک بن مخلد سنہ ۲۱۲ھ، امام مکی[26] بن ابراہیم سنہ ۲۱۵ھ، امام حماد[27] بن دلیل سنہ ھ، امام عبداللہ[28] بن ادریس سنہ ھ، امام فضیل[29] بن عیاض سنہ ۱۸۷ھ، امام ہشیم[30] بن بشیر سنہ ۱۸۳ھ، امام نوح[31] بن دراج الجامع سنہ ۱۸۳ھ، امام زہیر[32] بن معاویہ سنہ ۱۷۳ھ، امام شریک[33] بن عبداللہ قاضی سنہ ھ، امام نصر[34] بن عبدالکریم سنہ ۱۶۹ھ، امام مالک[35] بن مغول سنہ ۱۵۹ھ، امام جریر[36] بن حازم سنہ ۱۷۰ھ، امام جریر[37] بن عبدالحمید سنہ ۱۸۸ھ، امام الحسن[38] بن زیاد سنہ ۲۰۴ھ، امام حماد[39] بن ابی حنیفہ سنہ ۱۷۶ھ، امام ابو عصمہ[40] نوح بن مریم سنہ ۱۷۳ھ۔

بہرحال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ وہ زمانہ ہے جس میں علم حدیث کی کتابی خدمت کی گئی ہے اور اس خدمت کا فرض امام اعظم اور امام مالک کے تلامذہ نے انجام دیا ہے۔ تیسری صدی میں آنے والے محدثین بخاری و مسلم و دیگر ارباب سنن اور مسانید نے ان ہی سے علم حدیث حاصل کیا ہے۔

صفحہ ۴۲۳ کا بقیہ حاشیہ) ابو اسحاق الشیرازی نے طبقات الفقہاء میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ موصوف مصر تشریف لے گئے اور مالکی مذہب کے ترجمان عبداللہ بن وہب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ھذہ کتب ابی حنیفۃ یہ امام اعظم کی کتابیں ہیں مجھے کچھ سوالات کے جوابات مذہب مالک کے مطابق درکار ہیں۔ ابن وہب طرح دے گئے وہاں سے ابن القاسم کے پاس آئے اور پھر قیروان واپس آ گئے۔ لکھا ہے کہ قیروان میں ابوحنیفہ کی کتابوں کے صدقے ہی ان کو علمی جلال ملا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کتابوں کی ایک نقل ابن القاسم کی درخواست پر موصوف نے ابن القاسم کو بھی دی (الانتقاء ص ۵۰)

تیسری صدی میں علم حدیث

کتاب الآثار سے پہلے پہلی صدی میں جس قدر صحیفے اور مجموعے تیار ہوئے ان کی ترتیب فنی نہ تھی بلکہ ان کے جامعین نے تفسیر، سیرت، مناقب، احکام، مغازی سب قسم کی حدیثوں کو یکجا کرنے اور سمیٹنے کی کوشش کی اور اس کوشش کا اولین سہرا یقیناً ان کے سر ہے۔ امام شعبی نے بے شک حسب تصریح حافظ سیوطی بعض مضامین کی حدیثوں کو ایک ہی باب کے تحت لکھا تھا لیکن یہ کوشش بالکل ابتدائی تھی اس لیے احادیث کو کتابوں اور بابوں پر پوری طرح مرتب کرنے کا کام ابھی باقی تھا جسے امام اعظم نے کتاب الآثار تصنیف کر کے نہایت خوش اسلوبی سے مکمل فرمایا اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے ترتیب و تبویب کی ایک عمدہ مثال قائم کر دی۔ نیز دوسری صدی تک حدیث و فقہ یکجا تھے اور احادیث مرفوعہ کے ساتھ صحابہ کے اقوال اور فتاویٰ سے بھی استدلال کیا جاتا تھا۔ مسند و مرسل اور صحیح و حسن کی کوئی تقسیم نہ تھی۔ چنانچہ اسی اساس پر دوسری صدی میں ساری کتابیں مرتب ہو کر منصۂ صحافت پر آئیں۔

علم حدیث میں کثرت طرق

تیسری صدی میں علم حدیث کو فنی ترقی ہوئی اور اس فن کے ایک سے زیادہ شعبے رونما ہو گئے محدثین نے طلب حدیث میں دنیائے اسلام کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ ایک ایک شہر ایک ایک گاؤں میں پہنچ کر تاریخ سنت کو اس قدر مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم کر دیا ایک ایک حدیث کے لیے ایک سے زیادہ سندیں تلاش کیں تا آنکہ فن کے لحاظ سے وہ حافظ حدیث فن حدیث میں یتیم شمار ہونے لگا جسے ایک حدیث کم از کم سو سندوں سے معلوم نہ ہو۔ چنانچہ ابواسحاق جوہری جو امام مسلم اور دوسرے محدثین صحاح کے استاد ہیں فرماتے ہیں:

کل حدیث لا یکون عندی من مائۃ طرق فانا فیہ یتیم

حدیث اگر میرے پاس سو طریقوں سے نہ ہو تو میں حدیث میں یتیم ہوں۔[1]

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے الروض الباسم میں بعض حفاظ حدیث کی طرف نسبت کر کے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۹۔

لکھا ہے کہ واقع میں ابوبکر الصدیق کی حدیثیں تو پچاس سے زیادہ نہیں ہیں مگر حفاظ حدیث کے پاس ابوبکر کی حدیثوں پر مشتمل ضخیم کتاب دیکھ کر ان سے دریافت کیا گیا کہ ابوبکر کی حدیثیں تو زیادہ سے زیادہ پچاس ہیں مگر یہ کتاب مسند ابی بکر کے نام سے کیسی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک حدیث مجھے کم از کم سو طریقوں سے دستیاب نہ ہو تو اپنے آپ کو حدیث میں یتیم سمجھتا ہوں۔ دوسری صدی کے مؤلفین براہ راست مشاہیر تابعین یا کبار تبع تابعین کے شاگرد تھے۔ بدیں وجہ ان کے یہاں کثرت طرق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور امام اعظم نے زمانہ صحابہ پایا ہے اس لیے ان کی ذات کے بارے میں طرق و اسانید کی بہتات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس کثرت طرق کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیسری صدی میں ایک ایک شخص حفظ حدیث میں ترقی کے آخری مقام پر پہنچ گیا۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ میں نے مسند کو سات لاکھ حدیثوں سے منتخب کیا ہے امام ابو زرعہ رازی کہتے ہیں کہ امام احمد کو ایک کروڑ حدیثیں نوک زبان تھیں — امام یحیی بن معین کہتے ہیں کہ میں نے ایک کروڑ حدیثیں اپنے قلم سے لکھی ہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث زبانی یاد ہیں۔ امام مسلم کہتے ہیں کہ میں نے صحیح تین لاکھ حدیثوں سے لکھی ہے۔ ابو داؤد کہتے ہیں کہ میں نے پہلے پانچ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں اور سنن اسی کا انتخاب ہے۔ امام حاکم نے مدخل میں لکھا ہے کہ ایک ایک حافظ پانچ لاکھ حدیثیں یاد رکھتا تھا۔ ابوبکر محمد بن عمر رازی کہتے ہیں کہ حافظ ابو زرعہ رازی کو سات لاکھ حدیثیں یاد تھیں [1]

محدثین و حفاظ کے مراتب

کثرت طرق کی وجہ سے علم حدیث میں حدیث کے فن کاروں کے مراتب قائم ہوئے، مسند، شیخ، حافظ، محدث، حجۃ اور حاکم کی اصطلاحیں رونما ہو گئیں۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے منظومہ علم الاثر میں، حافظ زین الدین عراقی نے الفیہ میں اس پر بحث فرمائی ہے لیکن دوسری صدی کے مؤلفین میں یہ مراتب نہ تھے ان کے یہاں محدث اور حافظ کو ایک ہی معنے میں بولتے ہیں چنانچہ حافظ جلال الدین السیوطی لکھتے ہیں:۔

---

[1] تدریب الراوی ص ۱۲۔

قد کان السلف یطلقون المحدث والحافظ لمعنی [1]

سلف کے نزدیک محدث اور حافظ کے ایک ہی معنے تھے۔

تیسری صدی میں اہل حدیث، صاحب حدیث یا محدث اس وقت تک کسی کو نہ کہا جاتا جب تک بیس ہزار حدیثیں قلم بند نہ کرے چنانچہ حافظ ابو سعد اسحاق نے حافظ ابو زرعہ الرازی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

جو شخص بیس ہزار احادیث نہیں لکھتا اس کا شمار اہل حدیث میں نہیں ہو سکتا۔

جب کہ تیسری صدی میں محدث ہونے کے لیے صرف حفظ حدیث ہی کافی تھا چنانچہ ہشیم بن بشیر امام احمد کے استاد فرماتے ہیں:

جو شخص حفظ حدیث نہیں کرتا وہ ہرگز محدث نہیں ہے [2]

بالآخر ترقی کر کے تیسری صدی میں محدث ہونے کے لیے اہل حق سے ہونے کی گرفت بھی ڈھیلی کر دی گئی اور اہل حدیث صرف فن کاروں کے لیے استعمال ہونے لگا حتیٰ کہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے اعلان کر دیا کہ:

ھؤلاء ھم اھل الحدیث من ای مذھب کانوا وکذالک اھل العربیۃ واھل اللغۃ فان اھل کل فن ھم اھل المعرفۃ فیہ۔

خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھنے والے ہوں اہلحدیث ہیں جیسے اہل لغت اور اہل عربیت، اہل فن وہ ہی کہلاتے ہیں جو اس میں فنکار ہوں [3]

جب کہ دوسری صدی کے مؤلفین احادیث لینے میں تدین کو پیش نظر رکھتے تھے۔ امام مسلم نے مقدمہ میں سید التابعین امام ابن سیرین کے بارے میں بتایا ہے کہ:

یہ علم دین ہے یہ دیکھ کر لے کس سے لیتے ہو اپنا دین۔

امام بیہقی نے ابراہیم نخعی کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں،

ہمارے یہاں دستور یہ تھا کہ جب کسی سے حدیث لینی ہوتی تو اس

---

[1] تدریب الراوی ص ۸۔ [2] تدریب۔ [3] الروض الباسم ص ۱۲۲۔

کے اخلاق دیکھتے، اس کی نماز دیکھتے، اس کے احوال کی چھان بین کرتے
پھر اس سے حدیث لیتے[1]

حدیث میں مؤلفات کا توسع

علم حدیث کی اسی پہنائی اور وسعت کا تصنیف و تالیف پر بھی تیسری صدی میں اثر پڑا اور اس کے نتیجے میں جوامع اور سنن کے ساتھ تصنیف و تالیف کی بے شمار انواع و اقسام منصۂ صحافت پر آ گئیں مثلاً۔

مسانید، مصنفات، صحاح، مستخرجات، اجزاء، معاجم، طبقات، موضوعات، مشیخات، العلل، العوالی، الاطراف، الزوائد، تخریجات، الافراد، الغرائب وغیرہ وغیرہ۔

دوسری صدی کے مؤلفین چونکہ براہ راست مشاہیر تابعین یا کبار تابعین کے فیض یافتہ تھے۔ اس لیے ان کو اسناد کے بارے میں تحقیقات کی بہت کم ضرورت پیش آتی تھی لیکن تیسری صدی میں اسنادی وسائط پہلے سے کئی گنا بڑھ گئے اس لیے تیسری صدی میں محدثین کو اس سلسلے میں ایک سے زیادہ فنون سے دوچار ہونا پڑا۔ اور جمع روایات، تنقید احادیث اور اصولِ روایت کے سلسلے میں بہت سی ایسی نئی چیزیں پیدا ہو گئیں جن کی بنا پر اس دور کے مصنفین کو حدیث کی تدوین اپنے اپنے مذاق کے مطابق کرنی پڑی اور تصنیف و تالیف میں یہ گوناگوں انواع و اقسام رونما ہوئے۔

علم حدیث میں مسانید کی تالیف

سب سے پہلے تیسری صدی کے مؤلفین نے حدیث کو آثارِ صحابہ سے علیحدہ کر کے مسند حدیثیں جمع کیں۔ ہر راوی کی تمام پریشان اور غیر مرتب روایات کو یکجا کیا اور اس طرح مسانید کی تصنیف کا آغاز ہوا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تیسری صدی کے مشاہیر محدثین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> تا آنکہ کچھ ائمہ کی یہ رائے ہوئی کہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مستقل طور پر علیحدہ کیا جائے اور یہ تیسری صدی کے آغاز میں ہوا چنانچہ عبید اللہ

---

[1] التعلیق علی توضیح الافکار ج ۲ ص ۱۱۵۔

بن موسیٰ کوفی، مسدد بن مسرہد بصری، اسد بن موسیٰ اموی اور نعیم بن حماد خزاعی نے ایک ایک مسند تصنیف کی۔ دوسرے ائمہ بھی ان کے نقش قدم پر چلے اور حفاظ حدیث میں مشکل ہی سے کوئی امام ہوگا کہ جس نے اپنی احادیث کو مسانید پر مرتب نہ کیا ہو چنانچہ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور عثمان بن ابی شیبہ اور ان جیسے دیگر اکابر نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور بعض محدثین نے جیسے ابوبکر بن ابی شیبہ ابواب و مسانید دونوں عنوانوں پر کتابیں لکھیں [1]

امام حاکم المدخل میں رقمطراز ہیں:

یہ مسانید جو اسلام میں تصنیف ہوتے ہیں صحابہ کی مرویات ہیں ان کا سلسلہ سند معتبر اور مجروح ہر قسم کے راویوں پر مشتمل ہے مثلاً مسند عبید اللہ بن موسیٰ اور مسند ابی داؤد طیالسی۔ یہ دونوں پہلے شخص ہیں۔ جنہوں نے مسانید لکھی ہیں ان دونوں کے بعد احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، زہیر بن حرب اور عبید اللہ بن عمر قواریری نے مسانید ترتیب دیے۔ بعد ازیں کثرت سے تراجم رجال پر مسانید مرتب ہوئے اور ان سب کے جمع کرنے میں صحیح و سقیم کے امتیاز کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا [2]

علامہ محمد بن اسماعیل یمانی نے مسند کی یہ تعریف کی ہے کہ:

ان یذکر فیہ ما ورد عن ذالک الصحابی جمیعہ فیجمع الضعیف و غیرہ [3]

الکتانی نے جو مسند کی تعریف فرمائی ہے وہ بھی گوش گزار فرمالیجئے:

وہ کتابیں جن کا موضوع صرف یہ ہے کہ ہر صحابی کی حدیثوں کو الگ الگ بیان کیا جائے چاہے یہ صحیح ہوں یا ضعیف، ان کی ترتیب اسماء صحابہ میں حروف ہجا کے مطابق ہوتی ہے [4]

---

[1] الہدی الساری مقدمہ فتح الباری ص ۵۔ [2] المدخل ص ۴۔ [3] توضیح الافکار ج ا ص ۲۲۶
[4] الرسالۃ المستطرفہ ص ۵۲۔

گویا مصنفین مسانید کا پیش نہاد صرف یہ ہوتا ہے کہ حدیث کے تمام منتشر ذخیرے کو یکجا کر دیا جائے اور ایک صحابی کی جس قدر روایتیں مل سکتی ہیں ان کو سمیٹ دیا جائے اور چونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر راوی کی ہر روایت صحیح سند ہی سے منقول ہو اس لیے جس سند سے اور جس طریقے سے بھی وہ روایت مصنف کو پہنچی وہ اسے بالسند درج کر دیتا ہے۔ بدیں وجہ صرف صحیح روایات کی یکجائی ان کے موضوع سے خارج اور ان کی شرطِ تصنیف کے منافی ہے کیونکہ ان کی شرط تو صرف یہ ہوتی ہے کہ ایک صحابی کے نام سے تمام کچا پکا، صحیح اور غیر صحیح، قوی و غیر قوی، قابلِ قبول اور ناقابلِ قبول سرمایہ ہر طرف سے تلاش اور جستجو کے بعد فراہم کر دیا جائے تاکہ کوئی روایت مدون ہونے سے نہ رہ جائے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں:

وشرط اھلھا ان یفردوا حدیث کل صحابی علیحدۃ من غیر نظر
الی الابواب ویستقصون جمیع حدیث ذالک الصحابی کلہ سواء
رواہ من یحتج بہ ام لا فقصدھم حصر جمیع ماروی عنہ[1]

اس کا مطلب یہی ہے کہ اہلِ مسانید کے پیشِ نظر ہر قسم کے سرمایہ کی فراہمی ہوتی ہے۔ شاید آپ خلش محسوس کریں کہ اس فراہمی سے ان بزرگوں کا مقصد کیا تھا وہ ایسا کیوں کر رہے تھے؟

دراصل ان بزرگوں کا مقصد یہ تھا کہ جب یہ سارا ذخیرہ یکجا ہو کر آجائے گا تو اہلِ فن اصولِ تنقید اور قواعدِ روایت کے مطابق ان تمام روایات کی جانچ پڑتال کر کے ہر روایت کے بارے میں رائے قائم کر سکیں اور ساتھ ہی ایک ایک حدیث کے لیے طرق و اسانید کا بیش بہا ذخیرہ جمع ہو کر حدیث کے روایتی اسنادی استحکام کا ذریعہ ہو جائے۔ چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں:

ھذہ المسانید الکبار التی یذکر فیھا طرق الاحادیث[2]

ان مسانید سے حدیث کے طرق اور اسانید کا علم ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث اگر متعدد صحیح طرق سے آتی ہے تو وہ روایتی نقطہ نظر سے قوی سے قوی تر ہو جاتی ہے اور اگر ضعیف طرق و اسانید سے بھی آئے تو یہ ضعیف طرق صحیح حدیث کے لیے توابع اور شواہد کا کام دیتے ہیں۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں:

---

[1] تنقیح الانظار ج ۱ ص ۲۲۸۔ [2] تنقیح الانظار ج ۱ ص ۲۳۰۔

مالہما من المتابعات والشواھد

اس دور میں اگرچہ مسانید بہت لکھے گئے ہیں مگر ہم اپنے ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے چند مؤلفین کا ذکر کرتے ہیں۔

سنہ	مسند	سنہ	مسند
سنہ ۲۰۴ھ	مسند امام ابی داؤد طیالسی	سنہ ۲۲۴ھ	مسند مسدد بن مسرہد
سنہ ۲۱۳ھ	مسند عبید اللہ بن موسیٰ کوفی	سنہ ۲۲۶ھ	مسند ابی جعفر عبد اللہ بن محمد
سنہ ۲۲۸ھ	مسند یحییٰ بن عبد الحمید حمانی کوفی	سنہ ۲۲۷ھ	مسند ابی جعفر محمد بن عبد اللہ کوفی
سنہ ۲۳۹ھ	مسند ابی اسحاق ابراہیم بن سعید	سنہ ۲۵۲ھ	مسند ابی یعقوب التنوخی
سنہ ۲۵۱ھ	مسند ابی الحسن علی بن الحسن	سنہ ۲۴۲ھ	مسند ابی الحسن محمد بن مسلم
سنہ ۲۹۴ھ	مسند ابی زرعہ رازی	سنہ ۲۶۷ھ	مسند ابی یاسر عمار بن رجاء
سنہ ۲۶۵ھ	مسند ابی بکر احمد بن منصور	سنہ ۲۸۰ھ	مسند ابی سعید عثمان بن سعید
سنہ ۲۶۶ھ	مسند ابی الحسن علی بن عبد العزیز	سنہ ۲۹۰ھ	مسند ابی عبد الرحمٰن نعیم بن الطوسی
سنہ ۲۳۸ھ	مسند ابی یعقوب اسحاق بن ابراہیم	سنہ ۲۴۴ھ	مسند ابی جعفر احمد بن منیع
سنہ ۲۸۲ھ	مسند ابی الحارث بن محمد	سنہ ۲۳۹ھ	مسند ابی الحسن عثمان بن محمد
سنہ ۲۴۳ھ	مسند ابی عبد اللہ محمد بن یحییٰ	سنہ ۲۴۹ھ	مسند عبد بن حمید
سنہ ۲۱۹ھ	مسند ابی بکر عبد اللہ بن الزبیر	سنہ ۲۱۲ھ	مسند محمد بن یوسف الفریابی
سنہ ۲۵۶ھ	مسند احمد بن سنان	سنہ ۲۲۶ھ	مسند الحسین بن داؤد المصیصی
سنہ ۲۹۳ھ	مسند ابی بکر احمد بن عمرو البصری	سنہ ۲۷۶ھ	مسند احمد بن حازم
سنہ ۲۷۲ھ	مسند احمد بن مہدی الاصفہانی	سنہ ۲۵۱ھ	مسند اسحاق بن منصور نیشاپوری
سنہ ۲۷۳ھ	مسند محمد بن ابراہیم بن مسلم	سنہ ۲۵۲ھ	مسند یعقوب بن ابراہیم الدورقی
سنہ ۲۷۴ھ	مسند محمد بن الحسن ابی عبد اللہ	سنہ ۲۶۲ھ	مسند یعقوب بن شیبہ بصری
سنہ ۲۸۹ھ	مسند ابراہیم بن اسمٰعیل	سنہ ۲۸۹ھ	مسند الحسین بن محمد نیشاپوری
سنہ ۲۹۲ھ	مسند احمد بن علی المروزی	سنہ ۲۹۵ھ	مسند ابراہیم بن معقل نسفی
سنہ ۲۴۱ھ	مسند احمد بن حنبل	سنہ ۲۷۶ھ	مسند بقی بن مخلد

مسانید میں اولیت

ان تمام مسانید میں تاریخی طور پر اگرچہ اولیت کا مرتبہ جیسا کہ الحاکم نے لکھا ہے کہ :

اول من صنف المسانید علی تراجم الرجال فی الاسلام عبید اللہ بن موسیٰ العبسی والبوداؤد الطیالسی[1]

عبیداللہ بن موسیٰ کوفی کے مسند کو اوّلیت حاصل ہے کیونکہ مسند طیالسی درحقیقت ابوداؤد طیالسی کی تصنیف نہیں بلکہ اس کے جامع خراسان کے کچھ محدثین ہیں۔ امیر یمانی فرماتے ہیں کہ اس کی حیثیت مسند شافعی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے علامہ بقاعی کہتے ہیں کہ مسند طیالسی کو جن بزرگوں نے اوّلین مسند قرار دیا ہے ان کے پیش نظر صرف یہ ہے کہ مصنفین مسانید میں زمانی لحاظ سے ابوداؤد کا زمانہ سب سے پہلے ہے اور یہ مسند ابوداؤد کی تصنیف ہے مگر یہ واقعہ نہیں ہے بلکہ

انہ لیس من تصنیف ابی داؤد انما جمعہ بعض الحفاظ الخراسانیین[2]

یعنی یہ امام ابوداؤد کی تصنیف نہیں بلکہ بعض خراسانی محدثین نے بعد میں یہ کام انجام دیا ہے۔ اور عبیداللہ بن موسیٰ کے بارے میں محدثین کی تصریح کہ مسند خود ان کا تصنیف کردہ ہے۔ عبیداللہ پر تشیع کی تہمت ہے۔ ابوداؤد نے ان کو شیعہ لکھا ہے۔ الذہبی نے العابد من کبار علماء الشیعہ سے ان کا چہرہ شروع کیا ہے مگر یاد رہے کہ اس دور میں شیعہ ہونے کا مفہوم آج کے مطابق نہ تھا۔ اس دور میں شیعہ ہونے کا صرف یہ مطلب ہوتا ہے کہ حضرت علی کو باقی صحابہ پر مقدم کیا جائے چنانچہ حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں کہ:

التشیع وھو تقدیم علیؓ علی الصحابۃ رضی اللہ عنھم اجمعین[3]

اور شیعہ محترق یا غالی ہونے کا مطلب دوسری صدی میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے یہ بتایا ہے کہ:

التشیعی الغالی فی زمان السلف وعرفھم ھو من تکلم فی عثمان والزبیر وطلحۃ وطائفۃ ممن حارب علیاً و تعرض بسھم[4]

اس لیے عبیداللہ بن موسیٰ کا تشیع بھی اس دور میں اس نوع کا تھا۔ ان کو امام اعظم سے استفادے کا بھی موقعہ ملا ہے۔ چنانچہ امام ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں ان کو دوسرے محدثین کے ساتھ امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے[5]

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ اگر تبویب حدیث اور تدوین شرائع میں اوّلیت کا سہرا امام اعظم کے سر ہے ایسے ہی مسانید کی اوّلیت کا شرف بھی بواسطہ عبیداللہ بن موسیٰ امام اعظم کو ہی حاصل

---

[1] الرسالۃ المستطرفہ ص ۵۲۔ [2] توضیح الافکار ص ۲۲۹۔ [3] تدریب الراوی ص ۲۱۹۔
[4] لسان المیزان ج ۱ ص ۱۷۔ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۹۔

ہے۔ عبیداللہ بن موسیٰ ایک طرف اگر امام اعظم کے تلامذہ میں سے ہیں تو دوسری طرف امام بخاری رحمہ اللہ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ میں عبیداللہ بن موسیٰ کو امام بخاری کے اساتذہ کے پانچ طبقوں میں سے اولین طبقہ میں شمار کیا ہے۔ اس طبقے میں امام بخاری کے اساتذہ یہ ہیں۔ محمد بن عبداللہ انصاری، مکی بن ابراہیم، ابوعاصم النبیل، عبیداللہ بن موسیٰ، ابونعیم، خلاد بن یحییٰ، علی بن عیاش اور عصام بن خالد۔ اور لکھا ہے شیوخ ھؤلاء کلھم من التابعین ان کے اساتذہ تابعین ہیں۔[1]

مسند امام احمد بن حنبلؒ کی عظمت

اگرچہ تاریخی لحاظ سے اقدمیت عبیداللہ بن موسیٰ کو حاصل ہے لیکن اس صدی کے تمام مسانید میں جو شرف اور بلندی مسند امام احمد کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں امام موصوف نے جمع و ترتیب کا کام ۲۲۸ھ میں شروع کیا تھا چنانچہ المنہج میں ہے۔

۲۲۸ھ میں مسند کا کام شروع ہوا تھا۔ (ص ۲)

اس کی تالیف کا پس منظر خود امام نے یہ بتایا ہے کہ اگر علماء میں کبھی کسی حدیث میں اختلاف ہو تو یہ کتاب یعنی مسند احمد اس روایت کے استناد و عدم استناد میں دستاویز کا کام دے سکے چنانچہ امام ممدوح کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد کا بیان ہے۔

> میں نے اپنے والد احمد بن حنبل سے دریافت کیا کہ آپ کتابیں مرتب کرنے سے کیوں منع کرتے ہیں؟ حالانکہ آپ نے خود بھی مسند لکھی ہے آپ نے جواب میں فرمایا۔ یہ کتاب میں نے لوگوں کی رہنمائی کے لیے لکھی ہے جب سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں لوگوں میں کوئی اختلاف رونما ہوگا وہ اس کی طرف رجوع کریں گے۔[2]

اور آپ کے برادر زادے حنبل بن اسحاق کہتے ہیں کہ

> ہم سے امام احمد نے فرمایا کہ اس کتاب کو میں نے ساڑھے سات لاکھ روایتوں سے انتخاب کر کے جمع کیا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] الہدی الساری ص ۵۶۵۔ [2] خصائص المسند از حافظ مدینی ص ۸۔

کی جس حدیث میں مسلمانوں کا اختلاف ہو تم اس کتاب کی طرف رجوع کرو اگر
اس میں وہ روایت مل جائے تو فبہا ورنہ وہ حجت نہیں[1]

اگرچہ مسند کی تالیف کا کام ۱۸۰ھ میں شروع ہوا ہے لیکن امام موصوف اس کی جمع و ترتیب کا کام ساری زندگی کرتے رہے اور یہ کام کچھ اس قدر انہماک کے ساتھ کیا کہ اس کی تبویب، تنظیم اور ترتیب کی طرف متوجہ نہ ہو سکے ان کے پیش نظر صرف جمع و تدوین تھی اس کی خاطر انہوں نے پوری زندگی کے شب و روز صرف کر دیے۔ مسودات کی صورت میں اوراق متفرقہ کا یہ مجموعہ ان کے پاس موجود تھا اور ابھی تشنۂ تکمیل تھا کہ امام ممدوح کو سفر آخرت پیش آگیا۔ حافظ ابوالخیر شمس الدین جزری المصعد الاحمد فی ختم مسند الامام احمد میں فرماتے ہیں:

امام احمد نے مسند کی جمع و تدوین کا کام شروع کیا اسے ورقوں میں الگ الگ لکھا پھر اسے جدا جدا اجزاء میں تقسیم کیا تا آنکہ اس نے ایک مسودے کی صورت اختیار کر لی۔ بعد ازیں تکمیل سے پہلے ہی پیام موت آگیا انہوں نے اپنی اولاد اور اہل بیت کو اسے پہلی فرصت میں سنا ڈالا اور قبل اس کے کہ اس کی تنقیح و تہذیب پوری ہوتی، آپ داعی اجل کو لبیک کہہ گئے اور مسودہ جوں کا توں رہا، پھر ان کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد نے ان روایات کے مشابہ اور مماثل مسموعات بھی اس میں شامل کر دیے[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسند احمد صرف امام کی محنتوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس میں ان کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد کے اضافے بھی ہیں۔ اگرچہ جو کچھ اضافہ ہے اس کا اکثر حصہ عبداللہ بن احمد نے امام احمد ہی سے سنا ہے لیکن یہ وہ حصہ ہے جسے مسند کا املا کراتے وقت امام احمد املا نہیں کرا سکے۔ امام عبداللہ بن احمد کی جلالت شان کا اندازہ کرنا ہو تو طبقات میں ابن یعلی کی شہادت پڑھیے۔

صالح اپنے والد امام احمد سے بہت کم لکھتے ہیں لیکن عبداللہ نے اپنے والد سے اتنی زیادہ روایت کی ہے کہ دنیا میں کوئی ان کا حریف نہیں بن سکتا انہوں نے مسند، تفسیر، ناسخ و منسوخ، تاریخ حدیث، آیات

---

[1] مناقب احمد از ابن الجوزی ص ۱۹۱۔ [2] مقدمہ مسند۔

کتاب اللہ کی تقدیم و تاخیر، جوابات قرآن اور مناسک کبیر و صغیر کا علم حاصل کیا
اس کے علاوہ دوسری مصنفات اور حدیث شیوخ کا مطالعہ کیا چنانچہ ہم
دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکابر شیوخ عبداللہ کی معرفت رجال اور معرفت علل کو
مانتے ہیں عبداللہ طلب حدیث میں ہمیشہ سرگرم رہے غرض سلف سے
خلف تک عبداللہ کے علم و فضل اور جلالت شان کا سب کو یکساں
اقرار ہے[1]

مسند کا موجودہ نسخہ امام موصوف کے صاحبزادے عبداللہ ہی کا ترتیب دادہ ہے اس میں انہوں نے
اپنے والد کی جمع کی ہوئی حدیثوں کو ایک خاص طریق پر یکجا کیا ہے۔ عبداللہ کے بعد کچھ محدثین نے
اس ترتیب کو بدلنے کی خواہش کی ہے عبداللہ کی ترتیب پر حافظ ذہبی تنقید کرتے ہوتے
رقمطراز ہیں:

اگر امام عبداللہ مسند کو صحیح مرتب کر دیتے تو کیا اچھا ہوتا۔ شاید اللہ سبحانہ
اپنے کسی بندے کو توفیق دے کہ وہ اس کی خدمت کرے اس پر عنوان
قائم کرے اور اس کے رجال پر بحث کرے اس کی وضع و ہیئت بدل
دے اس مجموعہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا کثیر حصہ موجود
ہے اور بہت کم ایسا ہے کہ صحیح حدیث تو ہو لیکن اس مجموعہ میں نہ ہو۔
البتہ حسان کا استیعاب اس میں نہیں ہے گو اکثر یہ بھی موجود ہیں باقی
غریب اور ضعیف روایات تو ان کی مشہور روائتیں اس میں موجود ہیں۔
ہاں ان حدیثوں کا بڑا حصہ چھوڑ دیا ہے جو سنن اربعہ اور معجم طبرانی وغیرہ
میں موجود ہے[2]

باوجودیکہ اس میں جیسا کہ حافظ شمس الدین الحسینی نے التذکرہ برجال العشرہ میں تصریح کی ہے
چالیس ہزار حدیثیں آگئی ہیں پھر بھی احادیث صحیحہ کی بہت بڑی تعداد اس میں درج ہونے سے
رہ گئی ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

امام احمد سے اس کتاب میں بہت سی صحیح حدیثیں چھوٹ گئی ہیں،

---

[1] طبقات الحنابلہ ص ۱۳۳۔ [2] مقدمہ المسند ص ۴۰۔

باوجودیکہ کوئی اور مسند کثرتِ احادیث اور حسنِ ادا میں اس کے ہم پلہ نہیں
ہے بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ جماعتِ صحابہ میں دوسو کے قریب ایسے حضرات
کی روایتیں اس میں موجود نہیں کہ جن سے صحیحین میں احادیث آئی ہیں[1]

کیا مسند میں موضوع احادیث بھی ہیں؟

یہ سوال بھی اربابِ تحقیق کے یہاں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس موضوع پر محدثین اور محققین نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اون کا خلاصہ یہ ہے کہ حافظ عراقی کو اس پر اصرار ہے کہ مسند میں بہت سی حدیثیں ضعیف ہیں اور موضوع بھی ہیں لیکن موضوع کم ہیں۔ حافظ عراقی نے اپنے اس دعوے کی دلیل میں ان حدیثوں کی نشاندہی کی ہے جن کے بارے میں اہلِ فن کہتے ہیں کہ یہ حدیثیں موضوع ہیں۔ چنانچہ حافظ ابوموسیٰ المدینی نے ان میں سے بعض روایات کا خصائص المسند میں تذکرہ کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے القول المسدد فی الذب عن مسند احمد میں ان احادیث پر پیدا شدہ اعتراضات کا جواب دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ مسند میں کوئی حدیث موضوع نہیں ہے۔ حافظ ابن تیمیہ اسے تو تسلیم کرتے ہیں کہ مسند میں کچھ حدیثیں ضعیف ہیں لیکن یہ نہیں مانتے کہ امام احمد کی روایت کردہ کوئی حدیث مسند میں موضوع بھی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

مسند میں روایت کی شرط انہوں نے یہ رکھی ہے کہ کسی ایسے راوی سے روایت نہیں لیں گے جو دروغ گوئی میں ان کے یہاں معروف ہو ہاں ان کے صاحبزادے عبداللہ نے مسند میں کچھ اضافے کیے ہیں بعد ازیں عبداللہ کے شاگرد ابوبکر قطیعی نے بہت سی موضوع حدیثیں زیادہ کر دی ہیں۔ حقیقتِ حال سے ناواقف لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ موضوع حدیثیں بھی امام احمد ہی کی روایت کردہ ہیں حالانکہ یہ خیال سراپا غلط ہے[2]

حافظ ابن حجر عسقلانی بھی حافظ ابن تیمیہ کے اس میں ہم زبان ہیں مگر تین یا چار حدیثوں کے بارے میں ان کو خود تامل ہے۔ چنانچہ تعجیل المنفعۃ میں فرماتے ہیں کہ:

مسند میں تین یا چار حدیثوں کے سوا کوئی بے اصل یا موضوع نہیں ہے[3]

علامہ ابن الجوزی نے ان لوگوں کی بڑی شدومد سے تردید کی ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ

---

[1] اختصار علوم الحدیث ص ۷۔ [2] منہاج السنۃ ج ۴ ص ۲۷۔ [3] تعجیل المنفعۃ

مسند میں کوئی حدیث ضعیف نہیں ہے۔ پروفیسر محمد ابوزہرہ نے اپنی مشہور کتاب "احمد بن حنبل" میں ابن الجوزی کی کتاب صید الخاطر سے جو اقتباس نقل کیا ہے اس میں فرماتے ہیں:۔

مجھ سے بعض اصحاب حدیث نے دریافت کیا کہ مسند میں کچھ حدیثیں ایسی ہیں جو صحیح نہیں ہیں میں نے کہا کہ ہاں۔ میری یہ بات ان لوگوں پر گراں گزری جو مذہب حنبلی سے تعلق رکھتے ہیں میں نے ان لوگوں کی حرکت کو اس پر محمول کیا کہ یہ گروہ عوام ہے اور ان کی بات ناقابل التفات ہے۔ اسی دوران ان لوگوں نے فتوے لکھے ہیں ان کی اس حرکت پر بے حد حیران ہوا اور دل میں کہا کہ کس قدر حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ اہل علم بھی عوام جیسی باتیں کرتے ہیں اور یہ بات صرف اس لیے ہے کہ انہوں نے حدیث کا نام تو سن لیا مگر ان کو صحیح اور سقیم کی پرکھ نہیں ہے

بہر حال اس موضوع پر علماء کی آراء مختلف ہیں اور یہ بات ہمیشہ سے بحث و نظر کا مرکز رہی ہے کہ مسند میں کوئی روایت موضوع موجود ہے یا نہیں۔ ہمیں اس سلسلے میں حافظ ابن تیمیہ کا وہ فیصلہ پسند ہے جو انہوں نے اسی سے متعلق اپنی کتاب "التوسل والوسیلہ" میں درج کیا ہے۔

اگر موضوع سے مراد یہ ہے کہ کسی کذاب راوی کی حدیث مسند میں ہے تو یہ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے اور اگر مقصود یہ ہے کہ حضور کی کوئی بات کسی ایسے راوی کی راہ سے آئی ہے جو غلط گو یا حافظ کی کمی کا شکار ہے تو یہ بالکل درست ہے مسند اور سنن میں ایسی حدیثیں موجود ہیں[1]

کچھ ہو لیکن مسند احمد کی اس خصوصیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسند احمد دوسرے تمام مسانید سے زیادہ صحیح ہے جیسا کہ حافظ نورالدین ہیثمی نے غایۃ المقصد فی زوائد المسند میں تصریح کی ہے:

مسند احمد اصح صحیحاً من غیرہ

مسند احمد دوسرے مسندوں سے زیادہ صحیح ہے۔

اگرچہ مسند بقی بن مخلد مسند احمد سے زیادہ وسعت رکھتا ہے جیسا کہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر کی

---

[1] التوسل والوسیلہ۔

بتاتے ہے کہ:

ومن اوسعها مسند بقی بن مخلد[1]

مسانید میں سب سے وسیع مسند بقی بن مخلد ہے

اور اس کی وسعتوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ اس میں تیرہ سو صحابہ سے زیادہ اکابر کی روایات کا ذخیرہ ہے[2] اور اس میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ بیک وقت مسند بھی ہے اور مصنف بھی۔ اولاً کتاب کو صحابہ کے ناموں پر مرتب کیا ہے اور پھر صحابی کی روایات کو بترتیب فقہی یکجا کیا ہے اس لحاظ سے یہ کتاب مسند اور مصنف دونوں کا کام دیتی ہے لیکن اس کے باوجود مسند احمد جیسی اسے مقبولیت نہیں ہے بہر حال مسند احمد اس دور کے تمام مسانید میں اعلیٰ، اشرف اور احادیث کا بہت بڑا مجموعہ ہے ـــــ خیر یہ بات تو ایک ضمنی تھی کہ تیسری صدی میں سنن اور جوامع کے ساتھ مسانید بھی منصۂ صحافت پر آگئے۔

آپ ان تمام مسانید کے مصنفین، ان کی تاریخ وفات، ان کے اوطان کو دیکھئے آپ خود محسوس کریں گے کہ اس وقت کے تمام عالم اسلامی کے سارے شہروں میں حدیث کا چرچا عام ہو چکا ہے اور کوئی شہر بھی ایسا نہیں ہے جہاں حدیث نبوی نہ پہنچی ہو۔ ۲۹۵ھ میں اس صدی کا آخری مسند ہے۔ اس وقت کی اسلامی فتوحات کے نقشہ کو سامنے رکھ کر بتائیے کون سی جگہ ہے جہاں ارشادات نبوت کو اپنایا نہ گیا ہو۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب امام اعظم کے تلامذہ ہر جگہ پہنچ گئے تھے۔ حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ:

روی عنہ من المحدثین والفقہاء عدۃ لا یحصون

اگر آپ تاریخ میں ان اکابر ارباب مسانید کے علمی نسب ناموں کو تلاش کریں گے تو آپ کو ان کے علمی رشتے امام اعظم سے ملے ہوئے نظر آئیں گے۔ عبید اللہ بن موسیٰ کے بارے میں آپ سن چکے ہیں۔ امام احمد بن حنبل جو رئیس المحدثین ہیں ان کے بارے میں محدثین کی تصریحات یہ ہیں۔ امام ذہبی نے تاریخ الاسلام میں ان کے اساتذہ کی ایک طویل فہرست دی ہے اور ان میں امام ہیثم بن بشیر، امام جریر بن عبد الحمید، امام عباد بن العوام، یحییٰ بن ابی زائدہ، قاضی ابو یوسف، وکیع بن الجراح، یزید بن ہارون اور عبد الرزاق کا نام نمایاں طور پر لیا ہے اور ان سب کے متعلق امام بخاری نے تاریخ کبیر

---

[1] توضیح الافکار ص ۲۲۹ [2] التعلیقات الاحمد محمد شاکر علی اختصار علوم الحدیث ص ۱۸۶۔

ہیں اور حافظ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں شہادت دی ہے کہ یہ سب کے سب امام اعظم کے "تلامذہ" ہیں۔ امام وکیع بن الجراح کہتے ہیں کہ کوفہ میں اس جیسا نوجوان کوئی نہیں آیا۔ یہی بات امام اعظم کے دوسرے شاگرد حفص بن غیاث نے بھی کہی ہے۔ امام اعظم کی مجلس تدوین کے رکن رکین اور تلمیذ یحییٰ القطان بھی امام احمد کے اساتذہ میں سے ہیں۔ امام ذہبی نے ان کا اقرار بھی اس قسم کا نقل کیا ہے۔ الغرض ان ارباب مسانید میں بالواسطہ یا بلاواسطہ ہر ایک کا شجرۂ علمی امام اعظم سے ملتا ہے۔

علمِ حدیث میں مصنّفات

اس صدی میں مسانید کے ساتھ مصنّفات بھی منصۂ صحافت پر آ گئے۔

مصنّف سے مراد اصطلاحِ محدثین میں وہ کتابیں ہیں جن میں احکام اور ان سے متعلق باتیں ترتیب فقہی یکجا ہوں۔ مصنف اور جامع میں تھوڑا سا فرق ہے۔ جوامع وہ کتابیں ہیں جن میں عقائد، احکام، رقاق، کھانے پینے، سفر، مجلس میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب، تفسیر، تاریخ کی فتن اور مناقب کی روایات ہوں۔ لیکن مصنف میں صرف وہ احادیث فقہ و احکام ہوتی ہیں جن کا تعلق شہری زندگی میں فقہ اور قانون سے ہے۔ دوسری صدی میں سنن سے مصنف کا کام لیا جاتا تھا مگر تیسری صدی میں سنن کے ہی لیے مصنف کا نام وجود میں آ گیا۔ اگرچہ بعد کو سنن میں خصوص اور مصنف میں کچھ عموم سا آ گیا۔

تیسری صدی میں مصنف کے نام سے جو کتابیں وجود میں آئی ہیں وہ اگرچہ ہیں تو بہت مگر الکتانی نے الرسالۃ المستطرفہ میں دو کا ذکر کیا ہے۔

مصنف عبدالرزاق ۲۱۱ھ

یہ المصنف نامی ایک ضخیم تالیف دو جلدوں میں ہے اس کی ترتیب فقہی ہے اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ چونکہ یہ دور تابعین میں بھی ہے اور باتفاقِ محدثین اس کے مصنف کو تابعین سے شرف تلمذ حاصل ہے اس لیے اس میں اکثر احادیث ثلاثی ہیں یعنی ایسے نبوی ارشادات جو ان کو صرف تین ہی واسطوں سے معلوم ہوتے ہیں چنانچہ اتحاف النبلاء المتقین میں ہے:

اکثرش ثلاثی است[1]

---

[1] اتحاف النبلاء ص ۱۵۳۔

کتاب کے آخر میں شمائلِ نبوی ہیں اور شمائل کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں پر ختم کیا گیا ہے اور آخری حدیث یہ ہے:

حدثنا معمر عن ثابت عن انس قال کان شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی انصاف اذنیہ۔ (اتحاف ص ۱۵۳)

اس کتاب کا شمار حدیث کی ان کتابوں میں ہے جو اسلام کے علمی سرمایہ میں بہترین شمار کی جاتی ہیں۔ اس کتاب کے مصنف عبدالرزاق بن ہمام الیمانی ہیں اور اس دور کی پیداوار ہیں۔ جس کے بارے میں تمام ائمہ اسلام کا اتفاق ہے کہ اس دور والوں میں اتباع تابعین کو شرف قبول حاصل ہے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی نے تصریح کی ہے:

ثم اتفقوا ان آخر من کان من اتباع التابعین ممن یقبل قولہ عاش الی حدود ۲۲۰ھ ثم ظہرت البدع [1]

اس پر اتفاق ہے کہ اتباع تابعین سے آخری شخص جس کی بات قبول کی جاتی ہے ۲۲۰ھ تک زندہ رہا ہے بعد ازیں بدعتوں کا ظہور ہو گیا۔

امام عبدالرزاق ہی صحیفہ ہمام بن منبہ کے اپنے استاد معمر بن راشد سے راوی ہیں۔ امام عبدالرزاق کے تلامذہ میں رئیس المحدثین امام احمد بن حنبل ہیں۔ ہمام کا یہ صحیفہ بجنسہٖ آج بھی امام احمد کے مسند میں موجود ہے۔ یاد رہے کہ ہمام اس صحیفے کے مصنف نہیں بلکہ اپنے استاد حضرت ابوہریرہ سے راوی ہیں اور ہمام سے اس کے راوی معمر اور معمر سے اس کے راوی ان کے شاگرد امام عبدالرزاق ہیں۔

امام عبدالرزاق نے صرف معمر بن راشد ہی سے کسبِ فیض نہیں کیا بلکہ امام ذہبی اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے تصریح کی ہے کہ عبدالرزاق نے حدیث کے طالب علم کی حیثیت سے امام اعظم کے سامنے بھی زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ عقود الجمان میں ہے کہ امام اعظم کی خدمت میں زیادہ رہے ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر نے بسندِ متصل احمد بن منصور رمادی کا یہ بیان قلم بند کیا ہے کہ:

میں نے امام عبدالرزاق سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ میں نے امام ابوحنیفہ سے زیادہ بردبار کوئی نہیں دیکھا۔ میں نے ان کو مسجد حرام میں ایسی حالت میں

---

[1] فتح الباری ج ۷ ص ۴۔

دیکھا ہے کہ لوگوں کا ان کے ارد گرد حلقہ ہوتا تھا سوالات کی بوچھاڑ ہوتی تھی ایک
شخص کوئی مسئلہ دریافت کرتا آپ اس کو جواب دیتے آگے سے کوئی اعتراض
کرتا کہ اس مسئلہ میں حسن بصری یوں فرماتے ہیں۔ ابوحنیفہ کہتے کہ حسن بصری
سے غلطی ہوئی ہے۔ عبداللہ بن مسعود یہی فرماتے ہیں۔ عبدالرزاق کہتے ہیں
کہ میں نے اصل مسئلہ پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ عبداللہ بن مسعود اور ابوحنیفہ میں
ہم آہنگی ہے۔ بلکہ اصحاب عبداللہ کی بھی ان کو تائید حاصل ہوتی [1]

ان کے مصنف کی قدرومنزلت کا اندازہ کرنا ہو تو امام بخاری کی تاریخ کبیر میں یہ رائے پڑھیے کہ ان کی کتابی حدیثیں سب سے زیادہ صحیح ہیں۔ امام بخاری نے صحیح میں ان سے بکثرت حدیثیں لی ہیں اور ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ صحیح ہونے کی وجہ سے یہ ان کے مصنف ہی سے امام بخاری کا استفادہ ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی علمی کاوشوں سے معلوم ہوا ہے کہ مصنف عبدالرزاق کے مخطوطے استنبول اور صنعاء میں کامل اور حیدرآباد دکن، ٹونک، حیدرآباد سندھ اور مدینہ منورہ میں ناقص ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اہل علم کو یہ خوشخبری بھی دی تھی کہ

عثمانیہ کے فاضل پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف اسے آج کل ایڈٹ کر رہے ہیں
اور جنوبی افریقہ کے عالم اور علم دوست تاجر مولانا محمد موسیٰ اس کی اشاعت
میں دلچسپی لے رہے ہیں [2]

مصنف ابن ابی شیبہ ۲۳۵ھ

اس کتاب کا شمار حدیث کی ان چند بے مثال کتابوں میں ہے جو اسلام کا کارنامۂ فخر خیال کی جاتی ہیں۔ حافظ ابن کثیر دمشقی ابن ابی شیبہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

صاحب المصنف الذی لم یصنف احد مثلہ قط لا قبلہ و لا
بعدہ۔

اس مصنف کے مصنف ہیں کہ اس جیسی کتاب نہ پہلے اور نہ بعد میں لکھی گئی ہے [3]

حافظ ابن حزم نے اس کتاب کو عظمت کے لحاظ سے موطا امام مالک سے بھی مقدم رکھا ہے چنانچہ

---

[1] الانتقاء ص ۱۳۵ ۔ [2] مقدمہ صحیفہ ہمام ص ۵۶ ۔ [3] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۱۵ ۔

ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں ان کی جانب منسوب کر کے حدیث کی کتابوں کے جو ترتیبی مدارج لکھے ہیں اس میں انہوں نے مؤطا کو حدیث کی تیسرے درجہ کی کتابوں میں شمار کیا ہے جبکہ مصنف ابن ابی شیبہ کو درجۂ ثانیہ کی کتابوں میں ظاہر کیا ہے۔ اور مصنف عبدالرزاق کو بھی اس کا ہم پلہ بتایا ہے لیکن جہاں تک میں سمجھا ہوں درجات کی اس تعیین میں ان کے پیشِ نظر صحت نہیں ہے بلکہ احادیث مرفوعہ کی زیادتی ہے چنانچہ درجۂ اولیٰ کی کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد وہ خود فرماتے ہیں:

هذه الكتب التي افردت لكلام رسول الله صلى الله عليه وسلم[1]

ورنہ ظاہر ہے کہ از روئے صحت صحیحین، مسند طیالسی اور مسند ابن حنبل کو ایک صف میں کون لا سکتا ہے اور معلوم ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس میں حدیثِ نبوی کے پہلو بہ پہلو صحابہ و تابعین کے اقوال و فتاویٰ کا ذخیرہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہر حدیث کے متعلق یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کو سلفِ اُمت میں "تلقی بالقبول" کا درجہ ملا ہے یا نہیں اور دورِ صحابہ و تابعین میں اس پر عمل تھا کہ نہیں اور یہ اس کتاب کی وہ خاص افادی حیثیت ہے کہ جس میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتی اور یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب فقہاء و محدثین میں برابر متداول چلی آئی ہے۔ صاحبِ کشف الظنون نے اس کا تعارف ہی اس حیثیت سے کرایا ہے وہ فرماتے ہیں:

هو كتاب كبير جدا جمع فيه فتاوى التابعين واقوال الصحابة واحاديث الرسول صلى الله عليه وسلم على طريقة المحدثين بالاسانيد مرتبا على الكتب والابواب۔

یہ ایک بہت بڑی کتاب ہے جس میں فتاویٰ تابعین، اقوالِ صحابہ اور احادیثِ نبوت کو بطرزِ محدثین بالاسانید جمع کر دیا ہے۔

اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے تمام ابواب سے نظر ہٹا کر مصنف نے اس میں صرف احادیثِ احکام کو لیا ہے یعنی جس سے فقہ کا کوئی مسئلہ نکلتا ہے اور اس کتاب کا خاص امتیاز یہ ہے کہ اس میں فقہی مذہب کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک نہیں کیا گیا بلکہ اہلِ حجاز، اہلِ عراق دونوں مدرسوں کی جس قدر روایات مصنف کو ملی ہیں ان سب کو نہایت غیر جانبداری

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۸۔

ساتھ جمع کر دیا ہے اس لیے قدماء کی کتابوں میں یہ کتاب احادیث احکام پر جامع ترین ہے اور علامہ زاہد کوثری نے لحظ الالحاظ کی تعلیق میں مصنف کے بارے میں یہ بات بڑی قیمتی بتائی ہے:

المصنف لابن أبي شيبة من أنفع الجوامع للمسانيد والمراسيل وفتاوى الصحابة والتابعين ورتبه على الأبواب بحيث يطلع على مواضع الاتفاق والاختلاف بسهولة.

مسانید، مراسیل اور فتاویٰ صحابہ و تابعین پر مشتمل جو کتابیں ہیں ان کتابوں میں سب سے مفید اور سب سے زیادہ ضرورت جس کتاب کی ہے وہ صرف مصنف ابن ابی شیبہ ہے[1]

اور صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ چونکہ کوفہ میں لکھی گئی ہے اس لیے اس میں فقہاء عراق کے مذہب کو سمجھ کر بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے تا آنکہ مصنف نے اس کتاب میں اپنے خیال کے مطابق ایک مستقل باب امام ابوحنیفہ کے رد میں بھی لکھا ہے اس کا عنوان یہ ہے:

هذا ما خالف به أبو حنيفة الأثر الذي جاء عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

اس میں ایک سو پچیس مسائل لکھے ہیں اور اس پر حیران نہ ہونا چاہیے کیونکہ اجتہادی مسائل میں اختلاف ہوتا ہے اور ہر فریق کو دوسرے کے مسائل پر تنقید کا حق حاصل ہے۔ اگر فن میں اس تنقید کے حق پر قدغن قائم کر دیا جائے تو فن کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ زمانہ سلف میں ہر ایک نے دوسرے کے مسائل پر تنقید کی ہے۔ تنقید تمرد اور نا ادبی نہیں ہے۔ امام لیث بن سعد نے امام مالک کے ستر مسئلے ایسے شمار کیے ہیں جو سب کے سب احادیث رسول اللہ کے خلاف تھے۔ انہوں نے اس کے متعلق امام مالک کو یادداشت لکھی۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبر نے ان سے بسند متصل نقل کیا ہے کہ:

أحصيت على مالك بن أنس سبعين مسألة كلها مخالفة لسنة النبي صلى الله عليه وسلم مما قال مالك فيها برأيه۔[2]

---

[1] تعلیق لحظ الالحاظ ص ۱۵۰۔ [2] جامع بیان العلم وفضلہ ج ۲ ص ۱۴۸۔

میں نے مالک کے ستر مسئلے شمار کیے ہیں جو حضور کی سنت کے خلاف ہیں اور جو امام مالک نے محض رائے سے لکھے ہیں ۔

امام مالک کے نام لیث بن سعد کا وہ خط پڑھیے جو حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین کی تیسری جلد میں پورا نقل کر دیا ہے ۔ آپ محسوس کریں گے کہ سلف میں تنقید کا معیار کتنا بلند تھا لیکن بات کو پورے واشگاف انداز میں پیش کرتے اور دامانِ ادب و احترام کو ہاتھ نہ لگاتے ۔ میں یہاں اس خط کے چند اقتباسات ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کرتا ہوں ۔ فرماتے ہیں ؛

اس موضوع پر کہ عملِ اہلِ مدینہ حجت ہے آپ نے جو قرآن کی یہ آیت پیش کی ہے والسابقون الاولون من المهاجرين ... الخ تو اس کے بارے میں عرض ہے کہ ان سابقین اولین کی اکثریت جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر مدینہ چھوڑ کر دوسرے مقامات پر گئی ۔ فوج میں داخل ہو کر یہ لوگ مختلف شہروں میں پہنچے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا ۔ انہوں نے لوگوں کے روبرو کتاب و سنت کو بلا کم و کاست پیش کیا اور اس میں کوئی بات راز بنا کر نہیں رکھی ہے ہر فوج اور لشکر میں ایسا طبقہ ان لوگوں کا ہوتا تھا جو دانائے کتاب و سنت تھا اور ضرورت پڑنے پر ان مسائل میں اجتہاد کرتا تھا جو قرآن و سنت میں منصوص نہیں ہیں ان کے سامنے ابوبکر، عمر، عثمان تھے جن کو مسلمانوں نے مقامِ قیادت دیا تھا یہ ہر سہ بزرگ مسلمان فوجیوں سے بے خبر نہ تھے چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی دین قائم کرنے کی خاطر اور کتاب و سنت میں اختلاف سے بچانے کے لیے فوجیوں سے لگاتار خط و کتابت کے ذریعے رابطہ قائم رکھتے تھے ہر ایسی بات جس کا قرآن کی تفسیر سے سنت کی تشریح اور ان کے فیصلوں سے تعلق ہوتا وہ ان فوجیوں کو بتاتے اور سکھلاتے لہٰذا اگر کوئی ایسا معاملہ درپیش آجاتے جس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے مصر، شام اور عراق میں زمانہ ابوبکر، عمر اور عثمان میں عمل کیا ہو اور اس پر عمل کرتے ہوئے وہ دنیا سے رحلت فرما گئے وا لقا

ہو گئے ہوں تو بعد میں آج کسی کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ عمل کا کوئی ایسا پیمانہ بنائے جس کی دین کی زندگی میں ان بزرگوں سے عملی تائید نہ ہو۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

آپ کو بارش والی رات میں دو نمازوں کے جمع کرنے پر میری گرفت معلوم ہوئی ہے یقیناً میں نے اس پر گرفت کی ہے۔ شام میں بہ نسبت مدینہ کے بارش زیادہ ہوتی ہے مگر یہاں آنے والے صحابہ میں کبھی کسی نے یہ کام نہیں کیا درآں حالیکہ ان میں ابو عبیدہ، خالد بن الولید، یزید بن ابی سفیان، عمرو بن العاص اور معاذ بن جبل جیسے اجلّہ صحابہ تھے۔ مصر میں ابوذر، الزبیر بن العوام اور سعد بن وقاص فروکش تھے۔ حمص میں ستر بدری تھے۔ عراق میں عبداللہ بن مسعود، حذیفہ بن الیمان، عمران بن الحصین، علی مرتضیٰ اور ان کے بے شمار رفقا تھے لیکن ان میں سے کبھی کسی نے مغرب اور عشا کو جمع نہیں کیا ہے۔

یہ نمونہ ہے اس دور میں ان بزرگوں کی آزادانہ تنقید کا جس سے استنباط و اجتہاد کے فن میں باغ و بہار آئی ہے اور اس درجہ اوج کمال پر پہنچ گیا کہ زندگی کے ہر مسئلہ کا حل وہ شریعت کی روشنی میں تلاش کر لیتے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ یگانے تو یگانے بیگانے بھی بول پڑے کہ:

دورِ تابعین میں فقہاء اس کے جویا رہتے تھے کہ دنیوی مسائل ہوں یا دینی اعمال و اقوال نبوت میں نبوت کا منشاء معلوم ہو اور منشاء نبوت معلوم کرنے کا ان کے پاس صحابہ کی زندگی کے سوا کوئی ذریعہ نہ تھا صحابہ سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو حضور انور کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے آپ کے اعمال دیکھے اور کانوں سے ارشادات سُنے اس دور میں جو شخص اس روشنی سے جتنا زیادہ قریب تھا اتنا ہی اس کے فقہی نتائج زیادہ وسیع تھے[1]

یہ تو خیر ایک معاصر کی معاصر پر تنقید تھی خود امام شافعی جن کو امام مالک سے شرف تلمذ بھی

---

[1] العقیدہ والشریعۃ نقلاً تاریخ الفقہ الاسلامی ص ۳۶۔

ب انہوں نے بھی امام مالک کے ردّ میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں ثابت کیا ہے کہ ان کے بہت سے مسائل احادیث کے خلاف ہیں یہ کتاب آج بھی کتاب الام میں اختلاف مالک و شافعی کے نام سے موجود ہے۔ حافظ ابن حزم اندلسی اپنی کتاب مراتب الدیانۃ میں لکھتے ہیں کہ مؤطا میں ستّر سے اوپر ایسی حدیثیں ہیں کہ جن پر خود امام مالک نے عمل نہیں کیا[1] اور بعض مغاربہ نے ایک مستقل کتاب میں ان مسائل کو جمع بھی کر دیا ہے کہ جن میں امام مالک کا عمل مؤطا کی احادیث کے صریحاً خلاف ہے چنانچہ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں:

قد جمع بعض المغاربۃ کتابا فیما خالف فیہ المالکیۃ نصوص المؤطا۔[2]

محمد بن عبداللہ بن الحکم مالکی نے جو مصر کے مشہور فقیہ اور محدث تھے اور امام شافعی کے شاگرد بھی رہ چکے ہیں۔ امام شافعی کے ردّ میں کتاب لکھی ہے جس کا نام الرد علی الشافعی و ما خالف فیہ الکتاب والسنۃ ہے۔[3]

امام ابوحنیفہ کی کتاب السیر پر امام اوزاعی نے تنقید کی ہے۔ امام ابوحنیفہ کے مشہور شاگرد قاضی ابویوسف نے امام اوزاعی کی کتاب پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اس کا نام الرد علی السیر الاوزاعی ہے۔ امام شافعی کتاب الام میں اس کتاب کے راوی ہیں۔

ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنّف میں جو امام ابوحنیفہ پر ایک خاص باب میں تنقید کی تھی علماء نے اس پر بھی بھرپور تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان مسائل میں ابوحنیفہ کا مذہب حدیث کے موافق ہے۔ جن علمائے نے ابن ابی شیبہ پر اس موضوع میں تنقید کی ہے ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ حافظ عبدالقادر قرشی۔ ان کی کتاب کا نام الدر المنیفہ فی الرد علی ابن ابی شیبہ فیما اورده علی ابی حنیفہ ہے۔

۲۔ حافظ زین الدین قاسم۔ ان کی کتاب کا نام الاجوبۃ المنیفہ عن اعتراضات ابن ابی شیبہ علی ابی حنیفہ ہے۔[4]

۳۔ علامہ زاہد کوثری۔ ان کی کتاب کا نام النکت الطریفہ فی التحدث عن ردو ابن ابی شیبہ علی ابی حنیفہ ہے۔

---

[1] تدریب الراوی ص ۲۲۔ [2] تعجیل المنفعۃ ص ۱۴۳۔ [3] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۱ ص ۲۲۴
[4] تعلیق لحظ الالحاظ ص ۱۵۸۔

صاحب کشف الظنون ملا کاتب چلپی نے ایک اور کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جس کا نام الرد علی من رد علی ابی حنیفہ ہے۔

حافظ محمد بن یوسف صالحی شافعی عقود الجمان میں رقمطراز ہیں کہ خود انہوں نے بھی ابن ابی شیبہ کے رد میں ایک مستقل کتاب لکھنی شروع کی تھی اور دس حدیثوں تک جواب بھی لکھ لیا تھا مگر بعد کو قلم روک لیا۔

لیکن اس تنقید و تبصرہ سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ

۱۔ ان ائمہ میں باہم اکرام نہیں ہے اور ان کی ناقدانہ تحریروں کا منشا ان کی باہم رنجش ہے۔

۲۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ یہ ائمہ حدیث کی مخالفت کرتے تھے۔

اگر ان باتوں میں سے ایک بات بھی ہوتی تو ان کی اُمت میں امامت کون مانتا؟ بات یہ ہے کہ یہ اجتہادی مسائل ہیں اور ان میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جو روایت ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہو وہ حتماً سب کے نزدیک قابلِ پذیرائی ہو کیونکہ حدیث کی صحت کا مسئلہ منصوص نہیں بلکہ خود اجتہادی ہے ہو سکتا ہے کہ ایک کے علم کے مطابق اس کی سند میں کوئی کمزوری ہو یا پھر اس کے ذہن میں اس کا محمل اور مصداق اور ہو۔ اس موقعہ پر حافظ ابن عبد البر کیسی پتے کی بات فرما گئے ہیں۔

علمائے اُمت میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ ایک حدیث کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت مانتے ہوئے بلا وجہ رد کر دے۔ یا تو وہ اس حدیث کے نسخ کا دعویٰ کرتا ہے یا اجماع کی تائید کا اعلان کرتا یا اس کا کوئی ایسا محمل تجویز کرتا ہے جس کا اس کے اُصول پر ماننا ضروری ہے یا پھر حدیث کی روایتی حیثیت کو وہ مشکوک سمجھتا ہے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں ہے اور پھر وہ حدیث کو رد کرتا ہے تو اس کا امام ہونا تو درکنار اس کی تو عدالت بھی مخدوش ہو جاتی ہے۔

بہر حال مصنف بہت اونچے درجے کی کتاب ہے اس کے مصنف امام ابوبکر بن ابی شیبہ ۲۳۵ھ کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے اساتذہ میں حافظ ذہبی کی تصریح کے مطابق شریک القاضی، سفیان بن عیینہ، عبد اللہ بن المبارک اور جریر بن عبد الحمید ہیں۔ اور حافظ ابن حجر نے ان کے ساتھ ہشیم بن بشیر اور ابوبکر بن عیاش، ابو اسامہ، ابو معاویہ، وکیع بن الجراح، محمد بن فضیل اور یزید بن ہارون کا اضافہ فرمایا ہے۔ حافظ ذہبی نے سفیان بن عیینہ کو چھوڑ کر سب ہی کو امام اعظم کے

تلامذہ حدیث میں شمار کیا ہے۔ امام بخاری نے ابن ابی شیبہ سے تیس حدیثیں اور امام مسلم نے ان سے ایک ہزار پانچ سو چالیس حدیثیں روایت کی ہیں۔

آپ اس سے امام اعظم کی جلالت قدر کا اندازہ لگائیے یہ ادنیٰ سے ادنیٰ مثال ہے کہ تمام دوران علم حدیث اسی گھر کے خوشہ چین ہیں۔

تیسری صدی میں صحاح کی تدوین

صحاح سے مراد وہ کتابیں ہیں جن کے مؤلفین نے اپنی کتابوں میں صحت کا التزام کیا ہے الکتانی لکھتے ہیں:

کتب التزم اھلھا الصحۃ فیہا

تیسری صدی میں صحاح کے نام سے جو کتابیں منصہ شہود پر آئی ہیں وہ چھ ہیں۔

صحیح امام بخاری ۲۵۶ھ، صحیح امام مسلم ۲۶۱ھ، جامع ترمذی ۲۷۹ھ، سنن ابی داؤد ۲۷۵ھ، سنن ابی ماجہ ۲۷۳ھ، سنن نسائی ۳۰۳ھ۔ چونکہ صحاح کے نام سے یہ چھ کتابیں مشہور ہیں اس لیے ہم نے ان ہی کو صحاح ستہ لکھا ہے ورنہ حافظ ابن مندہ نے مخرجین صحاح میں صرف امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام نسائی کو شمار کیا ہے اور بجائے ستہ کے صحاح اربعہ کہا ہے۔ بعد کو حافظ ابو طاہر سلفی نے جامع ترمذی کو بھی مذکورہ بالا چار کتابوں کے ساتھ شمار کر کے تصریح کی ہے کہ ان پانچ کی صحت پر مشرق اور مغرب کے علماء کا اتفاق ہے لیکن حافظ عراقی نے ان لوگوں پر بڑی برہمی کا اظہار کیا ہے جو ترمذی، ابوداؤد جیسی کتابوں پر صحیح بولتے ہیں فرماتے ہیں:

ومن علیہا طلق الصحیحا فقد اتی تساھلا صریحا[1]

حافظ ابن الصلاح اور علامہ نووی نے قابل اعتماد کتابوں کے سلسلے میں صرف پانچ کتابوں کے مصنفین کی وفیات کا ذکر کیا ہے اور امام ابن ماجہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حافظ سخاوی نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ

ابن ماجہ ان مقاصد سے خالی ہے جن پر مصنفین کتب خمسہ نے توجہ دی ہے

---

[1] الفیۃ العراقی ص ۱۴۔

اور جن پر تدبر و غور سے محدث کو مشق ہوتی ہے خاص طور پر جبکہ اس میں نہایت
ضعیف بلکہ منکر حدیثیں بھی موجود ہیں[1]

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں امام ابن ماجہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

ابو عبداللہ بن ماجہ کی کتاب بہترین ہے کاش اس میں تھوڑی احادیث
واہیہ نہ ہوتیں[2]

اور خود امام ابن ماجہ کی زبانی حافظ ابوزرعہ کا یہ تاثر نقل کیا ہے:-

میں نے اس کتاب کو حافظ ابوزرعہ کی خدمت میں لیجا کر پیش کیا تو فرمایا کہ
میرے خیال میں اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تو یہ جوامع یا
ان میں سے اکثر بیکار ہو جائیں گے پھر فرمایا شاید اس میں تیس حدیثیں بھی
ایسی نہ ہوں جن کی اسناد میں ضعف ہو[3]

حافظ ذہبی نے حافظ ابوزرعہ کی رائے کو تذکرہ میں اگرچہ بلا تبصرہ نقل کیا ہے لیکن سیر اعلام النبلاء
کے حوالہ سے علامہ یمانی لکھتے ہیں کہ:

ابوزرعہ کا یہ بیان کہ شاید اس میں تیس حدیثیں بھی ایسی نہ ہوں جن کی سند
ضعیف ہو اگر صحیح ہے تو ان کی مراد ان تیس حدیثوں سے نہایت گری ہوئی
اور ساقط قسم کی روایتیں ہیں ورنہ نا قابل احتجاج روایات کا تو اس میں
ایک ذخیرہ ہے۔ شاید ان کی تعداد ہزار کے قریب ہو[4]

غالباً ان ہی تیس کو حافظ ذہبی نے تاریخ میں سنن ابن ماجہ کے ذکر میں قلیل سے تعبیر کیا ہے
فرماتے ہیں:

ونما غض من رتبۃ سننہ ما فیھا من المناکیر وقلیل من الموضوعات

سنن ابن ماجہ کو اپنے مرتبہ میں کمتر بنانے والی منکر روایات اور تھوڑی سی
احادیث موضوعہ ہیں[5]

اور یہی وہ تیس حدیثیں ہیں جن کو مشہور محدث ابن الجوزی نے موضوعات میں شمار کیا ہے

---

[1] فتح المغیث ص ۴۰۰۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۸۹۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۸۹
[4]، [5] توضیح الافکار ج ۱ ص ۲۲۳۔

مقدسی ۶۰۰ھ نے الاکمال فی اسماء الرجال میں کتب خمسہ کے ساتھ ابن ماجہ کے رجال کو یکجا مرتب کیا ہے۔[1]

اس بنا پر بعد کے علماء میں یہ بحث پیدا ہو گئی کہ صحاح میں کتب خمسہ کے سوا چھٹی کتاب موطا ہے یا ابن ماجہ؟

علامہ ابن الاثیر نے اپنی مشہور کتاب جامع الاصول میں محدث رزین ہی کی رائے کو ترجیح دی ہے اور اسی لیے اس کتاب میں ابن ماجہ کے حوالہ سے کوئی روایت درج نہیں ہے۔ اسی طرح حافظ ابو جعفر بن زبیر غرناطی کی تصریح ہے کہ:

جو کچھ بتایا گیا ہے ان سب میں اول وہ کتابیں ہیں کہ جن کے اعتماد پر مسلمانوں کا اتفاق ہے اور یہ وہی کتب خمسہ اور موطا ہے جو تصنیف میں اور مرتبہ میں ان سے کم نہیں ہے۔[2]

اور علامہ عبد الغنی نابلسی اپنی مشہور کتاب ذخائر المواریث فی الدلالۃ علی مواضع الحدیث کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

صحاح میں چھٹی کتاب کے بارے میں اختلاف ہے اہل مشرق کے نزدیک تو ابن ماجہ ہے اور اہل مغرب کے نزدیک موطا ہے۔[3]

لیکن عام متاخرین کا فیصلہ ابن ماجہ کے حق میں ہے محدث ابو الحسن سندھی لکھتے ہیں:

غالب المتاخرین علی انہ سادس الستۃ

حافظ سخاوی نے ابن ماجہ کو مقدم کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس میں بہت سی زائد حدیثوں کی وجہ سے افادیت پیدا ہو گئی ہے ورنہ صحت اور قوت روایات کے لحاظ سے سنن ابن ماجہ تو کیا صحاح ستہ کی کوئی کتاب بھی موطا کے مقابلے میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ کچھ علماء کی رائے میں ابن ماجہ کی جگہ سنن دارمی کو صحاح میں چھٹی کتاب ہونے کا مقام حاصل ہے۔ چنانچہ حافظ سخاوی نے کچھ لوگوں کا یہ خیال نقل کیا ہے کہ:

بجائے سنن ابن ماجہ کے مناسب یہ ہے کہ دارمی کی کتاب کو چھٹی قرار دیا جائے کیونکہ اس میں ضعیف راوی کم اور منکر و شاذ حدیثیں نادر ہیں۔

---

[1] الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۱۱۱ [2] تدریب الراوی ص ۵۶ [3] ذخائر المواریث۔

اور اگرچہ اس میں احادیث مرسلہ و موقوفہ موجود ہیں تاہم وہ سنن ابن ماجہ سے زیادہ بہتر ہے[1]

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اس کی ہمنوائی کی ہے چنانچہ حافظ سیوطی رقمطراز ہیں:

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ دارمی کی کتاب رتبہ میں سنن اربعہ سے کم نہیں ہے بلکہ اس کو اگر کتب خمسہ کے ساتھ ملا دیا جاتے تو ابن ماجہ کی بہ نسبت یہ زیادہ اچھا ہے کیونکہ وہ سنن ابن ماجہ سے کہیں بڑھ کر ہے[2]

لیکن اس تصریح کے باوجود حافظ ابن حجر کا عمل اس کے خلاف ہے چنانچہ محدث محمد بن اسماعیل الیمانی لکھتے ہیں:

صحاح خمسہ کے ساتھ مؤطا بھی ہے جیسا کہ جامع الاصول میں ابن الاثیر نے کہا اور کچھ لوگوں نے اس کی جگہ ابن ماجہ کو لکھا ہے اسی کے پیش نظر حافظ ابوالحجاج المزی نے تہذیب الکمال میں رجال کی ترتیب قائم کی ہے اور اسی راہ کو اس کتاب کے اختصار میں حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اور علامہ خزرجی نے خلاصہ میں اختیار کیا ہے[3]

الغرض بتانا یہ چاہتا ہوں کہ تیسری صدی میں یہ چھ کتابیں صحاح کے نام سے منصۂ شہود پر آئی ہیں۔ آئیے سرسری خالص محدثانہ نقطہ نظر سے ان کتابوں کے بارے میں محدثین کی کچھ آراء بھی پڑھ لیجیے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم

مسانید کے ذریعے جب حدیث کا تمام ذخیرہ یکجا ہو گیا اور احادیث کے سمیٹنے کا کام پورا ہو گیا تو اس دور کے محدثین نے اس ذخیرے سے انتخاب و اختصار کے لیے قدم اٹھایا اور صحاح کی تدوین عمل میں آئی۔ حافظ ابوبکر محمد بن موسیٰ الحازمی نے ابراہیم بن معقل نسفی کے حوالہ سے خود امام بخاری کی زبانی بتایا ہے کہ:

میں ایک روز اسحاق بن راہویہ کے پاس تھا وہاں ہمارے احباب میں سے کسی نے کہا کہ کاش تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن پر مشتمل کوئی مختصر

---

[1] فتح المغیث ص ۳۳۔ [2] تدریب الراوی ص ۵۷۔ [3] توضیح الافکار ج ۱ ص ۵۵۔

بیا کرتے یہ بات میرے دل میں اتر گئی اور میں نے حدیث کا ایک مختصر جمع
کرنا شروع کر دیا[1]

صرف اختصار ہی نہیں بلکہ اس میں صحیح احادیث کے انتخاب کا بھی پورا اہتمام فرمایا چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ :

امام بخاری فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب الجامع میں صرف وہی حدیثیں
درج کی ہیں جو صحیح ہیں اور بہت سی صحیح حدیثوں کو میں نے چھوڑ دیا ہے[2]

امام مسلم نے اس سے بھی آگے قدم بڑھایا اور احادیث کی صحت کے بارے میں صرف اپنی ذاتی تحقیق پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ مزید احتیاط کے پیش نظر صرف وہی حدیثیں جمع کیں کہ جن کی صحت پر مشائخ وقت کا بھی اجماع تھا چنانچہ ان کا بیان ہے :

لیس کل شیئ عندی صحیح وضعتہ ھھنا انما وضعت ھھنا ما اجمعوا علیہ[3]

---

[1] شروط الائمۃ الخمسہ ص ۱۵۔ [2] مقدمہ فتح الباری ص ۵۔ [3] صحیح مسلم میں جس موقعہ پر امام مسلم نے اپنی صحیح میں یہ بات فرمائی ہے وہ بھی گوش گزار فرمائیے۔ امام مسلم نے باب التشہد میں اپنے مشائخ سعید بن منصور، قتیبہ بن سعید، ابو کامل محمد بن عبدالملک کے حوالے سے بسند ابو عوانہ از یونس بن جبیر از حطان بن عبداللہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کی ایک طویل حدیث پیش فرمائی ہے اور پھر اسی حدیث کے بارے میں بتایا ہے کہ مجھے یہ حدیث ان تین طریقوں سے بھی ملی ہے۔ اوّل ابوبکر از ابواسامہ از سعید بن ابی عروبہ۔ دوم ابوغسان المسمعی از معاذ بن ہشام از ہشام۔ سوم اسحاق بن ابراہیم از جریر از سلیمان۔ ان تینوں طریقوں کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ کل ھؤلاء عن قتادۃ یعنی یہ سب بالاتفاق کہتے ہیں کہ ہم سے قتادہ نے بیان کیا ہے لیکن ان تینوں طریقوں میں سلیمان نے قتادہ کے حوالے سے اس حدیث میں یہ اضافہ کیا ہے کہ اذا قرأ فانصتوا اور پوری روایت اسی طرح ہے کہ امام مسلم فرماتے ہیں کہ ہم سے اسحاق بن ابراہیم نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے جریر نے بتایا وہ سلیمان تیمی سے روایت کرتے ہیں، وہ قتادہ سے قتادہ یونس بن جبیر سے اور وہ حطان بن عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے بتایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے خطاب فرمایا اور سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین فرمائی اور ہمیں نماز کا طریقہ سکھایا اور کہ نماز سے پہلے صفوں کو سیدھا کر لو پھر تم میں سے ایک تمہارا امام بنے جب وہ تکبیر کہے تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم چپ رہو اور جب وہ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم

(بقیہ صفحہ ۴۵۴ پر)

حافظ ابن الصلاح، حافظ جلال الدین السیوطی اور علامہ الجزائری نے تصریح کی ہے کہ امام مسلم کی مراد ما اجمعوا علیہ سے یہ ائمہ حدیث ہیں۔ امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین، امام عثمان بن ابی شیبہ اور امام سعید بن منصور خراسانی[1] حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کے ساتھ امام علی بن المدینی کا بھی اضافہ فرمایا ہے[2] اور حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ جس حدیث کو امام مسلم صحیح کہہ دیں اس کا صحیح ہونا نفس الامر اور حقیقت میں بالکل یقینی ہے[3]

امام مسلم نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ جب کتاب مکمل ہو گئی تو حافظ ابو زرعہ رازی کی خدمت میں لے جا کر پیش کی جو اس دور میں علل احادیث اور فن جرح و تعدیل کے مسلّم امام تھے اور جس روایت کے بارے میں انہوں نے کسی علت کی طرف اشارہ کیا اسے کتاب سے خارج کر دیا[4] بالآخر پوری پندرہ سالہ محنتوں اور عرق ریزیوں کے بعد احادیث صحیحہ کا یہ مجموعہ عوام کے سامنے آیا۔ اس کے بارے میں خود امام مسلم کا یہ دعویٰ ہے:

میں نے تین لاکھ احادیث سے یہ کتاب تالیف کی ہے اگر تمام روئے زمین

ط؟ کا بقیہ حاشیہ) (دیکھو صحیح مسلم جلد اول ص ۱۷۴) اس موقعہ پر امام مسلم سے ان کے ایک شاگرد ابوبکر نامی نے دریافت کیا کہ سلیمان کی روایت میں یہ اضافہ ہے۔ امام مسلم نے جواب دیا کہ سلیمان حفظ و ضبط میں کامل ہیں پھر ابوبکر نے پوچھا کہ اچھا یہ تو ابو موسیٰ اشعری کی حدیث ہے لیکن آپ، حضرت ابوہریرہ کی حدیث کے بارے میں کیا خیال ہے جس میں اذا قرأ فانصتوا آیا ہے۔ امام مسلم نے جواب میں فرمایا کہ ھو عندی صحیح وہ بھی میرے نزدیک صحیح ہے پھر سوال کیا گیا کہ اگر وہ بھی آپ کے نزدیک صحیح ہے تو اسے آپ نے اپنی کتاب میں یہاں کیوں درج نہیں فرمایا جواب میں وہ بات ارشاد فرمائی جو ہم نے کتاب میں درج کی ہے لیس کل شیئ عندی ... الخ یعنی میں نے ہر اس حدیث کو جو میرے نزدیک صحیح ہے اپنی صحیح میں درج کرنے کا التزام نہیں کیا بلکہ میں نے صرف وہ روایات درج کی ہیں جن پر محدثین کا اجماع ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی وہ حدیث جو صحیح مسلم میں بالسند موجود ہے امام مسلم کے نزدیک ہی نہیں بلکہ ان سب محدثین کے نزدیک صحیح ہے جن کے اتفاق کو امام مسلم اپنی صحیح میں اپناتے ہیں۔

[1] مقدمہ ابن الصلاح ص ۸، تدریب الراوی ص ۴۸، توجیہ النظر ص ۲۴۰۔ [2] مقدمہ فتح الباری ص ۲۰۳۔
[3] غایۃ المامول ص ۶۔ اس لحاظ سے گویا یہ تمام ائمہ حدیث حضرت ابو موسیٰ اشعری کی اس زیادتی والی حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔
[4] الحطہ میں مکی بن عبدان کے حوالہ سے امام مسلم کا یہ بیان بحوالہ خطیب بغدادی نقل کیا ہے دیکھو ص ۹۸۔

کے باشندے دو سو سال تک بھی حدیث کی کتابت کا کام کریں گے پھر بھی ان
کا مدار اور سہارا یہی کتاب رہے گی۔ میں نے جو کچھ درج کیا ہے وہ دلیل کی
تیمی تلی ترازو پر رکھ کر کیا ہے اور جو درج نہیں کیا ہے وہ بھی کسی دلیل ہی
کے سہارے نہیں کیا ہے[1]

حافظ مسلمہ بن قاسم قرطبی نے اپنی "تاریخ" میں صحیح مسلم کے بارے میں لکھا ہے کہ

لم یضع فی الاسلام احد مثلہ

اسلام میں اس جیسی تصنیف کوئی نہیں ہے

اہلِ علم ان دونوں کو صحیحین اور ان کے مصنفوں کو شیخین کہتے ہیں۔

محدثین کے نزدیک صحیحین کا مقام

امام بخاری کی صحیح اور امام مسلم کی صحیح کی صحت میں تو اہلِ علم میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں لیکن یہ بات ہمیشہ سے علماء میں بحث و نظر کا موضوع رہی ہے کہ ان بزرگوں کے یہاں صحت کا معیار کیا ہے

امام نووی نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن حکیم کے بعد سب سے زیادہ صحیح صرف یہ
دونوں کتابیں ہیں اور امت نے ان کو شرف قبول سے نوازا ہے اور امام
بخاری کی صحیح بمقابلہ امام مسلم کی صحیح کے زیادہ صحیح ہے اور اس میں زیادہ
فائدے ہیں[2]

حافظ ابن حجر عسقلانی اور دوسرے محدثین نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ

وہ صفات جن پر صحت کا مدار ہے بخاری میں مسلم سے زیادہ ہیں اور
بخاری کی شرطیں مسلم کی شرطوں سے زیادہ قوت والی اور زیادہ سخت ہیں[3]

اس پر تفصیلی گفتگو آپ آئندہ اوراق میں پڑھیں گے کہ ان دونوں میں زیادہ صحیح کون سی ہے اور اس موضوع پر مختلف علماء کے کیا خیالات ہیں۔

الغرض اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ دونوں کتابیں صحت کے لحاظ سے تمام کتابوں سے

---

[1] مقدمہ صحیح مسلم۔ [2] الحطہ ص ۵۲۔ [3] توضیح الافکار ج ۱ ص ۴۰۔

دیکھی ہیں چنانچہ امیر یمانی فرماتے ہیں:

قد اتفق الکل علی انھما اصح الکتب

ان دونوں کے اصح الکتب ہونے پر اتفاق ہے۔

صحیحین میں صحت کا معیار

یہاں پہنچ کر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دعویٰ اتفاق کی کہ یہ دونوں کتابیں تمام حدیث کی کتابوں کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہیں بنیاد کیا ہے؟ آخر وہ معیار کیا ہے جس کی وجہ سے از روئے صحت ان کو دوسری تمام کتابوں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔

ہماری معلومات کے مطابق اب تک اس سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ تین باتیں ہیں:

ایک یہ کہ ان کتابوں کی سب سے برتر ہونے کی وجہ خود ان بزرگوں کا التزام صحت ہے

دوم یہ کہ ان کتابوں کے اصح ہونے کی وجہ ان بزرگوں کی قائم کردہ شرطیں ہیں

سوم یہ کہ ان کتابوں کے اصح ہونے کا دار و مدار دراصل اس پر ہے کہ ان دونوں کتابوں کو پوری اُمت کی جانب سے شرفِ قبول حاصل ہے۔

بات اگرچہ طویل ہے مگر ہم چاہتے ہیں کہ ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے اس سلسلے میں کچھ مفید باتیں پیش کریں۔

التزام صحت اور اس کا مطلب

التزام صحت کا اگر یہ مطلب ہے کہ ان دونوں کتابوں کے مؤلفین کا اعلان ہے کہ ان کی حدیثیں صحیح ہیں۔ ہم نے اپنی کتابوں میں صحیح حدیثیں درج کی ہیں۔ تو یہ اپنی جگہ درست ہے کیونکہ ان دونوں بزرگوں کی اس قسم کی تصریحات موجود ہیں اور یقیناً مدعیانِ صحت کا یہی مقصود ہے چنانچہ امام یمانی لکھتے ہیں:

فالاولی عندی فی الاستدلال علی تقدم الصحیحین اخبار مؤلفیھما بان احادیثھما صحیحۃ

میرے نزدیک صحیحین کے مقدم ہونے کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان کے مؤلفین نے پتہ دیا ہے کہ ان کی احادیث صحیح ہیں [1]

---

[1] توضیح الافکار ج ۱ ص ۹۵۔

اور احادیث کے صحیح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ

رواۃ ھذہ الاحادیث عدول ضابطون ولا شذوذ فیہا ولا علۃ[1]

بلاشبہ اگر ان کتابوں کے مؤلفین کے اس دعوے پر ان کتابوں کی صحت کا مدار ہے۔ تو یہ شرف یقیناً ان کتابوں کو حاصل ہے۔

بخاری و مسلم کی شرطیں

اگر ان کتابوں کی صحت کی علت ان کتابوں کے مؤلفین کی پیش کردہ شرائط ہیں تو ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان بزرگوں نے اپنی شرائط کو نہ تو کہیں بیان کیا ہے اور نہ ہی اس موضوع پر ان سے کوئی علمی سرمایہ منقول ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ متاخرین نے خود ہی چند شرطیں ان کی کتابوں کو دیکھ کر مقرر کر لی ہیں۔ بعد ازیں دوسری کتابوں میں آمدہ حدیثوں کو اپنی بنائی ہوئی ان شرطوں پر تول تول دیکھنے لگے۔ چنانچہ علامہ طاہر الجزائری لکھتے ہیں۔

اعلم ان البخاری لم یوجد عنہ تصریح بشرط معین وانما اخذ ذالک من تسمیۃ الکتاب والاستقراء من تصرفہ[2]

علامہ امیر محمد بن اسماعیل الیمانی نے توضیح الافکار میں امام بخاری اور امام مسلم دونوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اعلم انہ لم ینقل عن الشیخین شرطاہ شرطاہ وعیناہ وانما تتبع العلماء الباحثون عن اسالیبہما طریقتہما حتی تحصل لہم ما ظنوہ شروطا لہما۔

شیخین سے ایسی کوئی شرط منقول نہیں ہے صرف علماء نے ان کے اسلوب و طریق سے تلاش کر کے اپنے خیال کے مطابق شرطیں بنائی ہیں[3]

حتیٰ کہ امام نووی نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ

علی شرط الشیخین کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کے رجال سند ان شیخین کی کتابوں

---

[1] توضیح الافکار ج ۱ ص ۹۵۔ [2] توجیہ النظر ص ۸۸۔ [3] توضیح الافکار ج ۱ ص ۱۰۰۔

میں آئے ہوئے رجال پر مشتمل ہوں کیونکہ ان کی اپنی کتابوں میں اور کوئی
شرط نہیں ہے [1]

اور چونکہ مسئلہ شرائط پر ان بزرگوں سے خود کوئی تصریحی بیان منقول نہیں ہے بلکہ بعد میں
آنے والوں کی تلاش و جستجو کی رہین منت ہیں اس لیے ان شرائط کی تعیین و تقدیر میں اختلاف
پیدا ہو گیا ہے :

اختلفوا فیہ لاختلاف افہامہم

آئیے اس موضوع پر مختلف علماء کی قیمتی آراء معلوم کر لیجئے۔ محمد بن طاہر مقدسی لکھتے ہیں
شرط البخاری و مسلم ان یخرجا الحدیث المجمع علی ثقۃ نقلتہ
الی الصحابی۔
بخاری اور مسلم کی شرط یہ ہے کہ وہ حدیث ان راویوں سے روایت کرتے
ہیں جن کی ثقاہت اتفاقی ہو [2]

لیکن راویوں کی ثقاہت پر اتفاق کا دعویٰ درست نہیں ہے۔ حافظ زین الدین کو ابن
طاہر کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں ہے وہ فرماتے ہیں کہ ابن طاہر کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کیونکہ امام
نسائی نے ایسے بہت راویوں کی تضعیف کی ہے جن سے شیخین نے روایت کی ہے بلکہ حافظ محمد بن
ابراہیم الوزیر نے ایک قدم اور بڑھا کر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ

صرف نسائی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ اس معاملہ میں ایک سے زیادہ
دوسرے ائمہ جرح و تعدیل امام نسائی کے ہم زبان ہیں۔
اگرچہ علامہ وزیر نے یہ کہہ کر کہ
لکنہ تضعیف مطلق غیر مبین السبب

حافظ عراقی کی بات کو بے وزن بنانے کی کوشش کی ہے لیکن مشہور محدث امیر یمانی نے بات
کو واضح کر کے پیش کیا اور حافظ ابراہیم کی تردید کر دی چنانچہ امیر موصوف فرماتے ہیں،
صحیحین کے راویوں میں سے جن پر جرح ہوتی ہے ان میں ہر ایک پر جرح
مطلق ہی نہیں ہوتی ہے بلکہ ان میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جن پر

---

[1] تدریب الراوی ص ۶۶ [2] شروط الائمۃ الخمسہ ص ۱۰۔

بھرپور اور مکمل جرح کی گئی ہے کچھ ایسے ہیں جن کو مرجئہ کہا گیا ہے مثلاً ایوب بن عائذ بخاری و مسلم کے راویوں میں ہیں ابوداؤد اور نسائی نے ان کو مرجئہ قرار دیا ہے۔ کچھ کو ناصبی بتایا گیا ہے جیسے ثور بن یزید بخاری کے راویوں میں سے ہیں۔ حریز بن عثمان بخاری کے راویوں میں سے ہیں۔ فلاس مشہور ناقدِ رجال نے بتایا ہے کہ یہ حضرت علی سے بغض رکھتے تھے۔ خالد قطوانی بھی بخاری کے راویوں میں ہیں مگر ابن سعد کی رائے میں غالی شیعہ تھے[۱]

علامہ حازمی نے اس موضوع پر شروط الائمۃ الخمسہ کے نام سے کتاب لکھی ہے اور اس میں امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی اور امام نسائی کی شرائط پر تبصرہ کیا ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے اس کا خلاصہ یہ لکھا ہے کہ:

شرط بخاری یہ ہے کہ ایسی حدیث روایت کی جائے جس کی سند متصل ہو، جس کے راویوں میں صرف ثقاہت اور اتقان ہی نہیں بلکہ انہوں نے جن سے وہ حدیث لی ہے ان کے ملازم صحبت بھی ہوں اور صحبت بھی طویل ہو لیکن امام بخاری کبھی ان لوگوں کی روایت بھی لے لیتے ہیں جو ملازم صحبت نہ ہوں اور امام مسلم کی شرط یہ ہے کہ روایت طبقۂ ثانیہ کی ہو اور کبھی کبھار ان سے بھی روایت لیتے ہیں جو ملازم نہ ہوں لیکن ان پر قدرے جرح بھی ہو گئی ہو[۲]

لیکن علامہ یمانی نے امام بخاری کے متعلق یہ کہہ کر حازمی کی بیان کردہ داستان کو مخدوش بنا دیا ہے کہ:

هذا لا یوافق ما نقل عن البخاری من انہ یشترط اللقاء ولو مرۃ۔

حازمی کی بات کا امام بخاری کی یہ تصریح ساتھ نہیں دیتی ہے کہ روایت میں راوی کے لیے ملاقات شرط ہے چاہے ایک ہی بار ہو۔

اور ایسے ہی امام مسلم کی طرف منسوب شرط کو بھی انہوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ

---

[۱] توضیح الافکار ج ۱ ص ۱۰۲۔ [۲] تدریب الراوی ص ۴۰۔

ان مسلماً لا یشترط اللقاء اصلاً کما صرح بہ فی مقدمۃ صحیحہ

امام مسلم ملاقات کو قطعاً شرط قرار نہیں دیتے ہیں

امام حاکم نے مدخل میں بخاری و مسلم کی یہ شرط بتائی ہے کہ

ایسی حدیث جسے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مشہور صحابی روایت کرے اور اس صحابی سے دو تابعی ثقہ روایت کریں۔ پھر ان سے ایسا کوئی شخص جو حفظ و اتقان میں مشہور ہو اور اس کے طبقہ رابعہ میں روایت کرنے والے ایک سے زیادہ راوی ہوں بعد ازیں بخاری و مسلم کے وہ شیوخ جو حفظ و عدالت میں مشہور ہوں روایت کریں۔ یہ درجہ اوّل کی روایات ہیں [1]

یہ شرط اگرچہ بے حد وزنی اور پُر شوکت ہے لیکن علامہ ابن طاہر مقدسی نے اسے یہ کہہ کر بے جان بنا دیا ہے کہ

ان الشیخین لم یشترطا ھٰذا الشرط ولا نقل عن واحد انہ قال ذالک والحاکم قدر ھٰذا التقدیر و شرط لھما ھٰذا الشرط علی ماظن

شیخین نے نہ یہ شرط لگائی اور نہ ان میں سے کسی سے یہ منقول ہے۔ حاکم نے خود ہی اپنے گمان سے عمارت سازی کر لی ہے [2]

اور امام حازمی نے حافظ ابو حاتم محمد بن حبان البستی سے اس پر جو تنقید نقل کی ہے وہ کافی سخت اور سنگین ہے۔ فرماتے ہیں:

احادیث سب اخبارِ آحاد ہیں۔ ایسی کوئی حدیث نہیں ہے جو دو عادل کی روایت کی قید سے آئی ہو اور پھر ہر ایک دو ہی سے روایت کر کے حضورِ انور تک پہنچا ہو۔ جب یہ صورت ناممکن اور غلط ہے تو ثابت ہو گیا کہ احادیث اخبارِ آحاد ہیں اور جو شخص اس قسم کی شرطیں عائد کرتا ہے وہ تو در اصل اس راہ سے لوگوں کو ترکِ سنن کی دعوت دے رہا ہے کیونکہ سنن تو ساری ہی اخبارِ آحاد ہیں [3]

---

[1] شروط الائمۃ الخمسہ ص ۶۲۔ [2] شروط الائمۃ الخمسہ ص ۱۴ [3] شروط الائمۃ الخمسہ ص ۲۴۔

امام حازمی نے ابوحاتم کی اس تنقید کو اقرب الی الصواب قرار دیا ہے اور پھر خود بھی امام حاکم کے اس خیال کی اپنے انداز پر بھرپور تردید کی ہے ـــــ بہرحال یہ شرائط چاہے ابن طاہر نے بتائی ہوں یا حاکم اور حازمی نے متاخرین کی بنائی ہوئی ہیں ورنہ شیخین سے اس سلسلہ میں کچھ بھی ثابت نہیں ہے۔

انما هو تظنن وتخمين من العلماء

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ بخاری و مسلم کی کتابوں کی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں صحیت کا دار و مدار شروط پر نہیں ہے۔

تلقیٔ اُمت بالقبول اور صحیحین

حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں صحیحین کی اصحیت کو ثابت کرنے کے وجوہ و دلائل جو بتائے جاتے ہیں ان میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ صحیحین کو تلقیٔ اُمت بالقبول کا شرف حاصل ہے صحیحین کے بارے میں یہ نکتہ آفرینی حافظ ابن الصلاح کی قائم کردہ ہے انہوں نے مقدمہ میں لکھا تھا کہ

لاتفاق الامة على تلقي ما اتفقا عليه بالقبول [1]

صحیحین کے بارے میں یہ موقف ایسا ہے کہ اسے وجہ ترجیح ہونا چاہیے چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر رقمطراز ہیں:

والوجه في هذا عند اهل الحديث هو تلقي الامة بالقبول ولا شك انه وجه ترجيح۔

محدثین کے نزدیک اس کی علت تلقیٔ اُمت بالقبول ہے اور یہ واقعی وجہ ترجیح ہے [2]

اگرچہ امام نووی نے اس مسئلہ پر حافظ ابن الصلاح کے خلاف بہت بڑا محاذ قائم کر لیا اور بتایا کہ تلقیٔ اُمت بالقبول کسی چیز کی صحت میں برتر ہونے کی نہیں بلکہ وجوب عمل کی دلیل ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ:

تلقیٔ اُمت بالقبول کا فائدہ وجوب عمل ہے اور اس میں کوئی اختلاف

---

[1] مقدمہ ابن الصلاح ص ۴۲۔ [2] تنقیح الانظار ج ۱ ص ۹۴۔

نہیں ہے کیونکہ وہ حدیثیں جو بخاری و مسلم سے باہر ہیں اگر ان کی اسانید
صحیح ہوں تو ان پر بھی عمل واجب ہے اور مفید ظن ہیں یہی صحیحین کی
پوزیشن ہے [1]

امیر یمانی نے حافظ ابن الصلاح کے موقف پر دو سوال قائم کر کے صورت حال کو اور بھی سنگین بنا دیا۔

۱۔ تلقی امت بالقبول میں کیا امت کا ایک ایک فرد خاص و عام مراد ہے؟

۲۔ کیا تلقی امت سے یہ مراد ہے کہ پوری امت جانتی ہے کہ یہ کتابیں ان بزرگوں کی تصنیف ہیں یا یہ مراد ہے کہ امت کے ایک ایک فرد نے صحیحین کی ایک ایک حدیث کو اپنا لیا ہے۔ لیجئے پوری بات ان کی زبانی سن لیجئے:

> جو شخص یہ کہتا ہے کہ صحیحین کو تلقی امت بالقبول حاصل ہے اسے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔ اس دعویٰ پر دو سوال ہوتے ہیں ایک یہ کہ امت سے کیا مراد ہے سب کے سب ہر خاص و عام یا صرف مجتہدین۔ ظاہر ہے کہ سب تو مراد نہیں ہیں یقیناً مجتہدین ہی مراد ہوں گے۔ اگر دعویٰ یہ ہے کہ امت کے تمام مجتہدین میں سے ایک ایک فرد نے عمل کی دنیا میں اپنا لیا ہے تو یہ خود محتاج دلیل ہے اور معلوم ہے کہ اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں۔ اس پر دلیل لانا ایسا ہی ہے جیسا کہ اجماع کے دعویٰ پر۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ اجماع مدعی کاذب ہے اور اگر زمانہ احمد میں صحیحین کے وجود پذیر ہونے سے پہلے یہ جھوٹ ہے تو پھر صحیحین کے لیے ان کی تالیف اور تشہیر کے بعد اس قسم کا دعویٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ علماء میں بہت سے ایسے بھی ہوں گے جن کو صحیحین کا پتہ بھی نہ ہو گا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ خود تلقی بالقبول سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ کہ لوگ مانتے ہیں کہ یہ دونوں کتابیں ان دونوں بزرگوں کا تالیفی کارنامہ ہیں۔ صرف اتنی بات تو کسی کتاب کی صحت کی

---

[1] توجیہ النظر ص ۱۲۶۔

ضمانت کے لیے کافی نہیں ہے یا یہ تمام اُمت نے ان کتابوں کی تمام حدیثوں
میں سے ایک ایک حدیث کے بارے میں یہ مان لیا ہے کہ یہ حضور انور
صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اس دعویٰ کی صداقت سب احادیث
کے بارے میں ناقابل تسلیم ہے [1]

صرف یہی نہیں بلکہ امام نودی کی ہمنوائی اور حافظ ابن الصلاح کی مخالفت میں اور بھی بہت کچھ کہا گیا ہے چنانچہ علامہ الجزائری فرماتے ہیں کہ یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے :

صحیحین کے بارے میں تلقی الامت بالقبول درست ہے لیکن یہ صحیحین کی
خصوصیت نہیں ہے بلکہ ابوداؤد، ترمذی اور نسائی کو بھی یہ مقام حاصل
ہے مگر اس کے باوجود ان کتابوں کی اصحیت کا کوئی بھی قائل نہیں ہے
اگر اُمت سے پوری اُمت مراد ہے تو اس سے زیادہ کوئی غلط بات نہیں
ہے کیونکہ ان کتابوں کی تحسین بخاری اور ائمہ مذاہب کے بعد منصۂ شہود
پر آئی ہے اور اگر اُمت سے ساری اُمت نہیں بلکہ وہ حضرات مراد ہیں
جو ان کتابوں کے مؤلفین کے بعد ہوتے ہیں تو یہ ساری اُمت نہیں
ہے اور کچھ لوگوں کی تلقی مفید مدعا نہیں ہے [2]

غالباً محمد بن اسماعیل یمانی کے اعتراض سے گلو خلاصی کے لیے متاخرین میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے تلقی الامۃ بالقبول میں تھوڑی سی ترمیم کر کے تلقی الائمہ بالقبول کا عنوان اختیار کیا ہے چنانچہ وہ الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ میں فرماتے ہیں :

وتلقاھما الائمۃ بالقبول [3]

اور اتحاف النبلاء المتقین میں لکھتے ہیں :

ائمہ دین تلقی کردہ اند این ہردو را بالقبول [4]

اور مولانا آزاد نے اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں ان سے بے پروا ہو کر لکھ دیا ہے کہ :

صحیحین کو ترجیح محض ان کی شروط کی بنا پر نہیں ہے بلکہ شہرت اور

---

[1] توضیح الافکار ج ۱ ص ۹۴۔ [2] توجیہ النظر ص ۱۳۱۔ [3] الحطہ ص ۸۲
[4] اتحاف النبلاء ص ۴۸۔

قبول کی بنا پر ہے اور اس پر تمام اُمت کا اتفاق ہو گیا ہے۔

لیکن یہ دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ مولانا نے اس دعویٰ پر کسی دلیل سے بحث نہیں فرمائی ہے اور محققین کو سب مدعیان تلقی سے یہی شکایت ہے کہ وہ نہ تو دعویٰ کی وضاحت کرنے میں اور نہ ان کے پاس دلائل کا سرمایہ ہے۔ عقیدت کیشی کی حد تک تو یہ بات ٹھیک ہے مگر سوال عقیدت کا نہیں ہے بلکہ علم و نظر اور تحقیق کا ہے۔

بہر حال یہ مبحث متاخرین محدثین کے یہاں طویل الذیل ہے اصلی بات وہی ہے جو اس سلسلے میں امیر یمانی نے توضیح الافکار میں فرمادی ہے کہ:

> فالاولیٰ عندی فی الاستدلال علی تقدم الصحیحین ھو اخبار مؤلفیھما بان احادیثھما صحیحۃ [1]
>
> صحیح یہی ہے کہ صحیحین کے مقدم ہونے کی وجہ ان کے مؤلفین کا یہ کہنا ہے کہ ان کتابوں کی احادیث صحیح ہیں۔

اور اس بات کا مطلب کہ ان دونوں کتابوں کی احادیث صحیح ہیں یہ بھی علامہ یمانی کی زبانی ہی سُن لیجئے:

> امام بخاری کا یہ کہنا کہ یہ احادیث صحیح ہیں اس کہنے کے مترادف ہے کہ ان حدیثوں کے راوی عادل اور ضابط ہیں اور ان میں کسی قسم کا کوئی شذوذ اور کوئی علت نہیں ہے۔

اگر واقعہ یہی ہے کہ ان کتابوں کی صحت میں بالا ہونے کی وجہ صرف اتنی بات ہے کہ ان حدیثوں کے راوی عدالت وضبط کی صفات سے موصوف اور ان کی بیان کردہ روایات شذوذ اور علت کے داغ سے پاک ہیں اور اس کے علاوہ ان بزرگوں کی نہ قائم کردہ کوئی شرط ہے اور نہ اس کی وجہ تلقی بالقبول ہے تو پھر اصحیت کو ان کتابوں میں محدود کرنا اپنے اندر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا ہے کیونکہ اس بنا پر کسی کتاب کو اصح کہنا کہ اس کے لکھنے والے بڑے بزرگ ہیں کوئی علمی اور تحقیقی بات نہیں ہے اس لیے حافظ ابن الہمام کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:

> یہ خواہ مخواہ کی اُپج اور تقلید محض ہے کیونکہ اصحیت کا دارومدار تو صرف

---

[1] توضیح الافکار ج ۱ ص ۹۵۔

اس پر ہے کہ صحیحین کے راوی ان شرائط کے تحت ہیں جو ان کے مؤلفین
کے پیش نظر ہیں۔ بالفرض اگر یہی شرطیں ان کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب
میں ہوں اور اس کے راوی اسی معیار پر پورے اترتے ہوں تو پھر صحیحین کی
حدیثوں کو اصح کہنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا[1]

اور صرف یہ حافظ ابن الہمام کا ہی خیال نہیں ہے بلکہ اس میں اور بھی حافظ ابن الہمام کے ہمنوا ہیں۔ حافظ ابن الہمام کے شاگرد علامہ ابن امیر الحاج نے یہاں عجیب نکتہ لکھ دیا کہ:

بخاری اور مسلم کا اصحیت میں مقابلہ بخاری اور مسلم کے بعد آنے والوں سے ہے۔ ان مجتہدین کی کتابوں سے ہرگز نہیں ہے جو امام بخاری اور امام مسلم سے پہلے گزر چکے ہیں[2]

ہے بھی یہ انصاف کی بات ورنہ بڑی ہی بے انصافی ہوگی کہ سلف مجتہدین کا مقابلہ بعد کے ان محدثین سے کیا جائے جو فضل و کمال، علم و اجتہاد اور تحقیق و تنقید میں ان کے برابر نہ تھے۔ شاید یہی چیز ہے جس نے حکیم الامت شاہ ولی اللہ کو کتب حدیث میں مؤطا کی اصحیت کے اعلان پر مجبور کر دیا۔ نواب علامہ صدیق حسن خاں فرماتے ہیں:

نزد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی و من قال بقولہ اصح کتب در حدیث و فقہ مؤطا است پستر بخاری پستر مسلم[3]

شاہ صاحب نے اس کے ترجیحی دلائل اور وجوہ نہایت شرح و بسط سے اپنی مشہور کتاب مصفیٰ میں بیان فرماتے ہیں۔ اسی ضمن میں علامہ زاہد کوثری کا ایک بیان بڑا ہی معنی خیز ہے۔ جو انہوں نے شروط الائمۃ الخمسہ کی تعلیقات میں لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

شیخین ہوں یا اصحاب سنن سب کے سب حفاظ حدیث باہم معاصر ہیں اور تدوین فقہ اسلامی کے بعد منصۂ شہود پر آتے ہیں اور حدیث کے ایک خاص حصہ پر اپنی توجہات کو مرکوز کیا ہے ان سے پہلے ائمہ مجتہدین کے سامنے حدیث کی ساری انواع مرفوع، موقوف، مرسل اور صحابہ و

---

[1] فتح القدیر ج ۱ ص ۳۱۷، التحدید ج ۳ ص ۳۰۔ [2] التقریر والتحبیر ج ۳ ص ۳۰
[3] مسک الختام ج ۱ ص ۱۸۔

تابعین کا وافر ذخیرہ تھا۔ کیونکہ نظر اجتہاد میں حدیث کی تمام انواع ہوتی ہیں
چنانچہ اس دور کی جوامع اور مصنفات اس کی شاہد ہیں ان کی حدیث کی
ساری قسمیں مذکور ہیں جن کی ایک مجتہد کو ضرورت ہوتی ہے اور ان جوامع
کے مؤلفین ارباب صحاح ستہ سے پہلے ائمہ مجتہدین کے تلامذہ ہیں یا تلامذہ
کے تلامذہ ہیں[1]

بہرحال امام بخاری کی کتاب جس کا پورا نام خود امام بخاری کا تجویز کردہ "الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ" ہے اپنے دور کی ایک بہترین جامع تصنیف ہے اور اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ امام موصوف نے جہاں احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا ہے اس کے ساتھ اور بھی بہت سے فوائد اور نوادر کی طرف اشارات فرمائے ہیں، انہوں نے فقہ کا بے شمار ذخیرہ تراجم میں پھیلایا ہے پھر اس کے مناسب آثار صحابہ اور احادیث مرفوعہ پیش کی ہیں تاکہ حدیث اور فقہ کا ربط ظاہر ہو جائے پھر ہر باب میں ان احکام کے مناسب قرآنی آیات تلاوت کی ہیں تاکہ فقہ کے تمام ابواب قرآن کریم میں اجمالاً نظر آجائیں اور ان کے مناسب احادیث دیکھ کر قرآن کی جامعیت کا پورا مشاہدہ ہو جائے اسی کے ساتھ قرآن اور حدیث کا ربط بھی معلوم ہو جاتا ہے اور اس طرح ایک ہی تصنیف منکرین فقہ اور منکرین حدیث دونوں کا جواب بن جاتی ہے۔ فقہ کو برا کہنے والے احادیث سے مسائل کے استنباط کا طریقہ سیکھ لیں اور حدیث کو قرآن کے خلاف کہنے والے قرآن میں احادیث کا ماخذ معلوم کر لیں۔ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں:

کل ابواب الفقہ لیس منہا الا ولہ اصل فی القرآن نعلمہ
والحمد للہ حاشا القراض[2]

فقہ کے تمام موضوعات کی تفصیل کے علاوہ قرآن میں اصل موجود ہے

اس لحاظ سے گویا امام بخاری کی تصنیف ان تمام علوم و فنون کا مجموعہ بن کر آئی جو اس دور تک اسلاف کی محنتوں سے منصۂ ظہور پر آ چکے تھے۔ چنانچہ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث فرماتے ہیں
معلوم ہونا چاہیے کہ امام بخاری دو سو سال بعد رونما ہوئے اور ان سے

---

[1] شروط الائمۃ الخمسہ ص ۵۳ - [2] الموافقات ج ۳ ص ۳۱۷ -

پیشتر علمار علوم دینیہ میں مختلف فنون کی کتابیں تصنیف کر چکے تھے چنانچہ امام مالک، سفیان ثوری نے فقہ میں اور ابن جریج نے تفسیر میں، ابوعبید نے غریب قرآن میں اور محمد بن اسحاق اور موسیٰ بن عقبہ نے سیرت میں، عبداللہ بن المبارک نے زہد و مواعظ میں، کسائی نے بدر الخلق میں اور یحییٰ بن معین نے صحابہ و تابعین کے حالات میں نیز متعدد علما نے فن رویا، ادب، طب، شمائل، اصول حدیث، اصول فقہ اور رد مبتدعین پر کتابیں تصنیف کی تھیں۔ امام بخاری نے ان تمام مدونہ و مروجہ علوم کا ایک حصہ کہ جس کو انہوں نے بصراحت یا بدلالت ان حدیثوں میں پایا جو امام بخاری کی شرط پر تھیں اپنی کتاب میں درج کر دیا۔[1]

حافظ ابوبکر بن موسیٰ حازمی فرماتے ہیں کہ:

امام بخاری کا پیش نہاد صرف یہ تھا کہ حدیث کا ایک مختصر مجموعہ لوگوں کے ہاتھ میں آجائے۔ تمام احادیث کا استیعاب ان کا مقصود نہ تھا ان کی شرط صرف یہ تھی کہ جو حدیثیں ان کے نزدیک صحیح ہیں ان کو درج کریں کیونکہ وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب میں صرف حدیثیں روایت کی ہیں۔[2]

امام بخاری سے اس کتاب کو اگرچہ نو ہزار لوگوں نے سُنا تھا لیکن امام موصوف کے جن تلامذہ سے صحیح بخاری کی روایت کا سلسلہ چلا وہ چار بزرگ ہیں۔

۱۔ ابراہیم بن معقل، ۲۔ حماد بن شاکر، ۳۔ محمد بن یوسف الفربری، ۴۔ ابوطلحہ منصور بن محمد البزدوی۔ ان چار میں پہلے دو بزرگ ابراہیم اور حماد مشہور حنفی عالم ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے شروع میں اپنا سلسلۂ سند ان حضرات تک بیان کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

و من طریق ابراهیم بن معقل بن الحجاج النسفی وکان من الحفاظ وله تصانیف۔ و من طریق حماد بن شاکر النسوی[3]

ان چاروں میں ابراہیم اور حماد کو یہ خاص شرف حاصل ہے کہ ان کو امام بخاری سے جامع کی روایت کا سب سے پہلے موقعہ ملا ہے کیونکہ ابراہیم اور حماد کی وفات بالترتیب ۲۹۴ھ اور ۳۱۱ھ

---

[1] مکتوبات شاہ ولی اللہ ص ۱۰۔ [2] شروط الائمۃ الخمسہ ص ۴۴۔ [3] فتح الباری ج ۱ ص ۱۔

میں ہوئی جب فربری اور ابوطلحہ کی وفات ۳۲۰ھ اور ۳۲۹ھ میں ہوئی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اگر یہ دونوں حنفی بزرگ امام بخاری کی کتاب کو ان سے روایت نہ کرتے تو جامع کی روایت کی ضمانت تن تنہا فربری پر رہ جاتی اور اس طرح روایتی نقطۂ نظر سے صورت حال بڑی نازک ہو جاتی۔ علامہ کوثری نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

هذا البخاري لولا ابراهيم بن معقل النسفي وحماد بن شاكر الحنفيان لكاد ينفرد الفربري عنه في جميع الصحيح سماعاً[1]

بالفاظ دیگر ۳۲۰ھ تک امام بخاری کی صحیح کا روایتی مرکز صرف احناف ہی تھے۔ بہرحال امام بخاری کی کتاب جیسا کہ امام ذہبی نے تاریخ اسلام میں لکھا ہے کہ کتب الاسلام میں افضل اور اسنادی نقطۂ نظر سے لوگوں کے لیے علم کا بہترین سرمایہ ہے۔

صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں موازنہ

اس پر تو جیسا کہ آپ سن آئے ہیں سب ہی کا اتفاق ہے کہ صحیحین اپنے زمانے اور اپنے بعد کی تمام کتابوں پر فوقیت رکھتی ہیں چنانچہ نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں:

لا ريب في تقديم الشيخين على اهل عصرهما ومن بعدهما في معرفة الصحيح والعلل[2]

اگر کچھ اختلاف ہے تو اس تقدیم کی علت اور بنیاد میں ہے کچھ کی رائے میں ان بزرگوں کا ان کتابوں میں التزام صحت ہے اور کچھ کے خیال میں اس کی علت ان بزرگوں کی قائم کردہ شرطیں ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ اس کی علت تلقی الامت بالقبول ہے۔ ان پر علماء کے مختلف خیالات آپ سن چکے ہیں۔ اصل بات سب کے یہاں تقریبا متفق علیہ ہے کہ صحیحین کا پایہ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں بلند ہے۔ اس پر اتفاق کے بعد لیکن اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ ان دونوں میں سے از روئے صحت خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے کس کا مقام اونچا ہے؟

حافظ ابن حجر عسقلانی اور عام علماء صحیح بخاری کو ترجیح قرار دیتے ہیں اور امام نووی نے صحت کے ہر پہلو کو سامنے رکھ کر اس کی تصویب کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ صحت کی عمارت جن دو ثبت اور

---

[1] شروط الائمۃ الخمسہ ص ۴۳۔ [2] الحطہ فی ذکر الصحاح ستہ ص ۸۴۔

دو منفی ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے وہ بتمامہ بخاری میں موجود ہیں۔ یعنی راویوں کی عدالت، اتصالِ سند کے ساتھ عدم شذوذ اور عدم علت قادحہ۔ عدالت وضبط کے لحاظ سے بخاری کا مقام مسلم سے اونچا ہے۔ اتصال کے پیش نظر بھی بخاری کو برتری حاصل ہے کیونکہ بخاری کے نزدیک صرف معاصرت کافی نہیں ہے بلکہ ملاقات بھی ضروری ہے چاہے ایک ہی بار ہو۔ شاذ نہ ہونے اور علت نہ ہونے کی بنیاد پر بھی بخاری کا پلڑا بھاری ہے کیونکہ نقد وجرح میں بخاری کی روایات بہ نسبت روایات مسلم کے کم ہیں۔ حافظ سیوطی نے بھی اس کی ہمنوائی کی ہے اور اس کو متعدد وجوہ سے ثابت کیا ہے لیکن اس کے برعکس مغاربہ کی رائے بجائے بخاری کے مسلم کے حق میں ہے اور ان مغاربہ میں حافظ ابن حزم، حافظ ابو علی الحسین بن علی نیشاپوری وغیرہ داخل ہیں چنانچہ شیخ ابو محمد القاسم بن القاسم تجیبی نے اپنی فہرست میں امام ابن حزم ظاہری کے متعلق لکھا ہے کہ وہ صحیح مسلم کو امام بخاری کی کتاب پر ترجیح دیتے ہیں اور مشہور مالکی محدث قاضی عیاض نے الالماع میں ابو مروان طبنی سے نقل کیا ہے کہ میرے کچھ شیوخ صحیح مسلم کو ترجیح دیتے تھے[1]

علامہ زرکشی کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال صرف کچھ کا نہیں بلکہ اکثر مغاربہ کا ہے چنانچہ امیر یمانی فرماتے ہیں:

لا یخفی ان ما قالہ الزرکشی ان دائرۃ الخلاف ادسع والذاھبون الی ترجیح مسلم اکثر ممن ذکر

بعض علماء نے مغاربہ کے اس میلان کی وجوہ بھی قلم بند کی ہیں۔ چنانچہ علامہ الجزائری فرماتے ہیں کہ

امام ابو علی نیشاپوری نے صحیح مسلم کو بخاری پر جو فوقیت دی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امام مسلم نے اپنی کتاب خاص اپنے شہر میں اپنے اساتذہ کی موجودگی میں لکھی وہ بیان و تحریر اور الفاظ میں بے حد محتاط تھے۔ برخلاف امام بخاری کے کہ وہ اکثر احادیث کو صرف حافظہ کی مدد سے لکھتے اور راویوں کے الفاظ میں امتیاز نہ کرتے اسی وجہ سے آپ کو شک ہو جاتا اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نے کئی حدیثیں بصرہ میں سنی ہیں مگر ان کو شام میں پہنچ کر قلم بند کیا ہے[2]

---

[1] توضیح الافکار ج ۱ ص ۴۵ ۔ [2] توجیہ النظر ص ۱۲۱ ۔

حافظ عسقلانی نے مغاربہ کے اس تاثر کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :

میری رائے میں اس کا تعلق صحیح مسلم کی اصحیت سے نہیں بلکہ اس کی وجوہ کچھ اور ہیں ایک وجہ وہ ہے جو حافظ ابن حزم نے بتائی ہے کہ اس میں خطبہ کے بعد حدیث کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امام بخاری روایت بالمعنے کے قائل ہیں۔ نیز وہ ایک حدیث کو ٹکڑے کر کے پیش کرنے کو درست سمجھتے ہیں۔ برخلاف امام مسلم کے کہ وہ اس کو صحیح نہیں سمجھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ امام بخاری نے یہ کتاب ایک جگہ قیام کی حالت میں نہیں بلکہ سفر میں لکھی ہے چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے کئی حدیثیں بصرہ میں سُنی ہیں مگر لکھنے کی نوبت خراسان میں آئی ہے اس وجہ سے بسا اوقات حدیثیں صرف حافظہ کے بھروسہ پر قلم بند کرتے اس لیے روایت باللفظ نہ ہوتی تھی بلکہ روایت میں تصرف کر کے اس کے مدلول و مدعا کو اپنے الفاظ میں پیش کرتے تھے لیکن امام مسلم نے اپنی کتاب قیام کی حالت میں اپنے اساتذہ کے سامنے لکھی ہے وہ الفاظ میں بے حد محتاط اور روایت باللفظ کے پابند تھے۔[1]

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ امام بخاری کی حمایت میں امام بخاری کے حامیوں کا لب ولہجہ ناگوار حد تک پہنچ گیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ان مغاربہ کی تنقیدات کا علمی اور تحقیقی جواب دیا جاتا لیکن ہوا یہ کہ امام مسلم اور امام ابو علی نیشاپوری تک پر نہایت رکیک الزام لگاتے اور ایسی زبان استعمال کی جو علمی زبان نہیں ہے اور نہ میدان تحقیق میں محققین کے شایان شان ہے چنانچہ حافظ ابو سعید العلائی کو جب امام مسلم کی برتری کے بارے میں امام ابو علی کے تاثرات معلوم ہوئے تو فرمایا کہ

امام ابو علی نیشاپوری کو صحیح کا پتہ ہی نہیں ہے۔[2]

اور مشہور حاکم کبیر ابو احمد نے اس معاملہ میں حد کر دی۔ حافظ ابن حجر ان سے ناقل ہیں :

اللہ محمد بن اسماعیل پر رحمتیں برسائے انہوں نے اُصول پر کتاب تالیف کی

---

[1] توضیح الافکار ج ۱ ص ۴۷ ۔

اور لوگوں کے لیے بیان کیا ہے اور جس نے بھی آپ کے بعد کوئی کام کیا
ہے وہ آپ ہی کی کتاب کے ذریعے کیا ہے جیسے امام مسلم انہوں
نے امام بخاری کی کتاب کے زیادہ حصے کو اپنی کتاب میں بکھیر دیا اور
اس میں ایسی ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا کہ امام بخاری کا نام تک نہیں لیا۔

حافظ ابن حجر نے صرف حاکم کبیر کی بات کو نقل کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس سے آگے قدم بڑھا کر حافظ دارقطنی کا وہ جارحانہ بیان بھی نقل کیا ہے جو امام مسلم کی جلالتِ شان کے سراسر خلاف ہے۔ لکھتے ہیں:

دارقطنی کہتے ہیں کہ اگر امام بخاری نہ ہوتے تو امام مسلم کا نام تک نہ ہوتا۔

اس پر بس نہیں بلکہ فرمایا کہ:

امام مسلم نے امام بخاری کی کتاب لی ہے اور اسی کا مستخرج بنا کر اس
میں کچھ حدیثوں کا اضافہ کر دیا ہے[2]

انا للہ خالی اللہ المشتکی! امام مسلم کا حدیث میں جو پایہ ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ دارقطنی کی محض بدگمانی ہے جو سراسر واقعات کے خلاف ہے۔ اتنی بات سب ہی جانتے ہیں کہ امام بخاری کو حدیث کی معلومات جن اساتذہ سے حاصل ہوئی تھیں وہ ہی اساتذہ قریب قریب امام مسلم کے بھی تھے اور حدیث و روایت کا جو مجموعہ امام بخاری کے پیش نظر تھا وہی کم و بیش امام مسلم کے بھی سامنے تھا۔ امام یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل، امام علی بن المدینی، امام عبداللہ بن المبارک، امام اعظم، امام محمد، امام ابو یوسف کی جس قدر تصانیف امام بخاری کی نظر سے گزری ہیں۔ امام مسلم کی نظر سے بھی گزر رہی تھیں۔ پھر یہ کہنا کس قدر بے انصافی ہے کہ امام مسلم جیسے امام کبیر نے جو کچھ اس فن میں لکھا وہ امام بخاری سے لے کر نقل کر ڈالا اور اس پر معاذ اللہ ان کی بد دیانتی کا عالم یہ تھا کہ امام بخاری کا نام بھی نہیں لیا۔

حدیث میں امام مسلم کا مقام

امام مسلم کا حدیث میں جو درجہ ہے اس کا اندازہ حافظ عصر ابو العباس بن عقدہ کے

---

[1] توجیہ النظر ص ۱۲۲۔ [2] مقدمہ فتح الباری۔

اس بیان سے ہوسکتا ہے جو حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیا ہے ان سے ایک بار دریافت کیا گیا کہ بخاری و مسلم میں حدیث میں مقام کس کا اونچا ہے۔ جواب میں فرمایا کہ دونوں عالم ہیں سائل کہتا ہے کہ میں نے بار بار ان سے یہی سوال کیا تو فرمایا کہ :

امام بخاری سے اہل شام کے بارے میں غلطیاں ہوتی ہیں کیونکہ انہوں نے ان کی کتابیں لے کر مطالعہ کیا تھا اس لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک جگہ کنیت کے ساتھ ایک شخص مذکور ہوتا ہے اور دوسرے مقام پر اس کا نام آتا ہے تو یہ اس کو دو شخص سمجھ لیتے ہیں لیکن امام مسلم کو علل میں غلطی بہت ہی کم ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے صرف مسند حدیثیں لکھی تھیں اور مقطوع و مرسل روایات نہیں لکھی ہیں[1]

یہی بات متاخرین محدثین میں سے جناب علامہ نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے ذرا اور وضاحت سے پیش فرمائی ہے :

امام مسلم نے اپنی صحیح میں علم حدیث کے عجائبات کا خزانہ فراہم کیا ہے خصوصاً احادیث کی سندوں اور متون میں ایک بے مثال علمی نمونہ ہے اسی بنا پر صحیح حدیث کو ضعیف حدیث سے ممتاز کرنے میں امام بخاری کی کتاب کے مقابلے میں امام مسلم کی کتاب کو شرف تقدم ہے۔ امام بخاری اہل شام کے بارے میں غلطیاں کرتے ہیں کیونکہ وہ ایک شخص کو ایک جگہ کنیت سے اور دوسری جگہ نام سے ذکر کرتے ہیں اور اس طرح ایک ہی شخص کو دو شخص سمجھ لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی روایات اکثر اہل شام سے بطور مناولہ ہوتی ہیں۔ برخلاف امام مسلم کے کہ وہ کسی مقام پر ایسی غلطی کا شکار نہیں ہوتے۔ صحیح بخاری کی حدیثوں میں تقدیم و تاخیر، حذف و اسقاط کی وجہ سے متون احادیث میں پیچیدگی آجاتی ہے لیکن یہ بات صحیح مسلم میں نہیں ہے کیونکہ امام مسلم الفاظ حدیث کو بغیر کسی ترمیم کے اور رجال حدیث کو اس طرح لاتے ہیں کہ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ترجمہ امام مسلم۔

کبھی کوئی تحریف نہیں ہوتی ہے[1]

صحیح مسلم کی شہرت اگرچہ مصنف سے تواتر کی حد تک پہنچی ہوتی ہے لیکن اس کی روایت کا سلسلہ جس بزرگ کے دم سے قائم رہا ہے وہ مشہور فقیہ حنفی شیخ الواسحاق ابراہیم بن محمد نیشاپوری ۳۰۸ھ ہیں۔ چنانچہ امام نووی مقدمہ شرح مسلم میں رقمطراز ہیں:

اسناد متصل کے ساتھ امام مسلم سے اس کی مسلسل روایات کا سلسلہ ان شہروں اور اس زمانے میں صرف الواسحاق ابراہیم بن محمد کی ذات سے وابستہ ہے۔

سنن نسائی اور صحاح میں اس کا مقام

امام نسائی نے اپنی سنن میں امام بخاری اور امام مسلم کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے اور صرف صحیح روایات ہی کو اپنی کتاب میں روایت کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب بخاری اور مسلم دونوں کے طریقوں کی جامع ہے اور علل حدیث کا بیان اس پر مستزاد ہے اور اس کے ساتھ حسن ترتیب اور جودت تالیف کا بہترین نمونہ ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے زہر الربی میں حافظ ابوعبداللہ بن رشید سے نقل کیا ہے کہ:

علم سنن میں جس قدر کتابیں تالیف ہوئی ہیں یہ کتاب ان سب میں بلحاظ تالیف انوکھی اور باعتبار ترتیب بہترین اور مثالی ہے۔ بخاری اور مسلم دونوں کے طریقوں کی جامع ہے نیز علل احادیث کا بھی ایک معتدبہ حصہ اس میں آگیا ہے[2]

حافظ ابوعلی النیشاپوری، حافظ ابن عدی، حافظ دار قطنی، حافظ عبد الغنی اور امام حاکم نے اس کتاب کی صحت کو سراہا ہے بلکہ حافظ ابن مندہ نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ:

الذین خرجوا الصحیح اربعۃ البخاری و مسلم و ابو داؤد و النسائی

یعنی جن چار نے صحیح احادیث کو روایت کیا ہے ان میں ایک امام نسائی بھی ہیں اور حافظ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں لکھا ہے کہ:

ابن طاہر کا بیان ہے کہ میں نے سعد بن علی الزنجانی سے ایک شخص کے بارے

---

[1] الحطر فی ذکر الصحاح الستۃ ص ۱۲۴۔ [2] مقدمہ زہر الربی علی المجتبیٰ از سیوطی۔

میں دریافت کیا انہوں نے فرمایا کہ ثقہ ہے عرض کیا کہ امام نسائی نے اس کی تضعیف کی ہے بولے کہ برخوردار! رجال کے بارے میں امام نسائیؒ کی امام بخاری اور امام مسلم سے زیادہ کڑی شرطیں ہیں۔

لیکن حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر کو اس دعویٰ کی صحت میں تامل ہے وجہ یہ ہے کہ حافظ ابن مندہ نے لکھا ہے کہ امام نسائی کی شرط یہ ہے کہ اس شخص سے حدیث روایت کریں گے جس کے ترک پر اجماع نہ ہوا ہو۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اجماع سے اجماع عام مراد نہیں ہے بلکہ طبقات ناقدین میں سے ایک خاص طبقہ کا اجماع مراد ہے۔ حافظ سخاوی کے اس بیان سے جو انہوں نے اس موضوع پر الاعلان بالتوبیخ میں لکھا ہے۔ اس پر مزید روشنی پڑتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

امام نسائیؒ کا مذہب یہ ہے کہ کسی راوی کی حدیث اس وقت تک نہ چھوڑی جائے گی جب تک اس راوی کے ترک پر سب کا ایکا نہ ہو جائے۔ امام نسائی کا مقصود یہ ہے کہ ناقدین میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ متشددین اور متوسطین متشددین میں امام شعبہ اور سفیان ثوری ہیں۔ متشددین میں یحییٰ القطان اور عبدالرحمٰن بن مہدی ہیں تیسرے طبقے میں یحییٰ بن معین اور امام احمد ہیں چوتھے طبقے میں ابو حاتم اور بخاری ہیں۔ امام نسائی کا مذہب یہ ہے کہ کسی راوی کو اس وقت تک نہ چھوڑا جائے جب تک سب کا اس کے چھوڑنے پر اتفاق نہ ہو جائے یعنی اگر ایک راوی کو عبدالرحمٰن بن مہدی ثقہ بتاتے ہیں مگر یحییٰ القطان اس کی تضعیف کرتے ہیں تو اسے نہ چھوڑا جائے گا کیونکہ راویوں کے بارے میں یحییٰ کا تشدد معلوم ہے[1]

اگرچہ صاحب تنقیح الانظار نے امام ابوالقاسم سعد بن علی الزنجانی کی اس بات

یا بنی ان لابی عبدالرحمٰن فی الرجال شرطا اشد من شرط البخاری ومسلم۔

کی صحت سے انکار کیا ہے اور اس کی ایک وجہ تو حافظ ابن مندہ کی بالا روایت کو قرار دیا ہے اور دوسری وجہ یہ بتائی ہے کہ چونکہ اس روایت کو حافظ ابن الصلاح اور حافظ زین الدین عراقی

---

[1] الاعلان بالتوبیخ ص ۱۶۸۔

نے ذکر نہیں کیا ہے اس لیے یہ روایت صحیح نہیں ہے لیکن حافظ ذہبی نے تاریخ میں تصریح کی ہے کہ امام ابوالقاسم سعد بن علی الزنجانی نے جو کچھ کہا ہے صحیح ہے اور حافظ ذہبی کے علاوہ خود حافظ ابوالفضل بن طاہر مقدسی نے شروط الائمہ میں بھی یہ واقعہ لکھا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ناقدینِ فن کے نزدیک جلالتِ علمی کے لحاظ سے امام نسائیؒ کا پایہ امام مسلم سے بھی اونچا ہے چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رقمطراز ہیں :

> فنِ رجال میں ماہرینِ فن کی ایک جماعت نے ان کو امام مسلم پر بھی فوقیت دی ہے اور دارقطنی وغیرہ نے ان کو اس فن میں اور دیگر علوم حدیث میں امام الائمہ ابوبکر بن خزیمہ پر مقدم کیا ہے[1]

اور حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلاءؒ میں امام نسائیؒ کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ :

> یہ مسلم، ترمذی اور ابوداؤد سے حدیث، علل حدیث اور علم الرجال میں زیادہ ماہر ہیں اور امام بخاری اور امام ابوزرعہ کے ہم عصر ہیں[2]

بہرحال امام نسائیؒ بڑی جلالتِ قدر کے مالک ہیں ان کی کتاب سنن نسائیؒ کے نام سے مشہور ہے یہ کتاب دراصل امام ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی بن بحر النسائیؒ کی تصنیف نہیں ہے بلکہ ان کی کتاب کا اختصار ہے۔ حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ یہ ان کے شاگرد حافظ ابوبکر بن السنی کے قلم کا رہینِ منت ہے اس کا نام المجتبیٰ ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

> اختصر السنن وسماہ المجتبیٰ[3]

کچھ کا خیال ہے کہ مجتبیٰ خود امام نسائیؒ ہی کی تصنیف ہے اس خیال کی تائید میں اس واقعہ کو پیش کیا جاتا ہے کہ امام نسائیؒ نے جب سنن تصنیف فرمائی تو اس کو امیر رملہ کی خدمت میں لے جاکر پیش کیا۔ امیر موصوف نے امام ممدوح سے دریافت کیا کہ کیا اس میں جو کچھ ہے سب کچھ صحیح ہے امام نسائیؒ نے جواب دیا نہیں اس پر امیر نے فرمائش کی کہ میرے لیے صرف صحیح روایات کو جمع کر دیجئے تب امام نسائیؒ نے اس کے لیے سنن صغریٰ تصنیف فرمائی۔ اس واقعہ کا ذکر علامہ ابن الاثیر نے جامع الاصول میں کیا ہے لیکن یہ کہانی محققین کے خیال میں صحیح نہیں ہے امیر یمانی نے حافظ ذہبی کی سیر اعلام النبلاء کے حوالہ سے بتایا ہے کہ :

---

[1] فتح الباری ص ۸۔ [2] توضیح الافکار ج ۱ ص ۲۲۰۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ترجمہ ابن السنی۔

ان هذہ الروایۃ لم تصح بل المجتبیٰ اختصار ابن السنی تلمیذ النسائی[1]

امام نسائی کے اساتذہ میں بزرگ ترین ہستی مشہور محدث امام اسحاق بن راہویہ کی ہے۔ امام اسحاق نے حدیث میں امام عبداللہ بن المبارک، جریر بن عبدالحمید، فضل بن عیاض کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ حافظ ذہبی کی تصریح کے مطابق یہ تینوں امام اعظم کے تلامذہ میں سے ہیں اور امام نسائی سے جن لوگوں کو شرف تلمذ حاصل ہے ان میں حافظ ابوبشیر الدولابی اور حافظ ابوجعفر الطحاوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حافظ ابوبشیر الدولابی محمد بن احمد حدیث کے مشہور حافظ اور فن جرح و تعدیل کے امام ہیں طلب حدیث میں حسب تصریح حافظ ذہبی حرمین، عراق، مصر اور شام کا سفر کیا اور بہت سے شیوخ سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ علامہ ابن الجوزی لکھتے ہیں کہ۔ حدث عن اشیاخ فیھم کثرۃ بکثرت شیوخ سے حدیث بیان کی ہے[2] امام بخاری سے بھی تلمذ حاصل ہے چنانچہ امام بخاری سے ان کی کتاب الضعفاء الصغیر کے راوی بھی ہیں حافظ ابن یونس لکھتے ہیں:

کان الدولابی من اھل الصنعۃ حسن التصنیف

حافظ مسلم بن قاسم فرماتے ہیں۔

کان مقدمًا فی العلم والروایۃ و معرفۃ الاخبار

دولابی علم و روایت اور معرفت اخبار میں پیش پیش ہیں۔

اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ:

جالس العلماء و تفقہ لابی حنیفۃ

علماء کی ہم نشینی اختیار کی ہے اور ابوحنیفہ کا فقہ حاصل کیا۔

فن حدیث میں جن اکابر حفاظ نے آپ کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا ہے ان میں ابن عدی، طبرانی اور ابن المقری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سنن ابی داؤد کا صحاح میں مقام

امام ابوداؤد نے خود اپنی کتاب کا ایک خط میں تفصیلی تعارف کرایا ہے یہ خط اہل مکہ کے خط کا

---

[1] توضیح الافکار ج ۱ ص ۲۲۱ [2] المنتظم لابن الجوزی۔

جواب ہے جس میں انھوں نے کتاب السنن کی حدیثوں کے متعلق امام موصوف سے دریافت کیا تھا ظاہر ہے کہ اس موضوع پر امام موصوف کے بیان کو جو اہمیت ہے وہ کسی اور کے بیان کی نہیں ہو سکتی۔ ہم یہاں اس رسالہ کا اقتباس نواب صدیق حسن خاں کی کتاب الحطہ سے نقل کرتے ہیں:۔

آپ لوگوں نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ کتاب السنن میں جو حدیثیں آئی ہیں کیا وہ میرے علم کے مطابق صحیح ترین ہیں؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سب حدیثیں صحیح ہیں۔ لیکن ایسی حدیثیں جو دو صحیح طریقوں سے مروی ہوں اور ان میں ایک کا راوی اسناد میں مقدم ہو اور دوسری کا حفظ میں بڑھا ہوا ہو تو ایسی صورت میں کبھی پہلی کو لکھ دیتا ہوں اور بعض دفعہ میں نے ایک طویل حدیث کو مختصراً ذکر کیا ہے کیونکہ اگر میں اس کو پوری نقل کرتا تو بعض سامعین کو پتہ بھی نہ چلتا اور اس میں جو فقہ کا مسئلہ تھا وہ سمجھ میں نہ آتا۔ اس بنا پر میں نے اختصار کیا اور جب کسی باب میں میں نے کسی حدیث کو دو یا تین طریقوں سے دہرایا ہے تو اس لیے کہ اس میں کوئی بات زیادہ تھی اور کبھی اس میں دوسری احادیث کی بہ نسبت ایک لفظ زیادہ ہوتا ہے اور جو حدیثیں میں نے اپنی کتاب السنن میں درج کی ہیں ان میں اکثر مشہور ہیں جو ہر اس شخص کے پاس موجود ہیں جس نے تھوڑا بہت حدیث کو لکھا ہے لیکن ان میں تمیز کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے[1]

سنن ابی داؤد کی افادیت کے پیش نظر امام غزالی نے تصریح کی ہے کہ علم حدیث میں صرف یہی ایک کتاب مجتہد کے لیے کافی ہے۔ مشہور محدث ابو یحییٰ زکریا ساجی کے الفاظ ہیں۔

کتاب اللّٰہ عز وجل اصل الاسلام وکتاب السنن لابی داؤد عہد الاسلام۔[2]

حافظ حمیدی کا بیان ہے کہ ایک روز حافظ ابن حزم کی مجلس میں صحیحین اور ان کی رفعت شان کا تذکرہ ہوا تو حافظ ابن حزم نے بتایا کہ حافظ سعید بن سکن کے پاس محدثین کی ایک

---

[1] الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ۔ [2] شروط الائمہ الستہ ص ۱۷۔

جماعت آئی اور انہوں نے کہا کہ علم حدیث میں کتابیں بہت زیادہ ہیں اگر شیخ اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کریں اور بتائیں کہ ہم کون سی کتابوں کو اپنائیں تو بس ہم ان ہی پر اکتفا کریں۔ حافظ ابن سکن یہ سُن کر خاموش ہوگئے اور گھر کے اندر چلے گئے۔ اندر سے کتابوں کے چار گٹھے اوپر نیچے رکھ کر لائے اور فرمایا :

هذه قواعد الاسلام كتاب مسلم، كتاب البخاري وكتاب ابي داؤد وكتاب النسائي [1]

حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ جس حدیث پر امام ابوداؤد کلام نہ کریں وہ ان کے نزدیک صحیح ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ خود امام ابوداؤد کی تصریح یہ ہے کہ میں نے کتاب السنن میں وہ حدیثیں درج کی ہیں جو میرے علم میں ہر موضوع پر سب سے زیادہ صحیح ہیں اس سے حافظ ابن الصلاح اور امام نووی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جن حدیثوں پر ابوداؤد نے کوئی کلام نہیں کیا ہے وہ قابل عمل ہیں اور ان کا مقام صحیح نہیں بلکہ حسن ہے لیکن حافظ ابن رشید نے لکھا ہے کہ ابوداؤد کے کلام نہ کرنے سے حدیث کا ضعیف ہونا لازم نہیں آتا۔ بہرحال محدثین کے یہاں یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ وہ حدیثیں جن پر ابوداؤد نے کلام نہیں کیا صحیح ہیں یا حسن؟ علامہ یمانی نے یہ کہہ کر بات ختم کردی۔

فالصواب انه يحتمل الثلاثة الحسن والصحة والوهن غير الشديد لا كما قاله ابن الصلاح ولا كما قال ابن رشيد

ٹھیک یہ ہے کہ تین باتوں کا احتمال ہے کہ صحیح ہوں، حسن ہوں یا پھر ضعیف لیکن کم درجے کی۔ نہ ابن الصلاح کے خیال کے مطابق اور نہ ابن رشید کی رائے کے موافق [2]

علامہ خطابی نے سنن ابوداؤد کا تعارف کراتے ہوئے معالم السنن میں لکھا ہے کہ :

امام ابوداؤد کی کتاب السنن بلاشبہ ایسی عمدہ کتاب ہے کہ علم دین میں ایسی عمدہ کوئی کتاب نہیں ہے اس نے سب کی جانب سے سندِ قبولیت حاصل کرلی ہے چنانچہ یہ کتاب علماء کے تمام فرقوں کی جانب سے

---

[1] شروط الائمۃ الستہ ص ۱۶۔ [2] توضیح الافکار ج ۱ ص ۲۰۱۔

اور فقہاء کے سارے طبقوں میں باوجود اختلاف کے حکم مانی جاتی ہے۔
سب لوگ اسی گھاٹ اُترتے ہیں اور یہیں سے سیراب ہوتے ہیں۔ اسی
پر اہل مصر، اہل عراق، بلادِ مغرب اور روئے زمین کے بہت سے شہروں
کے رہنے والوں کو اعتماد ہے۔ البتہ خراسان میں بیشتر لوگ محمد بن اسمٰعیل،
مسلم بن الحجاج اور ان لوگوں کی کتابوں کے دلدادہ ہیں کہ جو جمع صحیح
میں ان دونوں حضرات کے قدم بقدم چلے ہیں اور جنہوں نے جانچ
پڑتال میں ان کی شرطوں کو ملحوظ رکھا ہے لیکن ابوداؤد کی کتاب ترتیب
کے اعتبار سے بہت اچھی اور بلحاظِ فقاہت بہت اونچی ہے[1]

فقاہت میں بہت اُونچی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دیگر مصنفین صحاح کے مقابلے میں امام ابوداؤد پر ذوق فقہی زیادہ غالب ہے۔ چنانچہ تمام ارباب صحاح میں صرف امام ابوداؤد ہی ایک ایسے بزرگ ہیں جن کو علامہ ابواسحاق الشیرازی نے طبقات الفقہاء میں جگہ دی ہے اور امام موصوف نے اسی فقہی ذوق کی بنا پر اپنی کتاب میں صرف احادیث احکام پر اکتفا فرمایا ہے اگرچہ اس پابندی کی وجہ سے ان کی یہ کتاب احادیث کے بہت سے ابواب سے خالی ہو گئی ہے لیکن احادیث فقہ کا جتنا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں موجود ہے صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں نہیں ہے چنانچہ حافظ ابوجعفر غرناطی کے حوالے سے حافظ جلال الدین السیوطی رقمطراز ہیں:

لابی داؤد فی حصر احادیث الاحکام واستیعابہا مالیس لغیرہ۔
احادیث احکام کے بیان میں جو مقام ابوداؤد کا ہے وہ کسی اور کا
نہیں ہے[2]

امام ابوداؤد کے اساتذہ بخاری اور مسلم کے ہی اساتذہ ہیں:

اخذ الحدیث عن مشائخ البخاری ومسلم کاحمد بن حنبل
ابوداؤد نے بخاری ومسلم کے اساتذہ مثلاً امام احمد سے کسب فیض کیا ہے

ان اساتذہ میں امام احمد کی شخصیت اس صدی کے محدثین میں پدر بزرگوار کی حیثیت رکھتی ہے۔ شاید ہی تیسری صدی کے محدثین میں کوئی ہو جس کا علمی نسب نامہ بالواسطہ یا بلاواسطہ امام

---

[1] معالم السنن ج ۱ ص ۶۔ [2] الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۱۲۵۔

موصوف سے نہ ملتا ہو بلکہ امام ذہبی نے امام احمد کے تمام تلامذہ میں ابوداؤد کی یہ خصوصیت بتائی ہے۔

کان یشبہ باحمد بن حنبل فی ھدیہ ودلہ وسمتہ[1]

یہ خصوصیت امام ابوداؤد کو امام احمد کے دوسرے شاگردوں سے ممتاز کرتی ہے اور حدیث میں امام احمد کو جن اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے ان میں ہیثم بن بشیر، امام جریر بن عبدالحمید، امام ابوبکر بن عیاش، عباد بن العوام، وکیع بن الجراح، ابن نمیر، عبداللہ بن المبارک، یزید بن ہارون، عبدالرزاق بن ہمام اور یحییٰ بن ابی زائدہ وہ گرامی قدر ہستیاں ہیں جن کو حدیث میں امام اعظم کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ امام ابوداؤد امام اعظم کی مساعی جلیلہ کو نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور بڑے ادب و احترام سے ان کا نام لیتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر بسند متصل الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء میں ان سے ناقل ہیں:-

حدثنا عبداللہ بن محمد بن عبدالمؤمن بن یحییٰ قال اخبرنا ابوبکر محمد بن بکر بن عبدالرزاق التمار المعروف بابن داسۃ قال سمعت اباداؤد یقول رحم اللہ مالکاً کان اماماً رحم اللہ الشافعی کان اماماً رحم اللہ اباحنیفۃ کان اماماً

ابوداؤد کہتے ہیں اللہ مالک پر رحمت فرمائے امام تھے اور ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور شافعی رحمہ اللہ بھی امام تھے[2]

سنن ترمذی کا صحاح ستہ میں درجہ

امام ترمذی کی کتاب سنن ابوداؤد اور امام بخاری دونوں کے طریقوں کی جامع ہے اس کی اس جامعیت کا کچھ اندازہ حافظ ابوبکر بن العربی کے اس بیان سے ہوتا ہے جو عارضۃ الاحوذی میں ہے:

اس کتاب میں حسب ذیل چودہ علوم ہیں۔ احادیث کی اس طرح تدوین جو عمل سے قریب تر کر دیتی ہے۔ بیان اسناد، تصحیح، تضعیف،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۵۳۔ [2] الانتقاء ص ۳۲۔

تعدد طرق، جرح رواۃ اور تعدیل، راویوں کے نام اور کنیت کا بیان، وصل و انقطاع کا ذکر، معمول بہ اور متروک العمل روایات کی توضیح، احادیث کے ردّ و قبول کا معیار، اس موضوع پر علماء کے اختلاف کا ذکر۔ احادیث کی توجیہ و تاویل کے بارے میں اختلاف افکار کا بیان — یہ وہ علوم ہیں کہ ان میں سے ہر علم اپنی جگہ مستقل ہے[1]

حافظ جلال الدین السیوطی نے قوت المغتذی میں حافظ ابو جعفر بن الزبیر غرناطی سے ترمذی کی خالص محدثانہ خصوصیت یہ بتائی ہے کہ :

وللترمذي في فنون الصناعة الحديثية مالم يشاركه غيره[2]۔

فن حدیث میں امام ترمذی کی وہ شان ہے جس میں امام ترمذی کا کوئی بھی شریک نہیں ہے۔

دراصل یہ امام ترمذی ہی کی خصوصیت ہے کہ ایک طرف انہوں نے اپنی کتاب میں احادیث احکام میں سے صرف ان احادیث کو لیا ہے کہ جن پر فقہاء کا عمل رہا ہے۔ دوسری طرف اس کو صرف احکام ہی کے لیے خاص نہیں کیا بلکہ امام بخاری کی طرح سب احادیث کو لے کر اپنی کتاب کو جامع بنا دیا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ علوم حدیث کی ایک سے زیادہ انواع کو کتاب میں اس طرح درج کیا ہے کہ وہ علم حدیث کا ایک چمنستان بن گیا چنانچہ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں :

جامع ترمذی حدیث کی تمام کتابوں میں بعض وجوہ سے سب سے اچھی ہے اوّل بلحاظ ترتیب، دوم فقہاء کے مذاہب کا تذکرہ، سوم حدیث کی بلحاظ اسناد قسمیں صحیح، حسن، ضعیف وغیرہ، چہارم راویوں کے نام، لقب اور کنیت وغیرہ اور ان وجوہ کے علاوہ اور بھی علم رجال سے متعلق فوائد ہیں[3]

صحیح کے ساتھ حسن اور غریب کی اصطلاح

اب تک محدثین حدیث کی تقسیم صحیح اور ضعیف میں محصور کرتے تھے امام ترمذی بقول حافظ ابن تیمیہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے صحیح اور ضعیف کے درمیان حسن کی اصطلاح قائم کی ہے اور حسن

---

[1] عارضۃ الاحوذی ص ۲۲۔ [2] مقدمہ ترمذی۔ [3] بستان المحدثین ص ۱۰۹۔

کی تعریف بھی خود امام ترمذی نے کتاب العلل میں یہ بتائی ہے :

ہر ایسی حدیث جس کی سند میں کوئی متہم بالکذب نہ ہو اور حدیث شاذ بھی نہ ہو اور ساتھ ہی کئی طریقوں سے لے روایت کیا گیا ہو۔

لیکن اس تعریف کی بنیاد پر یہاں اس سوال کو محدثین کے یہاں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اگر امام ترمذی کے نزدیک حدیث حسن کی یہی تعریف ہے اور حسن خود صحیح کی قسم نہیں بلکہ قسیم ہے یعنی یہ نہیں کہ صحیح کی دو قسمیں ہیں صحیح حسن اور غریب۔ تو اس صورت میں ایک ہی حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ کیونکر درست ہو سکتا ہے کہ ھذا حدیث حسن صحیح یا ھذا حدیث حسن صحیح غریب۔ ظاہر ہے کہ حدیث کی تقسیم اگر فرق مراتب بتانے کے لیے ہوتی ہے تو ایک حدیث میں ایک ہی وقت میں اعلیٰ اور ادنیٰ مراتب کا اجتماع کیونکر ہو سکتا ہے ؛

علماء نے اس کے ایک سے زیادہ جوابات دیے ہیں۔

کچھ کہتے ہیں کہ اگر ایک حدیث دو سندوں سے مروی ہو تو امام ترمذی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ حدیث ایک سند سے صحیح اور دوسری سے حسن ہے۔

لیکن جب امام ترمذی ایک حدیث کے بارے میں یہ کہہ کر لا نعرفہ الا من ھذا الوجہ پھر یہ فیصلہ فرما دیں کہ ھذا حدیث حسن صحیح تو یہ معاملہ پیچیدہ ہو جاتا ہے اور یہ جواب سوال کو حل نہیں کرتا ہے۔

کچھ کی رائے یہ ہے کہ حسن صحیح ایک جگہ کہہ کر امام ترمذی متن اور سند دونوں کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور اپنے مخاطبوں کے جملہ دماغ میں یہ بات اتارنا چاہتے ہیں کہ حدیث بلحاظ متن حسن اور بلحاظ سند صحیح ہے۔

حافظ ابن کثیر نے اسے بھی محل نظر قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں اپنی جو رائے حافظ صاحب نے لکھی ہے وہ بھی سن لیجئے فرماتے ہیں کہ :

حسن اور صحیح دونوں ملے جلے ہیں اور حسن صحیح کا مقام امام ترمذی کی نظر میں حسن سے بالا اور صحیح سے کمتر ہوتا ہے اس لیے حکم کے لحاظ سے صرف صحیح اس حدیث سے زیادہ قوت والی ہے جسے حسن صحیح کہہ دیں لے

لے اختصار علوم الحدیث ص ۴۴۔

لیکن حافظ عراقی نے حافظ ابن کثیر کی رائے کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ:

والذی ظھر لہ تحکم لا دلیل علیہ، وھو بعید من فھم معنی کلام الترمذی[1]

ابن کثیر کی رائے ایک اپچ ہے اس کی کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ترمذی کا کلام اس کا ساتھ دیتا ہے۔

ہمیں اس سلسلے میں شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ کی وہ رائے بہت پسند آئی ہے جو جناب علامہ احمد محمد شاکر نے الباعث الحثیث میں ان سے نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں:

دراصل امام ترمذی کی نظر میں حسن ذرا صحیح سے عام ہے ایک حدیث کبھی حسن ہوتے ہوئے صحیح ہوتی ہے اور کبھی صحیح نہیں ہوتی ہے بلکہ صرف حسن ہی ہوتی ہے کیونکہ حسن کے معنے ان کے نزدیک مقبول اور معمول بہ کے ہوتے ہیں اسی کے لیے امام مالک کے یہاں علیہ العمل ببلدنا کی تعبیر ہے۔ ایسی حدیث جو سند کے لحاظ سے قوی ہو اور اس کی پشت پر صحابہ و تابعین کی عملی تائید نہ ہو وہ امام ترمذی کی زبان میں صرف صحیح کہلاتی ہے اور ایسی حدیث جو سند کے لحاظ سے قوی نہ ہو مگر اسے عملی تائید حاصل ہو اس کو صرف حسن کہتے ہیں بالفاظ دیگر امام ترمذی نے حسن صحیح نیز حسن اور صحیح کی تعبیرات یہ بتانے کے لیے اختیار کی ہیں کہ کتاب میں لوگوں کے سامنے احادیث اور احادیث پر خیر القرون صحابہ و تابعین کا عمل یکجا ہو کر سامنے آجاتے اس لیے امام ترمذی ان تمام حدیثوں کو جن کی پشت پر صحابہ و تابعین کی عملی تائید ہو حسن کہتے ہیں خواہ وہ صحیح ہوں یا درجہ صحت سے گری ہوتی ہوں۔ اور اگر احادیث کو عملی تائید حاصل نہ ہو تو اسے امام ترمذی حسن نہیں کہتے چاہے وہ صحیح ہوں بلکہ[2]

---

[1] شرح المقدمہ ص ۵۲۔

[2] الباعث الحثیث ص ۴۴۔

ترمذی کے بارے میں ایک اہم سوال

یہاں اس سوال کو بھی بڑی اہمیت دی جاتی ہے کہ

امام ترمذی ایک حدیث کی تضعیف بھی کرتے ہیں، اور اس کے ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس پہ اہل علم کا عمل ہے حالانکہ یہ بات محدثین کے مقررہ اصول و قواعد کے سرتاسر خلاف ہے کیونکہ احکام میں محدثین حدیث صحیح اور حسن کے علاوہ کسی بھی حدیث کو قبول نہیں کرتے ہیں۔ ترمذی میں ایسے ایک سے زیادہ مقامات ہیں جہاں حدیث کے بارے میں ایک طرف امام ترمذی تصریح کرتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور دوسری طرف فرماتے ہیں کہ اس پہ اہل علم کا عمل ہے۔ ایک مثال پیش کرتا ہوں ترمذی میں باب الجمع بین الصلاتین میں یہ حدیث لاتے ہیں۔

حدثنا ابو سلمۃ یحییٰ بن خلف البصری نا المعتمر بن سلیمان عن ابیہ عن حنش عن عکرمۃ عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من جمع بین الصلاتین من غیر عذر فقد اتی بابًا من ابواب الکبائر۔

جس نے بغیر عذر کے دو نمازوں کو یکجا کیا ہے اس نے بڑے گناہوں میں سے ایک بڑے گناہ کا ارتکاب کیا۔

اور اس کے بعد اسی حدیث پر یہ نوٹ لکھا ہے:

قال ابو عیسٰی حنش ھذا ھو ابو علی الرحبی وھو حسین بن قیس وھو ضعیف عند اھل الحدیث ضعفہ احمد وغیرہ

حنش کی کنیت ابو علی اور نام حسین بن قیس ہے اور یہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے امام احمد نے اس کی تضعیف کی ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ:

والعمل علی ھذا عند اھل العلم ان لا یجمع بین الصلاتین الا فی السفر او بعرفۃ[1]

---

[1] سنن ترمذی ج ۱ ص ۲۶۔

اس قسم کے اور بھی کئی مواقع ہیں۔ اس کے جواب میں اگرچہ بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ امام ترمذی نے اس طرز عمل سے ایک بے حد اہم اور کار آمد محدثانہ نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اپنے مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانا چاہتے ہیں کہ حدیث اگرچہ ہم کو روایتی اور اسنادی طرز پر کمزور طریقے سے پہنچی ہے لیکن اسے اہل علم کی تائید حاصل ہے۔ اور اہل علم کا کسی حدیث کو اپنا لینا بھی حدیث کی صحت کی ضمانت ہے چاہے روایت کی دنیا میں اسے قابل اعتماد اسناد کی قوت حاصل نہ ہو۔ یہی بات حافظ جلال الدین السیوطی نے امام ترمذی کے اس طرز اور انداز سخن سے سمجھی ہے۔ چنانچہ حافظ صاحب حدیث بالا اور اس کے متعلقہ نوٹ پر رقمطراز ہیں:

اشار بذالك الى ان الحديث اعتضد بقول اهل العلم وقد صرح غير واحد من اهل العلم بان من دليل صحة الحديث قول اهل العلم به وان لم يكن له اسناد يعتمد على مثله[1]

امام ترمذی نے یہ بات بتائی ہے کہ حدیث میں اہل علم کے قول سے قوت آگئی اور اس کی بے شمار علماء نے تصریح کی ہے کہ یہ حدیث کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔

اگر یہ واقعہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی کتابوں کی صحت میں برتری کا دارومدار ابن الصلاح اور دوسرے متاخرین محدثین کے نزدیک ان کے التزام صحت اور شرائط پر نہیں بلکہ اس شہرت اور قبول پر ہے جو امت کی جانب سے ان دونوں کتابوں کو حاصل ہے تو پھر یہ ماننے میں کیا تامل ہو سکتا ہے کہ شہرت اور قبول میں بذات خود صحت کی ضمانت ہے چنانچہ ایک سے زیادہ محدثین نے اس کی تصریح کی ہے، حافظ سیوطی تدریب الراوی میں رقمطراز ہیں کہ:

يحكم للحديث بالصحة اذا تلقاه الناس بالقبول وان لم يكن له اسناد صحيح۔

حدیث کو صحیح قرار دیا جاتا ہے جب اسے لوگ شرف قبول عطا کر دیں چاہے اس کی کوئی صحیح سند نہ ہو۔[2]

حافظ ابن عبدالبر نے التمہید میں حضرت جابر کی اس مرفوع حدیث پر کہ

---

[1] تعقبات على الموضوعات ص ۱۲۔ [2] تدریب الراوی ص ۲۴۔

الدنیار اربعۃ و عشرون قیراطاً

لکھا ہے کہ علماء کی جماعت کا اسے اپنا لینا اور رائے عامہ کا اس پر مجتمع ہونا اس حدیث کو سند سے بے نیاز بنا دیتا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے الافصاح علی نکت ابن الصلاح میں لکھا ہے کہ:

حدیث کے مقبول ہونے کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ علماء اس حدیث کے مدلول پر متفق ہو جائیں کیونکہ وہ قابل ہوتی ہے تا آنکہ اس پر عمل واجب ہو جاتا ہے ائمہ اصول میں سے ایک جماعت نے اس کی تصریح کی ہے۔

حافظ شمس الدین سخاوی رقمطراز ہیں:

جب کسی ضعیف حدیث کو امت شرف قبول عطا فرمادے اس پر عمل کیا جائے گا تا آنکہ اسے حدیث متواتر کا ایسا مقام حاصل ہو جائے گا جس سے قطعی الثبوت کو منسوخ کیا جا سکتا ہے[1]

بعینہٖ یہی سوال علامہ عصر محدث شیخ حسین بن محسن یمانی سے بھی کیا گیا ہے انہوں نے اس سوال کا جواب مفصل دیا ہے اور یہ معجم طبرانی صغیر کے آخر میں التحفۃ المرضیہ فی حل بعض المشکلات الحدیثیہ کے نام سے ملحق ہے اور تقریباً سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کے جواب کا لب لباب یہی ہے کہ ضعیف حدیث وہ ہے۔

حیث لم یکن فی سندہ کذاب۔

بہرحال امام ترمذی نے یہ بات سمجھائی ہے کہ حدیث مقبول وہ ہے جسے اہل علم کی تائید حاصل ہو اور وہ قابل عمل ہے چاہے وہ ہم تک پہنچنے میں کمزور وسائل کا شکار ہو گئی ہو۔ اس لحاظ سے امام ترمذی کی کتاب کو دوسری کتابوں کے مقابلے میں بہت اونچا مقام حاصل ہے۔

امام ترمذی نے جن اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے ان میں امام بخاری، قتیبہ بن سعید، محمود بن غیلان، احمد بن منیع، محمد بن المثنی، ہناد اور ابو زرعہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور یہ سب کے سب بالواسطہ یا بلا واسطہ امام اعظم کے تلامذہ سے تلمذ کا شرف رکھتے ہیں

---

[1] فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث ص ۱۲۰۔

امام بخاری کے متعلق تو آپ سُن آئے ہیں کہ قتیبہ بن سعید کے اساتذہ میں امام مالک کے ساتھ لیث بن سعد اور شریک کا ذکر کیا ہے اور لیث بن سعد اور شریک سے امام اعظم کا جو رشتہ ہے وہ تاریخ میں کوئی چھپی بات نہیں ہے۔ احمد بن منیع، ہشیم، عباد بن العوام اور عبد اللہ کے واسطہ سے امام اعظم سے ملتے ہیں اور خود امام ترمذی کے تلامذہ میں سرفہرست جن لوگوں کا نام آتا ہے ان میں حماد بن شاکر اور عبد بن محمد بھی ہیں۔ دونوں نسفی ہیں۔ اوّل الذکران چار میں سے ایک ہیں جن سے صحیح بخاری کی روایت کا سلسلہ چلا ہے۔ یہ دونوں حنفی بزرگ ہیں۔ محمود بن غیلان کو بیک واسطہ امام اعظم سے تلمذ حاصل ہے۔ چنانچہ امام ترمذی نے اپنی جامع کی کتاب العلل میں امام اعظم سے جو روایت کی ہے کہ :

حدثنا محمود بن غیلان حدثنا ابو یحییٰ الحمانی قال سمعت اباحنیفة یقول ماراٸیت احدا اکذب من جابر الجعفی ولا افضل من عطاء بن ابی رباح[1]

تو اس سے بھی ان کا امام اعظم سے بواسطہ ابو یحییٰ تلمذ ثابت ہے۔ ابو یحییٰ کے بارے میں حافظ ذہبی نے بھی تصریح کی ہے کہ وہ امام اعظم کے شاگرد ہیں۔

صحاح ستہ میں ابن ماجہ کا مقام

حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں یہ کتاب حسن ترتیب میں ممتاز ہے چنانچہ شاہ عبد العزیز فرماتے ہیں :

فی الواقع از حسن ترتیب و سرد احادیث بے تکرار و اختصار آنچہ کتاب دارد ہیچ یک از کتب ندارد[2]

فی الواقع اپنی ترتیب اور احادیث کے بغیر تکرار بیان کرنے اور اختصار میں اس کتاب کی کوئی کتاب بھی ہمسر نہیں ہے۔

اور اس کتاب کی یہی وہ خوبی ہے کہ جس کو دیکھ کر حافظ ابو زرعہ رازی کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے۔

---

[1] ترمذی ج ۲ ص ۲۳۳۔ [2] بستان المحدثین ص ۱۱۲۔

میرا خیال ہے کہ اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھ آگئی تو یہ جوامع یا ان میں سے
اکثر بیکار ہو جائیں گی۔[1]

ابن الاثیر نے کتاب کی اس افادی حیثیت کو ان لفظوں میں سراہا ہے۔

کتابہ کتاب مفید قوی النفع فی الفقہ

صحت کے لحاظ سے ابن ماجہ کا پایہ کتب خمسہ جیسا نہیں ہے۔ کتب خمسہ کے بارے میں اگرچہ
آپ حافظ ابوطاہر مقدسی کا یہ بیان سن چکے ہیں۔

قد اتفق علی صحتہا علماء الشرق والغرب[2]

لیکن حافظ عراقی کو ابوطاہر سے اس میں اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں:

جو شخص کتب سنن کو صحیح کہتا ہے جیسے ابوطاہر نے کتب خمسہ کی صحت
پر اتفاق کا اعلان کیا ہے اور جیسے حاکم کہ ترمذی کی کتاب کو الجامع الصحیح
کہتا ہے اور ایسے ہی خطیب۔ یہ تساہل ہے[3]

اور حافظ ذہبی نے بتایا ہے کہ:

ابن ماجہ حافظ، صدوق اور واسع العلم ہے لیکن ان کی سنن کا درجہ کمتر
ہونے کی وجہ اس کتاب میں مناکیر اور قدرے موضوعات ہیں[4]

حافظ سیوطی نے ابن رشید سے نقل کیا ہے۔

ابن ماجہ میں تفردات ہیں اور یہ ایسے لوگوں کی روایات پر مشتمل ہیں جن پر
کذب کی اور احادیث کی چوری کی تہمت ہے۔

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں کہ:

امام ذہبی نے ابن ماجہ میں کچھ احادیث کے موضوعہ ہونے کا جو پتہ دیا ہے
اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ احادیث باطلہ کم ہیں ورنہ جہاں تک احادیث
ضعیفہ کا مسئلہ ہے وہ تو ابن ماجہ میں کم از کم ایک ہزار حدیثیں ہیں[5]

اسی بنا پر حافظ ابوالحجاج المزی کا فیصلہ یہ ہے کہ:

---

[1] الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۱۰۰۔ [2] اختصار علوم الحدیث۔ [3] شرح الالفیہ ص ۱۰۴۔
[4] الاجوبۃ الفاضلہ ص ۷۱۔ [5] زہر الربیٰ ص ۴۔

ان الغالب فیما تفرد بہ الضعف[1]

ابن ماجہ کے تفردات میں زیادہ تر ضعف ہے۔

لیکن اس کے باوجود علمائے متاخرین نے سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شمار کیا ہے کیونکہ ضعیف روایتوں کا ہونا ابن ماجہ کی ہی خصوصیت نہیں ہے بلکہ صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان میں کم ہیں اور ابن ماجہ میں زیادہ ہیں۔ اور ان سب کتابوں کو باوجود ضعیف روایات ہونے کے صحاح ستہ تغلیباً کہا جاتا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی ہر روایت صحیح ہے۔ جناب علامہ فاضل نواب صدیق حسن خاں مسک الختام میں فرماتے ہیں:۔

> ان چھ کتابوں کو اصول ستہ، صحاح ستہ، کتب ستہ اور امہات ست کہتے ہیں۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے اشعتہ اللمعات میں فرمایا ہے کہ چھ کتابیں جو اسلام میں مشہور ہیں یہ ہیں۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ۔ اور کچھ کی رائے میں بجائے ابن ماجہ مؤطا ہے اور صاحب جامع الاصول نے مؤطا ہی کو اختیار کیا ہے اور ان کتابوں میں حدیث کی قسمیں صحیح، حسن اور ضعیف سب موجود ہیں اور ان کو صحاح کہنا محض تغلیباً ہے[2]

مؤلفین صحاح کے نقطۂ نظر کا اختلاف

اگرچہ ایک ہی موضوع پر ان بزرگوں کا یہ تصنیفی کارنامہ ہے ان کے شیوخ بھی بالواسطہ یا بلا واسطہ ایک ہی طبقہ کے لوگ ہیں۔ ان کے سامنے تالیفی سرمایہ بھی ایک ہی تھا۔ اس کے باوجود ان بزرگوں نے جُدا جُدا میدان تصنیف میں جو دادِ تحقیق دی ہے اس میں ان کا ایک خاص نصب العین، خاص مطمح نظر اور خاص پیش نہاد ہے۔ ایک ہی موضوع پر ایک ہی قسم کی حدیثوں کو الگ الگ پیش کرنے میں ایک گہری معنویت ہے۔

امام بخاری کا نقطۂ نظر

امام بخاری کا مطمح نظر اپنی صحیح میں احادیث صحیحہ کا استیعاب نہیں ہے کیونکہ وہ خود فرماتے ہیں۔

---

[1] توضیح الافکار۔ [2] مسک الختام ج ۱ ص ۱۷۔

لم اخرج فی ھذا الکتاب الا صحیحا و ما ترکت من الصحیح اکثر

میں نے اس کتاب میں صحیح احادیث روایت کی ہیں اور زیادہ صحیح احادیث میں نے چھوڑی ہیں [1]

امام حازمی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ امام بخاری کا مقصود احادیث صحیحہ کا ایک اختصار تیار کرنا ہے احادیث صحیحہ کا استیعاب ان کے پیش نظر نہیں ہے۔

علامہ زاہد کوثری نے امام بخاری کا مطمح نظر وضاحت کے ساتھ سمجھایا ہے کہ

صحیح میں امام بخاری کی غرض صرف یہ ہے کہ احادیث صحیحہ متصلہ کی تخریج کی جائے اور اس کے ساتھ ان احادیث سے فقہ، سیرت اور تفسیر کے مسائل کا استنباط کیا جائے۔ اور استشہاد میں صحابہ، تابعین اور فقہاء کی آراء سے مدد لی جائے اسی بنا پر وہ متون احادیث میں تقطیع بھی کرتے ہیں [2]

علامہ نواب صدیق خاں نے بھی امام بخاری کا یہی مطمح نظر بتایا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

امام بخاری نے صحت احادیث کے ساتھ فقہی فوائد اور حکیمانہ نکتوں کے استنباط کا بھی التزام کیا ہے [3]

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

امام بخاری نے محسوس کیا کہ ان کی صحیح فقہی فائدوں اور حکیمانہ نکتوں سے مالا مال ہو۔ آپ نے اپنی سمجھ کے مطابق متون احادیث سے بہت سے نت نئے معانی نکالے ہیں اور ان ہی معانی کی مناسبت سے احادیث کو ایک سے زیادہ بابوں میں الگ الگ کر کے پیش کیا ہے [4]

اور امام نووی فرماتے ہیں کہ:

امام بخاری کا مقصد صرف احادیث کا تعارف نہیں ہے بلکہ کتاب میں ان کا اصلی پیش نہاد یہ ہے کہ احادیث سے احکام استنباط کیے جائیں اور زندگی کے مختلف مسائل کے لیے ان سے استدلال کیا جائے

---

[1] شروط الائمۃ الخمسہ ص۵۰ ۔ [2] التعلیقات علی الحازمی ص۵۰ [3] الحطہ ص۸۳ ۔ [4] الھدی الساری ص۶ ۔

اسی وجہ سے بہت سے ابواب اسناد سے خالی ہیں [1]

بہرحال امام بخاری کا مطمح نظر صحیح میں صرف احادیث صحیحہ کا انتخاب ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ان کے پیش نظر دوسرے مقاصد بھی ہیں ۔

امام مسلم کا مطمح نظر

امام مسلم کا بھی اپنی صحیح میں یہ مقصد نہیں کہ ساری صحیح حدیثوں کا کتاب میں استیعاب کیا جائے بلکہ ان کا اصلی مقصد یہ ہے کہ ان حدیثوں کے لیے زیادہ سے زیادہ صحیح طرق کی فراہمی کی جائے اور صرف صحیح حدیثوں کو یک جا کر دیا جائے ۔ چنانچہ خود امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں اس بات کی توضیح کر دی ہے ۔ امام نووی فرماتے ہیں :

> جمع فیہ طرقہ التی ارتضاھا فاختار ذکرھا واورد فیھا اسانیدہ المتعددۃ والفاظہ المختلفۃ ۔
>
> امام مسلم نے اپنی صحیح میں ایک حدیث کے اپنی پسند کے سارے طریقوں کو یکجا کر کے ذکر کر دیا ہے اور اس کو متعدد سندوں اور مختلف الفاظ کے ساتھ پیش کیا ہے [2]

علامہ زاہد کوثری نے اسے زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش فرمایا ہے :

> امام مسلم کا مقصد صرف صحیح حدیثوں کو پیش کرنا ہے ان کے پیش نظر احادیث سے مسائل کا استنباط نہیں ہے وہ ایک حدیث کے سارے طرق کو ایک ہی جگہ صرف اس لیے سمیٹ دیتے ہیں تاکہ دیکھنے والے کے سامنے متون کا اختلاف اور اسانید کی نیرنگی بہترین شکل میں نمایاں ہو کر آجائے [3]

بہرحال امام مسلم کا پیش نہاد صرف حدیث کی اسنادی اور روایتی حیثیت کو نکھار کر پیش کرنا ہے ۔

امام ابوداؤد کا تالیف میں مقصد

امام ابوداؤد کا مطمح نظر اپنی سنن میں صرف ان احادیث کو یکجا کرنا ہے جن سے فقہا نے استدلال

---

[1] مقدمہ فتح الباری ص ۱۲ ۔ [2] الحطہ ص ۹۹ ۔ [3] شروط الائمۃ الخمسہ ص ۴۹ ۔

کیا ہے اور جن پر فقہائے کے مذاہب کی عمارت قائم ہوئی ہے۔ اسی بنا پر اصول کی کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ اجتہاد کے میدان میں صرف ابوداؤد کافی ہے۔

حافظ ابوبکر الخطیب فرماتے ہیں کہ:

ابوداؤد کی سنن علم دین میں بے مثال کتاب ہے اسے فقہا اور محدثین کے یہاں یکساں قبولیت کا شرف حاصل ہے۔ عراقیوں، مصریوں اور اہل مغرب کا اسے اعتماد ہے۔ ابوداؤد سے پہلے بے شک علماء نے جوامع اور مسانید تالیف کیے ہیں اور ان میں سنن، اخبار، قصص، مواعظ اور ادب کا علمی سرمایہ تھا لیکن سنن کو خالصاً کسی نے بھی ایسا پیش نہیں کیا جیسا کہ ابوداؤد نے یہ [1]

امام خطابی ابوداؤد کی شرح میں رقمطراز ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ امام ابوداؤد نے اپنی کتاب میں اصول علم، امہات السنن اور احکام فقہ پر مشتمل حدیث کا ایسا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے کہ متقدمین اور متاخرین میں اس کی مثال نہیں ہے [2]

حافظ ابن القیم الجوزی فرماتے ہیں کہ:

کتاب ابوداؤد کا اسلام میں ایک خاص مقام ہے اس کی حیثیت مسلمانوں میں ایک جج کی اور نزاع و جدال میں ایک قاضی کی ہے کیونکہ اس میں فقہ کی احادیث کا بھرپور سرمایہ ہے اور اس پر طرہ یہ کہ حسن ترتیب اور حسن نظم میں یہ اپنی مثال آپ ہے۔ مجروحین اور ضعفاء کی حدیثوں کو خوب نکھار دیا ہے [3]

امام ابوعیسیٰ ترمذی کا پیش نہاد

امام ترمذی کا پیش نہاد جامع ترمذی میں یہ ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم کے طریقوں کو یکجا کیا جائے یعنی ابواب کے ذریعہ استنباط مسائل کا نمونہ بخاری کے طرز پر ہو اور احادیث صحیحہ کے انتخاب

---

[1] الحطہ ص ۱۴۷۔ [2] معالم السنن ج ا ص ۱۳۔ [3] تہذیب السنن ج ا ص ۸۔

میں امام مسلم کی ترجمانی کی جاتے اور اس کے ساتھ ابوداؤد کے قدم بقدم چل کر صحابہ، تابعین اور فقہا کے مذاہب کو پوری وضاحت سے بیان کیا جاتے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ طرق حدیث میں ایک کا تفصیلی اور باقی کا اجمالی خاکہ پیش کر کے حدیث کا محدثین کے یہاں جو مقام ہے اسے معین کر دیا جاتے۔ گویا امام ترمذی کی کتاب ایک معجون مرکب ہے جس میں تینوں کتابوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

علامہ زاہد کوثری فرماتے ہیں:

> امام ترمذی کا مطمح نظر بخاری اور مسلم کے دو طریقوں کو ایک جگہ پیش کرنا ہے گویا امام ترمذی کو شیخین کا یہ طریق بیان وابہام میں بھایا ہے اور اس کے ساتھ وہ ابوداؤد کے طریقے کو بھی اپناتے ہیں اور اس پر ان کی جانب سے یہ اضافہ بھی ہے کہ صحابہ، تابعین اور فقہائے امصار کے مذاہب کو بیان کرتے ہیں۔ طرق حدیث میں بڑے اختصار سے کام لیا ہے ایک کو بیان کر کے باقی کی طرف اشارہ فرما دیتے ہیں اور ہر حدیث کے بارے میں بتلاتے ہیں کہ صحیح ہے یا حسن اور یا منکر۔ ضعف کی وجہ بتاتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ حدیث مستفیض ہے یا غریب۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب میں کوئی ایسی حدیث نہیں درج کی جس پر کچھ فقہا نے عمل نہ کیا ہو۔ سوائے ان دو حدیثوں کے۔ فان شرب فی الرابعة فاقتلوه اور جمع بین الظهر والعصر بالمدینة من غیر خوف ولا سفر [1]

امام نسائیؒ کا کتاب کی تالیف میں مسلک

اس کتاب میں امام نسائیؒ کا مسلک یہ ہے کہ خالص محدثانہ نقطہ نظر سے امام بخاری اور امام مسلم کے طریقوں کو انوکھے انداز میں پیش کر کے بیان علل میں خاص طریق پیش کیا جاتے۔ شاید اسی بنا پر مغرب کے بعض محدثین صحیح بخاری پر اس کی ترجیح کے قائل ہیں۔ چنانچہ حافظ شمس الدین سخاوی رقمطراز ہیں کہ:

---

[1] التعلیقات علی الشروط الائمۃ الخمسہ ص ۵۰۔

بعض مغاربہ نے تصریح کی ہے کہ امام نسائی کی کتاب کو بخاری پر فضیلت ہے[1]

اور اسی لیے ناقدینِ فن کے نزدیک جلالتِ علمی کے اعتبار سے امام نسائی کا پایہ امام مسلم سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

> فنِ رجال میں ماہرینِ فن کی ایک جماعت نے ان کو امام مسلم پر بھی فوقیت دی ہے[2]

حافظ ابوعبداللہ ابن رشید نے امام نسائی کا اس کتاب میں مسلک یہ بتایا ہے کہ:

> یہ کتاب علم سنن میں جس قدر کتابیں تالیف ہوئی ہیں ان سب میں فضیلت کے لحاظ سے انوکھی اور بلحاظ ترتیب بہترین ہے اور یہ بخاری اور مسلم دونوں کے طریق کی جامع ہے نیز علل حدیث کا بھی ایک حصہ اس میں بیان کیا گیا ہے[3]

امام ابن ماجہ کا مطمح نظر

امام ابن ماجہ کا مطمح نظر یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسائل فقہیہ پر مشتمل چند در چند متنوع عنوانوں کے ساتھ بغیر تکرار کے ایک مختصر مجموعہ لوگوں کے سامنے آجاتے۔

شاہ عبدالعزیز بستان المحدثین میں فرماتے ہیں۔

> فی الواقع ترتیب کی خوبی اور بغیر کسی تکرار کے احادیث کی پیش کش اور اختصار کا نمونہ جو یہ کتاب رکھتی ہے کوئی کتاب نہیں رکھتی۔

صحاح ستہ کی علمی خدمت

چونکہ علماء نے ان چھ کتابوں کی مختلف طریقوں سے علمی خدمت کی ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے اسی سلسلے کی دو اہم کڑیاں پیش کریں۔ ان کا نام مستخرجات اور اطراف ہے۔

---

[1] فتح المغیث ص ۱۲۔ [2] ہدی الساری ص ۸۔

[3] زہر الربی از سیوطی ص ۴۔

مستخرجات صحیحین اور استخراج کے فوائد

محدثین کی اصطلاحی زبان میں استخراج جیسا کہ حافظ عراقی اور حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے لکھا ہے کہ

ان یاتی المصنف الی الکتاب فیخرج احادیثہ باسانید لنفسہ من غیر طریق صاحب الکتاب

مصنف کوئی حدیث کی کتاب لے اور اس میں مندرج حدیثوں کو اپنی سندوں سے روایت کرے اور یہ صاحب کتاب سے الگ ہو۔

اس میں شرط یہ ہے کہ مستخرج خود صاحب کتاب سے کوئی حدیث روایت نہ کرے بلکہ صحیح سند کے ساتھ اوروں سے روایت کرے۔ چنانچہ صاحب تنقیح الانظار فرماتے ہیں:

شرط المستخرج الا یروی حدیث البخاری ومسلم منھا بل یروی حدیثھما عن غیرھما[1]

محدثین نے استخراج کے فوائد پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے۔ چند فوائد یہ ہیں۔

۱۔ اس کے ذریعے حدیث میں زیادہ الفاظ کی کوئی تشریح یا کسی محذوف کی تعیین ہو جاتی ہے

۲۔ کبھی مستخرج کی حدیث کی سند اصل سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔

۳۔ کثرت طرق کی وجہ سے حدیث میں قوت آجاتی ہے اور احادیث میں باہم تعارض کے وقت یہ قوت ترجیح میں بہت مفید کام کرتی ہے۔ یعنی تعارض کے وقت اس حدیث کو راجح قرار دیا جاتا ہے جس کے طرق زیادہ ہوں اور کثرت طرق معلوم کرنے کا ذریعہ محدثین کے یہاں استخراج ہے[2]

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ استخراج کے ان کے علاوہ اور بھی بہت فائدے ہیں۔

اول: مخرجین کی عدالت بھی اس سے صاف اور منقح ہو کر سامنے آجاتی ہے

دوم: کسی بھی روایت میں سماع کی تصریح مل جاتے تو عنعنہ کے ذریعے پیدا شدہ ابہام تدلیس کا شبہ دور ہو جاتا ہے۔

---

[1] تنقیح الانظار ج ۱ ص ۷۱۔ [2] تنقیح الانظار ج ۱ ص ۷۱۔

سوم: احادیث میں ایک بڑا اور اہم مسئلہ ان لوگوں کا ہے جو آخر عمر میں اختلاط کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ اختلاط حافظہ کی خرابی، بیماری یا کسی اور افتاد کی وجہ سے ہو جاتا ہے اصل کتاب میں آمدہ روایت کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ قبل از اختلاط ہے یا بعد از اختلاط۔ استخراج یہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ روایت کس دور سے متعلق ہے۔

چہارم: اصل کتاب کے متن یا سند کے بارے میں ابہام ہوتا ہے۔ استخراج میں تصریح آجاتی ہے اور اس طرح چہرۂ ابہام بے نقاب ہو جاتا ہے۔

پنجم: کبھی اصل کتاب کی حدیث میں راوی کے الفاظ خاص ہوتے ہیں باقی روایتوں کو صاحب کتاب مثلہ، یا نحوہ کہہ کر آگے چل دیتا ہے۔ استخراج کے ذریعے اس میں امتیاز ہو جاتا ہے۔

ششم: احادیث کی سند یا متن میں گاہ گاہ راوی کی جانب سے ادراج ہوتا ہے اور اس کا پتہ نہیں چلتا۔ استخراج کے ذریعے ادراج منقح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

ہفتم: حدیث بظاہر مرفوع ہوتی ہے لیکن واقعہ میں وہ موقوف ہوتی ہے۔ استخراج اس معاملے میں قاضی کا کام کرتا ہے[1]

امام بخاری اور امام مسلم کی کتابوں یعنی صحیحین کے جو مستخرجات لکھے گئے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ مستخرج حافظ ابوبکر احمد بن ابراہیم الاسماعیلی الجرجانی ۳۷۱ھ
۲۔ مستخرج حافظ ابو احمد محمد بن ابی حامد الغطریفی ۳۷۷ھ
۳۔ مستخرج حافظ ابو عبد اللہ محمد بن العباس بن ابی ذہل ۳۷۸ھ
۴۔ مستخرج حافظ ابوبکر احمد بن موسیٰ مردویہ الاصبہانی ۴۱۶ھ
۵۔ مستخرج حافظ ابی عوانہ یعقوب بن اسحاق الاسفرائنی ۳۱۶ھ
۶۔ مستخرج حافظ محمد بن محمد النیشاپوری ۲۸۰ھ
۷۔ مستخرج حافظ ابو الفضل احمد بن سلمہ البزار ۲۸۶ھ
۸۔ مستخرج حافظ ابو نعیم الاصبہانی ۴۳۰ھ

احادیث صحیحین کے طرق واسانید کی تعداد

سارے مستخرجات کا یہاں استقصاء مقصود نہیں ہے صرف یہ دکھانا ہے کہ اس سلسلے میں

---

[1] توضیح الافکار ج ۱ ص ۷۳۔

محدثین نے کس قدر عرق ریزی سے کام لیا ہے اور اس کا نتیجہ ہے کہ اگر حافظ زین الدین عراقی، حافظ ابن الصلاح اور حافظ ابن کثیر کی تصریح کے مطابق صحیح بخاری میں آمدہ حدیثوں کی تعداد تکرار کو چھوڑ کر صرف چار ہزار ہے اور امام نووی اور حافظ ابن کثیر کی رائے کے مطابق صحیح مسلم میں حدیثوں کی تعداد بھی صرف چار ہزار ہے۔ لیکن استخراج کی وجہ سے ان چار ہزار حدیثوں کو جن جن طریقوں سے روایت کیا گیا ہے اور حدیثوں کی یہ تعداد جن اسانید کے ذریعے آج اُمت کے ہاتھوں میں موجود ہے اس کی تعداد صرف چار ہزار نہیں بلکہ پچیس ہزار چار سو اسی ہے چنانچہ محمد بن اسمٰعیل الیمانی رقمطراز ہیں:

> صحیحین کے سارے طرق اور اسانید کی تعداد کے بارے میں حافظ ابن حجر نے حافظ جوزقی کی المتفق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انہوں نے صحیحین کی ایک ایک حدیث کا استخراج کیا ہے۔ تمام طرق و اسانید کی مجموعی تعداد پچیس ہزار چار سو اسی ہے[1]

اللہ اکبر! صرف چار ہزار ارشادات نبوت اُمت کو پچیس ہزار چار سو اسی طریقوں اور اسانید سے ملے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اتنے بڑے انبوہ نے ان ارشادات کو منتقل کرنے میں کوئی کوتاہی کی ہوگی۔ نظر کو بلند تر کیجئے اور ان لوگوں کی محنتوں اور عرق ریزیوں کی داد دیجئے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین میں ایک بڑی بھاری جماعت یہ کہتی ہے کہ صحیحین کی تمام احادیث قطعیت کو مفید ہیں۔ حافظ ابن حزم سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے نزدیک حدیث کے لیے کتنے راویوں کی ضرورت ہے جس کے بعد حدیث بداہتہً علم کا فائدہ دے سکے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی خاص عدد مقرر نہیں ہے۔ اگر دو شخص بھی کوئی خبر دیں اور ان کے بارے میں ہمیں یہ یقین ہو کہ اس سے پہلے نہ وہ کبھی ایک دوسرے سے ملے ہیں اور نہ اس خبر میں ان کے لالچ یا خوف کو کوئی دخل ہے۔ پھر ایک دوسرے کی لاعلمی میں اس خبر کو ہمارے سامنے بیان کریں وہ بھی از خود نہیں بلکہ ایک ایک جماعت کے واسطے سے۔ تو ہمیں ان کی سچائی کا بدیہی طور پر یقین آجائے گا۔ ہر وہ شخص جو دنیا کے حالات سے روزمرہ کی زندگی میں دوچار ہوتا ہے ہمارے اس بیان کی شہادت دے سکتا ہے کسی کی موت، ولادت، نکاح، ولایت اور اس قسم کے تمام واقعات کا بدیہی علم ان طریقوں سے حاصل ہوتا ہے[2]

---

[1] توضیح الافکار ج ۱ ص ۶۱۔ [2] توجیہ النظر۔

بہر حال صحیحین کے طرق واسانید کی یہ تعداد بتا رہی ہے کہ احادیث صحیحین صحیح ہیں اور یہ صرف صحیحین کی خصوصیت نہیں بلکہ دوسری کتابوں کے بھی مستخرج لکھے گئے ہیں۔ حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں:

مستخرج صحیحین ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ محمد بن عبد الملک نے سنن ابی داؤد کا، ابو علی الطوسی نے ترمذی شریف کا اور ابو نعیم نے ابن خزیمہ کی کتاب کا مستخرج لکھا ہے۔[1]

صحیحین اور دوسری کتب کے اطراف

محدثین کی زبان میں مسانید اور اطراف دونوں میں مرکزی توجہ روایت کنندہ صحابی پر ہوتی ہے یعنی ہر صحابی کی مرویات کو بلا لحاظ مضمون یکجا کیا جاتا ہے مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ مسانید میں پوری حدیث بیان کرتے ہیں مگر اطراف میں صرف حدیث کا کوئی مشہور حصہ بیان کر کے شیخین اور سنن کے تمام مشترک اور مخصوص طرق کا ذکر کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر حدیث کے شروع سرے کو اتنا بیان کر کے کہ جس سے باقی حدیث کی یاد دہانی ہو جائے اس کی تمام اسانید کو بالاستیعاب بیان کیا جاتا ہے یا ان کتابوں کا پتہ دے دیا جاتا ہے کہ جن میں یہ حدیث مروی ہے۔ اس موضوع پر بہت سے حفاظ حدیث نے داد تحقیق دی ہے۔ ان میں سب سے پہلے جن بزرگ نے صحیحین پر اطراف لکھے ہیں وہ حافظ ابو مسعود دمشقی سنہ ۴۰۱ھ ہیں۔ ان کے بعد حافظ ابو محمد خلف بن محمد سنہ ۴۰۱ھ، حافظ ابو نعیم اصفہانی اور حافظ ابن حجر نے بھی یہ علمی خدمت انجام دی ہے۔

صحیحین کے علاوہ کتب خمسہ کے اطراف حافظ احمد بن ثابت ازدی نے بھی لکھے اور کتب سنن کے اطراف لکھنے والے یہ بزرگ ہیں۔

حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی سنہ ۵۰۷ھ، حافظ ابو الحجاج جمال الدین المزی سنہ ۷۴۲ھ، حافظ شمس الدین ابو المحاسن محمد بن علی الحسینی الدمشقی۔ حافظ ابو القاسم بن عساکر، حافظ سراج الدین ابو حفص عمر بن نور الدین علی بن احمد الانصاری المعروف بابن الملقن۔ اس کے علاوہ بھی اور بہت سی کتابوں کے اطراف لکھے گئے ہیں۔ حافظ ابن طاہر نے امام اعظم کی احادیث پر اطراف لکھے

---

[1] تدریب الراوی ص ۸۲۔

ہیں جس کا نام اطراف احادیث ابی حنیفہ ہے ۔

دوسری اور تیسری صدی کے مولفین حدیث

ہم نے بالارادہ تیسری صدی کے محدثین میں ارباب صحاح کے تالیفی کارناموں پر ذرا کچھ تفصیلی تبصرہ کیا ہے کیونکہ اس صدی میں فن حدیث کے ارتقاء کا یہ وہ نقطہ کمال ہے جہاں پہنچ کر علم حدیث ایک فن کی حیثیت سے ہر قسم کی قوت سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آیا اور اس فن کا ایک ایک شعبہ محدثین کی محنتوں سے پایۂ تکمیل کو پہنچا ۔ اس صدی کے محدثین اور ارباب روایت نے حدیث کی خاطر خشکی اور تری کو چھان مارا اور دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں پہنچے ایک ایک شہر اور ایک ایک گاؤں میں جاکر تمام منتشر اور پراگندہ روایتوں کو جمع کیا اور اس طرح مسانید وجود میں آگئے ۔ صحت سند کی چھان بین کی گئی ۔ اسماء الرجال کی تدوین ہوئی ، جرح و تعدیل نے ایک فن کی صورت اختیار کر لی تا آنکہ صحاح جیسی بیش بہا کتابیں تصنیف و تالیف کے بازار میں آگئیں ۔

چونکہ تیسری صدی میں اسنادی وسائل کا دامن زیادہ سے زیادہ وسیع ہو گیا حتیٰ کہ جو حدیث دوسری صدی میں صرف دو واسطوں سے معلوم ہوتی تھی وہ تیسری صدی میں چھ اور سات واسطوں کی محتاج ہو گئی ۔ اس دور کے محدثین کو تاریخ رجال کی طرف توجہ کرنی پڑی اور اسماء الرجال کا عظیم الشان فن مدون ہوا ۔

ڈاکٹر اسپرنگر کا یہ کہنا ایک واقعہ اور حقیقت کا اقرار ہے کہ

> نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت ہم آج پانچ لاکھ اشخاص کا حال معلوم کر سکتے ہیں ۔ (ترجمان السنہ ص ۱۷۰)

محدثین نے اس کام کے لیے بڑے جتن کیے اور پاپڑ بیلے ہیں ۔ ہر ہر راوی کے پورے پورے حالات معلوم کیے ۔ اس کے نتیجے میں ہر روایت کے بارے میں اسناد کے لیے بلحاظ قوت و ضعف ، صحت و بطلان اور اتصال و انقطاع نئی نئی بحثیں پیدا ہو گئیں اور حدیث کے فن میں نت نئی اصطلاحات منصۂ شہود پر آگئیں ۔

بنا بریں تیسری صدی کے محدثین کی راہ علم حدیث کے سلسلے میں دوسری صدی کے محدثین سے کچھ ممتاز ہو گئی کیونکہ دوسری صدی کے محدثین براہ راست مشاہیر تابعین یا کبار اتباع تابعین

کے تلامذہ تھے اور اس لیے ان کو اسناد کے بارے میں تحقیقات کی بہت کم ضرورت تھی لیکن تیسری صدی میں روایت میں اسنادی وسائط پہلے سے کئی گنا زیادہ ہو گئے تھے اس لیے تیسری صدی کے محدثین کو نئے حالات اور جدید تقاضوں کے تحت اپنی شاہراہ بنانی پڑی۔ علم حدیث کے مختلف گوشوں میں اس کا نمایاں طور پر ظہور ہوا۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں اس پر قدرے تفصیل سے بحث کریں تاکہ ناظرین کے سامنے خالص روایتی نقطہ نظر سے دوسری اور تیسری صدی کے محدثین کے مابین فرق نمایاں ہو کر آجاتے اور ان اختلافی حدود کی نشاندہی ہو جاتے جس کی بنا پر علم حدیث کو یہ حالات درپیش آئے ہیں۔ سب سے پہلے اس موقعہ پر نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں حکیم الامت شاہ ولی اللہ کا وہ بیان پیش کر دیں جس سے ان دونوں صدیوں کے محدثین کے طرز عمل پر کافی روشنی پڑتی ہے شاہ صاحب تیسری صدی کے موتفین کا چہرہ لکھتے ہوتے رقمطراز ہیں:

غرض احادیث کی تدوین اور ان کو رسالوں اور کتابوں میں لکھنے کا رواج تمام اسلامی شہروں میں اس قدر عام ہو گیا کہ محدثین میں شاید ہی ایسے حضرات تھے جن کے پاس حدیث کا کوئی مجموعہ، رسالہ یا کتاب نہ ہو۔ ہر شخص ان میں سے حدیث در بغل کا مصداق تھا۔ بڑے بڑے علماء نے حدیث کی خاطر حجاز، شام، عراق، مصر، یمن اور خراسان کی خاک چھان ماری۔ کتابیں جمع کیں، نسخے تلاش کیے۔ احادیث غریبہ اور نوادر و آثار کو بہت محنت سے فراہم کیا اور ان کی توجہ سے وہ احادیث منصہ شہود پر آگئیں جو پہلے نہ تھیں اور ان کو وہ بات اس علم میں نصیب ہوئی جو پہلے کسی کو نصیب نہ تھی اور احادیث کی سندیں اس کثرت سے وجود میں آگئیں کہ بہت سی حدیثوں کی سینکڑوں سندیں معلوم ہو گئیں۔ اسانید کی کثرت نے بہت سی مستور اسانید سے پردہ ہٹا دیا۔ ہر حدیث کی غرابت اور شہرت کا پتہ لگ گیا۔ متابعات اور شواہد وجود پذیر ہو گئے۔ وہ احادیث سامنے آئیں جن سے پہلے ارباب فتوی باخبر نہ تھے اور باخبر نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ بہت سی حدیثوں کو خاص خاص شہر والے ہی روایت کرتے تھے مثلاً شام والے، عراق والے یا پھر خاص گھرانے کے آدمی روایت کرتے تھے جیسے بریدہ کی کتاب اور عمرو بن شعیب کا رسالہ، یا پھر مثلاً کوئی

روایت بیان کرنے والا صحابی غیر مشہور ہے اور اس سے چند حضرات کے سوا کسی نے روایت نہیں سنی ہے۔ تیسری صدی کے محدثین سے پہلے لوگ اسماء الرجال اور مراتب عدالت کے بارے میں صرف اپنے مشاہدے اور قرائن پر اعتماد کرتے تھے لیکن محدثین نے اسی کو موضوع بنا کر خوب چھان بین کی اور بحث و تدوین کے ذریعے اسے مستقل فن بنادیا اس کے نتیجے میں حدیث کا اتصال و انقطاع واضح ہو گیا۔[1]

آئیے شاہ صاحب ہی کی زبانی دوسری صدی کے محدثین کا بھی حال سن لیجئے۔ وہ انصاف اور حجۃ اللہ میں رقمطراز ہیں کہ :

اس طبقہ کے علماء کا طرز عمل ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے استدلال کیا جائے چاہے وہ مرسل ہو یا مسند۔ نیز صحابہ و تابعین کے اقوال سے استدلال کیا جائے کیونکہ ان کے علم میں یہ اقوال یا تو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں جن کو انہوں نے مختصر کر کے موقوف بنا لیا تھا یا پھر حکم منصوص سے ان کا استنباط تھا یا اپنی آراء سے ان کا اجتہاد تھا اور ہر صورت میں صحابہ و تابعین اپنے طرز عمل کے اعتبار سے بعد میں آنے والوں سے کہیں بہتر تھے اور کہیں زیادہ صائب الرائے تھے۔ نیز زمانے کے لحاظ سے سب سے مقدم اور علم کے اعتبار سے سب سے بڑھ چڑھ کر تھے لہٰذا سوائے اس صورت کے کہ ان میں باہم کسی مسئلہ میں اختلاف ہو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ان کے قول کے صریح خلاف ہو۔ ہر حال میں ان کے اقوال پر عمل کرنا لازم ہے اور جس صورت میں کسی بھی مسئلہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں مختلف ہوں تو اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرتے۔ اگر صحابہ کسی حدیث کے نسخ کے قائل ہوتے یا اس کو ظاہری معنے سے پھیر دیتے یا اس کے بارے میں

---

[1] الانصاف ص ۳۳ تا ۳۵۔

کوئی تصریح نہ کرتے لیکن ترک حدیث یا اس پر عمل نہ کرنے میں متفق ہوتے تو ان کے نزدیک یہ بات حدیث کے معلل ہونے یا منسوخ ہونے اور یا پھر موؤل ہونے کی علامت ہوتی۔ بہرحال ان سب صورتوں میں اس طبقہ کے علماء نے صحابہ ہی کا اتباع کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ امام مالک نے کتے کے برتن میں منہ ڈالنے والی حدیث کے بارے میں فرمایا کہ جاء الحدیث ولا ادری ما حقیقتہ؟ حدیث تو ہے مگر مجھے اس کی حقیقت کا پتہ نہیں ہے۔ امام مالک کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس پر فقہاء کو عمل کرتے نہیں دیکھا ہے۔ اور جب صحابہ و تابعین کے مذاہب میں بھی اختلاف ہوتا تو ہر عالم کے نزدیک اپنے ہی اہل شہر اور اپنے اساتذہ کا مذہب مختار سمجھا جاتا۔ کیونکہ وہ ان کے صحیح اور غیر صحیح اقوال سے باخبر ہوتا اور جو اصول ان اقوال کے مناسب ہوتے ان کو محفوظ رکھتا[1]

اسی روشنی میں دوسری صدی کے مؤلفین نے اپنے مسائل کی تدوین کی ہے۔ شاہ صاحب نے یہی بات قرۃ العینین میں پورے زور سے کھول کر سمجھائی ہے۔ فرماتے ہیں:

اور جو شخص ان مذاہب کے اصول سے واقفیت رکھتا ہے اس بارے میں شک نہیں کرسکتا کہ ان مذاہب کی اصل و اساس فاروق اعظم کے اجماعی مسائل ہیں اور یہ ان تمام مذاہب کے درمیان ایک مشترک چیز ہے۔ اس کے بعد مدینہ والوں میں فقہاء صحابہ مثلاً عبداللہ بن عمر اور عائشہ ہیں اور کبار تابعین مدینہ میں سے فقہاء سبعہ اور صغار تابعین میں سے زہری اور ان جیسے حضرات پر اعتماد امام مالک کے مذہب کی بنیاد ہے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود کے فتاویٰ پر اعتماد اکثر حالات میں اور حضرت علی مرتضیٰ کے فیصلوں پر کچھ حالات میں بشرطیکہ حضرت علی کے ان فیصلوں کو نقل کرنے والے عبداللہ بن مسعود کے اصحاب ہوں اور اس کے بعد امام ابراہیم نخعی اور شعبی کی تحقیقات اور ان کی تخریج پر

---

[1] الانصاف۔

اعتماد امام ابوحنیفہ کے مذہب کی بنیاد ہے[1]

آپ نے حکیم الامت کی زبان سے دوسری اور تیسری صدی کے علماء محدثین میں فرق و امتیاز اور خطوط اختلاف پڑھ لیے ہیں۔ یقیناً آپ اس موازنہ سے اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ دوسری اور تیسری صدی کے محدثین کے مابین ایک سے زیادہ مسائل علم حدیث کی حدود کے اندر رونما ہو گئے تھے۔ حدیث کی صحت، تعلیل حدیث، جرح و تعدیل رواۃ، حدیث کے رد و قبول، تحمل و سماع حدیث، شہرت و غرابت حدیث، وجوہ ترجیح اور مختلف احادیث میں مفاہمت، شرح حدیث اور خود حدیث کے آئینی اور قانونی مقام جیسے اہم مسائل میں تیسری صدی کے مؤلفین نے اپنی راہ بالکل نئی بنالی۔

دوسری اور تیسری صدی میں صحت حدیث کا معیار

اصول میں حدیث صحیح کی یہ تعریف کی گئی ہے

الصحیح ما اتصل سندہ بنقل عدل ضابط عن مثلہ من غیر شذوذ ولا علۃ قادحۃ[2]

حدیث صحیح کی یہ تعریف حافظ ابن الصلاح اور حافظ زین الدین عراقی نے کی ہے۔ اگرچہ اس تعریف سے امام خطابی صاحب معالم السنن کو اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ محدثین کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ:

ما اتصل سندہ و عدلت نقلتہ

اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ عامہ محدثین کے نزدیک حدیث کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے۔

سند میں اتصال ہو، راویوں میں عدالت اور ضبط ہو اور حدیث شاذ اور معلل نہ ہو۔

اور امام خطابی راویوں کی عدالت اور سند کے اتصال کے علاوہ کوئی شرط نہیں بتاتے۔ یہ تیسری صدی کے محدثین کا فیصلہ ہے اور اسے ہی حافظ ابن الصلاح نے محدثین کا اتفاقی موقف قرار

---

[1] قرۃ العینین ص ۱۷۱، ۱۷۳۔ [2] تنقیح الانظار ص ۱۴۔

دیا ہے۔ اس میں تین چیزیں مثبت ہیں اور دو منفی۔ مثبت یعنی اتصال سند، عدالت اور ضبط اور منفی یعنی شاذ نہ ہونا اور معلل نہ ہونا۔ امیر یمانی فرماتے ہیں کہ محدثین کے یہاں صحیح کی تعریف میں یہ پانچوں چیزیں بنیادی ہیں۔

ان پانچوں میں سے اتصال کی قید تیسری صدی کے محدثین نے اس لیے اضافہ کی ہے کہ ان کے زمانے میں اسنادی وسائط زیادہ ہوگئے تھے ان واسطوں میں اہم کڑیاں معلوم کرنا اور پھر ان میں باہم اتصال کا پتہ لگانا ضروری ہے۔ امام بخاری نے اتصال کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ دو راویوں کا صرف معاصر ہونا کافی نہیں ہے بلکہ ملاقات بھی ضروری ہے چاہے ایک بار ہی ہو۔ اگر معاصرت کے ساتھ ملاقات ہو تو پھر وہ عنعنہ سے روایت کو قبول کر لیتے ہیں ورنہ وہ اتصال کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ امام بخاری نے اس نظریہ کی توضیح تاریخ میں کی ہے اور صحیح میں ان کا اسی پر عمل ہے۔

قد اظهر البخاری هذا المذهب فی التاریخ وجری علیہ فی الصحیح[1]

لیکن امام مسلم نے اتصال کے معاملے کو اس قدر سنگین نہیں بنایا بلکہ وہ اس سنگینی پر امام بخاری پر برہم بھی نظر آتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اگر دونوں میں معاصرت ہو تو پھر ملاقات کی شرط بے سود ہے۔ معاصر دوسرے معاصر سے اگر روایت عنعنہ سے پیش کرے تو اسے اتصال پر محمول کیا جائے گا اور اس پر صحیح مسلم کے مقدمہ میں ایک بصیرت افروز نوٹ لکھا ہے۔

ان بزرگوں نے اتصال کو اتنی اہمیت اس لیے دی ہے کہ اسانید کے سلسلہ میں وسائط کی بہتات کی وجہ سے ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ ایک ایک راوی کے بارے میں ان کو یہ تحقیق کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی کہ جس سے وہ روایت لیتا ہے وہ اس کا معاصر ہے یا نہیں ہے۔ معاصر ہے تو اس سے اس کی ملاقات ہوتی ہے یا نہیں اور اگر ملا ہے تو اس نے یہ خاص حدیث اس سے سنی ہے یا کسی اور سے سن لی اور اس کا حوالہ دے دیا ہے ایسے بہت سے امور کی پابجائی میں محدثین کو جان کی بازی لگانی پڑتی ہے لیکن دوسری صدی کے مؤلفین کو چونکہ براہ راست مشاہیر تابعین یا کبار اتباع تابعین سے شرف تلمذ تھا اس لیے ان کو نہ اسناد کے بارے میں تحقیقات کی زیادہ ضرورت پیش آتی اور نہ ان کے یہاں اتصال کو اس قدر اہمیت تھی۔ ان کے یہاں مسند و مرسل

---

[1] مقدمہ فتح الباری۔

کی کوئی تفریق نہ تھی مرسل بھی مسند کی طرح حجت تھی۔

حدیث مرسل محدثین کی اصطلاح میں وہ حدیث کہلاتی ہے جس میں تابعی اپنے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین جو واسطہ ہے اس کو بیان کیے بغیر قال رسول اللہ کہے جیسا کہ عام طور پر مکحول دمشقی، ابراہیم، سعید بن المسیب اور حسن بصری اور دیگر تابعین کا معمول تھا۔ پھر اگر راوی نے دو راویوں کے درمیان جو شخص واسطہ ہے اسے چھوڑ دیا جیسے ایک شخص حضرت ابوہریرہ کا ہم عصر نہ ہونے کے باوجود کہے قال ابوہریرہ تو ایسی روایت محدثین کی زبان میں منقطع کہلاتی ہے اور اگر ایک سے زیادہ واسطے حذف کر دیے تو اسے معضل کہتے ہیں اور فقہاء و اصولیین کے یہاں ان سب کو مرسل کہتے ہیں۔

حدیث مرسل اور دوسری صدی کے ائمہ حدیث

حدیث مرسل کے بارے میں تیسری صدی میں ارباب روایت نے اپنا موقف دوسری صدی کے موقفین سے اتصال کی خاطر الگ بنا لیا ورنہ تیسری صدی سے پہلے اسنادی وسائط کم ہونے کی وجہ سے سب ہی حدیث مرسل کو دین میں مسند کی طرح حجت مانتے تھے اور مسائل و فتاویٰ کی بنیاد اسی پر قائم تھی۔ حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

> تابعین سارے کے سارے مرسل کے قبول پر متفق تھے ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی بھی امام سے دوسری صدی کے اختتام تک اس کا انکار ثابت نہیں ہے[1]

علامہ یمانی نے حافظ ابن جریر کا یہ فیصلہ حافظ ابن عبد البر اور حافظ بلقینی سے نقل کیا ہے امام ابوداؤد نے اپنے اس خط میں جو اہلِ مکہ کے نام لکھا ہے مرسل حدیث کے بارے میں اقرار کیا ہے کہ:

> باقی رہیں احادیث مرسلہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کو گزشتہ علماء مثلاً سفیان ثوری، امام مالک، امام اوزاعی سب ہی قابل استدلال سمجھتے تھے تا آنکہ امام شافعی آئے اور انہوں نے اس پر لب کشائی فرمائی اور

---

[1] توضیح الافکار ج ۱ ص ۲۹۱۔

امام احمد نے بھی اس موضوع پر ان کا اتباع کیا۔[1]

بلکہ حافظ ابن جریر تو یہاں تک کہہ گئے کہ یہ کہنا کہ مرسل حجت نہیں ہے

بدعۃ حدثت بعد مائتین تیسری صدی کی بدعت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دوسری صدی کے بزرگوں کو غلبۂ عدالت کی وجہ سے اپنے زمانے کے بزرگوں پر ایسا ہی اعتماد تھا جیسا اس زمانے میں ابن حجر اور دار قطنی کو بخاری و مسلم پر ہے کیونکہ اس دور میں عدالت غالب تھی چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر فرماتے ہیں:

ولا شك ان الغالب على حملة العلم النبوي في ذالك الزمان العدالة۔

بے شک اس زمانے میں اہل علم میں عدالت غالب تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ ایک متدین، متقی اور پرہیزگار شخص سے امید بھی یہی کی جا سکتی ہے کہ اس بڑی ذمہ داری کو انہوں نے اطمینان کے بعد ہی اٹھایا ہے کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی بات کو منسوب کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آپ کی طرف کسی بات کو منسوب کرنا دراصل اللہ سبحانہ کی طرف منسوب کرنا ہے جس کے دین و ایمان، سیرت و کردار پر بھروسہ کیا جاتا ہو کیا اس سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ قصداً اللہ کے دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ کر دیں گے جسے وہ جانتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت درست نہیں ہے یقیناً ایک حیثیت سے یہ افترا علی اللہ اور قول علی اللہ بغیر علم ہے اور قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر اسے سب سے بڑا ظلم قرار دیا ہے۔ جن بزرگوں کی عدالت مسلم ہو یقیناً ان سے اس کی توقع نہیں ہو سکتی یہ کھلا ہوا ایک عقلی قانون ہے۔ اسی بنا پر ان بزرگوں کے نزدیک حدیث مرسل حجت ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر لکھتے ہیں۔

مرسل الصحابة والتابعين وائمة الحديث مقبولة۔[2]

سوچا جائے کہ ائمہ حدیث کے مراسیل آج بھی ہمارے یہاں کیا اسی بنا پر مقبول نہیں ہیں؟ ائمہ حدیث کی جو کتابیں آج رائج ہیں کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ اصول حدیث کے مقررہ اصول کے مطابق ان کا اتصال ثابت ہے؟ اب ان کتابوں کی مرویات کو ان کتابوں کے مؤلفین تک جن

---

[1] تعلیقات علی شروط الائمۃ الخمسہ ص ۵۷۔ [2] الروض الباسم ص ۱۷۔

اسانید تک پہنچاتے ہیں اور جن رجال کے ذریعے ہم تک پہنچ رہی ہیں کیا ان کی عدالت ، ثقاہت ، امانت ، حفظ وضبط کی ہم نے اسی طرح چھان بین کی ہے جس طرح امام بخاری اور امام مسلم نے اپنے اساتذہ سے لے کر صحابہ تک کی ہے ۔ ان کتابوں کی مرویات کو ان کی طرف منسوب کرنے کی ہمارے پاس اس کے سوا دلیل ہی کیا ہے کہ :

والدليل على ذالك ان العلماء ماذالوا ينسبون فى مصنفاتهم الاحاديث الى من اخرجها ۔

اس بات کی اس کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہمیشہ سے علماء اپنی تصانیف میں حدیثوں کو ان محدثین کی طرف نسبت کرتے رہے ہیں [1]

اس لیے جیسا کہ ہمیں ان ائمہ حدیث کی بیان کردہ حدیثوں پر باوجود اتصال نہ ہونے کے اعتماد ہے ایسا ہی امام مالک کو سعید بن المسیب کے اور امام ابوحنیفہ کو امام شعبی اور ابراہیم نخعی کے روایت کردہ ارشادات پر اعتماد تھا ۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

ابراہیم نخعی نے ایک موقعہ پر جب کہ انہوں نے یہ حدیث روایت کی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محاقلہ اور مزابنہ سے منع فرمایا ہے اور ان سے کہا گیا تھا کہ کیا تمہیں اس کے سوا اور کوئی حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یاد ہی نہیں ۔ کہا کہ کیوں نہیں ؟ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ قال عبداللہ ، قال علقمة مجھے زیادہ پسند ہے ۔ اسی طرح شعبی جس وقت ان سے ایک حدیث کی بابت سوال کیا گیا اور کہا گیا کہ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع کر دیا جائے تو یہ جواب دیا تھا کہ نہیں مرفوع نہ کرو ہم کو یہ زیادہ محبوب ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص تک اس کو نقل کیا جائے کیونکہ اگر روایت میں کمی وبیشی ہوگی تو وہ بعد کے شخص پر ہی رہے گی [2]

بہر حال دوسری صدی کے مؤلفین کے یہاں حدیث کے صحیح ہونے کے لیے مسند ہونا ضروری نہ تھا بلکہ وہ مرسل اور منقطع سب کو یکساں دین میں حجت قرار دیتے تھے ۔

---

[1] الروض الباسم ص ۱۷ ۔ [2] الانصاف ۔

اگرچہ مرسل کا انکار تیسری صدی کے محدثین نے اسنادی وسائط میں زیادتی کی وجہ سے اپنے خیال میں احتیاط کی بنا پر کیا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو متعدد مسائل میں جہاں مرسل کے علاوہ اور کوئی روایت مسند ان کے علم میں نہ تھی۔ اگلے ائمہ سے اختلاف کرنا پڑا۔ متاخرین میں دارقطنی اور بیہقی بڑے نامور محدث گزرے لیکن ان دونوں کا حال یہ ہے کہ سند پر سند اور روایت پر روایت ذکر کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کے ضعیف ہونے کی ان کے پاس کوئی وجہ نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ اسے مرسل ثابت کریں یا موقوف کہہ دیں۔

یہ نہ بھول جائیے مصنفین صحاح میں سے اگرچہ امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں تصریح کی ہے کہ مرسل روایات حجت نہیں ہیں لیکن یہ تمام ارباب صحاح کا متفقہ فیصلہ نہیں ہے۔

امام ابوداؤد فرماتے ہیں:

فاذا لم یکن مسند ضد المرسل ولم یوجد مسند فالمرسل یحتج به ولیس هو مثل المعضل فی القوة۔

جب مسند مرسل کے خلاف نہ ہو اور مسند موجود نہ ہو تو مرسل سے احتجاج کیا جائے گا اور وہ قوت میں معضل کی طرح نہ ہو گی[1]

مراسیل صحابہ کے بارے میں تقریباً تمام علماء کرام متفق ہیں کہ وہ حجت ہیں۔ چنانچہ امام بیہقی کتاب القراۃ میں لکھتے ہیں کہ مراسیل صحابہ حجت ہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ مراسیل صحابہ جمہور اہل اسلام کے نزدیک حجت ہیں۔ اور ایک دوسرے مقام پر رقمطراز ہیں کہ ہمارے نزدیک اور دیگر تمام علماء کرام کے نزدیک مرسل صحابی حجت ہے[2]

اور علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ

صحابہ کرام کے مراسیل حدیث مسند کے حکم میں ہیں[3]

کبار تابعین کے بارے میں بھی امام بیہقی نے تصریح کی ہے کہ:

مراسیل کبار تابعین بھی مراسیل صحابہ کی طرح حجت ہیں جبکہ ان کے راویوں میں عدالت اور شہرت ہو اور کمزور و مجہول رواۃ کی روایت سے اجتناب ہو[4]

---

[1] رسالہ ابی داؤد۔ [2] شرح تہذیب ج ۴ ص ۲۸۲۔ [3] نیل الاوطار ج ۱ ص ۲۲۱۔ [4] کتاب القراۃ ص ۱۴۳

واضح ہے کہ ان تصریحات کے پیش کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ یہ مسئلہ اتفاقی ہے کسی نہ کسی انداز میں سب مانتے ہیں کہ مراسیل دین میں حجت ہیں اختلاف تفصیلات میں ہے نفس مسئلہ میں نہیں ہے۔

اس موقعہ پر حافظ ابو سعید صلاح الدین العلائی نے جامع التحصیل لاحکام المراسیل میں بڑے پتے کی بات لکھی ہے۔

جن لوگوں نے احادیث میں عنعنہ سے کام لیا ہے اور ان پر تدلیس کا شبہ ہے وہ سب ایک درجہ کے نہیں ہیں۔ کچھ تو اپنی جلالت قدر کی وجہ سے اس زمرہ میں شمار ہی نہیں ہو سکتے مثلاً یحییٰ بن سعید، ہشام بن عروہ اور موسیٰ بن عقبہ۔ کچھ ایسے ہیں جن کی تدلیس کو ائمہ نے برداشت کیا ہے اور ان کی روایت لی ہے چاہے انہوں نے سماع کی تصریح نہیں کی ہے اور ایسا صرف ان کی جلالتِ شان اور امامت کی وجہ سے ہے مثلاً امام زہری، امام اعمش، ابراہیم نخعی، الحکم بن عتیبہ، ابن جریج، الثوری، ابن عیینہ، شریک اور ہشیم بن بشیر، ان کی روایات صحیحین میں موجود ہیں۔[1]

موسیٰ بن عقبہ کی صحیح بخاری میں روایت موجود ہے لیکن اسماعیل نے تصریح کی ہے کہ ان کا امام زہری سے سماع ثابت نہیں ہے۔ صحیح مسلم میں ابان بن عثمان کی بحوالہ عثمان بن عفان روایت موجود ہے حالانکہ امام احمد فرماتے ہیں کہ ابان نے عثمان سے نہیں سنا ہے اس انقطاع کے باوجود ان روایات کا کتابوں میں ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے یہاں بھی مرسلات کو شرف حاصل ہے۔

اس موقعہ پر ہمیں حافظ ابن رجب حنبلی کی وہ بات پسند آتی ہے جو مشہور علامہ زاہد کوثری نے ان سے نقل کی ہے اور جس کے ذریعے انہوں نے مرسلات کے موضوع پر دوسری اور تیسری صدی کے مؤلفین کے درمیان مفاہمت کی کوشش کی ہے فرماتے ہیں:

دونوں کے نقطۂ نظر میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ محدثین کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کے محدثانہ اور روایتی نقطہ نظر سے انقطاع اور عدم اتصال کی بنا پر اگر کوئی حدیث صحیح نہیں ہے اور وہ مرسل ہے تو وہ درجہ صحت میں آجاتے اور فقہاء یعنی دوسری صدی کے محدثین کی نظر اس کی اسناد پر نہیں بلکہ ان معنے پر ہوتی ہے جو حدیث مرسل میں بیان ہوئے ہیں اور اس کی پشت پر ایسے قرائن موجود ہیں جو

---

[1] جامع التحصیل لاحکام المراسیل بحوالہ شروط ص ۴۲۔

ان معنے کی صحت کی دلیل ہیں۔[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ محدثین کی نظر اسناد پر ہوتی ہے اور دوسری صدی کے محدثین کے پیش نظر صرف معنے ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایسے دور میں ہیں جس میں اسناد کی تحقیق کی چنداں ضرورت ہی نہیں ہے۔

افراد و غرائب اور تیسری صدی کے محدثین

چونکہ تیسری صدی کے محدثین نے اتصال کو صحت حدیث کا معیار بنا لیا تھا اس لیے انہوں نے ہر نادر نوشتے اور غیر متداول صحیفے کا کھوج لگایا۔ مختلف اسلامی شہروں کے افراد و غرائب فراہم کیے اور تمام پریشان اور غیر متداول روایات جمع کر لیں اور طرق و اسانید کے ذریعے تمام علوم اسلامی جو اب تک خاص خاص سینوں اور سفینوں میں منتشر تھے یکجا ہو گئے۔ دوسری صدی کے مؤلفین عام طور پر اپنی کتابوں میں ان ہی روایات کو جگہ دیتے تھے جو اہل علم میں متداول تھیں۔ قاضی ابو یوسف نے ایسے موقعہ کے لیے یہ جچا تلا معیار پیش فرمایا تھا کہ :

الروایۃ تزداد کثرۃ ویخرج منہا مالا یعرف ولا یعرفہ اہل الفقہ ولا یوافق الکتاب ولا السنۃ فایاک وشاذ الحدیث وعلیک بما علیہ الجماعۃ من الحدیث وما یعرفہ الفقہاء وما یوافق الکتاب والسنۃ۔

روایات میں بلحاظ کثرت اضافہ ہوگا اور غیر معروف حدیثیں منصۂ شہود پر آئیں گی جن کو نہ اہل فقہ جانتے ہیں اور جو نہ کتاب و سنت کے موافق ہیں۔ تم حدیث شاذ سے بچ کر رہنا اور صرف اس حدیث کو اپنانا جو جماعت پیش کرے جسے فقہاء جانتے ہوں، جو قرآن و سنت کے موافق ہو۔[2]

لیکن تیسری صدی کے محدثین میں یہ انداز بدل گیا اور اس کے نتیجے میں افراد و غرائب کے جمع ہو جانے پر ایسی روایات سامنے آئیں کہ جن پر صحابہ، تابعین اور فقہاء مجتہدین کا عمل نہ تھا اور جو فقہاء

---

[1] تعلیقات علی شروط الائمۃ الخمسۃ ص ۴۵۔ [2] الرد علی سیر الاوزاعی ص ۳۱۔

میں متداول اور معروف نہ تھیں۔ تیسری صدی میں جن محدثین پر روایتی نقطہ نظر کا غلبہ تھا ان کو ان افراد و غرائب کی صحت پر اصرار تھا۔ ان کا خیال تھا کہ صحیح سند سے ایک چیز کے ثابت ہو جانے کے بعد اس پر عمل میں چون وچرا کرنا دیدہ و دانستہ حدیث کی مخالفت ہے لیکن دوسری صدی کے محدثین ایسی روایات کو شواذ کہتے ہیں۔ تیسری صدی کے محدثین صحتِ سند پر زور دیتے تھے۔ اس وجہ سے تیسری صدی کے ارباب روایت نے ایسی تمام روایات کو معمول بہ قرار دیا اور ان مسائل میں دوسری صدی کے مجتہدین سے بالکل جداگانہ رائے قائم کر لی اور صحابہ و تابعین کے جو فتاویٰ ان روایات کے خلاف تھے ان کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ نحن رجال وھم رجال یعنی جس طرح ان کو اجتہاد کا حق تھا ہمیں بھی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں ہم یہاں آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

ابوداؤد و ترمذی کی حدیث قلتین

ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث ہے کہ:

سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الماء وما ینوبہ من الدواب والسباع فقال صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان الماء قلتین لم یحمل الخبث[1]

صرف ابوداؤد میں ہی نہیں بلکہ ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں بھی ہے، یہ حدیث خواہ کتنے ہی متعدد طرق سے آئی ہو اور خواہ سند کے لحاظ سے کیسی ہو مگر یہ امر واقعہ ہے کہ یہ حدیث دوسری صدی میں غیر معروف تھی۔ اسے اہلِ علم و فتویٰ میں سے کوئی بھی قابلِ عمل سمجھتا تھا اور اس بنا پر قاضی ابو یوسف کی زبان میں شاذ تھی۔

حافظ ابن القیم نے تہذیب سنن ابی داؤد میں اس حدیث کے ہر پہلو پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے لیکن اس ساری بحث میں سب سے زیادہ لطیف پہلو وہ ہے جس میں انہوں نے اس حدیث کے شذوذ کو بے نقاب کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

یہ حدیث حلال و حرام، پاک و ناپاک کے بارے میں فیصلہ کن ہے

---

[1] ابوداؤد ص ۵۶۔

اور پانیوں کے مسئلہ میں اس کی حیثیت وہی ہے جو زکوٰۃ کے سلسلہ میں مختلف نصاب ہائے زکوٰۃ کی ہے۔ اگر اس کی حیثیت ٹھیک ٹھیک یہی ہے تو کیا وجہ ہے کہ یہ حدیث صحابہ میں مشہور نہیں ہوئی اور گوشۂ گمنامی میں پڑی رہی۔ حالانکہ اُمت کو اس کی نصاب زکوٰۃ سے بھی زیادہ ضرورت تھی کیونکہ زکوٰۃ تو ہر کس وناکس پر فرض نہیں ہوتی مگر پانی تو ہر وضو اور غسل میں اسلامی زندگی کی ناگزیر ضرورت ہے اس لیے ضروری تھا کہ یہ حدیث ایسے ہی ذرائع سے ہمارے پاس پہنچتی جن ذرائع سے پیشاب کی نجاست، اس کے غسل کا وجوب اور نماز کی عدد رکعات نقل ہو کر آئی ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اس حدیث کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرنے والے صرف ایک حضرت عبداللہ بن عمر ہیں اور حضرت عبداللہ سے روایت کرنے والے صرف عبیداللہ اور عبداللہ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر کے دوسرے تلامذہ نافع، سالم، ایوب اور سعید بن جبیر کہاں گئے اور اہلِ مدینہ اور ان کے علماء اس حدیث سے کیوں بے خبر ہے حالانکہ وہ اس حدیث کے سب سے زیادہ ضرورت مند تھے کیونکہ پانی کی ان کے یہاں قلت تھی اور یہ ممکن نہیں ہے کہ حضرت ابن عمر کو یہ حدیث معلوم ہو اور ان کے اصحاب اور ان کے شہر میں جو اہلِ علم تھے ان کو خبر نہ ہو اور وہ اس کو روایت نہ کریں۔ لہٰذا اگر یہ حدیث حضرت ابن عمر کے پاس ہوتی تو ابن عمر کے اصحاب اسے روایت کرتے اور اہلِ مدینہ کا یہ مسلک ہوتا۔ اس سے بڑھ کر اس حدیث کا شذوذ اور کیا ہوگا؟ اور چونکہ اس کا قائل کوئی نہیں ہے اس لیے اس موضوع پر حضرت ابن عمر کے پاس حدیث کا ہونا ثابت نہیں ہے۔ یہ اس روایت کے شاذ ہونے کا بیان ہے۔[1]

---

[1] تہذیب السنن ج ۱ ص ۶۲ مصری مطبع انصار السنۃ المحمدیہ۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث نے بھی اس حدیث کے متروک العمل اور شاذ ہونے پر ایک جامع تبصرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

اس کی مثال حدیث قلتین ہے کیونکہ یہ حدیث صحیح ہے اور ایک سے زیادہ طریقوں سے مروی ہے۔ سب کا دارومدار ولید بن کثیر عن محمد بن جعفر بن الزبیر عن عبداللہ یا محمد بن عباد بن جعفر عن عبیداللہ بن عبداللہ ہے۔ دونوں عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں اس سند کے بعد اس کے بہت سے طریقے ہیں۔ عبداللہ اور عبیداللہ کی ثقاہت میں کوئی کلام نہیں ہے لیکن ان علماء میں سے نہیں جن پر فتویٰ کا دارومدار اور لوگوں کا اعتماد تھا۔ اس بنا پر یہ حدیث نہ سعید بن المسیب کے عہد میں ظاہر ہوئی اور نہ زہری کے زمانے میں اور نہ اس پر مالکیہ چلے اور نہ احناف میں سے کسی نے اس پر عمل کیا[1]

دیکھ لیجئے کہ شاہ صاحب نے اس روایت کے دونوں مرکز عبیداللہ اور عبداللہ کے بارے میں یہ کہہ کر

وان کانا من الثقات لکنهما لیس ممن وسد الیهم الفتویٰ وعول علیهم الناس۔

لفظ بلفظ اور حرف بحرف وہی بات کہہ دی جو ہم نے بتائی ہے کہ یہ روایت اہلِ علم اور اربابِ فتویٰ میں متداول نہ تھی اور یہی بات قاضی ابو یوسف نے مایعرفہ الفقہاء کے ذریعے سمجھائی تھی۔

صرف حدیث قلتین ہی پر موقوف نہیں ہے اور بھی اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

ابوداؤد کی حدیث تابین

ابوداؤد اور ترمذی میں ہے:

---

[1] الانصاف ص ۲۹۔

عن وائل بن حجر قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قرأ
ولا الضالین قال آمین ورفع بہا صوتہ۔
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب ولا الضالین کہتے تو اونچی آواز سے
آمین کہتے۔

حافظ ابن القیم نے اس حدیث پر جو نوٹ لکھا ہے وہ سن لیجئے۔ فرماتے ہیں:
حدیث وائل کو شعبہ اور سفیان دونوں نے روایت کیا ہے سفیان کی
روایت میں رفع بہا صوتہ ہے اور شعبہ کی روایت میں اس کی جگہ
خفض بہا صوتہ ہے۔ اس حدیث میں چار چیزیں قابل غور ہیں۔
اول یہ کہ شعبہ اور سفیان کا رفع اور خفض میں اختلاف ہے۔ دوم یہ کہ
دونوں حجر کی شخصیت میں مختلف ہیں۔ شعبہ کہتے ہیں کہ ابو العنبس حجر
کی کنیت ہے اور سفیان کہتے ہیں کہ نام ہی حجر بن عنبس ہے۔ سوم
یہ کہ حجر کا حال معلوم نہیں ہے۔ چہارم یہ کہ ثوری اور شعبہ مختلف ہیں
سفیان اسے حجر عن وائل کی روایت بتاتے ہیں اور شعبہ اسے حجر عن علقمہ
عن وائل کی روایت بتاتے ہیں۔ اگرچہ امام دارقطنی نے ثوری کی روایت
کی تصحیح کی ہے لیکن یہ محل نظر ہے اور اسی بنا پر امام ترمذی نے
روایت کی تصحیح نہیں کی[1]

اس روایت کے تفرد اور غرابت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے تمام رواۃ چاہے
سفیان ہوں یا شعبہ، سلمۃ بن کہیل ہوں یا علقمہ بن وائل یا پھر عبد الجبار بن وائل۔ سب کوفہ
کے رہنے والے ہیں حتیٰ کہ امام دارقطنی اس کو اپنی سنن میں نقل کرنے کے بعد رقمطراز ہیں:

ھذہ سنۃ تفرد بہا اھل الکوفۃ[2]

اور اس پر طرہ یہ کہ تمام اہل کوفہ میں کوئی بھی آمین بالجہر کا قائل نہیں ہے چنانچہ قاضی شوکانی
رقمطراز ہیں:

کذا روی عن ابی حنیفۃ والکوفیین[3]

---

[1] تہذیب السنن شرح ابی داؤد ج ۱ ص ۴۳۹ [2] سنن دارقطنی ص ۱۲۷۔ [3] نیل الاوطار ص ۱۸۶۔

صحیحین کی حدیث خیار مجلس

یہ حدیث مختلف کتابوں میں آتی ہے۔ صاحب منتقی الاخبار نے شیخین کے حوالہ سے اس طرح نقل کی ہے:

عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال المتبایعان بالخیار مالم یتفرقا[1]

خود شیخین نے اسے متعدد پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ اس حدیث کی بنا پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کاروباری زندگی میں اگر دو آدمیوں میں کوئی سودا ہوجائے اور بات چیت ختم ہوجائے تو جب تک دونوں سودا کرنے والے ایک جگہ بیٹھے ہیں سودا توڑا جا سکتا ہے اور دونوں میں ہر ایک کو ایسا کرنے کا اختیار ہے لیکن شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

فانہ حدیث صحیح روی بطرق کثیرۃ وعمل بہ ابن عمر و ابوھریرۃ من الصحابۃ ولم یظھر علی الفقھاء السبعۃ و معاصریھم فلم یکونوا یقولون بہ فرأی مالک و ابوحنیفۃ ھذا علۃ قادحۃ فی الحدیث

یہ حدیث صحیح ہے متعدد طریقوں سے مروی ہے اس پر صحابہ میں ابن عمر اور ابوہریرہ نے عمل کیا ہے لیکن یہ حدیث فقہاء سبعہ اور ان کے معاصرین کے دور میں ظاہر نہیں اس لیے فقہاء سبعہ نے اس پر عمل نہیں کیا اور امام مالک اور امام ابوحنیفہ نے فقہاء سبعہ کے عمل نہ کرنے کو اس حدیث کی صحت میں علت قادحہ سمجھا ہے[2]

حافظ ابوبکر الخطیب نے یہ حدیث نقل کرکے امام مالک کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے اس پر اس لیے عمل نہیں کیا کہ مدینہ والوں کا عمل اس کے خلاف تھا چنانچہ فرماتے ہیں:

رواہ مالک ولم یعمل بہ وزعم انہ رأی

---

[1] نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۵۷۔ [2] الانصاف ص ۳۰۔

اهل المدینة علی العمل بخلافہ

اس حدیث کو امام مالک نے روایت کیا ہے لیکن اس پر اس لیے عمل نہیں کیا ہے کہ ان کے خیال میں یہ حدیث عمل اہل مدینہ کے خلاف ہے یاد رہے کہ اس کی جو سند خطیب نے بتائی ہے وہ سند زریں ہے جسے علماء نے اصح الاسانید قرار دیا ہے یعنی مالک عن نافع عن عبداللہ بن عمر۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود نافع کا بھی امام مالک کے زمانے میں اس پر عمل نہ تھا۔ اسی لیے خطیب نے لکھا ہے کہ:

فلم یکن ترکہ العمل بہ قدحاً لنافع [1]

نافع کا اس پر عمل نہ کرنا حدیث میں قادح نہیں ہے

چنانچہ امام محمد نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

وبهذا نأخذ [2]

اور امام محمد ہی نے اس کی تفسیر بتائی ہے کہ:

تفسیرہ عندنا علی ما بلغنا عن ابراهیم النخعی انه قال المتبایعان بالخیار ما لم یتفرقا قال ما لم یتفرقا عن منطق البیع اذا قال البائع قد بعتك فله ان یرجع ما لم یقل الاخر قد اشتریت فاذا قال المشتری قد اشتریت بكذا وكذا فله ان یرجع ما لم یقل البائع قد بعت۔

اس ارشاد کا مطلب ہمارے نزدیک جیسا کہ ہمیں ابراہیم نخعی سے معلوم ہوا ہے یہ ہے کہ اس میں تفرق سے تفرق اقوال مراد ہے جب بائع کہہ دے کہ میں نے بیچ دیا تو بائع کو رجوع کا حق اس وقت تک ہے جب تک خریدار یہ نہ کہے کہ میں نے خرید لیا اور اگر مشتری کہہ دے کہ میں نے خرید لیا تو اسے رجوع کا اس وقت تک حق ہے کہ جب تک بیچنے والا یہ نہ کہے کہ میں نے بیچ دیا۔ [3]

یہی معنے سمجھانے کے لیے امام اعظم نے وہ تعبیر اختیار کی ہے جو حافظ ابن عبدالبر نے

---

[1] الکفایہ فی علوم الروایہ ص ۱۴۳۔ [2] مؤطا امام محمد ص ۳۴۱۔ [3] مؤطا امام محمد ص ۳۴۲۔

سفیان بن عیینہ کے حوالہ سے پیش کی ہے. سفیان کہتے ہیں کہ:

میں نے امام ابوحنیفہ کے سامنے یہ حدیث پیش کی کہ البیعان بالخیار مالم یتفرقا۔ تو آپ نے فرمایا کہ اگر سودا کرنے والے دونوں شخص کشتی میں سفر کر رہے ہوں تو ان میں افتراق کب ہوگا۔

ایک ہی بات میں حدیث کی روح سمجھا دی اور بتا دیا کہ تفرق سے تفرق اقوال مراد ہے اگرچہ سفیان بن عیینہ نے امام اعظم کی اس بات کو گوارا نہ کیا اور کہہ دیا۔

کان ابوحنیفۃ یضرب لحدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الامثال فیردہ۔

ابوحنیفہ تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے لیے مثالیں بیان کرتے تھے۔

یہ سفیان بن عیینہ ہی کی خصوصیت نہیں ہے اس سے پہلے حفاظ حدیث نے فقہاء پر اسی قسم کی پھبتی کسی ہے. چنانچہ ابن ماجہ میں ایک واقعہ آتا ہے جس میں حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عباس کا مکالمہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ نے کہا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

توضؤوا مما غیرت النار

حضرت ابوہریرہ کی زبان سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی سن کر حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ:

انتوضاء من الحمیم

حضرت ابوہریرہ نے حضرت ابن عباس سے یہ بات سنی تو فرمایا:

یا ابن اخی اذا سمعت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیثاً فلا تضرب لہ الامثال

اے میرے برادر زادے! جب تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث سنے تو اس کے لیے مثالیں نہ بنا۔[1]

---

[1] سنن ابن ماجہ باب الوضوء مما غیرت النار

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ حدیث غیار مجلس بھی اپنے اس مطلب کے لحاظ سے افراد و غرائب میں سے ہے اسی طرح وہ تمام روایات جن پر عہد صحابہ و تابعین میں ارباب فتویٰ کا عمل نہ تھا۔ ان سب روایات کے بارے میں دوسری اور تیسری صدی کے محدثین کا نقطہ نظر بالکل جدا جدا تھا۔ تیسری صدی کے محدثین ان کو صرف اسنادی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے اور اتصال و عدالت کے ذریعے ان روایات کو صحیح گردانتے تھے لیکن دوسری صدی کے محدثین فقہاء ان کو ما علیہ الجماعۃ اور تعامل و توارث اور السنۃ کی روشنی میں جانچتے تھے۔ اس پر تفصیلی تبصرہ آگے آ رہا ہے۔

امام اعظمؒ اور حدیث کی صحت

محدثین کی زبان سے تو آپ صحیح حدیث کی تعریف پڑھ چکے ہیں۔ ان کے یہاں حدیث صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ راویوں میں عدالت و ضبط ہو، سند میں اتصال ہو اور حدیث شاذ و معلل نہ ہو۔ حدیث کی صحت میں ان پانچ کی حیثیت اساس اور بنیادی کی ہے۔ چنانچہ امیر یمانی ان پانچوں کا ذکر کر کے فرماتے ہیں:

فھذہ الخمسۃ ھی المعتبرۃ فی حقیقۃ الصحیح عند المحدثین

یہی پانچ چیزیں محدثین کے نزدیک صحیح کی حقیقت میں معتبر ہیں۔[1]

لیکن امام اعظم ابوحنیفہ محدثین کی بیان کردہ شرطوں کو ضروری قرار دینے کے ساتھ ضبط کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ضبط صدر کو راوی کے لیے اتنا ضروری قرار دیتے ہیں کہ راوی کے لیے حدیث کے بیان کرنے میں یہ بنیادی شرط بتاتے ہیں کہ حدیث کی روایت صرف وہ شخص کرے جو حدیث کے سننے کے دن سے بیان کرنے کے دن تک حدیث کا حافظ ہو چنانچہ ابوجعفر طحاوی نے امام اعظم کے بارے میں بسند متصل لکھا ہے کہ

قال ابو حنیفۃ لا ینبغی للرجل ان یحدث من الحدیث الا بما حفظ من یوم سمعہ الی یوم یحدث بہ

ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ کسی شخص کے لیے مناسب نہیں ہے کہ حدیث بیان کرے مگر صرف وہ شخص بیان کرے جو سننے کے دن سے بیان کرنے

---

[1] توضیح الافکار ج ۱ ص ۱۰۔

کے دن تک حدیث کا حافظ ہو[1]

سید الحفاظ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ امام اعظم کا اپنا بھی یہی معمول تھا۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے یحییٰ بن معین کا یہ بیان لکھا ہے:

امام ابوحنیفہ صرف وہ حدیثیں بیان کرتے ہیں جن کے وہ حافظ ہیں اور جن کے وہ حافظ نہیں وہ بیان ہی نہیں کرتے[2]

امام نووی نے تقریب میں اس کو متشددین کا مسلک قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

فمن المشددین من قال لا حجۃ الا فیما رواہ من حفظہ و تذکرہ روی عن مالک وابی حنیفۃ۔

کوئی حدیث اس وقت تک حجت اور دلیل نہیں ہو سکتی جب تک راوی اپنی یاد اور حافظہ سے روایت نہ کرے[3]

اور حافظ سیوطی نے امام اعظم کا روایت حدیث میں یہ ضابطہ بیان کرنے کے بعد دوسرے محدثین سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے اس میں شدت محسوس کی ہے اور لکھا ہے کہ:

ھذا مذھب شدید و قد استقر العمل علی خلافہ فلعل الرواۃ فی الصحیحین من لم یوصف بالحفظ لا یبلغون النصف

یہ مذہب بڑا ہی سخت ہے محدثین کا اس کے خلاف عمل ہے کیونکہ اگر اس معیار کے پیش نظر صحیحین کا جائزہ لیا جاتے تو نصف راوی ایسے ملیں گے جو حافظہ کی اس شرط پر پورے نہ اتریں گے[4]

امیر یمانی نے توضیح الافکار میں، حافظ ابن کثیر نے اختصار علوم الحدیث میں اور حافظ ابن الصلاح نے مقدمہ میں یہی بات بتائی ہے۔ ابن الصلاح کے الفاظ یہ ہیں:

من مذاھب التشدید مذھب من قال لا حجۃ الا فیما رواہ الراوی من حفظہ و تذکرہ وذالک مروی عن

---

[1] الجواہر المضیئۃ۔ [2] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۱۹۔ [3] تقریب ص ۲۰۷
[4] مقدمہ ابن الصلاح ص ۹۳۔

مالک وابی حنیفۃ۔

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ حدیث کے صحیح ہونے کے لیے یہ شرط لگاتے ہیں کہ راوی کا ضبط اس درجہ قوی ہو کہ سننے کے بعد سے بیان کرنے کے وقت تک اسے برابر یاد رہے۔ اگر یاد نہ رہے تو اس کو روایت کرنا درست نہ سمجھتے تھے۔ بعد کے محدثین نے حفظ کی جگہ کتابت کو کافی سمجھ لیا اس لیے ان کے خیال میں اگر راوی کو حدیثوں کے الفاظ و معانی کچھ بھی یاد نہ ہوں تاہم وہ قلم بند صورت میں اس کے پاس موجود ہو تو اس کو روایت کر سکتا ہے چنانچہ محدث خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

> ابوزکریا یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص اپنے قلم سے لکھی ہوئی حدیث پاتے مگر وہ اس کو زبانی یاد نہ ہو تو کیا کرے؟ کہنے لگے کہ ابوحنیفہ تو یہ کہتے ہیں کہ جس حدیث کا انسان حافظ نہ ہو اسے بیان نہ کرے لیکن ہم یوں کہتے ہیں کہ اپنی کتاب میں جو کچھ اپنے قلم سے لکھا ہوا پائے اسے بیان کر دے چاہے وہ اس روایت کا حافظ ہو یا نہ ہو[1]

بہرحال امام اعظم نے ضبطِ صدر کو دوسرے محدثین سے الگ ہو کر بے حد اہمیت دی ہے اور اس کو حدیث کی صحت، عدالت، اتصال کے ساتھ بنیادی شرط قرار دیا مگر بعد کو محدثین نے یہ سختی برداشت نہ کی۔ جس قدر زمانہ گزرتا گیا حفظ کی جگہ کتابت رائج ہوتی گئی۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حافظِ حدیث کی روایت کو غیر حافظ کی روایت پر ترجیح ہے۔ کیونکہ حافظ نہ ہونے کی حالت میں احتمال ہے کہ کوئی خط میں خط ملا کر نوشتہ میں گڑبڑ کر دے۔ بہرحال امام اعظم نے حدیث کے صحیح ہونے کے لیے جو شرط لگائی وہ اگرچہ تیسری صدی کے محدثین کے یہاں ایک تشدید کی حیثیت رکھتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ فخر الاسلام بزدوی ضبط کی دقیق تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ضبط کا مفہوم یہ ہے کہ بات کو ایسے طریق پر سنا جائے جیسے سننے کا حق ہے پھر اس کے معنے مراد کو سمجھا جائے۔ امکانی کوشش سے اسے یاد کیا جائے پھر اس کی حدود کی حفاظت کر کے اس کی پابندی کی جائے اور اسے دوسرے

---

[1] الکفایہ فی علوم الروایہ ص ۲۳۱۔

تک پہنچاتے وقت تک اس کے مذاکرات کا اہتمام کرنا چاہیے مبادا وہ ذہن سے اتر نہ جائے [1]

یہ تصریحات فن حدیث میں امام اعظم کی عظمت شان اور جلالت قدر کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں غالباً جو لوگ امام اعظم کو حدیث میں متشددین میں شمار کرتے رہے ہیں ان کے پیش نظر امام اعظم کی یہی شرائط ہیں جیسے ابن خلدون نے لکھا ہے کہ:

شدد فی شروط الروایۃ والتحمل وضعف روایۃ الحدیث الیقینی اذا عارضہا الفعل النفسی۔

امام صاحب نے روایت کی شرطوں اور اس کے تحمل میں سختی کی اور اگر حدیث فعل نفسی کے معارض ہو تو اس کی تضعیف کی ہے [2]

لیکن جسے سختی کہا جا رہا ہے اسی کا نام احتیاط ہے۔ اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دین کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ احتیاط برتی جاتے۔ امام اعظم کی اس احتیاط کا بڑے بڑے محدثین نے اقرار کیا ہے۔ چنانچہ حافظ ابو محمد عبداللہ حارثی بسند متصل امام وکیع سے جو حدیث کے بہت بڑے امام ہیں نقل کرتے ہیں:

اخبرنا القاسم بن عباد سمعت یوسف الصفار یقول سمعت وکیعاً یقول لقد وجد الورع عن ابی حنیفۃ فی الحدیث ما لم یوجد عن غیرہ۔

جیسی احتیاط حدیث میں امام ابو حنیفہ نے کی ہے کسی دوسرے نے نہیں کی [3]

اسی طرح علی بن الجعد سے جو حدیث کے بہت بڑے امام اور حافظ ہیں اور امام بخاری اور ابو داؤد کے استاد ہیں یہ بیان منقول ہے کہ:

امام ابو حنیفہ جب حدیث بیان کرتے ہیں تو موتی کی طرح آبدار ہوتی ہے [4]

اور یہ امام اعظم کی احتیاط ہی کا نتیجہ ہے کہ امام وکیع بن الجراح جیسا شخص جو حدیث میں امام احمد، امام ابن المدینی، امام یحییٰ بن معین اور امام عبداللہ بن المبارک کا استاد ہے۔ امام اعظم کی ساری حدیثیں

---

[1] اصول فخر الاسلام ج ۲ ص ۱۰، برکشف الاسرار۔ [2] المخطط ص ۳۴۔
[3] المناقب للموفق ج ۱ ص ۱۹۷۔ [4] جامع المسانید ج ۲ ص ۳۰۸۔

نوک زبان کرتا ہے اور جسے سید الحفاظ یحییٰ بن معین حفاظ حدیث میں سب سے اونچا بتلاتے ہیں، چنانچہ حافظ ابن عبدالبر یحییٰ بن معین سے ناقل ہیں:

میرے علم میں وکیع سے اونچا کوئی نہیں ہے۔ وکیع امام ابوحنیفہ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے اور ان کو امام ابوحنیفہ کی ساری حدیثیں یاد تھیں اور انہوں نے امام ابوحنیفہ سے حدیثیں سنی تھیں [1]

امام اعظم اور ردّ و قبولِ روایت

محدثین نے روایت کے ردّ و قبول کے لیے جو شرطیں لکھی ہیں اور جن روایات کو قابلِ استدلال قرار دیا ہے ان کے نقل کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ بالغ، عاقل ہونے کے ساتھ عدالت اور ضبط کی صفات سے موصوف ہوں، حافظ ابن الصلاح نے جماہیر ائمہ حدیث کا فیصلہ یہی بتایا ہے اور حافظ ابن کثیر نے اس میں تیقظ کا اضافہ کر کے لکھا ہے کہ:

اگر ان شرطوں میں سے ایک شرط بھی مخدوش ہو جاتے تو روایت مردود ہو جاتے گی [2]

امام نووی نے تقریب میں اور حافظ سیوطی نے تدریب الراوی میں اسی کی توثیق کی ہے لیکن امام اعظم نے کسی بھی روایت کی قبولیت کے لیے ان شرطوں کے ساتھ یہ بھی اضافہ کیا ہے۔ کہ اگر روایت کا تعلق اسلام کی عام عملی زندگی سے ہو تو ضروری ہے کہ اس کا نقل کرنے والا ایک نہ ہو بلکہ صحابی سے اس کو نقل کرنے والی ایک جماعت ہو اور جماعت بھی نیک اور پارسا لوگوں کی ہو۔ چنانچہ امام ربانی عبدالوہاب الشعرانی رقمطراز ہیں:

قد كان الامام ابوحنيفة يشترط في الحديث المنقول عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قبل العمل به ان يرويه عن ذالك الصحابي جمع اتقياء عن مثلهم وهكذا۔

جو حدیث جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اس کی بابت امام ابوحنیفہ یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس کو متقی لوگوں کی ایک جماعت

---

[1] جامع بیان العلم ج ا ص ۸۲۔ تاریخ بغداد ج ۳۔ [2] اختصار علوم الحدیث ص ۹۲۔

اس صحابی سے برابر نقل کرتی آئے۔[1]

امام شعرانی نے حدیث کی قبولیت کے لیے امام اعظم ابو حنیفہ کی جس شرط کا ذکر کیا ہے وہ بصراحت خود امام اعظم سے منقول ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے امام یحییٰ بن معین کی سند سے امام اعظم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

میں کتاب اللہ سے لیتا ہوں اگر اس میں نہ ملے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان حدیثوں سے کہ جو ثقات کے ہاتھوں میں ثقات کے ذریعے شائع ہوتی ہیں۔ پھر اگر یہاں بھی نہ ملے تو آپ کے اصحاب سے جس کا قول چاہتا ہوں اختیار کر لیتا ہوں لیکن جب بات ابراہیم، شعبی، حسن بصری اور عطاء بن ابی رباح پر آپڑتی ہے تو جس طرح ان حضرات نے اجتہاد کیا میں بھی اجتہاد کرتا ہوں۔[2]

اس کا مطلب یہ ہے کہ امام اعظم اس حدیث کو قبول فرماتے تھے جس کے پہلے طبقہ میں اگرچہ راوی ایک ہو مگر اس کے بعد وہ مختلف طبقوں میں پھیلی ہو اور اسے ایسے لوگوں نے نقل کیا ہو جو اتقیاء اور پارسا ہوں۔ طبقہ اولیٰ سے صحابہ اور طبقہ ثانیہ سے تابعین مراد ہیں۔

بعد کو محدثین غرائب و افراد، نوادر و آثار جمع ہو جانے پر اس کی پابندی نہ کر سکے بلکہ یہ امر واقعہ ہے کہ امام حاکم نے جب صحیح حدیث کی دس قسمیں قرار دیتے ہوئے پہلی قسم کے بارے میں یہ اعلان کیا کہ:

ان اختیار البخاری و مسلم اخراج الحدیث عن عدلین عن عدلین الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

بخاری و مسلم کا مسلک یہ ہے کہ وہ حدیث کو دو عادل راویوں سے روایت کرتے ہیں اور پھر وہ دو اپنے سے اوپر دو سے تاآنکہ یہ سلسلہ اسی طرح دو دو ہو کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوتا ہے۔[3]

تو محدثین نے امام حاکم کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ حافظ ابن حبان نے امام حاکم کے اس اعلان کو حدیث کے خلاف سازش قرار دیا اور بتایا کہ:

---

[1] المیزان الکبریٰ ج ۱ ص ۶۲۔ [2] مناقب ابی حنیفہ امام ذہبی ص ۲۰۔ [3] شروط الائمۃ الخمسہ ص ۲۲۔

احادیث سب کی سب اخبار آحاد ہیں جو شخص روایت حدیث میں اس
قسم کی شرطیں عائد کرتا ہے دراصل وہ ترک حدیث کی اسکیم بناتا ہے
کیونکہ حدیثیں اخبار آحاد کے ذریعے ہی آئی ہیں [1]

امام ابوبکر محمد بن موسیٰ حازمی نے امام حاکم کے اس دعویٰ کو چیلنج کیا اور لکھا کہ:

لیس کذالک لانهما اخرجا فی کتابیهما احادیث جماعة من
الصحابة لیس لهم الا راو واحد واحادیث لا تعرف
الا من جهة واحدة۔

یہ واقعات کے خلاف ہے کیونکہ امام بخاری اور مسلم نے اپنی صحیحین
میں ایسی جماعت سے بھی حدیثیں روایت کی ہیں جن کی روایات میں
صحابہ سے صرف ایک ہی راوی ہے اور ایسی حدیثیں بھی جو ایک
ہی طریق سے مروی ہیں [2]

حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی نے بھی امام حاکم کے اس دعویٰ کی واشگاف لفظوں
میں تردید کی ہے اور فرمایا:

شیخین نے اس قسم کی کوئی شرط نہیں لگائی اور نہ ان سے یہ شرط
منقول ہے۔ بخدا یہ بہترین شرط ہوتی اگر اس کا صحیحین میں کوئی
نام و نشان ہوتا۔ ہمارا مطالعہ یہ ہے کہ یہ قانون ان کتابوں میں
قدم قدم پر پارہ پارہ ہے۔

اور پھر خود امام حاکم کی تردید کے بعد یہ تجویز پیش فرمائی کہ امام بخاری و مسلم کا موقف
ان کتابوں میں صرف یہ ہے کہ:

وہ ایسی حدیثیں روایت کرتے ہیں جس کے راویوں کی ثقاہت
اتفاقی ہو [3]

لیکن حافظ زین الدین عراقی نے حافظ ابن طاہر کی اس تجویز کو یہ کہہ کر بے جان کر دیا کہ:

قبول روایت میں امام بخاری و مسلم کا یہ موقف نہیں ہے۔ کیونکہ

---

[1]، [2] شروط الائمۃ الخمسۃ ص ۲۳۔ [3] شروط الائمۃ الستۃ ص ۲۔

امام نسائی نے ایسے راویوں پر جرح کی ہے جن سے شیخین نے روایت کی ہے[1]

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ محدثین اپنے دور میں امام اعظم کی عائد کردہ شرائط کی حدیث کے رد و قبول میں پابندی نہ کر سکے۔

یہ حقیقت ہے کہ امام اعظم کے اس بیان کی روشنی میں اگر سنت اصل ثانی ہے تو قرآن اصل اوّل۔ لیکن سنت کے موضوع پر حدیث اس وقت قبول کی جا سکتی ہے جب وہ بالکل موثق اور مصادر مختلفہ سے ثابت ہو کر آئی ہو اور اس کا صدق و ضبط اور نقل ہر لحاظ سے پایہ تصدیق کو پہنچ چکا ہو۔ آپ صرف ان حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں جو اس معیار پر صحیح ہیں۔ اور جن کی ثقات کے ذریعے اشاعت ہوتی ہے۔ امام سفیان ثوری نے بھی حدیث کے متعلق امام اعظم کا یہی موقف بتایا ہے کہ:

> یاخذ بما صح عندہ من الاحادیث التی کان یحملھا الثقات و بالاخر من فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔
>
> جو حدیثیں ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہیں اور ثقات جن کو روایت کرتے ہوں۔ نیز جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ہوتا ہے یہ اس کو لیتے ہیں[2]

اس لحاظ سے امام اعظم کی حدیثوں کا بیشتر حصہ مشہور ہوتا ہے کیونکہ یہی وہ دور ہے جس میں شہرت کو اعتباری حیثیت حاصل ہے ورنہ اس کے بعد اگر کوئی حدیث شہرت پذیر ہوتی ہے تو آئینی اور قانونی لحاظ سے وہ شہرت نہیں جس سے حدیث کو قوت حاصل ہو سکے۔ علامہ عبدالعزیز بخاری رقمطراز ہیں:

> احادیث کی شہرت کا اعتبار قرن دوم و سوم میں ہوگا۔ قرون ثلاثہ کے بعد شہرت معتبر نہیں ہے کیونکہ اس زمانے میں اکثر اخبار آحاد مشہور ہو گئی ہیں۔ حالانکہ ان کو مشہور نہیں کہتے ہیں[3]

شاید آپ کو اس پر حیرت ہو مگر اس میں حیرت کی کون سی بات ہے؟ شہرت کا دا ردمدار تو

---

[1] توضیح الافکار ج ۱ ص ۱۰۱۔ [2] مناقب ابی حنیفہ ذہبی ص ۲۰۔

[3] کشف الاسرار ج ۲ ص ۷۔

شعبہ ہی ہیں[1] یعنی جن کی علم حدیث میں جلالت، شان اور عظمت [illegible] شعبہ کو اعتماد ہو جائے تو کسی کے لیے یارائے سخن نہیں ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم [illegible] لکھتے ہیں:

قد كان الحافظ المشهور بعناية في [illegible]

امام ابوحنیفہ علم حدیث میں مشہور حافظ حدیث تھے۔[2]

بہرحال امام اعظم نے صحت حدیث کے لیے ایک بہت اونچا معیار قائم کیا تھا ان کے شروط روایت کے لیے معیار تحقیق کی حد تک بمقابلہ محدثین زیادہ سخت تسلیم کیے گئے ہیں جیسا کہ آپ مقدمہ ابن خلدون اور المیزان الکبریٰ کے حوالے سے پڑھ چکے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اپنی شروط میں تیسری صدی کے محدثین کی نسبت متشدد تھے۔

امام اعظم اور اہل ہوی سے روایت

روایت کے رد و قبول سے متعلق اس پر تو دوسری اور تیسری صدی کے محدثین کا اتفاق ہے کہ قبول روایت کے لیے اسلام اور عدالت شرط ہے اور [illegible] ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کافر کی حالت کفر میں اور فاسق کی حالت [illegible] میں روا[illegible] پر کبھی دو رائیں نہیں ہوتی ہیں۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ [illegible] رکھتے ہوئے اپنے مخصوص نظریات کے حامل ہیں جن کے نتیجے میں جمہور امت [illegible] سے ہٹ کر انہوں نے اپنی راہ الگ بنالی مثلاً خوارج، روافض، نواصب، [illegible] اور مرجئہ وغیرہ۔ کیا ان کی روایات کو ان کے مخصوص نظریات کے باوجود شرف قبول [illegible] جا سکتا ہے یا نہیں چونکہ یہ موضوع علم حدیث کے مہمات مباحث میں سے ہے اس [illegible] علما نے اپنے مختلف عہدوں میں جی بھر کر اس پر داد تحقیق دی ہے۔ چنانچہ حافظ ابوبکر الخطیب بغدادی رقمطراز ہیں:

> علماء میں اہل ہوی سے روایت لینے کے موضوع پر [illegible] زیادہ
> مدارس فکر ہیں۔ سلف میں سے ایک جماعت [illegible] خیال
> نہیں کرتی۔ ان کا موقف یہ ہے کہ کافر اور فاسق [illegible]

---

[1] الانتقاد ص ۱۷۷۔ [2] الروض الباسم ج ۱ ص ۱۶۶

پوزیشن بھی کافر معاند اور فاسق عابد کی ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ ان کی روایت ناقابلِ قبول ہو اور کچھ کی رائے میں اہلِ اہواء کی روایت کو قبول کر لینا درست ہے بشرطیکہ وہ جھوٹ کو جائز نہ سمجھتے ہوں۔ فقہاء میں سے یہ امام شافعی کی رائے ہے۔ اور کچھ کی رائے یہ ہے کہ اہلِ اہواء میں سے ان کی رائے قبول کر لی جائے جو ہوٰی و بدعت کے داعی نہ ہوں۔ دعاۃ کی روایت قابلِ احتجاج نہیں ہے۔ یہ امام احمد کی رائے ہے۔ مؤرخین اور متکلمین کی ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ سب اہلِ اہواء کی روایات قابلِ قبول ہیں چاہے وہ اپنے نظریات کی وجہ سے کفر ہی کے میدان میں ہوں۔[1]

روایت و تحدیث میں تمام اہلِ اہواء میں روافض کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس اہمیت کی بنیادی وجہ ان کے وہ نظریات ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ اُمت کے جمہور سے الگ ہوتے ہیں صحابہ کے بارے میں ان کا موقف علم کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہے اور تقیہ کا عقیدہ بھی ان کی صداقت کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ اس لیے اس موضوع پر امام اعظم کا فیصلہ عبداللہ بن المبارک نے یہ بتایا ہے۔

امام اعظم سے ابوعصمہ نے دریافت کیا کہ اہلِ اہوا سے روایت کے بارے میں آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ جواب میں فرمایا کہ سب اہلِ اہواء سے روایت لے سکتے ہو بشرطیکہ وہ عادل ہوں لیکن شیعہ سے روایت نہ لینا۔ کیونکہ ان کے عقیدے کی عمارت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی تضلیل پر ہے۔[2]

ہمارے نزدیک یہ مسئلہ بھی دوسری اور تیسری صدی کے اختلافی مسائل میں سے ہے۔ اسی لیے حضرت امام مالک بھی اس مسئلہ میں امام اعظم کے ہم زبان ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ روافض سے روایت نہ کرو۔ مشہور محدث یزید بن ہارون لکھتے ہیں ہر صاحبِ بدعت کی اگر داعی نہ ہو تو روایت لے لی جائے لیکن روافض سے روایت نہ لی جائے۔ شریک بن عبداللہ کی

---

[1] الکفایہ فی علوم الروایہ ص ۱۲۴۔ [2] الکفایہ فی علوم الروایہ ص ۱۳۶۔

رائے ہے کہ جس سے تم علم لو علم ہے لو لیکن روافض سے علم نہ لو۔ عبداللہ بن المبارک نے عمرو بن ثابت کا نام لے کر بتایا ہے کہ اس سے حدیث نہ لو کیونکہ یہ سلف کو برا کہتا تھا[1] یہ دوسری صدی کے محدثین کے افکار ہیں۔ تیسری صدی میں ان افکار کی بندشوں کو ڈھیلا کرنے کی کوشش شروع ہوتی ہے اور رافضیوں کے بارے میں محدثین نے اپنا موقف بدل دیا۔ امام شافعی نے عام روافض کو اس پابندی سے نکال کر خاص خطابیت تک اسے محدود کر دیا۔ اور فرمایا کہ ان سے روایت نہ لینی چاہیے۔ اس کے بعد محدثین کی عام رائے تمام اہل اہواء کے بارے میں بلا استثناء شیعہ قائم ہو گئی کہ

تقبل غیر الدعاۃ من اھل الاھواء فاما الدعاۃ فلا تقبل اخبارھم[2]

ان میں جو داعی نہ ہوں ان سے روایت لی جائے داعی کی روایت نہ لی جائے۔

اسی کو محدثین کی اکثریت کی حمایت حاصل ہے بلکہ حافظ ابن حبان بستی نے اس پر سب کا اتفاق نقل کیا ہے۔ حافظ ابن الصلاح نے اسی کو اعدل الاقوال قرار دیا ہے اور اس کے خلاف سوچنے کو بھی بارگاہ محدثین میں گستاخانہ جرأت بتایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

والقول بالمنع مطلقا مباعد للشائع عن ائمۃ الحدیث۔[3]

مطلقاً اسے روکنا اس راہ سے دور ہٹنا ہے جو ائمہ حدیث سے مشہور ہے

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو کچھ طے کیا گیا ہے اور جسے اعدل الاقوال کہا گیا ہے کیا واقعات اور حالات نے بھی اس کا ساتھ دیا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ خود بخاری و مسلم نے دعاۃ سے روایات لی ہیں چنانچہ حافظ عراقی نے لکھا ہے کہ بخاری و مسلم نے دعاۃ اہل اہواء کی روایات لی ہیں۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے تدریب الراوی میں بخاری و مسلم کے ان راویوں کی فہرست دی ہے جن سے شیخین نے روایات لی ہیں اور نوبت بایں جا رسید کہ کہنے والوں نے کہہ دیا۔

کتاب مسلم ملآن من رواۃ الشیعۃ۔[4]

---

[1] تدریب الراوی ص ۲۱۸ ۔ [2] توضیح الافکار ج ۲ ص ۱۰۴ ۔ [3] اختصار علوم الحدیث ص ۹۹

[4] تدریب الراوی ص ۱۲۸

اور حافظ ابن الصلاح کو اس نظریہ کو کہ روافض سے روایت نہ لینی چاہیے یہ کہہ کر مرجوح قرار دینا پڑا کہ فان کتبھم طافحۃ بالروایۃ عنھم محدثین کی کتابیں ان کی روایات سے اٹی پڑی ہیں۔ امام ذہبی نے بدعت کی تقسیم کے ذریعے محدثین کی صفائی پیش فرمائی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

بدعت کی دو قسمیں ہیں صغریٰ جیسے تشیع زیادہ یا کم مثلاً وہ حضرات جنہوں نے حضرت علی سے نبرد آزما ہونے والوں کے بارے میں لب کشائی کی ہے۔ یہ طبقہ تابعین ہیں بہت ہے اور ایسے ہی اتباع تابعین میں اگر ان کی روایات کو تشیع کی بنا پر رد کر دیا جائے تو حدیث کا بیشتر حصہ ختم ہو جائے گا اور بدعت کبریٰ جیسے رفض کامل اور اس میں غلو مثلاً ابو بکر و عمر کے دامان احترام کو ہاتھ لگانا اور لوگوں میں اس کا پروپیگنڈا کرنا۔ یہ قسم بلاشبہ ناقابل احتجاج ہے۔ مجھے اس قسم کے لوگوں میں کوئی بھی صادق مامون نظر نہیں آتا بلکہ جھوٹ ان کا فیشن اور تقیہ اور نفاق ان کا شیوہ ہے [1]۔

اگرچہ خود امام ذہبی نے بقول حافظ سیوطی ایک دوسرے موقعہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ :

اس موضوع پر لوگ مختلف الخیال ہیں۔ کچھ کی رائے میں شیعہ سے روایت قطعاً منع ہے اور کچھ کے نزدیک مطلقاً جائز ہے اور تیسری رائے یہ ہے کہ جو شخص ان کی حدیث کو جانتا ہو اس کے لیے جائز ہے اور دوسرے کے لیے جائز نہیں ہے [2]

بعد ازیں حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ سیوطی نے شیعہ اور رافضی کی تشریح فرما کر محدثین کے اس بوجھ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ ساری مساعی صرف اس لیے بروئے کار آئی ہیں کہ محدثین سے جو طے شدہ پالیسی کے خلاف عمل ہوا ہے اس کا مداوا ہو جائے لیکن ان مساعی اور کوششوں کی نوعیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ یہ کتابوں کی مدد سے شیعہ اور رافضی کی تشریح فرما رہے ہیں اور دوسری صدی کے محدثین مشاہدے

---

[1]، [2] تدریب الراوی ص ۲۱۰۔

اور واقعات کے زور سے بتا رہے ہیں کہ :

فان اصل عقیدتھم تضلیل اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

اور عبداللہ بن المبارک نے آپ بیتی سنائی ہے کہ فانہ کان لیسب السلف اور یہی صورتِ حال امام مالک کی ہے۔

اس آخری دور میں شام کے مشہور فاضل نے محدثین کی اس موضوع پر صفائی کرتے ہوئے کھلے بندوں اعلان کر دیا ہے کہ محدثین نے جن اہل اہواء سے روایات لی ہیں وہ مبتدعین نہیں ہیں بلکہ مبتدعین ہیں۔ یعنی ہیں تو وہ اہل السنت مگر یار لوگوں نے ان کو بدعتی مشہور کر دیا ہے۔ میری مراد علامہ جمال الدین قاسمی ہیں۔ انہوں نے خاص اس موضوع پر الجرح والتعدیل کے نام سے کتابچہ لکھا ہے جو مصر میں ۱۳۳۰ھ میں مطبع المنار نے شائع کیا ہے اور اس آخری دور میں مشہور محدث فاضل علامہ احمد محمد شاکر جن کی حدیث میں علمی خدمت اہل علم کے لیے سامان رشک ہے۔ الباعث الحثیث میں یہ کہہ کر معاملہ ہی صاف کر دیا ہے کہ کسی بھی مکتبِ فکر سے کوئی راوی تعلق رکھتا ہو روایت میں تو صرف راوی کی صداقت و امانت کا اعتبار ہو گا۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

العبرۃ فی الروایۃ بصدق الراوی وامانتہ والثقۃ بدینہ وخلقہ۔

روایت میں تو صرف راوی کی صداقت، امانت، دین میں ثقاہت اور اخلاق کا اعتبار ہو گا۔[1]

غور فرمایئے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ امام اعظم نے یہ کہہ کر

الا الشیعۃ فان اصل عقیدتھم تضلیل اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

دینی ثقاہت اور اخلاقی امانت کو چیلنج کیا تھا۔ ان مساعی کے باوجود اس کا حل اب تک کوئی نہ بتا سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ خواہ کچھ کہا جائے مگر واقعات کی دنیا میں تحقیق کی بے لاگ عدالت کا فیصلہ ابو حنیفہ کے ساتھ ہے۔

---

[1] الباعث الحثیث ص ۱۰۰۔

لیکن امام اعظم کا یہ فیصلہ صرف ان کے بارے میں ہے جن کے تشیع کی عمارت اصحاب نبوت کی تفضیل کی اساس پر قائم ہے۔ اس تصریح کی ضرورت بھی حضرت امام کو اس لیے پیش آئی کہ ان کے گردوپیش میں ایسا طبقہ موجود تھا جیسا کہ عبداللہ بن المبارک کی تصریح سے معلوم ہو چکا ہے اور اس طبقہ کے علاوہ اس دور میں ایسا بھی طبقہ تھا جو صرف حضرت علی کے لیے صحابہ میں برتری کا نظریہ رکھتا تھا جیسا کہ حافظ سیوطی نے تدریب میں بتایا ہے اور ایسا طبقہ تھا جو حضرت علی اور حضرت معاویہ کے سیاسی جھگڑوں میں حضرت علی کا طرفدار تھا جیسا کہ ذہبی نے تصریح کی ہے ان طبقوں کی روایت سے امام ابوحنیفہ نے نہیں روکا ہے امام اعظم نے جس دکھتی رگ پر انگشت رکھ کر بتایا ہے وہ یہ اور صرف یہ ہے کہ:

اصل عقیدتہم تضلیل اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اور بس اس عقیدے کا حامل طبقہ یقیناً امام اعظم کے زمانے میں موجود تھا اس میں کسی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آپ مانیں یا نہ مانیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ اسی وجہ سے دوسری صدی کے محدثین کو حضرت علی کی بہت سی حدیثوں سے دست بردار ہونا پڑا حالانکہ حضرت علی کے علم، ان سے محبت اور ان سے عقیدت کا برابر تقاضا یہی رہا کہ ان کے بارے میں جو کچھ بھی سنا جاتے اس کی تصدیق کی جاتے لیکن یہاں حضرت علی کی عقیدت و محبت کا رسول کی عقیدت و محبت اور اس کی حدیث کی عظمت سے مقابلہ تھا۔ اس کی محبت کا تقاضا یہ اور صرف یہ تھا کہ اس کی جانب کوئی غلط بات منسوب نہ ہو جاتے۔ ایمان کو بچانے کے لیے احتیاط کی راہ یہی تھی کہ چھان بین کی جائے۔

حافظ ابن القیم لکھتے ہیں:

قاتل اللہ الشیعۃ فانہم افسدوا کثیراً من علمہ بالکذب علیہ ولہذا تجد اصحاب الحدیث من الصحیح لا یعتمدون من حدیثہ الا ما کان من طریق اہل بیتہ واصحاب عبداللہ بن مسعود۔

اللہ شیعوں کا برا کرے کہ انہوں نے حضرت علی کے علم کا بڑا حصہ ان پر جھوٹ بول کر محدثین کی نظر میں مشتبہ کر دیا ہے اس لیے صحیح حدیث کے متلاشی محدثین بجز حضرت علی کے گھر والوں اور عبداللہ بن

مسعود کے اصحاب کی وساطت سے آئی ہوئی حضرت علی کی حدیثوں پر
اعتماد نہیں کرتے ہیں [1]

اسی دور میں مشہور محدث حماد بن سلمہ نے یہ انکشاف کیا کہ:

اخبرنی شیخ من الرافضۃ انھم کانوا یجتمعون علی
وضع الاحادیث -

مجھے رافضیوں کے ایک سربراہ نے بتایا ہے کہ وہ حدیثیں بنانے کے
لیے باقاعدہ اجتماعات کرتے تھے [2]

اور آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن حافظ زیلعی نے نماز میں جہر بسملہ کے موضوع پر خالص محدثانہ نقطہ نظر سے تفصیلی تبصرہ کرتے ہوتے یہ انکشاف کیا ہے کہ بسم اللہ بلند آواز سے پڑھنے کے موضوع پر جس قدر روایات آئی ہیں ان کا سرچشمہ ہی شیعہ ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

وغالب احادیث الجھر تجد فی رواتھا من ھو منسوب الی
التشیع [3]

بسم اللہ بآواز بلند پڑھنے کی زیادہ روایات شیعہ راویوں کی وساطت سے
آتی ہیں۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ نماز میں بسم اللہ کے جہر پر اخبار آحاد کا زیادہ ذخیرہ وضعی اور بناوٹی ہے اور بناوٹی ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ:

لان الشیعۃ تری الجھر وھم اکذب الطوائف فوضعوا فی
ذالک احادیث -

کیونکہ نماز میں بسم اللہ بآواز بلند پڑھنے کے قائل ہیں اور شیعہ گروہوں
میں سب سے زیادہ دروغ گو ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر
حدیثیں بنالی ہیں۔

ان تصریحات سے آپ امام اعظم کے اس دوررس فکر کی صداقت کا اندازہ لگا سکتے

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۶ - [2] الباعث الحثیث ص ۸۴
[3] نصب الرایہ ج ۱ ص ۱۸۲ -

ہیں اور آپ کو ماننا پڑے گا کہ اس میں تھوڑا سا تسامح بہت بڑی بلا کا سامان ہے۔

جرح و تعدیل رواۃ حدیث اور امام اعظم

علامہ جزائری نے توجیہ النظر میں حدیث کے سلسلے میں ۵۲ قسم کے علوم کی نشاندہی کی ہے ان ہی علوم کے برتنے پر کہا جاتا ہے کہ جو شخص بھی حدیث کے مختلف طرق و اسانید، ان کے راویوں کی راست گفتاری اور ان پر جرح و تعدیل کی داستان پڑھے گا۔ اس کو حدیث کی عظمت کا اقرار کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ یہ امر آخر ہے کہ کوئی شخص مطالعہ کی محنت سے پہلو تہی کر کے خواہ مخواہ انکار کر ڈالے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ محدث کی مثال ایک صراف کی سی ہے۔ بسا اوقات روپیہ کی شکل و صورت اور آواز تک میں فرق نہیں ہوتا لیکن صراف کی چٹکی اس کا کھوٹ بتا دیتی ہے۔ یہ کھوٹ بتا دینے کا علم فن حدیث میں بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی کی مدد سے علماء نے صحیح احادیث کو غلط سے اور قوی کو ضعیف سے چھانٹ کر علیحدہ کیا اور اس سلسلے میں علماء نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اسی کا نام علم جرح و تعدیل ہے۔ اسے ہی علم میزان رجال یا علم رجال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر راویوں کی امانت، ثقاہت، عدالت اور قوت ضبط کو بتایا جاتے تو یہ علم التعدیل ہے اور اگر اس کے برعکس ان کے کذب، غفلت یا نسیان وغیرہ سے بحث کی جائے تو یہ علم الجرح ہے۔ امام حاکم معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

وھما فی الاصل نوعان کل نوع منھما علم براسہ

اصل میں یہ دو قسمیں ہیں ان میں سے ہر قسم مستقل علم ہے۔[1]

علم حدیث کے طفیل میں یہ عظیم الشان علم وجود میں آیا ہے اور اقوام عالم کی تاریخ میں اس طرح کے تنقیدی علم کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ اس فن کی ابتدا کیوں ہوئی؟ حافظ سیوطی الکافی فی تاریخ السخاوی میں رقمطراز ہیں کہ:

چونکہ حدیث نبوی صدر اول میں سفینوں سے نہیں بلکہ لوگوں کے سینوں سے لی جاتی تھی اس لیے احادیث کی حفاظت اور ان کو

---

[1] معرفۃ علوم الحدیث ص ۵۲۔

غلط سے بچانے اور مقبول میں تمیز کی خاطر جرح کو جائز کیا گیا[1]

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

لوگوں نے یہ علم صحابہ سے لیا اس کے یاد کرنے اور اس کے پہنچانے میں اوقات لگاتے اور جانیں کھپاتیں لیکن صحابہ کے بعد ہر دور میں ایسے لوگ اس میں داخل ہو گئے جن میں اس کی صلاحیت اور قابلیت نہ تھی۔ انہوں نے نقل روایات میں غلطیاں کیں اور کچھ نے عمداً خلافِ واقعہ نقل میں دست اندازی کی۔ اس راہ سے حدیث ایک بڑی آفت سے دوچار ہو گئی۔ اللہ سبحانہٗ نے اس وقت ایسے اربابِ فکر میدان میں رونما کئے جنہوں نے حدیثِ نبوت کی چھان بین اور اس کی مدافعت کا کام کیا۔ خیر خواہی کے جذبہ سے راویوں پہ کلام کیا۔[2]

حافظ سخاوی نے اس پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

پہلی صدی ہجری جو صحابہ و کبار تابعین کے دور میں گزری۔ اس دور میں حارث اور مختار کذاب جیسے اکا دکا شخص کو چھوڑ کر کسی ضعیف الروایۃ شخص کا تقریباً وجود نہ تھا۔ پہلی صدی گزر کر جب دوسری صدی آئی تو اس کے اوائل میں اوساط تابعین میں ضعفا کی ایک جماعت پیدا ہوئی جو زیادہ تر حدیث کو زبانی یاد رکھنے اور اپنے کوزۂ ذہن میں اس کو محفوظ کرنے کے لحاظ سے ضعیف سمجھی گئی چنانچہ آپ ان کو دیکھیں گے کہ وہ موقوف کو مرفوعاً نقل کر جاتے ہیں۔ کثرت سے ارسال کرتے ہیں اور ان سے روایت میں غلطیاں بھی ہوتی ہیں جیسے ابو ہارون عبدی وغیرہ۔ پھر جب تابعین کا آخری دور آیا یعنی ۱۵۰ھ کے قریب قریب۔ تو ائمہ کی ایک جماعت نے توثیق و تضعیف کے لیے زبان کھولی۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ ما رائیت اکذب من

---

[1] الرفع والتکمیل ص ۱۴۔ [2] لسان المیزان ج ۱ ص ۳۔

جابر الجعفی میں نے جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا نہیں دیکھا۔ اور امام اعمش نے ایک جماعت کی تضعیف اور دوسری کی توثیق کی۔ اور شعبہ کے رجال کے بارے میں غور و فکر سے کام لیا۔ یہ بڑے محتاط تھے اور بجز ثقہ کے تقریباً کسی سے روایت نہ کرتے تھے۔ امام مالک کا بھی یہی حال تھا اور اس دور کے ان لوگوں میں سے کہ جب وہ کسی کے بارے میں کچھ کہہ دیں تو ان کی بات مان لی جاتی ہے معمر، ہشام دستوائی، اوزاعی، سفیان ثوری، ابن الماجشون، حماد بن سلمہ اور لیث وغیرہ ہیں۔ پھر ان کے بعد دوسرا طبقہ ابن المبارک، ہشیم، ابو اسحاق فزاری، معافی بن عمران، بشیر بن المفضل اور ابن عیینہ وغیرہ کا ہے۔ پھر ان ہی کے ہم زمان ایک اور طبقہ ابن علیہ، ابن وہب اور وکیع جیسے حضرات کا ہے۔ بعد کو ان ہی کے دور میں دو ایسے شخص جو حدیث کے حافظ اور اس فن میں حجت گزرے ہیں۔ تنقید رجال کے لیے اٹھے یہ یحییٰ بن سعید القطان اور عبدالرحمٰن بن مہدی ہیں[1]

علامہ جزائری نے بھی اس پر تفصیلی تبصرہ فرمایا ہے[2] اور حافظ شمس الدین السخاوی نے الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ میں علم الجرح والتعدیل کی ایک مورخانہ دستاویز ترتیب دی ہے۔ اس تاریخی ترتیب میں جن ائمہ جرح و تعدیل کا تذکرہ کیا ہے ان کے تعارف کے لیے حافظ موصوف نے یہ عنوان قائم کیا ہے۔

اما المتکلمون فی الرجال فخلق من نجوم الھدی ومصابیح الدجی المستضاء بھم۔

ان اکابر میں جن کو نجوم الہدی اور مصابیح الظلم کہا ہے۔ سب سے پہلے مقدمہ ابن عدی کے حوالہ سے اس فن کی امامت کے سلسلے میں صحابہ میں سے فاروق اعظم، علی مرتضیٰ، ابن عباس، عبداللہ بن سلام، عبادۃ بن الصامت اور عائشہ صدیقہ کا نام لیا ہے۔ پھر اکابر تابعین میں امام شعبی، امام ابن سیرین، سعید بن جبیر اور سعید بن المسیب کا تذکرہ کیا ہے اور اس

---

[1] فتح المغیث ص ۴۷۹۔ [2] توجیہ النظر ص ۱۱۴۔

کے بعد لکھا۔

فلما کان عند آخر عصر التابعین وھو حدود الخمسین و مائۃ تکلم فی التوثیق والتجریح طائفۃ من الائمۃ فقال ابوحنیفۃ ما رایت اکذب من جابر وضعف الاعمش جماعۃ ووثق آخرین ونظر فی الرجال شعبۃ [1]

اور اس کے بعد ان سب کا تذکرہ کیا ہے جو آپ فتح المغیث کے حوالہ سے پہلے پڑھ چکے ہیں اور یہ بھی اضافہ فرمایا کہ:

پھر یحییٰ بن سعید القطان اور عبدالرحمٰن بن مہدی کے بعد امام شافعی، یزید بن ہارون، ابوداؤد الطیالسی، عبدالرزاق، الفریابی، ابوعاصم النبیل وغیرہ ہوتے ہیں اور ان کے بعد حمیدی، القعنبی، ابوعبید یحییٰ اور ابوالولید الطیالسی نے اس میں کلام کیا ہے [2]

اس تاریخی دستاویز میں حافظ سخاوی نے صرف یہ نہیں بتایا ہے کہ آخر عصر تابعین میں جرح و تعدیل کے فن میں امامت کا مقام امام اعظم کو حاصل ہے بلکہ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی ذات گرامی تابعی ہونے کی حیثیت میں توثیق و تجریح کے میدان میں صرف تعارفی نہیں بلکہ ایک عظیم الشان استدلالی شخصیت ہے اور ائمہ جرح و تعدیل میں ان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے چنانچہ حافظ سخاوی کی یہ تصریح ہے:-

تکلم فی التوثیق والتجریح طائفۃ من الائمۃ فقال ابوحنیفۃ -

راویوں کی توثیق و جرح پر ائمہ کی ایک جماعت نے لب کشائی کی، چنانچہ ابوحنیفہ نے فرمایا -

اسی بنا پر امام ترمذی نے اپنی جامع میں جرح و تعدیل پر امام اعظم کے ان دو فقروں کو بالاسناد کتاب العلل میں روایت کیا ہے۔

حدثنا محمود بن غیلان قال حدثنا ابویحییٰ الحمانی قال سمعت اباحنیفۃ یقول ما رأیت احداً اکذب من جابر الجعفی

---

[1]، [2] الاعلان بالتوبیخ ص ۱۶۳، ۱۶۴۔

ولا افضل من عطاء

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ میں نے جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا اور عطاء سے زیادہ فاضل کوئی نہیں دیکھا ہے [1]

اس روایت کا تعلق راویوں کی جرح و تعدیل سے ہے اور امام ترمذی نے اسے سند کے طور پر پیش کیا ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ امام ترمذی کے نزدیک امام اعظم کا شمار ان ائمہ میں ہے جن کی بات جرح و تعدیل کے موضوع پر سند ہے۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ امام اعظم کے منہ سے نکلے ہوئے تعدیل میں عطاء کے متعلق اور جرح میں جابر جعفی کے متعلق دو فقرے علم حدیث میں دو اہم فنون کی بنیادی اینٹ ہیں۔ پہلا فقرہ یعنی ما رایت افضل من عطاء بن ابی رباح علم التعدیل کی اور دوسرا فقرہ یعنی ما رایت اکذب من جابر الجعفی علم الجرح کی۔ اور تعدیل بھی معمولی رواۃ کی نہیں بلکہ امام فن کی فرمائی ہے اور صرف امام ترمذی نے نہیں بلکہ امام بیہقی نے بھی امام ابوحنیفہ کی اس موضوع پر استدلالی حیثیت کو تسلیم کیا ہے چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب المدخل میں بسند متصل عبد الحمید الحمانی کے حوالہ سے لکھا ہے:

سمعت ابا سعد الصنعانی وقام الی ابی حنیفۃ فقال یا ابا حنیفۃ ما تقول فی الاخذ عن الثوری فقال اکتب عنہ فانہ ثقۃ ما خلا احادیث ابی اسحاق عن الحارث وحدیث جابر الجعفی۔

میں نے ابوسعد کو امام ابوحنیفہ سے یہ کہتے سنا ہے کہ آپ کی سفیان ثوری سے روایت کے بارے میں کیا رائے ہے؟ فرمایا ان سے حدیثیں لکھو کیونکہ وہ ثقہ ہیں لیکن ان کی وہ حدیثیں نہ لکھو جو بحوالہ ابو اسحاق از حارث ہیں۔ اور حدیث جابر جعفی بھی نہ لکھو [2]

حافظ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں ابوالزناد عبد اللہ بن ذکوان کی تعدیل کرتے ہوئے جہاں دوسرے اکابر نقاد کے تعدیلی کلمات درج کیے ہیں کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ ابوالزناد ربیعہ سے زیادہ عالم ہیں۔ سفیان ثوری کہتے ہیں کہ امیر المومنین فی الحدیث ہیں ان سب سے

---

[1] جامع ترمذی۔ [2] البستان ص ۳۰۔

پہلے امام اعظم کے یہ تعدیلی کلمات نقل کیے ہیں :

رأیت ربیعۃ وابا الزناد وابوالزناد افقہ

میں نے ربیعہ اور ابوالزناد دونوں کو دیکھا ہے لیکن ابوالزناد زیادہ فقیہ ہیں۔[1]

مشہور امام جعفر صادق سے کون واقف نہیں ہے۔ حافظ ذہبی نے ان کی تعدیل کرتے ہوئے جہاں یحییٰ بن معین اور ابوحاتم سے ان کی توثیق نقل کی ہے وہاں امام اعظم کے یہ تعدیلی کلمات بھی نقل فرماتے ہیں :

عن ابی حنیفۃ ما رأیت افقہ من جعفر بن محمد[2]

اسی بنا پر ہمیشہ اس فن کے اماموں کو جرح و تعدیل کے موضوع پر امام اعظم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا ہے چنانچہ حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں :

اعلم ان الامام ابا حنیفۃ قد قبل قولہ فی الجرح و التعدیل وتلقوہ عنہ علماء ھذا الفن وعملوا بہ

جرح و تعدیل کے موضوع پر امام اعظم کی بات قبول کی گئی ہے اور اس فن کے علماء نے اسے اپنایا ہے اور اس پر عمل پیرا ہوئے ہیں[3]

یہی جابر جعفی جن کے بارے میں امام ترمذی نے کتاب العلل میں امام اعظم سے یہ فیصلہ نقل کیا ہے کہ ما رأیت اکذب من جابر۔ دوسرے ائمہ کی اس کی نسبت آراء کو پیش نظر رکھ کر امام ابوحنیفہ کی قوت فیصلہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ امام ثوری کہتے ہیں کہ ما رأیت اورع فی الحدیث من جابر۔ میں نے جابر سے زیادہ حدیث میں محتاط نہیں دیکھا۔ امام شعبہ کہتے ہیں کہ جابر اگر حدیث میں سماع، تحدیث اور انباء کی تصریح کردے تو قابل اعتبار ہے۔ ایک بار امام ثوری نے شعبہ سے کہا کہ تم جابر کے بارے میں کچھ کہو گے تو پھر میں تمہارے متعلق کچھ کہوں گا۔[4]

ذرا غور فرمایئے کہ جابر کی توثیق کون لوگ کر رہے ہیں اور یہ کس شان کے اجلہ فن ہیں۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ترجمہ ابوالزناد۔ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ [3] الجواہر المضیہ ج ۱ ص ۳۰
[4] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۷۶۔

لیکن تحقیق کی بے لاگ عدالت نے جو فیصلہ دیا ہے وہ یہی ہے کہ جابر جعفی کی روایت قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ لیث بن ابی سلیم فرماتے ہیں کہ کذاب ہے۔ امام نسائی کہتے ہیں کہ متروک ہے امام ابوداؤد نے فیصلہ کیا ہے کہ میرے نزدیک قوی نہیں ہے۔ جریر بن عبدالحمید اور یحییٰ المحاربی کی رائے ہے کہ غالی قسم کا شیعہ تھا اور حضرت علیؓ کی رجعت کا معتقد تھا۔ سید الحفاظ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ جابر جعفی نہیں قطعاً کذاب تھا بلکہ جاننے والوں نے بتایا ہے کہ بد تھا اور رافضی یشتم اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم رافضی ہے حضور انور کے صحابہ کا گستاخ ہے

صرف جابر جعفی نہیں بلکہ دوسرے راویوں کے متعلق بھی امام اعظم سے تنقیدات منقول ہیں جن کو محدثین کے یہاں شرف قبول حاصل ہے مثلاً زید بن عیاش کے بارے میں امام اعظم اور امام مالک کے درمیان اختلاف ہے۔ امام اعظم اسے مجہول قرار دیتے ہیں لیکن امام مالک نے اس کے حوالہ سے مؤطا میں حضرت سعد بن ابی وقاص کی وہ روایت نقل کی ہے جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور اور چھوارے کو ملا کر بیچنے سے منع فرمایا ہے[1]

بعد کو اگرچہ بعض محدثین نے امام مالک کی تقلید میں اس روایت کو صحیح قرار دیا لیکن خود امام بخاری اور امام مسلم نے اس بارے میں امام ابوحنیفہ کے فیصلے سے موافقت کی ہے چنانچہ محدث حاکم نے یہ حدیث درج کر کے امام بخاری اور امام مسلم کی جانب سے اس حدیث کی تخریج نہ کرنے پر معذرت اس طرح پیش کی ہے:

> والشیخان لم یخرجاہ لما خشیا من جہالۃ زید بن عیاش
>
> شیخین نے زید بن عیاش کے مجہول ہونے کے اندیشے سے اسے روایت نہیں کیا۔[2]

حافظ ابن الہمام نے اسی موضوع پر ایک واقعہ لکھا ہے کہ

> امام اعظم بغداد تشریف لائے تو وہاں کے ارباب روایت نے اس مسئلہ میں کہ رطب کی بیع تمر سے جائز ہے، یہ کہہ کر امام اعظم کے خلاف آواز اٹھائی کہ یہ مسئلہ حدیث کے خلاف ہے۔ ارباب روایت نے امام صاحب سے دریافت کیا کہ بتایئے آپ کھجور

---

[1] تنویر الحوالک ج ۲ ص [illegible] ۔ [2] تہذیب التہذیب ترجمہ زید بن عیاش

کی بیع تمر سے کیسے جائز بتاتے ہیں؟ امام صاحب نے جواباً فرمایا کہ دو حال سے خالی نہیں کہ رطب تمر ہے یا نہیں اگر ہے تو بیع جائز ہے التمر بالتمر حدیث میں اس کی اجازت ہے اور اگر تمر نہیں ہے تو پھر بھی اس کی بیع جائز ہے کیونکہ حدیث میں ہے۔ اذا اختلف النوعان فبیعوا کیف شئتم۔ ارباب روایت نے لاجواب ہو کر حدیث سعد پیش کی جس میں حضور نے بیع الرطب بالتمر سے منع فرمایا ہے۔ امام اعظم نے جواباً فرمایا کہ اس حدیث کا مدار زید بن عیاش ہے۔ اس کی حدیث قابلِ پذیرائی نہیں ہے [1]

مار الرجال اور امام اعظم

محدثین لکھتے ہیں کہ اسماء الرجال کا علم حدیث کے علم کا نصف ہے جیسا کہ حافظ عراقی نے رح الالفیہ میں امام علی بن المدینی سے نقل کیا ہے اور وجہ اس کی یہ بتائی ہے کہ حدیث ن اور سند کے مجموعے کا نام ہے اور سند کا تعلق راویوں سے ہے اور راویوں ہی کے بات کی واقفیت علم اسماء الرجال ہے۔ اور راویوں پہ جرح و تعدیل ایک نہیں بلکہ دو یم المرتبت اور جلیل القدر فنوں کے مجموعے کا نام ہے۔ نقد و نظر اس کی جان ہے۔ اگر ے شخص کی ذات کو اس فن میں استدلالی حیثیت سے مان لیا جاتا ہے تو اس کا واضح لفظوں مطلب یہ ہے کہ اس کی رجال میں معرفت کی پختگی اور راویوں کے احوال سے واقفیت کو تسلیم لیا گیا ہے کیونکہ علم الجرح میں جارح اور علم التعدیل میں معدل ہونے کی بنیادی شرط یہی ہے۔ علماء نے اس پہ سیر حاصل بحث کی ہے۔ تاج الدین السبکی، علامہ بدر بن جماعہ حافظ ابن حجر نے اس کی تصریح کی ہے کہ جو شخص جرح و تعدیل کے اسباب و وسائل سے ف نہ ہو اس کی کوئی رائے اس فن میں کسی درجہ میں قبول نہ کی جائے گی اور حافظ ذہبی نے ما ہے:

وہ عالم و عارف جو حدیثوں کے راویوں کا تزکیہ یا ان پہ جرح کرتا ہے

---

[1] فتح القدیر ص ۱۵۱ھ

نقاد خبیر اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کی تلاش و جستجو میں جان نہ کھپائے اور بہت زیادہ مذاکرہ، شب بیداری، تیقظ اور فہم و فراست کے ساتھ دینداری، پارسائی اور انصاف سے ہم آغوش نہ ہو۔[1]

دوسرے علماء نے بھی اسی قسم کی تصریحات پیش فرمائی ہیں۔

اہل فن کی یہ تصریحات بتا رہی ہیں کہ ناقد کے لیے راویوں کے حالات سے واقفیت ضروری ہے۔ ناقد کا فرض ہے کہ جس پر تنقید کر رہا ہے یہ جانے کہ کون ہے کیا کرتا ہے، اس کا چال چلن کیسا ہے، اس کی سمجھ بوجھ کس درجہ کی ہے، ثقہ ہے یا غیر ثقہ، عالم ہے یا جاہل، ذہین ہے یا غبی، یادداشت کا کیا حال ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے۔ کس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ جب تک ان بنیادی امور سے پوری واقفیت نہ ہو کوئی شخص ناقدین میں شمار نہیں ہو سکتا ہے۔ بلاریب اگر امام اعظم کا شمار معدلین رجال میں ہے اور نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ محدثین نے ان کے اس مقام کو تسلیم کیا ہے تو اس کے باور کرنے میں کس کو تامل ہو سکتا ہے کہ امام اعظم کو اسماء الرجال میں اونچا مقام حاصل تھا۔ امام اعظم اس موضوع پر بھی بعد میں آنے والوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ حافظ عبدالقادر قرشی نے ابو سلیمان الجوزجانی کے حوالہ سے مشہور امام حدیث حماد بن زید جو عبدالرحمٰن بن مہدی اور علی بن المدینی کے استاد ہیں ان کا جو بیان لکھا ہے اس سے امام اعظم کی رجال شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

سمعت حماد بن زید یقول ما عرفنا کنیۃ عمرو بن دینار الا بابی حنیفۃ کنا فی المسجد الحرام وابو حنیفۃ مع عمرو بن دینار فقلنا لہ یا ابا حنیفۃ کلمہ یحدثنا فقال یا ابا محمد حدثہم۔

میں نے حماد بن زید سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہمیں عمرو بن دینار کی کنیت کا علم نہ تھا۔ ابو حنیفہ کے ذریعہ ہمیں ان کی کنیت کا علم ہوا ایک بار ہم مسجد حرام میں تھے ابو حنیفہ عمرو بن دینار کے پاس ہی

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۵۔

کھڑے تھے ہم نے امام صاحب سے کہا کہ آپ ان سے کہئے کہ حدیث بیان کریں آپ نے ان سے فرمایا کہ اے ابو محمد ان کو حدیث سناؤ [1]

امام حماد بن زید کی جلالت قدر کا اندازہ کرنا ہو تو عبد الرحمٰن بن مہدی کا یہ بیان پڑھیے فرماتے ہیں کہ:

میں نے ان سے زیادہ سنت کا جانکار کوئی نہیں دیکھا ہے [2]

حافظ ابن عبد البر نے سلیمان بن حرب کے حوالہ سے جہاں ان کے متعلق یہ انکشاف کیا ہے کہ حماد کہتے ہیں بخدا مجھے ابو حنیفہ سے محبت ہے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ:

روی حماد بن زید عن ابی حنیفۃ حدیثا کثیراً۔ [3]

ان احادیث کثیرہ کی صحیح تعداد بھی سن لیجئے۔ امام عجلی فرماتے ہیں کہ حماد بن زید کو چار ہزار حدیثیں یاد تھیں اور یہ آپ پہلے امام حسن بن زیاد کی زبانی سن چکے ہیں کہ امام اعظم کی مجموعی مرویات کی تعداد چار ہزار ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ امام ابو حنیفہ کی ساری مرویات حماد بن زید روایت کرتے تھے۔ واضح رہے یہ عمرو بن دینار ہی ہیں جن کے متعلق امام سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ عمرو بن دینار کی حدیثیں بیان کرنے کے لیے مجھے تحدیث کے لیے مقرر فرمانے والے بھی امام اعظم ہیں [4] حماد بن زید کہتے ہیں کہ ہم عمرو بن دینار کے پاس ہوتے جب امام اعظم تشریف لاتے تو عمرو بن دینار ہمیں چھوڑ کر ان کی طرف سراپا توجہ ہو جاتے ہم امام اعظم سے پوچھتے وہ ہم سے حدیثیں بیان کرتے [5]

تاریخ رجال میں امام اعظم کی مہارت اور برتری کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوتا ہے جو داؤد بن المحبر نے بتایا ہے کہ امام اعظم سے پوچھا گیا کہ احرام والے کو اگر تہ بند نہ ملے تو کیا شلوار پہن سکتا ہے فرمایا ہرگز نہیں بلکہ اسے تہ بند باندھنا چاہیے۔ پوچھا اگر اس کے پاس تہ بند نہ ہو تو کیا کرے؟ فرمایا شلوار فروخت کرے اور تہ بند خرید لے۔

پوچھنے والے نے کہا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

المحرم یلبس السراویل اذا لم یجد الازار

احرام والا شلوار پہنے جب اسے تہ بند دستیاب نہ ہو۔

---

[1] الجواہر المضیۃ، [2] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۳۲۵۔ [3] الانتقاء ص ۱۳۰۔ [4] [5] ایضاً ج ا ص ۶۱۔

امام اعظم نے جواب میں فرمایا کہ:

لم یصح فی ھذا عندی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیئ۔

میرے نزدیک اس موضوع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت بھی صحیح نہیں ہے[1]

اور فرمایا کہ ہمارے نزدیک تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت یہی ثابت ہے کہ حضور انور نے احرام والے کو شلوار پہننے سے منع فرمایا۔
کسی حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کی راویوں پر نظر ہو اور اسانید و طرق کا پتہ ہو اس لیے امام اعظم کا یہ فرمانا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ امام اعظم تاریخ رجال سے پورے طور پر واقف تھے۔ امام مالک سے جب اس حدیث کے بارے میں یہی سوال کیا گیا تو امام مالک کا جواب یہ تھا:

لم اسمع بھذا ولا اری ان یلبس المحرم سراویل

میں نے یہ حدیث نہیں سنی ہے اور احرام والے کے لیے میری رائے میں شلوار پہننے کی گنجائش نہیں ہے[2]

الغرض امام مالک اور امام ابوحنیفہ دونوں ہی احرام والے کے لیے شلوار پہننے کے جواز کے قائل نہیں ہیں لیکن حدیث کی حد تک ایک باریک سا فرق ہے اور وہ یہ کہ امام مالک حدیث کے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے یہ حدیث سنی نہیں۔ اور نہ سننا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں اسی لیے حافظ ابن حجر عسقلانی کو امام مالک کی جانب سے یہ معذرت پیش کرنے کا خیال آگیا۔

کان حدیث ابن عباس لم یبلغہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک کو یہ حدیث نہیں پہنچی[3]

برخلاف امام اعظم کے کہ انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے یہ حدیث سنی نہیں ہے

---

[1] الانتقاد۔ [2] اوجز المسالک مع موطا ج ۳ ص ۱۲ ۳۔
[3] فتح الباری ج ۴ ص ۴۶۔

بلکہ فرمایا ہے:

لم یصح فی ھذا عندی من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ ایک میں بے خبری اور دوسری میں باخبری کا پتہ ان کے لم یصح کہنے سے چلتا ہے۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ حدیث تو موجود ہے لیکن اس کی صحت کا جو معیاری پیمانہ مقرر ہے اس پر پوری نہیں اترتی ہے۔ کیونکہ محدثین کے یہاں عدم صحت اس کو مستلزم نہیں ہے کہ گھڑی ہوئی اور موضوع ہے۔ علامہ زرکشی نے نکت علی ابن الصلاح میں، حافظ ابن حجر عسقلانی نے القول المسدد اور نتائج الافکار میں اور ملا علی قاری نے موضوعات کبیر میں تصریح کی ہے اور باخبر ہو کر روایت کی عدم صحت کا اعلان فنکار ہونے کی نشانی ہے۔ اسی بنا پر اس حدیث پر علی الاطلاق امام احمد کے سوا کسی نے عمل نہیں کیا ہے چنانچہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

قال القرطبی: اخذ بظاھر ھذا الحدیث احمد فاجاز لبس الخف والسراویل للمحرم الذی لا یجد النعلین او الازار علی ما لھما واشترط الجمھور قطع الخف وفتق السراویل۔

قرطبی فرماتے ہیں اس حدیث کے ظاہر پر امام احمد نے عمل کیا ہے انہوں نے خف اور شلوار کے پہننے کو جیسے بھی ہوں جائز سمجھا ہے لیکن جمہور نے خف کے لیے قطع اور شلوار کے لیے فتق کی شرط لگائی ہے [1]

بہرحال امام اعظم ابوحنیفہ علم الجرح والتعدیل کی طرح معاملہ الرجال کے فن میں یکتائے روزگار تھے۔

تحمل روایت حدیث اور امام اعظم

امام اعظم نے علم حدیث کے ہر شعبے میں خاص رہنمائی فرمائی ہے اور مستقبل میں جب کہ علوم و فنون میں بہار آنے والی تھی آپ نے بننے کے نشانات کا کچھ اس انداز سے پتہ دیا ہے کہ

---

[1] فتح الباری ج ۴ ص ۴۸۔

بعد میں آنے والوں نے ان ہی بتائے ہوئے نشانات پر پوری عمارت قائم کی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے جیسا کہ حافظ ابن حزم نے بتایا ہے کہ اقوام دنیا میں کسی کو اسلام سے پہلے یہ توفیق میسر نہیں ہوئی ہے کہ اپنے پیغمبر کی باتیں صحیح صحیح ثبوت کے ساتھ محفوظ کر سکے یہ شرف صرف امت اسلامیہ کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے رسول کے ایک ایک کلمہ کو صحت اور اتصال کے ساتھ جمع کیا ہے آج روئے زمین پر کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو اپنے پیشوا کے ایک کلمہ کی سند بھی صحیح طریق پر پیش کر سکے اس کے برعکس اسلام نے اپنے رسول کی سیرت کا ایک ایک شوشہ پوری صحت و اتصال کے ساتھ محفوظ کیا۔ اور صرف اس سرمایہ علمی کی حفاظت ہی نہیں بلکہ اس علمی سرمایہ کو آگے پہنچانے، ایک دوسرے سے اسے حاصل کرنے کے طرق بھی مقرر فرمائے ہیں۔ چنانچہ اسی کو محدثین کی اصطلاحی زبان میں تحمل روایت کہتے ہیں۔

تحمل روایت کے طرق

تحمل روایت کے لیے ارباب روایت نے آٹھ صورتیں مقرر فرمائی ہیں۔ حافظ زین الدین عراقی لکھتے ہیں:

الاخذ للحدیث وتحملہ عن الشیوخ ثمانیۃ اقسام[1]

پھر ان طرق سے حاصل کردہ احادیث کو بیان کرنے کے لیے تعبیر کا بھی ایک خاص پیمانہ مقرر کیا ہے۔

محدثین نے تحمل روایت کی جو آٹھ صورتیں بتائی ہیں یہ ہیں۔ سماع[1]، عرض[2]، اجازہ[3]، مناولہ[4]، مکاتبہ[5]، اعلام[6]، وصیۃ[7]، وجادۃ[8]۔

سماع وعرض

سماع یہ ہے کہ شاگرد اپنے استاد سے مشافہۃً احادیث سنے چاہے استاد اپنے حافظہ کے بھروسہ پر زبانی سنائے یا پھر کتاب سے دیکھ کر سنائے۔ لکھائے یا نہ لکھائے۔ چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں:

---

[1] توضیح الافکار ج ۲ ص ۲۹۵۔

سماع الشیخ وھو املاء وغیرہ من حفظ ومن کتاب [1]

حافظ زین الدین عراقی فرماتے ہیں :

سواء احدث من کتابہ او من حفظہ باملاء او بغیر املاء [2]

عرض یہ ہے کہ شاگرد پڑھے اور اُستاد سنے ۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں :

القراءۃ علی الشیخ حفظا او من کتاب وھو العرض عند الجمہور [3]

سماع ہو یا عرض ان دونوں میں اس موضوع پر تو کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ان دونوں طریقوں سے روایت کرنا صحیح ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ یہ دونوں برابر ہیں یا ان دونوں میں اعلیٰ و ادنیٰ کی نسبت ہے ۔

جمہور محدثین نے سماع کو ارفع اقسام قرار دیا ہے ۔ چنانچہ حافظ ابن الصلاح نے مقدمہ میں ، حافظ زین الدین عراقی نے الفیہ میں ، امام نووی نے تقریب میں ، حافظ ابن کثیر نے اختصار علوم الحدیث میں اور حافظ سیوطی نے تدریب میں اس کی تصریح کی ہے لیکن اس موضوع پر دوسری صدی کے محدثین کی آراء ان بزرگوں سے مختلف ہیں ۔ دوسری صدی میں امام ابوحنیفہ ، امام مالک ، امام لیث بن سعد ، امام ابن ابی ذئب ، امام شعبہ ، امام یحییٰ بن سعید الانصاری ، امام عبدالعزیز بن جریج ، امام سفیان ثوری اور امام سعید بن ابی عروبہ جیسے اساطین اُمت کی رائے میں تحمل روایت کی دوسری صورت یعنی شاگرد پڑھے اور اُستاد سنے جسے قرأۃ علی الشیخ اور عرض کہتے ہیں ارفع اقسام ہے ۔ اس سلسلے میں محدثین کی تصریحات یہ ہیں ۔

حافظ سیوطی نے امام بیہقی کی مدخل کے حوالہ سے مکی بن ابراہیم کا بیان درج کیا ہے :

ابن جریج ، عثمان بن الاسود ، حنظلہ بن ابی سفیان ، طلحہ بن ابی سفیان ، طلحہ بن عمرو ، امام مالک ، محمد بن اسحاق ، سفیان ثوری ، ابوحنیفہ ، ہشام بن عروہ ، ابن ابی ذئب ، سعید بن ابی عروبہ ، المثنیٰ بن الصباح ،

---

[1] تقریب ص ۲۳۹ ۔ [2] توضیح الافکار ج ۲ ص ۲۹۷ ۔ [3] اختصار علوم الحدیث ۔

ان سب کا کہنا ہے کہ تمہارا استاد تمہارے سامنے پڑھے اور تم سنو[1]
حافظ ابو بکر الخطیب نے مکی بن ابراہیم کے حوالہ سے خاص امام ابو حنیفہ کی زبانی بیان لکھا ہے
مکی بن ابراہیم کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ فرماتے تھے کہ میں اگر استاد کے
روبرو پڑھوں تو مجھے یہ زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ استاد پڑھے
اور میں سنوں[2]
اسی سلسلے میں امام حسن بن زیاد کے حوالے سے امام اعظم کا جو بیان آیا ہے وہ بھی سن لیجئے
اس سے امام صاحب کا موقف واضح اور صاف ہو کر سامنے آجاتا ہے :۔
حسن بن زیاد کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ فرماتے تھے۔ تمہارا محدث کے
روبرو پڑھنا اس سے سننے کے مقابلے میں زیادہ ثابت اور مؤکد
ہے کیونکہ جب استاد تمہارے سامنے پڑھے تو وہ صرف کتاب ہی
سے پڑھے گا اور جب تم پڑھو گے تو وہ کہے گا کہ میری جانب سے وہ
بیان کرو جو تم نے پڑھا ہے اس لیے یہ مزید تاکید ہو گی[3]
حافظ ابن کثیر نے امام اعظم کے اس موقف کو ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے :
وعن مالک وابی حنیفۃ وابن ابی ذئب انھا اقوی
امام مالک، ابو حنیفہ اور ابن ابی ذئب کہتے ہیں کہ یہی قوی ہے
امام نووی نے امام صاحب کے اس موقف کو ذرا اور طرح پیش کیا ہے :
والثابت عن ابی حنیفۃ وابن ابی ذئب وھو روایۃ
عن مالک
امام ابو حنیفہ اور ابن ابی ذئب اور امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ
قراۃ علی الشیخ کو شیخ سے سننے پر ترجیح دی جائے[4]
حافظ ابن الصلاح نے بھی اس کا تذکرہ فرمایا ہے :
فنقل عن ابی حنیفۃ وابن ابی ذئب وغیرھما ترجیح القراۃ

---

[1] تدریب الراوی ص ۲۴۴ - [2] الکفایہ فی علوم الروایہ ص ۲۰۶ - [3] اختصار علوم الحدیث ص ۱۱۰
[4] تقریب ص ۲۴۴ -

علی الشیخ علی السماع من لفظہ [1]

امام ابوحنیفہ امام ابن ابی ذئب نے قرأۃ علی الشیخ کو سماع پر ترجیح دی ہے۔

حافظ زین الدین عراقی نے امام اعظم اور ابن ابی ذئب کا نام لکھ کر بتایا ہے

قد رجحا العرض وعکسہ اصح
وجلّ اھل المشرق نحوہ جنح [2]

اس داستان کو طول دینے اور ارباب حدیث کی تصریحات کے تکرار سے میرا مقصود علم کے ان یتیم خانوں میں محدثین کی یہ صدائے غریب پہنچانا ہے جو بجلی کی روشنی اور پنکھوں کی ہوا میں بیٹھ کر یہ کہتے رہتے ہیں کہ ابوحنیفہ حدیث سے بے بہرہ تھے اور ابلہ فریبی کے لیے ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ وہ فقیہ تھے اور صرف فقیہ۔ انصاف آپ کے ہاتھ ہے۔

بہرحال تحمل روایت کا کوئی طریق ہو سماع ہو یا قرأۃ علی الشیخ اس پر سب کا ہی اتفاق اور اجماع ہے کہ دونوں طرح سے روایت صحیح ہے لیکن بیان روایت کے لیے دوسرے طریق یعنی قرأۃ علی الشیخ میں جو تعبیری پیمانہ اختیار کیا جاتا ہے اس میں اگرچہ اس حد تک تو سب یک زبان ہیں کہ تعبیر یوں ہونی چاہیے قرأت علیہ (میں نے اس کے سامنے پڑھا) یا قرئ علیہ وانا اسمع (اس کے سامنے پڑھا گیا اور میں سن رہا تھا) وغیرہ۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ اس طریق میں حدثنا یا اخبرنا کا تعبیری پیمانہ بھی استعمال کرنا درست ہے یا نہیں۔ عام ارباب روایت اور محدثین اس سے روکتے ہیں۔ امام احمد، نسائی اور دوسرے محدثین کا یہی مذہب ہے خطیب بغدادی نے لکھا ہے:

ھو مذھب خلق کثیر من اصحاب الحدیث

محدثین کی اکثریت کا مذہب یہی ہے

حافظ ابن کثیر نے اسے مسلم، نسائی اور جمہور مشارقہ کا مذہب قرار دیا ہے لیکن اس موضوع پر امام اعظم ابوحنیفہ کا مذہب ان بزرگوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ امام اعظم اس صورت میں حدثنا کی تعبیر کو جائز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابوبکر الخطیب فرماتے ہیں کہ:

---

[1] مقدمہ ص ۵۲ [2] القید ص ۶۲۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ میں نے امام اعظم سے دریافت کیا کہ ایک شخص جس نے حدیث محدث کو سُنا کر حاصل کی ہے کیا اس کے لیے گنجائش ہے کہ وہ حدثنا کہے ؟ فرمایا کہ ہاں اس کے لیے گنجائش ہے کہ وہ یہ کہے کہ حدثنی فلان اور سمعت فلانا اور اس کا یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کے سامنے اقراری دستاویز کو پڑھا جائے اور کہہ دے کہ اس نے میرے سامنے اس دستاویز کے سارے مندرجات کا اقرار کیا ہے [۱]

ایک دوسرے موقعہ پر خطیب بغدادی ہی رقمطراز ہیں :

امام ابوعاصم النبیل کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک، ابن جریج، سفیان ثوری اور امام ابوحنیفہ سے دریافت کیا کہ ایک شخص اگر شیخ کے سامنے حدیث پڑھ رہا ہے تو کیا اسے نقلِ روایت کے موقعہ پر حدثنا کہنا درست ہے؟ سب کا متفقہ جواب یہ تھا کہ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

امام ابوعاصم ہی کا ایک اور بیان اس سے زیادہ واضح ہے فرماتے ہیں :

میں نے امام مالک، ابن جریج، سفیان ثوری اور ابوحنیفہ سے پوچھا کہ محدث کے سامنے ایک شخص خود حدیث پڑھتا ہے پھر وہ کہتا ہے کہ حدثنا فلان اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ سب کا جواب یہ تھا کہ ہاں ٹھیک ہے۔ ابوعاصم کہتے ہیں کہ ان میں دو حجازی اور دو عراقی ہیں۔

مشہور محدث یحییٰ بن ایوب کہتے ہیں :

میں نے ابوقطن سے سُنا ہے وہ فرماتے تھے کہ میرے سے امام ابو حنیفہ نے کہا میرے سامنے پڑھو اور حدثنا کہو۔ اگر میرے خیال میں اس میں کوئی بھی مضائقہ ہوتا تو میں ایسا کرنے کا تمہیں ہرگز حکم

---

[۱] الکفایہ فی علوم الروایہ ص ۳۰۷۔

نہ دیتا۔[1]

امام نووی نے تقریب میں لسے دوسری صدی کے محدثین کا مذہب قرار دیتے ہوئے اس موضوع پر امام بخاری کی ہمنوائی کا بھی تذکرہ کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

انہ مذھب الزھری ومالک وابن عیینۃ ویحیی القطان والبخاری وجماعۃ من المحدثین ومعظم الحجازیین والکوفیین۔[2]

قاضی عیاض، حافظ سیوطی، حافظ ابن کثیر بھی اس معاملے میں امام نووی کے ہم زبان ہیں۔

تحمل روایت اور اجازت

تحمل روایت کے طریقوں میں سے اجازت بھی محدثین کے یہاں ایک طریق ہے۔ محدثین کی زبان میں اجازت یہ ہے کہ شیخ کسی بھی شخص کو اپنی مرویات کی روایت کا زبانی یا تحریری پروانہ دے دے۔

اجازت کی ایک نہیں بلکہ محدثین کے نزدیک متعدد صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی خاص شخص کو کسی خاص حدیث کی اجازت دی جاتے مثلاً یوں کہے کہ میں نے تم کو حدیث کی اجازت دی ہے۔ جمہور محدثین اس کے جواز کے قائل ہیں اور اس طریق سے علمی سرمایہ کی روایت کو درست کہتے ہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں۔

والصحیح الذی قالہ الجمھور من الطوائف واستقر علیہ العمل جواز الروایۃ والعمل بھا۔

سب کے نزدیک صحیح اور سب کا عمل جس پر ہے وہ یہی ہے کہ اس کی روایت اور اس پر عمل درست ہے۔[3]

لیکن محدثین میں مشہور امام نقد و نظر شعبہ اس کے جواز کے قائل نہیں ہیں اور حافظ سیوطی نے تدریب میں امام آمدی کے حوالہ سے امام ابوحنیفہ اور ابویوسف کا اور قاضی عبدالوہاب کے حوالہ سے امام مالک کا بھی یہی موقف قرار دیا ہے چنانچہ آمدی نے تصریح کی ہے:

قال ابوحنیفۃ وابویوسف لا تجوز الروایۃ بالاجازۃ مطلقاً۔[4]

---

[1] الکفایہ ص ۳۰۷۔ [2] تقریب ص ۲۴۵۔ [3] تقریب ص ۲۴۵۔ [4] الاحکام الآمدی ج ۲ ص ۱۹۲

تحمّلِ روایت اور مناولہ

تحمّل روایت کے طریقوں میں سے ایک طریق مناولہ بھی ہے
مناولہ یہ ہے کہ محدث طالب کو اپنی مسموعات پر مشتمل کتاب دے اور کہہ دے کہ اسے تم میری جانب سے روایت کرو یا طالب کو کتاب کا مالک بنا دے یا لکھنے کے لیے کتاب عاریۃً دے دے یا طالب شیخ کے پاس اپنی مسموعات کی کتاب لے کر آئے شیخ اُسے دیکھ کر طالب کو کہہ دے کہ تمہیں اس کتاب کے مشتملات کی میری جانب سے روایت کی اجازت ہے اس کو عرض المناولہ کہتے ہیں۔ اس موقعہ پر محدثین کے یہاں یہ سوال ابھر آیا ہے کہ بلحاظِ قوت اس کا کیا حکم ہے ؟ اس ابھرے ہوئے سوال کے جواب میں علماء مختلف الخیال ہیں۔ امام نووی نے بتایا ہے کہ امام زہری، ربیعہ، یحییٰ بن سعید، مجاہد، امام شعبی، علقمہ، ابراہیم، ابوالعالیہ، ابوالزبیر مکی، ابوالمتوکل، مالک، ابن وہب، ابن القاسم۔ ان سب کی رائے یہ ہے کہ عرض مناولہ قوت میں تحملِ روایت کی پہلی صورت سماع کے برابر اور ہم پلہ ہے لیکن اس کے مقابلے میں امام ابوحنیفہ، سفیان ثوری، امام اوزاعی اور عبداللہ بن المبارک وغیرہ کہتے ہیں کہ عرض مناولہ کا درجہ سماع اور قرأت علی الشیخ دونوں سے کمتر ہے۔ چنانچہ حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں :

والصحیح انها منحطة عن السماع والقراءة وهو قول الثوری
والاوزاعی وابن المبارک وابی حنیفة

صحیح یہی ہے کہ مناولہ عرض کا مقام سماع اور قرأت علی الشیخ سے نیچے ہے یہی ثوری، اوزاعی، ابن مبارک اور ابوحنیفہ کا کہنا ہے[1]

اور امام حاکم نے اسی بات کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح پیش فرمایا ہے :

اما فقهاء الاسلام الذین افتوا فی الحلال والحرام فانهم
لم یروه سماعاً منهم الشافعی والاوزاعی وابوحنیفة
والثوری وابن حنبل وابن المبارک

فقہاء اسلام جو اسلام میں حلال وحرام کا فتویٰ دیتے ہیں وہ عرض مناولہ کو سماع قرار نہیں دیتے جیسے شافعی، اوزاعی، ابوحنیفہ اور ثوری وغیرہ[2]

---

[1] مقدمہ ابن الصلاح [2] معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۰۶۔

بہرحال امام اعظم کا مذہب اس موضوع پر یہی ہے کہ عرض مناولہ سماع و قرأت کے ہم پلہ نہیں ہے اور متاخرین محدثین نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے۔

تحمل روایت کی باقی صورتیں یعنی مکاتبہ، اعلام، وصیت اور وجادہ پر بھی محدثین کے یہاں تفصیلی مباحث اصول حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ علم حدیث کی ہر شاخ میں امام اعظم کی جلیل القدر خدمات موجود ہیں اور محدثین نے ہمیشہ سے اس فن میں ان کی جلالت شان کا لوہا مانا ہے۔ اسی بنا پر حافظ ابن عبدالبر نے مشہور محدث یزید بن ہارون کا امام اعظم کے بارے میں یہ تاثر نقل کیا ہے۔

ادرکت الف رجل وکتبت عن اکثرھم ما رأیت فیھم افقہ ولا اورع ولا اعلم من خمسۃ اولھم ابو حنیفۃ

میں نے ہزار محدثین کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے اور ان میں اکثر سے احادیث لکھی ہیں لیکن ان سب میں سب سے زیادہ فقیہ، سب سے زیادہ پارسا اور سب سے زیادہ عالم صرف پانچ ہیں۔ ان میں اولین مقام ابو حنیفہ کا ہے [۱]

امام مکی بن ابراہیم فرماتے ہیں:

کان ابو حنیفۃ زاھداً عالماً راغباً فی الآخرۃ صدوق اللسان احفظ اھل زمانہ۔

امام ابو حنیفہ زاہد، عالم، آخرت کی طرف راغب، راست گو اور اپنے زمانے میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔ [۲]

محدث صیمری نے شیخ الاسلام حافظ یزید بن ہارون سے بھی اسی کے قریب قریب روایت یا ہے:

کان ابو حنیفۃ تقیاً زاھداً عالماً صدوق اللسان احفظ اھل زمانہ [۳]

اور امام یحییٰ بن سعید القطان جو مشہور ناقد حدیث اور جرح و تعدیل کے امام ہیں وہ فرماتے ہیں:

---

[۱] جامع بیان العلم وفضلہ۔ الانتقاء ص ۱۲۳۔ [۲] مناقب موفق، [۳] مقدمہ ابن ماجہ۔

انہ واللہ لا علم ہذہ الامۃ بما جاء عن اللہ و رسولہ

واللہ امام ابوحنیفہ اس اُمت میں اللہ اور اس کے رسُول کے احکام کے سب سے بڑے عالم تھے[1]

امام ابو عبداللہ الحاکم نے اپنی مشہور کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں نوع التاسع والاربعین میں ان ائمہ کا تذکرہ کیا ہے جن کی حدیثوں کو حفظ و مذاکرہ اور برکت کے لیے ذخیرہ کیا جاتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

ہذا النوع من ہذہ العلوم معرفۃ الائمۃ الثقات المشہورین من التابعین واتباعہم ممن یجمع حدیثہم للحفظ والمذاکرۃ والتبرک بہم وبذکرہم من الشرق الی الغرب۔

یہ قسم علوم حدیث ہیں سے ان معتمد، مشہور تابعین اور اتباع تابعین کے بتانے کے لیے ہے جن کی حدیثوں کو حفظ، مذاکرہ کے لیے جمع کیا جاتا ہے۔ اور جن سے برکت پائی اور مشرق سے مغرب تک جن کے ذکر سے برکت لی جاتی ہے[2]

یہ عنوان قائم کر کے امام حاکم نے مدینہ، مکہ، مصر، شام، یمن، یمامہ، کوفہ، الجزیرہ، بصرہ، واسط اور خراسان کے محدثین کا تذکرہ کیا ہے ان میں امام ابوحنیفہ کا نمایاں تذکرہ کیا ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام اعظم محدث ہونے کی حیثیت سے محدثین کی برادری میں صرف جانے پہچانے نہیں بلکہ بارگاہ محدثین میں ان کی جلالت وامامت علم حدیث میں مسلم ہے

حدیث شاذ اور امام اعظم

یہ امر واقعہ ہے کہ آج بھی تدوین حدیث کے بعد حدیث کے نام پر جو علمی سرمایہ موجود ہے وہ تین قسم کا ہے۔ کچھ وہ حدیثیں ہیں جن کے الفاظ محفوظ ہیں اور کچھ وہ ہیں کہ الفاظ تو محفوظ نہیں لیکن ان کے معانی محفوظ ہیں۔ اور کچھ حدیثیں ایسی ہیں جن کے الفاظ میں

---

[1] ماتمس بہ الحاجہ [2] معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۴۰۔

اختلاف ہے اور ساتھ ہی ان کے راویوں کی عدالت بھی اختلافی ہے۔ قسم اول اور قسم ثانی محدثین اور فقہاء کے یہاں مفہوم و مدلول کی تعبیر میں اختلافی ہے اور آخری قسم خود محدثین کے یہاں صحت اور ثبوت کے لحاظ سے اختلافی ہے، چنانچہ حافظ ابوبکر عقال الصقلی فرماتے ہیں :۔

> احادیث محدثین کے یہاں دائرہ ضبط میں اس طرح آتی ہیں کہ کچھ ایسی ہیں جن کی نقل میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعینہٖ الفاظ محفوظ ہو گئے ہیں۔ یہی وہ حدیثیں ہیں جو ہر قسم کی علت سے پاک وصاف ہیں۔ کچھ حدیثیں وہ ہیں کہ نقل میں معانی تو محفوظ ہیں مگر اصل الفاظ تک محدثین کی رسائی نہیں ہوئی ہے۔ اور کچھ حدیثیں وہ ہیں کہ جن کے الفاظ مختلف ہیں اور جن کے راویوں کی عدالت بھی اختلافی ہے یہی وہ حدیثیں ہیں جن میں علتیں ہوتی ہیں۔ فنکار ہی اصول صحیحہ کے مطابق ان میں صحیح اور ضعیف کی تمیز کر سکتے ہیں [1]

محدثین نے صحیح حدیث کی تعریف یہ بتائی ہے کہ جس کے راویوں میں ضبط، عدالت کے ساتھ سند کا اتصال ہو اور اس میں شذوذ اور علت قادحہ نہ ہو۔ گویا حدیث کے صحیح ہونے کی ایک ناگزیر منفی شرط یہ ہے کہ وہ شاذ نہ ہو لیکن شاذ کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں محدثین میں باہم اختلاف ہے۔

حافظ ابن کثیر نے حافظ ابو یعلی الخلیلی سے شاذ کی یہ تعریف نقل کی ہے :

> والذی علیہ الحفاظ ان الشاذ مالیس لہ الا اسناد واحد یشذ بہ ثقۃ او غیر ثقۃ ۔

> حفاظ کے نزدیک شاذ یہ ہے کہ اس کی صرف ایک ہی سند ہو اور اس طرح ثقہ یا غیر ثقہ اس میں شذوذ پیدا کر رہا ہو [2]

اور امام حاکم نے شاذ کی یہ تعریف بتائی ہے ۔

> ھو الذی ینفرد بہ الثقۃ ولیس لہ متابع

---

[1] شروط الائمۃ الخمسۃ، ذکر الکوثری فی تعلیقہ ما نقلہ عن ابی بکر بن عقال الصقلی فی فوائدہ علی ما رواہ ابن بشکوال

[2] اختصار علوم الحدیث ص ۵۷ ۔

ثقہ راوی کا ایسا یگانہ بیان جس کا متابع کوئی نہ ہو شاذ کہلاتا ہے[1]

لیکن حافظ ابن الصلاح نے دونوں پر بڑی کڑی تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ اگر شاذ یہی ہے تو امام بخاری کی پہلی حدیث بھی شاذ ہے اور اس پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

اس تعریف کی بنیاد پر تو حدیث انما الاعمال بالنیات بھی شاذ ہے۔ کیونکہ یہ بھی ایک فرد ہے جسے حضرت عمر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے منفرداً روایت کرتے ہیں پھر حضرت عمر سے علقمہ بھی منفرداً روایت کرتے ہیں اور علقمہ سے اسے روایت کرنے میں محمد بن ابراہیم اور محمد بن ابراہیم سے یحییٰ بن سعید منفرد ہیں۔ محدثین کے نزدیک یہی ثابت ہے اور اس سے بھی زیادہ واضح مثال عبداللہ بن دینار کی یہ حدیث ہے ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن بیع الولاء و ھبتہ۔ اس میں بھی عبداللہ بن دینار منفرد ہے۔ ایسے ہی وہ حدیث جو بحوالہ مالک از زہری از انس آئی ہے جس میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوتے اور آپ کے سر پر ڈھال تھی۔ اس میں مالک امام زہری سے منفرد ہیں۔ یہ سب روایات صحیحین میں موجود ہیں اور ان کی سند بھی صرف ایک ہی ہے جس کا تعلق ثقہ کے تفرد سے ہے۔ غرائب صحیح میں اس کا وافر ذخیرہ ہے۔ امام مسلم کا اپنا اقرار ہے کہ امام زہری کی نوے حدیثیں ایسی ہیں کہ ان کی اسناد میں وہ منفرد ہیں اور ان کی کوئی ہمنوائی نہیں کرتا ہے۔

حافظ ابن الصلاح نے اس الجھن کا مداوا اور اس مشکل کا خود ہی حل بھی پیش فرمایا ہے لیجیے وہ بھی ان کی زبانی سن لیجیے وہ فرماتے ہیں :

اصل واقعہ یہ ہے کہ راوی اگر کوئی روایت منفرداً پیش کرتا ہے تو ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ اس کی یہ روایت اگر اس سے زیادہ

---

[1] معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۱۹

کسی حافظ وضابط کی روایت کے خلاف ہو تو یہ شاذ مردود ہے۔ اور
اگر اس کی روایت میں مخالفت کا کوئی پہلو نہ ہو تو پھر اس منفرد کی حیثیت
کو دیکھا جائے اگر حافظ عادل اور ثقہ ہو تو اس کے تفرد کو شرف پذیرائی
دیا جائے اور اس میں یگانگت قادح نہیں ہوگی جیسا کہ پہلی مثالوں
میں ہے اور اگر راوی کے حفظ و اتقان پر بھروسہ نہ ہو تو اس کی روایت
دائرہ صحت سے خارج تصور کی جائے گی۔[1]

قاضی بدرالدین بن جماعہ نے حافظ ابن الصلاح کی اس پیش فرمودہ قرارداد کی تائید فرمائی ہے لیکن حافظ محمد بن ابراہیم نے اس پر بھی ایک سوال قائم کر دیا ہے اور بہت کچھ چنین و چناں کے بعد نتیجہ یہ نکالا ہے کہ:

شاذ اور نکارت کی بنا پر حدیث میں محدثین کے لیے قدح بے حد مشکل ہو گئی۔[2]

یہ خالص محدثانہ رنگ میں ان محدثین کا نقطہ نظر ہے جن پر اسناد و روایت کا غلبہ ہے۔ دوسری صدی میں شاذ کی تعریف اور اس کی حقیقت کو آشکارا کرنے کے لیے محدثین نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ اس سے بالکل جداگانہ ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ ہر ایسی حدیث کو شاذ قرار دیتے ہیں جو اس موضوع پر آئی ہوئی دوسری حدیثوں اور معانی قرآن کے خلاف ہو۔ چنانچہ حافظ ابن عبدالبر نے امام اعظم کے نقطہ نظر کو ایک موقعہ پر محدثین کو جواب دیتے ہوئے اس طرح واضح کیا ہے:

كثير من اهل الحديث استجازوا الطعن على ابى حنيفة
لرده كثيراً من اخبار الآحاد العدول لانه كان يذهب
فى ذالك الى عرضها على ما اجتمع عليه من الاحاديث و
معانى القرآن فما شذ من ذالك رده وسماه شاذاً۔

بہت سے محدثین نے امام ابوحنیفہ پر اس لیے اعتراض کیا ہے کہ
انہوں نے بہت سے ثقہ شخصوں کی حدیثوں پر عمل نہیں کیا۔ اصل
بات یہ ہے کہ امام صاحب کا دستور یہ تھا کہ وہ خبر واحد کو اس
باب کی دوسری حدیثوں اور معانی قرآن کے مجموعہ سے ملا کر دیکھتے

---

[1] مقدمہ ابن الصلاح ص ۳۰۔ [2] تنقیح الانظار ج ۱ ص ۳۸۵۔

اگر خبر واحد کا مضمون ان سے مطابقت کھاجاتا تو اس پر عمل کر لیتے ورنہ اس
کو قبول نہ کرتے اور اس کو شاذ حدیث فرماتے [1]

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ امام اعظم اس حدیث کو شاذ بتاتے ہیں جو معانی قرآن اور اس موضوع پر آئی ہوئی دوسری حدیثوں کے خلاف ہو۔ امام اعظم کا شاذ کے موضوع پر یہ موقف قابل داد ہے اور امام مالک بھی امام صاحب کے ہمنوا ہیں۔ اسی بنا پر امام مالک حدیث ولوغ کلب کی تضعیف فرماتے تھے۔ شاطبی فرماتے ہیں کان مالک یضعفہ امام مالک اسے ضعیف کہتے تھے [2] لیکن حالات کے تحت طبیعتوں اور مزاجوں میں اختلاف رونما ہو گیا۔ جن کے مزاجوں میں تفقہ کا رنگ غالب تھا۔ انہوں نے امام اعظم کی ہمنوائی کی۔ چنانچہ امام شافعی سے جو شاذ کی تعریف منقول ہے وہ بھی اس کے قریب قریب ہے وہ فرماتے ہیں کہ :

شاذ یہ نہیں ہے کہ ثقہ راوی کوئی ایسی حدیث روایت کرے جس کو اس
کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا بلکہ شاذ یہ ہے کہ ثقہ راوی ایسی حدیث
روایت کرے جو عام لوگوں کی روایت کے مخالف ہو [3]

جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ بخلاف ماروی الناس سے امام اعظم کے موقف کی تائید فرمائی ہے لیکن چونکہ امام موصوف نے تیسری صدی کا کچھ حصہ پایا ہے اور اس دور میں جملہ بلادِ اسلامیہ کے افراد و غرائب بازار میں عام ہو گئی تھیں اس لیے تعبیر اس ماحول کی علمی فضا سے متاثر ہو گئی ہے اور معاملہ صرف روایت و اسناد پر آکر ٹھہر گیا ہے

قاضی ابو یوسف نے ایسی روایت کو شاذ قرار دیا ہے۔

جو کتاب و سنت کے موافق نہ ہوں اور جو فقہاء مجتہدین میں معروف
نہ ہوں۔

چنانچہ وہ ایک موقعہ پر لکھتے ہیں :

فایاک وشاذ الحدیث وعلیک بما علیہ الجماعۃ من الحدیث
وما یعرفہ الفقہاء ما یوافق الکتاب والسنۃ ۔

---

[1] الانتصار ص ۴۲ [2] الموافقات ج ۲ ص ۲۴ [3] الموافقات ج ۳ ص ۲۱
[3] توضیح الافکار ج ۱ ص ۳۷۷ ۔

ایک دوسرے موقعہ پر فرماتے ہیں :

وھو عندنا شاذ والشاذ من الحدیث لا یوخذ بہ

یہ حدیث شاذ ہے اور شاذ حدیث ہمارے نزدیک حجت نہیں ہے[1]

بہرحال دوسری اور تیسری صدی کے محدثین شاذ حدیث کے موضوع پر مختلف الخیال ہیں۔

روایت بالمعنے اور امام اعظم

اس نقطہ پر متقدمین اور متاخرین سب کا تقریباً اتفاق ہے کہ اگر روایت کرنے والا حافظ اور عارف نہ ہو تو اس کے لیے روایت بالمعنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے چنانچہ حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں :

اگر کوئی شخص حدیث بالمعنے روایت کرنا چاہے تو اگر الفاظ اور مقاصد روایت سے آشنا نہ ہو تو سب کا اس پر اتفاق ہے کہ اس کے لیے روایت بالمعنے جائز نہیں ہے۔ اسے روایت باللفظ ہی کرنی چاہیے[2]

امام نووی فرماتے ہیں کہ :

اگر الفاظ اور مقاصد سے ناآشنا ہو اور معانی کے ڈھانچہ سے ناواقف ہو تو بالاتفاق اس کے لیے روایت بالمعنے ناجائز ہے۔ روایت باللفظ ہی کرنی چاہیے[3]

حافظ ابن کثیر نے اختصار علوم الحدیث میں بھی تصریح فرمائی ہے۔ لیکن علماء کا اس موضوع پر اختلاف ہے کہ اگر راوی عالم و عارف ہو تو کیا اس کے لیے روایت بالمعنے کی کوئی گنجائش ہے۔ حافظ ابوبکر الخطیب نے اکثر سلف کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ وہ اسے بھی ناجائز کہتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ :

سلف کی اکثریت اور حدیث میں ارباب تحقیق کہتے ہیں کہ روایت بالمعنے ناجائز ہے بلکہ نہایت ضروری ہے کہ روایت باللفظ ہو اس میں کسی قسم کی کوئی کمی یا زیادتی اور کسی طرح کی تقدیم اور تاخیر نہ کی جائے۔

---

[1] الرد علی سیر الاوزاعی ص ۱۰۵۔ [2] مقدمہ ص ۱۰۵۔ [3] تقریب ص ۳۱۱۔

اس موضوع پر کچھ روایات ہم پیش کر چکے ہیں ان اکابر نے عالم اور غیر عالم میں اس موضوع پر کوئی فرق نہیں کیا ہے [1]

حافظ جلال الدین السیوطی نے اسی کو سلف میں قاسم بن محمد، امام ابن سیرین اور رجاء بن حیوہ کا مسلک قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

کان القاسم بن محمد وابن سیرین و رجاء بن حیوہ یعیدون الحدیث علی حروفہ [2]

قاسم، ابن سیرین رجاء روایت باللفظ کرتے تھے۔

امام ذہبی نے صحابہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود کو اسی نظریہ کا علم بردار بتایا ہے وہ فرماتے ہیں:

کان ممن یتحری فی الاداء ویشدد فی الروایۃ ویزجر تلامذتہ عن التھاون فی ضبط الالفاظ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود ادائیگی میں تحری کرتے تھے اور روایت میں سختی کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو ضبط الفاظ میں تہاون سے بڑے زور سے روکتے تھے [3]

اگرچہ امام غزالی نے المستصفی میں، امام رازی نے محصول میں، علامہ قرافی نے شرح تنقیح الفصول میں، حافظ سیوطی نے تدریب الراوی میں اور علامہ الجزائری نے توجیہ النظر میں یہ بتایا ہے کہ امام ابوحنیفہ نقل روایت میں روایت بالمعنے کے جواز کے قائل ہیں لیکن مشہور محدث ملا علی قاری نے شرح مسند امام میں امام اعظم کے بارے میں حافظ ابوجعفر طحاوی کی ایک روایت کی وجہ سے دعویٰ کیا ہے کہ امام اعظم کسی درجے میں بھی روایت بالمعنے کے جواز کے قائل نہیں ہیں، حافظ ابوجعفر کی وہ روایت جس کو دلیل بنا کر انہوں نے امام اعظم کا یہ موقف بتایا ہے یہ ہے:

حدثنا سلیمان بن شعیب حدثنا ابی قال املأ علینا

---

[1] الکفایہ فی علوم الراویہ ص ۱۹۸۔ [2] تدریب الراوی ص ۳۱۱۔
[3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷۔

ابو یوسف قال قال ابو حنیفۃ لا ینبغی للرجل ان یحدث من الحدیث الا ما یحفظہ من یوم سمعہ الی یوم یحدث بہ۔

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کو اس وقت تک حدیث نہیں بیان کرنی چاہیے جب تک اسے سننے کے دن سے لے کر بیان کرنے کے دن تک یاد نہ ہو۔[1]

اور اس سے ملا علی قاری نے امام اعظم کا یہ مسلک مقرر فرمایا ہے کہ:

حاصلہ انہ لم یجوز الروایۃ بالمعنی ولو کان مرادفاً للمبنی خلافاً للجمھور من المحدثین۔

امام اعظم روایت بالمعنی کو ناجائز کہتے ہیں چاہے وہ مرادف الفاظ ہی میں کیوں نہ ہو یہ جمہور محدثین کے خلاف ہے۔

یہی قرین قیاس ہے کیونکہ وہ جب یہ پابندی لگاتے ہیں کہ جب تک روایت سننے کے دن سے بیان کرنے تک زبانی یاد نہ ہو روایت بیان نہ کرے اور وہ حفظ کے ساتھ یہ قید بھی اضافہ کرتے ہیں کہ راوی روایت کا حافظ ہونے کے ساتھ عارف بھی ہو تو وہ یہ کب گوارا کر سکتے ہیں کہ روایت کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیا جاتے۔ بلکہ امام اعظم نے تو اس میں اتنی شدت اختیار کی ہے کہ اگر حفظ و معرفت کا سرمایہ راوی کے پاس نہ رہا ہو چاہے وہ روایت باللفظ ہی ہو لیکن راوی کو یاد نہ ہو مگر لکھی ہوئی اس کے پاس موجود ہو تو صرف کتاب کے سہارے راوی کو روایت کی اجازت نہیں دیتے چنانچہ امام نووی رقمطراز ہیں:

اذا وجد سماعہ فی کتابہ ولا یذکرہ فعن ابی حنیفۃ وبعض الشافعیۃ لا یجوز روایتہ۔

اگر حدیث راوی کے پاس کتاب میں لکھی ہوئی ہو لیکن اسے زبانی یاد نہ ہو تو امام ابو حنیفہ اس کی روایت کرنے کو جائز نہیں سمجھتے۔[2]

اس سے محدث قاری ہی کی تائید ہوتی ہے۔ خطیب بغدادی نے یحییٰ بن معین کا جو

---

[1] شرح مسند امام ص ۳۔ [2] تقریب ص ۳۱۰۔

بیان لکھا ہے اس سے امام اعظم کے اس موقف پر جس کی نشاندہی ملا علی قاری نے کی ہے۔ مزید روشنی پڑتی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ :

یحییٰ بن معین سے دریافت کیا گیا کہ اگر کسی شخص کے پاس اپنی لکھی ہوئی حدیث ہو لیکن وہ اسے زبانی یاد نہ ہو تو کیا کرے ؟ فرمایا کہ ابو حنیفہ تو یوں فرماتے ہیں کہ جس حدیث کا آدمی حافظ اور عارف نہ ہو اسے بیان نہ کرے [1]

ظاہر ہے کہ حفظ کا الفاظ سے اور معرفت کا معانی سے ہی تعلق ہے یعنی راوی کو الفاظ بھی محفوظ ہوتے چاہئیں اور الفاظ کے ساتھ معانی بھی اس کے جانے پہچانے ہوں۔ اس قید اور پابندی کے پیش نظر روایت بالمعنے کی امام اعظم کے یہاں کب گنجائش ہو سکتی ہے۔ صاحب کشف الاسرار نے اسی کو عزیمت قرار دیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

العزیمة ان یحفظ المسموع من وقت السماع والفهم الی وقت الاداء وهذا مذهب ابی حنیفة فی الاخبار والشهادة

عزیمت یہی ہے کہ سنی ہوئی بات کو سننے اور سمجھنے کے وقت سے نقل روایت کے وقت تک یاد رکھے یہی اخبار و شہادت میں ابو حنیفہ کا مذہب ہے [2]

اور عزیمت کے مقابلے میں رخصت بنا کر جس چیز کا ذکر کیا ہے وہ محدثین کی رخصت نہیں بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو کوئی حدیث معلوم ہو اور اس سے کوئی شخص علمی استفادہ کرنا چاہتا ہے تو یہ اپنے جواب میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو اپنے الفاظ میں پیش کر سکتا ہے بشرطیکہ اسے ارشاد نہ صرف یاد ہو بلکہ اسے پورے طور پر سمجھے ہوتے بھی ہو لیکن اس میں بنیادی شرط یہ ہے کہ :

اول : ارشاد کا تعلق محکمات سے ہو۔

دوم : بیان کرنے والا وجوہ لغت سے آشنا ہو، اس کا منشا یہ ہے کہ۔

اگر ارشاد عام ہو تو پھر اس میں روایت بالمعنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایسے ہی اگر ارشاد

---

[1] الکفایہ ص ۲۳۱ - [2] کشف الاسرار ج ۲ ص ۴۴۳ -

مشکل، مشترک اور مجمل کا حامل ہو تو پھر روایت بالمعنے کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی رقمطراز ہیں :۔

والرخصة ان ينقله بمعناه فان كان محكما لا يحتمل غيره يجوز نقله بالمعنى لمن له بصيرة فى وجوه اللغة وان كان ظاهرا يحتمل غيره فلا يجوز نقله بالمعنى الا للفقيه المجتهد وما كان من جوامع الكلم او المشكل او المشترك او المجمل لا يجوز نقله بالمعنى للكل ۔

رخصت یہ ہے کہ حدیث میں روایت بالمعنے کی اجازت ہے بشرطیکہ وہ محکم ہو اور روایت کرنے والا لغت وزبان کی گہرائیوں سے واقف ہو اور اگر حدیث عام ہو تو پھر بالمعنے روایت غیر مجتہد کے لیے ناجائز ہے۔ ایسے ہی وہ حدیثیں جن میں جوامع الکلم، مشکل، مشترک اور مجمل آئے ہوں ان سب میں روایت بالمعنے ناجائز ہے [1]

فقیہ مجتہد کی قید بھی یہ بتانے کے لیے لگائی ہے کہ وہ فتاویٰ میں روایت کے معانی کو اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہے۔ اس موقعہ پر حافظ ابن حزم بڑی عمدہ بات لکھ گئے ہیں ۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا حکم تو یہی ہے کہ اس کی روایت باللفظ ہونی چاہیے۔ کسی حالت میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہ ہو صرف ایک صورت میں روایت بالمعنے کر سکتا ہے اور وہ یہ کہ راوی حدیث کا حافظ ہو اور ساتھ ہی ضمنی طور پر اس کے معانی سے بھی پورا واقف ہو۔ اس حالت میں اگر اس سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جائے تو یہ مفتی کی حیثیت میں حدیث کے معنے اور مدلول کو جواب میں اپنے الفاظ میں پیش کر سکتا ہے یا کسی سے مباحثہ کر رہا ہو موقعہ استدلال میں اپنے لفظوں میں حدیث کے معنے پیش کر سکتا ہے۔ یہی قرآنی آیات کا حکم ہے۔ اس حد تک اس میں کوئی اختلاف

---

[1] المنار ج ۲ ص ۴۲۔

نہیں ہے لیکن اگر راوی ہونے کی حیثیت میں حدیث بیان کرے اور
ارشاد کی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرے تو اس کے
لیے ناگزیر ہے کہ الفاظ نبوت ویسے ہی پیش کرے جیسے سُنے ہیں اس
میں حرف کی بھی تبدیلی جائز نہیں ہے چاہے الفاظ میں معنوی ترادف
بھی ہو۔[1]

میں سمجھتا ہوں کہ ملا علی قاری نے امام اعظم کے مذہب کی اس موضوع پر جو نقاب کشائی کی ہے۔ اس کا مفاد بھی قریب قریب یہی ہے اور فقہاء اصولیین نے روایت بالمعنے پر جو رخصت دی ہے ان کا منشا بھی اسی قسم کی رخصت کی نشاندہی ہے۔ بہر حال امام اعظم، امام مالک اور خطیب بغدادی کے الفاظ میں سلف کی اکثریت کا مذہب یہی ہے۔ لیکن بعد کو محدثین اس کی پابندی نہ کر سکے اور انہوں نے پہلے کتابت کے سہارے حفظ کی گرفت کو ڈھیلا کیا۔ بعد ازیں راوی سے معرفت کی قید کو یہ کہہ کر ہٹایا کہ عارف ہو یا نہ ہو حدیث روایت کر سکتا ہے اور معلوم ہے کہ الفاظ کی نگرانی اگر حفظ کے ذریعے ہوتی ہے تو معانی کی حفاظت کا واحد ذریعہ معرفت ہے لیکن محدثین کو اس میں شدت معلوم ہوئی تا آنکہ حافظ سیوطی نے برملا اس کی سنگینی کی یہ کہہ کر شکایت کی۔

هذا مذهب شديد قد استقر العمل على خلافه

یہ مذہب بہت سخت ہے محدثین کا عمل اس کے خلاف ہے۔

اور اس شکایت کے بعد انہوں نے واشگاف لفظوں میں اقرار کیا کہ

لعل الرواة في الصحيحين ممن يوصف بالحفظ لا يبلغون النصف۔

شاید صحیحین کے نصف راوی بھی حفظ کی قید پر پورے نہ اتریں۔

اس کے بعد محدثین کی بارگاہ میں روایت بالمعنے کی بھی اجازت دے دی گئی ہے اس سلسلے میں محدثین کی تصریحات یہ ہیں:

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

---

[1] احکام الاحکام ج ۲ ص ۲۰۵۔

اگر راوی عالم ہو الفاظ اور اس کے مدلولات سے واقف ہو۔ جمہور علماء نے روایت بالمعنے کو جائز قرار دیا ہے اور اسی پر عمل ہے [1]
حافظ ابوبکر الخطیب بغدادی لکھتے ہیں۔

جمہور فقہاء کہتے ہیں عالم بمواقع الخطاب کے لیے روایت بالمعنے جائز ہے اور علماء کا اس میں اتفاق ہے کہ جاہل بمواقع الخطاب کے لیے یہ ناجائز ہے [2]

حافظ ابن الصلاح رقمطراز ہیں :

صحیح یہی ہے کہ سب صورتوں میں روایت بالمعنے جائز ہے بشرطیکہ راوی عالم ہو [3]

امام نووی فرماتے ہیں :

جمہور سلف اور خلف مختلف گروہوں میں سے کہتے ہیں کہ سب میں روایت بالمعنے جائز ہے جبکہ قطعی طور پر معنے کی ادائیگی کر سکتا ہو [4]

علامہ الجزائری نے اس موقعہ پر جو بیان قلم بند کیا ہے اس سے پوری صورت حال واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے وہ فرماتے ہیں :

علماء کا ایک گروہ تو یہ کہتا ہے کہ روایت بالمعنے مطلقاً ناجائز ہے یہی اکثر محدثین، فقہاء اور اصولیین اور ظاہریہ کا مذہب ہے عبداللہ بن عمر اور تابعین کی ایک جماعت سے بھی یہی منقول ہے استاد ابواسحاق اسفرائنی اور ابوبکر رازی کا بھی یہی کہنا ہے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ امام مالک کا بھی صحیح مذہب یہی ہے اور امام مالک کا یہ ارشاد کہ لا اکتب الا عن رجل یعرف ما یخرج من راسہ (میں صرف اس شخص کی روایت قلم بند کرتا ہوں جو اپنے منہ سے نکلی ہوئی بات کو جانتا ہے) اسی کا مؤید ہے کیونکہ یہ بات آپ نے اس سوال کے جواب میں فرمائی تھی کہ آپ

---

[1] اختصار علوم الحدیث ص ۱۴۱ [2] الکفایہ ص ۱۹۸ - [3] مقدمہ ص ۸۵ - [4] تقریب ص ۳۱۲ -

نے زمانہ پانے کے باوجود بہت سے لوگوں سے روایت کیوں نہیں لی؟ نیز امام مالک نے ایسے بہت سے لوگوں سے بھی روایت نہیں لی ہے جو فضل و تقویٰ میں مشہور تھے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ یہ اکابر اپنی حدیثوں کے عارف نہ تھے ــــ امام بیہقی اور خطیب بغدادی نے نقل کیا ہے کہ امام مالک حدیث میں روایت بالمعنے کے جواز کے قائل نہ تھے اور باقی میں اسے درست سمجھتے تھے۔ بعض بزرگوں نے روایت بالمعنے میں اتنا تشدد اختیار کیا ہے کہ وہ حرف کی تبدیلی کو بھی گوارا نہیں کرتے چاہے وہ مرادف ہی کیوں نہ ہو اور کلمات کی تقدیم و تاخیر کو بھی پسند نہیں کرتے بلکہ بعض تو مشدّد کو مخفف اور مخفف کو مشدّد کرنے سے بھی روکتے ہیں۔ اور ان کا موقف یہ ہے کہ اگر روایت میں کسی درجے میں بھی تبدیلی ہوگی تو اس سے راوی اس وعید کا مصداق ہو جائے گا۔ جو اس سلسلے میں آتی ہے اور اس لیے بھی روایت بالمعنے درست نہیں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی جوامع الکلم کی صفت سے موصوف ہے اور آپ کے سوا دوسرا کوئی خواہ فصاحت و بلاغت کے کتنے ہی اونچے مقام پر ہو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی گرد پا بھی نہیں پاسکتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ بسا اوقات روایت بالمعنے کرنے والا اپنی جگہ مطمئن ہوتا ہے کہ اس نے معنی کا حق ادا کر دیا لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہوتا اس کا احادیث میں مشاہدہ ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر امام شعبہ کا حدیث میں جو مقام ہے وہ سب ہی جانتے ہیں لیکن شعبہ ہی نے جب اسماعیل بن علیہ سے یہ حدیث سنی کہ نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یتزعفر الرجل اور اسے اپنے لفظوں میں اس طرح پیش کیا کہ نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن التزعفر، تو معاملہ کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔ شعبہ کی روایت بالمعنے نے ایک

عمومی ضابطہ کی صورت اختیار کرلی جب کہ اسماعیل کی روایت ایسے
مردوں سے مخصوص بنا رہی تھی۔ معاملہ میں کتنی بڑی نزاکت ہے
اور نزاکت بھی ایسی کہ شعبہ جیسا امام فن محسوس نہ کرسکا۔ لیکن
اسماعیل نے تاڑ لی اور شعبہ کو بتا دیا۔[1]

اور پوری وضاحت اور قوت سے یہ بات لکھنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ :

کان ینبغی ان یکون هذا المذهب هو الواقع ولکن لم
یتفق ذالك

اچھا تو یہی تھا کہ یہی مسلک اختیار کیا جاتا مگر ایسا نہیں ہوا ہے۔

ایسا نہیں ہوا تو پھر کیا ہوا؟ یہ بھی ان کی زبانی سن لیجئے۔ فرماتے ہیں :

ذهب جمهور العلماء الی جواز الرواية بالمعنی لمن
یحسن ذالك بشرط ان یکون جازما بانه ادی معنے
اللفظ۔

جمہور علماء نے روایت بالمعنے کے جواز کو اپنا لیا ہے بشرطیکہ راوی کو
مطلب کی ادائیگی پر یقین ہو اور اسے اس کا ڈھنگ آتا ہو[2]

بے محل نہ ہوگا اگر اس موقعہ پر ۵۴۲ھ کے ایک محقق کی رائے پر بھی نظر ڈال لی جائے
حدیث میں روایت بالمعنے کے جواز نے جو عام شکل اختیار کرلی تھی اس پر بحث کرتے
ہوئے یہ قابل مصنف رقمطراز ہے :

روایت بالمعنے میں یہ اختلاف صرف زمانہ صحابہ تک ہے۔ صحابہ
کے علاوہ کسی کے لیے بھی روایت بالمعنے کی گنجائش نہیں ہے
چاہے راوی معنے کو اپنے الفاظ میں کیسے ہی بھرپور انداز میں پیش
کرے۔ اگر ہم صحابہ کے بعد اوروں کے لیے بھی اس کی گنجائش
پیدا کرلیں تو ہم حدیث کی روایت پر اعتماد نہیں کرسکیں گے
کیونکہ ہر ایک ہمارے زمانے تک منقول میں تبدیلی کرتا ہے

---

[1] [2] توجیہ النظر ص ۳۰۵۔

اور اپنی رائے سے حرف کی جگہ حرف لے آتا ہے اس طرح خبر خبر نہیں
رہتی۔ صحابہ کا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے ان میں دو اہم خصوصیتیں
ہیں۔ ایک فصاحت و بلاغت، کیونکہ ان کی جبلت عربی ہے اور
ان کی زبان میں صحیح سلیقہ ہے۔ دوسرے یہ کہ صحابہ نے حضور انور
صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کو آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مشاہدہ
معنے کے سمجھنے میں معین و مددگار ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ مخبر اور
معاین میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ صحابہ احادیث میں جو یہ
تعبیر اختیار کرتے ہیں کہ امر رسول اللہ اور نہی رسول اللہ
ھکذا۔ تو حضور کے الفاظ ذکر نہیں کرتے بات حضور کی ہوتی ہے
اور الفاظ کا جامہ صحابہ کا ہوتا ہے۔ یہ خبر بالکل صحیح ہوتی ہے۔
اس میں کسی انصاف پسند کے لیے شبہ کی کوئی گنجائش نہیں
ہے[1]

اس حد تک دوسری صدی کے محققین میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے اور یہ بات صحابہ کی حد
تک ایک عقلی ضابطہ کی بات ہے واقعی یہ بہترین مسئلہ کا حل ہے اور اس میں کبھی بھی دو رائیں
نہیں ہوئی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہوا کیا؟ کیا فی الواقع روایت بالمعنے حدیث میں صحابہ تک
محدود رہی ہے؟ افسوس ہے کہ اس کا جواب محدثین کے یہاں نفی میں ہے۔ عربی تو عربی
عجمی اور مولدین راویوں نے احادیث کو بالمعنے روایت کیا ہے حتیٰ کہ عربی ادب اور علماء بلاغت
کے یہاں حدیث کی زبان بھی اس وجہ سے حجت و استدلال کی زبان نہ رہی۔ حافظ جلال الدین
السیوطی نے اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام تو زبان کی حد تک اس کے صرف
اس حصے سے استدلال کیا جا سکتا ہے جس کے بارے میں یہ ثابت
ہو جائے کہ روایت باللفظ ہوئی ہے اور یہ حدیث میں بے حد
کم اور نادر ہے " وذالك نادر جدا " صرف چند گنتی کی چھوٹی

---

[1] احکام القرآن ابوبکر بن العربی ج ۱ ص ۱۰۔

چھوٹی حدیثوں کو چھوڑ کر اکثر حدیثوں کی روایت بالمعنے ہے اور یہ
روایت بالمعنے بھی عجمیوں اور مولدین کے ہاتھوں تدوین حدیث
سے پہلے ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے اسے اپنے انداز میں اپنی عبارت
میں روایت کیا ہے انہوں نے کمی بیشی بھی کی ہے اور تقدیم و
تاخیر بھی اور الفاظ کی تبدیلی بھی۔[1]

اور اس آخری دور میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے بھی تشریح کی ہے کہ

جمہور الرواۃ کانوا یعتنون بروس المعانی لا بحواشیہا

عام راوی صرف روایت بالمعنے کرتے ہیں اور بس۔[2]

بلکہ علامہ جزائری نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

روایت بالمعنے پر مشتمل حدیث سے صرف اصل مسئلہ پر استدلال کیا
جا سکتا ہے کسی کلمہ کی حدیث میں تقدیم و تاخیر یا حروف عطف وغیرہ
سے کوئی استدلال نہیں ہو سکتا ایسے ہی الفاظ اور ان کی ترکیب سے
بھی کوئی استدلال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ روایت بالمعنے کرنے والے
راویوں کی اکثریت نقل روایت میں اس کا نہ کوئی اہتمام کرتی ہے
اور نہ لحاظ۔ بلکہ احادیث کے کچھ راوی تو ایسے ہیں جن کو عربی
زبان سے بھی پوری واقفیت نہیں چہ جائیکہ زبان اور ادب کے
اسرار و لطائف سے۔[3]

ہمیں چاہیے کہ معاملے کے اس پہلو پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

یقیناً اگر روایت بالمعنے کا دائرہ کار صرف صحابہ تک ہی رہتا تو معاملہ میں اتنی سنگینی نہ آتی جس قدر السیوطی، الجزائری اور حکیم الامت نے محسوس کی ہے کہ روایت بالمعنے کی وجہ سے حدیث کی زبان حجت نہ رہی اور حدیث میں انداز کلام اور پیرایہ بیان سے استدلال نہیں ہو سکتا کیونکہ صحابہ بہر حال عرب تھے ان کو لسانی لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ متکلم کے مذاق سخن سے بھرپور واقفیت تھی۔ ان کے دلوں پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] توجیہ النظر ص ۳۱۳۔ [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۴۔ [3] توجیہ النظر ص ۳۱۳۔

شخصیت کا بڑا گہرا اثر تھا۔ ان کے لیے آپ کی بات اور آپ کے واقعات و حالات کی حیثیت عام انسانی وقائع جیسی نہ تھی۔ وہ آپ کی ایک ایک تقریر ایک ایک گفتگو اور آپ کی زندگی کے ایک ایک عمل سے وہ علم حاصل کر رہے تھے جو ان کو اس سے پہلے کبھی حاصل نہیں ہوا تھا وہ خود جانتے تھے کہ ہم اس سے پہلے جاہل تھے اور یہ پاکیزہ ترین شخصیت ہمیں علم کی دولت سے مالا مال کر رہی ہے اس لیے وہ آپ کی ہر بات کو پوری توجہ سے سنتے اور آپ کے ہر کام کو دیکھتے تھے کیونکہ ان کو اپنی زندگی میں اسی کی کاپی کرنی تھی ظاہر ہے کہ اس احساس کے ساتھ آدمی جو کچھ سنتا اور دیکھتا ہے اسے سمجھنے اور یاد رکھنے میں وہ سہل انگاری سے کام نہیں لے سکتا۔
وہ قرآن کی رُو سے یہ بھی جانتے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بار بار متنبہ کرنے سے بھی ان کو اس کا شدید احساس تھا کہ نبوت کے ذمہ جھوٹ تراشنا ایک سنگین گناہ ہے۔ وہ اپنے اندر اس بات کی بہت بڑی ذمہ داری محسوس کرتے تھے کہ بعد کے آنے والوں تک حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور آپ کی ہدایت و تعلیمات کو پہنچانا قرآن کا عائد کردہ فریضہ ہے

لتکونوا شہداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شہیداً

اسی وجہ سے صحابہ کے حالات میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں کہ حدیث بیان کرتے ہوتے وہ کانپ جاتے تھے ان کے چہرے کا رنگ فق ہو جاتا تھا۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے ابو عمر و الشیبانی کی زبانی حضرت عبداللہ بن مسعود کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ:

> میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس بیٹھتا سال سال بھر کبھی زبان پر قال رسول اللہ نہ آتا۔ اگر کبھی آتا تو کپکپی طاری ہو جاتی اور فرماتے کہ حضور نے یوں فرمایا یا اس جیسا یا اس کے قریب فرمایا۔[1]

پھر اکابر صحابہ خاص طور پر عام صحابہ کی احادیث روایت کرنے میں نگرانی کرتے ان کو روایت میں احتیاط کی تلقین کرتے تھے۔ امام ذہبی نے حضرت ابوبکر کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ احادیث میں احتیاط اور تحری کی تلقین کرتے تھے۔ حضرت فاروق اعظم کے متعلق بھی یہ انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے محدثین کے لیے نقل روایت میں احتیاط کی شاہراہ قائم کی ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ کے بارے میں خاص طور پر لکھا ہے کہ:

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۔

فقد زجر الامام علی عن روایۃ المنکر و حث علی التحدیث بالمشہور۔

حضرت علی نے منکر روایت سے منع کیا ہے اور مشہور روایات کو بیان کرنے کی ترغیب دی ہے [1]

اور ساتھ ہی یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ زمانہ صحابہ میں حضور انور کی احادیث کا بہت بڑا حصہ وہ تھا جس کی حیثیت محض زبانی روایات کی نہیں تھی بلکہ صحابہ کے معاشرے میں ان کی شخصی زندگیوں میں، ان کے گھروں میں، ان کی معیشت اور حکومت و عدالت میں اس کی پوری حکمرانی تھی اور عملاً نافذ تھی۔ اس کے آثار و نقوش ہر طرف لوگوں کو چلتے پھرتے نظر آتے تھے پورا معاشرہ اس کو استعمال کرتا تھا۔ فقہاء کی زبان میں اسی کا نام السنۃ ہے اور حدیث اسی کی تاریخ ہے اور یہ السنۃ ہی زمانہ تابعین میں حدیث کی صحت کا ایک معیاری پیمانہ تھی۔

حافظ ذہبی نے دور تابعین کے بارے میں طبقہ خامسہ کے آخر میں جو نوٹ لکھا ہے اس کو پڑھ کر آپ دورِ صحابہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مسلمان عزت و برتری میں اور علم کی گہرائی میں بہت اونچے مقام پر تھے جہاد کے پھریرے لہرا رہے تھے، سنتیں شاہراہِ عام پر تھیں اور بدعتیں سرنگوں۔ اعلان حق کرنے والوں کی کثرت تھی۔ عبادت گزاروں کا ہجوم تھا۔ پوری انسانیت زندگی میں سکھ اور چین کا سانس لے رہی تھی۔ اسلامی فوجیں اقصائے مغرب میں جبرالٹر، حبشہ اور ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھیں [2]

یہ دور تابعین کی نقاشی ہے صحابہ تو پھر صحابہ ہیں۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

بہرحال صحابہ کی ذات گرامی کا موضوع بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اگر روایت بالمعنے کا دائرہ کار صحابہ کرام تک ہی محدود رہتا تو شاید معاملہ میں اتنی سنگینی ہرگز نہ آتی اسی بنا پر امام اعظم کے نزدیک روایت باللفظ کا اعتباری مقام صحابہ کے بعد ہے۔ چنانچہ ان

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۵۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۲۴۔

کے یہ الفاظ صراحۃً اس کی دلیل ہیں کہ :

لا ینبغی للرجل ان یحدث من الحدیث الا بما حفظہ من یوم سمعہ الی یوم یحدث بہ [1]

سوال تو صحابہ سے لینے کے بعد روایت کرنے والوں کا ہے کیا ان کے لیے بھی روایت بالمعنے کی گنجائش ہے جبکہ ان میں عجمی اور مولدین بھی ہیں۔ اس بارے میں امام اعظم کا موقف وہی ہے جو ملا علی قاری نے پیش کیا ہے۔ اگرچہ محدثین کے دربار سے اس پر تشدید کا آوازہ کسا گیا ہے لیکن فی الحقیقت تاریخ ستر کی یہ بڑی ہی دردانگیز بے انصافی ہے جو حدیث کے اس عظیم الشان امام کے ساتھ جائز رکھی گئی ہے۔ جس طرح بے درد نکتہ چینوں نے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی اسی طرح معتقدوں نے بھی اس کے فہم و بصیرت سے حدیث میں بے رخی اختیار کر لی۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ فخر الاسلام بزدوی نے ضبط کی تشریح کرتے ہوئے جو یہ لکھ دیا ہے کہ :

ضبط کا مفہوم یہ ہے کہ کلام کو ایسے طریق سے سنا جائے جیسے سننے کا حق ہے پھر اس کی مراد کو سمجھا جائے پوری کوشش سے اسے یاد کیا جائے پھر اس کی حفاظت کرکے اس کی پابندی کی جائے اور اسے ادا کرنے وقت اس کے مذاکرہ کا اہتمام کرتے رہنا چاہیے مبادا وہ ذہن سے اتر نہ جائے [2]

تو اس سے ان کا مقصود بھی یہی سمجھانا ہے کہ ضبط میں الفاظ کا یاد رکھنا، ان کی حفاظت کرنا بنیادی شرط ہے۔ اس لیے یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک روایت بالمعنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ اور فخر الاسلام ہی سے روایت بالمعنے پر شدید پابندی جو حافظ ابن الہمام نے نقل کی ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

والعزیمۃ فی الاداء باللفظ والرخصۃ معناہ بلا نقص وزیادۃ للعالم باللغۃ ومواقع الالفاظ وقال فخر الاسلام

---

[1] شرح مسند امام ص ۳۔ [2] اصول فخر الاسلام ج ۲ ص ۱۶۷۔

الا فی نحو المشترك والمجمل والمتشابہ بخلاف العام والحقیقۃ المحتملتین للخصوص والمجاز اما المحکم منھما فتکفی اللغۃ۔

عزیمت تو روایت میں باللفظ ہی ادائیگی ہے اور رخصت روایت بالمعنے ہے بشرطیکہ راوی زبان داں اور مواقع الفاظ سے واقف ہو اور کمی زیادتی نہ کرے اور فخر الاسلام نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ روایت کا تعلق مجمل، مشترک اور تشابہ سے نہ ہو ہاں اگر عموم وخصوص ہو تو اس سے مستثنیٰ ہے اور محکم اگر ہو تو صرف زبان داں ہونا کافی ہے [1]

دوسرے اصولیین بھی فخر الاسلام کے ہمنوا ہیں۔ سعد الدین تفتازانی اور اصول بزدوی کے شارح علامہ عبد العزیز بخاری نے بھی اسی قسم کی تصریح کی ہے۔

مراتب حدیث اور امام اعظم رح

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ قوت کے لحاظ سے ہر حدیث کا درجہ ایک نہیں ہے بلکہ ان میں فرق مراتب ہے۔ فقہاء اور محدثین دونوں کے نزدیک حدیث کی تین قسمیں ہیں۔ متواتر، مشہور اور اخبار آحاد۔ علامہ فخر الاسلام بزدوی نے متواتر کی یہ تعریف کی ہے۔

متواتر ان حدیثوں کو کہتے ہیں جن کے روایت کرنے والے لاتعداد ہوں اور ان کی عددی اکثریت، ان کی عدالت اور بعد مقامات کی وجہ سے اس احتمال کی گنجائش نہ ہو کہ یہ سب جھوٹ پر متفق ہو گئے اور اجماع ہر زمانہ میں موجود رہے اور اس کا آخر اور اوسط شہرت کے لحاظ سے یکساں ہو جیسے قرآن، پانچ نمازیں، تعداد رکعت، مقادیر، زکوٰۃ وغیرہ [2]

اتنے زیادہ لوگوں کی کسی محسوس کے بارے میں خبر جن کا جھوٹ پر متفق

---

[1] کتاب التحریر ج ۳ ص ۹۷۔ [2] اصول فخر الاسلام ج ۲ ص ۲۸۱۔

ہونا عادۃً محال ہو[1]

حافظ ابن حجر عسقلانی نے خبر کے متواتر ہونے کی چار شرطیں بتائی ہیں۔ اول بیان کرنے والوں کی تعداد کثیر ہو۔ دوم ان کا جھوٹ پر متفق ہونا عادۃً محال ہو۔ سوم جس کثرت سے بیان کرنے والے ہوں اسی جیسی کثرت از ابتداء تا انتہا رہے۔ چہارم روایت کا انجام کسی محسوس و مشاہد معاملہ پر ہو اور ان شرطوں کے ساتھ سننے والوں کو اس خبر سے علم یقینی حاصل ہو رہا ہو تو ایسی خبر متواتر ہے[2]

حافظ جلال الدین السیوطی نے متواتر کی دو قسمیں بتائی ہیں لفظی اور معنوی۔ تواتر لفظی کی حد تک حافظ ابن حبان بستی اور امام حازمی کا دعویٰ یہ ہے کہ موجودہ ذخیرہ حدیث میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ حافظ ابن الصلاح اور امام نووی بھی ان کے ہمنوا ہیں بلکہ حافظ ابن حبان بستی نے تو حدیث عزیز کا بھی انکار کر دیا ہے۔ حدیث عزیز یہ ہے کہ اس کے بیان کرنے والے سلسلہ سند میں کہیں بھی دو سے کم نہ ہوں ایسے نادر الوجود ہونے کی وجہ سے عزیز کہتے ہیں لیکن حافظ ابن حجر نے نزہۃ النظر میں اس کی تغلیط کی ہے اور ایسے ہی قاضی ابوبکر بن العربی کا یہ دعویٰ بھی بے دلیل ہے کہ حدیث کا عزیز ہونا بخاری کی شرائط میں داخل ہے۔ ابن رشید نے صحیح کہا ہے کہ:

لقد کان یکفی القاضی فی بطلان ما ادعی انہ شرط البخاری اول حدیث مذکور فیہ۔

قاضی کے دعوے کی تغلیط کے لیے بخاری کی پہلی ہی روایت کافی ہے[3]

بعض علماء نے تواتر معنوی کی بھی تین قسمیں بتائی ہیں۔ تواتر اسناد، تواتر عمل اور تواتر قدر مشترک۔

تواتر اسناد

یہ کہ حدیث کو شروع سند سے لے کر آخر تک اتنی جماعت روایت کرنے والی ہو جس کا

---

[1] توجیہ النظر ص ۳۲۔ [2] نزہۃ النظر ص ۸۔ [3] نزہۃ النظر ص ۱۰۔

جھوٹ پر اکٹھا محال ہو۔ اس لحاظ سے محدثین نے حدیث من کذب علی متعمدا کو متواتر قرار دیا ہے حافظ ابن الصلاح نے اس کے راویوں کی تعداد ۶۲ اور حافظ عراقی نے ۷۰ سے زائد لکھی ہے حافظ سیوطی نے اسنادی تواتر پر مشتمل حدیثوں کو ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ کتاب کا نام "الفوائد المتکاثرہ فی الاخبار المتواترہ" ہے۔ اس کتاب کی تلخیص بھی ان کے ہی قلم سے "الازہار المتناثرہ" کے نام سے نکلی ہے۔ محمد بن جعفر الکتانی نے اس کا ذیل "نظم المتناثر من الحدیث المتواتر" کے نام سے لکھا ہے۔ امیر یمانی فرماتے ہیں کہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کی حدیثیں اسی تواتر کی مثال ہیں۔ کیونکہ ان کو روایت کرنے والے پچاس صحابہ ہیں ان میں عشرہ مبشرہ بھی داخل ہیں۔ حافظ زین الدین عراقی فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے راویوں کو اکٹھا کیا تو ان کی گنتی پچاس ہوئی۔ حافظ ابن مندہ اور امام حاکم نے دعویٰ کیا ہے کہ عشرہ مبشرہ اس کی روایت پر جمع ہیں۔ امام بیہقی امام حاکم کے حوالے سے فرماتے ہیں۔

لا نعلم سنۃ اتفق علی روایتھا عن رسول اللّٰہ
صلی اللّٰہ علیہ وسلم الخلفاء الاربعۃ ثم العشرۃ
الذین شھد لھم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم
بالجنۃ فمن بعدھم من اکابر الصحابۃ علی تفرقھم
فی البلاد الشاسعۃ غیر ھذہ السنۃ۔

ہمارے علم میں ایسی کوئی سنت نہیں ہے جس کی روایت پر حضور
انور صلی اللّٰہ علیہ وسلم سے خلفاء راشدین، عشرہ مبشرہ اور پھر
اکابر صحابہ متفق ہوئے ہوں سوائے اس سنت کے[1]

یاد رہے کہ یہ تواتر تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کو حاصل ہے امیر یمانی کی آپ تصریح پڑھ چکے ہیں۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے بھی یہ بات صراحۃً لکھی ہے کہ

فمن امثلۃ ذالک حدیث رفع الیدین عند تکبیرۃ الاحرام
بالصلاۃ[2]

یہی وجہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین پر امت میں کبھی بھی دو رائیں نہیں ہوئی

---

[1] توضیح الافکار ج ۲ ص ۴۱۱۔ [2] تنقیح الانظار ج ۲ ص ۴۱۲۔

ہیں، علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں حافظ ابن حزم، حافظ ابن المنذر اور علامہ السبکی کے حوالے سے اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں حافظ ابن عبد البر کے حوالے سے تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کو یہ کہہ کر پوری اُمت کا فیصلہ قرار دیا ہے کہ:

اجمع العلماء علی جواز رفع الیدین عند افتتاح الصلوٰۃ

تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین پر پوری اُمت کا اجماع ہے۔ [1]

یہ اسنادی تواتر ہے اور یہی محدثین کے یہاں زیر بحث آتا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ اور علامہ شوکانی نے ختم نبوت سے متعلق حدیثوں کے بارے میں اسی تواتر کا دعویٰ کیا ہے۔ علامہ الجزائری نے یہاں ایک فیصلہ کن نوٹ لکھا ہے اس جگہ اس کا ذکر یقیناً فائدے سے خالی نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

جب علماء کے یہاں متواتر کا بلا قید ذکر آتا ہے تو ہر شخص کا ذہن متواتر کی قسم اول کی طرف ہی جاتا ہے۔ یعنی متواتر لفظی، علماء کا کچھ حدیثوں کے بارے میں اختلاف ہے، کچھ متواتر بتاتے ہیں اور کچھ انکار کرتے ہیں اس میں محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ نزاع محض لفظی ہے دونوں صحیح کہتے ہیں جو کہتے ہیں کہ متواتر ہے ان کی مراد تواتر معنوی ہے اور جو انکار کرتے ہیں ان کا منشا تواتر لفظی ہے علماء اصول کہتے ہیں کہ قرآن تو تواتر ہی سے ثابت ہے لیکن سنت تواتر اور آحاد دونوں سے ثابت ہے لیکن سنت میں متواتر کم ہے بلکہ راجح فیصلہ یہی ہے کہ سنت میں اگر ہے تو صرف تواتر معنوی ہے اور جو بھی سنت میں تواتر کا مدعی ہے اس کی مراد تواتر معنوی ہے۔

تواتر عمل

اسی کو توارث کہتے ہیں۔ زمانہ نبوت سے لے کر آج تک کسی کام کو کرنے والے اس قدر ہوں کہ عادۃً ان کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو۔ اسلامی عبادات اُمت کو اسی تواتر سے ملی ہیں

---

[1] فتح المغیث ص ۱۲۰۔

اور فرائض نہیں بلکہ واجبات وسنن بھی اسی راہ سے آئے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کو اولاً صحابہ کے معاشرے نے اپنایا۔ ان کی شخصی زندگیوں میں، ان کے گھروں میں، ان کی معیشت میں، ان کی تعلیم گاہوں میں، ان کی عدالت اور ان کی حکومت میں، غرض صحابہ کرام کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے ہر گوشہ میں جس اسوۂ حسنہ کا ٹھپہ لگا تھا اور جس کو ان سے والذین اتبعوھم باحسان کی تعمیل میں تابعین نے لیا اور جس کی اتباع تابعین نے کاپی کی ہے اسی کو محدثین تابعین کی زبان میں السنۃ اور اسی کا نام فقہاء اتباع تابعین کے یہاں ما علیہ الجماعۃ ہے۔ نماز پنجگانہ، نمازوں کی رکعتیں، رمضان کے روزے، تراویح کی رکعتیں، مقادیر زکوٰۃ، اعمالِ حج، وضو اور حتیٰ کہ وضو میں مسواک کا استعمال اسی تواترِ عمل سے ثابت ہے اور یہ بات سب ہی مانتے ہیں کہ عمل میں قول سے زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ اس پر اجمالی تبصرہ تلقی الامۃ بالقبول کے ذیل میں گزر چکا ہے۔ اس کی طاقت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اگر سند کے لحاظ سے حدیث ضعیف بھی ہو لیکن اس کی پشت پر عمل کی قوت ہو تو وہ حدیث بھی صحیح قرار پاتی ہے بلکہ حافظ سخاوی نے لکھا ہے کہ:

ینزل منزلۃ المتواتر فی انہ ینسخ المقطوع

اس کے ساتھ متواتر جیسا معاملہ ہوتا ہے یعنی اس سے قطعی منسوخ بھی ہو سکتا ہے[1]

محدثین نے تواترِ عمل کی وجہ سے ایک سے زیادہ ضعیف حدیثوں کو صحیح قرار دیا ہے۔ مثلاً حدیث "لا وصیۃ لوارث" الفاظ مختلفہ میں مروی ہے اور امام ترمذی نے اس کے کچھ طریقوں کی تصحیح اور کچھ کی تحسین بھی فرمائی ہے لیکن حافظ ابن حجر رقمطراز ہیں:

لا یخلو اسناد کل منھا عن مقال

اس کے باوجود انہوں نے لکھا ہے کہ:

جنح الشافعی فی الام الی ھذا لفظ متواتر

اس کے متواتر ہونے کی وجہ خود امام شافعی نے جو بتائی ہے وہ ان کی زبانی سنیے:

وجدنا اھل الفتیا ومن حفظنا عنھم من اھل العلم

---

[1] فتح المغیث ص ۱۲۰۔

بالمغازی من قریش لا یختلفون فی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال عام الفتح "لا وصیۃ لوارث"، ویاثرونہ ممن لقوہ من اہل العلم فکان نقل کافۃ عن کافۃ فھو اقوی من نقل واحد۔

ہم نے اہل فتویٰ کو اور ان اہل علم کو جن سے ہم نے اسلام کا علمی سرمایہ حاصل کیا ہے پایا ہے کہ وہ اس میں متفق ہیں کہ حضور انور نے فتح مکہ والے سال لا وصیۃ لوارث فرمایا ہے اور یہ لوگ اس ارشاد کو اپنے سے قبل اہل علم ہی سے نقل کرتے ہیں اس لیے یہ نقل کافہ عن کافہ ہے یہ خبر واحد سے بھی قوی ہے۔[1]

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تواتر عمل کی کس قدر طاقت ہے۔ اس پر تو تابعین صحیح حدیثوں کو جانچتے تھے اور حدیث کی صحت کا یہ ایک معیار تھا۔

تواتر قدر مشترک

حافظ سیوطی اس کو تواتر معنوی کہتے ہیں۔ ایسی روایات جو متعدد طرق سے آئی ہوں، الفاظ مختلف ہوں، واقعات الگ الگ ہوں لیکن اس میں کوئی قدر مشترک ہو مثلاً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شب بیداری کے سلسلے میں کوئی کہتا ہے کہ آپ نے پانچ رکعت نماز پڑھی، کوئی سات، کوئی نو، کوئی گیارہ، کوئی تیرہ، کوئی پندرہ اور کوئی سترہ بتاتا ہے تعداد کو چھوڑ کر رات کو نماز تہجد اس میں قدر مشترک ہے۔ حافظ سیوطی فرماتے ہیں کہ دعا میں ہاتھ اٹھانے کی حدیثوں میں بھی اسی قسم کا تواتر ہے۔ اس موضوع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سو سے زیادہ حدیثیں آئی ہیں۔

جیسے قرآن تواتر لفظی کے ذریعے امت کو ملا ہے۔ ایسے ہی سنت کا علمی سرمایہ بھی امت کو تواتر عمل، تواتر اسناد اور تواتر قدر مشترک کے ذریعے ملا ہے۔ اور میں کتاب کے آغاز میں بتا آیا ہوں کہ جیسے قرآن کے لیے قراء سبعہ کی روایات ہیں ایسے ہی سنت کے لیے

---

[1] فتح الباری ج ۵ ص ۲۸۸۔

محدثین کی روایات ہیں نہ تو قرآن پر روایات قراء اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ اور نہ سنت پر روایات محدثین اور نہ قرآن کا قرآن ہونا قراء سبعہ کی روایات پر موقوف ہے اور نہ سنت کا سنت ہونا روایات محدثین پر موقوف ہے۔ حدیث تو دراصل تاریخ سنت اور اس کی روایت کا نام ہے۔ حدیث کے اس روایتی سلسلے سے پہلے بھی سنت موجود تھی اور اس کے بعد بھی ہے۔ العلامۃ الشیخ السید انور شاہ کشمیری نے کیسی عجیب بات فرمائی ہے کہ:

کان الاسناد لئلا یدخل فی الدین مالیس منہ لا لیخرج من الدین ما ثبت منہ من عمل اھل الاسناد۔

روایت و اسناد کا سلسلہ اس لیے بروئے کار آیا تھا کہ دین میں وہ چیز نہ آنے پائے جو دین نہیں ہے اس لیے نہیں کہ دین سے ثابت شدہ چیز کو خارج کیا جاتے[1]

قرآن ہو یا سنت دونوں روایتی سلسلے سے الگ ہو کر متواتر ہیں۔ قرآن چونکہ ایک علمی چیز ہے اس لیے اس کا تواتر بھی علمی ہے اور سنت ایک عملی چیز ہے اس لیے وہ عملاً ہی متواتر ہے اسی بنا پر احناف نے حدیث مشہور کی عام شاہراہ سے ہٹ کر یہ تعریف کی ہے کہ:

ما کان احاد الاصل متواتراً فی القرن الثانی والثالث۔

اور حافظ ابوبکر نے اسی بنا پر مشہور کو متواتر کا قسیم نہیں بلکہ اس کی قسم قرار دیا ہے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ امام اعظم سے جو صحیح کی تعریف نقل کی گئی ہے اس میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ امام عبدالوہاب الشعرانی رقمطراز ہیں:۔

قد کان الامام ابو حنیفۃ یشترط فی الحدیث المنقول عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل العمل بہ ان یرویہ عن ذالک الصحابی جمع اتقیاء عن مثلھم ھکذا۔

جو حدیث حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اس کی بابت امام اعظم عمل سے پہلے یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس کو متقی لوگوں

---

[1] التعلیقات علی الاجوبۃ الفاضلہ ص ۲۳۸۔

کی ایک جماعت اس صحابی سے برابر نقل کرتی چلی آئے [1]

یہ قید کہ "اس کو متقی لوگوں کی ایک جماعت صحابی سے برابر نقل کرتی آئے" اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ حدیث اگرچہ صحابی کی ذات تک خبر واحد ہو مگر اس کے بعد اسے نقل کرنے والے بہت سے متقی اور پارسا راوی ہوں یعنی صحابی سے گزرنے کے بعد قرن ثانی اور قرن ثالث میں وہ متواتر ہو اور جس قید کا امام شعرانی نے پتہ دیا ہے وہ خود امام اعظم سے بصراحت منقول ہے چنانچہ حافظ ذہبی نے امام یحییٰ بن معین کی سند سے امام اعظم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ

آخذ بکتاب اللہ فما لم اجد فبسنۃ رسول اللہ والآثار
الصحاح التی فشت عنہ فی ایدی الثقات عن الثقات۔

اس میں یہ فقرہ کہ "آپ کی وہ صحیح حدیثیں جو ثقات کے ہاتھوں میں ثقات ہی کے ذریعے شائع ہوئی ہوں" خاص طور پر قابل غور ہے۔ اس میں آپ نے صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ آپ ان حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں جو ثقات میں مشہور ہوں۔ بلاشبہ امام اعظم کا زمانہ دور تابعین ہے۔ اس میں سنت تو تواتر عمل سے آنکھوں کے سامنے موجود تھی اور احادیث تواتر اسناد کے ذریعے نیکوکار لوگوں کی وساطت سے آئی تھی۔ کشف الاسرار میں ہے:

> احادیث کی شہرت کا اعتبار قرن دوم وسوم میں ہوگا۔ قرون ثلاثہ کے بعد شہرت کا اعتبار نہیں ہے کیونکہ اس زمانے میں اخبار آحاد مشہور ہوگئی تھیں حالانکہ ان کو مشہور نہیں کہتے۔

اخبار آحاد اور امام اعظم

خبر واحد اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راوی ایک دو یا اس سے زیادہ ہوں لیکن اس میں شہرت کے اسباب نہ ہوں۔ امام اعظم اولین شخصیت ہیں جنہوں نے اخبار آحاد کو قابل استدلال قرار دیا ہے۔ چنانچہ خاص اس موضوع پر حافظ ابن حزم نے امام اعظم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

هذا ابو حنیفۃ یقول ما جاء عن اللہ تعالیٰ فعلی الراس

---

[1] المیزان الکبریٰ ج ۱ ص ۶۲۔

والعين وماجاء عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فسمعاً وطاعةً وماجاء
عن الصحابة تخیرنا من اقوالھم ولم نخرج عنھم وماجاء
عن التابعین فھم رجال ونحن رجال۔

یہ ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ جو کچھ اللہ سبحانہ کی جانب سے آئے یعنی قرآن
وہ سر آنکھوں پر اور جو کچھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے
آئے اس کے لیے ہم سراپا شنید وطاعت ہیں اور صحابہ سے جو
کچھ آئے تو ان کے اقوال میں سے ہم انتخاب کریں گے اور کسی
درجہ میں ان کے ارشادات سے علیحدہ نہ ہوں گے اور اگر تابعین
سے آئے تو ہم بھی آدمی ہیں وہ بھی آدمی ہیں[1]

ابوحمزہ السکری نے امام اعظم کا جو ارشاد نقل کیا ہے وہ اس سے بھی واضح ہے۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث
صحیح سند سے آئے ہم اسی کو لیتے ہیں اور اس سے آگے نہیں
جاتے۔[2]

ابوحمزہ کو امام حافظ الدین ابن البزاز کردری نے مناقب میں امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے اور حافظ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں حفاظِ حدیث کے طبقہ خامسہ میں ذکر کیا ہے ان کا نام محمد بن میمون مروزی ہے اس لیے امام اعظم کے بارے میں ان کی رائے بڑی قیمتی ہے الغرض خبر واحد کے حجت ہونے اور قابل عمل ہونے میں امام اعظم اور تیسری صدی کے محدثین کا موقف ایک ہے۔ حافظ ابوبکر الخطیب خبر واحد کے موضوع پر محدثین کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

خبر واحد پر عمل کرنے کے موضوع پر تمام تابعین کا اتفاق ہے
اور تابعین کے بعد آج تک کے فقہاء امصار کا اس پر ایکا ہے
ہمارے علم میں اس کا کوئی بھی منکر نہیں ہے اور نہ اس پر آج
تک کسی نے کوئی اعتراض کیا ہے۔ ان کا یہ اتفاق بتا رہا ہے

---

[1] الاحکام الاحکام ج ۱ ص ۹۵۔ [2] الانتقاء ص ۱۴۴۔

کہ ان سب کے نزدیک اس پر عمل واجب ہے اگر کہیں بھی انکار
کا کوئی کانٹا ہوتا تو تاریخ میں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔[1]

اس اتفاق کے باوجود اخبارِ آحاد کے موضوع پر چند اہم مباحث فکر و نظر کی جولانگاہ ضرور ہیں مثلاً یہ کہ اخبارِ آحاد کے لیے معیارِ صحت کیا ہے؟ اور اخبارِ آحاد موجب للعمل ہونے کے ساتھ مفید یقین بھی ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں منصوص نہیں ہیں اس لیے ان میں فکر و نظر کا اختلاف ناگزیر ہے۔

اخبارِ آحاد کا معیارِ احتجاج

جمہور محدثین کا موقف تو یہ ہے کہ اخبارِ آحاد اس وقت تک قابلِ احتجاج نہیں ہو سکتیں جب تک ان میں خاص خاص شرائط نہ ہوں۔ امام شافعی نے ایک سائل کے جواب میں ان شرائط کا تفصیلی جائزہ پیش فرمایا ہے:

> خبرِ واحد میں حجت ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں یہ شرائط ہوں۔ راوی میں ثقاہت اور صداقت کے ساتھ اتنا علم ہو کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے جانتا ہو اور الفاظ سے ہٹ کر معنے کو دوسرے لفظوں کا لبادہ پہنانے کی صلاحیت رکھتا ہو یا پھر روایت باللفظ کرتا ہو۔ اگر حافظہ کی مدد سے بیان کرتا ہے تو حدیث کا حافظ ہو اور اگر کتاب سے روایت کرتا ہے تو کتاب کا حافظ، ثقات راویوں کا ہمنوا ہو۔ مدلس نہ ہو، اس طرح راویوں کی ساری لڑی اوپر سے نیچے تک ہو تا آنکہ حدیث حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے۔[2]

دوسرے محدثین نے بھی اسی معیار کو اپنایا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں:

> اما الحدیث الصحیح فھو الحدیث المسند الذی یتصل اسنادہ بنقل العدل الضابط عن العدل الضابط الی

---

[1] الکفایہ فی علوم الروایہ ص ۳۱ - [2] الکفایہ ص ۲۴ -

مختلفاً ولا یکون شاذاً ولا معللاً -

صحیح وہ باسند حدیث ہے جس کی سند میں اتصال ہو، جو عادل ضابط عادل ضابط کی وساطت سے تاآخر روایت کرے اور شاذ و معلل نہ ہو۔

اور اس کے بعد لکھا ہے کہ:

فھذا الحدیث الذی یحکم لہ بالصحۃ

یہی وہ حدیث ہے جس کے صحیح ہونے کا ہم فیصلہ کرتے ہیں [1]

حافظ زین الدین عراقی فرماتے ہیں کہ جب محدثین کسی حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے تو اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ سند کے لحاظ سے یہ صحیح ہے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اس حدیث کی قطعیت بتا رہے ہیں چنانچہ علامہ عراقی فرماتے ہیں:

حیث یقول المحدثون ھذا حدیث صحیح فمرادھم فیما ظھر لنا عملاً بظاھر الاسناد لا انہ مقطوع بصحتہ فی نفس الامر [2]

اور حافظ ابن الصلاح نے بھی یہی بات لکھی ہے:

لیس من شرطہ ان یکون مقطوعاً بہ

حافظ ابن ابراہیم الوزیر نے اس کی وجہ یہ بتاتی ہے کہ:

لجواز الخطاء والنسیان علی الثقۃ [3]

مطلب یہ ہے کہ صحت سے ان بزرگوں کی مراد صرف اصطلاحی صحت ہے۔ قرآن جیسی واقعی صحت نہیں ایک روایت پر اس اصطلاحی صحت کی خواہ کتنی مہریں لگ جائیں لیکن بہر حال غیر معصوم انسانوں کی شہادت اور غیر معصوم ناقدوں کا ایک فیصلہ ہے۔ ایسا فیصلہ ہر بات کے لیے حجت کا فائدہ دے سکتا ہے مگر یقینیات اور قطعیات کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی راوی کی شہادت یقینیات قطعیہ سے ٹکرا جائے گی تو یقینیات اپنی جگہ سے نہ ہلیں گی۔ راوی کی شہادت کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی۔

---

[1] مقدمہ علوم الحدیث ص ۲۲۔ [2] توضیح الافکار ج ۱ ص ۲۴۔ [3] تنقیح الانظار ج ۱ ص ۲۵۔

دراصل یہاں دو چیزیں ہیں اور دونوں کا مزاج الگ الگ ہے ایک حدیث کی صحت اور دوسرے حدیث کی مقبولیت ۔ حدیث کی صحت سے بحث کرنا اگر اربابِ روایت کا کام ہے تو حدیث کی قبولیت کو بتانا مجتہدین کا فن ہے ہر گوشہ کی طرح یہاں بھی افراط و تفریط کی دورائیں پیدا ہو گئی ہیں ۔

کچھ وہ ہیں جن کے نزدیک کسی بھی حدیث کا فقہ کی کتابوں میں آجانا ہی حدیث کی صحت کی ضمانت ہے اور ان کتابوں کے مؤلفین کی جلالت علمی سے دب کر حدیث کو صحیح مان لیتے ہیں حالانکہ فقہ کی کتابیں بہر حال مسائل کی کتابیں ہیں ان میں حدیث کی صحت سے کوئی بحث نہیں ہوتی ہے ۔ نہ ان کا یہ فن ہے حدیث کے لیے محدثین ہی کی خوشہ چینی چاہیے۔ فقہ احناف میں معرکہ کی کتاب اگر ہدایہ ہے تو فقہ شافعی میں رافعی کی شرح الوجیز ہے۔ ان دونوں کتابوں کی حدیثوں کو دیکھنا ہو تو حافظ زیلعی کی نصب الرایہ اور حافظ ابن حجر کی التلخیص کو دیکھنا ہوگا یہ دونوں محدث ہیں اور یہ ان کا فن ہے ۔

ملا علی قاری محدث نے اس حدیث کو جو جمعۃ الوداع میں قضائے عمر کے بارے میں آتی ہے موضوعات میں قطعاً باطل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے :

> لاعبرۃ بنقل صاحب النہایۃ وغیرہ من بقیۃ شراح الھدایۃ لیسوا من المحدثین ولا اسندالحدیث الیٰ احد من المخرجین ۔
>
> اس حدیث کو صاحبِ نہایہ اور ہدایہ کے دوسرے شارحوں کے نقل کرنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ وہ نہ خود محدث ہیں اور نہ محدثین کے حوالے سے پیش کرتے ہیں [۱]

اور مولانا عبد الحی لکھنوی نے ملا علی قاری کے اس فیصلہ سے عمدۃ الرعایہ کے مقدمہ میں جو نتیجہ نکالا ہے وہ بھی گوش گزار فرمالیجئے :۔

> ملا علی قاری کے اس فیصلہ سے یہ عجیب بات معلوم ہو گئی کہ فقہ کی کتابیں اپنی جگہ مسائل کے لیے خواہ کتنی معتبر سہی اور ان کے

---

[۱] الاجوبۃ الفاضلہ ص ۳۰ ۔

مؤلفین بھی چاہے کتنے ہی صاحب کمال اور معتمد ہیں لیکن فقہ کی
کتابوں میں آمدہ حدیثوں پر محدّثانہ نقطہ نظر سے بھرپور اعتماد نہیں
کیا جاسکتا۔ کیونکہ کتنی ہی حدیثیں ہیں جو فقہ کی معتبر کتابوں میں
آئی ہیں لیکن فی الواقع وہ موضوع ہیں ـــــ ہاں اگر مصنف کتاب
زمرۂ محدثین سے ہو تو بے شک اس کی بیان کردہ حدیث پر اعتماد
کیا جاسکتا ہے یا اگر مصنف حدیث کو کسی محدث کے حوالہ سے
پیش کرے تو اس پر بھروسہ ہو سکتا ہے۔ راز اس میں یہ ہے کہ
اللہ نے ہر فن کے لیے فن کی شخصیتیں بنائی ہیں۔ اپنی مخلوقات
میں سے ہر طبقہ کو کچھ نوعی خصوصیات سے مالا مال کیا ہے۔ کچھ
محدثین ایسے ہیں جن کو روایت و اسناد ہی سے کام ہوتا ہے فقہ
ان کا میدان نہیں ہے اور کچھ فقہاء ایسے ہیں جن کا مقام بس فقہ میں
ہے حدیث میں ان کو کوئی مہارت نہیں ہوتی[1]

مولانا نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور خود انسان کا وجدان بھی یہی باور کرتا ہے
کہ فن والوں سے ہی فن کی بات معلوم ہو سکتی ہے اگر آپ شاعروں سے مسائل یا فقہاء سے
اشعار کی تحقیق کریں تو یہ بے محل بات ہے ۔ اس موقعہ پر حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر بڑے
پتے کی بات فرما گئے ہیں کہ:

اختلاف طبقات کے باوجود مسلمانوں کے سارے فرقے اس پر
متفق ہیں کہ ہر فن میں اس کے فنکاروں کی بات سے استدلال
کیا جاسکتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو سارے علوم حرف غلط ہو کر رہ جائیں
کیونکہ جو فنکار نہیں وہ یا تو اس میں لب کشائی ہی نہ کرے گا
اور کرے گا تو غیر تسلی بخش ہوگی۔ غور کرو اگر قرآن و سنت کے
غریب الفاظ کی تحقیق تم قاریوں سے کرو یا قرأت کے مسائل
اہل لغت سے پوچھو، معانی، بیان اور نحو کی باتیں تم محدثین سے

---

[1] عمدۃ الرعایہ ص ۳۔

دریافت کرو اور علم الاسناد، علل حدیث کی تحقیق کے لیے تم بارگاہ متکلمین کا رُخ کرو تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ علوم و فنون ملیامیٹ ہو کر رہ جائیں ہے[1]

دوسری طرف ارباب روایت ہیں جنہوں نے محدثین کی تصحیح کو ہی صرف حدیث کی مقبولیت کا معیار بنا لیا ہے۔ انہوں نے ائمہ نقد میں سے دارقطنی وغیرہ پر محدثانہ نقطہ نظر غالب دیکھ کر اپنی توجہات کا مرکز صرف اسناد ہی کو بنا لیا اور متن سے نظریں ہٹالی ہیں۔ حالانکہ حدیث اسناد و متن دونوں کا نام ہے۔ حدیث کی صحت کی حد تک اسناد کی تحقیق کرنا اگر محدثین کا کام ہے تو حدیث کے متن کی حد تک قبولیت کو بتانا مجتہدین و فقہاء کا کام ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے حافظ ابن حبان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

ان النظر ان کان للسند فالشیوخ اولی وان کان للمتن فالفقہاء

اگر سند سے متعلق تحقیق کرنی ہو تو محدثین سے کرنی چاہیے اور اگر متن کے بارے میں کچھ پوچھنا ہو تو فقہاء سے پوچھنا چاہیے[2]

اس کی وجہ امام حازمی نے یہ بتائی ہے۔

لان قصدهم اثبات الاحکام ومجال نظرهم فی ذالک متسع

فقہاء کا پیش نہاد احکام ثابت کرنا ہے اور اس میں ان کا میدان وسیع ہے۔[3]

علامہ خطابی کو بھی اس افراط و تفریط کی شکایت ہے۔ یہاں ان کے بیان کو ناظرین کی ضیافت طبع کی خاطر پیش کرنا فائدے سے خالی نہیں ہے وہ فرماتے ہیں کہ:۔

میں نے اپنے زمانے میں علماء کو دو گروہ میں منقسم دیکھا ہے۔ محدثین اور ارباب فقہ ان دونوں علموں میں مقام اور محل کے لحاظ سے انتہائی قرب کے باوجود یہ دونوں طبقے باہم بچھڑے ہوئے بھائی معلوم ہوتے ہیں۔ محدثین کی اکثریت کی تگ و دو تو صرف روایات سمیٹنے اور طرق یکجا کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ غرائب اور

---

[1] الروض الباسم ج۱ ص ۷۹۔ [2] الباعث الحثیث ص ۱۶۵۔ [3] شروط الائمۃ الخمسۃ ص ۲۷۔

شواذ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں متون کا ان کو کوئی پتہ نہیں ہے
معانی سے نابلد اور استنباط سے بالکل ناآشنا ہیں۔ فقہاء پر زبان
طعن و تشنیع استعمال کرتے ہیں۔ فقہاء کے خلاف ان کا آوازہ
ہے کہ یہ سنّت کی مخالفت کرتے ہیں لیکن فقہاء کے مقام علمی کی
ان بیچاروں کو ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ زبان کی اس غلط کروٹ
سے خود ہی گناہ کما رہے ہیں۔ فقہاء کا حال یہ ہے کہ حدیث کی
حد تک ان کو قدرے علم تو ہے مگر ان میں صحیح، سقیم، کھری کھوٹی
میں تمیز کا بالکل سلیقہ نہیں ہے[1]

علامہ الجزائری نے توجیہ النظر میں بھی اس قسم کی شکایت کی ہے۔ بہرحال یہ موضوع تفصیل طلب ہے لیکن چونکہ ایک اہم اصولی سوال ہے اس لیے اس باب میں تحقیق کی راہ یہ ہے کہ حدیث کی صحت کے بارے میں محدثین سے اور حدیث کی قبولیت کے متعلق مجتہدین و فقہاء سے استفادہ کرنا چاہیے۔

اخبار آحاد سے احتجاج کا مسئلہ صرف حدیث کی صحت سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کا صحت کے ساتھ قبولیت سے بھی تعلق ہے۔ امام اعظم محدث ہونے کے ساتھ چونکہ فقیہ اور مجتہد بھی ہیں اس لیے حدیث کی صحت کے ساتھ حدیث کی قبولیت کی بھی شرطیں بتائی ہیں۔ حدیث کی صحت کے موضوع پر وہ بھی وہی کچھ فرماتے ہیں جو عام ارباب روایت کا مسلک ہے لیکن حدیث کے مقبول اور قابل عمل ہونے کے لیے انہوں نے کچھ شرائط پیش کی ہیں۔ ان میں اہم یہ ہیں کہ :

۱۔ روایت دین کے مسلّمہ اصولوں کے خلاف نہ ہو۔
۲۔ معانی قرآن سے متصادم نہ ہو۔
۳۔ سنّت مشہورہ کے خلاف نہ ہو۔
۴۔ صحابہ و تابعین کے عمل متوارث کے خلاف نہ ہو۔
۵۔ خبر واحد کا تعلق عموم بلویٰ سے نہ ہو۔

---

[1] معالم السنن ج ۱ ص ۲۰۶۔

مسلمہ اصولوں کے خلاف روایت

امرِ اول یعنی یہ کہ روایت دین کے مسلّمہ اصول کے خلاف نہ ہو۔ اس کی اہمیت تمام اربابِ اجتہاد نے ہمیشہ تسلیم کی ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز امام اعظم کے اس معیار کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

شریعت کا علمی سرمایہ دو قسم کا ہے قوانین کلیہ اور حوادث جزئیہ۔ قوانین سے مقصود ضوابط عامہ ہیں مثلاً یہ کہ شہادت پیش کرنا مدعی کا کام ہے شریعت، دراصل ان ہی قوانین کا نام ہے۔ مجتہد کا کام ہے کہ ان ضوابط کو حوادث جزئیہ سے متاثر نہ ہونے دے۔

(فتاوی عزیزی)

علامہ شاطبی اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

قوانین عامہ پر جزئی اور خصوصی واقعات اثر انداز نہیں ہوتے کیونکہ قواعد کلیہ قطعی ہوتے ہیں اور حوادث جزئیہ ظنی ہوتے ہیں۔ گمان و وہم سے یقین و اذعان کی عمارت منہدم نہیں ہو سکتی اور نہ ظن میں یقین کا مدمقابل بننے کی تاب ہے۔ نیز قواعد کلیہ دلائل قطعیہ سے غذا حاصل کرتے ہیں اس لیے ان میں کسی دوسرے احتمال کی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی، برخلاف حوادث کے کہ ان میں ہر وقت اور ہمہ آن دوسرے احتمالات کا امکان رہتا ہے۔ احادیث و اخبار کی حیثیت جزئیات کی ہے اور قواعد کا مقام کلیات کا ہے[1]

شریعت میں اس کی ایک سے زیادہ مثالیں ہیں۔ صرف ایک مثال ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔ قرآن و سنت میں وضو میں سر کے مسح کا ایک عمومی ضابطہ قرآن میں ہے۔

وامسحوا برؤسکم

اور سنت سے بھی اس ضابطہ کی تائید معلوم ہوتی ہے لیکن کچھ حدیثوں میں سر کی جگہ عمامہ پر مسح کا ذکر آیا ہے۔ مسند احمد، بخاری، ابن ماجہ میں بحوالہ عمرو بن امیہ۔ ترمذی، ابن ماجہ،

---

[1] الموافقات ج ۳ ص ۳۲۔

مسند احمد، مسلم، نسائی میں بحوالہ بلال، ترمذی میں بحوالہ مغیرہ۔ طبرانی میں بحوالہ ابی امامہ اور مسند احمد میں بحوالہ ثوبان اور سلمان عمامہ پر مسح کے بارے میں احادیث آئی ہیں۔

ان حدیثوں کی وجہ سے مسح راس کے اس ضابطہ حتمی کو ہرگز ہرگز نہ چھوڑا جائے گا جو قرآن اور سنت متواترہ سے ثابت ہے۔ اگر روایات مسح عمامہ صحیح بھی ہوں تو ان کو مطالب کا ایسا جامہ پہنایا جائے گا جس سے مسح راس کی قطعیت پر کوئی حرف نہ آتے۔ علامہ عبداللہ دراز دمیاطی رقمطراز ہیں:

> جیسا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مسح عمامہ کی روایات آئی ہیں، یہ روایات وضو میں مسح راس کے قاعدہ عام پر ہرگز اثر انداز نہ ہوں گی۔ اگر روایات صحیح بھی ہوں تو ان کو کسی وقت عذر پر محمول کیا جائے گا مثلاً سر میں زخم یا کسی اور بیماری کو اس قاعدہ عامہ سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔[1]

علامہ شاطبی اس پر بحث کرتے ہوتے رقمطراز ہیں:

> جب بذریعہ استقرار ایک قاعدہ کلیہ ثابت ہو چکا ہے پھر اگر کوئی جزئیہ سامنے آجائے جو اس قاعدہ کے خلاف ہو تو جزئیہ کے لیے ایسا محمل تجویز کرنا ہوگا جس سے وہ قاعدہ عام سے ہم آہنگ ہو جائے کیونکہ قاعدہ کی کلیت کا علم تو پوری شریعت کے سسٹم کو دیکھ کر ہوا ہے یہ ناممکن ہے کہ اس خاص جزئیہ کی وجہ سے قواعد کی عمارت کو مسمار کیا جائے۔[2]

اس میں امام مالک بھی امام اعظم کے ہمنوا ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دوسری صدی کے فقہاء و محدثین کا مسلک ہے کہ اخبار آحاد کے قابل عمل اور قابل احتجاج ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلام کے قوانین کلیہ کے خلاف نہ ہوں اور ان بزرگوں کو یہ مسلک ابوبکر، عمر، عائشہ اور ابن عباس سے ورثہ میں ملا ہے۔ علامہ شاطبی نے الموافقات میں اس پر مستقل عنوان کے تحت بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ، ابن عباس اور عمر بن الخطاب نے

---

[1] التعلیقات علی الموافقات ج ۴ ص ۲۶۰۔ [2] الموافقات ج ۳ ص ۱۰۔

اخبار آحاد کو اصولِ اسلامیہ کے مخالف ہونے کی وجہ سے رد کر دیا تھا اور اس موضوع پر شاطبی نے امام مالک کا مذہب بھی کھول کر بتایا ہے وہ فرماتے ہیں :

اس مسئلے کی سلف میں اصل موجود ہے۔ حضرت عائشہ نے حدیث ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ کو اسی وجہ سے رد کر دیا کہ قرآن کے اس ضابطہ عام کے خلاف ہے لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ۔ نیز ابن عباس کی اس روایت کو جس میں رویت باری کا ذکر ہے حضرت عائشہ نے لا تدرکہ الابصار کے ضابطہ کی وجہ سے نامنظور کیا۔ ایسے ہی حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس نے حضرت ابو ہریرہ کی اس روایت پر تنقید کی جس میں برتن میں ہاتھ داخل کرنے سے پہلے ہاتھ دھونے کی ہدایت ہے۔ نیز حضرت ابن عمر کی نحوست والی روایت کو ضابط رلی ان الامر کلہ للہ کے خلاف قرار دیا اور بتایا کہ یہ بات نحوست کا اسلام نے اعلان کیا ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ حضور فرما ایام جاہلیت میں لوگوں کا اعتقاد یہ تھا[1]

الغرض دوسری صدی کے محدثین کا نقطہ نظر اخبار آحاد کے بارے میں واضح اور صاف یہ تھا کہ خبر واحد اگر شریعت کے کسی مسلمہ قاعدے کے خلاف ہو تو اس پر عمل جائز نہیں ہے علامہ شاطبی نے امام مالک کا بھی یہی مذہب بتایا ہے اور علامہ ابن عربی نے بھی امام مالک کا راجح مسلک یہی قرار دیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ :

اذا جاء الخبر معارضا لقاعدۃ من قواعد الشرع ھل یجوز العمل بہ ام لا ؟ فقال ابو حنیفۃ لا یجوز العمل بہ و قال الشافعی یجوز و تردد مالک فی المسئلۃ قال و مشہور قولہ و الذی علیہ المعول ان الحدیث ان عضدتہ قاعدۃ آخری قال بہ و ان کان وحدہ ترکہ

اگر خبر واحد کسی قاعدہ شریعت کے معارض ہو تو کیا اس پر عمل جائز ہے؟

---

[1] الموافقات ج ۳ ص ۱۹۔

امام ابوحنیفہ تو فرماتے ہیں کہ ناجائز ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ جائز ہے اور امام مالک کا قول مشہور اور قابلِ اعتماد یہی ہے کہ حدیث کی تائید میں اگر کوئی قاعدہ ہو تو عمل جائز ہے اور اگر نہ ہو تو اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔[1]

اس کے برعکس تیسری صدی کے محدثین نے اس اساس سے ہمنوائی نہیں کی بلکہ انہوں نے اخبارِ آحاد کے ذریعے آئی ہوئی ہر خبرِ واحد کے بارے میں فیصلہ کر دیا کہ ہر صحیح حدیث بجائے خود ایک اصول ہے جس طرح قرآنِ حکیم ایک اصول ہے اور صحیح حدیث وہ ہے جو محدثین کی طے کردہ اصطلاحِ صحت پر پوری اترے۔ چنانچہ علامہ خطابی رقمطراز ہیں:

والاصل ان الحدیث لما ثبت عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وجب القول بہ وصار اصلاً فی نفسہ۔

حدیث جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے تو اسے اپنانا واجب ہے اور وہ خود ایک اصل ہے۔[2]

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی یہی بات لکھی ہے کہ:

الحدیث الصحیح اصل بنفسہ

حدیث صحیح خود ایک اصل ہے۔[3]

ابن السمعانی کے حوالہ سے بھی یہی بتایا گیا ہے کہ:

متی ثبت الخبر صار اصلاً من الاصول ولا یحتاج الی عرضہ علی اصل اٰخر۔

جب حدیث ثابت ہو جائے تو وہ خود ایک اصل ہو جاتی ہے۔[4]

فکر و نظر کے اس اختلاف کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسلام کے مسلمات میں ترمیم کرنی پڑ گئی اور ہر حدیث کے صحیح ہونے کے بعد تیسری صدی میں اسلام میں اُصول ہی اصول ہو گئے۔ مثلاً عرض کرتا ہوں کہ صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں حدیث آئی ہے۔

عن ابی ھریرۃ انہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ

---

[1] الموافقات ج ۳ ص ۲۰ [2] معالم السنن ج ۳ ص ۱۱۳ [3]، [4] فتح الباری ج ۴ ص ۲۵۱ -

علیہ وسلم لم یکذب ابراهیم الا ثلاث کذبات ثنتین منها فی ذات اللہ تعالیٰ قوله انی سقیم وقوله بل فعله کبیرهم هذا وواحدة فی سارة۔

اگر اس معیار کو مان لیا جائے کہ ہر حدیث ثابت ہونے کے بعد ایک اصل ہے تو نبی کا کذب بھی اسلام کے اصولوں میں سے ایک اصل بن جائے گا معاذ اللہ ثم معاذ اللہ حالانکہ نبی کی سچائی اور اس کی صداقت مانے ہوئے اصولوں میں سے ایک مسلمہ اصول ہے۔ وحی و نبوت کے سارے کارخانے کی رونق نبوت کے اسی وصف سے وابستہ ہے۔ اسی بنا پر علماء اور شراح حدیث کو اس حدیث کے لیے مطالب کے جامے تلاش کرنے پڑے اور ایک نہیں۔ بلکہ متعدد توجیہات کرنی ناگزیر ہو گئیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ حضرت ابوہریرہ کی یہ حدیث دین کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ نبوت ایک سیرت ہے جو صرف سچائی ہی سے بنتی ہے اور صرف سچائی ہی کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے۔ ایک نبی کسی بات سے عاجز نہیں ہوتا لیکن اس بات سے کہ سچ نہ بولے وہ قطعاً عاجز ہوتا ہے حقیقت اور سچائی کے خلاف جو کچھ ہے کبھی وہ نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ اس لیے انبیاء کی سچائی اور عصمت دین کے یقینیات قطعیہ میں سے ہے اور روایت چاہے کتنی ہی بہتر قسم کی کیوں نہ ہو لیکن ہر حال میں راوی کی شہادت ہے اور راوی بھی غیر معصوم۔ اس کی شہادت ایک لمحہ کے لیے یقینیات قطعیہ اور دین کے مسلمہ اصولوں کے مقابلے میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ اور الجزائری نے جو بعض کی طرف منسوب کرکے اور امام رازی نے جسے امام اعظم کی طرف منسوب کرکے لکھا ہے کہ:

هذا الحديث لا ينبغي ان يقبل لان فيه نسبة الكذب الى ابراهيم۔

اس حدیث کو شرف قبول حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ حضرت ابراہیم کی طرف جھوٹ کی نسبت ہے۔

اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ:

جب ایک غیر معصوم راوی کی غلطی ماننے اور معصوم نبی کی طرف جھوٹ کی نسبت میں تعارض ہو جائے تو ہم راوی کی غلطی مان لیں گے

لیکن نبی کی طرف جھوٹ کی نسبت گوارا نہ کریں گے۔[1]

حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے:

انا لا ندعی العصمة فی الرواة

ہم راویوں میں عصمت کے دعویدار نہیں ہیں۔

راویوں میں محدثین زیادہ سے زیادہ عدالت کے مدعی ہیں اور عدالت اور عصمت میں جب بھی تعارض ہوگا تو عصمت کو راجح قرار دیا جائے گا۔

یہ ایک مثال ہے ورنہ اس قسم کی مثالوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

معانی قرآن سے متصادم روایت

حدیث کی اصطلاحی صحت کے بعد دین کی زندگی میں اسے اپنانے اور اس کی مقبولیت کے لیے امام اعظم ایک شرط یہ بھی بتاتے ہیں کہ وہ حدیث کسی درجے میں معانی قرآن سے متصادم نہ ہو اور اس شرط کے عائد کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اپنے مدلول اور مفہوم میں قطعی نہیں ہے لیکن اپنے منطوق میں وہ حتمی اور قطعی ہے اور احادیث اخبار آحاد ہونے اور روایت بالمعنے کی وجہ سے اپنے منطوق، اپنے مفہوم میں ہرگز ہرگز قطعی نہیں ہیں۔ ایک روایت پر اصطلاحی صحت کی خواہ کتنی مہریں ثبت ہو جائیں مگر آپ قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ راوی جو کچھ بتا رہا ہے یقیناً یہ الفاظِ نبوت ہی ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

قد یختلف صیغ حدیث لاختلاف الطرق و ذالک من جهة نقل الحدیث بالمعنے۔

حدیث میں الفاظ متعدد طرق سے آنے کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں اور یہ اختلاف الفاظ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حدیث کی روایت بالمعنے ہوئی ہے۔[1]

امام اعظم کا یہ ضابطہ حافظ ابن عبد البر نے اس طرح پیش کیا ہے کہ:

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ۔

امام اعظم اخبار آحاد کو اپنے یہاں جمع کردہ حدیثوں اور معانی قرآن پر
پیش فرماتے تھے۔ ان حدیثوں میں جو اپنے معنے میں منفرد ہوتی
تھیں ان کو ترک کر دیتے اور ان کا نام شاذ رکھتے۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخبار آحاد اگر معانی قرآن کے خلاف ہوتی تھیں تو آپ کے یہاں درجہ قبولیت نہ ملتا تھا۔ خواہ وہ معانی قرآن قرآن کا منطوق ہوں یا مدلول۔ اگر خبر واحد ان کے خلاف ہوتی تو خبر کی صحت میں آپ اسے علت قادحہ قرار دیتے۔ دراصل اخبار آحاد میں تعلیل کا مسئلہ نہایت ہی نازک ترین مسئلہ ہے۔ محدثین کی نظر تو اس موضوع پر صرف اسناد اور الفاظ متن ہی پر ہوتی ہے لیکن مجتہدین کی نظر اس معاملہ میں الفاظ متن اور اسناد ہی پر نہیں ہوتی بلکہ ان کو تقابلی مطالعہ میں اسے شریعت کے پورے نظام کو سامنے رکھ کر جانچا ہوتا ہے اسی لیے کسی حدیث کے ضعیف ہونے کی وجوہ نہ صرف متعدد ہوتی ہیں بلکہ متباین ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ امام حازمی رقمطراز ہیں:

پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اخبار آحاد کے ضعیف ہونے کی وجوہ
ایک سے زیادہ ہونے کے ساتھ مختلف بھی ہوتی ہیں اور اہل علم
اس موضوع پر مختلف نقطہ ہائے نظر رکھتے ہیں اور ان میں بزرگ ترین
یہ ہے کہ حدیث کی مقبولیت کا دارومدار ظاہر شرع کی ہمنوائی پر
ہے اور محدثین کے نزدیک دوسرے اسباب ہیں۔[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محدثین کے یہاں تعلیل اخبار کے جو پیمانے مقرر ہیں ان کا تعلق تمام تر محدثانہ نقطہ نظر سے ہے اور فقہاء کے یہاں صرف یہی پیمانہ نہیں بلکہ وہ اس کے ساتھ دوسرے سانچوں میں بھی اخبار کو رکھ کر جانچتے ہیں۔ ایک مثال سے اس کی توضیح کرتا ہوں۔

شیخین اور دوسرے ارباب صحاح نے حدیث روایت کی ہے کہ:

عن ابن عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال المتبایعان
بالخیار مالم یتفرقا۔

یہ حدیث صحیح ہے اور حدیث کی کتابوں میں متعدد طرق سے مروی ہے۔ محدثین نے اس

---

[1] الانتقاد ص ۱۴۹۔ [2] شروط الائمۃ الخمسہ ص ۵۲۔

حدیث پر غور کیا اور غور و فکر کے بعد ان کو اس کی سند میں ایک جگہ نازک ترین علت معلوم ہوئی۔ بتانے والوں نے اس کا سلسلۂ سند یوں ظاہر کیا۔

یعلی بن عبید عن سفیان الثوری عن عمرو بن دینار عن ابن عمر عن النبی۔

حدیث متصل ہے لیکن الجزائری کہتے ہیں کہ اس میں علت موجود ہے اور اس علت کی وجہ سے بلحاظ سند حدیث صحیح نہیں ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

وهو متصل غیر صحیح

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ علت کیا ہے؟ الجزائری نے بتایا ہے کہ

والعلة فی قوله عن عمرو بن دینار انما هو عن عبداللّٰه بن دینار عن ابن عمر هکذا رواه الائمة من اصحاب سفیان فوهم یعلی بن عبید و عدل عن عبداللّٰه بن دینار الی عمرو بن دینار و کلاهما ثقة۔

اس میں علت یہ ہے کہ سند میں عمرو بن دینار آیا ہے حالانکہ عمرو بن دینار نہیں بلکہ عبداللہ بن دینار ہے۔ ائمہ نے ایسا ہی روایت کیا ہے یعلی بن عبید کو وہم ہو گیا اور عبداللہ کی جگہ عمرو مذکور ہو گیا۔[1]

یہ محدثانہ تعلیل ہے لیکن حدیث میں جو فقہاء یعنی امام مالک اور امام ابو حنیفہ نے علت قادحہ معلوم کی ہے وہ اس کے سوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ حدیث زمانہ فقہاء سبعہ میں منظر عام پر نہیں آئی اور ان کے معاصرین اس سے آشنا نہیں ہیں۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

فرای مالک و ابو حنیفة هذا علة قادحة فی الحدیث۔[2]

بہر حال امام اعظم اخبار آحاد کو معانی قرآن کے سانچے میں ڈال کر حدیث کی مقبولیت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ حافظ ابو جعفر طحاوی فرماتے ہیں:۔

خلاصہ یہ کہ حدیث جب شریعت کے موافق ہو قرآن اس کا مصدق ہو اور آثار اس کے مؤید ہوں تو ایسی حدیث کی تصدیق واجب ہے لیکن اگر حدیث شریعت کے خلاف ہو قرآن اس کی تکذیب

---

[1] توجیہ النظر ص ۲۶۶۔ [2] الانصاف ص ۳۱۔

کرتا ہو تو ایسی حدیث کا رد کرنا ضروری ہے اور یہ اس بات کی کھلی نشانی ہے کہ یہ فرمودہ نبوت نہیں ہے[1]

مشہور محدث ابو بکر خطیب بغدادی فرماتے ہیں:

اخبار آحاد کو مندرجہ ذیل صورتوں میں قبول نہ کیا جائے گا۔ جب عقل صریح کے خلاف ہو، جب حکم قرآنی کے خلاف ہو، جب سنت مشہورہ کے خلاف ہو اور جب کسی ایسے عمل کے خلاف ہو جو سنت کے قائم مقام ہو کر چل رہا ہے اور جب کسی بھی دلیل قطعی کے خلاف ہو[2]

خطیب بغدادی ہی نے الفقیہ والمتفقہ میں یہ بات اس سے زیادہ وضاحت سے پیش کی ہے۔ علامہ زاہد کوثری نے الفقیہ والمتفقہ کے حوالہ سے ان کا یہ بیان قلم بند کیا ہے اور اسے مولانا ابو الوفاء افغانی نے الرد علی سیر الاوزاعی کی تعلیق میں نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

جب ثقہ مامون راوی کوئی حدیث متصل الاسناد روایت کرے تو اسے صرف ان وجوہ کی بنا پر رد کیا جا سکتا ہے۔

اوّل عقل کے صریح خلاف ہو۔ دوم حکم قرآنی یا سنت متواترہ کے خلاف ہو۔ اگر ایسا ہوگا تو یقیناً حدیث بے اصل ہے اور یا پھر منسوخ سوم اجماع کے خلاف ہو کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ حدیث صحیح ہو اور اُمت کسی ایسی چیز پر مجتمع ہو جائے جو اس کے خلاف ہو۔ چہارم راوی کسی ایسی بات کے بیان میں منفرد ہو جسے سب کو جاننا چاہیے پنجم راوی کوئی ایسا انکشاف کرے جسے عادۃً متواتر ہونا چاہیے۔

ان پانچوں صورتوں میں خبر واحد قابل پذیرائی نہ ہوگی[3]

حافظ ابو بکر الجصاص نے قرآنی آیت اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم پر یہ نوٹ لکھا ہے

اس آیت قرآنی کا مطالبہ یہ ہے کہ قرآن کا اتباع بہرحال واجب

---

[1] المعتصر ص ۳۶۲ ۔ [2] الکفایہ ص ۴۳۲ ۔

[3] الفقیہ والمتفقہ بحوالہ التعلیق الرد علی سیر الاوزاعی ص ۲۸ ۔

ہیے اور قرآن پر اخبار آحاد کو بالادستی حاصل نہیں ہے کیونکہ قرآن کی
اتباع دلائل قطعیہ سے ثابت ہے اور آحاد کا ثبوت ظنی ہے اس لیے
کسی حال میں کسی حدیث کی بنا پر قرآن کو نہ چھوڑا جائے گا اور نہ آحاد کی
وجہ سے قرآن پر کوئی اعتراض ہوگا۔[1]

اس موقعہ پر علامہ عبدالعزیز بخاری کے اس بیان سے چشم پوشی کرنا اس مقام سے بے انصافی ہوگی جو انہوں نے کشف الاسرار میں لکھا ہے:

ثقہ راوی کی حدیث کو قرآن کی مخالفت کی بنا پر رد کرنا سب کے درمیان
اتفاقی ہے۔ علاوہ ان ظاہریہ کے جو اخبار آحاد کو بھی متواتر کی طرح
قطعی کہتے ہیں۔ ان کے مکتب میں خبر واحد اور کتاب اللہ کو ایک
ترازو میں تولا جاتا ہے ان سے اس موضوع پر بات ہی بیکار ہے۔[2]

بہرحال امام اعظم اور امام مالک حدیث کی صحت کے بعد اس کی مقبولیت میں معانی قرآن کے خلاف ہونے کو علت قادحہ قرار دیتے ہیں اور اس بنا پر انہوں نے ایک سے زیادہ حدیثوں کو معلل قرار دے کر ناقابلِ پذیرائی بنایا ہے۔ ترمذی، ابن ماجہ اور بیہقی میں حدیث آتی ہے

عن عبد اللہ ان غیلان بن سلمۃ الثقفی اسلم ولہ
عشرۃ نسوۃ فی الجاھلیۃ فاسلمن معہ فامر النبی
صلی اللہ علیہ وسلم ان یتخیر منھن اربعا۔

امام ترمذی نے اسے بحوالہ زہری عن سالم عن عبداللہ روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے تو محدثانہ انداز میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ

ھذا حدیث غیر محفوظ

اور صحیح روایت کی نشاندہی کی ہے۔ شیخ علاء الدین مغلطائی فرماتے ہیں کہ

احادیث ھذا الباب کلھا معلولۃ ولیست اسانیدھا قویۃ

لیکن قاضی ابو یوسف نے اس کے بارے میں جو فیصلہ فرمایا ہے اس سے ان کی حدیث و فقہ میں جلالتِ شان کا اندازہ ہوتا ہے فرماتے ہیں:

---

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۲۰۔ [2] کشف الاسرار ج ۳ ص ۱۰۔

هو عندنا شاذ والشاذ من الحديث لا یؤخذ بہ

یہ تو محدثانہ فیصلہ ہے لیکن اس کی جو توجیہ ارشاد فرمائی ہے اس سے ان کی مجتہدانہ جلالتِ قدر معلوم ہوتی ہے فرماتے ہیں :

لان اللہ تعالیٰ لم یحل الا نکاح الاربع فما کان من فوق ذالک کلہ فحرام من اللہ فی کتابہ۔

کیونکہ اللہ سبحانہ نے ایک وقت میں چار سے نکاح حلال کیا ہے پانچ کا ایک کے نکاح میں اجتماع حرام ہے۔[1]

دیکھ لیجئے معانی قرآن سے تصادم ہونے کو شاذ ہونے کی علت قرار دیا ہے۔ اسی قبیل سے حدیث مصرّاۃ ہے یعنی حضرت ابوہریرہ کی مندرجہ ذیل حدیث۔

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اونٹ، بکری کو مصرّاۃ نہ بناؤ جو کوئی ایسا جانور خریدے تو وہ دودھ دوہنے کے بعد اختیار رکھتا ہے چاہے اسے رکھے اور چاہے تو اسے واپس کر دے اور اس کے ساتھ بائع کو ایک صاع کھجور دے دے۔[2]

امام اعظم نے اس حدیث کو معانی قرآن سے معارض ہونے کی وجہ سے غیر مقبول قرار دیا ہے۔ اس حدیث کی رو سے سودے کی واپسی کی صورت میں خریدار کو دودھ کا تاوان کھجور کی صورت میں ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بلاشبہ عیب کی موجودگی میں مشتری کو معاملہ فسخ کرنے کا حق حاصل ہے لیکن خریدار پر دودھ برتنے کی پاداش میں کھجور کا تاوان قرآن کے بتلاتے ہوئے ضابطہ ضمان کے خلاف ہے۔ قرآن نے متلفات اور عدوانات میں تاوان ذوات الامثال میں مثلی بتایا ہے۔ قرآن کی یہ آیات اس کی صریح شہادات ہیں۔

فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم۔

پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو چاہیے کہ جس طرح کا معاملہ اس نے تمہارے ساتھ کیا ہے بالکل ویسا ہی معاملہ تم بھی اس کے ساتھ کرو۔

ایک اور ارشاد ہے :

---

[1] الرد علی سیر الاوزاعی ص ۸۰۔ [2] منتقی الاخبار مع نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۸۳۔

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به

اور اگر تم سزا دو تو چاہیے کہ اتنی ہی سزا تم دو جیسی تمہیں دی گئی ہے۔

یہ آیات قرآنی صراحتہً کہہ رہی ہیں کہ عدوانات کی حدود ہیں تاوان مثلیات میں مثل ہوتا ہے ان ارشادات ربانی کی روشنی میں دودھ کا تاوان دودھ ہونا چاہیے کیونکہ دودھ ذوات الامثال سے ہے۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد تاوان کے موضوع پر ایک ضابطہ کی صورت میں امت کو شہرت کی راہ سے ملا ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے یہ آپ کا عدالتی فیصلہ ہے۔

عن عائشۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قضی ان الخراج بالضمان

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے کہ خراج ضمان کے ساتھ ہے

یہ قرآن وسنت کے واضح اصول ہیں اور یہ روایت ان کے معارض ہے اس لیے امام اعظم اس روایت کو مقبول نہیں قرار دیتے۔ حافظ ابو جعفر طحاوی نے اس روایت کا دوسرے پہلو سے جائزہ لیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

دودھ جسے خریدار نے گھر لا کر نکالا ہے اس میں خریدنے سے پہلے کچھ مالک کی ملک تھا اور کچھ خریدار کے یہاں آ کر پیدا ہوا ہے۔ وہ خریدار کی ملک ہے۔ کھجوروں کا جو صاع مالک کو دیا جا رہا ہے وہ اگر سارے دودھ کا بدل ہے تو یہ حدیث الخراج بالضمان کے خلاف ہے کیونکہ جو دودھ خود ملک مشتری میں پیدا ہوا ہے وہ تو اس کا ہے خریدار پر کھجور کا تاوان بلا وجہ ہے چنانچہ امام شافعی کا بھی یہی مذہب ہے کہ اگر خریدار نے صیر ورۃ کے علاوہ کسی اور وجہ سے جانور واپس کر دیا تو خریدار پر ضمان نہیں ہے۔ اور اگر یہ صاع اس دودھ کا بدل ہے جو سودے کے وقت جانور کے پستانوں میں موجود تھا تو پھر بیع الکالی بالکالی ہے جس سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ دودھ خریدار کی ملک نہیں ہے نہ سودے کی وجہ سے اور نہ حدیث الخراج بالضمان کی رو سے۔ خریدار نے اگر پی لیا ہے تو اس کے ذمہ دَین ہے اس لیے دونوں میں سے کوئی صورت ہو ایک حدیث کا چھوڑنا

ناگزیر ہے [1]

علامہ خطابی نے جہاں اس حدیث پر گفتگو فرماتے ہوئے امام اعظم کے موقف کا تذکرہ کیا ہے وہاں واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ امام اعظم اس پر اس لیے عمل نہیں کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں

انہ خبر مخالف للاصول لان فیہ تقویم المتلف بغیر النقود وفیہ ابطال ردا لمثل فیمالہ مثل۔

یہ حدیث اصول کے خلاف ہے اس میں تلف شدہ چیز کا ضمان بغیر نقدی کے دیا جا رہا ہے اور اس طرح یہ حدیث مثلیات میں مثلی کے دینے کے اصول کو رد کرتی ہے [2]

اور معلوم ہے کہ یہ اصول قرآن کا بتایا ہوا ہے اس لیے یہ حدیث معانی قرآن کے معارض ہے۔ علامہ ابن دقیق العید نے یہ فرما کر کہ

لم یقل ابو حنیفۃ بھذا الحدیث

لکھا ہے کہ ابوحنیفہ اس پر اس لیے عمل نہیں کرتے کہ یہ حدیث ان کی رائے میں اصول معلومہ کے خلاف ہے اور وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اخبار آحاد اگر اصول معلومہ کے مخالف ہوں تو ان پر عمل واجب نہیں ہے۔ حدیث کے اصول معلومہ کے مخالف ہونے پر امام اعظم کے موقف کو جن آٹھ وجہوں سے منقح کیا ہے ان میں اولین وجہ یہ بتائی ہے کہ

یہ کہ مثلیات میں تاوان مثلی اور قیمتی اشیاء میں قیمت سے ہوتا ہے اس حدیث میں دودھ اگر مثلیات سے ہے تو اس کا تاوان دودھ سے ہونا چاہیے اور اگر قیمتی ہے تو اس کی قیمت دی جانی چاہیے لیکن حدیث میں تاوان جو تجویز کیا گیا ہے نہ وہ مثلی ہے اور نہ قیمتی بلکہ تاوان میں کھجوریں دی گئی ہیں اس لیے یہ حدیث اس اصول کے مخالف ہے [3]

امام اعظم کے موقف کی وضاحت کے بعد ان لوگوں کی جانب سے جوابات بھی نقل کیے گئے ہیں جو ظاہر حدیث پر عمل پیرا ہیں۔ مخالفین اس حد تک تو امام اعظم کے ہمنوا ہیں کہ اخبار آحاد

---

[1] شرح معانی الآثار ج ۲ ص ۲۰۷۔ [2] معالم السنن ج ۵ ص ۸۶ [3] احکام الاحکام ج ۲ ص ۱۲۶

اگر اصول معلومہ کے معارض ہوں تو قابلِ قبول نہیں ہیں۔ چنانچہ ابن دقیق العید رقمطراز ہیں:

خص الرد لخبر الواحد بالمخالفۃ للاصول لا بمخالفۃ
قیاس الاصول۔

لیکن اس میں ان کو تامل ہے کہ حدیث مصراۃ بھی اصول معلومہ کے مخالف ہے یا نہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ حدیث اصول معلومہ کے مخالف نہیں ہے بلکہ قیاسِ اصول کے خلاف ہے۔ علامہ شوکانی نے بھی یہی بات لکھی ہے۔

ان المتوقف فی خبر الواحد انما هو اذا کان مخالفا للاصول
لا لقیاس الاصول[1]

یہی جواب امام شوکانی کی رائے میں سب سے زیادہ شاندار ہے یعنی حدیث مصراۃ اصول معلومہ کے نہیں بلکہ قیاس اصول کے مخالف ہے لیکن علامہ ابن دقیق العید نے اس جواب کی یہ کہہ کر فی هذا نظر (محل نظر ہے) کمزوری کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ حافظ ابن حجر اور علامہ خطابی کو جب اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ملی کہ حدیث مصراۃ اصول معلومہ کے خلاف ہے تو انہوں نے اصول اور قیاس اصول سے نظر ہٹا کر اپنے مخصوص ذہن کے تحت یہ جدت پیدا کر دی کہ محدثین کی اصطلاحی صحت کے بعد ہر حدیث خود ہی ایک اصل کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے چنانچہ علامہ خطابی فرماتے ہیں:

ان الحدیث اذا ثبت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
وجب القول بہ وصار اصلاً فی نفسہ۔

حدیث جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے تو اسے اپنانا
واجب ہے اور وہ حدیث خود اصل ہے[2]

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی یہی بات دہرائی ہے

الحدیث الصحیح اصل بنفسہ۔[3]

لیکن یہ صرف ان ذہنوں کا تخلیقی کارنامہ ہے جو قرآن کے ساتھ بلحاظ ثبوت احادیث کی قطعیت کو مانتے ہیں، یہ عامہ اہل علم کا موقف نہیں ہے اس پر تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ اپنے مقام

---

[1] نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۸۵۔ [2] معالم السنن ج ۵ ص ۸۶۔ [3] فتح الباری ج ۴ ص ۲۹۱۔

پر اُٹے گا۔

حدیث مصراۃ کے بارے میں امام اعظم کا صحیح موقف تو یہی ہے کہ یہ حدیث معانی قرآن سے معارض ہونے کی وجہ سے درجہ قبولیت حاصل نہیں کر سکی۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ خود احناف نے بھی امام اعظم کے موقف کو صحیح انداز میں پیش نہیں کیا اس لیے یہاں چند در چند سوالات ابھر آئے۔

عیسٰی ابن ابان نے امام اعظم کے موقف کی ترجمانی اس طرح کی کہ ایسی اخبار آحاد جن کے لیے کسی صورت میں بھی قیاس میں گنجائش نہ نکل سکے اور راوی فقیہ نہ ہو اسے رد کر دیا جائے اور یہ حدیث مصراۃ اسی قبیل سے ہے چنانچہ حافظ عبد القادر قرشی لکھتے ہیں:

مذهب عيسٰى بن ابان من اصحابنا اشتراط فقه الراوى
لتقديم الخبر على القياس وخرج عليه حديث المصراة
وتابعه اكثر المتاخرين[1]

حافظ ابن حجر عسقلانی، حافظ ابن القیم، حافظ ابن تیمیہ، علامہ ابن دقیق العید اور علامہ شوکانی نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا ہے۔ حافظ ابن حجر تو یہاں تک فرما گئے۔

هو كلام اذى قائله به نفسه وفى حكايته غنى عن تكلف
الرد عليه[2]

فخر الاسلام بزدوی نے امام اعظم کی جو ترجمانی کی ہے وہ بھی بے شمار شبہات کی تخلیق کا ذریعہ بنی ہے انہوں نے صرف قیاس کا سہارا لیا ہے اور اپنے مخاطبوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ چونکہ حدیث مصراۃ قیاس کے معارض ہے اس لیے اسے امام اعظم نے نہیں اپنایا ہے چنانچہ وہ اس حدیث کے مقبول نہ ہونے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

دُودھ کے عوض میں ایک صاع کھجور کا دینا ضروری سمجھا گیا ہے ظاہر ہے کہ دودھ خریداری اور بکری پر قبضہ کے بعد ہی دوہا گیا ہوگا لہذا وہ خریدار کی ذمہ داری میں داخل ہے کیونکہ وہ اس کا مالک ہے اس لیے تاوان کا سوال ہی نہیں۔ دُودھ مال کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ

---

[1] کتاب الجامع ص ۱۷م۔ [2] فتح الباری ج ۵ ص ۲۹۰۔

ایسے ہے جیسے بکری کا بچہ۔ اس لیے مشتری پر تاوان کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ نیز اگر دودھ کو مال فرض بھی کر لیا جائے تو یہ اُون کی طرح بکری کے تابع ہے پھر بھی خریدار اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اگر خریدار پر تاوان اس لیے ہے کہ اس نے عقد بیع کیا ہے تو دودھ کے مقابلے میں بکری کی قیمت اتنی کم ہو جانی چاہیے۔ اور اگر اس کی وجہ مشتری کی تعدی ہے تو وہ اتنا دودھ واپس کر دے یا اس کی قیمت دے۔ کسی بھی صورت میں ایک صاع تمر دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔[1]

اس بیان کی روح یا اور صرف یہ ہے کہ حدیث مصراۃ قطعاً خلاف قیاس ہے اور خلاف قیاس ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ان بزرگوں کی اپنی اپج ہے۔ ان کی یہ تخریجات امام اعظم کے مسلک کی ترجمانی نہیں کرتی ہیں اور ان کے بیانوں سے امام اعظم کے اصل مسلک کی تصویر سامنے نہیں آتی چنانچہ امام ابوالحسن کرخی نے تصریح کی ہے کہ

> ہمارے اصحاب ان حدیثوں پر اس لیے عمل نہیں کرتے کہ یہ کتاب اللہ اور سنت کے خلاف ہیں نہ کہ اس لیے کہ راوی فقیہ نہیں ہے حدیث مصراۃ کتاب وسنت دونوں کے خلاف ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔[2]

اس لیے یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے اور یہی امام اعظم کا موقف ہے کہ حدیث مصراۃ معانی قرآن اور سنت کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول ہے اس لیے نہیں کہ یہ حدیث خلاف قیاس ہے جیسا کہ بزدوی کا خیال ہے اور اس لیے نہیں کہ اس کے راوی حضرت ابوہریرہ ہیں اور وہ غیر فقیہ ہیں جیسا کہ عیسٰی بن ابان کی رائے ہے۔ یہاں حافظ ابن تیمیہ کی یہ بات بے حد وزنی ہے کہ واپسی کی علت حدیث میں عیب کی بنا پر نہیں بلکہ اس کی علت وہ جعل سازی اور تدلیس ہے جس کا مالک نے دودھ روک کر مظاہرہ کیا ہے

---

[1] [2] کشف الاسرار ج ۲ ص ۷۰۲۔

قاضی ابو یوسف بھی خریدار کو اختیار دیتے ہیں کہ وہ ایسا مویشی واپس کر دے۔ اگر فی الواقع حدیث میں جانور کی واپسی کا حکم دھوکے اور تدلیس کی بنا پر ہے تو پھر اس ارشاد نبوت کے ذریعے امام اعظم کا موقف بے حد مستحکم اور پائیدار ہو جاتا ہے کیونکہ دھوکہ دو ہی طرح سے ہوتا ہے گفتار سے یا کردار سے۔ اگر لین دین میں گفتار کے ذریعے دھوکہ دیا گیا تو عدالت کے ذریعے اس کا اقالہ ضروری ہے۔ اور اگر کردار کے ذریعے تدلیس کی گئی ہے تو قانونی طور پر تو اقالہ ضروری نہیں ہے لیکن از روئے دیانت ضروری ہے۔ قانون ہمیشہ کھلے اور صاف حقائق پر لاگو ہوتا ہے۔ پوشیدہ اور مستور کارروائیاں قانون کے احتساب سے باہر ہیں۔ مان لیا جائے کہ تصریہ دھوکہ اور تدلیس ہے اور اس میں بائع پر واجب ہے کہ معاملہ کو فسخ کرے لیکن یہ وجوب از روئے دیانت ہے نہ کہ از روئے قانون۔ اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جعل سازی اور تدلیس کرنے والوں کو از روئے دیانت حسن معاشرت کی خاطر فرما رہے ہیں کہ اگر کوئی ایسی جعل سازی وجود میں آ جائے تو اخلاق اور باہمی رواداری کا تقاضا یہ ہے کہ جانور واپس لے لیا جائے اور مشتری کی مروت یہ ہے کہ وہ اسے ایک صاع کھجور دے دے یا اس کی قیمت ادا کر دے جیسا کہ خطابی نے قاضی ابو یوسف کی رائے بتائی ہے ورنہ جہاں تک معاملہ کی نفسہ نظر سے اس کی قانونی حیثیت کا تعلق ہے وہ تو وہی ہے جو قرآن اور سنت سے ثابت ہے۔ کیونکہ اگر جانور کی واپسی عیب کی بنا پر ہو جیسا کہ محدثین کہتے ہیں یا جعل سازی کی بنا پر ہو جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ کہتے ہیں تو نقصان عیب میں قرآن و سنت کا ضابطہ یہی ہے کہ متلفات اور عدوانات میں تاوان ذوات الامثال میں مثلی ہوتا ہے۔

بہرحال اخبار آحاد کا معانی قرآن کے معارض ہو جانا امام اعظم کے نزدیک علت قادحہ ہے

سنت مشہورہ سے معارض حدیث

اخبار آحاد اگر سنت سے معارض ہوں خواہ ان پر اصطلاحی صحت کی محدثین نے کتنی ہی مہریں لگا دی ہوں۔ امام اعظم اس کو بھی اخبار آحاد کے لیے علت قادحہ قرار دیتے ہیں اور اس میں امام اعظم ہی تنہا نہیں بلکہ دوسری صدی کے سب محدثین کا موقف یہی ہے۔ ابو بکر الخطیب کی زبانی آپ اس کی پوری داستان پہلے سن چکے ہیں۔ ان ظاہریہ کو چھوڑ کر جن کے یہاں ہر زیب محدثین کی اصطلاحی صحت کا لبادہ پہن لینے کے بعد خود ہی اصل بن جاتی ہے اور جن کے

یہاں آحاد کو جانچنے کا کوئی معیاری پیمانہ نہیں ہے سب کہتے ہیں کہ اخبارِ آحاد اگر سنتِ مشہورہ کے معارض ہوں تو یہ علتِ قادحہ ہے۔

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کا جو محسوس پیمانہ صحابہ میں چھوڑا ہے اور جسے جماعتِ صحابہ نے اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں اپنایا اور جسے خلافتِ راشدہ نے اپنے دورِ اقتدار میں تمام ممالکِ اسلامیہ میں قانونی طور پر نافذ کیا ہے اور جسے اسلام کہہ کر دُنیا نے پکارا ہے۔ یہی حضورِ انور کی سنتِ مشہورہ ہے۔ چونکہ یہ عملاً متواتر ہے اس لیے اس کے خلاف سند کی بڑی سے بڑی قوت بھی بطورِ چیلنج قبول نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس کی ایک مثال ہدیہ ناظرین کرتا ہوں ۔

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمر بھر کے عمل اور صحابہ کے تعامل سے اُمت کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امامت کے لیے وہ شخص آگے ہونا چاہیے جو عاقل، بالغ ہو اور اس ضابطہ کلیہ میں کہیں کوئی استثنا نہیں ہے۔ صرف عمرو بن سلمہ کی ایک منفرد روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے قبیلہ میں صرف چھ سال کی عمر میں امامت کی ہے۔ حدیث صحیح بخاری میں اور حدیث کی دوسری کتابوں میں اس طرح آئی ہے کہ:

> عمرو بن سلمہ کہتے ہیں کہ زمانہ فتح مکہ میں سب نے اسلام کی طرف پیش قدمی کی۔ میرے والد نے ہماری قوم میں سے اسلام لانے میں پہل کی۔ مسلمان ہونے کے بعد جب میرے والد واپس تشریف لائے تو بتایا کہ میں تمہارے لیے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے حق لے کر آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ فلاں فلاں اوقات میں نماز پڑھا کرو۔ جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے ایک اذان کہے اور جسے قرآن زیادہ یاد ہو وہ امامت کرے۔ لوگوں نے دیکھا کہ مجھ سے زیادہ قرآن کسی کو یاد نہیں ہے کیونکہ میں آنے والے مسافروں سے ملتا جلتا رہتا تھا۔ لوگوں نے مجھے ہی آگے کر دیا اس وقت میری عمر صرف چھ یا سات سال تھی۔ میں ایک چادر اوڑھ کر نماز پڑھا رہا تھا جب سجدے میں جاتا تو برہنہ ہو جاتا۔ قبیلہ کی ایک عورت نے کہا کیا تم اپنے امام کی جائے ستر نہیں ڈھانپتے۔ لوگوں نے میرے لیے کپڑا خرید کر قمیض تیار کی،

جس قدر مجھے اس روز خوشی ہوئی کبھی ایسی خوشی نہ ہوئی تھی[1]

تیسری صدی کے محدثین نے اس حدیث سے چھ سالہ بچے کے لیے امامت کے جواز کا پروانہ حاصل کر لیا۔ چنانچہ مشہور محدث محمد بن نصر مروزی نے امام اسحاق بن راہویہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

اما امامة الغلام بعد ان یعقل الامامة ویفقه فی الصلاة فجائزة وان لم یحتلم و فیما قال النبی صلعم یؤم القوم اقرأهم وان کان اصغرهم دلالة علی ذالک[2]

لڑکے کی امامت عقل و فہم کے بعد درست ہے اگرچہ نابالغ ہو اور حضور کا یہ ارشاد کہ لوگوں میں جو زیادہ پڑھا ہوا ہو وہ امامت کرے اس کی دلیل ہے۔

علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ

فیه جواز امامة الصبی ووجه الدلالة ما فی قوله لیؤمکم اکثرکم قرآنا من العموم[3]

یہ حدیث بچے کی امامت کے جواز کی دلیل ہے کیونکہ اقرأکم ... الخ کا جملہ عام ہے۔

لیکن دوسری صدی کے محدثین اور فقہا نے اس حدیث کو اس موضوع پر سنت مشہورہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابلِ قبول نہیں سمجھا۔ لیث بن سعد، عطاء بن ابی رباح، ابراہیم نخعی، شعبی، مالک اور ابوحنیفہ نے اس حدیث پر عمل نہیں کیا اور اس جزئی واقعہ کی یہ تاویل کر دی کہ یہ ان نومسلموں کا اپنا اجتہاد تھا کہ معصوم بچے کو امام بنا لیا۔ اس لیے اس موضوع پر یہ حجت نہیں ہے۔ دین میں نبوت کا چھوڑا ہوا ضابطہ اور محسوس و مرئی عمل کا پیمانہ امامت کے متعلق وہی ہے جس پر ہمیشہ صحابہ نے عمل کیا ہے۔

تاریخِ سنت میں بھی اس محسوس پیمانۂ عمل کے بارے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ

---

[1] منتقی الاخبار ج ۳ ص ۱۴۰۔ [2] قیام لیل ص ۱۰۱، [3] نیل الاوطار ج ۳ ص ۱۴۰۔

ارشاد اُمت کو ملا ہے۔ مثلاً مالک بن الحویرث کہتے ہیں کہ :

ہم ایک وفد کی صورت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے بیس روز آپ کی خدمت میں رہے آپ بڑے ہی مہربان اور شفیق تھے جب آپ نے ہم میں واپسی کا اشتیاق محسوس کیا تو ارشاد فرمایا کہ واپس جاؤ جہاں رہو تعلیم جاری رکھو اور نماز پڑھو جب نماز کا وقت آئے چاہیے کہ تم میں سے ایک اذان کہے اور لیؤ مکم اکبرکم جو تم میں بڑا ہو وہ امامت کرے۔[1]

اس واقعہ کو امام بخاری نے ایک جگہ نہیں بلکہ چھ جگہ اپنے مختلف اساتذہ کے حوالے سے نقل کیا ہے ان میں زیادہ مبسوط وہ واقعہ ہے جو ابوالنعمان کے حوالہ سے لکھا ہے۔

منتقی الاخبار میں اس موضوع پر صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس کے فتاویٰ بھی نقل کیے ہیں کہ بچے کے لیے امامت کی گنجائش نہیں ہے اور قیام لیل میں لیث بن سعد، یحییٰ بن سعید الانصاری، ابن جریج، مجاہد، سفیان ثوری، ابراہیم نخعی کے آثار بھی اسی موقف کی تائید میں آئے ہیں بلکہ عمر بن عبدالعزیز کا وہ مکتوب بھی نقل کیا ہے جس میں انہوں نے اپنے گورنر کو اس حرکت پر ڈانٹ پلائی ہے کہ اس نے نماز کے لیے اپنے بچے کو امام بنا دیا تھا لکھا ہے کہ :

قدمت غلاما لم تحتنكه السن ولم تدخله تلك
النية اماما للمسلمين فى صلاتهم
تم نے چھوٹے بچے کو امام بنا لیا۔

امام اعظم نے ان صاف اور واضح ہدایات کی روشنی میں اپنی خداداد فقاہت سے امامت کے اس ضابطہ عام کو جو سنت کی راہ سے آیا ہے اپنی جگہ سے نہ ہلنے دیا۔

یہ تو اس پر خالص مجتہدانہ نظر تھی جس سے سنت کے معارض ہونے کی وجہ سے حدیث پایہ مقبولیت حاصل نہ کر سکی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف یہی علت قادحہ ہے اور اس حدیث کی صحت بالکل ٹکسالی ہے۔

---

[1] رواہ الجماعۃ منتقی الاخبار ج ۳ ص ۱۹۴۔

محدثین نے اس کی صحت میں بھی کلام کیا ہے۔ الخطابی فرماتے ہیں کہ امام احمد فرماتے ہیں کہ عمرو بن سلمہ کا واقعہ ضعیف ہے اور حافظ ابن القیم نے بدائع الفوائد میں اس روایت کے بارے میں لکھا ہے فیہ رجل مجھول فھو غیر صحیح اس میں ایک مجہول راوی ہے لہذا روایت صحیح نہیں ہے۔ اور تو اور حافظ ابن حزم بھی ظاہریت کے باوجود یہاں بول پڑے کہ:

> اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کے معلوم ہو جانے کے بعد اس پر نکیر نہیں فرمائی تو ہم بچے کی امامت ضرور جائز کہتے لیکن ہمارے علم میں یہ نہیں آیا۔ اگر مان لیا جائے کہ عمرو بن سلمہ بھی اپنے والد کے ساتھ حضور کے پاس گئے تھے اور حضور اس وفد کو جب حکم دے رہے تھے تو یہ بھی موجود تھے۔ پھر بھی اس عمر کا آدمی نہ مامور ہے اور نہ مکلف ہے اس لیے عمر امامت کے لیے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ اس حکم کے مخاطب صرف مامورین ہیں[1]

اخبار آحاد کا توارث سے معارضہ

امام اعظم اخبار آحاد کو توارث کے پیمانے میں بھی تولتے ہیں اور ہر ایسی حدیث کو معلول قرار دیتے ہیں جو توارث کے خلاف ہو۔ اسی توارث کو السنۃ اور ما علیہ الجماعۃ کہتے ہیں اور اس موضوع پر امام اعظم کو دوسری صدی کے محدثین کی ہمنوائی بھی حاصل ہے چنانچہ مصر کے مشہور محدث و فقیہ لیث بن سعد نے امام مالک کے نام جو خط لکھا ہے اس میں امام موصوف نے اس معیار کو واضح طور پر پیش فرمایا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> جب کوئی ایسا مسئلہ سامنے آ جاتے جس پر مصر، شام، عراق میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے زمانہ ابوبکر و عمر و عثمان میں عمل کیا ہو اور اسی پر تا آخر حیات رہے ہوں تو ہماری ایسے مسئلے کے بارے میں رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کی ہرگز ہرگز

---

[1] المحلی ج ۴ ص ۲۱۸۔

اجازت نہ دی جائے گی کہ وہ اب کوئی ایسا کام کریں جو صحابہ و تابعین
میں ان کے اسلاف کے سرتا سر خلاف ہو[1]

امام مالک عمل اہل مدینہ کی حجیت کے جو قائل ہیں اس کا مبنیٰ بھی توارث ہے۔ حافظ ابن القیم اسی کو عمل مستمر کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی یہ قابل اتباع حجت ہے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر وہ اعلام میں فرماتے ہیں :

فہذا النقل وہذا العمل حجۃ یجب اتباعہا وسنۃ
متلقاۃ بالقبول علی الراس والعینین واذا ظفر العالم
بذالک قرت بہ عینہ واطمانت الیہ نفسہ

یہ نقل اور یہ عمل واجب الاتباع دلیل ہے اور ایک ایسی سنت
ہے جسے تلقی بالقبول حاصل ہے اگر ایسی کوئی دلیل مل جائے تو دل
کی ٹھنڈک اور اطمینان کا موجب ہے[2]

واضح رہے کہ اگرچہ حافظ ابن القیم نے عمل اہل مدینہ کی حجیت سے اختلاف کیا ہے جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں لیکن وہ زمانہ خلافت راشدہ میں اہل مدینہ کے عمل کی حجیت کے قائل ہیں۔ ہاں جب دور خلافت کے بعد صحابہ کی اکثریت مدینہ سے باہر چلی گئی ہے تو پھر وہ اہل حرمین کے عمل کی حجیت کو نہیں مانتے بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی بھی شہر میں صحابہ نے ڈیرا لگایا ہو اور وہاں صحابہ کا قائم کردہ جادۂ عمل استمرار کے ساتھ اُمت کو ورثہ میں ملا ہو تو اس میں اور اہل مدینہ کے عمل میں کوئی فرق نہیں ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

اگر کسی ایسے شہر والوں کا کہ جہاں صحابہ منتقل ہو گئے تھے وہاں صحابہ
کی تعلیم کے مطابق کوئی عمل مستمر چلا آتا ہے تو اس عمل میں اور اہل
مدینہ کے عمل میں کیا فرق ہے ،[3]

ان کو استمرار عمل اور توارث کی حد تک اختلاف نہیں ہے اختلاف کا مرکزی نقطہ مکان اور در و دیوار ہیں۔ توارث کو تو وہ اس حد تک طاقتور دلیل قرار دیتے ہیں کہ کتاب الروح میں ایک مقام پر تلقین میت فی القبر کے تذکرے میں ایک حدیث ضعیف لے کر آتے ہیں اور

---

[1] اعلام الموقعین ج ۳ ص ۲۹۰۔ [2] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۳۰۲۔ [3] اعلام الموقعین ج ۲ ص [illegible]

خود فرماتے ہیں کہ یہ اس موضوع پر ضعیف حدیث ہے مگر اس کے ساتھ جواز عمل کا پروانہ انہوں نے جس بنیاد پر دیا ہے وہ بھی تعامل اور توارث ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

فہذا الحدیث وان لم یثبت فاتصال العمل بہ فی سائر الامصار والاعصار من غیر انکار کاف فی العمل بہ [1]

حدیث اگرچہ ثابت نہیں لیکن اس کی پشت پر اتصال عمل کی طاقت ہے اس لیے عمل کے لیے کافی ہے۔

حافظ ابن عبدالبر نے الاستذکار میں امام مالک کے حوالے سے یہ تصریح کی ہے کہ :

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو مختلف حدیثیں آئیں اور ہمیں یہ معلوم ہو کہ حضرت ابوبکر نے اس پر عمل کیا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہو گی کہ جس روایت پر انہوں نے عمل کیا ہے وہ ہی صحیح اور مقبول ہے [2]

حافظ ابوبکر الخطیب بغدادی نے امام مالک کا ایک دوسرا بیان نقل کیا ہے :

اگر یہ حدیث معمول بہ ہوتی کہ امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر ہی نماز پڑھو تو اس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر و عمر و عثمان ضرور عمل کرتے۔ [3]

اسی سلسلے میں امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں جو ضابطہ لکھا ہے وہ بھی سن لیجیے :

جب دو حدیثیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف آئیں تو یہ دیکھا جائے گا کہ آپ کے صحابہ نے کس پر عمل کیا ہے [4]

امام عثمان دارمی محدث کے حوالے سے مشہور محدث امام بیہقی بیان کرتے ہیں کہ :

جب کسی موضوع پر احادیث مختلف ہوں اور راجح و مرجوح کا پتہ نہ ہو تو ہم یہ دیکھیں گے کہ خلفاء راشدین نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کس پر عمل کیا ہم اسی کو راجح قرار دیں گے جس

---

[1] کتاب الروح ص ۱۴ - [2] التعلیق المجد ص ۴۸ - [3] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۴۷

[4] سنن ابی داؤد -

پر خلفاء راشدین کا عمل ہے [1]

مشہور مجتہد اور اصولی امام حافظ ابو بکر الجصاص فرماتے ہیں کہ:

جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو ارشاد مروی ہوں اور ان
میں سے ایک پر سلف کا عمل ہو تو اسی کو ثابت کہا جائے گا جس
پر سلف کا عمل ہے [2]

دوسری صدی میں تعامل و توارث کی طاقت اس درجہ معلوم تھی کہ اس دور کے مصنفین اپنی کتابوں میں صرف ان حدیثوں کو اپناتے تھے جن کی پشت پر تعامل کی قوت ہوتی تھی چنانچہ قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں:

علیك من الحدیث ما تعرفه العامة [3]

الغرض امام اعظم ابو حنیفہ اخبار آحاد کے مقبول ہونے کے لیے تعامل کے ہمنوا ہونے کی شرط لگاتے تھے اور اسی معیار پر اخبار آحاد کو جانچتے تھے چنانچہ ایک سے زیادہ مسائل میں اسی معیار سے اخبار آحاد کو نا پایا گیا ہے نماز میں بسم اللہ آہستہ پڑھنی چاہیے یا بلند آواز سے - اس موضوع پر ایک سے زیادہ حدیثیں آئی ہیں۔ انس بن مالک کی صحیح مسلم کی حدیث بھی ابو حنیفہ کی مؤید ہے۔ محدثین نے اس حدیث کو معلل قرار دیا ہے اور متن میں علت ہونے کی مثال میں سب نے اس حدیث کو پیش کیا ہے چنانچہ الجزائری لکھتے ہیں:

نعلل قوم روایة اللفظ المذکور لما رأوا الاکثرین انما قالوا
فیه فکانوا یستفتحون --- الخ

کچھ لوگوں نے اس حدیث انس کو معلل قرار دیا ہے۔

اور صاحب دراسات اللبیب نے دعویٰ کیا ہے کہ

هذا حدیث البسملة قد علل روایة مسلم لسبع علل
بسملہ کی حدیث روایت مسلم میں سات علل موجود ہیں [4]

اگرچہ اس کا واضح اور شافی جواب حافظ ابن تیمیہ نے فتاویٰ میں دے دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس موضوع پر۔ حضرت انس کی حدیث میں کوئی اضطراب نہیں ہے سب کی سب

---

[1] فتح الباری جلد اول [2] احکام القرآن ج ۱ ص ۱۷ - [3] الرد علی سیر الاوزاعی - [4] دراسات اللبیب ص ۲۹۴ -

جیسے نماز کی ضرورت نہ ہو اور پھر اکابر صحابہ کے بارے میں کوئی مسلمان سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ خلاف پیغمبر پر مواظبت کریں۔[1]

اس موقعہ پر حافظ ابن تیمیہ بڑے پتے کی بات فرما گئے ہیں۔ اس کو نظر انداز کرنا بے انصافی ہے

امور وجودیہ یہی وہ امور ہیں جن کے نقل کرنے اور یاد رکھنے کا عادات اور ہمتیں اہتمام کرتی ہیں اور ان کا نقل کرنا شرعاً ضروری ہے۔ باقی رہا امور عدمی اور منفی چیزیں۔ تو ان کے نقل کی نہ چنداں ضرورت ہوتی ہے اور نہ عادۃً اس کا کوئی اہتمام ہوتا ہے۔ اگر پانچ نمازوں کے علاوہ چھٹی نماز کی کوئی حدیث پیش کرے یا رمضان کے روزوں کے علاوہ کسی روزے کی فرضیت کا دعویٰ کرے یا رکعات نماز یا فریضہ زکوٰۃ میں کوئی اکتشاف کرے تو ہم اس کو بلا ریب غلط اور جھوٹ کہیں گے اور دلیل ہمارے پاس اس کے سوا کچھ نہ ہوگی کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کا ہونا منقول ہوتا۔ منقول نہ ہونا اس کے نہ ہونے کی دلیل ہے۔ بس یہی بسم اللہ کو بلند آواز سے نہ پڑھنے کی دلیل ہے۔[2]

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھا کر اسی معیار سے رفع یدین کے موضوع پر اخبار آحاد کو ناپ لیجئے تکبیر تحریمہ کی حد تک تو رفع یدین کا مسئلہ امت میں اتفاقی ہے چنانچہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ

لم یختلفوا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یرفع یدیہ حین یفتتح الصلوٰۃ۔

تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین میں کوئی بھی اختلاف نہیں ہے۔

اگرچہ حافظ ابن حزم نے مطلق رفع یدین میں تواتر کا یہ کہہ کر دعویٰ کیا ہے جیسا کہ ان سے علامہ محمد معین سندھی نے دراسات اللبیب میں نقل کیا ہے کہ:

ان احادیث الرفع فی کل خفض ورفع متواترۃ توجب یقین العلم۔[3]

---

[1] نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۳۲۔ [2] فتاوی ابن تیمیہ ج ص ۰۰۔ [3] دراسات اللبیب ص ۱۹۰۔

لیکن جیسا کہ آپ پہلے سُن آئے ہیں کہ دوسرے علماء کرام کو ان کے اس فیصلہ سے اتفاق نہیں ہے ان کا کہنا ہے کہ صرف تکبیر افتتاح کے وقت رفع یدین متواتر ہے۔ چنانچہ علامہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے تنقیح الانظار میں، علامہ محمد بن اسماعیل نے توضیح الافکار میں اور حافظ زین الدین عراقی کی تصریحات اس موضوع پر آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ چونکہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین متواتر ہے اس لیے اس میں علماء کی کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ رفع یدین کے موضوع پر اگر اختلاف ہے تو تکبیر تحریمہ کے علاوہ دوسرے مواقع پر ہے۔ اس سلسلے کی سب سے زیادہ مشہور روایت حضرت عبداللہ بن عمر کی ہے۔ یہ روایت خود مواقع رفع یدین میں مختلف ہے چنانچہ حضرت ابن عمر کی روایت بطریق سالم میں تین مواقع پر تذکرہ ہے، تکبیر تحریمہ، عند الرکوع اور رکوع سے اُٹھتے وقت۔ اور بطریق نافع میں قعدۂ اولیٰ سے اُٹھتے وقت بھی رفع یدین مذکور ہے اور دونوں بخاری کی روایات ہیں۔ نیز طبرانی کی روایت میں ایک پانچواں رفع یدین سجدہ میں جاتے وقت بھی مذکور ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

وعند التکبیر حین یھوی ساجدا"

اور صاحب دراسات اللبیب نے ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے بین السجدتین رفع یدین کو حضرت انس، الحسن اور ابن سیرین کے حوالہ سے پیش کیا ہے اور علامہ ابن دقیق العید نے شرح العمدہ میں بین السجدتین رفع یدین کو قانونی قرار دیا ہے اور علامہ عراقی نے بھی محدثانہ نقطہ نظر سے اسے سراہا ہے وہ فرماتے ہیں۔

ھی مثبتۃ و ھی مقدمۃ علی النفی[1]

امام اعظم نے ان اخبار آحاد کو توارث سے معارض ہونے کی وجہ سے معلول قرار دیا اور ان تمام مواقع میں سے صرف اس رفع یدین کو اختیار فرمایا جو اسناداً متواتر ہے اور جسے توارث کی تائید حاصل ہے یعنی تکبیر تحریمہ کے وقت۔ انہوں نے ان روایات کا جس روشنی میں مطالعہ فرمایا وہ اُمت کا عمل متوارث ہے۔ کیونکہ کوفہ میں اصحاب امیر المومنین علی مرتضیٰ اور اصحاب عبداللہ بن مسعود رفع یدین نہ کرتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر نے کوفہ کی پوری آبادی کے بارے میں مشہور محدث محمد بن نصر مروزی کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا ہے کہ:

---

[1] دراسات اللبیب ص ۱۹۰۔

لا نعلم مصراً من الامصار ترکوا رفع الیدین باجماعھم
عند الخفض والرفع الا اھل الکوفۃ [1]

کوفہ کے سوا تمام شہروں میں ایسا کوئی شہر ہمیں معلوم نہیں جس کی آبادی نے بالاتفاق رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت رفع یدین چھوڑا ہو۔

اور یہی حال زمانہ امام مالک میں مدینہ طیبہ کا ہے۔ چنانچہ ابن رشد نے بدایہ میں اسی کو امام مالک کے روایتِ ترک کو اختیار کرنے کی بنیاد بتایا ہے وہ فرماتے ہیں :

ان السبب لروایۃ الترک عن مالک ھو عمل المدینۃ
اذ ذاک فھذا العدد العظیم لعلہ مبنی علی الترک [2]

امام مالک سے ترک رفع یدین کی روایت آنے کا سبب اہل مدینہ کا عمل ہے۔

مکہ میں رفع یدین عبداللہ بن الزبیر کے زمانے میں شروع ہوا اس سے قبل اہل مکہ کا عمل ترک رفع یدین ہے جیساکہ میمون مکی کے سوال ابن عباس اور اس انداز بیان سے کہ لم ار احداً یصنعہا ظاہر ہے۔

جب کوفہ، مدینہ اور مکہ کے فقہاء اس پر عمل کر رہے ہیں تو یہ تعامل اور توارث نہیں تو اور کیا ہے؟ بس اسی پیمانے پر احادیث رفع یدین کو امام اعظم نے ناپ کر صرف تکبیر تحریمہ والے رفع یدین کو اختیار فرمالیا اور باقی کو خلاف اولیٰ قرار دیا۔ واضح رہے کہ رفع یدین میں اختلاف جواز اور عدم جواز میں نہیں ہے بلکہ جیساکہ ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں، حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ اور فتاویٰ میں اور حافظ ابن القیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے صرف اولویت اور عدم اولویت میں ہے۔

بہر حال امام اعظم اخبار آحاد کو توارث اور تعامل کی ترازو میں تولتے ہیں۔ حافظ ابن رجب حنبلی نے اسے ائمہ فقہاء اور محدثین کا فیصلہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ فضل علم السلف علی الخلف میں رقمطراز ہیں۔

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۲۶۰۔ [2] بدایۃ المجتہد لابن رشد۔

فاما الائمۃ و فقہاء اہل الحدیث فانہم یتبعون
الحدیث الصحیح حیث کان اذا کان معمولا بہ عند الصحابۃ
و من بعدھم و عند طائفۃ منہم فاما ما اتفق علی
ترکہ فلا یجوز العمل بہ لانہم ما ترکوہ الا علی علم
انہ لا یعمل بہ۔

ائمہ مجتہدین اور فقہاء محدثین حدیث صحیح کی پیروی کرتے ہیں بشرطیکہ
وہ صحابہ اور تابعین میں معمول بہ ہو یا ان میں سے کسی گروہ کے
نزدیک اگر حدیث ایسی ہو جس کے چھوڑنے پر وہ متفق ہو چکے
تو اس پر عمل جائز نہیں ہے کیونکہ انہوں نے بہر حال یہ جان کر
ہی چھوڑا ہے کہ یہ نا قابل عمل ہے۔[1]

امام ترمذی نے سنن میں اسی کو اپنایا ہے ترمذی کا مطالعہ کیجئے وہ قدم قدم پر ہر موضوع
پر حدیث لکھتے ہیں اور پھر اس کی تائید میں اُمت کا عمل یہ کہہ کر پیش فرماتے ہیں و العمل
علی ھذا عند اھل العلم۔ اس سے ان کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ اس حدیث کو
صحابہ و تابعین کی عملی تائید حاصل ہے اس لیے یہ صحیح ہے اور یہ ترمذی کی خصوصیت نہیں
بلکہ تمام اہل علم کا مسلک یہی ہے سکہ بند ظاہریہ کو چھوڑ کر سب یہی کہتے ہیں علامہ محمد معین
سندھی نے نہ معلوم کس دلیل کی قوت سے یہ دعویٰ کیا ہے۔

لیس احد من المحدثین یلتفت فی صحۃ الحدیث و حسنہ
الی اشتراط اخذ اھل العلم لہ

محدثین میں سے کوئی بھی حدیث کی صحت یا حسن ہیں یہ شرط نہیں
لگاتا کہ اسے اہل علم کی عملی تائید حاصل ہو۔[2]

اس کے بعد خود ہی انہوں نے محسوس کر لیا کہ امام ترمذی کا سنن میں طرز عمل یہی ہے۔
اولاً امام ترمذی کے عمل کے لیے تاویل کا جامہ تلاش کرنا شروع کیا۔ جب تاویل چست نہ بیٹھی
اور بات بنانے کے باوجود نہ بنی تو یہ کہہ کر طرح دے گئے کہ

---

[1] التعقیبات علی الدراسات ص ۲۶۳ [2] دراسات اللبیب ص ۲۶۲۔

وان کان الترمذی یری ذالک فھو مما اختص بہ علی
خلاف جماھیر العلماء[1]

پتہ نہیں وہ جماہیر علماء کون سے ہیں جو اس موضوع پر امام ترمذی کے مخالف ہیں۔ امام مالک کی تصریح خطیب بغدادی اور ابن عبدالبر کی زبانی ابوداؤد صاحب سنن کی سنن میں، محدث عثمان الدارمی کا بیان امام بیہقی کی معرفت، حافظ ابن حجر عسقلانی کا فتح الباری میں بیان، حافظ ابن رجب کا وضاحتی نوٹ اور حافظ ابوبکر الجصاص رازی کا اعلان آپ پہلے اس موضوع پر پڑھ چکے ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث ازالۃ الخفاء میں فرماتے ہیں:

اتفاق سلف و توارث ایشاں اصل عظیم است در فقہ

دراصل یہ بات جس ذہنی تحفظ کے ساتھ کہی گئی ہے وہ کچھ اور ہے اگر وہ واضح ہو کر سامنے آجاتے تو راہ کی ساری مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔

اعمال واقوال صحابہ کا اسلام میں مقام

اصل بات یہ ہے کہ محدثین اور فقہاء کے یہاں اعمال واقوال اور فتاوی صحابہ سب حجت ہیں ان کو وہ قبول کرتے ہیں۔ ان میں اس موضوع پر دو رائیں نہیں ہیں۔ اگر کچھ اختلاف ہے تو وہ انداز قبول میں ہے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں:

اگر مجھے کتاب وسنت میں کوئی مسئلہ نہیں ملتا تو میں اقوال صحابہ پر عمل کرتا ہوں اور جس کا قول چاہتا ہوں لے لیتا ہوں اور جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ان کے اقوال سے تجاوز کرکے کسی اور کا قول لوں[2]

امام مالک تو صحابہ کے اعمال واقوال کو سنت کا درجہ دیتے ہیں وہ فتوی صحابی اور حدیث کے مابین موازنہ کرتے تھے چونکہ ان اکابر کے یہاں صحابہ کے اعمال واقوال کا یہ وزن ہے اس لیے ان کے یہاں احادیث کی صحت اور مختلف حدیثوں میں ترجیح کا معیار بھی یہی ہے صرف شیعہ کو اس سے اختلاف ہے وہ صحابہ کے اعمال واقوال کو قابل احتجاج قرار نہیں دیتے

---

[1] دراسات اللبیب ص ۲۷۷۔ [2] الانتقاء ص ۱۴۲۔

ہیں۔ حافظ ابن القیم نے جمہور کے مذہب کو ۴۶ دلائل سے ثابت کیا ہے اور بلاشبہ وہ دلائل قوی اور مؤثر ہیں۔ لیکن یہاں ان کی تفصیل موجب طوالت ہوگی[1] ہاں آخری دور میں علامہ شوکانی نے اپنی کتاب ارشاد الفحول میں محدثین و فقہاء کے اس مسلک پر تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اقوال صحابہ حجت نہیں ہیں وہ فرماتے ہیں:

> حق یہ ہے کہ قول صحابی حجت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو اُمت کے لیے مبعوث نہیں فرمایا ہے اور ہمارا رسُول ایک ہے، کتاب ایک ہے اور جمیع اُمت اتباع کتاب و سنّت پر مامور ہے پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ کے دین میں بغیر کتاب اللہ اور سنت رسُول اللہ کے یہ قول حجت ہے تو وہ دین میں ایسی بات کہتا ہے جو ثابت نہیں اور شریعت اسلامیہ میں ایسی شرع ایجاد کرتا ہے جس کی پیروی کا اللہ نے حکم نہیں دیا ہے اور ایسا کہنا بہت بڑی بات ہے لہذا اللہ کے سوا کسی ایک یا چند بندوں کے بارے میں یہ حکم لگانا کہ اس کا یا ان کا قول مسلمانوں پر حجت ہے اور اس پر عمل واجب ہے غلط ہے[2]

ظاہر ہے کہ اس ذہنی تخلیق کے بعد اخبار آحاد کو اعمال صحابہ میں تولنے اور جانچنے کی گنجائش کب گوارا ہوسکتی ہے۔ سندھ کے مشہور عالم محمد معین نے اسی بنا پر لکھ دیا ہے کہ

> و یترك عمل الصحابة الثابت عنهم بالحديث الضعيف
> صحابہ سے ثابت شدہ اعمال کو حدیث ضعیف کی وجہ سے بھی چھوڑ دیا جائے گا۔[3]

اور تقلید کی تردید کے جوش میں یہاں تک فرما گئے کہ

---

[1] اس سلسلے میں حافظ ابن القیم کی اعلام الموقعین کی جلد چہارم از ص ۱۲۰ تا ۱۵۲ کا مطالعہ مفید ہے اس میں بے حد مفید علمی جواہر پارے ہیں۔ [2] ارشاد الفحول الی تحقیق الحق فی علم الاصول ص ۲۱۴۔
[3] دراسات اللبیب ص ۸۶۔

التمسك بآثار الصحابة عند وجدان المرفوع الصحيح
علی خلافه تمسك ضعيف

جب حدیث مرفوع موجود ہو تو آثار صحابہ کو اختیار کرنا ایک غلط
استدلال ہے[1]

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ اسلام کا سارا علمی سرمایہ روایت و اسناد کی پنی تلی ترازو کے ذریعے صرف حدیث مرفوع کی صورت میں اُمت کو ملا ہے حالانکہ صورت معاملہ یہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ جسے ہم سنت کہتے ہیں وہ صحابی کی محسوس اور مرئی زندگی کے ذریعے آئی ہے انہوں نے ہر سنی ہوئی حدیث کو نہ روایت کیا ہے اور نہ اس کا اہتمام کیا ہے۔ اس موقعہ پر حافظ ابن القیم مفید بات فرماتے ہیں :

> یہ حقیقت ہے کہ صحابہ کرام نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر سنی ہوئی حدیث کو روایت نہیں کیا سوچیے حضرت ابوبکر الصدیق اور حضرت فاروق اعظم اور دوسرے کبار صحابہ نے جو کچھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ۲۳ سالہ حیات نبوت میں سنا ہوگا اس کو کچھ بھی اس سے نسبت ہے جو حدیثوں کی مقدار ان سے مروی ہے حضرت ابوبکر سے صرف سو حدیثیں مروی ہیں۔ دراں حالیکہ حضرت ابوبکر وفات تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے حضور انور کی کوئی بات بھی ان سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت سے حضرت ابوبکر کو شرف حضوری اور آپ کے قول و فعل کا علم رہا۔ آپ کی سیرت و کردار کا ہر پہلو ان کی نظر کے سامنے تھا۔ اُمت میں سب سے زیادہ حضور انور سے ابوبکر ہی واقف تھے۔ یہی حال دوسرے کبار صحابہ کا ہے یعنی جو کچھ انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا یا جو آپ کے حالات مشاہدہ کیے تھے ان کے مقابلے میں ان کی

---

[1] دراسات اللبیب ص ۲۹۳۔

مرویات کی تعداد بہت کم ہے اور اگر یہ اپنے مشاہدات اور مسموعات کو
روایت کرتے تو ان کی روایات کی تعداد حضرت ابوہریرہ سے
کہیں زیادہ ہوتی [1]

ان بزرگوں سے روایات کم آنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ سنت چونکہ صحابہ کی عملی زندگی میں موجود تھی اس لیے اس کا کوئی داعیہ ہی نہ تھا۔ اور یہ عملی زندگی ان سے منتقل ہو کر تابعین میں آئی ہے اور تابعین میں اس کا داعیہ پیدا ہوا۔

ذرا اس پہلو پر غور فرمایئے کہ ایک طرف اُمت کا عمل ہے اور دوسری طرف راوی کی شہادت ہے۔ اُمت کو یقیناً عصمت حاصل ہے لیکن راوی کی روایت کو عصمت نہیں بلکہ صرف اصطلاحی صحت کا مقام دیا گیا ہے۔ یہ مان لینا ہے کہ راوی کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا یا حافظہ غلط ہو گیا لیکن یہ کہ خیر القرون میں پوری اُمت پیغمبر کے خلاف جمع ہو گئی ہو ناممکن ہے یہ تواتر عمل ہے اور اس کے خلاف جب بھی ایک شخص کی روایت چیلنج بن کر آئے گی اس کی صحت مقدوح ہو جائے گی۔

یہ ارشاد نبوت کو رد کرنا نہیں بلکہ ارشاد ہی کے ثبوت کا ایک مستحکم اور محتاط معیار ہے۔

اخبار آحاد میں مفاہمت اور امام اعظمؒ

اللہ سبحانہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے

ثم جعلنٰک علیٰ شریعۃ من الامر فاتبعہا ولا تتبع
اھواء الذین لا یعلمون

پھر ہم نے تم کو الامر کی صاف راہ پر لگایا ہے اسی کی پیروی کیجئے
اور بے علم لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے۔

شریعۃ من الامر کے معنے ہیں امر کی راہ۔ امر یا امور کا واحد ہے اور یا اوامر کا۔ اگر امور کا واحد ہے تو مقصود یہ ہے کہ آپ کو زندگی کے حقائق کو پورا کرنے کی راہ اللہ نے بتا دی ہے اور اگر اوامر کا واحد ہے تو مطلب یہ ہے کہ آئینی اور قانونی اقدار کی راہ پر ہم نے تم کو

---

[1] اعلام الموقعین ج ۴ ص ۲۴۸۔

بتا دیا ہے۔ شریعۃ کے معنے راہ کے آتے ہیں دونوں صورتوں میں آیت کا مدلول یہ ہے کہ
سلام کی شریعت صاف اور واضح ہے اس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ علامہ شاطبی فرماتے
ین الشریعۃ لا تعارض فیہا البتۃ لیکن چونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریعی
ندگی کی پوری تاریخ ہم تک شہور وسنین کی تعیین اور ایام کی ترتیب سے نہیں پہنچی اور
وکچھ صحابہ کے ذریعے پہنچی اس میں بھی بعد کو راویوں نے روایت بالمعنے کی ہے اس لیے
ہماری نگاہ میں تعارض محسوس ہوتا ہے اور تعارض کا حاصل یہ ہے کہ

ان یاتی حدیثان متضادان فی المعنی ظاہراً

اس تضاد کو دور کرنے کا موضوع اہم ترین موضوع ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے
ہوتا ہے کہ یہ کام صرف محدثین کا نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ فقیہ ہو۔ چنانچہ
حافظ ابوبکر حازمی فرماتے ہیں:

ذالک من وظیفۃ الفقہاء لان قصدہم اثبات
الاحکام ومجال نظرہم فی ذالک متسع

یہ فقہاء کا کام ہے کیونکہ حدیث میں ان کا مطمح نظر احکام ثابت
کرنا ہوتا ہے اور اس موضوع پر ان کی فکری جولانیاں وسیع ہیں [1]

اور امام نووی فرماتے ہیں:

انما یکمل لہ الائمۃ الجامعون بین الفقہ والحدیث
والاصولیون الغواصون علی المعانی

یہ کام زیبا ہے ان ائمہ کے لیے جن میں حدیث وفقہ کی شان
جامعیت پائی جاتی ہے اور وہ اصولیین جو معانی کی گہرائی
میں اترے ہیں [2]

حافظ سخاوی کے حوالہ سے حافظ محمد بن ابراہیم رقمطراز ہیں:

ہذا فن تکلم فیہ الائمۃ الجامعون بین الفقہ
والحدیث وقواعدہ مقررۃ فی اصول الفقہ

---

[1] شروط الائمۃ الخمسہ ص ۲۷۔ [2] التقریب ص ۴۱۲

اس موضوع پر ان اماموں نے لب کشائی فرمائی ہے جو حدیث و فقہ کے جامع ہیں اور اس کے قواعد اصول فقہ میں مقرر ہیں [۱]

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کام اہم ہونے کے ساتھ بے حد نزاکت بھی رکھتا ہے اس کی نزاکت یہ ہے کہ یہ ایک کام نہیں بلکہ اس میں بیک وقت متعدد کاموں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اور مختلف احادیث میں مفاہمت کرانی پڑتی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو شریعت کے سارے احکام باہم ٹکرا جائیں اور شرعی و قانونی اقدار کی کوئی مستقل حیثیت نہ رہے۔ حافظ ابن حزم نے اس سلسلے میں جس فراخدلی کا یہ فرما کر مظاہرہ کیا ہے کہ

اذا تعارض الحدیثان — ففرض علی مسلم استعمال کل ذالک

اگر دو حدیثوں میں تعارض ہو تو ہر مسلم کا فرض یہ ہے کہ سب پر ہی عمل کرے [۲]

یقیناً ایک منفرد زندگی کے لیے آزادی کی حد تک یہ ایک خوبی کی بات ہے لیکن تشریع جب اجتماعی زندگی میں نظم کی مضبوطی، عمل کی پختگی اور توازن اور فکر کی استقامت قائم کرنا چاہے تو ان کی خوبیوں سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے اس فراخدلانہ آزادی کے ساتھ یہاں حد بندی کا کوئی خط خود زندگی کا ایک اہم تقاضا ہے جو ان تمام کی پوری پوری ضمانت دے سکے۔ آئین و قانون کے تمام احکام ان ہی حد بندیوں کے خطوط سے بنتے اور ابھرتے ہیں یہ خطوط جونہی ہٹنے لگتے ہیں۔ نظام قانون کی پوری عمارت ہل جاتی ہے۔ بلاشبہ ہر حدیث پر عمل کرنے کی آزادی کا پروانہ ایک بہت بڑی فراخدلی ہے لیکن حیاتِ اجتماعی میں یہی آزادی ہوائے نفس سے ہمدوش ہو کر بے راہ روی کے نام سے پکاری جاتی ہے ماننا پڑے گا کہ معاملہ صرف اتنا ہی نہیں ہے جتنا ایک منفرد زندگی کے دائرہ کار کی حد تک حافظ ابن حزم نے سوچا ہے بلکہ یہاں زندگی کے حقائق کے تقاضے کچھ اور بھی ہیں کسی ایک گوشہ ہی کو سامنے رکھ کر نہ سوچنا چاہیے دوسرے گوشوں کی بھی خبر رکھنی ضروری ہے۔ یقیناً اگر ہمیں اخبار آحاد میں آئین و قانون کی اقدار کو بچانے کے لیے کبھی مفاہمت کرنی پڑتی ہے تو کبھی دو حدیثوں میں راجح و مرجوح قرار دینا پڑتا ہے۔ اور

۱؎ تفصیل منہاج ۲ ص ۱۲۱ - ۱۴۲ - ۲؎ احکام الاحکام ص ۱۵۱ -

ں کے ساتھ ہی اگر ہماری نظر تاریخ احکام پر ہے اور ہمیں کسی طریق سے دونوں میں سے
ں کا پہلے ہونا اور دوسرے کا بعد میں ہونا معلوم ہو گیا ہے تو ایک کو کالعدم قرار دینا
تا ہے اور اس کے لیے ہمیں نبوت کی جانب سے نسخ کی صراحت کا انتظار ضروری نہیں ہے
افسوس ہے کہ علامہ معین سندھی نے دراسات میں اتنی موٹی سی بات کو یہ کہہ کر پیچیدہ
دیا کہ

لیس نسخ الحدیث بالحدیث فان ذالک لا یتحقق لا بصریح
النسخ المرفوع الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

یہ حدیث کا حدیث سے نسخ نہیں ہے کیونکہ نسخ کے ثابت ہونے
کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحۃً نسخ ثابت ہونا چاہیے[1]

گویا موصوف نے یہ فرض کر لیا ہے کہ حدیث کے نام پر جو تاریخ سنت محدثین کی روایات
مدون ہوئی وہ پوری کی پوری تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتب و مدون ہوئی ہے حالانکہ
ت معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ حضور انور کی پوری ۲۳ سالہ زندگی میں سنت کی یہ
خ کیف ما اتفق اُمت کو ملی ہے اور وہ بھی صحابہ سے راویوں نے سن سن کر اپنے الفاظ
حدثین تک پہنچائی ہے اور ہر محدث حافظ تو ضرور ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے
جو کچھ کہہ رہا ہے وہ اس کے مغز سخن کو سمجھ کر ہی کہہ رہا ہے۔ مشہور محدث محمد بن المثنیٰ
حدیث یاد تھی۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی الی عنزۃ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عنزہ (نیزہ) کو سترہ بنا کر نماز پڑھی۔

لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ محمد بن المثنیٰ جو ائمہ ستہ حدیث کے شیوخ میں
ہیں یعنی امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ کے
ہیں اور جن کا تعلق قبیلہ عنزہ سے ہے وہ اس حدیث کا یہ مطلب سمجھتے رہے
ل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ عنزہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے اور
مط مطلب کے سہارے وہ اپنے عنزی ہونے پر ناز کرتے تھے اور کہتے تھے۔

---

[1] دراسات اللبیب ص ۱۱۶۔

نحن قوم لنا شرف نحن من عنزة صلی الینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ہماری قوم کو شرف حاصل ہے کہ ہم قبیلہ عنزہ سے ہیں ہماری طرف رسول اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی ہے [1]

امام حاکم نے اسی حدیث میں ایک اور راوی کی کہانی بتائی ہے کہ وہ اس میں عنزہ کو شاۃ (بکری) کے معنے میں سمجھتا تھا اور روایت بالمعنے اس طرح کرتا تھا کہ

صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی شاۃ [2]

ان حالات میں کون دعوی کر سکتا ہے کہ جب تک نسخ کی صراحت نہ ہو نسخ کا فیصلہ نہ ہو سکتا۔ زندگی کے تقاضوں اور قانونی ضروریات کو نظر انداز کر کے محض جذباتی نعرہ لگا اور کہنا کہ تعارض کے وقت ہی دو حدیثوں میں سے ایک کو منسوخ کہنا شریعت کے مقابلہ میں بے باکانہ جرأت ہے نعرے کی حد تک تو درست ہے لیکن حقائق اور واقعات کی دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ خود محدثین نے اس کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے البتہ اس بارے علماء کے افکار مختلف ہیں کہ ان تینوں مفاہمت، ترجیح اور نسخ میں سے آحاد میں تعارض کے وقت کس کا پلڑا بھاری ہے لیکن اس قدر مشترک پر سب ہی متفق ہیں کہ روایتی اسنادی حیثیت سے اگر دونوں حدیثیں ایک جیسی ہوں اور تاریخ احکام کے فیصلے ان کی تقدیم و تاخیر کا پتہ ہو یا خیر القرون میں اُمت نے کسی ایک کو عملاً اپنا لیا تو پھر ایک کالعدم اور دوسری کو معمول بہ قرار دیا جائے گا۔ ایسا ممکن نہ ہو تو مفاہمت اور ترجیح سے کام لیا جائے گا۔ مفاہمت یہ ہے کہ دو حدیثوں میں ہم آہنگی اس طرح پیدا کی جائے کہ دونوں زندگی کے حقائق کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ مفاہمت قانون کی ایک بنیادی ضرورت ہے اخبار آحاد میں تشریعی زندگی بڑا مفاہمت ہی کا کام ہے۔ حافظ ابن حجر نے ایک سے زائد مقامات پر تصریح کی ہے کہ اہمال حدیث سے جمع بین الحدیثین زیادہ بہتر ہے۔ امام حاکم نے مفاہمت ہی کو عموم فائدہ کا حامل قرار دیا ہے۔ حافظ ابو جعفر طحاوی نے شرح معانی الآثار میں ایک مقام پر اسی سلسلے میں یہ ضابطہ لکھا ہے:

---

[1] تقریب ص ۲۸۶۔ [2] تدریب الراوی ص ۳۸۶۔

اولی الاشیاء اذا روی حدیثان عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاحتملا الاتفاق واحتملا لتضاد ان تحملھما علی الاتفاق۔

اچھا یہی ہے کہ دو حدیثوں میں باہم مفاہمت کرائی جاتے[1]

حضرت مولانا عبدالحی نے علامہ ابن امیر الحاج کے حوالہ سے نقل کیا ہے

الجمع متعین عند الامکان اذا دار الامر بینہ و بین اھدار العمل باحدھما بالکلیۃ۔

جب صورتِ حال یہ ہوجاتے کہ مفاہمت ہو ورنہ دونوں میں سے ایک ہاتھ سے جائے گی تو مفاہمت ضروری ہے[2]

مفاہمت کے موضوع پر امام اعظم کی ذہانت اور فطانت کو سب نے سراہا ہے احکام تو احکام غیر احکام سے متعلق احادیث میں مفاہمت کے لیے بھی امام اعظم کی ذات گرامی محدثین کے یہاں استدلالی ہے۔

دنیا میں اسلام کے رونما ہونے کے بعد اسلام کی دعوت کو قبول کرنے کا سب سے پہلے شرف کسے حاصل ہوا ہے؟ یہ سیرت و تاریخ کا اہم مبحث ہے اور اختلاف روایات کی وجہ سے فقہاء مدینہ میں بھی اس میں اختلاف رہا ہے اور دور کبار تابعین میں فقہاء کوفہ بھی اس میں مختلف ہیں۔ کئی حدیثوں میں اولین مسلم حضرت علی کو بتایا گیا ہے۔ ترمذی اور نسائی کی حدیثوں میں یہ شرف حضرت ابوبکر کو دیا گیا ہے کچھ روایات میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا نام آیا ہے اور بعض حدیثوں میں حضرت زید بن حارثہ کو سب سے پہلا مسلمان ظاہر کیا گیا ہے محدثین نے ان روایات میں روایتی نقطہ نظر سے تحلیل کا کام کیا اور خالص محدثانہ نظر سے ان پر بحث فرمائی۔ لیکن حافظ ابن کثیر نے اس ساری داستان کو لکھنے کے بعد جو فیصلہ کن بات فرمائی ہے وہ یہ نہیں کہ ان روایات میں راجح کون ہے؟ بلکہ اس موقعہ پر انہوں نے حضرت امام اعظم کا وہ فیصلہ لکھ دیا ہے جس میں امام صاحب نے ان حدیثوں میں مفاہمت کا فارمولا پیش کیا ہے:

---

[1] شرح معانی الآثار ج ۲ ص ۳۵۸ [2] الاجوبۃ الفاضلۃ ص ۱۹۷۔

فقد اجاب ابو حنیفة بالجمع بین هذہ الاقوال ان اول
من اسلم من الرجال الاحرار ابوبکر و من النساء خدیجة
و من الموالی زید بن حارثہ و من الغلمان علی بن ابی طالب۔
ابو حنیفہ نے ان سب میں اس طرح ہم آہنگی پیدا کر دی ہے کہ
آزاد مردوں میں سے اسلام لانے کی اوّلیت کا شرف ابوبکرؓ کو
عورتوں میں سے خدیجۃ الکبریٰ کو غلاموں میں سے زید کو اور لڑکوں
میں سے علی مرتضیٰ کو حاصل ہوا ہے [1]

احکام اور فقہ پر مشتمل حدیثوں میں مفاہمت کی مثالوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ یہاں ہم تطویل سے بچتے ہوئے اپنے ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے چند مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ مفاہمت کے موضوع پر امام اعظم کی خداداد ذہانت کا صحیح انداز ہو سکے۔

رفع یدین کی صورت

نماز میں تکبیر تحریمہ کے وقت جو رفع یدین کیا جاتا ہے اس کی کیفیت میں روایات مختلف آئی ہیں حافظ ابن حجر نے تلخیص میں ساری روایات سمیٹ دی ہیں اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں بھی سب روایات کو یکجا کیا ہے ان میں ابن عمر کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرفع یدیہ حذو
منکبیہ اذا افتتح الصلاۃ۔
حضور انور نماز کے آغاز میں مونڈھوں تک ہاتھ اٹھاتے تھے۔

ابوداؤد، نسائی میں وائل کی روایت میں یہ الفاظ ہیں

یرفع ابھامیہ الی شحمۃ اذنیہ
آپ اپنے دونوں انگوٹھوں کو کانوں کی پاپڑیوں تک اٹھاتے تھے

احمد اور مسلم میں ابوقلابہ کی روایت میں ہے

کان اذا کبر رفع یدیہ حتی یحاذی بھما اذنیہ

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۹۔

ہاتھ اٹھاتے وقت دونوں ہاتھ کانوں کے سامنے ہوتے تھے۔
حذو منکبین یعنی مونڈھوں تک ہاتھ اٹھانے کو علامہ ابن دقیق العید نے امام شافعی کا مذہب
قرار دیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں ھو اختیار الشافعی فی منتھی الرفع اور مذکورہ بالا حدیثوں میں
سے محدثانہ نقطہ نظر سے بلحاظ قوت سند حدیث ابن عمر کو راجح قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

ورجح مذھب الشافعی بقوۃ السند لحدیث ابن عمر[1]
امام شافعی کے مذہب کو قوت سند کی وجہ سے راجح قرار دیا ہے

علامہ شوکانی نے بھی قوت سند ہی کو پیش نظر رکھ کر ان حدیثوں کے ساتھ ترجیح کا معاملہ فرمایا
ہے لیکن امام اعظم نے تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کی جو صورت بتائی ہے کہ

یرفع یدیہ حتی یحاذی بابھامیہ شحمتی اذنیہ
رفع یدین اس طرح کرے کہ ہاتھ کے دونوں انگوٹھے کانوں کی پاپڑیوں
کے آمنے سامنے ہو جائیں[2]

تو اس سے انہوں نے ان حدیثوں کے بارے میں اپنا موقف واضح فرما دیا کہ وہ اس موضوع
پر آئی ہوئی حدیثوں میں ترجیح کو نہیں بلکہ مفاہمت کو اپناتے ہیں اور مفاہمت اس طرح
ہے کہ جب انگوٹھے کان کی پاپڑی سے متصل ہوں گے تو ہاتھ کا بالائی حصہ اگر کانوں کے
سامنے ہوگا تو ہاتھ کا زیریں حصہ مونڈھوں کے محاذ میں ہوگا اور اس طرح ابن عمر، وائل
اور مالک بن الحویرث کی تمام مختلف روایات میں مفاہمت ہو گئی۔ اور یہ میری ذاتی رائے
نہیں ہدایہ کے مشہور شارح حافظ ابن الہمام نے بھی رفع یدین کی اس صورت سے یہی نتیجہ
نکالا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

ولا معارضۃ فان محاذاۃ الشحمتین بالابھامین تسوغ
حکایۃ محاذاۃ الیدین بالمنکبین والاذنین
ان حدیثوں میں کوئی معارضہ نہیں ہے کیونکہ جب انگوٹھے پاپڑیوں کے
سامنے ہوں گے تو ہاتھ کانوں اور مونڈھوں کے سامنے آجائیں گے[3]

روایات میں ہر راوی کا بیان اپنی اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ

---

[1] احکام الاحکام ج ۱ ص ۲۵۲۔ [2] ہدایہ ج ۱ ص ۸۲۔ [3] فتح القدیر ج ۱ ص ۱۹۸۔

اٹھانے کی مدت قلیل ہوتی ہے۔ ہر شخص کی اضطراری نگاہ ہاتھ کے جس حصہ پر پڑی اسی کا ر
میں اظہار کر دیا۔

ہبہ کی واپسی پر احادیث میں مفاہمت

حدیث میں آتا ہے

عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العائد
فی ھبتہ کالکلب یعود الی قیئہ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہبہ دے کر واپس لینے والا
ایسا ہے جیسے کتا کہ قے کر کے چاٹے[1]

یہ حدیث امام بخاری اپنی صحیح میں دو طریق سے لائے ہیں ایک بحوالہ سعید بن المسیب او
دوسری بحوالہ عکرمہ۔ دونوں حدیثوں کی وجہ سے امام بخاری نے پوری قطعیت کے ساتھ
فیصلہ فرمایا ہے کہ

لا یحل لاحد ان یرجع فی ھبتہ وصدقتہ
ہبہ اور صدقہ کو دے کر واپس لینا کسی کے لیے روا نہیں ہے

لیکن اس کے ساتھ ایک دوسری حدیث بھی آتی ہے

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یرجع فی ھبتہ
الا الوالد من ولدہ۔

ہبہ کر کے واپسی کا حق کسی کو نہیں ہے سوائے والد کے کہ وہ اپنے
لڑکے سے دے کر واپس لے سکتا ہے۔

جن لوگوں نے حدیث ابن عباس کی صرف ظاہری سطح کو دیکھا کہ ہبہ دے کر واپس ل
کو کتے کے قے چاٹنے سے تشبیہہ دی ہے انہوں نے ہبہ کی واپسی کے لیے حرمت کا فیص
کر دیا اس لیے کہ قے ناپاک ہوتی ہے اور ناپاک چیز حرام ہے لیکن امام اعظم نے یہاں صر
یہ نہیں دیکھا کہ قے سے تشبیہہ دی ہے بلکہ تشبیہہ پر بڑے گہرے غور کے بعد بتایا کہ

---

[1] فتح القدیر ج ۷ ص ۱۹۸۔

واقعی ناپاک ہوتی ہے اور ناپاک چیز حرام بھی ہوتی ہے لیکن حضور انور نے جو تشبیہ دی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہبہ دے کر واپس لینے والا اس شخص کی طرح ہے جو قے کر کے چاٹے۔ بلکہ تشبیہ یہ ہے کہ ہبہ دے کر واپس لینے والا اس کتے کی طرح ہے جو قے کر کے چاٹے۔ ظاہر ہے کہ قے حرام ہے لیکن کتے کے لیے حرام نہیں ہے کیونکہ حلت و حرمت کا تعلق تکلیف سے ہے اور کتا مکلف نہیں ہے اس لیے حدیث کی روح یہ ہے کہ ہبہ کی واپسی مکروہ اور خلاف اولیٰ ہوگی۔ اگر تشبیہ آدمی سے دی جاتی تو پھر ہبہ کی واپسی حرام ہوتی کیونکہ آدمی کے لیے حرام ہے اور یہ کراہت بھی اس وقت ہے جب کہ موہوب لہ ہبہ کنندہ کا قریبی رشتہ دار نہ ہو اور موہوب لہ کی جانب سے ہبہ کنندہ کو اس کا کوئی بدل نہ ملا ہو اور یہ دونوں شرطیں امام اعظم نے دو حدیثوں کو پیش نظر رکھ کر مقرر فرمائی ہیں۔ رشتہ داری کی شرط نسائی میں آئے ہوئے استثناء " الا الوالد من ولدہ " سے اخذ کی ہے اور بدل کی شرط دار قطنی اور ابن ابی شیبہ کی اس روایت سے لی ہے۔

الرجل احق بھبتہ مالم یثب منھا

ہبہ کا حقدار ہے جب تک اس کا بدل نہ پاتے

دیکھ لیجئے کس شاندار طریق سے تمام ارشادات کے درمیان مفاہمت ہوگئی۔

ارشادِ نبوّت اور صحابی کے فتویٰ میں مفاہمت

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا شرب الکلب فی اناء احدکم فلیغسلہ سبعاً۔

تمہارے برتن میں جب کتا منہ ڈال دے تو چاہیے کہ اسے سات بار دھو ڈالے۔

سنن دار قطنی میں حضرت ابوہریرہ کی دوسری حدیث ہے

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یغسل الاناء من ولوغ الکلب ثلاثاً او خمساً او سبعاً۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کتے کے برتن میں منہ

ڈالنے سے برتن کو تین یا پانچ یا سات بار دھویا جائے[1]

حافظ زیلعی نے ابن عدی کے حوالہ سے ایک اور حدیث حضرت ابوہریرہ کی یہ بھی لکھی ہے

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا ولغ الکلب فی اناء احدکم فلیہرقہ ولیغسلہ ثلاث مرات[2]

برتن میں کتا منہ ڈال جائے تو اسے گرا کر تین بار دھو ڈ۔

نیز دارقطنی نے اپنی سنن میں حضرت ابوہریرہ کا یہ فتویٰ بھی روایت کیا ہے

اذا ولغ الکلب فی الاناء فاھرقہ ثم اغسلہ ثلاث مرات۔[3]

جب کتا برتن میں منہ ڈال دے تو اسے اٹھاؤ اور اسے تین بار دھوؤ

اور دارقطنی نے حضرت ابوہریرہ کا یہ عمل بھی نقل کیا ہے کہ

انہ کان اذا ولغ الکلب فی الاناء اھرقہ وغسلہ ثلاث مرات[4]

برتن میں کتا منہ ڈال دے تو اسے گرا کر تین بار دھوتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ سے ان کا فتویٰ اور ان کا عمل نقل کرنے والے مشہور محدث و مجتہد حضرت عطاء بن ابی رباح ہیں۔

محدثین نے اپنے روایتی مذاق کے مطابق ان حدیثوں کی اسنادی بحث کو سامنے رکھ کر سبع کی روایت کو راجح قرار دیا اور تین کی مرفوع روایت میں عبدالوہاب پر تفرد کا الزام لگا دیا اور ابن عدی کی روایت میں احمد حسین کرابیسی پر یہ تنقید کی کہ ان کا تعلق لفظیہ سے ہے یعنی ان لوگوں میں سے ہیں جو کہتے ہیں کہ قرآن کے جو الفاظ ہمارے منہ سے نکلتے ہیں وہ مخلوق ہیں۔ یہ کلامی مسائل میں امام بخاری کے اساتذہ میں سے ہیں اور جو جرح ان پر کی گئی ہے بالکل اسی قسم کی جرح امام بخاری پر بھی کی گئی ہے چنانچہ حافظ ابوالولید حسان بن محمد نیشاپوری ۳۴۹ھ نے جب صحیح بخاری پر مستخرج لکھنے کا ارادہ کیا تو ان کے والد بزرگوار نے ان کو ہدایت کی۔

علیک بکتاب مسلم فانہ اکثر برکۃ فان البخاری کان ینسب الی اللفظ

---

[1] نصب الرایہ ج ۱ ص ۱۳۱۔ [2]، [3]، [4] نصب الرایہ ج ۱ ص ۱۳۱۔

تمہیں مسلم کی کتاب پر مستخرج لکھنا چاہیے کہ اس میں برکت زیادہ ہے کیونکہ
امام بخاری مسئلہ لفظ کی طرف منسوب ہیں۔
چنانچہ سعادت مند بیٹے نے باپ کی تعمیل ارشاد میں بجائے صحیح بخاری کے صحیح مسلم پر مستخرج تصنیف کیا۔ حافظ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں ابوالولید مذکور کے ترجمہ میں اس واقعہ کو نقل کر کے بڑے افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ

ومسلم ایضاً منسوب الی اللفظ والمسئلۃ مشکلۃ[1]

اور خود امام مسلم پر بھی لفظیہ ہونے کا الزام معاملہ پیچیدہ ہے

اسی فکری اختلاف کی وجہ سے امام مسلم نے امام ذہلی سے جو تمام ارباب صحاح کے فن حدیث میں استاد ہیں اور جن کو تلفظ بالقرآن کے مسئلہ پر امام بخاری سے سخت اختلاف ہو گیا تھا۔ اپنی صحیح میں روایت نہیں لی اور صرف امام ذہلی سے ہی نہیں بلکہ اس اختلاف کے نتیجے میں امام مسلم نے امام بخاری سے بھی اپنی صحیح میں روایت نہیں لی۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں :

قد انصف مسلم فلم یحدث فی کتابہ عن ھذا ولا عن ھذا

امام مسلم نے اچھا کیا ہے کہ اپنی کتاب میں کسی سے بھی روایت نہیں لی۔

بہر حال یہ علمی چشمک کوئی جرح کی بات نہیں ہے اور اس بنیاد پر نہ امام بخاری مجروح ہو سکتے ہیں اور نہ کرابیسی۔ اس لیے حضرت ابوہریرہ کی روایت کو شک کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ امام بیہقی نے اس روایت کو یہ کہہ کر "درخود اعتنا" نہیں سمجھا کہ

اس حدیث کا راوی عبدالملک تمام عطا بن ابی رباح کے "تلامذہ میں
اور پھر عطا" تمام ابوہریرہ کے اصحاب میں سے اس روایت میں
منفرد ہیں حالانکہ عطا" اور ابوہریرہ کے تلامذہ سب کے سب
سات بار کی روایت کرتے ہیں۔ اس لیے عبدالملک کی روایت
مخالف ثقات ہونے کی وجہ سے قابل پذیرائی نہیں ہے[2]

لیکن امام بیہقی کی یہ معذرت اصول محدثین کے مطابق کچھ جچتی نہیں ہے جب کہ جمہور

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ص ۱۸۴۔ [2] نصب الرایہ ج ۱ ص ۱۲۱۔

محدثین اور فقہا لکھتے ہیں کہ ثقہ کا تفرد قابلِ قبول ہے۔ عبد الملک بن ابی سلیمان مسلم کے راویوں میں سے ہے۔ اور تمام اربابِ سنن نے ان سے روایت لی ہے۔ ابن سعد، ابن عمار موصلی، الثوری، ترمذی، احمد، یحییٰ اور نسائی ان کی ثقاہت اور امانت کے گن گا رہے ہیں۔ امام شعبہ نے اگر ان سے حدیث شفعہ نہیں لی ہے تو خطیب کہتے ہیں کہ یہ ان کی بے انصافی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

شعبہ سے اس معاملہ میں بڑی بے انصافی ہوئی ہے کہ انھوں نے محمد بن عبد اللہ کی حدیث کو اپنایا اور عبد الملک بن ابی سلیمان کی حدیث کو چھوڑ دیا کیونکہ محمد بن عبد اللہ کی روایت کے غیر معتبر ہونے میں تمام محدثین متفق ہیں۔ برخلاف عبد الملک کے کہ ان کے بارے میں سب محدثین رطب اللسان ہیں اور ان کا تذکار حسن درجۂ شہرت کو پہنچا ہوا ہے[1]

آئیے امام شعبہ کا وہ بیان بھی سن لیجئے جس کے سہارے امام بیہقی نے عبد الملک بن ابی سلیمان کو متروک اور نا قابلِ احتجاج قرار دیا ہے۔

حدثنا نعیم بن حماد قال سمعت وکیعا یقول سمعت شعبة یقول لو روی عبد الملک بن ابی سلیمان حدیثا آخر مثل حدیث الشفعة طرحت حدیثه

شعبہ کہتے ہیں کہ اگر عبد الملک حدیث شفعہ کے علاوہ کوئی اور حدیث روایت کرے گا تو میں اس کی حدیث کو پھینک دوں گا۔

کیوں؟ اس کی وجہ کوئی نہیں بتائی گئی۔ شعبہ کا یہ بیان ہمیں نعیم کی وساطت سے ملا ہے نعیم کی خود شخصیت کیا ہے؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ابو داؤد کہتے ہیں کہ نعیم کی بیس حدیثیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے۔ امام نسائی ان کو ضعیف کہتے ہیں۔ ازدی لکھتے ہیں کہ:

کان نعیم یضع الحدیث فی تقویة السنة وحکایات مزورة فی ثلب نعمان کلها کذب۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۹۵۔

نعیم سنت کی تقویت کے لیے حدیثیں گھڑتے تھے اور امام ابوحنیفہ
کے مثالب میں جھوٹی حکایتیں بناتے تھے[1]

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ نعیم نے یہاں بھی اپنے گمان کے مطابق سات کے عدد کی سنت کو قوی سے قوی تر بنانے کے لیے مدافعانہ کارروائی کی ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ زہین کی روایات کو مجروح کر دیا جائے اور اس کے لیے بیچارے عبدالملک کو نشانہ بنالیا ورنہ عبدالملک کو جملہ محدثین کی حمایت حاصل ہے اور سب کے نزدیک ثقہ ہیں ان کا قصور صرف یہ ہے کہ:

كان من احفظ اهل الكوفة۔[2]

یہ کوفہ کے حفاظِ حدیث میں سے ہیں۔

امام سفیان ثوری کہتے ہیں کہ حفاظِ حدیث لوگوں میں یحییٰ بن سعید، عبدالملک بن ابی سلیمان، اور اسماعیل بن خالد ہیں۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ امام شعبہ عبدالملک کے حافظہ پر بے حد حیران ہوتے تھے۔ امام یحییٰ بن معین سے عبدالملک کی حدیث شفعہ کے بارے میں جب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ لوگوں نے اس حدیث پر گرفت کی ہے لیکن عبدالملک ثقہ ہیں، صدوق ہیں۔ ان جیسوں پر گرفت نہیں ہو سکتی۔

بہرحال محدثین نے اپنے نقطہ نظر سے ان حدیثوں میں ردّ و قبول کا رویہ اختیار کیا اور حافظ ابن القیم اور علامہ شوکانی کو تو یہاں تک جوش آگیا کہ

حدیث جب کسی موضوع پر صحیح ہو جائے اور اس کے مقابلے میں
کوئی دوسری حدیث صحیح نہ ہو ہمارا فرض یہی ہے کہ حدیث کو اپنائیں
اور اس کے مخالف ہر چیز کو چھوڑ دیں اور ہم حدیث کو کسی کی بھی
مخالفت کی وجہ سے نہ چھوڑیں گے خواہ وہ کوئی ہو راوی یا غیر راوی[3]

اور علامہ شوکانی رقمطراز ہیں

کسی حال میں بھی کسی کا قول حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں
حجت نہیں ہے[4]

---

[1] میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۲۹۔ [2] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۲۳۔ [3] اعلام الموقعین۔ [4] نیل الاوطار ص ۳

اتباعِ سنت کی حد تک تو یہ بات بالکل درست ہے اور واقعی ایک مسلمان کے ایمان کا تقاضا یہی ہے لیکن یہاں یہ بحث بے محل ہے کیونکہ یہاں حضور کے ارشاد کا مقابلہ حضور کے ارشاد سے ہے ایک وہ ارشاد ہے جو بخاری میں بحوالہ ابوہریرہ ہے اور دوسرا ابوہریرہ ہی کے حوالہ سے سنن دار قطنی میں ہے اور اس کی تائید میں حضرت ابوہریرہ کا عمل اور ان کا فتویٰ یہی ہے ذرا سوچنے کی بات ہے کہ اگر حضرت ابوہریرہ کا یہ بیان درست ہے کہ حضور نے فرمایا کہ برتن میں کتا منہ ڈال دے تو تین مرتبہ دھویا جائے اور درست نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہے جبکہ روایت صحیح ہے اور اس پر ابوہریرہ کا عمل بھی ہے اور عمل کے ساتھ اسی پر ابوہریرہ فتویٰ بھی دیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ حضرت ابوہریرہ کا یہ بیان بھی درست ہے کہ حضور نے فرمایا کہ برتن کو سات بار دھویا جائے تو یہ سوال یہاں بےحد اہم ہے کہ اس سات بار والے بیان کے ہوتے ہوئے حضرت ابوہریرہ نے تین پر کیونکر عمل کیا اور اس پر فتویٰ کیوں دیا۔ حضرت ابوہریرہ کے لیے تو ارشادِ نبوت کا درجہ قطعیت میں آیتِ قرآنی کا ہے کیونکہ وہ خود حضور سے سنتے ہیں۔ یہاں حافظ ابوجعفر طحاوی کی یہ بات جی کو لگتی ہے کہ اگر حضرت ابوہریرہ نے اس ارشاد کو عمداً ترک کیا ہے تو اس سے ان کی عدالت پر حرف آتا ہے اور ان کی روایات کا سرمایہ ہی ناقابلِ قبول ہو جاتا ہے اس لیے ہم ایسا سوچنے کو بھی تیار نہیں ہیں۔

امام اعظم ابوحنیفہ نے ان سب حدیثوں کو اور حضرت ابوہریرہ کے فتویٰ اور عمل کو پیشِ نظر رکھ کر ان میں ایسی مفاہمت کر دی ہے کہ جس سے ان حدیثوں میں سے کوئی حدیث بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلی ہے فرماتے ہیں کہ تین بار دھونا واجب ہے اور سات کا عدد استحباب کے لیے ہے۔ چنانچہ امام طحاوی فرماتے ہیں:

یحمل مازاد علی الثلاث فی المرفوع والموقوف علی ابی ھریرۃ کلیھما علی الاستحباب لورود التثلیث فی المرفوع والموقوف عنہ[1]

تین سے زیادہ عدد کو مستحب قرار دیا جائے گا۔

اور حافظ ابن الہمام فرماتے ہیں

طھارۃ الاناء الذی ولغ فیہ الکلب لاتتوقف علی السبع

---

[1] معانی الآثار۔

بل تثبت قبل السبع بالثلاث علی ما ذکرہ الحاکم فی اشارتہ
وھو ایضا مقتضی نقلھم عن ابی حنیفۃ وجوبھا و
استحباب الاربعۃ بعدھا۔

جس برتن میں کتے نے منہ ڈال دیا اس کا پاک ہونا سات پر موقوف
نہیں بلکہ وہ سات سے پہلے ہی تین سے پاک ہو چکا ہے جیسا کہ
حاکم نے بتایا ہے اور یہی تقاضا ہے امام ابوحنیفہ کی اس روایت کا
جس میں کہا ہے کہ تین بار دھونا واجب ہے اور سات بار مستحب ہے[1]

اس طرح دونوں ارشاد نبوت میں اور راوی حدیث کے فتویٰ میں مفاہمت ہو گئی اور تمام حدیثوں
پر اپنی اپنی جگہ عمل ہو گیا۔

جماعت کھڑی ہوجانے پر سنتیں پڑھنا

اسی قسم کی ایک اور مثال سنیے۔ صحیح مسلم میں حدیث آتی ہے:

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا اقیمت
الصلوۃ فلا صلوۃ الا المکتوبۃ۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نماز قائم کر دی جاتے تو فرض
نماز کے سوا کوئی نماز نہیں ہے۔

اگرچہ حفاظ حدیث کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ یا
حضرت ابوہریرہ کا فتویٰ ہے۔ حضرت امام شافعی نے کتاب الام میں اسے حضرت ابوہریرہ کا
فتویٰ ہی قرار دیا ہے۔ ابن ابی شیبہ کا مصنف میں اور طحاوی کا شرح معانی الآثار میں یہی
میلان ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ شاید اسی اختلاف کی بنا پر امام بخاری نے اس
کو اپنی صحیح میں روایت نہیں کی ہے۔

ظاہر بینوں نے اس حدیث سے یہی سمجھا ہے کہ اگر جماعت کھڑی ہو جاتے اور کوئی شخص
سنتیں وغیرہ پڑھ رہا ہو تو اس کی سنتیں کالعدم اور باطل ہوں گی۔ چنانچہ علامہ شوکانی نے ظاہریہ

---

[1] التحریر ج ۳ ص ۸۲۔

کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

واهل الظاهر انها لا تنعقد صلاة تطوع فی وقت اقامة الفریضة۔[1]

ظاہریہ کی رائے میں فرض قائم ہونے پر کوئی نفل نماز نہیں ہوتی ہے
اور علامہ شوکانی کا اپنا میلان بھی یہی ہے وهذا القول هو الظاهر یہی قول ظاہر ہے
لیکن اس حدیث میں نماز کے باطل ہونے کے لیے دُور کا بھی اشارہ نہیں ہے۔ نہ یہ اس کا منطوق ہے نہ مدلول اور نہ مفہوم۔ اسی بنا پر ائمہ اربعہ میں سے یہ کسی کا مذہب نہیں ہے۔ جمہور کا مذہب یہی ہے کہ توڑے نہیں بلکہ پوری کرے۔ امام اعظم کا مذہب صحیح یہ ہے کہ اگر ایک رکعت ملنے کی توقع ہو تو سنتیں مسجد سے باہر ادا کرے۔ رکعت کی قید اس حدیث سے لی گئی ہے۔

من ادرك الركعة من الصلاة فقد ادرك الصلاة

(رواہ ابوداؤد)

جس نے نماز کی ایک رکعت پالی اس نے نماز پالی
امام اعظم کا یہ مذہب امام محمد نے جامع صغیر میں ان الفاظ میں لکھا ہے۔

رجل انتهى الى الامام فی الفجر ولم یصل رکعتی الفجر فخشی ان یفوته رکعة ویدرك الاخرى فانه یصلی رکعتی الفجر عند باب المسجد فان خشی فوتهما دخل مع الامام ولم یصل رکعتی الفجر۔

اگر کوئی نماز میں آیا اور اس نے صبح کی سنتیں نہ پڑھی ہوں اسے ایک رکعت جانے کا اندیشہ ہو اور دوسری رکعت ملنے کی اُمید ہو تو اسے اجازت ہے کہ مسجد کے دروازے کے پاس صبح کی سنتیں پڑھ لے اگر دونوں رکعتوں کے نہ ملنے کا اندیشہ ہو تو جماعت میں شامل ہو جائے اور سنتیں نہ پڑھے۔

---

[1] نیل الاوطار ج ۳ ص ۷۲

صاحبِ ہدایہ نے باب ادراک الفریضہ میں اسی کو مختار قرار دیا ہے اور علامہ کاشانی نے امام صاحب کا یہی مذہب بتایا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ کی اس روایت میں نماز کھڑی ہونے پر نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے اور اس کا منشا دوسری حدیثوں کو ملا کر صبح کی سنتوں اور فرض کو بلا فصل ادائیگی پر نکیر کرنا ہے۔ کیونکہ دوسری حدیثوں میں جماعت کھڑی ہونے سے پہلے جماعت کھڑی ہونے پر اور جماعت سے فراغت کے بعد سب پر نکیر آتی ہے اور ہر جگہ منشا یہی ہے کہ صبح کی سنتوں اور فرضوں میں اتصال نہ کیا جائے بلکہ انفصال ہونا چاہیے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو مختلف پیرایوں میں پیش کیا ہے سب کی روح یہ ہے کہ نمازِ فجر کی سنتوں اور فرضوں میں فصل کیا جائے بلکہ ایک موقعہ پر آپ نے یہ بات صراحۃً فرمائی ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مر بعبد اللہ بن مالک وهو منتصب يصلي ثمه قبل صلوٰۃ الصبح فقال لا تجعلوا هذه الصلوٰة كصلوٰة قبل الظهر و بعدها واجعلوا بينهما فصلاً۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم عبد اللہ بن مالک کے پاس سے گزرے وہ نمازِ صبح سے پہلے سنتیں پڑھ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا اس نماز کو ظہر کی نماز سے پہلے اور بعد کی سنتوں جیسا نہ بناؤ ان میں کچھ فاصلہ کرو۔

اس میں وضاحت کے ساتھ بتا دیا کہ مقصود یہ ہے کہ صبح کے فرضوں اور سنتوں میں فاصلہ ہو۔ چاہے یہ فاصلہ زمانی ہو یا مکانی۔ حضور ہی کے دوسرے اعمال سے مکانی فصل معلوم ہوتا ہے اس لیے امام اعظم نے اس ارشاد کی روح سمجھ کر بتایا کہ سنتوں کی ادائیگی اگر مسجد میں نہیں بلکہ مسجد سے باہر ہو جائے تو منشاء نبوت پورا ہو جائے گا۔ تصریح کے بعد قیاس آرائی کا کوئی محل نہیں ہے۔ جب فرما رہے ہیں کہ ان میں فاصلہ کرو تو منطوق کلام اسی کو قرار دیا جائے ورنہ نماز سے قبل سنتوں پر ٹوکنے کے معنے کوئی نہیں ہیں۔ اور نماز کے بعد بھی سنتوں کی ادائیگی پر نکیر آتی ہے۔ چنانچہ ترمذی میں ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے نماز کھڑی ہو گئی میں نے جماعت سے صبح کی نماز ادا کی حضور انور اٹھے تو مجھے نماز پڑھتے

دیکھا۔ فرمایا فیس چھوڑ! کیا دو نمازیں یک دم میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں نے صبح کی دو سنتیں نہیں پڑھی ہیں۔ فرمایا پھر بھی نہیں۔

نماز ہوتے ہوئے بھی سنتیں پڑھنے پر نکیر آئی ہے چنانچہ صحیح بخاری میں ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو جماعت کھڑی ہو جانے پر نماز کی سنتیں پڑھتے دیکھا۔ جب حضور نماز سے فارغ ہو گئے تو حضور انور نے اس سے فرمایا کیا صبح کی نماز چار رکعتیں ہیں؟ کیا نماز صبح چار رکعت ہے؟

ایک اور حدیث صحیح مسلم میں ہے:

ایک شخص مسجد میں آیا حضور انور صبح کی نماز پڑھ رہے تھے۔ اس نے دو رکعت مسجد میں پڑھی پھر جماعت میں مل گیا۔ حضور نے سلام پھیر کر فرمایا دونوں نمازوں میں کون سی نماز کو تو نے قرار دیا ہے؟ انفرادی کو یا جماعت والی کو؟

ان تمام ارشادات کو غور سے پڑھیے اور بار بار پڑھیے آپ کے سامنے یہ بات منقح ہو کر آجائے گی کہ منشاء نبوت سنتوں اور فرضوں کو ایک ہی جگہ ملا کر پڑھنے سے روکنا ہے اور مقصد یہ ہے کہ دونوں میں فصل کیا جائے۔ چنانچہ حافظ ابو جعفر طحاوی فرماتے ہیں:

اس حدیث نے بتایا ہے کہ حضور انور نے ابن بحینہ کے لیے جس بات پر ناگواری کا اظہار فرمایا ہے وہ سنتوں کو ایک ہی جگہ پر فرضوں سے بغیر کسی فصل کے ملانا ہے[1]

اس لیے اگر صبح کی سنتوں کی ادائیگی مسجد سے باہر کر کے مکان کا فصل کر دیا جائے تو منشاء نبوت پورا ہو جاتا ہے صرف امام اعظم ہی نے نہیں بلکہ خود صحابہ کرام نے بھی حضور انور کا یہی منشاء سمجھا ہے کیونکہ اذا اقیمت الصلوٰۃ میں اذا اگر ظرفیہ ہے تو دو ہی صورتیں ہیں ظرف زمان یا ظرف مکان۔ ظاہر ہے کہ ظرف مکان ہے۔ مکان ہونے کی صورت میں اس کی

---

[1] معانی الآثار ج ا ص ۱۱۸۔

حد بندی ناگزیر ہے موٹی سے موٹی عقل والا بھی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ لاہور کی شاہی مسجد میں صبح کی جماعت کھڑی ہونے پر تمام روئے زمین پر ہر قسم کی نماز حرام ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو پھر اذا اقیمت الصلوٰۃ میں مکان سے مکان نماز یعنی مسجد ہی مراد ہے اس لیے نماز کھڑی ہو جانے پر مسجد میں سنتیں نہ پڑھنی چاہئیں۔ یہی امام ابوحنیفہ کا اصل مذہب ہے صحابہ کے عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ محمد بن کعب نے حضرت عبداللہ بن عمر کے بارے میں بتایا ہے:

خرج عبداللہ بن عمر من بیتہ فاقیمت صلوٰۃ الصبح فرکع رکعتین قبل ان یدخل المسجد و ھو فی الطریق ثم دخل المسجد فصلی الصبح مع الناس رکعتین۔

عبداللہ بن عمر گھر سے نکلے نماز صبح کھڑی ہو چکی تھی۔ آپ نے سنتیں مسجد میں داخل ہونے سے پہلے راستہ ہی میں ادا کیں بعد ازیں مسجد میں آئے اور جماعت سے نماز پڑھی۔[1]

یہ اور اس قسم کے ایک سے زیادہ آثار صحابہ آتے ہیں۔ امام ابوبکر بن شیبہ نے انیس صحابہ کے آثار پیش کئے ہیں جن سے بیرون مسجد صبح کی نماز کھڑی ہو جانے کے باوجود ادائے سنت کا پتہ چلتا ہے:۔

شاید آپ یہاں یہ خلش محسوس کریں کہ امام اعظم کو صبح کی سنتوں کی ادائیگی پر اس قدر اصرار کیوں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ اصرار بھی امام اعظم کا اپنا نہیں بلکہ براہ راست سراج رسالت منیر کا اصرار ہے۔

مسند احمد، ابوداؤد میں ارشاد ہے:

لا تدعوا رکعتی الفجر ولو طردتکم الخیل۔

صبح کی سنتیں نہ چھوڑو چاہے تمہیں گھوڑے روند ڈالیں۔

حضرت عائشہ نے حضور انور کے عمل کی جو تصویر پیش کی ہے وہ بھی سن لیجئے:

لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی شیئ من النوافل اشد تعاھدًا منہ علی رکعتی الفجر۔

---

[1] معانی الآثار ص ۲۱۸۔ ج ۱۔

نبوت کے اسی اصرار کی بنا پر امام اعظم فجر کی سنتوں کی ادائیگی کو جماعت کھڑی ہو جانے کے باوجود دو شرطوں کے ساتھ جائز بتاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ بیرونِ مسجد ہو۔ دوم یہ کہ دونوں رکعتوں کے جانے کا اندیشہ نہ ہو۔ اگر ایسا اندیشہ محسوس کرے تو جماعت میں شامل ہو جائے اور سنتوں کو طلوعِ آفتاب کے بعد پڑھے۔ صبح کی نماز کے بعد نہ پڑھے کیونکہ صبح کی نماز کے بعد حضورِ انور کا بتایا ہوا عام ضابطہ یہ ہے:

عن عمر بن الخطاب ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن الصلوٰۃ بعد الفجر حتی تطلع الشمس وبعد العصر حتی تغرب الشمس (متفق علیہ)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ فجر کے بعد طلوعِ آفتاب تک اور نمازِ عصر کے بعد غروبِ آفتاب تک نماز سے منع فرمایا ہے۔

صرف حضرت عمر ہی سے نہیں بلکہ التلخیص الجبیر میں حافظ عسقلانی نے بتایا ہے کہ صحابہ کی ایک بڑی جماعت نے یہ ضابطہ نقل کیا ہے۔ اربابِ ظواہر نے ترمذی کی ایک روایت میں اپنا خودساختہ مطلب ڈال کر اسے اس مشہور ضابطہ سے متصادم کر دیا۔

ترمذی میں قیس بن فہد کا یہ واقعہ منقول ہے:

خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاقیمت الصلوٰۃ فصلیت معہ الصبح ثم انصرف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فوجدنی اصلی فقال مھلا یا قیس اصلاتان معا قلت یا رسول اللہ انی لم اکن صلیت رکعتی الفجر قال فلا اذن۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے جماعت کھڑی ہو گئی میں نے آپ کے ساتھ نمازِ صبح ادا کی بعد ازیں حضور نے نماز سے فراغت کے بعد مجھے نماز پڑھتے پایا تو فرمایا اے قیس چھوڑ! کیا دو نمازیں اکٹھی؟ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے صبح کی دو سنتیں نہیں ادا کی تھیں فرمایا پھر بھی نہیں۔

اس حدیث میں فلا اذن کے معنے فلا باس اذن یعنی تب کوئی مضائقہ نہیں بتا کر اس

روایت کو پہلی روایت عمر کے معارض بنا دیا اور بطور خود صبح کی نماز کے بعد سنتیں پڑھنے کا پروانہ دے دیا۔ اور اس واقعہ ہی میں مہلاً یا قیس (چھوڑ اے قیس) کی گرفت سے ایسے بے خبر ہو گئے گویا یہ بات زبان نبوت نے فرمائی ہی نہیں۔ لیکن امام اعظم نے مہلاً یا قیس کے زور کی وجہ سے فلا اذن کے معنے فَلَا اِذْنَ اِذَنْ "تب بھی اجازت نہیں ہے" بتا کر مراد نبوت کو مقرر فرمایا اور اس طرح اس واقعہ کو دوسرے ارشادات کے ساتھ متصادم ہونے سے بچا لیا۔ اور فلا اذن کے معنے بھی امام اعظم نے صرف سیاق کلام کی مدد سے نہیں بلکہ حدیث ہی میں آمدہ دوسرے شواہد سے لیے ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم میں واقعہ آیا ہے کہ نعمان بن بشیر نے اپنے ایک لڑکے کو کچھ مال دے دیا۔ ان کی خواہش ہوئی کہ اس معاملہ میں حضور انور بھی گواہ ہو جائیں۔ نعمان حضور انور کی خدمت میں آئے۔ آپ نے دریافت کیا هل نحلت سائر ابنائك مثله، کیا تم نے اپنے سارے بیٹوں کو اسی طرح دیا ہے؟ بولے کہ نہیں۔ حضور نے فرمایا کہ فلا اذن۔ یہاں معنے صاف ہیں کہ پھر اجازت نہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔ ان شواہد کی روشنی میں امام اعظم نے صبح کی نماز کے بعد سنتوں کی ادائیگی سے منع فرمایا اور طلوع آفتاب کے بعد ان کی ادائیگی کو جائز قرار دیا۔ طلوع آفتاب کے بعد کے متعلق خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد بھی آیا ہے جو حاکم نے مستدرک میں، دارقطنی، بیہقی اور ترمذی نے اپنی اپنی کتابوں میں بحوالہ حضرت ابوہریرہ نقل کیا ہے۔

من لم يصل ركعتي الفجر فليصلهما بعد ما تطلع الشمس

جس شخص نے صبح کی سنتیں نہیں پڑھیں اسے چاہیے کہ آفتاب نکلنے پر پڑھ لے۔

اس طرح امام اعظم نے اس موضوع پر آئی ہوئی مختلف حدیثوں میں شاندار طریق پر مفاہمت کر دی کہ ایک ارشاد نبوت بھی امت کے عمل سے بیگانہ نہ رہا اور سب حدیثوں پر عمل ہو گیا۔

یہ چند مثالیں بطور مشتے از خروارے عرض کر دی گئی ہیں تاکہ ناظرین اندازہ کر سکیں کہ مختلف حدیثوں میں مفاہمت کے موضوع پر سیدنا ابوحنیفہ سے ملی ہوئی فقاہت کیا ہے؟

وجوہ ترجیح اور امام اعظم

اگر دو صحیح حدیثوں میں تعارض ہو اور ان میں باہم مفاہمت کی کوئی صورت نہ ہو تو ان میں ایک کو

راجح اور دوسری کو مرجوح قرار دیا جاتا ہے۔ ترجیح کی حقیقت یہ ہے کہ دو حدیثیں اگر صحت و قوت کے لحاظ سے یکساں اور ہم پلہ ہوں لیکن اپنے مضمون کے لحاظ سے باہم متعارض ہوں تو ان دونوں میں سے ایک کو دوسری کے مقابلہ میں کسی ایسے سہارے کے ذریعے جس میں خود مستقل طور پر حجت بننے کی صلاحیت نہ ہو راجح قرار دیا جاتا ہے۔ جن سہاروں کے ذریعے ترجیح کا عمل کیا جاتا ہے، محدثین کی اصطلاحی زبان میں ان کو وجوہ ترجیح کہتے ہیں۔ علماء نے ایک سے زیادہ وجوہ ترجیح کی نشاندہی کی ہے۔ علامہ حازمی نے دوسرے علماء کے بارے میں بتایا ہے کہ

قد اورد بعض ائمتنا فی باب الترجیحات نیفاً و اربعین وجهاً فی ترجیح احد الحدیثین علی الآخر۔

ہمارے بعض ائمہ نے وجوہ ترجیح چالیس سے زیادہ بتاتے ہیں۔[1]

خود علامہ حازمی نے کتاب الاعتبار میں جن وجوہ ترجیح کا پتہ دیا ہے ان کی تعداد پچاس ہے اور آخر میں یہ بھی تصریح کی ہے کہ

فهذا القدر کاف فی ذکر الترجیحات و ثم وجوه کثیرة اضربنا عن ذکرها کیلا یطول هذا المختصر۔

وجوہ ترجیح کی یہ مقدار کافی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ ہیں لیکن ہم نے طوالت کے اندیشہ سے ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔[2]

حافظ سیوطی نے وجوہ کثیرہ کے چہرۂ ابہام سے یہ کہہ کر نقاب ہٹا دی ہے کہ

و وصلها غیره الی اکثر من مائة کما استوفی ذالك العراقی فی نکتة۔

حازمی کے علاوہ اوروں نے اس تعداد کو ایک سو تک پہنچا دیا ہے جیسا کہ حافظ عراقی نے نکت علی ابن الصلاح میں اس کی تفصیل کی ہے۔[3]

علامہ جمال الدین قاسمی نے تمام وجوہ ترجیح کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے۔

جو شخص صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین کے حالات کا مطالعہ کرے گا وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ بزرگ اس پر متفق تھے اور ان کی

---

[1] شروط الائمۃ الخمسہ ص ۲۸ - [2] کتاب الاعتبار ص ۲۲ - [3] تدریب الراوی ص ۳۹۹ -

اس موضوع پر کبھی بھی دو رائیں نہیں ہوتی ہیں کہ راجح پر عمل کیا جائے
اور مرجوح کو چھوڑ دیا جائے۔ ترجیح کے طریقے بہت ہیں۔ لیکن
ترجیح کی بنیاد یہ ہے کہ وجہ ایسی ہو جو مسالک شرعیہ کے مطابق
اور مزاج نبوت کے موافق ہو۔ جس میں یہ چیز موجود ہو وہ وجہ معتبر
ہے۔ ترجیح کبھی بلحاظ اسناد، کبھی باعتبار متن، کبھی بحیثیت مدلول
اور کبھی کسی بیرونی چیز کی وجہ سے ہوتی ہے۔[1]

ان وجوہ ترجیح کا یہاں موقعہ نہیں ہے جو محدثین کرام نے قلم بند فرمائی ہیں اور جن کو فقہاء کرام نے اسلام کی قانون سازی کے مختلف مرحلوں پر استعمال کیا ہے۔

ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ اگر دو حدیثیں صحیح ہونے کے باوجود باہم متعارض ہو جائیں تو کیا ان میں سے کسی ایک کو اس بنا پر راجح قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس کے بیان کرنے والے علم و فکر اور فقہ و نظر کی دولت سے مالامال ہیں۔ اس حد تک سب متفق ہیں کہ راویوں میں فقاہت یقیناً وجہ ترجیح ہے چنانچہ امام حازمی رقمطراز ہیں۔

وجوہ ترجیح میں سے تیسویں وجہ یہ ہے کہ دو حدیثوں میں سے کسی
ایک کے بیان کرنے والے اگر حفظ و ضبط میں ہم پلّہ ہوں لیکن ان میں
سے ایک کے راوی فقہا ہوں تو فقہا کی روایت کو ترجیح ہوگی۔ علی
بن خشرم محدث کہتے ہیں کہ ہم سے امام وکیع نے کہا کہ ان دو سندوں
میں سے تمہیں کون سی سند پسند ہے؟ اعمش عن ابی وائل عن عبداللہ
یا سفیان عن منصور عن ابراہیم عن علقمہ عن عبداللہ۔ ہم نے جواباً عرض
کیا کہ ہمیں تو الاعمش عن ابی وائل عن عبداللہ کا سلسلہ سند زیادہ پسند
ہے۔ امام وکیع نے بتایا کہ اس سند میں اعمش اور ابو وائل شیوخ
حدیث ہیں۔ اور دوسری سند میں سفیان، منصور، ابراہیم اور علقمہ
فقہا ہیں اور وہ حدیث جو فقہا کی راہ سے آئے بلاشبہ اس حدیث
سے بہتر ہے جو محدثین کی وساطت سے آئے۔[2]

---

[1] قواعد التحدیث ص ۳۱۲-۳۱۳ [2] کتاب الاعتبار ص ۵، معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۱، الکفایہ ص ۴۱۲۔

علامہ ابو السعادات مجد الدین ابن الاثیر نے جامع الاصول میں اس موقعہ پر بڑے پتے کی بات لکھی ہے:

یہ سلسلۂ روایت فقہاء کی راہ سے عبداللہ بن مسعود تک رباعی ہے اور محدثین کی راہ سے ثنائی ہے یعنی فقہاء کے طریق میں عبداللہ تک چار راوی ہیں اور محدثین کے سلسلے میں صرف دو راوی ہیں۔ اس کے باوجود صرف راویوں کی فقاہت کی وجہ سے فقہاء کی روایت کو راجح قرار دیا گیا ہے۔[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دو حدیثوں میں تعارض ہو جائے اور بلحاظ سند دونوں قوی ہوں۔ لیکن ایک کے سلسلہ سند میں شیوخ حدیث ہوں اور دوسری فقہاء کی وساطت سے آرہی ہو تو خود ارباب حدیث کے نزدیک بھی فقہاء کی روایت کا پلڑا بھاری ہوگا۔ چاہے فقہاء کی روایت کے مقابلے میں محدثین کی روایت کو "علو" کا مقام بھی حاصل ہو۔ یعنی فقہاء کے سلسلے میں راویوں کی تعداد زیادہ اور محدثین کے طریق میں راویوں کی تعداد کم ہو۔ علامہ محمد معین سندھی نے اس مقام پر یہ کہہ کر کہ

فقه الرواة لا اثر له فى صحة المروى دانما مدارها على العدالة والضبط۔

راویوں کی فقاہت کا روایت کی صحت پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے روایت کا دارومدار تو راویوں کی عدالت وضبط پر ہے۔[2]

اختلاط سے کام لیا ہے۔ گفتگو روایت کی صحت میں نہیں ہے کیونکہ یہ مسئلہ اتفاقی ہے کہ روایت کی صحت کے لیے فقہ راوی شرط نہیں ہے۔ اس میں دو رائیں نہیں ہیں۔ گفتگو تو اس میں ہے کہ اگر دو صحیح روایتوں میں تعارض ہو جائے، دونوں روایتوں کے راویوں میں عدالت وضبط یکساں ہو اور ان میں باہم کسی طرح مفاہمت نہ ہو سکے تو کسے راجح قرار دیا جائے ظاہر ہے کہ محدثین فقہ راوی کو ترجیح میں سبب مؤثر قرار دیتے ہیں۔ آپ امام حازمی کی تصریح پڑھ چکے ہیں۔ حافظ سیوطی اور حافظ عراقی جیسے اساطین حدیث بھی امام حازمی کے ہم زبان ہیں چنانچہ حافظ جلال الدین السیوطی رقمطراز ہیں،

---

[1] جامع الاصول ج ۱ ص ۶۲۔ [2] دراسات اللبیب۔

ثالثها — اي من وجوه الترجيح — فقه الراوي سواء كان الحديث مروياً بالمعنى او باللفظ - لان الفقيه اذا سمع ما يمتنع حمله على ظاهره بحث عنه حتى يطلع على ما يزول به الاشكال-

وجوہ ترجیح میں سے تیسری وجہ فقہ راوی بھی ہے چاہے حدیث کی روایت باللفظ ہو یا بالمعنے ہو کیونکہ فقیہ جب کوئی ایسی بات سنتا ہے جسے ظاہر پر محمول کرنا دشوار ہو تو اس کے بارے میں بحث و تمحیص سے کام لیتا ہے تاآنکہ وہ ایسی چیز پر مطلع ہو جاتا ہے جس سے راہ کی مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔[1]

خطیب بغدادی لکھتے ہیں :

ويرجح بان يكون رواته فقهاء لان عناية الفقيه بما يتعلق من الاحكام ومثله من عناية غيره بذالك ۔

کسی حدیث کو اس کے راویوں کے فقیہ ہونے کی بنا پر ترجیح دی جائے گی کیونکہ فقہا کی مرکزی توجہ احکام پر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔[2]

بہرحال علامہ معین الدین سندھی نے یہ کہہ کر اپنے مخاطبوں کو ایک سنگین غلط فہمی میں ڈالنے کی کوشش ہے ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ روایت کی صحت کے لیے فقہ راوی کسی کے نزدیک بھی شرط نہیں ہے۔ فقہ راوی صحت کے لیے نہیں بلکہ صرف دو صحیح روایتوں میں ترجیح کا سبب ہے۔ ترجیح روایت اور صحت روایت دو الگ الگ موضوع ہیں ان کو باہم خلط ملط کرنا سنگین مغالطہ ہے بہرحال فقہ راوی کے ترجیح روایت کے لیے وجہ ہونے میں محدثین اور فقہا کا نقطہ نظر ایک ہے اور یہ ایک بے غبار حقیقت ہے۔ شیخ عبداللطیف سندھی کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے کہ

لا يرتاب احد في ان فقه الراوي مما يثبت به الترجيح

راوی کی فقاہت روایت کی ترجیح کے لیے مثبت ہے اور اس میں کوئی بھی شبہ نہیں ہے۔[3]

---

[1] تدریب الراوی ص ۳۹۹ [2] الکفایہ فی علوم الروایہ ص ۴۳۶ [3] ذب ذبابات الدراسات ج ۱ ص ۶۵ ۔

ہاں البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اگر دونوں روایتیں صحیح ہوں اور دونوں میں تعارض ہو اور دونوں میں ایک کے راوی فقہا ہوں اور دوسری متعدد طرق سے مروی ہو۔ تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ محدثین اور ارباب روایت کا موقف یہ ہے کہ کثیر الطرق روایت کو راجح قرار دیا جائے گا۔ چنانچہ امام حازمی ارقام فرماتے ہیں:

کسی حدیث کو راجح قرار دینے کے وجوہ میں سے ایک وجہ کثرت عدد ہے اس کا روایت پر خاص اثر ہوتا ہے اس طریق سے روایت کے بارے میں علم میں پختگی آتی ہے۔[1]

خطیب بغدادی فرماتے ہیں:

ویرجح بکثرۃ الرواۃ لاحد الخبرین[2]

لیکن اس موضوع پر امام اعظم کو محدثین سے اختلاف ہے ان کا کہنا ہے کہ ایسی دو روایتوں میں ترجیح اس روایت کو دی جائے گی جس کے بیان کرنے والے فقہا ہوں۔ چنانچہ رفع یدین کے موضوع پر انہوں نے امام اوزاعی سے مناظرے کے وقت اسی اصول کو اپنایا ہے۔ امام اوزاعی سے امام اعظم کا یہ مناظرہ امام موفق نے امام الحارثی کے حوالہ سے بسند متصل نقل کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں قاسم بن اصبغ کے ترجمہ میں امام حارثی کا ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے:

عالم ماوراء النھر و محدثہ الامام العلامہ ابو محمد عبداللہ بن یعقوب بن الحارث الحارثی البخاری الملقب بالاستاذ جامع مسند ابی حنیفہ۔[3]

امام حارثی نے اس واقعہ کی سند یہ لکھی ہے:

حدثنا محمد بن ابراھیم بن زیاد الرازی، حدثنا سلیمان بن الشاذ کوفی قال سمعت سفیان بن عیینۃ یقول اجتمع ابوحنیفۃ والاوزاعی بمکۃ۔

حافظ ابن الہمام نے فتح القدیر میں، علامہ اکمل الدین نے عنایہ میں، ملا علی قاری نے شرح نخبہ میں، الشیخ ابوالطیب سندھی نے ترمذی کے حاشیہ میں اور السید مرتضیٰ زبیدی نے عقود الجواہر المنیفہ میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ایسی معروف و مشہور داستان کے بارے میں

---

[1] کتاب الاعتبار ص ۹ ۔ [2] الکفایہ ص ۴۳۶ ۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ص ۸۵۲ ۔

اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ایسی معروف و مشہور داستان کے بارے میں راویوں کی معاصرانہ چشمک سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بے اصل ہونے کا دعویٰ کرنا فن کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ حیرت ہے کہ علامہ محمد معین سندھی نے اس قصہ کے معلق ہونے کا یہ کہہ کر دعویٰ کیا ہے :

ان ھذہ الحکایۃ عن سفیان بن عیینۃ معلقۃ ولم ار من اسندھا[1]

اور ساتھ ہی یہ چیلنج بھی دیا ہے :

ومن عندہ السند فلیات بہ

حالانکہ یہ واقعہ نہ تو غیر مسند ہے جیسا کہ آپ امام حارثی کی زبانی سن آتے ہیں کہ انہوں نے اپنے مسند میں اسے باسند لکھا ہے چنانچہ مولانا عبدالحی فرماتے ہیں :

فقد اسندھا ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن یعقوب بن الحارث الحارثی البخاری المعروف بالاستاذ تلمیذ ابی حفص الصغیر بن ابی حفص الکبیر تلمیذ الامام محمد بن الحسن فی مسندہ بقولہ حدثنا محمد بن ابراھیم بن زیاد ۔۔ الخ[2]

اور نہ معلق ہے جیسا کہ امام موفق نے لکھا ہے۔ آئیے اب اصل واقعہ گوش گزار فرمالیجئے :

سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ اور امام اوزاعی مکہ کے دارالحناطین میں جمع ہوتے۔ گفتگو کے دوران امام اوزاعی نے امام اعظم سے دریافت کیا آپ رکوع میں جاتے وقت اور اس سے اٹھتے وقت رفع یدین کیوں نہیں کرتے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ اس لیے کہ رفع یدین رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ امام اوزاعی نے فرمایا یہ کیونکر ہو سکتا ہے مجھے زہری نے بتایا، انہوں نے سالم سے اور سالم نے اپنے باپ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع کرتے وقت، رکوع کو

---

[1] دراسات اللبیب ص ۲۰۵ – [2] الاجوبۃ الفاضلہ ص ۲۱۴ –

جاتے اور اُٹھتے وقت رفع یدین کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہ نے جواب دیا مجھے حماد نے بتایا۔ انہوں نے ابراہیم سے سُنا ابراہیم نے علقمہ اور اسود سے سُنا اور انہوں نے عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف نماز شروع کرتے وقت رفع یدین کرتے تھے اور پھر اسے نہیں دہراتے تھے۔ امام اوزاعی نے پھر جواب میں کہا۔ میں آپ کو زہری، سالم اور ان کے والد ابن عمر کی روایت سناتا ہوں اور آپ مجھے حماد اور ابراہیم کی روایت سناتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ جواباً بولے حماد زہری سے زیادہ فقیہ تھے۔ ابراہیم سالم سے بڑھ کر عالم تھے اور اگر صحابی ہونے کا پاس نہ ہوتا تو میں یہ کہتا کہ علقمہ عبداللہ بن عمر سے زیادہ عالم فقہ تھے اور عبداللہ تو آخر عبداللہ ہیں [1]

عبداللہ سے مراد عبداللہ بن مسعود ہیں یعنی ان راویوں میں کوئی شخص بھی عبداللہ بن مسعود کا ہم پلہ نہیں ہے۔

حافظ ابن الہمام نے یہ واقعہ درج کرکے لکھا ہے کہ

رفع یدین کے موضوع پر آثارِ صحابہ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں بہت ہیں اور ان میں گفتگو بڑی طویل الذیل ہے خلاصہ کلام یہ ہے کہ دونوں رفع اور عدم رفع ثابت ہیں اور دونوں کے ثابت ہونے کی صورت میں باہم ترجیح کی ضرورت ہے کیونکہ تعارض موجود ہے۔ عدم رفع ہمارے نزدیک اس لیے راجح ہے کہ نماز اس موجودہ صورت میں مختلف احوال سے گزر کر آئی ہے اقوال اور رفع یدین کی جنس کے افعال ایک وقت میں نماز میں مباح تھے اور وہ منسوخ ہو چکے ہیں۔ اگر یہ حرکتیں بھی اسی درجے میں آجائیں تو کوئی بعید نہیں ہے۔ رفع یدین چونکہ وجودی حرکت کا

---

[1] الاجوبتہ الفاضلہ ص ۲۰۲۔

نام ہے اس لیے اس میں اس کا احتمال ہے برخلاف عدم رفع کے کہ
وہ ایک منفی چیز ہے اس میں اس احتمال کی کوئی گنجائش نہیں ہے
عدم رفع حرکت نہیں بلکہ سکون کا نام ہے وہ بالاجماع نماز میں خشوع
کے عموم کی وجہ سے مطلوب ہے اور ایک وجہ ترجیح یہ بھی ہے کہ
عدم رفع کی روایت کے راوی فقاہت کی وجہ سے رفع یدین کے
راویوں پر برتری رکھتے ہیں جیسا کہ امام ابوحنیفہ نے امام اوزاعی کو
جواب دیا ہے۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ

رفع یدین اور عدم رفع دونوں قسم کی روایتوں میں موازنہ کرتے ہوتے
امام ابوحنیفہ نے عدم رفع کی روایات کو راویوں کی فقاہت کی بنا پر
اور امام اوزاعی نے سند کے عالی ہونے کی بنا پر ترجیح دی ہے۔[1]

امام اعظم نے روایت کے اسنادی علو سے ہٹ کر فقاہت کو ترجیح کے لیے کیوں وجہ قرار
دیا ہے؟ اس لیے کہ

فقاہت کے ذریعے فقیہ میں صحیح اور غیر صحیح کا شعور اور سلیقہ ہوتا
ہے جب اسے کوئی ایسی بات معلوم ہوتی ہے جس کا ظاہر مزاج شریعت
سے مطابقت نہیں رکھتا تو وہ اس کو اول نظر میں ہی روایت نہیں
کرتا بلکہ اس کی حقیقت کا کھوج لگاتا ہے اور اس کے معنے میں
سرگرداں رہتا ہے جب وہ مطمئن ہوجاتا ہے تو روایت کرتا ہے
برخلاف غیر فقیہ کے کہ یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں ہوتی ہے
وہ سنی ہوئی بات کو آگے چلا دیتا ہے۔ اس تعلیل کا تقاضا یہ بھی
ہے کہ افقہ کی روایت کو فقیہ کی روایت پر ترجیح دی جائے۔[2]

ترجیح روایت کے بارے میں دراصل امام ابوحنیفہ کا یہی مذہب ہے اور فقاہت ان کے نزدیک
دو صحیح حدیثوں میں ترجیح کا سبب مؤثر ہے۔ فخر الاسلام بزدوی نے تصریح کی ہے کہ ھذا

---

[1] فتح القدیر ج ۱ ص ۳۱۶۔ [2] فواتح رحموت بحوالہ الاجوبۃ الفاضلۃ ص ۲۱۱۔

مذهبنا فی الترجیح اور حافظ ابن الہمام نے اسی کو فتح القدیر میں مذہب منصور قرار دیا ہے اور ملا علی قاری نے واشگاف لفظوں میں بتا دیا ہے کہ

والمذهب المنصور عند علمائنا الحنفیة الافقهیة دون الاکثریة ۔

کامیاب مذہب احناف کے نزدیک افقہیت ہے اکثریت نہیں ہے ۔

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ عددی طاقت اور ووٹوں کی زیادتی سے کسی روایت کو راجح نہ قرار دیا جاتے بلکہ یہ دیکھا جائے کہ معنویت کہاں ہے ؟

ظاہر بین بزرگوں نے امام اعظم کے اس زریں ضابطہ کو تخریبی قسم کا ضابطہ قرار دے کر بےجان بنانے کی ناکام کوشش کی ہے لیکن شاید ان کو علم نہیں ہے کہ محدثین کے علم حدیث کے متعلق سارے ہی اصول وضوابط تخریبی ہیں ۔ اصول حدیث کا کوئی ضابطہ اور قاعدہ بھی منصوص نہیں ہے یہ بات کہ تعدد طرق کی بنا پر روایت کو ترجیح دی جاتے خود تخریبی ہے اور اس کا پس منظر افراد وغرائب کے لیے گنجائش نکالنا ہے یعنی اس کو افراد وغرائب کے لیے بنایا گیا ہے فن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ورنہ اللہ کے دین میں احتیاط کا تقاضا تو یہی ہے کہ دین میں فکر ونظر اور فقہ وبصیرت رکھنے والوں کی بات کا پلڑا بھاری ہو ۔ آخر کوئی وجہ تو ہے کہ نماز کی صف اول کے بارے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ حکم تھا جو بحوالہ ابو مسعود انصاری اور بحوالہ عبداللہ بن مسعود مسند احمد، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی میں ان الفاظ میں موجود ہے ۔

لیلینی اولوا الاحلام والنهی منکم

مجھ سے قریب نماز میں تم میں سے اہل عقل وفہم ہوا کریں ۔

اہل علم وفضل کو صف اول میں رکھنے کی اس کے سوا وجہ کیا ہو سکتی ہے جو علامہ شوکانی نے بتائی ہے :

لیاخذوا عن الامام ویاخذ عنهم غیرهم لانهم امثّ بضبط صفة الصلاة وحفظها ونقلها وتبلیغها

تاکہ وہ امام کے اعمال وافعال کی کاپی کریں اور رہتے عامہ ان کے اعمال وافعال کی کاپی کرے ۔ کیونکہ اہل علم ہی نماز کے طریقہ کو زیادہ ضبط اور حفظ کر سکتے ہیں اور ان میں لتے آگے نقل کرنے اور پہنچانے کی

صلاحیت ہے[1]

امام اعظم نے اوزاعی کے سامنے رفع یدین کے موضوع پر یہی کسوٹی پیش فرمائی ہے۔ رفع یدین کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث ہے اور عدم رفع کے موضوع پر حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے۔ ان دونوں حدیثوں کی روایتی اور اسنادی حیثیت دونوں کو مسلم ہے اور ان دونوں روایتوں کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہے۔ امام اعظم نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت کو راجح قرار دیا ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود کبار صحابہ سے ہیں۔ نماز میں یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صف اول میں ہوتے تھے۔ حضور انور نے معلمین قرآن میں سب سے پہلا نمبر ان کا بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ جس چیز کو تمہارے لیے ابن مسعود پسند کرے میں تمہارے لیے اسی پر راضی ہوں[2] اور فرمایا کہ ابن مسعود کے عہد اور تحقیق کو مضبوطی سے قائم رکھو اور اس پر جمے رہو[3] حضرت عمر نے ان کو علم کا انبار کہا ہے اور کوفہ والوں کی طرف معلم قرآن وسنت بنا کر روانہ کیا۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود خلفاء راشدین سے بھی زیادہ عالم تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ وہ ہر وقت حضور انور کے پاس رہتے تھے اور حضور انور ان سے کسی وقت حجاب نہ کرتے تھے۔ ان کی وفات ساٹھ سال کی عمر میں ۳۲ھ میں ہوئی ہے۔ مسلمان ہونے والوں میں یہ چھٹے مسلمان ہیں اس لیے ان کا شمار ابوبکر و عمر، عثمان و علی کے ساتھ السابقون الاولون میں ہے۔ ان کا بیان امام اعظم کو پہنچا ہے کہ حضور انور صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرتے تھے اور حضرت عبداللہ بن عمر بے شک بزرگ ترین صحابی ہیں لیکن حضور انور کی ہجرت کے وقت ان کی عمر تیرہ سال تھی اور وفات کے وقت یہ عمر کی چھبیسویں بہار دیکھ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا شمار نہ السابقون الاولون میں ہے۔ اور نہ یہ ابوبکر و عمر کے علم و فضل میں ہم پلہ ہیں۔ نماز میں حضور کے پیچھے جو مقام عبداللہ بن مسعود کا ہے وہ یقیناً عبداللہ بن عمر کا نہیں ہے اس لیے امام اعظم نے عبداللہ بن مسعود کے بیان کو راجح قرار دیا ہے۔

حدیث ضعیف اور امام اعظم

محدثین نے حدیث ضعیف کی یہ تعریف کی ہے کہ

---

[1] نیل الاوطار ج ۳ ص ۱۵۵۔ [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۱۹ [3] الاستیعاب ج ۱ ص ۳۵۹۔

حدیث ضعیف وہ حدیث ہے جس میں حسن اور صحیح کی صفات نہ ہوں۔[1]

اور کچھ نے یہ بتایا ہے کہ

حدیث ضعیف وہ حدیث ہے جو حسن کے پاتے کی نہ ہو۔

لیکن حدیث ضعیف کی یہ تعریف ان بعد میں آنے والے محدثین کرام کی اختراعی ہے جن کے نزدیک حدیث تین قسموں پر مشتمل ہے۔ صحیح، حسن اور ضعیف۔ ورنہ متقدمین حدیث کی اس ثلاثی تقسیم سے آشنا نہ تھے۔ ان کے یہاں حدیث کی تقسیم ثنائی تھی یعنی حدیث کی دو ہی قسمیں بتاتے تھے صحیح اور ضعیف۔ چنانچہ امام احمد کے زمانے تک حدیث دو ہی قسموں میں منحصر تھی ان دو کے درمیان حسن کا کوئی درجہ نہ تھا لیکن بعد کے محدثین نے ان دونوں کے درمیان حسن کی صورت نکال لی۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

حدیث کی یہ تقسیم صحیح، حسن اور ضعیف امام ابو عیسیٰ ترمذی کی بنائی ہوئی ہے ترمذی سے پہلے یہ تقسیم کسی سے مروی نہیں ہے اور ترمذی نے اس سلسلے میں اپنی مراد بھی واضح کر دی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔ حسن وہ ہے جو متعدد طرق سے مروی ہو اور جس کا کوئی راوی کذب سے متہم نہ ہو اور نہ ہی شاذ ہو۔ یہ مرتبہ میں اس صحیح سے کم ہے جس کے راویوں کی عدالت اور ضبط معلوم ہوتا ہے۔ ضعیف وہ ہے جس کا راوی متہم بالکذب ہو یا ردی الحفظ ہو۔[2]

علامہ خطابی نے حسن کی یہ تعریف کی ہے:

جس کا مخرج معلوم ہو اور جس کے راوی مشہور ہوں۔[3]

لیکن حافظ ابن تیمیہ کو علامہ خطابی سے اختلاف ہے وہ امام ترمذی کے ہمنوا ہیں

حدیث حسن وہ ہے جو متعدد طرق سے مروی ہو اور اس کا کوئی راوی کذب سے متہم نہ ہو اور نہ وہ شاذ ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ متاخرین جسے حسن کہتے ہیں وہ متقدمین کے یہاں ضعیف ہے چنانچہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] تقریب ص ۵۰۔ [2] توضیح الافکار۔ [3] معالم السنن ج ۱ ص ۱۵۔

لیس المراد بالحدیث الضعیف فی اصطلاح السلف ھو الضعیف
فی اصطلاح المتاخرین بل ما یسمیہ المتاخرون حسناً قد
یسمیہ المتقدمون ضعیفاً۔
ضعیف کے بارے میں متقدمین اور متاخرین کی اصطلاحیں الگ الگ
ہیں۔ متاخرین جسے حسن کہتے ہیں متقدمین کی زبان میں اس کا نام
ضعیف ہے۔[1]

اسی ضعیف کے بارے میں محدثین نے امام اعظم کا یہ موقف بتایا ہے کہ وہ اسے رائے اور قیاس کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حزم نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

اس پر اجماع ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ حدیث ضعیف رائے
اور قیاس پر مقدم ہے بشرطیکہ اس موضوع پر صحیح حدیث نہ ہو۔[2]

حافظ ابن القیم رقمطراز ہیں:

اصحاب ابی حنیفۃ مجمعون علی ان مذھب ابی حنیفۃ ان
ضعیف الحدیث اولی عندہ من القیاس والرای۔
ابوحنیفہ کے اصحاب کا اس پر اجماع ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب
یہ ہے کہ ضعیف حدیث ان کے نزدیک قیاس اور رائے سے بہتر ہے۔[3]

بلکہ حافظ ابن القیم ہی نے اس موضوع پر امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل کی ہم آہنگی کا دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

فتقدیم الحدیث الضعیف وآثار الصحابۃ علی القیاس والرای
قولہ وقول الامام احمد بن حنبل۔
حدیث ضعیف اور آثار صحابہ کو قیاس اور رائے پر مقدم کرنا امام
ابوحنیفہ اور امام احمد کا قول ہے۔[4]

لیکن ضعیف سے متاخرین کی مراد اصطلاحی ضعیف نہیں بلکہ حسن مراد ہے، چنانچہ حافظ

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۸۳۔ [2] الاحکام
[3] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۸۲۔ [4] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۷۷۔

ابن تیمیہ فرماتے ہیں :

ہمارا یہ کہنا کہ حدیث ضعیف رائے اور قیاس سے بہتر ہے۔ اس سے ضعیف متروک مراد نہیں ہے بلکہ حسن ہے اور اصطلاح ابن ترمذی سے قبل حدیث کی دو ہی صورتیں تھیں صحیح یا ضعیف اور ضعیف کی دو قسمیں تھیں ضعیف متروک اور غیر متروک۔ چنانچہ ائمہ حدیث کی زبان پر یہی اصطلاحیں جاری تھیں۔ اس کے بعد وہ لوگ آئے جن کو صرف اصطلاح ترمذی ہی کا پتہ تھا جب ان کے کان میں بعض ائمہ حدیث کا یہ قول پڑا کہ حدیث ضعیف قیاس سے بہتر ہے تو انہوں نے خیال کیا کہ ایسی حدیث سے حجت لائی جا رہی ہے جو بہ اصطلاح ترمذی ضعیف ہے تو یہ ان لوگوں کے طریقہ کو ترجیح دینے لگے جو حدیث صحیح کے اتباع کا اظہار کرتے ہیں۔[1]

حافظ ابن القیم نے یہی بات پوری صراحت سے لکھی ہے فرماتے ہیں :

ضعیف سے باطل و منکر مراد نہیں ہے اور نہ وہ روایت ہے جس کے راویوں میں کوئی متہم ہو بلکہ حدیث ضعیف ان کے یہاں صحیح کی قسیم ہے۔ قسم نہیں ہے ان کے یہاں حدیث کی ثلاثی نہیں بلکہ ثنائی تقسیم ہوتی تھی اور ضعیف ان کے یہاں مراتب والی تھی۔[2]

علامہ ابن علان صدیقی نے امام احمد کے اس ارشاد پر کہ حدیث ضعیف پر عمل کیا جائے گا بشرطیکہ اس موضوع پر کوئی صحیح حدیث نہ ہو۔ یہ نوٹ لکھا ہے کہ :

حدیث ضعیف کے بارے میں امام احمد سے جو منقول ہے تو اس میں ضعیف سے مراد وہ ضعیف ہے جو صحیح کے مقابلے میں ہو یہ خود امام احمد اور متقدمین کا عرف ہے کیونکہ ان کے یہاں حدیث کی دو ہی قسمیں صحیح اور ضعیف ہیں اور یہ ضعیف حسن کو بھی شامل ہے اور باقی متاخرین کی اصطلاحی ضعیف تو وہ امام احمد کی ہرگز مراد

---

[1] التوسل والوسیلہ ص ۸۷۔ [2] اعلام ج ۱ ص ۳۱۔

نہیں ہے[1]

اور یہ صرف امام احمد ہی کی نہیں بلکہ امام اعظم ابوحنیفہ کے ارشاد میں بھی ضعیف سے متقدمین کی اصطلاحی ضعیف مراد ہے چنانچہ علامہ ابن علان ہی نے علامہ زرکشی کے حوالہ سے یہ انکشاف فرمایا ہے کہ:

وقریب من ھذا قول ابن حزم الحنفیۃ متفقون علی ان
مذھب ابی حنیفۃ ان ضعیف الحدیث عندہ اولی من
الرای والظاھر ان مرادھم بالضعیف ماسبق[2]

الغرض صرف امام اعظم ہی کا نہیں بلکہ تمام ائمہ کا مذہب یہی ہے کہ قیاس و رائے کے مقابلے میں حدیث ضعیف پر عمل کیا جاتے چنانچہ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:

لیس احد من الائمۃ الاو ھو موافقہ علی ھذا الاصل
من حیث الجملۃ۔

اماموں میں سے ہر ایک بالاجمال اس موضوع پر امام احمد کا ہمنوا ہے۔[3]

لیکن یہاں اتنی بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ یہ ائمہ جس حدیث ضعیف سے استدلال کرتے ہیں وہ ضعیف الاسناد تو محدثین تک پہنچنے میں ضرور ہوتی ہے مگر ضعیف المتن نہیں ہوتی ہے اتصال عمل کی کسی شاہد صحیح کی ظاہر قرآن کی اور بالآخر کثرت طرق کی اسے یقیناً تائید حاصل ہوتی ہے اسنادی کمزوری کی حد تک حافظ ابن تیمیہ بڑے پتے کی بات فرما گئے ہیں:

ایک شخص محدثین کے یہاں حدیث میں غلطیوں کی وجہ سے ضعیف
قرار پاتا ہے لیکن اس کی حدیثوں میں زیادہ تر صحیح ہوتی ہیں۔ وہ
اس سے محض اعتبار[4] و اعتضاد کی خاطر حدیثیں روایت کرتے ہیں کیونکہ

---

[1]، [2] شرح الاذکار ج ۱ ص ۸۶، ۸۷۔ [3] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۳۱۔

[4] اعتبار اصول حدیث کی ایک اصطلاح ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ روایت کی مختلف سندیں جمع کر کے دیکھی جائیں تاکہ پتہ چل جائے کہ قدر مشترک کے طور پر سند و متن کا کتنا حصہ درست اور صحیح ہے۔ حافظ سیوطی فرماتے ہیں کہ اعتبار متابعت اور شاہد محدثین کی خاص اصطلاحی زبان ہے اس کے ذریعے وہ احادیث کے مختلف احوال معلوم کرتے ہیں سب سے یہ جانتے ہیں کہ راوی اپنے بیان میں منفرد ہے یا نہیں پھر یہ کہ

(باقی ص ۶۵۶ پر)

تعدد طرق اور کثرت اسانید سے روایت میں اتنی قوت آجاتی ہے کہ اس کے ذریعے علم حاصل ہو جاتا ہے۔ چاہے روایت کرنے والے فاسق و فاجر ہی ہوں اور اگر روایت میں غلطیوں کے باوجود بیان کرنے والے علماء اور عادل ہوں تو پھر کیا ہی کہنے ہیں جیسے عبداللہ بن لہیعہ۔ یہ اکابر علماء میں سے ہیں۔ لیکن کسی وجہ سے ان کی روایات میں غلطیاں ہوتی ہیں حالانکہ ان کی روایات بیشتر صحیح ہوتی ہیں[1]

آیئے سرِ دست چند مثالیں بھی سُن لیجئے تاکہ اندازہ ہوسکے کہ ائمہ دین نے دین کی زندگی میں ضعیف حدیثوں سے کس طرح اور کس انداز میں فائدہ اٹھایا ہے۔

حدیث قہقہہ سے وضو کے ٹوٹنے پر استدلال

مسئلہ یہ ہے کہ نماز کی حالت میں اگر قہقہہ مار کر ہنسا جائے تو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اس موضوع پر احادیث مسندہ اور مرسلہ دونوں آتی ہیں۔ احادیث مسندہ میں ابی موسیٰ اشعری، ابوہریرہ، عبداللہ بن عمر، انس بن مالک، جابر بن عبداللہ، عمران بن الحصین اور ابی الملیح کی احادیث آتی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی روایت بھی محدثانہ نقطہ نظر سے اصطلاحی صحت کے معیار پر پوری نہیں ہے۔ ابی موسیٰ کی روایت طبرانی میں ہے اگرچہ حافظ ہیثمی نے اس کے رجال کی توثیق کی ہے لیکن ان میں محمد بن عبدالملک مختلف فیہ ہے۔ حدیث ابی ہریرہ سنن دارمی میں ہے مگر منقطع ہونے کے ساتھ عبدالعزیز اور عبدالکریم کی وجہ سے ضعیف ہے۔

حافظ ابن عدی فرماتے ہیں:

---

۶۵۵ کا بقیہ حاشیہ:۔ معروف ہے یا مجہول و مستور۔ اعتبار یہ ہے کہ کسی روایت کی مختلف سندیں یکجا کی جائیں اور دیکھا جائے کہ سند میں کسی اور کی ہمنوائی بھی اسے حاصل ہے یا نہیں اس ہمنوائی کے بہم پہنچنے کا نام اعتبار ہے۔ پھر اس تلاش میں اگر راوی کی یا راوی کے استاد کی یا استاد کے استاد کی آخر سند تک ہمنوائی مل جائے تو اس کا نام متابعت ہے اور پھر اگر اس روایت کے ہم معنے کوئی اور روایت بھی دستیاب ہو جائے تو اس کا نام شاہد ہے حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ اعتبار کا فائدہ یہ ہے کہ حدیث کے لیے توابع اور شواہد معلوم ہو سکیں۔ [1] قواعد التحدیث ص ۱۱۵۔

والبلاء فى هٰذا الاسناد من عبد العزيز وعبد الكريم وهما
ضعيفان [1]

عبداللہ بن عمر کی حدیث کے بارے میں ابن الجوزی کا العلل المتناہیہ میں فیصلہ یہ ہے کہ
هذا حديث لا يصح -

حدیث انس سنن دارقطنی میں ہے اس میں بھی داؤد متروک الحدیث اور ایوب ضعیف ہے۔ دارقطنی فرماتے ہیں -

رادہ داؤد بن المحبر و متروك يضع الحديث عن ايوب
وهو ضعيف [2]

حدیث جابر بھی سنن دارقطنی میں ہے لیکن اس میں یزید بن سنان ضعیف ہے۔ عمران بن الحصین کی روایت عمرو بن قیس اور عمرو بن عبید کی وجہ سے پایہ اعتبار سے گری ہوئی ہے - ابوالملیح کا اس موضوع پر بیان اپنے اضطراب کی وجہ سے محدثین کے دربار میں مخدوش ہے یہی حال ان روایات کا ہے جو مسندہ نہیں بلکہ مرسلہ ہیں۔ ان پر تفصیلی کلام حافظ زیلعی نے نصب الرایہ میں فرمایا ہے۔ بہرحال نماز میں قہقہہ سے وضو ٹوٹنے کے موضوع پر جس قدر روایات آئی ہیں وہ مسند ہوں یا مرسل۔ محدثین کے یہاں متکلم فیہ ہیں اور حافظ ابن القیم کا یہ کہنا درست ہے کہ
اجمع اهل الحديث على ضعفه [3]

اس کے باوجود کہ عقلیت کا تقاضا بھی ہے اور قیاس بھی چاہتا ہے کہ قہقہہ سے وضو نہ ٹوٹے امام ابوحنیفہ نے قہقہہ کو وضو کے لیے ناقص قرار دیا ہے - اس باب میں بہت سے امور تفصیل طلب ہیں لیکن یہاں مزید اطناب کا موقعہ نہیں ہے -

نبیذ تمر سے وضو کی حدیث

اگر اور کوئی پانی نہ ہو اور صرف کھجوروں کی نبیذ ہی ہو تو نبیذ ہی سے وضو جائز ہے اس کے لیے تیمم روا نہیں ہے۔ اس موضوع پر دو حدیثیں آتی ہیں۔ ایک حدیث ابن مسعود اور دوسری حدیث ابن عباس۔ حدیث ابن مسعود پر محدثین نے خاص محدثانہ اور مورخانہ کلام کیا ہے۔ ابن

---

[1] نصب الرایہ ج ۱ ص ۴۰ - [2] سنن دارقطنی ص ۵۹ - [3] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۸۲ -

ابی حاتم نے کتاب العلل میں حافظ ابو زرعہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

حدیث ابی فزارۃ فی الوضوء لیس بصحیح و ابو زید مجہول۔

حافظ ابو جعفر طحاوی فرماتے ہیں:

ان حدیث ابن مسعود روی من طرق لا تقوم بمثلها حجۃ[1]

اگرچہ حدیث ابن مسعود کو ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے لیکن محدثین کے یہاں اس کی صحت مخدوش ہے۔ خود صاحب ہدایہ کو اس کے اضطراب کی شکایت ہے۔ حافظ منذری نے مشہور محدث ابو احمد الکرابیسی سے نقل کیا ہے۔

لا یثبت فی ھذا الباب من ھذہ الروایۃ حدیث بل

اخبار الصحیحۃ عن عبد اللّٰہ ناطقۃ بخلافہ

اس باب میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے بلکہ عبد اللّٰہ سے صحیح حدیثیں اس کے خلاف ہیں[2]

عبد اللّٰہ بن عباس کی حدیث سنن ابن ماجہ میں ہے لیکن حافظ بزار کا فیصلہ ہے:

ھٰذا حدیث لا یثبت

یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔[3]

حدیث مقدار ایام حیض

حیض کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ مدت کے موضوع پر جو حدیث آتی ہے وہ اگرچہ ابو امامہ، واثلہ بن الاسقع، معاذ بن جبل، ابو سعید، انس بن مالک اور عائشہ کے حوالہ سے آتی ہے اور حدیث کی متعدد کتابوں میں موجود ہے لیکن ان کے راویوں میں مجاہیل ضعفاء کا اتنا ہجوم ہے کہ محدثین کے معیار کے مطابق اس کی صحت کی کوئی ضمانت نہیں ملتی ہے لیکن اس کے باوجود قابل قبول سمجھ لی گئی۔

بہر حال امام اعظم قیاس اور رائے کے مقابلے میں حدیث ضعیف پر بھی عمل کرتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ امام اعظم کے زمانے میں معاشرے کی عملی تائید کی وجہ سے ان حدیثوں

---

[1] نصب الرایہ ص ۱۴۶۔ [2] معالم السنن ج ا ص ۸۳۔ [3] نصب الرایہ ج ا ص ۱۴۳

کا درجہ حسن ہو جاتا ہے۔ علامہ بابرتی نے شاید اسی بنا پر لکھا ہے کہ:

والحدیث مشهور ثبت بطرق مختلفة وعملت به الصحابة۔[1]

حافظ ابن الہمام فرماتے ہیں:

فهذه عدة احادیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم متعددة الطرق وذالك یرفع الضعیف الی الحسن۔[2]

یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی چند حدیثیں ہیں اور متعدد طرق سے آنے کی وجہ سے درجہ حسن کو پہنچ گئی ہیں۔

حافظ سخاوی فرماتے ہیں:

حسن لغیرہ بھی قابل احتجاج ہو جاتی ہے جب وہ متعدد طرق سے آئے۔

امام نووی بھی علامہ سخاوی کے ہم زبان ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

حدیثوں کی سندیں اگر الگ الگ ہوں چاہے وہ ضعیف ہوں، ان کا مجموعہ باہم تقویت کی وجہ سے حدیث کو حسن اور قابل احتجاج بنا دیتا ہے۔

امام بیہقی کی بھی یہی رائے ہے کہ حدیث ضعیف کثرت طرق سے آئے تو قوی ہو جاتی ہے بلکہ عون الباری میں امام نووی کے حوالہ سے یہاں تک نقل کر دیا ہے کہ:

حدیث ضعیف اگر متعدد طرق سے مروی ہو تو وہ ضعیف سے حسن اور مقبول و معمول بہ ہو جاتی ہے۔[3]

ارباب روایت کے یہاں عمل کے بارے میں تین مسلک ہیں۔

اول یہ کہ ضعیف پر قطعاً عمل نہ کیا جائے۔ ابن سید الناس نے اسی کو یحییٰ بن معین کا مسلک قرار دیا ہے۔ علامہ سخاوی نے فتح المغیث میں ابوبکر بن العربی کا یہی میلان بتایا ہے بلکہ صاحب قواعد التحدیث کی تصریح کے مطابق محدثین میں بخاری اور مسلم کا بھی یہی مسلک ہے۔

دوم یہ کہ حدیث پر ہر حال میں عمل کیا جائے گا۔

حافظ سیوطی فرماتے ہیں:۔

---

[1] عنایہ ج ۱ ص ۸۰۔ [2] فتح القدیر ج ۱ ص ۱۱۲۔ [3] قواعد التحدیث ص ۱۱۰۔

عزی ذالک الی ابی داؤد و احمد لانهما یریان اقوی من رای الرجال ۔[1]

سوم یہ کہ صرف فضائل میں ضعیف پر عمل کیا جاتے احکام میں ضعیف پر عمل نہ کیا جاتے چنانچہ امام حاکم رقمطراز ہیں :

میں نے ابوزکریا عنبری سے سنا وہ فرماتے تھے کوئی حدیث اگر حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہ کرتی ہو اور کسی حکم کو واجب نہ کرتی ہو اور صرف ترغیب و ترہیب سے تعلق رکھتی ہو تو اس سے چشم پوشی کی جائے گی اور اس کے راویوں پر جرح میں تساہل سے کام لیا جائے گا اور جیسا کہ امام عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں کہ جب ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حلال و حرام اور احکام کی روایت کرتے ہیں تو اسانید کے بارے میں سختی برتتے ہیں اور رجال پر نقد کرتے ہیں اور جب فضائل و عقاب کی روایت کرتے ہیں تو اسانید میں نرمی اختیار کرتے ہیں اور احادیث میں تسامح سے کام لیتے ہیں ۔ میمونی نے امام احمد کا بھی ایسا ہی بیان بتایا ہے کہ رقاق کی حدیثوں میں تساہل مناسب ہے لیکن احکام میں نہیں ۔[2]

علامہ عراقی فرماتے ہیں کہ :

اگر حدیث ضعیف ہو لیکن موضوع نہ ہو تو محدثین اس کی اسناد میں تساہل کو جائز سمجھتے ہیں اور یہ بھی جائز قرار دیتے ہیں کہ ضعف کی تصریح کے بغیر بیان بھی کر سکتا ہے جب کہ حدیث کا تعلق احکام و عقائد سے نہ ہو بلکہ مواعظ، قصص اور فضائل میں ترغیب و ترہیب سے ہو ۔ اگر حدیث احکام و عقائد سے متعلق ہو تو اس میں تساہل قطعاً ناجائز ہے ۔ ائمہ حدیث میں عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن المبارک اور احمد بن حنبل کی یہی رائے ہے ۔[3]

حافظ ابن الہمام نے تصریح کی ہے کہ :

---

[1] تدریب الراوی ص ۲۰۸ ۔ [2] قواعد التحدیث ص ۱۱۳ ۔ [3] شرح الالفیہ ص ۲۹۱ ۔

حدیث اگر ضعیف ہو اور موضوع نہ ہو تو اس سے استحباب ثابت ہو جاتا ہے۔[1]

لیکن حافظ سیوطی نے تدریب الراوی میں اور حافظ سخاوی نے القول البدیع میں حافظ ابن حجر عسقلانی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ حدیث ضعیف کی قبولیت کے لیے تین شرطیں ہیں۔

اوّل یہ کہ حدیث میں ضعف زیادہ نہ ہو یعنی حدیث کے راوی ایسے نہ ہوں جو جھوٹ میں شہرت رکھتے ہوں یا ان پر دروغ گوئی کی تہمت ہو یا کھلم کھلا غلطیوں کا شکار ہوں۔

دوم یہ کہ حدیث جس مضمون پر مشتمل ہے اس کی کوئی اصل شریعت میں موجود ہو بات محض بے اصل اور من گھڑت نہ ہو۔

سوم یہ کہ عمل کے وقت میں اس کے ثابت ہونے کا عقیدہ نہ رکھا جائے بلکہ از روئے احتیاط اس پر عمل ہو۔ آخری دو شرطیں حافظ عزالدین بن عبدالسلام اور علامہ ابن دقیق العید کی بتائی ہوئی ہیں۔ اور پہلی شرط کو علامہ علائی نے اتفاقی قرار دیا ہے۔

مولانا عبدالحی نے ظفرالامانی فی شرح مختصر الجرجانی میں ان سہ گانہ شرطوں کا تذکرہ کر کے مثالیں بھی دی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں :

> فقہاء احناف کا فیصلہ ہے کہ اذان کے کلمات آہستہ آہستہ دھیمی آواز سے اور تکبیر جلدی اکہری آواز سے کہی جائے اور ایسا کرنا مستحب ہے اور اس پر انہوں نے ترمذی کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو بحوالہ حضرت جابر ان الفاظ میں آئی ہے کہ — حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال سے فرمایا ہے کہ اے بلال جب اذان دو تو آہستہ آہستہ دو اور جب تکبیر کہو تو جلدی کرو..... الخ — امام ترمذی نے اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ ھو اسناد مجھول۔ امام دارقطنی نے اس کے راوی عبدالمنعم کی تضعیف کی ہے اس کے باوجود چونکہ فضائل اعمال میں حدیث ضعیف کافی ہو جاتی ہے اس لیے فقہائے نے اس پر عمل کو مستحب قرار دیا ہے۔ نیز فقہاء حنفیہ وضو میں گردن کے مسح کو مستحب قرار دیتے ہیں اور اس پر وہ

---

[1] فتح القدیر ج ۱ ص ۶۸ ۴۔

ایک ایسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو خالص محدثانہ نقطہ نظر سے ضعیف ہے۔ ابو داؤد میں ہے کہ طلحہ بن مصرف اپنے والد اور دادا کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سر کا مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے تا آنکہ آپ نے قذال تک مسح کیا۔ قذال گردن کے بالائی حصہ کو کہتے ہیں۔ یہ روایت معانی الآثار میں بھی ہے لیکن یہ سب روایات طلحہ کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہیں۔ ابن القطان نے طلحہ، ان کے والد اور ان کے دادا کو مجہول قرار دیا ہے۔[1]

علامہ دوانی کا شبہ اور اس کا جواب

علامہ دوانی نے انموذج العلوم میں یہاں ایک شبہ اٹھا کر ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ حدیث ضعیف سے استحباب ثابت ہو جاتا ہے ایک پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ علامہ موصوف کے اس شبہ کو مولانا عبدالحی نے الاجوبۃ الفاضلہ میں، مولانا صدیق حسن خاں نے الحطہ میں اور علامہ جمال الدین القاسمی نے قواعد التحدیث میں بڑی آب و تاب سے بیان کیا ہے۔ ان کے شبہ کا خلاصہ یہ ہے کہ فقہاء ایک طرف فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف سے استحباب اور جواز معلوم ہو سکتا ہے، لیکن دوسری طرف یہ بھی ان کا ہی ارشاد ہے کہ استحباب ہو یا جواز۔ یہ بھی احکام شرعیہ میں سے ایک حکم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ حدیث ضعیف احکام کے اثبات کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ اتنی بات سب ہی جانتے ہیں کہ حدیث ضعیف سے استحباب و جواز ثابت ہوگا تو اس کے نتیجے میں اس سے حکم شرعی کا اثبات ہوگا۔ اس لیے ایک طرف یہ کہنا کہ حدیث ضعیف سے استحباب و جواز ثابت ہو جاتا ہے اور دوسری طرف یہ بتانا کہ حدیث ضعیف سے احکام ثابت نہیں ہوتے دونوں میں اس لحاظ سے یقیناً "تضاد" ہے کہ استحباب اور جواز بھی خود حکم شرعی ہے۔ اگر حدیث ضعیف سے حکم شرعی ثابت نہیں ہو سکتا تو لازماً استحباب بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔

---

[1] ظفر الامانی ص ۹۸۔

علماء نے اس شبہ کے متعدد جوابات دیے ہیں اور خود علامہ دوانی نے بھی اس کے ازالہ کی بہترین کوشش فرمائی ہے۔

علامہ احمد الخفاجی نے نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض میں جو جواب دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

> حدیث ضعیف سے فضیلت کا ثابت ہونا کسی حکم کے ثابت ہونے کو مستلزم نہیں ہے ایسا عمل جس کا استحباب صحیح حدیث سے ثابت ہو اس کا ثواب یا اسے کرنے کی ترغیب یا صحابہ کی فضیلت یا اذکار ماثورہ کی فضیلت اگر کسی ضعیف حدیث سے معلوم ہو جائے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اصل حکم ہی حدیث ضعیف سے ثابت ہو رہا ہے۔ اعمال اور فضائلِ اعمال میں بہت بڑا فرق ہے[1]

علامہ خفاجی کی بات بڑی گہری ہے اور اپنے اس بیان کے ذریعے وہ پڑھنے والوں کے ...زہ ذہن میں یہ بات اتارنا چاہتے ہیں کہ حدیث ضعیف سے کسی عمل کا وجود ثابت نہیں کیا ...تا ہے بلکہ ثابت شدہ موجود عمل جس کا وجود دلائل شرعیہ سے پہلے ثابت ہو چکا ہے صرف ...ن کی فضیلت کو حدیث ضعیف کے ذریعے ظاہر کیا جا سکتا ہے مثلاً نماز تہجد کی سنیت ...ائل شرعیہ سے ثابت ہے اب اس ثابت شدہ سنت کی ترغیب کے لیے یا اس کی ...رگی کے اظہار کے لیے حدیث ضعیف کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ علامہ موصوف نے اس طرح ...مہ دوانی کے اٹھاتے ہوئے سوال کا جواب دیا ہے۔ مولانا صدیق حسن خاں نے صرف ...امہ موصوف کے جواب پر ہی اکتفا فرمایا ہے اور اس سلسلے میں اپنی کوئی قیمتی رائے ظاہر ...یں فرمائی ہے۔ جمال الدین القاسمی نے علامہ موصوف پر بہت بڑی برہمی کا اظہار فرمایا ہے۔ ...مولانا عبدالحی نے یہ فرما کر علامہ خفاجی کی بنائی ہوئی عمارت کو بے جان کر دیا ہے کہ خفاجی ...یہ موقف فقہاء اور محدثین دونوں کے خلاف ہے۔ فقہاء کے اس لیے کہ وہ ضعیف ...یث سے بلاشبہ ایسے عمل کے استحباب کو ثابت کرتے ہیں جس کا استحباب احادیث صحیحہ ...ہرگز ثابت نہیں ہے۔ محدثین کے اس لیے کہ وہ حدیث ضعیف کا فضائل، مناقب

---

[1] نسیم الریاض ج ۱ ص ۵۴۔

اور ترغیب و ترہیب کے موضوع پر ذکر کرتے ہیں۔ اگر فضائل اعمال سے وہی کچھ مراد ہے جو خفاجی بتاتے ہیں تو اس کا مقابلہ ترغیب و ترہیب میں قبولیت سے نہیں ہو سکتا۔ علامہ کا یہ ارشاد امام نووی کی اس تصریح کے بھی خلاف ہے جو انہوں نے الاذکار میں کی ہے:

> اذا ورد حدیث ضعیف بکراھیۃ بعض البیوع او الانکحۃ، فالمستحب ان یتنزہ عنہ [1]
>
> جب کوئی ضعیف حدیث نکاح یا سودے کی کراہت کو بتائے تو اس سے بچنا ہی اچھا ہے۔

اور حافظ ابن الہمام کے اس نظریہ کے بھی خلاف ہے۔

> یثبت الاستحباب بالحدیث الضعیف [2]
>
> استحباب حدیث ضعیف سے ثابت ہو جاتا ہے۔

نیز اگر بالفرض وہ ہی کچھ امر واقعہ ہے جو خفاجی بتاتے ہیں تو پھر ان شرائط میں کوئی افادیت نہیں رہتی جو قبول ضعیف کے لیے محدثین میں سے حافظ ابن حجر عسقلانی نے قائم فرمائی ہیں کیونکہ اگر ضعیف سے صرف ان اعمال کی فضیلت ہی بیان ہو سکتی ہے جو احادیث صحیحہ کے ذریعے ثابت ہو چکے ہوں تو پھر یہ قید بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے کہ حدیث ضعیف جس مضمون پر مشتمل ہو اس کی کوئی اصل موجود ہو اور یہ شرط بھی بالکل بے جان ہو جاتی ہے کہ عمل کے وقت اس کے ثبوت کا اعتقاد نہ رکھتا ہو۔

مولانا عبدالحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> اس مقام پر واقعی اور سچی بات یہ ہے کہ جب کسی بھی کام کا جواز یا استحباب کسی خاص حدیث صحیح سے ثابت نہ ہو اور اس موضوع پر کوئی ضعیف حدیث آجائے لیکن اس کا ضعف شدید نہ ہو تو اس سے جواز و استحباب ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کام کی کوئی اصل شریعت میں موجود ہو اور یہ کام اصول شرعیہ اور دلائل صحیحہ کے منافی نہ ہو۔ [3]

---

[1] الاذکار ص ۔ [2] فتح القدیر کتاب الجنائز۔ [3] الاجوبۃ الفاضلۃ ص ۵۵۔

خود علامہ دوانی نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے وہ اگرچہ ذرا طویل ہے لیکن اسے یہاں نظرانداز کرنے سے بات ادھوری رہ جائے گی اس لیے یہاں اس کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

اس موضوع پر قابلِ اعتماد بات یہ ہے کہ جب کسی بھی کام کی خوبی کسی حدیث سے معلوم ہو جاتے اور وہ کام ناجائز اور مکروہ ہونے کے اندیشے سے بالا ہو تو ایسے موقعہ پر ضعیف پر عمل جائز اور مستحب ہے کیونکہ یہ ناجائز ہونے کے اندیشے سے پاک ہے اور اس پر ثواب کی توقع ہے اور اس توقع کی وجہ کام میں اباحت اور استحباب کی گنجائش ہوتا ہے بنابریں ثواب کی امید پر عمل ہی میں احتیاط ہے۔ اور اگر خود کام ہی ناجائز اور استحباب کے درمیانی مقام پر ہو تو پھر ناجائز ہونا راجح ہے۔ اور اگر کام کراہت اور استحباب سے دوچار ہو تو اس میں فکر و غور کے لیے کافی گنجائش نکل سکتی ہے عمل کی صورت میں مکروہ کا تسکار ہو سکتا ہے اور ترک کی حالت میں مستحب سے دستبرداری کی راہ ہے۔ اگر کراہت کا اندیشہ قوی ہو اور استحباب کا احتمال کمزور ہو تو ایسی حالت میں ترک کو ترجیح دی جائے گی۔ اور اگر کراہت کا اندیشہ کمزور ہو تو عمل میں احتیاط کا پہلو ہے۔ اور اگر طرفین برابر ہوں تو پھر بھی عمل میں استحباب کو اپنایا جائے گا۔ ان تمام صورتوں میں حدیث ضعیف پر عمل اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ عدم جواز کا احتمال نہ ہو، حاصل کلام یہ ہے کہ کسی کام کا جواز ان صورتوں میں حدیث ضعیف سے نہیں بلکہ باہر سے معلوم ہوتا ہے اور استحباب کا پتہ بھی حدیث ضعیف سے نہیں بلکہ ان قواعد شرعیہ سے ہوتا ہے جو دین کی زندگی میں احتیاط کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ اس لیے احکام میں سے کوئی چیز بھی حدیث ضعیف سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ ان میں حدیث ضعیف کے ذریعے استحباب کا احتمال رونما ہوتا ہے اس لیے احتیاطاً اس پر عمل کیا ہے اور احتیاطی عمل کا استحباب خود قواعد شرعیہ سے معلوم ہے۔[1]

---

[1] الخطر ص ۶۱۔

مولانا عبدالحی نے اس موضوع کے تفصیلی مباحث اور ان کی گہرائیاں ظفر الامانی میں سمیٹ دی ہیں بہرحال متقدمین ہوں یا متاخرین۔ ضعیف میں اختلاف کے باوجود عمل بالضعیف پر متفق ہیں۔ اگرچہ اس کی وجوہات میں اختلاف ہے۔

متقدمین حدیث ضعیف پر عمل تابعین اور اتباع تابعین کی عملی تائید کی وجہ سے کرتے ہیں اور متاخرین تعدد طرق سے آنے کی بنا پر۔

متاخرین کے مابین جس حدیث ضعیف پر عمل کے بارے میں اختلاف ہے وہ ان کی اپنی اصطلاحی ضعیف ہے۔ اس کا متقدمین کی ضعیف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حدیث وقیاس میں تعارض اور امام اعظم

قانون کی اصولی کتابوں میں قیاس کی جو تعریف کی گئی ہے ہم آپ کو یہاں اس میں الجھانا نہیں چاہتے۔ اس کے تفصیلی مباحث آپ کو انشاء اللہ "امام اعظم اور علم الشرائع" میں ملیں گے۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ احکام متناہی ہیں اور حوادث و واقعات جو روزانہ نت نئے پیش آ رہے ہیں وہ ان گنت ہیں۔ الشہرستانی رقمطراز ہیں:۔

> ہمیں اس کا قطعاً علم ہے کہ حوادث و واقعات خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے، بے حساب اور بے شمار ہیں۔ اور یہ بھی ہمیں پتہ ہے کہ ہر ہر واقعہ اور حادثہ کے بارے میں صاف اور صریح حکم نہیں ہے اور ایسا ممکن بھی نہیں ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہے کہ حوادث و واقعات ان گنت اور احکام مقررہ ہیں تو اس کا نتیجہ لازماً یہ ہے کہ لامتناہی متناہی کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔ اس لیے یہ بات حتمی اور قطعی ہے کہ اسلام میں اجتہاد و قیاس کا خاص مقام ہے تاکہ ہر پیش پا افتادہ حال کے لیے اجتہاد کے ذریعے راستہ معلوم ہو سکے [1]

قرآن نے ان حوادث کے لیے اعتبار اور نبوت نے اجتہاد کا امت کو پروانہ دے کر ایک طرف اسلامی قانون کو بازیچہ اطفال بننے سے محفوظ کر لیا اور دوسری طرف اسلامی معاشرے کو

---

[1] الملل والنحل ج ۱ ص ۲۰۴۔

بے راہ روی، آوارگی اور بے قیاس زندگی کی برائیوں سے بچا لیا۔ اس بنا پر چند گنے چنے لوگوں کو چھوڑ کر پوری اُمت نے قیاس کی شرعیت کو مانا ہے۔ امام شافعی کے مشہور شاگرد امام مزنی رحمۃ اللہ قیاس پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر آج تک دینی معاملات میں فقہاء قیاس سے برابر کام لیتے رہے ہیں۔ ان کا اس پر اجماع ہے کہ حق کی نظیر حق ہے اور باطل کی نظیر باطل ہے لہٰذا قیاس کا انکار درست نہیں ہے کیونکہ وہ مماثل اشیاء پر مماثل احکام کا نام ہے۔[1]

حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ:

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پیش آنے والے حوادث میں اجتہاد سے کام لیتے تھے اور بعض احکام کو بعض پر قیاس کرتے تھے وہ ایک نظیر سے دوسری نظیر قائم کرتے تھے۔[2]

امام ابوبکر سرخسی[3] نے اس موضوع پر مفید اور بڑے پتے کی بات لکھی ہے:۔

> قیاس سے شریعت میں کام لینا صحابہ اور ان کے بعد تابعین اور ائمہ دین کا مذہب ہے۔ سب سے پہلا شخص جس نے قیاس کے جواز کا انکار

---

[1] جامع بیان العلم وفضلہ۔ [2] اعلام الموقعین ج ا ص ۱۷۶۔

[3] ان کا نام محمد بن احمد کنیت ابوبکر اور لقب شمس الائمہ ہے ۴۸۳ھ ان کی تاریخ وفات ہے۔ اصول فقہ میں ان کی یہ کتاب اب مصر میں طبع ہو چکی ہے۔ حاجی خلیفہ نے ان کی اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ کتاب السرخسی نے خوارزم کے جیل خانہ میں لکھی ہے۔ جب باب شروط پر پہنچے تو رہائی ہو گئی آپ فرغانہ پہنچے اور اس کتاب کی تکمیل کرائی (کشف الظنون ص ۹۰) فرغانہ کو آج کل تاشقند کہتے ہیں۔ ڈاکٹر حتی نے اپنی تاریخ آداب العرب میں اس کی تصریح کی ہے۔ مولانا عبدالحی نے مدینۃ العلوم کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اصول فقہ کی اس کتاب اور شرح السیر الکبیر ان دونوں کو شمس الائمہ نے قید میں تصنیف کیا۔ حکامِ وقت کو نصیحت کی پاداش میں قید کیے گئے تھے (الفوائد البہیہ ص ۱۵۷) یہ اس مشہور قصے کی طرف اشارہ ہے جس کا خود شمس الائمہ نے اپنی کتاب مبسوط کے مختلف مقامات پر تذکرہ کیا ہے۔ ان کو یہ تکلیف مسئلۃ النوائب کے سلسلہ میں اٹھانی پڑی۔ یعنی حکومت کی جانب سے بلا وجہ بھاری بھاری

(باقی صفحہ ۶۶۵ پر)

کیا ہے وہ ابراہیم نظام ہے۔ بغداد کے کچھ متکلمین نے اسی کی
پیروی کی ہے۔ بعد ازیں ایک سادہ لوح شخص داؤد نامی آئے
اور انھوں نے متقدمین کے اس سے متعلق افکار معلوم کیے بغیر ہی
قیاس پر عمل کے ابطال کا اعلان کر دیا۔ اور لوگوں کو بتایا کہ شریعت
میں قیاس حجت نہیں ہے۔ ان کی پیروی میں وہ تمام ظاہریہ جو
غور و فکر کی نعمت سے ان کی طرح بے نیاز ہیں یہی کچھ کہنے لگے۔
اور ان میں سے کچھ نے یہی بات قتادہ، مسروق اور ابن سیرین کی
طرف منسوب کی ہے۔ یہ ان بزرگوں پر بہتان ہے۔ ان کا مقام
اس سے کہیں بالا و بالا ہے کہ وہ اس قسم کی بات کہیں [1]
علامہ شوکانی بھی انکار قیاس کی خشت اول کی نشاندہی میں السرخسی کے ہمزبان ہیں۔

---

[1] اصول سرخسی ص ۱۱۸، ۱۱۹۔

ص کا بقیہ حاشیہ :۔ ٹیکس لگائے گئے۔ اس کے خلاف انھوں نے احتجاج کیا ان ٹیکسوں کا فتح القدیر میں اس
طرح ذکر آیا ہے کالجبایات فی زماننا ببلاد فارس علی الخیاط و لصباغ وغیرھم للسلطان
فی کل یوم او الشھر او ثلاثۃ الشھر یعنی جیسے ہمارے زمانے میں بادشاہ فارس کے لیے درزی،
رنگریز وغیرہ روزانہ اور ماہانہ اور سہ ماہی ٹیکس لیا کرتے ہیں (ج ۵ ص ۳۳۲) اس کے بعد حافظ
ابن الہمام لکھتے ہیں کہ شمس الائمہ نے ان ٹیکسوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور بتایا کہ اکثر
النوائب تؤخذ ظلماً و من تمکن من دفع الظلم عن نفسہ فھو خیر لہ زیادہ تر ٹیکس
ظلماً ہی لیے جاتے ہیں اور جو شخص اپنی ذات سے ظلم دور کر سکتا ہے اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ ایسا
ہی کرے اور ان کو صرف اسی پر اصرار نہ تھا بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ ٹیکس دینا ہی چاہتا ہے تو وہ
ایسے شخص کو دے دے جو ظلم کی خود مدافعت نہ کر سکتا ہو یا ایسے فقیر کو دے دے جو کسی ظلم کا مقابلہ اس کے ذریعے
کر سکے۔ اس طرح دینے والا ثواب کا مستحق ہوگا (فتح القدیر ج ۵ ص ۳۳۳) بظاہر جیل میں قید کی مدت
بہت لمبی تھی کیونکہ مبسوط، شرح السیر الکبیر نیز اصول فقہ کا اکثر حصہ جیل ہی میں لکھا گیا ہے۔ شمس الائمہ
کی تحریک کامیاب ہوئی۔ ابن خلکان نے ملک شاہ سلجوقی کے بارے میں لکھا ہے وابطل المکوس والخفارات
فی جمیع البلدان تمام ٹیکس وغیرہ ختم کر دیے۔

اولین شخص جس نے قیاس کا کھلم کھلا انکار کیا نظام ہے[1]۔ اور اس کی معتزلہ میں سے کچھ لوگوں نے پیروی کی ہے مثلاً جعفر بن حرب، جعفر بن جبشہ، محمد بن عبداللہ۔ ان ہی کے سیکھے ناسگے داؤد ظاہری نے بانٹے ہیں۔[2]

حافظ ابن عبدالبر مغربی نے حافظ ابوالقاسم بغدادی کے حوالے سے بتایا ہے کہ

ما علمت احدا سبق النظام الی القول بنفی القیاس

نظام سے پہلے قیاس کا منکر میرے علم میں کوئی نہیں ہے۔

اور اپنا یہ تاثر ظاہر کیا ہے:

لا خلاف بین فقہاء الامصار وسائر اھل السنۃ فی نفی القیاس فی التوحید و اثباتہ فی الاحکام الا داؤد الظاھری فانہ نفاہ۔

فقہا اور تمام اہل السنت کا موقف یہ ہے کہ عقائد میں قیاس روا نہیں ہے اور احکام میں درست ہے داؤد نے احکام میں بھی انکار کیا ہے[3]

تمام اہل السنت کی قید پر حیرت کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ شیعہ کا موقف اس موضوع پر اہل السنت سے بالکل جدا ہے ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ فرماتے ہیں:

ایک طبقے نے قیاس کے موضوع پر شدید مخالفت کی ہے ان میں سب سے مخالف شیعہ ہیں وہ اسے قطعاً حجت نہیں مانتے ہیں۔

---

[1] ابراہیم بن سیار نظام غالی معتزلی ہے اس کے حالات کے لیے الفرق بین الفرق ص ۱۱۳ تا ۱۳۶ دیکھیے۔ لسان المیزان ج ۱ ص ۶۷۔ تاریخ بغداد ج ۶ ص ۹۷۔ خطیب لکھتے ہیں کان احد فرسان اھل النظر والکلام علی مذھب المعتزلۃ۔ الحافظ بھی ان کے ہی شاگرد ہیں شعر میں صرف ملکہ ہی نہ تھا بلکہ لکھا ہے کہ دقت معانی کے مالک تھے۔ المرزبانی کا بیان ہے کہ تدقیق شعر اور تدقیق معانی میں نظام ایک مثالی شخصیت تھے (تاریخ بغداد)

[2] ارشاد الفحول ص ۱۸۶۔ [3] جامع بیان العلم و فضلہ ج ۲

ان کے بعد اہل الظاہر ہیں اور ان کے سرگردہ داؤد ظاہری اور مذہب ظاہریہ کے مشہور ناشر حافظ ابن حزم ہیں [۱]

الغرض یہ مسئلہ اہل حق میں کوئی خاص اختلافی نہیں ہے اور جن کو اختلاف ہے ان کی مخالفت اجماع میں قادح نہیں ہے جیسا کہ سیوطی نے تصریح کی ہے۔

البتہ محل بحث یہ ہے کہ اگر قیاس اور خبر واحد میں تعارض ہو جائے تو کیا کیا جائے۔ کیا خبر واحد کو مخالف قیاس ہونے کی وجہ سے رد کر دیا جائے اور یا پھر خبر واحد کو قبول کر کے قیاس کو رد کر دیا جائے۔

اس موضوع پر امام اعظم کی ترجمانی کرتے ہوئے بیگانوں نے نہیں بلکہ یگانوں نے کچھ پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔

فخر الاسلام بزدوی علی بن محمد کا کہنا یہ ہے کہ اگر خبر واحد کے راوی اصحاب کبار ہوں۔ مثلاً خلفاء راشدین، عبداللہ بن مسعود، زید بن ثابت، معاذ بن جبل، ابوموسیٰ اشعری، عائشہ اور دیگر صحابہ جو علم و فضل میں شہرت رکھتے ہوں تو ان کی روایت کردہ حدیثوں کو قیاس پر ترجیح دی جائے گی۔ خود فخر الاسلام نے اس کی توجیہ اس طرح کی ہے۔

> اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث نبوی کا حفظ و ضبط بڑا کٹھن کام ہے آپ کو اللہ کی جانب سے شان جامعیت ملی تھی۔ صحابہ میں روایت بالمعنے کا عام رواج تھا۔ اگر راوی حدیث کے معلوم کرنے اور اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہو تو اس بات کا خطرہ در پیش ہوتا ہے کہ حدیث کا کوئی جز اس سے نہ رہ جائے اور اس طرح حدیث میں قیاس سے ایک شبہ زائد داخل ہو جائے گا لہٰذا اس میں احتیاط بھی زیادہ چاہیے۔ اور اس قصور فہم سے ہمارا مطلب صرف مقابلے کے وقت میں فقہ حدیث میں احتیاط ہے صحابہ کی تحقیر ہرگز مقصود نہیں ہے امام محمد متعدد مواقع پر امام ابوحنیفہ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے انس بن مالک کی روایت کو اپنایا ابوہریرہ تو ان سے بڑھ کر ہیں

---

[۱] تاریخ الفقہ الاسلامی ص ۲۴۴۔

اس باب میں ہمارے اصحاب کا مسلک یہ ہے کہ ایسے راویان حدیث کی روایت اس وقت ترک کی جائے گی جب اس کے قبول کرنے میں کسی طرح کی گنجائش نہ ہو گی۔ جب قیاس کے سب دروازے بند ہو جائیں گے اس وقت وہ حدیث کتاب اور سنت مشہورہ کی مخالف تصور کی جائے گی اور اجماع کی بھی[1]

فخر الاسلام بزدوی نے امام اعظم کا جو موقف قرار دیا ہے یہ دراصل امام اعظم کا نہیں بلکہ عیسیٰ بن ابان کا موقف ہے۔ چنانچہ علامہ عبدالعزیز بخاری رقمطراز ہیں:

هٰذا مذهب عيسى بن ابان وتابعه اكثر المتاخرين۔

یہ عیسیٰ ابن ابان کا مذہب ہے اور اسی کی اکثر متاخرین نے پیروی کی ہے

ورنہ جہاں تک امام اعظم کے اس موضوع پر موقف کا تعلق ہے وہ نہیں جو فخر الاسلام بتا رہے ہیں بلکہ وہ ہے جو ان کے بھائی صدر الاسلام[2] سے صاحب تحقیق نے نقل کیا ہے کہ حدیث

---

[1] کشف الاسرار ج ۲ ص ۱۶۔

[2] یہ دو بھائی ہیں، ایک کا نام علی بن محمد لقب فخر الاسلام، کنیت ابو الحسن ہے، اور ان کے چھوٹے بھائی کا نام محمد بن محمد لقب صدر الاسلام اور کنیت ابو الیسر ہے۔ دونوں بھائی اپنے وقت کے امام ہوتے۔ ان کے جدِ امجد علامہ عبدالکریم صرف یہی نہیں کہ امام الہدیٰ ابو المنصور الماتریدی کے تلامذہ میں سے تھے بلکہ اپنے وقت میں درس و تدریس کا حلقہ بھی انہوں نے قائم کیا تھا۔ فخر الاسلام سمرقند کے قاضی تھے اور صدر الاسلام کا مستقر بخارا تھا۔ آخر زمانے میں بڑے بھائی کے انتقال کے بعد صدر الاسلام کو بھی سمرقند کا قاضی القضاۃ بنا دیا گیا۔ کان قاضی القضاۃ بسمرقند (الجواہر ج ۲ ص ۲۷۱) دونوں صاحب تصنیف ہیں۔ صدر الاسلام کے علمی کارناموں میں ان کی کتاب "اصول دین ہے"، علامہ قاسم بن قطلوبغا نے ان کی تصانیف کے بارے میں ان کے شاگرد رشید نجم الدین محمد نسفی صاحب عقائد نسفیہ کا یہ تأثر لکھا ہے کہ قد ملأ المشرق والغرب بمؤلفاته فی الاصول والفروع۔ فخر الاسلام کی تصانیف بھی ایک سے زیادہ کتابیں ہیں۔ مورخین نے ان کو امام فی الدنیا فی الفروع والاصول لکھا ہے۔ فخر الاسلام کی وفات بخارا میں رجب ۴۸۲ھ میں ہوئی۔ اور صدر الاسلام کی وفات رجب ۴۹۳ھ میں ہوئی ہے۔

اور قیاس میں اگر تعارض ہو جائے تو حدیث کو قیاس پر مقدم کیا جائے گا بشرطیکہ حدیث صحیح ہو اور کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو۔ صدر الاسلام نے امام اعظم کے اس مسلک کی توجیہ فرمائی ہے کہ

راوی کی عدالت اور ضبط ثابت ہو جانے کے بعد روایت میں تغیر و تبدل کا خیال ایک امر موہوم ہے۔ ظاہر ہے کہ راوی جو کچھ پیش کرتا ہے یہ اس کی سنی ہوئی بات ہے بالفرض اگر الفاظ میں اس کی جانب سے کوئی تغیر بھی ہوتا ہے تو یہ ایسا تغیر نہیں ہوتا جس سے مطلب بدل جائے کیونکہ ارباب عدالت راویوں کے بارے میں یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ اہل زبان ہیں اور زبان دانی کے ساتھ معنے کی تبدیلی کا گمان محض ایک خیال ہے اور ان کی عدالت و تقوی مان کر ان پر زیادتی اور کمی کا شبہ کرنا بھی بے محل ہے۔ نیز جس قیاس کی بنا پر روایت کو رد کیا جا رہا ہے خود اس قیاس کی صحت ہی کی کیا ضمانت ہے؟ قیاس صحیح سے واقفیت بھی دشوار تر ہے لہذا حدیث کو اپنانا ضروری ہے [1]

شیخ ابوالحسن کرخی نے بھی امام اعظم کے مسلک کی یہی ترجمانی کی ہے۔ چنانچہ علامہ عبدالعزیز بخاری فرماتے ہیں:

شیخ ابوالحسن کرخی اور ان کے ہمنواؤں کے نزدیک حدیث کے قیاس پر مقدم کرنے کے لیے راوی کی فقاہت شرط نہیں ہے بلکہ روایت کی قبولیت کے لیے صرف راوی میں عدالت اور ضبط ہونا کافی ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ حدیث قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو۔ بلاشبہ ایسی حدیث کو قیاس پر بھی مقدم کیا جاتے [2]

حافظ ابن الہمام نے بھی امام اعظم کا یہی مسلک بتایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

اذا تعارض خبر الواحد والقیاس بحیث لا جمع قدم الخبر مطلقاً عند الاکثر منھم ابوحنیفۃ والشافعی واحمد

---

[1] کتاب التحقیق ص ۱۶۴۔ [2] کتاب الاسرار ج ۲ ص ۱۴۔

حدیث اور قیاس میں اگر تعارض ہو جاتے اور کسی طرح بھی دونوں کا باہم جمع کرنا ممکن نہ ہو تو پھر حدیث کو بلا شرط مقدم کیا جائے گا۔ اکثر کی رائے یہی ہے ان ہی میں ابوحنیفہ، شافعی اور احمد ہیں[1]

دوسرے اکابر نے امام اعظم کے اس موقف کی تائید میں جو دلائل پیش کیے ہیں ان کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں لیکن علامہ عبدالعزیز بخاری نے اسی سلسلے میں جو بات پوری قوت سے بتائی ہے وہ سننے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں:

> جو بات فخر الاسلام نے پیش فرمائی ہے یہ ہمارے اصحاب سے قطعاً منقول نہیں ہے ان سے اس کے برعکس جو کچھ روایتہً ہمیں معلوم ہوا ہے وہ صرف یہ ہے کہ خبر واحد قیاس پر مقدم ہے اور اس بارے میں تفصیلاً ان سے کچھ بھی مروی نہیں ہے ۔۔۔ واقعات بھی اسی نظریہ کے مؤید ہیں۔ چنانچہ حدیث ابی ہریرہ کی وجہ سے بھول کر کھانے پینے سے روزہ ٹوٹنے کا فیصلہ ابوحنیفہ نے اسی بنا پر کیا ہے حدیث اگرچہ خلاف قیاس ہے لیکن اس کے باوجود اسی پر عمل ہے حتیٰ کہ امام اعظم سے منقول ہے کہ لولا الروایۃ لقلت بالقیاس ۔ اس موضوع پر اگر یہ روایت نہ ہوتی تو میں قیاس سے کام لیتا۔ اور یہ بھی امام اعظم سے منقول ہے کہ ماجاءنا عن اللہ والرسول فھو علی الرأس والعین اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے جو کچھ ہمارے پاس آتے وہ ہمارے سر آنکھوں پر ہے۔ اس بنا پر ہمارے اسلاف میں سے کسی سے بھی روایت کی صحت کے لیے راوی کے فقیہ ہونے کی شرط منقول نہیں ہے بلاشبہ یہ بات بعد کو گھڑی گئی ہے[2]

فقہ احناف میں جن روایات پر عمل نہیں کیا گیا ہے مثلاً حدیث عرایا، حدیث مصراۃ، اور حدیث قرعہ، اور جن کے متعلق لوگوں نے عمل نہ کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ خلاف قیاس ہیں۔

---

[1] تیسیر التحریر ج ۳ ص ۱۱۶۔ [2] کتاب التحقیق ص ۱۶۵۔

ان کا جواب دیتے ہوئے امام علامہ ابوالحسن کرخی رقمطراز ہیں :

> یہ غلط ہے کہ ہمارے اصحاب نے ان حدیثوں پر اس لیے عمل نہیں کیا کہ یہ خلاف قیاس ہیں بلکہ ان حدیثوں پر عمل نہ کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ حدیثیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے خلاف ہیں۔ اور یہ وجہ بھی نہیں کہ ان کے راوی فقاہت کی نعمت سے محروم ہیں۔ حدیث عرایا سنت مشہورہ کے خلاف ہے اور وہ سنت یہ ہے کہ التمر بالتمر مثل بمثل کیل بکیل کھجور کے بدلے کھجور برابر برابر۔ ہم یہ تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہیں کہ ابوہریرہ فقیہ نہیں تھے۔ آپ زمانۂ صحابہ میں فتویٰ دیتے تھے حالانکہ اس زمانے میں غیر فقیہ کے فتویٰ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی تھے۔ آپ نے ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی ہے اور آپ سے روایت کردہ حدیثوں کو کافی شہرت ہوئی ہے [1]

بہرحال یہ حقیقت بے غبار ہے کہ امام اعظم اور آپ کے اصحاب سنت بلکہ اخبار آحاد تک کو قیاس کے مقابلے میں راجح قرار دیتے تھے اور یہی امام اعظم کے موقف کی صحیح ترجمانی ہے۔

حدیث میں امام اعظم کے اصول

حدیث کی صحت اور اس کی قبولیت کے بارے میں امام اعظم نے جو اصول مقرر فرمائے ہیں۔ اور اس فن میں جو ایک فن کار کی حیثیت سے علمی خدمت سرانجام دی ہے اس کی ایک ادنیٰ سی جھلک آپ بالا صفحات میں دیکھ چکے ہیں اور آپ یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ تیسری صدی میں امام شعبہ اور یحییٰ بن معین کے زمانے تک امام اعظم کی ذات گرامی اس فن میں ارباب حدیث کے یہاں صرف علمی نہیں بلکہ استدلالی شخصیت تھی۔

امام اعظم کے وضع فرمودہ اصولوں کے بارے میں کچھ بزرگ ایک سنگین غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور انہوں نے اس کے نتیجے میں یہ باور کرانے کی ناکام کوشش کی ہے کہ امام اعظم کے

---

[1] کشف الاسرار ج ۲ ص ۲۳ ۔

نام سے اس موضوع پر جو بھی سرمایہ ہے وہ سب یار لوگوں کا گھڑا ہوا ہے اور تو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے خاص خطیبانہ انداز میں برملا کہہ دیا کہ

امام ابوحنیفہ اور ان کے صاحبین کو ان اختراعی اصول و قواعد کا وہم و خیال بھی نہ گزرا ہو گا۔[1]

میرے خیال میں یہ ان بزرگوں کی جانب سے بہت بڑی زیادتی ہے۔

دراصل یہاں دو چیزیں ہیں اور دونوں اپنے مزاج کے لحاظ سے الگ الگ ہیں صحتِ حدیث اور قبولیتِ حدیث۔

صحتِ حدیث کے لیے اصول و قواعد اور قوانین و ضوابط بنانا اگر محدثین کا کام ہے تو قبولیت کے لیے شرائط اور قواعد مرتب کرنا اربابِ اجتہاد اور فقہاء کا کام ہے۔ حدیث کی صحت کے لیے بخاری اور مسلم کے نام سے جو شرائط، جو اصول و قواعد اور جو ضوابط متاخرین نے بنائے ہیں اور بتائے ہیں ان میں ایک بھی معاصرت اور لقا کو مستثنیٰ کر کے امام بخاری اور امام مسلم سے صراحۃً منقول نہیں ہے۔ بلکہ بتانے والوں نے کھلے بندوں یہ انکشاف کیا ہے۔

اعلم ان البخاری و مسلماً و من ذکرنا بعدھم لم ینقل عن واحد منھم انہ قال شرطت ان اخرج فی کتابی ما یکون علی الشرط الفلانی و انما یعرف ذالک من سبر کتبھم فیعلم بذالک شرط کل رجل منھم۔

امام بخاری اور مسلم وغیرہ سے ایسی کوئی ثبت تصریح نہیں آئی جس میں ان بزرگوں نے یہ بتایا کہ کتاب میں تخریج روایت کی فلاں شرط کی میں نے پابندی کی ہے ان کی شرائط کا پتہ ان کی کتابوں کے مطالعہ سے ہوتا ہے اور بس۔[2]

الجزائری بھی علامہ مقدسی کے ہم زبان ہیں۔ فرماتے ہیں۔

اعلم ان البخاری لم یوجد عنہ تصریح بشرط معین و انما اخذ ذالک من تسمیۃ الکتاب والاستقراء من تعرفہ

---

[1] تذکرہ ص ۱۰۰۔ [2] شروط الائمۃ الستۃ ص ۱۵۔

خود بخاری کی کسی شرط کے بارے میں کوئی تصریح نہیں ہے ان کی کتاب
کے نام اور کتاب میں ان کے تفرقات سے لوگوں نے خود یہ اخذ کر
لیا ہے۔[1]

اگر حدیث کی صحت کے لیے شرائط وضوابط کا پیمانہ ان بزرگوں کے طرزِ عمل سے معلوم کر کے بنایا جاسکتا ہے اور اسے ان بزرگوں کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے تو پھر ائمہ مجتہدین ابو حنیفہ، ابو یوسف اور محمد کی کتابوں میں طرزِ عمل سے اگر متاخرین نے کچھ قواعد معلوم کر کے ان بزرگوں کی طرف منسوب کر دیے تو اس میں کون سی قباحت ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ صحتِ حدیث کے موضوع پر قوانین کی تخریج کو صرف برداشت نہیں کیا جاتا بلکہ اس پر تحسین وآفرین کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔ لیکن قبولیتِ حدیث کے میدان میں ائمہ اجتہاد کی طرف منسوب اصول وقوانین طبعِ نازک پر گراں ہوتے ہیں اور ان پر تخریجی ہونے کی پھبتی اور اختراعیت کا آوازہ کسا جاتا ہے فیا للاسف ویا للعار والی اللّٰہ المشتکی

دوسرے علوم وفنون کی طرح حدیث بھی ایک فن ہے اس کے بھی دوسرے علوم کی طرح تقاضے ہیں۔ بتایا جائے آخر وہ کون سا علم ہے جس میں قواعد وضوابط تخریجی نہیں ہوتے۔ اشتقاق، تصریف، معانی، بدیع، بیان، نحو وغیرہ زبان اور لغت سے متعلق اصول وقوانین کا نام ہے۔ کیا ان میں کوئی بھی منصوص ہے؟ سب کے سب بعد میں آنے والوں کے اختراعی اور تخریجی قوانین وضوابط ہیں۔ اس طرح کی تخریج اگر علمی طور پر غلط ہے تو علوم وفنون کی پوری دنیا مشکوک ہو کر رہ جائے گی اور کسی فن کے قواعد وضوابط کو بھی اعتماد وثوق کا پروانہ نہیں مل سکتا۔

اس سلسلے میں حکیم الامت شاہ ولی اللّٰہ کا اسم گرامی بھی پیش کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے حجۃ اللّٰہ البالغہ اور انصاف میں ان اصول وضوابط کے تخریجی ہونے کی تصریح کی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

> اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا اختلاف بزدوی وغیرہ کی کتابوں میں بیان شدہ اصولوں پر مبنی ہے لیکن

---

[1] توجیہ النظر ص ۸۸۔

امر واقعہ یہ ہے کہ یہ اصول زیادہ تر ان کے اقوال پر تخریج کیے گئے ہیں[1]

شاہ صاحب کی اس عبارت سے یہ سمجھنا کہ جملہ قواعد کا علمی سرمایہ تخریجی ہے اور چونکہ تخریجی ہے۔ اس لیے یہ سرمایہ ناقابل اعتبار ہے بہت بڑی زیادتی اور بے انصافی ہے۔ شاہ صاحب تو اس عبارت کے ذریعے اپنے مخاطبوں کے دماغوں میں مقدسی اور حازمی کی طرح ان قواعد کی تاریخی حیثیت پیش فرما رہے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ قوانین تخریجی ہیں اور صاحب مذہب سے خود مروی نہیں ہیں اور اس موضوع پر شاہ صاحب کے اس انکشاف کی حیثیت حرف بحرف وہی ہے جو مقدسی اور حازمی کے اس انکشاف کی ہے کہ صحت حدیث کے موضوع پر شرائط وغیرہ کا سرمایہ بخاری و مسلم کا خود ساختہ اور پرداختہ نہیں ہے بلکہ ان کے بعد میں آنے والے محدثین کا اختراعی اور تخریجی ہے جیسا کہ آپ پہلے سن آئے ہیں۔

انصاف ہی میں شاہ صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ

ان قواعد کی پابندی اور ان پر وارد شدہ اعتراضات کے جوابات میں تکلف سے کام لینا جیسا کہ بزدوی کا کام ہے۔ متقدمین کا ہرگز شیوہ نہیں ہے[2]

شاہ صاحب کے اس ارشاد کی حیثیت بھی بالکل اس محاکمہ کی ہے جو حافظ ابن الہمام نے ان متاخرین محدثین کے جواب میں پیش کیا ہے جنہوں نے حدیث کی اصحیت کو بخاری و مسلم کے دائرے میں محدود کر دیا تھا۔ حافظ ابن الہمام نے بتایا کہ

یہ خواہ مخواہ کی اڑپیچ ہے اس میں کسی کی تقلید روا نہیں ہے کیونکہ اصحیت کا مدار تو صرف ان شروط پر ہے جو ان بزرگوں نے اپنی کتابوں میں ملحوظ رکھی ہیں۔ اگر یہی شرطیں ان دو کتابوں کے علاوہ کہیں اور بھی پائی جائیں تو پھر اصحیت کو ان میں محدود کرنا بالکل بے معنی ہے[3]

یہ بات حافظ ابن الہمام نے ان سے کہی ہے کہ جو صحیحین کی حدیثوں کی اصحیت کا صرف صحیحین میں ہونے کی وجہ سے دعویٰ کرتے ہیں۔ اور تو اور حضرت مولانا ابو الکلام آزاد کو

---

[1] الانصاف ص ۸۲۔ [2] الانصاف ص ۸۳۔ [3] توضیح الافکار ج ۱ ص ۸۹۔

شیخ ابن الہمام کے خلاف استغاثہ کرنا پڑا۔ وہ فرماتے ہیں:

ابن الہمام نے اس طرح کے اصول بنانا شروع کر دیے کہ صحیحین کی ترجیح صحیحین کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ محض ان شروط کی وجہ سے ہے۔ اس لیے اگر دوسری کتاب کی روایت بھی ان شرطوں پر آئی تو قوت میں صحیحین کی روایت کے ہم پلہ ہو جائے گی حالانکہ صحیحین کی ترجیح محض ان شروط کی بنا پر نہیں بلکہ شہرت اور قبول کی بنا پر ہے۔ اور اس پر تمام اُمت کا اتفاق ہو چکا ہے[1]

اتفاقِ اُمت، شہرت اور قبول کی پوری داستان محدثین کی زبانی آپ پہلے سن چکے ہیں اس لیے یہاں اس کا تکرار بے معنے ہے۔

بہرحال اگر شاہ صاحب اور حافظ ابن الہمام دونوں کا آپ موازنہ کریں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ دونوں میں ایک رُوح کام کر رہی ہے فرق ہے تو صرف یہ کہ شاہ صاحب متاخرین فقہاء کے بارے میں وہی بات کہہ رہے ہیں جو ابن الہمام نے متاخرین محدثین کے بارے میں کہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اصُول و قواعد صحتِ حدیث سے متعلق ہوں یا قبولیت سے۔ دونوں تخریجی اور اختراعی اور بعد میں آنے والوں کے بناتے ہوتے ہیں۔ نہ تو محدثین کے یہاں صحتِ حدیث کے اصُول بذریعہ وحی آتے ہیں اور نہ فقہاء کے پاس قبولیت حدیث سے متعلق قوانین منصوص ہیں۔ اگر قواعد و ضوابط کو یہ کہہ کر پس انداز کر دیا جائے کہ یہ انسانوں کے بناتے ہوتے ہیں تو تمام نظام شریعت درہم برہم ہو جائے گا۔

اس میں علمی طور پر کوئی شک نہیں کہ اصُول و قواعد تخریجی ہیں اس لیے ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ہاں اس کی جگہ یہ بات عقل کو اپیل کرتی ہے کہ فن کے قواعد اہل فن کے بناتے ہوئے ہونے چاہئیں۔ کیونکہ کسی فن میں غیر فنکاروں سے استفادہ فن سے اعتماد ہٹا دینا ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر اس موقعہ پر بڑے پتے کی بات فرما گئے۔

تمام اسلامی فرقے اس پر متفق ہیں کہ ہر فن میں اس کے فنکاروں کی

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۵۰۰۔

بات حجت ہوگی۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو علوم و فنون کی دنیا ختم ہو جائے
کیونکہ اناڑی اول تو فن میں بات نہ کر سکے گا اور اگر بات کرے گا
تو غلط کرے گا۔[1]

یہ بات تو مبنی بر انصاف ہے لیکن اس میں کوئی معقولیت نہیں ہے کہ اصول و قواعد کو تخریجی بتا کر غیر معتبر قرار دے دیا جائے۔ اسے اگر بطور اصل تسلیم کر لیا جائے تو فن قراءت میں تجوید کے اصول، ادب و لغت میں لغت و زبان کے قواعد، فقہ میں اصول فقہ، حدیث میں اصول حدیث، تفسیر میں اصول تفسیر سب ہی انسانوں کے وضع کردہ اور تخریجی ہیں۔ ان کو اگر یہ کہہ کر رد کر دیا جائے کہ یہ وضعی اور تخریجی ہیں تو اسلام کے پورے علمی سرمایہ سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ اصول و قواعد حدیث کے ہوں یا فقہ کے۔ سب انسانی محنتوں کے رہین منت ہیں اس لیے یہ کہنا کچھ وزن نہیں رکھتا کہ احناف نے کچھ شرطیں لگائی ہیں جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ نے مجموعۃ الرسائل میں لکھا ہے۔

بہت سے اہل الرائے نے اکثر احادیث کا ایسی شرطوں کی وجہ سے
انکار کر دیا جو انہوں نے خود لگائیں ہیں۔[2]

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ حدیث کی صحت کے لیے اگر محدثین متاخرین شرطیں مقرر کریں تو یہ درست اور علم کی خدمت سمجھی جائے اور حدیث ہی کی قبولیت کے میدان میں اللہ کے دین میں احتیاط کی خاطر اگر احناف شرطیں بتائیں تو ان کو خود لگائی ہوئی شرطیں قرار دیا جائے۔ دونوں اُمتی ہیں دونوں فن کی خدمت اللہ کے دین کی خاطر کر رہے ہیں دونوں کا پیش نہاد دین کی حفاظت ہے دونوں میں یہ امتیاز کچھ قرین انصاف نہیں ہے۔

یہ درست ہے کہ یہ اصول و ضوابط بخاری و مسلم کی طرح امام اعظم سے صراحۃً منقول نہیں ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تدوین قانون کے موقعہ پر حدیث کے بارے میں کچھ ضوابط ان ائمہ مجتہدین کے ضرور پیش نظر ہوں گے جن کی روشنی میں انہوں نے حدیث و سنت کو قانون سازی میں استعمال کیا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے حدیث کی تصنیف کے موقعہ پر کچھ قوانین و ضوابط ضرور ائمہ ستہ حدیث کے پیش نظر تھے جن کی روشنی میں انہوں نے

---

[1] الروض الباسم ج ۱ ص ۷۷۔ [2] مجموعۃ الرسائل والمسائل ج ۵ ص ۲۱۔

حدیث کے مجامیع تیار کر کے اسلام کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ ان سے اگر صراحۃً اصول و ضوابط کا کوئی سرمایہ منقول نہیں ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ کہ صحت حدیث کے لیے ان بزرگوں کے پیش نظر کوئی ضابطہ ہی نہ تھا ایسے ہی حدیث کی قبولیت کے بارے میں اگر ائمہ مجتہدین ابوحنیفہ، ابویوسف اور محمد سے اصولی سرمایہ صراحۃً منقول نہیں تو اس کا بھی ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ تدوین شریعت کے میدان میں یہ بزرگ حدیث کی حد تک کسی قاعدے اور آئین کے پابند نہ تھے۔ یقیناً آپ کچھ قواعد کے ضرور پابند ہوں گے۔ باقی ان کا مدون نہ کرنا۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں اصول و قوانین کا وجود ہی نہ تھا اور تدوین شریعت کا سارا کام محض جزاف سے ہو رہا تھا۔

جن علماء نے اصول و قوانین پر تدوین کی خدمت انجام دی ہے انہوں نے ان کو ائمہ مذہب سے منقول فروعی علمی سرمایہ سے اخذ کر کے ائمہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج، اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ، الرد علی سیر الاوزاعی اور امام محمد کی الحجۃ علی اہل المدینہ، مؤطا، کتاب الآثار پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر امام اعظم کے استدلال کے قواعد عامہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

شاہ صاحب کا منشا

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو اپنے مطالعہ میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاہ صاحب انصاف اور حجۃ اللہ میں ان اصول و قوانین کے خلاف نہیں بلکہ عیسیٰ بن ابان جیسے حضرات کی ان آراء کے خلاف احتجاج کرنا چاہتے ہیں جو شعوری یا غیر شعوری طور پر حنفی فقہ میں داخل ہو گئی ہیں اور جن کو بعض جامد قسم کے فقہاء نے جدل و مناظرے کے لیے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے اس احتجاج میں شاہ صاحب منفرد نہیں بلکہ امام ابوالحسن کرخی اور حافظ ابن الہمام کی زبانی آپ پہلے اس موضوع پر بہت کچھ پڑھ چکے ہیں۔ چنانچہ جن قواعد کا نام لے کر شاہ صاحب نے تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ صاحب مذہب سے منقول نہیں ہیں اور ان کے لیے جن محققین کا حوالہ دیا ہے وہ وہی آراء ہیں جن کو متاخرین نے اصول کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے چنانچہ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

ان قواعد کے ائمہ مذہب سے منقول نہ ہونے پر محققین کا یہ قول

کافی ہے کہ یہ قاعدہ کہ ایک راوی جو ضبط و عدالت میں معروف ہو
مگر فقہ میں شہرت نہ رکھتا ہو تو اس کی وہ روایت واجب العمل نہ ہو
گی جس سے رائے اور قیاس کا دروازہ بند ہو جاتا ہو جیسے حدیث
مصراۃ۔ یہ عیسیٰ بن ابان کا مذہب ہے اور بہت سے متاخرین
اس کے قائل ہیں۔ لیکن امام کرخی اور بہت سے علماء کے نزدیک
راوی کا فقیہ ہونا ضروری نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ قول ہمارے
اصحاب سے منقول نہیں ہے بلکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ حدیث
قیاس پر مقدم ہے[1]

یہ تصریح اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ شاہ صاحب اصول و قواعد کی مطلق نفی نہیں فرما رہے ہیں جو ائمہ نے ارباب مذاہب کی فروعات سے اخذ کیے ہیں بلکہ ان آراء کی تردید کر رہے ہیں جن کا نام اصول رکھ لیا گیا ہے اور جن کا ارباب مذاہب سے تعلق نہیں ہے ورنہ جہاں تک ان اصول و قواعد کا تعلق ہے جو ہم نے کتاب میں حدیث کے موضوع پر امام اعظم کا نام لے کر پیش کیے ہیں وہ امام اعظم نے دلیل و برہان کے تحت اختیار کیے ہیں اور ان پر آج تک کسی بھی محدث نے یہ تنقید نہیں کی ہے کہ یہ اختراعی ہیں اور امام اعظم سے ثابت نہیں ہیں۔ اس موضوع پر امام اعظم کو دوسری صدی کے محدثین کی پوری پوری حمایت حاصل ہے۔ بلاریب جیسے معانی قرآن سے تصادم کے موقعہ پر کسی حدیث کو رد نہیں کیا بلکہ حدیث کی موجودگی میں قیاس سے متعلق بحث و اجتہاد کو بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ حکیم الامت نے امام اعظم کے اس موقف کی یہ کہہ کر وضاحت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ روزے دار اگر بھول کر کھا پی لے
تو امام اعظم حضرت ابوہریرہ کی حدیث پر عمل کرتے ہوئے روزہ
نہ ٹوٹنے کا فتویٰ دیتے ہیں حالانکہ روایت ابی ہریرہ قطعاً خلاف
قیاس ہے اس موقعہ پر امام اعظم فرماتے ہیں کہ اگر روایت نہ ہوتی
تو میں قیاس کے مطابق فتویٰ دیتا۔[2]

[1،2] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۶۱۔

اسی سے ان تمام اُصول وضوابط اور قواعد و قوانین کا اندازہ لگا لیجیے جو حدیث سے متعلق آپ پیچھے اوراق میں پڑھ چکے ہیں ۔

اُصول وضوابط صحت وقبولیتِ حدیث

اربابِ روایت اور ائمہ اجتہاد کے نقطۂ نگاہ میں چونکہ بنیاد ہی پر ایک عظیم فرق ہے۔ اس لیے ان کے پیش فرمودہ اُصول وضوابط میں بھی اختلاف ناگزیر ہے جو حیثیت محدثین کی حدیث کی صحت اور رجال اسناد میں ہے وہی حیثیت مجتہدین کی حلال وحرام کے احکام کی معرفت میں ہے اور دونوں میں ایسے بھی ہیں جن کو دونوں فنوں میں امامت حاصل ہے ۔

حافظ ابن تیمیہ کتاب الاستغاثہ میں جو بکری کی تردید میں لکھی ہے رقمطراز ہیں ۔

امام یحییٰ بن معین، بخاری، مسلم، ابوحاتم، ابوزرعہ، نسائی، ابن عدی، دارقطنی اور ان جیسے حضرات کے کلام کی حیثیت رجال اور صحیح وضعیف احادیث کے بارے میں وہی ہے جو امام مالک، سفیان ثوری، اوزاعی، شافعی اور ان جیسے حضرات کے کلام کی احکام اور حلال وحرام کی معرفت کے باب میں ہے ۔ اور ائمہ میں ایسے حضرات بھی ہوتے ہیں جو محدثین میں بھی امام ہیں اور فقہا میں بھی اور دونوں جماعتوں میں شامل ہیں ۔ گو ان میں سے ایک جماعت کی طرف ان کا انتساب زیادہ موزوں ہے ۔ اور حدیث و فقہ کے اکثر امام جیسے مالک، شافعی، احمد اور اسحاق ابن راہویہ اور اسی طرح اوزاعی، ثوری اور لیث ایسے ہی تھے اور اسی طرح ابو یوسف صاحب ابی حنیفہ اور خود امام ابوحنیفہ کا بھی وہ ہی مرتبہ ہے جو ان کے شایان شان ہے [1]

محدثین کا خاص موضوع اخبار و آثار کی تحقیق بلحاظِ روایت کرنا ہے اور بس۔ اس لیے ان پر اخبار ہی نقطۂ نظر غالب ہے اور وہ روایت کو معتبر یا غیر معتبر قرار دینے میں صرف اس کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ اسناد و رجال کے لحاظ سے وہ کیسی ہے ؟

---

[1] الرد علی البکری ص ۱۴۰، ۱۴۳ ۔

اس کے برعکس مجتہدین کے پیش نظر صرف اسناد و رجال ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ان کے پیش نظر بحیثیت مجموعی شریعت حقہ کا پورا سسٹم ہوتا ہے اس بنا پر حدیث کی قبولیت کے ضوابط ان کے یہاں اس کے زیر اثر مرتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ امام حازمی فرماتے ہیں:

اما الفقہاء فمدارک الضعف عندھم محصورۃ وجلھا منوط بمراعاۃ ظاہر الشرع۔

فقہا کے یہاں اسباب ضعف حدیث محدود ہیں اور ان میں عظیم تر یہ ہے کہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ حدیث ظاہر شریعت سے کس قدر موافق ہے[1]

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے شریعت کے پورے سسٹم پر نظر ہونے کا مطلب بتایا ہے کہ

مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان پانچ علموں کا جامع ہو۔ قرآن کی قرآت اور تفسیر، احادیث کا علم مع اسانید اور صحیح وضعیف کی معرفت، مسائل میں سلف کے ارشادات سے واقفیت، عربی زبان کا علم، استنباط مسائل اور نصوص میں تطبیق کا علم[2]

مولانا محمد اسماعیل الشہید نے مجتہدین کو شریعت کے پورے سسٹم پر بحیثیت مجموعی نظر ہونے میں انبیاء کے مشابہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

پس مشابہ بانبیاء دریں فن مجتہدین مقبولین اند۔ پس ایشاں را از ائمہ فن باید شمرد مثل ائمہ اربعہ۔ ہر چند مجتہدین بسیار از لیسیار گذشتہ اما مقبول درمیان جمہور امت ہمیں چند اشخاص اند۔ پس گویا کہ مشابہت تامہ دریں فن نصیب ایشاں گردیدہ۔ بناءً علیہ درمیان جماہیر اسلام از خواص و عوام بلقب امام معروف گردیدند۔

اس فن میں انبیاء سے مشابہت رکھنے والے مجتہدین ہیں ان کو اس فن کا امام سمجھنا چاہیے جیسے ائمہ اربعہ۔ اگرچہ مجتہدین بہت ہوتے ہیں لیکن جمہور امت میں مشہور یہی چند ہستیاں ہیں اس لیے گویا پوری پوری مشابہت اس فن میں ان کے ہی حصہ میں آئی ہے

---

[1] شروط الائمۃ الخمسہ ص ۵۱۔ [2] ازالۃ الخفاء۔

یہی وجہ ہے کہ جمہور اُمت کے خواص و عوام میں یہی بزرگ امام کے لقب
سے مشہور ہوتے ہیں۔[1]

اور امامت کا یہ مطلب بتایا ہے کہ

امامت در ہر کمال عبارت است از حصول مشابہت تامہ با نبیاء اللہ
دراں کمال۔

اور علامہ شاطبی نے اسی کمال کا تذکرہ اس طرح کیا ہے کہ

انما تحصل درجة الاجتهاد لمن اتصف بوصفين احدهما
فهم مقاصد الشريعة على كمالها والثانی من الاستنباط۔

درجہ اجتہاد صرف اس شخص کو ملتا ہے جو دو صفتوں سے موصوف
ہوتا ہے ایک یہ کہ پوری شریعت کے مقاصد کو سمجھتا ہو۔ دوسرے
یہ کہ مسائل نکالنے کی قدرت رکھتا ہو۔[2]

اسی کی جھلک آپ ان اصولوں میں دیکھیں گے جو ان بزرگوں نے رد و قبولیت روایات کے
لیے وضع فرماتے ہیں اور جن کے پیش نظر ان بزرگوں کی یہ حیثیت نہیں وہ ذرا سے فکری لغ
کو دیکھ کر بدک جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ جس طرح روایت و اسناد کو شب و روز کنگھالنے
کنگھالتے محدث کو یہ ملکہ ہو جاتا ہے کہ وہ صحیح اور غیر صحیح سند کو اپنے ذوق سے پہچان لیتا ہے
چنانچہ بتانے والوں نے عبدالرحمٰن بن مہدی کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے۔

میں نے عبدالرحمٰن بن مہدی سے دریافت کیا کہ آپ سلسلہ روایت
میں جھوٹے کا پتہ کیسے لگا لیتے ہیں؟ فرمایا جیسے حکیم مجنون کا پتہ
لگا لیتا ہے۔

اور اسی کمال کو وہ اپنے الفاظ میں یوں تعبیر کرتے تھے کہ:

معرفة الحديث الهام

حدیث کی معرفت الہام ہے۔[3]

ٹھیک ٹھیک اسی طرح مجتہد کو یہ ملکہ ہو جاتا ہے کہ متن حدیث پر نظر ڈالتے ہی یہ بتا د

---

[1] منصب امامت ص ۵۳۔ [2] الموافقات ج ۱ ص ۲۴۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۰۳۔

ہے کہ حدیث شریعت اسلامیہ کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہے یا نہیں۔ احادیث پر نظر ڈالتے وقت مجتہد کا یہی ملکہ ردّ و قبول کا معیار بن جاتا ہے۔ شریعت کا مزاج عین مزاج نبوت ہے جو شخص شریعت کے مزاج کو سمجھتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ متون احادیث کو دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ ان میں سے کون سا ارشاد اور کون سا عمل صاحب نبوت کا ہو سکتا ہے۔ بہرحال صحیح اور غیر صحیح سند کو پہچاننے کا ملکہ ہو جو محدثین کو ہوتا ہے یا متن حدیث کے ردّ و قبول کا ملکہ ہو جو مجتہدین کو ہوتا ہے۔ چونکہ یہ دونوں حالتیں سر تا سر ذوقی ہیں اور کسی ضابطہ کے تحت نہیں آتی ہیں اس لیے ان میں باہم اختلاف کی گنجائش ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے متن حدیث کی حد تک جیسے ائمہ مجتہدین میں بکثرت مسائل میں اختلاف ہوا ہے ایسے ہی صحت اسناد کی حد تک ائمہ روایت کے درمیان بھی روایات میں بکثرت اختلافات ہوتے ہیں:

ایک حدیث کو امام مسلم اس تحدی کے ساتھ اپنی صحیح میں لاتے ہیں کہ

لیس کل شیئ عندی صحیح وضعتہ ھھنا انما وضعت ھھنا ما اجمعوا علیہ۔

ہر وہ حدیث جو میرے نزدیک صحیح تھی اس کو میں نے یہاں درج نہیں کیا۔ میں نے صحیح مسلم میں صرف ان حدیثوں کو درج کیا ہے کہ جن کی صحت پر شیوخ کا اجماع ہے[1]

لیکن اس کے باوجود بہت سی حدیثیں ہیں جن کو کسی علت قادحہ کی بنا پر امام بخاری نے روایت نہیں کیا۔ یہاں حافظ عبد القادر قریشی کا بہت قیمتی بیان پڑھنے کے لائق ہے جو انہوں نے ایک ناقد کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

حافظ رشید عطار نے اُن حدیثوں پہ ایک کتاب لکھی ہے جو صحیح مسلم میں مقطوع آئی ہیں۔ اس کتاب کا نام "الفوائد المجموعہ فی شان ما وقع فی مسلم من الاحادیث المقطوعہ" ہے ــــ اور یہ جو لوگ کہہ دیتے ہیں کہ حدیث کو اگر شیخین روایت کر لیں تو معاملہ پار

---

[1] صحیح مسلم کتاب الصلاۃ باب التشہد

ہے۔ فنی لحاظ سے یہ محض ادعا ہے اور حدیث کی قوت کی یہ کوئی قانونی ضمانت نہیں ہے۔ آخر یہ مسلم ہی تو ہے جس میں لیث بن سلیم جیسے ضعیف راویوں سے بھی روایات آتی ہیں۔ یہ کہنا کہ مسلم میں اس قسم کے راویوں کی روایات کا درجہ محض شواہد، توابع اور اعتبار کا ہے درست نہیں ہے۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ شواہد اور توابع کی مدد سے کسی حدیث کا حال معلوم ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ امام مسلم نے کتاب میں اگر صحت کا التزام کیا ہے تو آپ ہی بتایئے کہ وہ حدیث جو خود ان راہوں سے آتی ہو وہ صحیح کیسے ہو گی؟

سب مانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ محدثین کے یہاں حدیث میں اَنَّ اور عَنْ کی تعبیر انقطاع کی نشاندہی کرتی ہے لیکن بخاری اور مسلم دونوں اپنی کتابوں میں عنعنہ پر مشتمل روایات لائے ہیں اس کے جواب میں یہ کہنا کوئی معنویت نہیں رکھتا کہ عنعنہ صحیحین کے علاوہ دوسری کتابوں میں منقطع ہونے کی نشانی ہے۔ امام مسلم نے بحوالہ ابی الزبیر عن جابر بہت سی معنعن حدیثیں روایت کی ہیں حالانکہ حفاظ کا فیصلہ ہے کہ ابوالزبیر مدلس ہے۔ حافظ ابن حزم اور حافظ عبدالحق نے لیث بن سعد کے حوالہ سے بتایا ہے کہ انہوں نے ابوالزبیر سے دریافت کیا کہ مجھے وہ حدیثیں سناؤ جو تم نے خود جابر سے سنی ہیں۔ انہوں نے صرف سترہ حدیثیں سنائیں۔ اس بنا پر حفاظ کہتے ہیں کہ لیث کی حدیثیں بحوالہ ابی الزبیر عن جابر صحیح ہیں لیکن مسلم میں جابر کی بحوالہ ابی الزبیر ایسی بھی حدیثیں ہیں جو لیث کی وساطت سے نہیں آتی ہیں اور جن میں عنعنہ ہے۔

نیز امام مسلم نے جابر اور ابن عمر کے حوالہ سے حجۃ الوداع کے موضوع پر یہ روایت پیش کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دسویں ذی الحجہ کو مکہ تشریف لے گئے آپ نے وہاں طواف افاضہ کیا پھر مکہ ہی میں نماز پڑھ کر منیٰ واپس تشریف لائے۔ دوسری روایت

میں ہے کہ آپ طواف افاضہ کر کے منیٰ تشریف لاتے اور نماز ظہر منیٰ
میں ادا کی۔ دونوں روایتوں کو جمع کرنے کے لیے یہ توجیہ کرتے ہیں کہ
نماز تو مکہ ہی میں ادا کی مگر منیٰ میں بیان جواز کے لیے دوبارہ پڑھی۔
مگر حافظ ابن حزم کہتے ہیں کہ ان دونوں روایتوں میں سے ایک بلا شبہ
جھوٹ ہے۔ ایسے ہی مسلم میں حدیث اسرا میں یہ اضافہ آیا ہے
کہ واقعہ اسرا آپ کو وحی آنے سے پہلے پیش آیا ہے۔ حفاظ حدیث
نے اس پر بڑی لے دے کی ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ ایسے ہی
مسلم کی حدیث خلق اللہ التربۃ یوم السبت باتفاق حفاظ ضعیف ہے۔[1]

الغرض بتانا یہ چاہتا ہوں کہ جیسے ائمہ مجتہدین قبولیت حدیث کی حد تک مسائل میں اختلاف رکھتے ہیں ایسے ہی محدثین بھی روایت حدیث کی حد تک صحت حدیث میں اختلاف رکھتے ہیں اور قبولیت و صحت میں ان کے فکری اختلاف کا مظاہرہ ان اصول و ضوابط میں بھی ہوا ہے جو اس موضوع پر ان بزرگوں سے منقول ہیں۔

تلامذہ حدیث اور امام اعظم

اگر یہ صحیح ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو پھر جیسا کہ امام ابن حجر مکی نے لکھا ہے کہ امام اعظم کی عظمت شان کو سمجھنے کے لیے یہ کافی ہے کہ بڑے بڑے ائمہ کو ان کے سامنے زانوئے شاگردی طے کرنے کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

مشائخ ائمہ مجتہدین اور علماء راسخین میں سے بڑے بڑے لوگوں
نے امام اعظم کی شاگردی اختیار کی ہے مثلاً امام جلیل عبداللہ بن المبارک
جن کی جلالت قدر پر اتفاق عام ہے اور جیسے امام لیث بن سعد اور
مالک بن انس۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ ناھیک بھؤلاء الائمۃ
ابو حنیفہ کو سمجھنے کے لیے بس یہ ائمہ کافی ہیں۔[2]

امام بخاری نے تاریخ کبیر میں حدیث میں امام اعظم کے یہ تلامذہ بتاتے ہیں۔

---

[1] الجواہر المضیئۃ ص ۴۳۰۔ [2] الخیرات الحسان ص ۱۸۔

روی عنہ — عباد بن العوام — ابن المبارک، ہشیم و وکیع —
ومسلم بن خالد — وابومعاویہ — والمقری [1]

شیخ الاسلام ابو محمد عبد الرحمٰن بن ابی حاتم رازی نے ان پر عبد الرزاق بن ہمام اور ابونعیم کا اضافہ اور کیا ہے [2] حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان ناموں کا اور اضافہ کیا ہے۔

حماد۔ ابراہیم بن طہمان، حمزۃ بن حبیب الزیات، زفر بن الہذیل۔
ابو یوسف القاضی۔ ابو یحیٰی الحمانی، عیسٰی بن یونس، یزید بن زریع،
اسد بن عمرو البجلی، حکام بن یعلی الرازی، خارجہ بن مصعب، عبد المجید
بن ابی رواد، علی بن مسہر، محمد بن بشیر العبدی، مصعب بن المقدام،
یحیٰی بن یمان، نوح بن ابی مریم، ابو عاصم [3]

حافظ عسقلانی نے آخر میں یہ بھی لکھا ہے کہ وآخرون یعنی ابوحنیفہ کے حدیث میں صرف یہی نہیں بلکہ اور بھی تلامذہ ہیں۔

خطیب بغدادی نے ان ناموں کی اور نشاندہی کی ہے۔

یزید بن ہارون، علی بن عاصم، یحیٰی بن نصر، عمرو بن محمد، ہوذہ بن خلیفہ [4]

حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ امام صاحب کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے والے دو قسم کے تلامذہ ہیں۔ ایک وہ ہیں جنہوں نے فقہ میں امام صاحب سے استفادہ کیا ہے اور دوسرے وہ ہیں جنہوں نے حدیث میں امام صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے اور دونوں کے لیے حافظ ذہبی نے جو تعبیری زبان اختیار کی ہے وہ الگ الگ ہے قسم اول کے لیے وہ لکھتے ہیں کہ:

تفقہ بہ جماعۃ من الکبار منہم زفر بن الہذیل وابو
یوسف القاضی الی اخرہ

اور قسم ثانی کے لیے وہ فرماتے ہیں:

روی عنہ من المحدثین والفقہاء عدۃ لا یحصون۔

---

[1] تاریخ کبیر ج ۴ ص ۸۱۔ [2] کتاب الجرح والتعدیل ج ۴ ص ۴۴۹۔
[3] تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۴۹۔ [4] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۲۴۔

اس کے بعد ان گنت محدثین میں سے چند محدثین کا بطور مشتے از خروارے تذکرہ کیا ہے۔ خود ان کی زبانی بہ نام گوش گزار فرمایئے۔

ممن اقرانہ مغیرۃ بن مقسم و زکریا بن ابی زائدہ و مسعر بن کدام و سفیان الثوری و مالک بن مغول و یونس بن ابی اسحاق و من بعدہم زائدہ و شریک والحسن بن صالح و ابوبکر بن عیاش و حفص بن غیاث، جریر بن عبدالحمید المحاربی، ابو اسحاق الفزاری، اسحاق بن یوسف الازرق، المعافی بن عمران، زید بن الحباب، سعد بن الصلت، حفص بن عبدالرحمٰن، عبیداللہ بن موسیٰ، محمد بن عبداللہ الانصاری، ابو اسامہ، ابن نمیر، جعفر بن عون، اسحاق بن سلیمان الرازی[1]

ہم نے بالارادہ تکرار سے بچنے کے لیے ان ناموں کو چھوڑ دیا ہے جو پہلے آچکے ہیں حافظ ابوالحجاج المزی نے تہذیب الکمال میں اگرچہ سارے تلامذہ کا استقصا نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے جن تلامذہ کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں تلامذہ کی بہتات کا تذکرہ کرنے اور نمونہ کے چند نام ذکر کرنے کے بعد "وبشر کثیر" اور مناقب میں "وخلائق" فرماکر تلامذہ کی کثرت کو بتایا ہے۔
اس بہتات کے اجمالی تذکرے کو حافظ عبدالقادر قرشی نے یہ کہہ کر بے نقاب کیا ہے کہ

روی عن ابی حنیفۃ ... نحو من اربعۃ آلاف نفر[2]

تلامذہ کی اسی کثرت اور بہتات کے تذکرے میں حاشیہ نسائی میں حافظ ابن حجر کے حوالے سے بعض ائمہ کا یہ تاثر نقل کیا ہے کہ

اسلام کے مشہور اماموں میں سے کسی کے اتنے اصحاب اور شاگرد نہیں ہوئے جس قدر امام ابوحنیفہ کے ہوئے اور جس قدر علماء نے آپ سے استفادہ کیا ہے اور سے نہیں کیا۔

امام اعظم کے تلامذہ کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ خلیفہ وقت کی حدود مملکت بھی اس سے

---

[1] مناقب ذہبی ص ۱۲۔ [2] الجواہر المضیئہ

زیادہ وسیع نہ تھیں۔ امام حافظ الدین بن البزاز الکردری نے امام اعظم کے مخصوص تلامذہ کا تفصیلی تذکرہ لکھنے کے بعد سات سو تیس مشاہیر علمائے کرام کے نام بقید نسب لکھے ہیں اور صوبہ وار ان کو شمار کیا ہے۔ چنانچہ جن صوبہ جات وممالک کا اس سلسلے میں انہوں نے نام لیا ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:

مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، کوفہ، بصرہ، واسط، موصل، جزیرہ، رقہ، نصیبین، دمشق، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز، کرمان، اصفہان، حلوان، استرآباد، ہمدان، نہاوند، رے، دامغان، قومس، طبرستان، جرجان، نیشاپور، سرخس، نسا، مرو، بخارا، سمرقند، کش، صغانیاں، ترمذ، بلخ، ہرات، قہستان، سجستان، رم، خوارزم،

حافظ الدین بن البزاز الکردری نے ان امکنہ کے جن خاص خاص تلامذہ کا تذکرہ زیر عنوان

من روی عنہ الحدیث والفقہ شرقاً وغرباً بلداً بلداً[1]

لکھا ہے ان کی تعداد سات سو تیس مشاہیر علماء ہیں۔

علامہ ابن الندیم نے الفہرست میں اسی بہنات کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے۔

العلم براً وبحراً شرقاً وغرباً بعداً وقرباً تدوینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ[2]

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دوسری صدی کے نصف ثانی میں امام اعظم کے تلامذہ دنیا کے چپہ چپہ پر پھیل چکے تھے اور ہر جگہ علم کی اشاعت میں مصروف تھے۔ زندگی کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہ تھا جہاں ان کا پرچم نہ لہراتا ہو۔ اقتدارِ حکومت سے مدرسوں اور خانقاہوں تک ان ہی کا پھریرا اڑ رہا تھا۔ بلکہ بہتوں کے لیے ان کی یہ مقبولیت اور ہر گوشہ حیات پر قبضہ باعث رشک بنا ہوا تھا۔ اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان شہروں میں آپ نے مرو کا نام پڑھا ہے۔ یہاں عرصہ سے فقہ حنفی کی حکمرانی تھی اور امام اعظم کے تلامذہ کی ایک بڑی جماعت یہاں قضا، افتاء اور تدریس میں مشغول تھی۔ علامہ نضر بن شمیل جب بصرہ سے مامون کی علمی قدردانیوں کی شہرت سن کر یہاں آتے تو امام اعظم کے علوم

---

[1] مناقب کردری۔ [2] فہرست ابن الندیم ص ۲۹۹۔

کی یہ قبولیت عام اور اشاعت عام دیکھ نہ سکے اور کچھ نوعمر محدثین کو اپنے ساتھ ملا کر امام اعظم کے علوم کے خلاف ایک منظم اسکیم بنا لی۔ چنانچہ صدر الائمہ نے بر سند لکھا ہے کہ فتح بن عمر کہتے ہیں :

نضر بن شمیل جس زمانے میں مرو میں مقیم تھے میں وہیں تھا انہوں نے امام اعظم کی کتابوں کو آب رواں میں بھیج کر دھونا شروع کیا۔ خالد بن صبیح نے جو ان دنوں مرو کے قاضی تھے، یہ کہانی سنی۔ تو وہ خود اور خانوادہ صبیح کے دیگر افراد فضل بن سہل کے پاس پہنچے۔ یہ مامون کا وزیر اعظم تھا۔ وراق کہتے ہیں کہ اس زمانے میں خانوادہ صبیح میں پچاس یا اس سے بھی زائد ایسے علماء موجود تھے جو عدلیہ میں کام کرنے کی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ خالد کے ساتھ ابراہیم بن رستم اور سہل بن مزاحم بھی تھے ان سب حضرات نے آکر فضل بن سہل کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ فضل نے واقعہ سن کر جواب دیا کہ میں اس وقت تک اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا جب تک کہ صورت واقعہ کو خلیفہ کے روبرو پیش نہ کر دوں۔ یہ کہہ کر فضل مامون الرشید کے پاس گیا اور اسے سارے واقعہ سے آگاہ کیا۔ مامون نے فریقین کے بارے میں پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ فضل نے بتایا کہ یہ نوخیز تو اسحاق بن راہویہ اور احمد بن زہیر ہیں مگر نضر بن شمیل ان کے ساتھ ہیں اور دوسرے خالد بن صبیح، سہل بن مزاحم اور ابراہیم بن رستم ہیں۔ مامون نے دوسرے روز دونوں کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ اسحاق اور ان کے ساتھیوں کو مامون کی گفتگو معلوم ہوئی تو اسحاق بن راہویہ کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ مامون سے گفتگو کون کرے گا۔ آخر مشورے سے یہ طے پایا کہ احمد بن زہیر مامون سے گفتگو کریں۔ چنانچہ دوسرے روز دربار میں حاضری ہوئی۔ مامون نے آتے ہی سلام کیا اور نضر بن شمیل سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ امام ابو حنیفہ کی کتابوں کے متعلق آپ

لوگوں نے یہ کیا رویہ اختیار کیا ہے؟ نصر تو خاموش رہے مگر احمد بن زہیر بولے کہ امیر المومنین اگر اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں۔ مامون نے کہا ہاں فرمائیے وہ بولے امیر المومنین! ہم نے ان کی کتابوں کو کتاب اللہ و سنت کے خلاف پایا ہے۔ مامون نے کہا کتاب و سنت کے خلاف کیسے؟ اتنا کہہ کر خالد بن صبیح سے ایک مسئلہ دریافت کیا کہ اس کے بارے میں ابوحنیفہ نے کیا کہا ہے؟ خالد نے امام موصوف کے قول کے مطابق فتویٰ بتایا۔ احمد بن زہیر اس کے خلاف روایت بیان کرنے لگے مگر مامون نے امام ابوحنیفہ کی تائید میں وہ احادیث پیش کیں جو ان لوگوں کے علم میں نہ تھیں۔ آخر میں مامون نے کہا کہ لو وجدناها مخالفاً لکتاب اللہ و سنۃ رسولہ ما استعملنا ہا اگر ہم ان کو کتاب و سنت کے خلاف پاتے تو ان پر عمل کرانے کے خواہش مند ہی کیوں ہوتے۔ خبردار اب آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔ اگر نصر بن شمیل تم میں نہ ہوتے تو میں تم کو ایسی سزا دیتا کہ یاد رکھتے [1]

الغرض امام اعظم کے تلامذہ کی ہمسری دیکھی نہ جا سکی۔ ان تلامذہ میں ایسی گرامی قدر شخصیتیں ہیں جو اپنے وقت میں نہ صرف حافظِ حدیث بلکہ علم حدیث کے آفتاب ہوتے۔ ان کا دامن اگرچہ بہت وسیع ہے مگر ہم یہاں صرف تقریب کی خاطر چند کا تعارف بطور مشتے از خروارے لکھتے ہیں۔

الحافظ یحییٰ بن زکریا ابن ابی زائدہ

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو صاحب ابی حنیفہ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ ابوسعید کنیت اور کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ الخطیب نے امام علی بن المدینی کے حوالہ سے ان کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ

حدیث میں روایت و اسناد کے سارے سلاسل کا محور صرف چھ بزرگ

---

[1] مناقب الامام ج ۲ ص ۵۵، ۵۶۔

ہیں۔ان کے نام بتاتے ان کے بعد ان چھ بزرگوں کا علم ارباب تصنیف کے حصے میں آیا ہے۔ بعدازیں ان ارباب تصنیف کا سارا علم دو یحییٰ نامی شخصیتوں میں سمٹ کر آیا ہے۔اوّل یحییٰ بن زکریا۔ دوم یحییٰ بن سعید۔ [1]

اور یہ بھی امام علی بن المدینی کا تاثر ہے کہ :

زمانہ ابن عباس میں علم ابن عباس پر زمانہ شعبی میں شعبی پر اور زمانہ ثوری میں ثوری پر اور زمانہ یحییٰ میں یحییٰ پر ختم ہے۔ [2]

صاحب تصانیف بزرگ ہیں۔حافظ ذہبی نے تو صرف اس قدر بتایا ہے کان اماما صاحب التصانیف لیکن ابن ابی حاتم کا کہنا ہے کہ کوفہ میں کتابوں کے سب سے پہلے مصنف یہی ہیں خطیب بغدادی نے بھی یہی لکھا ہے کہ

انہ اول من صنف الکتاب فی الکوفۃ وکان یعد فی فقہاء محدثی الکوفۃ۔

لیکن بات ابھی ناتمام اور ادھوری ہے۔ حافظ ابوجعفر طحاوی نے اس کی پوری وضاحت فرمائی ہے وہ بسند متصل اسد بن الفرات سے ناقل ہیں کہ

امام اعظم ابوحنیفہ کے وہ تلامذہ جنہوں نے تدوین کتب کا کام کیا ہے ان کی تعداد چالیس ہے۔ ان دس حضرات میں جو ان تمام میں اوّلین صف کے سمجھے جاتے تھے امام ابویوسف، امام زفر، داؤد الطائی، اسد بن عمرو، یوسف بن خالد اور یحییٰ بن زکریا ابن ابی زائدہ ہیں — اور یحییٰ کے سپرد لکھنے کا کام تھا اور یحییٰ تیس سال تک اس مجلس میں لکھنے کا کام کرتے رہے [3]

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ یحییٰ بن زکریا نے تدوین کا یہ کام پورے تیس سال امام اعظم کی نگرانی میں کیا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ یحییٰ کا تصنیفی کارنامہ ہے کیونکہ

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۱۵۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۴۷۔
[3] الجواہر المضیۃ ج ۲ ص ۲۶۲۔

وہ کتابت کا کام کرتے تھے ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ یحییٰ کا کارنامہ نہیں بلکہ امام اعظم کا تصنیفی کارنامہ ہے۔ یحییٰ تو صرف کتابت کا کام کرتے تھے کتابت کی بنا پر بعد کو محدثین نے یحییٰ کی طرف نسبت کر دیا۔ امام اعظم کے یہاں تصنیف کا طرز یہی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو املا کرایا کرتے تھے اور تعلیم و تصنیف کا سارا کام زبانی تھا۔ چنانچہ حافظ قاسم بن قطلوبغا نے منیۃ الالمعی میں تصریح کی ہے:

ان المتقدمین من علمائنا کانوا یملون المسائل الفقهیة و ادلتها من الاحادیث النبویة باسانیدهم۔

ہمارے علماء متقدمین مسائل اور ان کے دلائل کا احادیث نبویہ سے اپنی اسانید کے ساتھ املا کراتے تھے[1]

حال کے غیر مسلم محققین میں سے ڈاکٹر فلپ حتی نے بھی یہی انکشاف کیا ہے:

قد ھا ابو حنیفة فی الکوفة وبغداد و توفی سنہ ۷۶۷ء وکان قد احترف التجارة ثم مال عنها الی الفقه فاصبح اعظم علمائه فی الاسلام وقد افضی بتعالیمه شفها للتلامیذ[2]

ابو حنیفہ کوفہ اور بغداد میں پروان چڑھے ۷۶۷ء میں وفات پائی پہلے کاروبار کرتے تھے پھر شرائع کی طرف متوجہ ہوئے اور اسلام کے علماء میں عظیم ترین شخصیت بن کر سامنے آئے۔ آپ نے اپنی تعلیمات کو اپنے تلامیذ تک زبانی پہنچایا ہے[2]

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ اسی زمانے میں امام اعظم نے اختلاف الصحابہ، کتاب السیر، کتاب الآثار جیسی کتابیں اپنے شاگردوں کو املا کرائی ہیں۔ ان کے اولین کاتب یحییٰ ہیں۔ بعد میں یہی کتابیں ان کے شاگردوں سے موسوم ہو گئی ہیں مثلاً کتاب السیر امام حسن بن زیاد، کتاب السیر امام محمد وغیرہ وغیرہ۔ اوروں کا پتہ نہیں لیکن وکیع بن الجراح کا نام لے کر تو خطیب بغدادی نے علانیہ اور برملا لکھ دیا ہے کہ:

وکیع انما صنف کتبه علی کتب یحیی بن ابی زائدہ[3]

---

[1] منیۃ الالمعی ص ۹۔ [2] تاریخ العرب ج ۲ ص ۳۸۴۔ [3] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۱۶۔

یحییٰ بن زکریا کے سامنے جن ائمہ حدیث نے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے ان میں امام احمد، ابراہیم بن موسیٰ، ابوکریب اور زیاد بن ایوب کا نام لیا ہے لیکن حافظ ابوبکر الخطیب نے یحییٰ بن آدم، قتیبہ بن سعید، ہناد بن السری، محمد بن علیلی، یحییٰ بن معین، ابوبکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ اور سریج بن یونس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ

کان علی قضاء المدائن و بعد من حفاظ الکوفیین للحدیث مفتیا مثبتا۔

مدائن کے قاضی تھے اور ان کا شمار کوفہ کے حفاظِ حدیث میں ہے [1]

ان کی جلالتِ علمی کا اندازہ کرنا ہو تو یحییٰ بن سعید القطان کا وہ بیان پڑھیے جو حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ:

سارے کوفہ میں مجھے یحییٰ سے زیادہ اپنی مخالفت کا کسی سے اندیشہ نہ تھا [2]

اربابِ صحاح نے ان سے احادیث روایت کی ہیں۔ اور بمقام مدائن بعمر ۶۳ سال وفات پائی ہے۔

امام ابوعبدالرحمٰن المقری

عبداللہ بن یزید نام ابوعبدالرحمٰن کنیت اور المقری لقب ہے۔ سنہ ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے۔ علم قرأت میں امام نافع کے شاگرد ہیں۔ حدیث میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ امام اعظم کے تلامذہ میں سے ہیں۔ حافظ ذہبی رقمطراز ہیں:

سمع من عون و ابی حنیفۃ۔

بصرے میں ۳۶ سال اور مکہ معظمہ میں ۳۵ سال قرآن پڑھایا ہے اسی لیے مقری کر کے مشہور ہیں۔ حدیث کی ساری کتابوں میں ان کی روایات ہیں۔

حافظ ابوبکر الخطیب نے بسند متصل ان کے بارے میں انکشاف کیا ہے کہ:

بشر بن موسیٰ کا بیان ہے کہ امام ابوعبدالرحمٰن المقری ہم سے حدیثیں روایت کرتے تھے لیکن جب امام موصوف امام اعظم ابوحنیفہ

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۱۶۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ص ۱۹۷۔

کے حوالہ سے روایات پیش فرماتے تو ان کا دستور یہ تھا کہ تعبیر کا پیرایہ یہ اختیار فرماتے تھے کہ حدثنا شاھنشاہ یعنی محدثین کے ملک معظم نے ہم سے بیان کیا [1]

حافظ ذہبی نے تذکرہ میں ان کے حوالہ سے بسند متصل ایک حدیث روایت کی ہے جس میں نہ صرف ان کو امام اعظم کا شاگرد ظاہر کیا ہے بلکہ بتایا ہے کہ قطیعیات میں یہ سند عالی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

انبانا ابن قدامۃ اخبرنا ابن طبرزد انا ابو غالب بن البناء انا ابو محمد الجوھری انا ابو بکر القطیعی نا بشر بن موسیٰ انا ابو عبدالرحمن المقری عن ابی حنیفۃ عن عطاء عن جابر انہ رآہ یصلی فی قمیص خفیف لیس علیہ ازار و لا رداء۔ قال و لا اظنہ صلی فیہ الا لیرینا انہ لا باس بالصلاۃ فی الثوب الواحد [2]

ابن ابی حاتم کا مغالطہ

کتاب الجرح والتعدیل میں امام مقری کے ترجمہ میں امام مقری کا ایک ایسا بیان درج کیا ہے جو نہ صرف امام مقری کی شان جلالت کے خلاف ہے بلکہ تاریخی طور پر ثابت بھی نہیں ہے لکھتے ہیں کہ ابو عبدالرحمن مقری کہتے ہیں کہ ہم سے ابوحنیفہ حدیثیں بیان کرتے تھے اور جب احادیث کے بیان سے فارغ ہو جاتے تو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ یوں فرماتے ھذا الذی سمعتم کلہ ریح و باطل۔ یعنی تم نے مجھ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات سنے ہیں وہ ہوائی اور باطل ہیں ۔ بیان کی رکاکت ہی بتا رہی ہے کہ ذہنوں نے امام اعظم کی شان محدثانہ سے مرعوب ہو کر یہ افسانہ تراشا ہے ۔ امام اعظم تو امام اعظم ہیں ایک فاسق سے فاسق تر مسلمان کی زبان پر بھی ارشادات نبوت بتا کر یہ کلمات نہیں آتے۔ آئیے ذرا تاریخی طور پر بھی اس کا تجزیہ کر لیجئے اور دیکھئے کہ اس کی روایتی پوزیشن کیا ہے ۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۴۵ ۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ص ۱۶۰

ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ مجھے ابراہیم الجوزجانی نے ایک خط میں امام ابو
عبدالرحمٰن کا یہ بیان لکھا ہے۔

کیا ابراہیم الجوزجانی نے خود یہ بیان امام مقری سے سنا ہے ؟ ہرگز نہیں بلکہ فرماتے ہیں کہ
مجھے معلوم ہوا ہے یعنی ان کو کسی نے بتایا ہے۔ یہ بتانے والا کون ہے ؟ جوزجانی نے اس
کا نام نہیں بتایا۔ سند کا یہ انقطاع ہی زبان حال سے بول رہا ہے کہ کسی نے نہیں بتایا ہے
بلکہ یاروں کا بنایا ہوا افسانہ ہے۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اس کا مصنف کون ہے ؟ آپ مانیں
یا نہ مانیں یہ خود ابراہیم جوزجانی کے ہاتھوں کی صفائی ہے کہ نکہ اسماعیل بن ابان کہتے ہیں کہ
جوزجانی حق سے منحرف اور روگرداں تھے اور ناصبی مذہب رکھتے تھے[۱] حافظ ابن حجر
عسقلانی فرماتے ہیں کہ امام حبان فرماتے ہیں کہ جوزجانی حروری تھے یعنی حضرت علی کے مخالف
تھے۔ حافظ صاحب نے ہی تہذیب میں واقعہ لکھا ہے کہ ان کے دروازے پر ایک بار
محدثین کا مجمع تھا۔ جوزجانی کی کنیز چوزہ باہر لے کر آئی کہ اسے کوئی ذبح کر دے مگر آپ
یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ان کے تمام شاگردوں میں کسی کو اسلامی زندگی برتنے کا اتنا
بھی سلیقہ نہ تھا کہ کوئی چوزہ ہی ذبح کر دے۔ کنیز نے جوزجانی کو صورتِ حال سے آگاہ کیا
تو بولے واہ آج چوزہ کو ذبح کرنے والا کوئی نہیں ہے ایک وقت وہ تھا کہ علی مرتضیٰ
صرف چاشت کے وقت میں بیس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو ذبح کر دیتے تھے۔ لاحول
ولا قوۃ الا باللہ[۲]

اسی بنا پر حافظ صاحب نے جوزجانی کا نام لے کر صاف لکھ دیا ہے کہ

اما الجوزجانی فلا عبرۃ بحطہ علی الکوفیین

اور صرف تہذیب میں نہیں بلکہ لسان المیزان میں اس موضوع پر ایک فصل قائم کی ہے
اور یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ کوفہ والوں کے بارے میں جوزجانی کے جارحانہ اقدامات ناقابل
برداشت ہیں :

الحاذق اذا تامل تلب ابی اسحاق الجوزجانی رای العجب وذالک
لشدۃ انحرافہ فی النصب۔

---

[۱] میزان الاعتدال۔ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۱۸۲۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ کون ہے جس کے دامانِ تقدس پر جوزجانی کے لگائے ہوئے دھبے نہیں ہیں۔ امام اعمش، امام ابونعیم اور عبید اللہ بن موسیٰ بات کو مختصر کرکے فرماتے ہیں کہ اس کی چیرہ دستیوں سے اساطین حدیث اور ارکان روایت نالاں ہیں[1] اس بنا پر اگر جوزجانی نے امام اعظم کے خلاف یہ بے پر کی اڑائی ہے تو حیرت کی کوئی بات نہیں، بلکہ میں حافظ عسقلانی سے ایک قدم آگے بڑھا کر کہتا ہوں کہ —— آپ اس شخص کی زبان قلم سے دامانِ امامت کی حفاظت چاہتے ہیں جس کی زبان دہن سے دامانِ خدا فت محفوظ نہیں ہے فانا للہ والی اللہ المشتکی۔ حیرت جوزجانی پر نہیں بلکہ ان کی سادہ لوحی پر ہے جو جانتے بوجھتے اس قسم کی من گھڑت کہانیوں کو بلا تنقید نقل کر جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان لوگوں سے ابوحنیفہ کے فضل اور علم کو دیکھا نہیں گیا ہے۔ سینوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی جب کتابیں خورد برد کرنے کی سازش میں ناکامی ہوئی تو اس راہ سے دل کی بھڑاس نکالنے میں لگ گئے۔ عبد اللہ بن المبارک فرماتے ہیں کہ لوگ امام اعظم کے متعلق صرف از راہ حسد چہ میگوئیاں کرتے ہیں، حافظ ابن ابی داؤد محدث کہتے ہیں کہ امام اعظم کے بارے میں چہ میگوئیاں کرنے والے دو ہی قسم کے ہیں حاسد اور ناواقف، میرے نزدیک ناواقف دونوں میں غنیمت ہے، ناواقفیت کا ایک واقعہ بھی سن لیجئے:

عبد اللہ بن المبارک کہتے ہیں کہ میں شام میں امام اوزاعی کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ اے خراسانی کوفہ میں یہ کون بدعتی ہے جس کی کنیت ابوحنیفہ ہے۔ یہ سن کر میں گھر واپس آیا اور امام اعظم کی کتاب سے کچھ مسائل کا انتخاب کیا۔ تیسرے روز کتاب ہاتھ میں لے کر اوزاعی کی خدمت میں حاضر ہوا امام اوزاعی مسجد میں تھے۔ دریافت کیا کہ یہ کیا کتاب ہے؟ میں نے ان کو کتاب دے دی اس میں وہ مسئلے بھی ان کی نظر سے گزرے جن کی پیشانی پر میں نے لکھ دیا تھا کہ نعمان اس کے متعلق یوں فرماتے ہیں۔ لکھا ہے کہ اوزاعی نے اذان دے کر کھڑے کھڑے نماز سے پہلے جب کتاب کا ابتدائی حصہ دیکھ لیا تو کتاب رکھ دی اور نماز سے فراغت کے بعد کتاب کا پھر مطالعہ کیا تا آنکہ کتاب ختم کر دی۔ پھر مجھ سے دریافت کیا اے خراسانی یہ نعمان کون ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ ایک بزرگ ہیں میری ان سے عراق میں ملاقات ہوئی ہے۔ فرمایا یہ تو بڑے پائے کے بزرگ ہیں

---

[1] لسان المیزان ج ۱ ص ۱۶۱۔

جاؤ ان سے ملو اور علم حاصل کرو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو وہی ابوحنیفہ ہیں جن کے پاس جانے سے مجھے آپ روکتے تھے[1]

بہرحال امام ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن یزید المقری امام اعظم کے حدیث میں تلامذہ میں سے ہیں اور بعد کے محدثین کے بالواسطہ یا بلاواسطہ استاذ ہیں حتیٰ کہ حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ حدیث کی کوئی کتاب بھی ان کی روایات سے خالی نہیں ہے۔ امام عبداللہ بن المبارک ان کی امانت، ثقاہت، عدالت اور دیانت کو کھرے سونے سے تعبیر کرتے تھے[2]

امام عبداللہ بن المبارک

حافظ جمال الدین المزی نے تہذیب الکمال میں، حافظ ذہبی نے مناقب میں، حافظ جلال الدین السیوطی نے تبییض الصحیفہ میں اور امام بخاری نے تاریخ میں عبداللہ بن المبارک کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔

عبداللہ بن المبارک کی جلالتِ قدر کا اندازہ کرنا ہو تو امام الحسن بن عیسٰی کا یہ بیان پڑھیے وہ فرماتے ہیں کہ:

> عبداللہ بن المبارک کے تلامذہ نے ایک میٹنگ اس ارادے سے منعقد کی کہ امام موصوف کی خوبیاں بیان کی جائیں۔ جن خوبیوں پر سب کا اتفاق ہوا یہ تھیں۔ فقہ، ادب، نحو، لغت، زہد، شجاعت، شعر، فصاحت، قیام لیل، حج، جہاد فی سبیل اللہ، گھوڑے کی سواری، ترک مالایعنی، انصاف، رفقاء سے کم اختلاف۔ یہ سب خوبیاں آپ کی ذات گرامی میں جمع ہیں[3]

حافظ ذہبی نے بتایا ہے کہ امام بخاری نے بچپنے میں عبداللہ کی کتابوں کو ازبر کر لیا تھا۔ لیکن حافظ ابن حجر نے مقدمہ میں سولہ سال کی قید لگائی ہے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ابن المبارک کے سامنے ایک بار امام اعظم کا تذکرہ ہوا فرمایا اس شخص کے بارے میں کیا کہا جاتے جس کے سامنے دنیا اور اس کا پورا سرمایہ آیا مگر اس نے لات ماردی۔ کوڑے کھائے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۳۸۔ [2] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۸۳۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۲۔

تکلیفیں برداشت کیں مگر اس چیز کو ہرگز قبول نہیں کیا جس کے لیے اس وقت لوگ تمنائیں کر رہے تھے اور درخواستیں لیے پھر رہے تھے[1]

امام ابن المبارک فرماتے ہیں کہ میں نے امام اعظم سے زیادہ پارسا کوئی نہیں دیکھا ہے اور ایک نظم میں جو انہوں نے امام اعظم کی شان میں لکھی ہے امام اعظم کی محدثانہ شان کو سراہا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ امام ابن المبارک کے قلب میں امام اعظم کا کیا مقام تھا چنانچہ فرماتے ہیں۔

روی آثارہ فاجاب فیہا　　کطیران الصقور من المنیفہ

انہوں نے آثار کو روایت کیا تو ایسی بلند پروازی دکھائی جیسے شکاری پرندے بلند مقام سے اڑ رہے ہوں۔

ولم یکن لہ بالعراق نظیر　　ولا بالمشرقین ولا بالکوفۃ[2]

نہ عراق میں ان کی کوئی مثال تھی　　نہ مشرق و مغرب اور نہ کوفہ میں

امام اعظم کے فقہ کے بارے میں عبداللہ بن المبارک کا جو تاثر حافظ عبدالقادر نے سوید بن نصر کے حوالہ سے لکھا ہے اس سے ان لوگوں کی تردید ہوتی ہے جو لوگوں کو فقہ ابی حنیفہ کے بارے میں عبداللہ کی طرف منسوب کر کے افسانے سناتے رہتے ہیں ہیں۔ فرماتے ہیں:

لا تقولوا رای ابی حنیفۃ ولکن قولوا انہ تفسیر الحدیث

اسے ابو حنیفہ کی رائے نہ کہو بلکہ یہ کہو کہ یہ حدیث کی تفسیر ہے[3]

اور یہ بھی عبداللہ بن المبارک ہی کا کہنا ہے کہ حدیث سے چمٹے جاؤ اور حدیث کی خاطر امام اعظم سے کیوں؟ اس کی وجہ بھی خود عبداللہ بن المبارک کی زبانی سنیئے۔

یعرف تاویل الحدیث ومعناہ

اور خود ابن المبارک کا اپنی ذاتی تربیت کے بارے میں امام اعظم کے متعلق تاثر یہ تھا کہ

لولا ان اللہ اعاننی بابی حنیفۃ وسفیان کنت بدعیاً

امام ابو حنیفہ کے علوم سے پورے طور پر سیراب ہونے کے بعد سفیان ثوری سے شرف تلمذ

---

[1] مناقب ذہبی ص ۱۵۔ [2] جامع المسانید ج ۲ ص ۳۰۸۔
[3] الجواہر المضیۃ ج ۱ ص ۴۶۰۔

حاصل کیا ہے۔ امام ذہبی نے بسندِ متصل نقل کیا ہے کہ

مالزمت سفیان حتی جعلت علم ابی حنیفۃ بکذا

واشار بقبض یدہ۔

میں سفیان کے پاس اس وقت گیا جب میں نے ابوحنیفہ کے علم

کو پورے طور پر سمیٹ لیا[1]

ان کے زہد و تقویٰ اور پارسائی کا عالم یہ تھا کہ مشہور محدث سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ

میں نے صحابہ اور عبداللہ بن المبارک دونوں کے حالات کا مطالعہ

کیا مجھے صحابہ میں عبداللہ سے زائد صرف دو چیزیں معلوم ہوتی ہیں

ایک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف اور دوسرے

غزوات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت[2]

امام اعظم نے ان سے ان کی زاہدانہ زندگی کی تاریخ کے بارے میں دریافت کیا۔ فرمایا کہ ایک روز میں اپنے بھائیوں کے ہمراہ ایک باغ میں تھا۔ رات تک سارا وقت کھانے پینے میں گزر گیا۔ میں اس زمانے میں گانے بجانے کا بہت دلدادہ تھا۔ سحری کے وقت میں سو رہا تھا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ درخت پر بیٹھا ہوا ایک پرندہ کہہ رہا ہے۔

الم یان للذین امنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ و

ما نزل من الحق۔

میں نے اس سوال پر ہاں کہہ کر جواب دیا۔ آنکھ کھل گئی باجے وغیرہ توڑ کر نذر آتش کر دیئے

یہ میری زاہدانہ زندگی کا روزِ اول ہے[3]

ان علوم کا منبع تو آپ ان کی زبانی سن چکے ہیں۔ کہ میں نے امام ابوحنیفہ کے علم کو پورے طور پر سمیٹ لیا تھا۔ آئیے اب ان کی اس علم پر مشتمل تصانیف کا حال بھی سن لیجئے۔ یہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ امام بخاری نے سولہ سال کی عمر میں ان کی کتابوں کو زبانی یاد کیا تھا علمی طور پر ان کتابوں کا کیا مقام تھا اور ان میں کس قسم کے مسائل تھے۔ مشہور محدث یحییٰ بن آدم سے خطیب بغدادی نے بسندِ متصل نقل کیا ہے کہ:

---

[1] مناقبِ ذہبی ص ۲۵۔ [2] تاریخِ بغداد ج ۱ ص ۱۶۳۔ [3] الفوائد البہیہ ص ۳۹۔

جب میں دقیق مسائل کی تلاش میں ہوتا اور مجھے عبداللہ بن المبارک کی کتابوں میں بھی نہ ملتے تو میں مایوس ہو جاتا۔[1]

ان کی کتابوں میں حدیثوں کی تعداد کس قدر تھی؟ حافظ ذہبی نے یحییٰ بن معین کی زبانی بتایا ہے ان کی کتابیں تقریباً بیس ہزار حدیثوں پر مشتمل تھیں۔[2]

یتیم فی الحدیث کا مطلب

بزرگوں نے ان کو بھی معاف نہیں کیا اور امام اعظم کے متعلق ان کے منہ سے نکلے ہوئے اچھے بول کو غلط معنے پہنا کر ہنر کو عیب بنا دیا۔ بعد کو ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی میں بھی ابو حنیفہ کے بارے میں ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو لوگ غلط معنے پہنانے کی کوشش کرتے تھے اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جو خطیب بغدادی نے حماد بن احمد مروزی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:

میں نے ایک بار عبداللہ بن المبارک کو یہ کہتے سنا کہ

کان ابو حنیفۃ اٰیۃ

ایک شخص بول پڑا اے ابو عبدالرحمٰن! یہ بتایئے کہ آیت کس میں تھے شر میں یا خیر میں۔ عبداللہ بن المبارک نے فوراً ڈانٹ کر کہا کہ خاموش رہو۔ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ آیت کا لفظ خیر ہی کے لیے آتا ہے شر کے لیے آیت نہیں غایت آتا ہے یوں بولا جاتا ہے اٰیۃ فی الخیر او غایۃ فی الشر اور بعد ازیں قرآن کی یہ آیت تلاوت کی —

وجعلنا ابن مریم وامہ اٰیۃ[3]

جیسے اس شخص نے عبداللہ کے منہ سے نکلے ہوئے اچھے فقرے کو جس میں وہ امام اعظم کو اللہ سبحانہ کی نشانی بتا رہے تھے عبداللہ ہی کے سامنے غلط معنے پہنا دیئے ٹھیک اسی طرح عبداللہ ہی کے منہ سے نکلے ہوئے اچھے بول کان ابو حنیفۃ یتیما فی الحدیث کو یار لوگوں نے ایسے معنے پہنا دیئے جس سے ان کا جی تو خوش ہوا ہوگا لیکن متکلم کی روح تڑپ کر رہ گئی ہوگی اور

---

[1] تاریخ بغداد۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۴۔ [3] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۳۶۔

اسی پر بس نہیں بلکہ روایت بھی بالمعنے شروع کر دی کہیں یتیماً کہیں مسکیناً روایت کیا۔ خطیب بغدادی اور محمد بن نصر مروزی کی روایت میں یتیم آیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے الجرح والتعدیل میں یتیم کی جگہ مسکین لکھا ہے اور ابن عبد البر نے جو روایت بحوالہ ابوالموجہ پیش کی ہے اس میں نہ یتیم ہے نہ مسکین بلکہ تہیم آیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب بات نہ بنی تو اسے بنانے کی دوبارہ کوشش میں روایت میں نیرنگی آ گئی ہے اور پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ جن راہوں سے یہ روایت گزر کر آئی ہے اور جن جن سندوں اور طرق سے عبد اللہ بن المبارک کا یہ بیان آیا ہے ان میں کوئی طریق بھی ایسا نہیں جسے صحیح کہہ دیا جاسکے۔ لیکن اگر ہم روایت کا محدثانہ نقطۂ نظر سے پوسٹ مارٹم نہ کریں اور مان لیں کہ واقعی حضرت عبد اللہ نے یہ بات فرمائی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم ایسے غلط معنے پہنا کر لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کریں کہ امام اعظم کو حدیث نہ آتی تھی کیونکہ لفظ یتیم دو معنے میں استعمال ہوتا ہے ایک لغوی اور دوسرے محدثین کے اصطلاحی۔

لغت میں یتیم کے معنے صاحب قاموس نے یگانہ اور نادر کے لکھے ہیں الیتیم الفرد وکل شیئ یعز نظیرہ۔ یگانہ اور ہر ایسی چیز جو نادر المثال ہو۔ زمخشری رقمطراز ہیں کہ درۃ یتیمۃ بیت یتیم اور رحمۃ یتیمۃ کے محاورات بے مثال اور نادر الوجود کے لیے بولے جاتے ہیں۔ بچہ بے باپ کے ہو کر فرد رہ جاتا ہے اس لیے وہ یتیم کہلاتا ہے۔ مطلب صاف ہے کہ امام اعظم حدیث میں نادرۃ الدہر اور عدیم النظیر شخصیت ہیں اور یہ بھی یہ بات ٹھیک۔ عبد اللہ بن المبارک کے دوسرے بیان بھی اس کے مؤید ہیں۔

اصطلاح محدثین میں یتیم وہ شخص کہلاتا ہے جو ایک حدیث کو کم از کم ایک سو سندوں سے روایت نہ کرے چنانچہ مشہور محدث ابراہیم بن سعید جوہری کہتے ہیں۔

کل حدیث لم یکن عندی من مائۃ وجہ

فانا فیہ یتیم۔

جو حدیث مجھے سو سندوں سے نہ ملے تو میں اس میں اپنے کو یتیم سمجھتا ہوں[1]

حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے بھی یہی بات الروض الباسم میں نقل کی ہے۔

اگر اس معنے کے لحاظ سے امام اعظم حدیث میں یتیم ہیں تو یہ بات نہ امام اعظم کے لیے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۹۔

قدح ہے اور نہ کسی کے لیے قابلِ مدح ہے۔ امام اعظم کا زمانہ اکثارِ طرق کا زمانہ نہ تھا۔ اس لحاظ سے تو سارے تابعین اور سارے صحابہ حدیث میں یتیم ہیں کیونکہ صحابہ اور تابعین میں کسی کو بھی کوئی ارشادِ نبوت سو سو طرق سے معلوم نہ تھا اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ حدیث تو دراصل نام ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور آداب و احوال کا۔ نہ کہ اکثارِ طرق کا۔ اسلام کی زندگی میں مسائل کے لیے ضرورت کی چیز حدیث ہے نہ کہ طرق۔ اور امام اعظم کو یہ چیز بخوبی حاصل تھی جیسا کہ آپ سن آئے ہیں کہ امام اعظم چار ہزار احادیث روایت کرتے تھے اور یہ بھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ احادیث احکام کی کل تعداد بھی چار ہزار ہی ہے یہی تعداد بعد کو فن پیدا ہونے پر محدثین کے زمانے میں تیسری صدی میں چار ہزار سے لاکھوں تک پہنچ گئی۔

اس فن کے مشہور محدث اسرائیل اس موقعہ پر بڑے پتے کی بات فرما گئے کہ

> نعمان کیا ہی مزے دار شخص تھے فقہ سے متعلق ہر حدیث ان کو خوب یاد تھی اس کی ان کو بے حد جستجو تھی اور اس میں جو کچھ فقہ ہوتا اس کے خوب ہی عالم تھے انہوں نے حماد سے حدیثیں یاد کی تھیں اور خوب یاد کی تھیں اس لیے ان کی خلفاء، امراء اور وزراء سب عزت کرتے تھے۔[1]

بہرحال عبداللہ بن المبارک امام اعظم کے تلامذہ میں سے تھے بعد کے تمام محدثین ان سے شرف تلمذ رکھتے ہیں۔ امام احمد کے خاص اساتذہ میں سے ہیں اور یہی وہ مثالی شخصیت ہے جو زہد و تقویٰ میں امام اعظم سے پوری پوری مشابہت رکھتی تھی۔ یعنی زہد، تھوڑی پونجی پر گزر بسر کرنا، بادشاہوں اور اربابِ اقتدار سے دور رہنا، دین کو اپنے رزق کے لیے راہ نہ بنانا، دین کے معاملات میں پستی اور دناءت کا اظہار نہ کرنا۔ یہ تمام باتیں عبداللہ بن المبارک کی ذاتِ گرامی میں پائی جاتی تھیں رحمہ اللہ تعالیٰ۔

الامام ابراہیم بن طہمان

حافظ ذہبی نے ان کا حفاظِ حدیث کے پانچویں طبقے میں ذکر کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے کبار

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۳۹۔

تلامذہ میں سے تھے۔ اوران کے فخر کے لیے یہ کافی ہے کہ خود امام اعظم نے استاد ہونے کے باوجود ان سے روایت لی ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے۔

حدث عنہ من شیوخہ صفوان بن سلیم، وابوحنیفۃ الامام [1]

محدثین کے عرف میں اس قسم کی روایات کو روایۃ الاکابر عن الاصاغر کہتے ہیں۔ اور ایک محدث کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے سے بالا اور کمتر اور اپنے جیسوں سے روایت کرے۔ علامہ ترمسی نے محدثین کبار کا فیصلہ لکھا ہے کہ

لا یکون محدثا حتی یاخذ عمن فوقہ ومثلہ ودونہ
محدث ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے سے برتر، کمتر اور مثیل سے روایت لے [2]

اسی بنا پر محدثین نے اس کی عظمت شان اور جلالت قدر کا اقرار کیا ہے وہ فرماتے ہیں،

ورع مہم تدعو الیہ الہمم العالیۃ والانفس الزکیۃ۔

بہرحال امام اعظم نے استاد ہونے کے باوجود ابراہیم بن طہمان سے روایت لی ہے ابراہیم کی جلالت قدر کا اندازہ ان کے تلامذہ سے ہو سکتا ہے۔ ان کے تلامذہ میں ابوبکر الخطیب نے عبداللہ بن المبارک، سفیان بن عیینہ، خالد بن نزار، وکیع بن الجراح، عبدالرحمٰن بن مہدی، ابوعامر العقدی، محمد بن سابق، یحییٰ بن ابی بکیر کا نام لیا ہے۔ حافظ ذہبی نے ان کو الحافظ الامام کے لقب سے نوازا ہے۔ مشہور محدث اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں کہ ابراہیم کی حدیث میں ثقاہت مسلم ہے ہمیشہ سے ائمہ ان کی حدیثوں کے خواہاں رہے ہیں اور سب نے ان کی ثقاہت کی منادی کی ہے [3]

افسوس ہے کہ ایسا باکمال اور بلند پایہ محدث بھی ارباب ظواہر کی فرقہ وارانہ چشمک سے بچ نہ سکا۔ چونکہ امام اعظم کے شاگرد تھے اور اس بات کے قائل تھے کہ ایمان وعمل دو جداگانہ چیزیں ہیں اور دونوں کا حکم مختلف ہے اس بنا پر بزرگوں نے ان پر بھی مرجئہ ہونے کی

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۱۰۰۔ [2] منہج ذوی النظر ص ۲۳۲۔ [3] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۱۰۸۔

تہمت لگا دی ۔ یہاں بھی نعیم بن حماد اور ابو اسحاق الجوزجانی نے اپنی جولانی طبع کا ان کو نشانہ بنایا۔ لیکن ان کو پھر بالآخر منہ کی کھانی پڑی ۔ اور حافظ ذہبی کو کہنا پڑا۔

فلا عبرة بقول مضعفه

اس زعم کے خلاف تمام ارباب صحاح ان کی حدیث سے احتجاج پر متفق ہیں اور مشہور محدث اقرار کرتے ہیں کہ :

انه حسن الحديث يميل شيئا الى الارجاء فى الايمان حبب الله حديثه الى الناس [1]

ذرا ٹھہر جایئے اور یمیل شیئا الی الارجاء فی الایمان کی حقیقت بھی گوش گزار فرما لیجئے ۔ خدا بھلا کرے محدث خطیب بغدادی کا کہ وہ اس مقام پر ارجاء کی حقیقت ابو الصلت کے حوالہ سے یہ کہہ کر بے نقاب کر گئے ۔

قال على :- قال ابو الصلت لم يكن ارجاء هم هذا المذهب الخبيث ان الايمان قول بلا عمل وان ترك العمل لا يضر بالايمان بل كان ارجاء هم انهم كانوا يرجون لا بل الكبائر الغفران ردا على الخوارج و غيرهم الذين يكفرون الناس بالذنوب فكانوا يرجون ولا يكفرون بالذنوب و نحن كذالك

ان کا ارجاء یہ مذہب خبیث نہ تھا کہ ایمان قول بغیر عمل ہے اور ترک عمل سے کچھ نہیں بگڑتا ہے بلکہ ان کا ارجاء تو صرف یہ تھا کہ وہ گنہ گاروں کے لیے اُمیدوار مغفرت تھے وہ خوارج کی تردید کرتے تھے جو لوگوں کو صرف گناہ کی پاداش میں دائرۂ اسلام سے نکال دیتے ہیں وہ بخشش کی اُمید کرتے تھے اور کسی کو گناہ کی وجہ سے کافر نہ کہتے تھے اور ہم بھی ایسے ہی ہیں ۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ خطیب نے بتایا ہے کہ امام وکیع بن الجراح اور سفیان ثوری جیسے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۹۸ ۔

محدثین کا بھی یہی مذہب ہے۔

وکیع بن الجراح کہتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوری سے بھی آخر میں یہی سُنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ ہم سارے مسلمان گنہ گاروں کے لیے جو ہماری نماز پڑھتے ہیں اُمیدوار مغفرت ہیں خواہ وہ کیسا ہی عمل کریں۔[1]

اور واقعہ یہ ہے کہ مانتے تو سب تھے لیکن محدثین فقہاء کی یہ تعبیر سننے کو تیار نہ تھے کہ ایمان و عمل جُدا جُدا ہیں اور ان میں ہر ایک کا حکم مختلف ہے۔ صرف یہ دیکھ کر کہ ایمان وعمل کو جُدا جُدا سمجھنا مرجیۃ کا مذہب ہے اس کی تردید کرتے تھے۔ چنانچہ امام بخاری اپنی صحیح میں اس کے خلاف عنوان پر عنوان لاتے ہیں۔ حالانکہ مرجیۃ کے نزدیک عمل کی حیثیت ہی کوئی نہیں ہے ان کا تو کھلا مذہب یہ ہے کہ اگر ایک شخص سچے دل سے توحید و نبوت پر ایمان رکھتا ہے تو پھر اسے گناہ کی کوئی پروا نہیں اور وہ سارے گناہوں کے باوجود آخرت کی بازپرس سے آزاد ہے لیکن محققین اہل السنت جو عمل کو جزو ایمان نہیں بتاتے ان کے نزدیک ایک گنہ گار مسلمان کا معاملہ اللہ سبحانہٗ کے اختیار میں ہے چاہے تو اپنے فضل سے بخش دے اور چاہے تو اپنے عدل کے مطابق سزا دے اور خود امام بخاری کا بھی یہی مذہب ہے۔ بہرحال ابراہیم بن طہمان کی برگزیدہ شخصیت اس سے برتر تھی۔

امام احمد بن حنبل کے دل میں ان کی اس قدر عظمت تھی کہ ایک بار ان کی مجلس میں ابراہیم کا ذکر ہوا تو امام احمد بیماری کی وجہ سے ڈھاسنا لگاتے بیٹھے تھے اُٹھ بیٹھے اور فرمایا:

لا ینبغی ان یذکر الصالحون فیتکأ۔[2]

صالحین کا ذکر ہو تو ڈھاسنا لگانا اچھا نہیں ہے۔

ولادت ہرات میں ہوئی اور وفات ۱۶۳ھ میں حرم محترم میں ہوئی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

الامام الحافظ مکی بن ابراہیم

حافظ ذہبی نے ان کا ذکر اس طرح شروع کیا ہے۔ الحافظ الامام، شیخ خراسان۔ اور ان کے اساتذہ میں یزید بن ابی عبید اور بہز بن حکیم کے ساتھ امام ابو حنیفہ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۰۹۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۹۲۔

حدث عن یزید بن ابی عبید و جعفر الصادق و بہز بن حکیم و ابی حنیفۃ و ھشام۔

امام مکی بن ابراہیم امام اعظم کے خاص تلامذہ میں سے ہیں۔ صدر الائمہ رقمطراز ہیں کہ مکی بن ابراہیم کوفہ آئے اور امام اعظم کی خدمت میں ایک عرصہ تک رہے اور آپ سے فقہ و حدیث حاصل کیا اور بکثرت روایتیں لیں [1]

امام مکی علم حدیث میں بہت بڑے امام ہیں، بڑے بڑے جلیل القدر ائمہ ان کے شاگرد تھے۔ امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین اور امام بخاری نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔ خود امام مکی کا بیان ہے کہ میں نے ساٹھ حج کیے، دس سال تک حرم محترم کا مجاور رہا ہوں اور سترہ تابعین سے حدیثیں لکھی ہیں اور یہ بھی فرماتے تھے کہ ۱۲۶ھ میں پیدا ہوا۔ اور سترہ سال کی عمر میں علم حدیث کی تحصیل شروع کی [2] حافظ عسقلانی نے تہذیب میں یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ لوگوں کو میری ضرورت پیش آئے گی تو میں سوائے تابعین کے کسی سے بھی حدیث نہ لیتا [3] ان کے آغاز علم کی داستان بھی بڑی مزے دار ہے۔ کیونکہ ان کو تحصیل علم کے لیے امام ابوحنیفہ نے ہی متوجہ کیا تھا۔ چنانچہ امام حارثی عبد الصمد بن فضل کی زبانی ان سے ناقل ہیں کہ میں کاروبار کرتا تھا ایک بار امام اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا کہ تم تجارت کرتے ہو مگر تجارت میں علم کے بغیر سراسر خسارہ بھی خسارہ ہے۔ تم علم کیوں نہیں حاصل کرتے ہو اور احادیث کیوں نہیں لکھتے۔ امام موصوف مجھے برابر اس طرف توجہ دلاتے رہے حتیٰ کہ میں نے اس وادی میں قدم رکھ دیا اور کتابت علم کی طرف متوجہ ہو گیا اور اللہ سبحانہ نے مجھے علم کی دولت مرحمت فرمائی اس لیے میں ہر نماز کے بعد اور جب بھی امام ممدوح کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں۔

لان اللہ تعالیٰ ببرکتہ فتح لی باب العلم

کیونکہ آپ ہی کی برکت سے اللہ سبحانہ نے میرے لیے علم کا دروازہ کھولا ہے [4]

---

[1] مناقب صدر الائمہ ج ۱ ص ۲۰۳۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۲۳۔
[3] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۹۵۔ [4] مناقب صدر الائمہ ج ۲ ص ۱۶۱

ظاہر ہے کہ آپ امام اعظم سے پندرہ سولہ سال کی عمر میں کاروبار ہی کے سلسلے میں ملے ہوں گے اسی عمر کے لڑکے کو علم کی ترغیب دی جاتی ہے۔ سال ڈیڑھ سال سوچ بچار میں گزر گیا اور بالآخر آپ نے سترہ سال کی عمر میں علم حدیث کے طالب علم کی حیثیت اختیار کر لی اور اس سلسلے میں الدین استاد آپ کے امام اعظم ہوتے اور آپ ۱۴۳ھ سے ۱۵۰ھ تک امام اعظم کے علوم سے خوشہ چینی کرتے رہے اور آپ کی وفات کے بعد آپ نے حجوں کا سلسلہ شروع کیا اور پہلا حج ۱۵۰ھ ہی میں کیا۔ خطیب نے عبدالصمد بن الفضل کے حوالہ سے انکشاف کیا ہے کہ آپ نے ساٹھ حج کیے ہیں۔ اگر آپ کی وفات جیسا کہ محمد بن سعد نے بتایا ہے ۲۱۰ھ میں ہوئی ہے تو حجوں کی یہ تعداد اسی طرح پوری ہو جاتی ہے کہ آپ کا پہلا حج ۱۵۰ھ میں ہو۔

امام اعظم کے علم کے بارے میں ان کا تاثر یہ تھا کہ کان اعلم اھل زمانہ اور محدثین کی اصطلاحی زبان میں علم سے مراد حدیث ہی ہوتا ہے۔

امام مکی کے دل میں امام اعظم کی حدیث دانی کی عظمت کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو صدر الائمہ نے اسماعیل بن بشر کی زبانی نقل کیا ہے کہ

> ایک بار ہم امام مکی کی مجلس درس میں حاضر تھے انھوں نے درس شروع کیا کہ حدثنا ابو حنیفۃ ... الخ حاضرین میں سے ایک بول پڑا کہ حدثنا عن ابن جریج ہم سے ابن جریج مکی کی روایات بیان کیجئے اس پر امام مکی کو اس قدر غصہ آیا کہ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ فرمانے لگے۔
>
> انا لا نحدث السفہاء حرمت علیک ان تکتب عنی قم من مجلسی ہم بیوقوفوں سے حدیثیں بیان نہیں کرتے تمہیں میرے سے حدیث لکھنا روا نہیں ہے میری مجلس سے کھڑے ہو جاؤ۔ چنانچہ جب تک اس شخص کو اپنی مجلس سے نہ اٹھا دیا حدیث بیان نہیں کی اور جب اس کو نکال دیا گیا تو پھر وہی حدثنا ابو حنیفۃ کا سلسلہ شروع کر دیا۔[1]

---

[1] مناقب صدر الائمہ ج ۱ ص ۳۳۲۔

امام مکی کو امام اعظم کے تلامذہ میں صرف حافظ ذہبی نے ہی نہیں بلکہ حافظ ابوالحجاج المزی نے تہذیب الکمال میں، حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں بھی اس کی تصریح کی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے مقدمہ فتح الباری میں جہاں امام بخاری کے اساتذہ و مشائخ حدیث کا تذکرہ کیا ہے وہاں یہ بھی تصریح کی ہے کہ مکی بن ابراہیم کا تعلق امام بخاری کے اساتذہ میں اس طبقہ اولیٰ سے ہے جنہوں نے تابعین کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا ہے۔ گویا مراتب شیوخ میں امام بخاری کے اساتذہ اتباع تابعین ہیں۔ اور ان اتباع تابعین میں جو امام بخاری کے طبقہ اولیٰ کے شیوخ ہیں سب سے اونچا اور بالا مقام مکی بن ابراہیم کا ہے۔ چنانچہ امام بخاری کی مرویات میں جو روایات سب سے عالی ہیں اور جن کو ثلاثیات کہا جاتا ہے جن کی تعداد بائیس ہے ان میں زیادہ تعداد امام بخاری کو مکی بن ابراہیم ہی کے حوالہ سے ملی ہے یعنی بائیس میں سے گیارہ اور باقی گیارہ دوسرے مختلف اساتذہ سے آئی ہیں جیسا کہ آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں اور مکی بن ابراہیم کے حوالہ سے جو ثلاثیات امام بخاری کو ملی ہیں وہ صحیح بخاری کے مندرجہ ذیل ابواب میں آئی ہیں۔

باب اثم من کذب علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب قدر کم ینبغی ان یکون بین المصلی والسترۃ، باب الصلوٰۃ الی الاسطوانۃ، باب وقت المغرب، باب صوم عاشوراء، باب اذا احال دین المیت۔ باب البیعۃ فی الحرب، باب من رای العدو، باب غزوۃ خیبر، باب آنیۃ المجوس، باب اذا قتل نفسہ خطاء۔

الامام الضحاک بن مخلد ابوعاصم النبیل

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں، حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں، حافظ ابوالحجاج المزی نے تہذیب الکمال میں اور محدث صیمری نے مناقب میں ان کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ ان کو فخر ہے کہ ان کے حلقہ تلمذ میں امام احمد بن حنبل، امام اسحاق بن راہویہ، امام علی بن المدینی اور امام بخاری جیسے اساطین علم حدیث داخل ہیں۔ امام ابوداؤد فرماتے ہیں۔ کہ امام ابوعاصم کو ایک ہزار صحیح حدیثیں نوک زبان تھیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ میں نے خود ان سے سنا ہے فرماتے تھے کہ مجھے جب سے غیبت کی حرمت معلوم ہوئی ہے۔ میں نے کبھی غیبت نہیں کی۔[1]

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۴۵۲۔

ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا سارا علم ان کے سینے میں محفوظ تھا۔ چنانچہ ابن خراش کہتے ہیں لم یر فی یدہ کتاب ان کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی گئی۔

حافظ ذہبی نے بھی ان کی اس خوبی کو یہ کہہ کر سراہا ہے کہ

لم یحدث قط الا من قبل حفظہ [1]

حافظ خلیلی فرماتے ہیں کہ ان کے زہد، علم و دیانت پر علماء کا اتفاق کہتے ہیں۔

ان کو نبیل کیوں کہتے ہیں۔

اس میں علماء کے مختلف خیالات ہیں۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ان کی زیرکی اور فراست کی وجہ سے ان کو نبیل کہا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ شہر میں ایک روز ہاتھی آ گیا عام شہری اسے دیکھنے گئے لیکن ابوعاصم اس نظارہ سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔ ابن جریج نے یہ سن کر فرمایا کہ انت النبیل تو ہی عقل مند ہے لیکن امام طحاوی اور حافظ دولابی نے خود ان کا بیان اس سلسلے میں جو نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ:

امام زفر کے یہاں ان کی اکثر حاضری ہوا کرتی۔ اتفاق سے امام موصوف کے یہاں ان کا ہم نام ایک اور شخص بھی آتا تھا جن کی وضع قطع بالکل گئی گزری تھی۔ یہ حسین وجمیل اور خوش پوش تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ انہوں نے حسب معمول امام زفر کے دروازے پر دستک دی۔ لونڈی نے آکر دریافت کیا کون؟ جواب ملا کہ ابو عاصم۔ کنیز نے اندر جاکر اطلاع دی کہ ابوعاصم دروازے پر حاضر ہیں۔ امام زفر نے دریافت کیا کون سے ابوعاصم ہیں؟ لونڈی کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ النبیل (معزز)، ابوعاصم اندر آئے تو امام زفر فرمانے لگے کہ اس لونڈی نے تمہیں وہ لقب دیا ہے جو میرے خیال میں تم سے کبھی بھی جدا نہ ہو گا۔ اس نے تمہیں نبیل کے لقب سے ملقب کیا ہے ابوعاصم کا بیان ہے کہ اس روز سے میرا یہ لقب پڑ گیا۔[2]

حافظ ابن ابی العوام نے بھی اس واقعہ کو بسند متصل نقل کیا ہے۔ بصرے میں ابوعاصم النبیل

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۲۴۔ [2] الجواہر المضیئۃ ج ۱ ص ۲۶۴۔

ہی امام اعظم کے مذہب کی نشر و اشاعت کا باعث بنے ہیں۔ ابو عاصم کی وفات ۲۱۲ھ میں ہوئی اس وقت آپ کی عمر نوے سال کی تھی۔ فقاہت میں یگانہ روزگار تھے۔ ابن سعد ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ کان ثقۃ فقیھا۔ ائمہ ستہ میں امام بخاری تو ان کے بلا واسطہ شاگرد ہیں اور امام ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی بواسطہ حافظ بدرعہ عبداللہ بن اسحاق ابو محمد الجوہری ان کے تلامذہ میں سے ہیں۔

حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں کہ امام طحاوی نے بکار بن قتیبہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ میں نے خود امام ابو عاصم کی زبانی سنا ہے فرماتے تھے کہ ہم امام اعظم کی خدمت میں حاضر تھے آپ کے پاس فقہ و حدیث کے تشنگان علوم کا بے حد ہجوم ہوتا تھا۔ ایک روز آپ نے فرمایا کہ کیا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو صاحب خانہ سے جا کر کہے کہ وہ اس ہجوم کا بندوبست کرے۔ میں نے عرض کیا کہ میں جاتا ہوں لیکن ذرا مجھے کچھ مسائل کے بارے میں پوچھنا ہے فرمایا پاس آؤ اور پوچھ لو۔ میں آگے بڑھ گیا اور مسائل دریافت کیے۔ اسی اثنا میں اوروں نے بھی کچھ سوالات کیے اور آپ نے ان کو جوابات دیے۔ میں ان میں کچھ ایسا محو ہوا کہ مجھے صاحب خانہ کے پاس جانا یاد نہ رہا۔ پھر آپ ہجوم سے کچھ پریشان ہوتے اور فرمایا کہ ابھی ابھی یہاں کسی شریف آدمی نے صاحب خانہ کے پاس جانے کا وعدہ کیا تھا وہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں ہوں۔ فرمایا کیا تم جاؤ گے نہیں؟ تم نے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ عرض کیا کہ میں نے بلا قید وقت جانے کو کہا تھا جب چاہوں جا سکتا ہوں فرمایا کیا کہہ رہے ہو؟ مخاطبات اور محاورات میں کلام کا محمل ارادہ سے مقرر نہیں ہوتا ہے اس کا محمل فی الفور ہے۔[1]

حافظ ابن حجر نے ابو عاصم النبیل کو بھی امام بخاری کے اساتذہ میں صف اول اور طبقہ اولی کا درجہ دیا ہے۔ یہ بھی اتباع تابعین سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں سے ایک ہیں جن کی وساطت سے امام بخاری کو ثلاثیات ملی ہیں۔ ان کی وساطت سے آئی ہوئی ثلاثی حدیثوں کی تعداد صحیح بخاری میں چھ ہے۔

امام اعظم سے ان کو جو گہری اور بے پایاں عقیدت تھی اس کا اندازہ کرنا ہو تو امام نصر بن علی کا یہ بیان پڑھیے کہ:

میں نے ایک بار ابو عاصم سے دریافت کیا کہ آپ کے خیال میں

---

[1] الجواہر المضیئۃ ج ۲ ص ۴۵۶۔

سفیان ثوری زیادہ فقیہ ہیں یا ابو حنیفہ۔ فرمایا سفیان سے مقابلہ کرتے
ہو۔ بخدا ابو حنیفہ کا فقہ میں مقام تو میرے نزدیک ابن جریج سے
بھی بالا ہے۔ میری آنکھوں نے آج تک علم پر اتنا قابو یافتہ شخص
کوئی نہیں دیکھا۔[1]

بہرحال ابو عاصم النبیل کی شخصیت امام اعظم کے تلامذہ میں جیسے گرامی قدر ہے ایسے ہی ان کی ذات گرامی بعد میں آنے والے محدثین کے اساتذہ میں عظیم ترین ہستی ہے۔ سارے محدثین کا شجرہ علمی بالواسطہ اور بلاواسطہ ان سے جا کر ملتا ہے۔

الامام الحافظ یزید بن ہارون

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں مبسوط ترجمہ لکھا ہے جو ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے "الحافظ القدوہ، شیخ الاسلام" اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب میں ان کے چہرے کا آغاز اس طرح کیا ہے "احد الحفاظ المشاہیر الاعلام"، امام علی بن المدینی کہتے ہیں کہ میں نے یزید بن ہارون سے بڑھ کر کسی کو حافظِ حدیث نہیں دیکھا۔ ابن ابی شیبہ کہتے ہیں کہ ہم نے یزید بن ہارون سے زیادہ حفظ میں کسی کو پکا نہیں دیکھا۔ علی بن عاصم کا بیان ہے کہ یزید رات بھر نوافل پڑھتے۔ انہوں نے کچھ اوپر چالیس سال تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی ہے۔[2] حافظ ابو بکر الخطیب نے بسندِ متصل یحییٰ بن ابی طالب کا بیان لکھا ہے کہ میں نے بغداد میں ان سے حدیث کا سماع کیا ہے اس وقت ان کے درس میں ستر ہزار حاضرین کی تعداد بتائی جاتی تھی۔[3] حافظ عبد القادر قرشی نے الجواہر المضیئہ میں اور حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں امام ابو حنیفہ کے ترجمہ میں تصریح کی ہے کہ یزید بن ہارون نے امام اعظم سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ یہ امام صاحب کے فضل و کمال اور حفظِ حدیث کے نہایت معترف تھے۔ ایک بیان میں فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو میں نے دیکھا ہے ان میں ابو حنیفہ سے زیادہ فقیہ کوئی نہیں۔ حافظ ابن عبد البر نے یزید بن ہارون کے حوالہ سے لکھا ہے:

---

[1] مناقب صدر الائمہ ج ۲ ص ۶۵۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۲۔
[3] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۴۶۔

ادركت الف رجل فكتبت عن اكثرهم ما رأيت فيهم افقه ولا اورع ولا اعلم من خمسة اولهم ابو حنيفة ۔

میں ایک ہزار اکابر سے ملا ہوں اور ان میں اکثر سے حدیثیں لکھی ہیں۔ لیکن میں نے ان میں پانچ سے زیادہ پارسا، فقیہ اور عالم کوئی نہیں دیکھا ہے ان میں اولین ابوحنیفہ ہیں [1]

ان کی حدیث دانی کا حال یہ ہے کہ علی بن شعیب کہتے ہیں کہ میں نے خود ان کو یہ کہتے سُنا ہے کہ مجھے بالاسناد چوبیس ہزار حدیثیں زبانی یاد ہیں [2]

ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ کے یزید بن ہارون منشی رہے ہیں یعنی جس زمانے میں ابوشیبہ واسط میں قاضی تھے تو یزید ان کے منشی تھے ان کے بارے میں یزید کا بیان ہے کہ:

اپنے زمانے میں ابوشیبہ سے زیادہ عادلانہ فیصلہ کوئی نہ کرتا تھا [3]

یہ امام یزید کے حدیث میں اُستاد بھی ہیں۔ افسوس ہے کہ ابوشیبہ کو بعد کے محدثین نے جرح کے تیروں کا نشانہ بنالیا ہے اور اس کی بنیاد محض ایک افسانے پر رکھی ہے ورنہ یزید بن ہارون تک ان کی ثقاہت اور دیانت میں کسی کو کوئی کلام نہ تھا۔

یزید اپنے علمی جلال میں اس قدر اونچا پایہ رکھتے تھے کہ مامون جیسا عظیم المرتبت خلیفہ بہت بڑے علمی جلال کے باوجود ان سے خائف تھا۔ حافظ ذہبی نے جو واقعہ لکھا ہے اس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

یحییٰ بن اکثم کہتے ہیں کہ ایک بار ہم سے مامون نے کہا کہ اگر مجھے یزید کی جانب سے اندیشہ نہ ہوتا تو میں اعلان کر دیتا کہ قرآن مخلوق ہے دریافت کیا گیا یہ یزید کون ہیں؟ جن سے آپ کو اندیشہ ہے۔ جواب دیا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ میں اعلان کروں اور یزید میری تردید کریں اور لوگوں میں اختلاف ہو کر رائے عامہ فتنہ کا شکار ہو جائے۔ مامون کی یہ باتیں سُن کر ایک شخص یزید بن ہارون کے پاس واسط پہنچا اور کہا کہ امیرالمومنین آپ کو سلام کہتے ہیں اور یوں فرماتے ہیں کہ میرا ارادہ ہے کہ میں

---

[1] جامع بیان العلم وفضلہ۔ [2] تہذیب ج ۱۱ ص ۳۶۸۔ [3] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۱۲۔

قرآن کے مخلوق ہونے کا اعلان کردوں۔ امام یزید نے سنتے ہی فرمایا کہ تم
جھوٹ بولتے ہو امیر المومنین نے یہ بات نہیں کہی اور نہ امیر المومنین
سے یہ توقع ہے کہ وہ ایسے عامہ کے سامنے ایسی بات رکھیں جس سے
عوام آشنا نہیں ہیں۔[1]

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ مامون الرشید نے یزید کی زندگی میں اس بات کا اعلان نہیں
کیا۔ حافظ ذہبی کی تصریح کے مطابق یزید کی وفات سنہ ۲۰۶ھ میں ہوئی اور مامون نے یزید بن ہارون
کی وفات کے پورے چھ سال بعد سنہ ۲۱۲ھ میں اس کا اعلان کر دیا۔

ابھی صرف اعلان تھا اور سنہ ۲۱۸ھ میں اس نے طے کر لیا کہ اپنی قوت سے کام لے کر لوگوں
کو خلق قرآن کا مسئلہ ماننے پر مجبور کرے چنانچہ اس فیصلہ کو جبراً نافذ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔
اللہ اکبر! یزید کی شخصیت میں کس قدر برتری ہوگی جو ایک فتنہ کے لیے تاحین وفات روک بنی رہی۔

بہرحال امام یزید بن ہارون کی ذات گرامی محدثین کے یہاں ایک استدلالی شخصیت ہے
بڑے بڑے ائمہ حدیث نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی طے کیا ہے جیسے امام احمد بن حنبل،
امام علی بن المدینی، امام ابوخیثمہ، امام ابوبکر بن ابی شیبہ، خلف بن سالم، امام احمد بن منیع وغیرہ
وغیرہ، اس لحاظ سے بعد کے تمام محدثین کے لیے امام یزید بن ہارون استاد الاساتذہ ہیں۔

الامام الحافظ وکیع بن الجراح

وکیع بن الجراح بن ملیح بن عدی نام، ابوسفیان کنیت، نسباً الرواسی اور بلحاظ بود و باش کوفی
ہیں، علم حدیث کے مشہور امام ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کو الامام الثبت الحافظ محدث العراق
کے القاب سے یاد کیا ہے۔ مشہور ناقد رجال یحییٰ بن معین علم حدیث میں ان کا پایہ بتاتے ہوئے
فرماتے ہیں وکیع فی زمانہ کالاوزاعی فی زمانہ، عبداللہ بن المبارک، امام احمد بن حنبل، امام
علی بن المدینی، امام یحییٰ بن معین، امام اسحاق بن راہویہ، امام زہیر، امام ابوبکر بن ابی شیبہ
اور ابوکریب نے ان کے آگے زانوئے ادب تہ کیا ہے۔[2]

یحییٰ بن معین کہتے ہیں۔ بخدا میں نے اللہ کی خاطر وکیع کے علاوہ حدیث روایت کرنے والا

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۹۲۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۲۔

کوئی نہیں دیکھا اور مجھے وکیع سے زیادہ حافظ بھی کوئی نظر نہیں آیا اور فرماتے تھے کہ محدثین تو چار ہیں وکیع، یعلی بن عبید، القعنبی اور احمد بن حنبل۔ امام احمد جب وکیع کا ذکر فرماتے تو کہتے کہ میرے مشاہدے میں وکیع سے زیادہ حدیث کا ضابط اور حافظ کوئی نہیں ہے۔ ان کا ہی ایک اور بیان ہے کہ میں نے وکیع جیسا علم، حفظ و ضبط میں روایت و اسناد، فقہ و احکام میں اور پارسائی و تقویٰ میں کوئی نہیں دیکھا[1] جسم کے ذرا بھاری بھر کم تھے، مکہ تشریف لاتے۔ فضیل بن عیاض سے ملاقات ہوتی۔ سعید بن منصور کہتے ہیں کہ فضیل نے ان سے پوچھا کہ راہب عراق ہو کر یہ موٹاپا کیسا؟ جواب بڑا ہی مسکت دیا فرمایا کہ مسلمان ہونے کی خوشی میں پھول گیا ہوں۔ حافظہ اس قدر غضب کا تھا کہ ابوداؤد کہتے ہیں کہ وکیع کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی گئی[2] صرف یہی نہیں کہ امام اعظم کے تلامذہ میں سے تھے جیسا کہ حافظ ذہبی نے ترجمۂ ابی حنیفہ میں تصریح کی ہے بلکہ یہ امام اعظم کے ان مخصوص تلامذہ میں سے ہیں جن کے بارے میں خود امام صاحب نے یہ تاثر ظاہر فرمایا ہے۔

> تم میرے دل کی مسرت اور میرے رنج و غم کا جلا ہو، فقہ و شرائع کی زین میں نے تمہارے لیے کس دی ہے اور لگام تمہارے ہاتھ میں دے چکا ہوں۔ رائے عامہ تمہارے پیچھے چلے گی اور تمہارے الفاظ کی متلاشی ہو گی تم میں سے ہر ایک عدلیہ میں کام کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ میرا تم سے اللہ کے نام پر اور اس علم کی بزرگی کے نام پر مطالبہ ہے کہ علم کو کرایہ پر چلانے سے بچنا۔ اگر تم میں سے کوئی عدلیہ کی آزمائش میں پڑ جائے اور اسے اپنے اوپر اعتماد نہ ہو تو اس کے لیے عہدۂ قضا ہرگز روا نہیں ہے اور اگر ناگزیر حالات میں طبیعت کے خلاف یہ کام کرنا ہی پڑ جائے تو لوگوں سے علیحدگی ہرگز اختیار نہ کرنا۔ نماز پنجگانہ مساجد میں عوام کے ساتھ ادا کرنا اور نماز کے بعد اعلان کے ذریعے ارباب ضرورت کو تلاش کرنا اور نماز عشا کے بعد خصوصاً اس مقصد کے لیے تین بار

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۷۰۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۳۔

اعلان کرنا۔ اگر بیمار ہو جاؤ تو بیماری کے زمانے کی تنخواہ نہ لینا اور
اگر سربراہ مملکت خزانہ حکومت میں بددیانتی کرے اور ظلم و جور کا
رویہ اختیار کرے تو اس کی سربراہی باطل اور اس کی حکومت
ناجائز ہے۔[1]

وکیع کے والد اگرچہ سرکاری ملازم تھے یعنی سرکاری خزانہ کے نگران تھے اور حکومت کا مالیاتی مسئلہ ان سے متعلق تھا۔ خود امام وکیع کے حوالہ سے خطیب رقمطراز ہیں کہ:

میں امام اعمش کے پاس گیا اور ان سے احادیث روایت کرنے کی درخواست کی انہوں نے مجھ سے میرا نام دریافت کیا۔ بتایا کہ وکیع ہے۔ فرمایا کہ نام تو بڑا ہی پُرعظمت ہے۔ میرا خیال ہے کہ مستقبل میں تمہارا نام ہوگا۔ بتاؤ کوفہ میں کہاں رہتے ہو؟ میں نے بتایا کہ بنی رواس میں۔ بولے کہ جراح بن ملیح کے گھر سے کتنی دور؟ میں نے عرض کیا کہ وہ تو میرے والد ہیں۔ بولے جاؤ پہلے ان سے میرا ماہانہ لے آؤ وہ کیشیئر ہیں۔ میں بعد ازیں تمہیں پانچ حدیثیں سناؤں گا۔ میں گھر آیا اور صورت حال سے والد کو مطلع کیا۔ والد نے کہا کہ آدھا روزینہ لے جاؤ اور پانچ حدیثیں سن آؤ پھر آدھا لے جانا اور پانچ حدیثیں سن آنا اس طرح تمہیں دس حدیثیں آ جائیں گی۔ چنانچہ میں آدھا روزینہ لے کر پہنچا امام اعمش نے لے لیا اور مجھے نقد دو حدیثیں سنا دیں میں نے عرض کیا کہ آپ نے تو مجھ سے پانچ حدیثوں کا وعدہ کیا تھا فرمایا پورا ماہانہ کہاں ہے میرا خیال ہے کہ تمہارے والد نے تمہیں یہ ترکیب سمجھائی ہوگی۔ لیکن ان کو پتہ نہیں کہ اعمش جہاں دیدہ گھاگ ہے جاؤ پورا روزینہ لے کر آؤ اور پوری پانچ حدیثیں سن لو۔ میں واپس آیا وظیفہ لے گیا اور پانچ حدیثیں سنیں۔[2]

اس کے باوجود کہ ان کے والد کا سرکار میں اس قدر عمل دخل تھا اور اتنی اونچی کلیدی

---

[1] المناقب للذہبی ص ۱۷ [2] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۶۸۔

ملازمت پر تھے اور ہارون الرشید سربراہ مملکت عباسی نے امام وکیع کو عدلیہ میں لانے کی کوشش بھی کی لیکن لکھا ہے کہ انہوں نے عہدۂ قضا قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ:

اراد الرشید ان یولی وکیعًا قضاء الکوفۃ فامتنع [1]

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ امام وکیع نے اپنے اُستاد ہی کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی اور اس راہ میں اپنی ذات پر اعتماد نہ ہونے کی وجہ سے اپنے اُستاد کی نصیحت پر عمل کیا تھا۔

امام وکیع صاحبِ تصانیف بزرگ ہیں۔ ہم نے ان کی تصانیف کا گزشتہ اوراق میں ذکر کیا ہے امام ذہبی نے ان کے بارے میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ نماز میں بسم اللہ با آواز بلند کو بدعت کہتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر اور حافظ ابوبکر الخطیب دونوں اس پر متفق ہیں کہ امام وکیع نے حدیث میں امام اعظم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ چنانچہ الخطیب نے اگر یہ بتایا ہے کہ:

کان قد سمع منہ شیئًا کثیرًا۔ [2]

تو حافظ ابن عبدالبر نے بھی یہی لکھا ہے کہ:

وکان قد سمع من ابی حنیفۃ حدیثًا کثیرا۔ وکان یحفظ حدیثہ کلہ [3]

اور صرف حدیث میں ان کو نسبت تلمذ ہی حاصل نہ تھی بلکہ امام اعظم کے علم پر ان کو اس قدر اعتماد تھا کہ حافظ ذہبی نے تذکرہ میں، الخطیب نے تاریخ بغداد میں اور ابن عبدالبر نے الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الفقہاء اور جامع بیان العلم میں یحییٰ بن معین کے حوالہ سے تصریح کی ہے کان یفتی بقول ابی حنیفۃ۔ ان کی وفات ۱۹۷ھ میں ہوئی ہے۔

الامام الحافظ علی بن مسہر

علی بن مسہر نام، ابوالحسن کنیت، نسبت ولاکی وجہ سے قرشی اور سکونت کے لحاظ سے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۲۔ [2] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۷۱۔

[3] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۹۔

کوفی ہیں۔ حافظ ذہبی نے ان کا ترجمہ الامام الحافظ کے القاب سے شروع کیا ہے۔ ان کے تلامذہ میں مشہور محدثین میں ابوبکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ، علی بن حجر اور ہناد ہیں۔ یہ فقہ و حدیث دونوں کے جامع تھے۔ امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، ابو زرعہ، نسائی اور ابن حبان ان سب نے متفقہ طور پر ان کو ثقہ کہا ہے۔ امام عجلی کے ان کے بارے میں الفاظ یہ ہیں کان ممن جمع الحدیث والفقہ۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ کان ثقۃ کثیر الحدیث۔

امام سفیان ثوری اگرچہ خود بھی امام اعظم کی مجلس درس میں حاضر ہوتے ہیں اور ان سے حدیثیں روایت کی ہیں مگر امام اعظم کی فقہ کو انہوں نے علی بن مسہر سے حاصل کیا ہے۔ اور سفیان ثوری نے اپنی کتاب جامع کی تصنیف میں بھی زیادہ تر ان سے ہی مدد لی ہے۔ چنانچہ عبدالقادر قرشی نے مشہور محدث صیمری سے جو خطیب بغدادی کے علم حدیث میں استاد ہیں نقل کیا ہے:

وھو الذی اخذ عنہ سفیان علم ابی حنیفۃ و نسخ منہ کتبہ[1]

اسی بنا پر سفیان ثوری کی جامع کے بارے میں حافظ ابن عبدالبر نے قاضی ابو یوسف کا یہ تاثر بتایا ہے:

سفیان الثوری اکثر متابعۃ منی لابی حنیفۃ[2]

علی بن مسہر آرمینیا میں عدلیہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے قاضی کہلاتے تھے۔ حافظ ذہبی نے ان کو امام اعظم کے تلامذہ میں شمار کیا ہے ۱۸۹ھ میں کوفہ ہی میں وفات ہوئی۔ محدثین نے ان کی ثقاہت، دیانت اور امانت کے بہت گن گاتے ہیں۔

الامام الحافظ حفص بن غیاث

حفص بن غیاث نام، ابو عمر و کنیت، نسباً نخعی اور وطناً کوفی ہیں۔ خطیب بغدادی نے ان کے تلامذہ میں جن اجلہ محدثین کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ابو نعیم، عفان بن مسلم، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، زہیر بن حرب اور اسحاق بن راہویہ ہیں۔

اولاً بغداد پھر کوفہ میں منصب قضا پر فائز رہے ہیں۔

---

[1] الجواہر المضیئۃ ج ۲ ص ۳۷۸۔ [2] الانتقاء ص ۱۲۸۔

حفص بن غیاث بھی امام اعظم کے ان مخصوص تلامذہ میں سے ہیں جن کو امام اعظم نے قلبی مسرت قرار دیا ہے۔ ان کے قاضی بننے کی داستان خطیب بغدادی نے جو لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بکراہت قاضی بننا گوارا کیا تھا۔ چنانچہ حمید بن الربیع کہتے ہیں کہ

> جب عبداللہ بن ادریس، حفص بن غیاث اور وکیع بن الجراح کو ہارون الرشید نے عدلیہ میں کام کرنے کے لیے بلایا تو مجلس میں پہنچتے ہی عبداللہ بن ادریس نے ہارون الرشید کو سلام کیا اور سلام کے بعد جان کر زمین پر گر پڑے یوں محسوس ہوتا تھا کہ دورہ پڑ گیا۔ وکیع نے اپنے کو آنکھ پر ہاتھ رکھ کر یک چشم بنا لیا۔ ہارون نے یہ صورت حال دیکھ کر دونوں کو نااہل قرار دے دیا۔ حفص کہتے ہیں کہ اگر مجھ پر قرض اور اولاد کا بار نہ ہوتا تو میں کبھی بھی یہ عہدہ قبول نہ کرتا[1]

قاضی بن گئے لیکن ان کی عدلیہ کی پوری زندگی زہد و پارسائی کی مثالی زندگی ہے۔ چنانچہ ابو ہشام الرفاعی کہتے ہیں کہ حفص بن غیاث ایک روز عدالت میں مقدمہ سن رہے تھے کہ رئیس مملکت نے بلا بھیجا۔ لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ عدالت کا وقت ہے میں اس وقت نہیں آ سکتا۔ ایک روز آپ بیمار ہو گئے اور پورے پندرہ دن بیمار رہے۔ حفص بن غیاث کے پوتے عبید کہتے ہیں کہ آپ نے مجھے ایک سو درہم دیے اور کہا کہ جاؤ یہ رقم خزانہ حکومت میں داخل کر آؤ اور بتایا کہ یہ ان پندرہ دنوں کی تنخواہ واپس کر رہا ہوں جن میں میں نے کام نہیں کیا۔ یہ میرا حق نہیں ہے[2]

ان کی حدیث دانی، حدیث میں ثقاہت اور حفظ و ضبط کا سب محدثین لوہا مانتے ہیں۔ چنانچہ امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں:

> وہ تمام احادیث جو امام حفص بن غیاث نے کوفہ و بغداد میں بیان کی ہیں۔ وہ سب زبانی یادداشت کے سہارے روایت کی ہیں ان میں کوئی بھی لکھی ہوئی نہ تھی اور ان حدیثوں کی تعداد جو لوگوں نے ان سے لکھیں تین ہزار ہے اور چار ہزار حدیثیں ان کو یاد تھیں[3]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۱۸۸۔ [2] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۱۹۱۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۴۔

زُہد و پارسائی اور اس شانِ محدثانہ کے ساتھ آپ جذبۂ سخاوت سے بھی مالا مال تھے۔ چنانچہ ابو جعفر المسندی نے ان کو اسخی العرب کے لقب سے یاد کیا ہے اور ان سے ان کا یہ اعلان بھی نقل کیا ہے:

من لم یاکل من طعامی لا احدثہ

محدثین کے لیے تاریخ رجال سے واقفیت نہایت ضروری ہے کیونکہ بیشتر احادیث اخبارِ آحاد ہیں اور آحاد کا تمام تر مدار رجال اسناد پر ہے۔ لہٰذا جب تک راویانِ حدیث کے حالات پر بخوبی اطلاع نہ ہو۔ اس کی سند کی صحت و ضعف کا پتہ نہیں چل سکتا۔ پہلی صدی میں تو اس کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ اس زمانے میں حدیثوں کے راوی تمام تر صحابۂ کرام اور اکابر تابعین ہی تھے۔ قرنِ اول گزر جانے پر بے شک ضعیف راویوں کا کچھ پتہ ملتا ہے۔ لیکن ان کا ضعف بیشتر بد دیانتی کی بنا پر نہیں بلکہ حافظہ کی کمزوری، قلتِ ضبط یا روایت میں تساہل کی وجہ سے ہے۔ بہرحال اس دور تک حدیث کے راویوں میں کسی دروغ گو کا وجود نادر اور ضعیف الروایۃ بہت کم تھے۔ امام اعظم اور امام مالک کی اکثر و بیشتر حدیثیں اسی طبقہ کے راویوں سے منقول ہیں۔ اسی لیے وہ صحت و وثوق کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ سمجھی جاتی ہیں۔ دوسری صدی میں کچھ لوگوں نے روایتِ حدیث میں کذب بیانی سے کام لیا تو ائمۂ جرح و تعدیل نے تاریخ کی روشنی میں روایتوں کو جانچا۔ چنانچہ امام سفیان ثوری فرماتے ہیں:

جب راویوں نے جھوٹ سے کام لیا تو ہم نے ان کے لیے تاریخ استعمال کی۔

اور امام حفص بن غیاث نے وقت کے اس تقاضے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اسی سلسلے میں بڑے پتے کی بات فرمائی ہے:

اذا تھمتم الشیخ فحاسبوہ بالسنین۔

جب کسی شیخ کو متہم کرو تو دونوں کی عمروں کا حساب لگا لو۔[1]

یعنی اس راوی کی عمر کا اس شخص کی عمر سے حساب لگا لو جس سے یہ روایت کر رہا ہے کہ یہ اس سے ملا بھی ہے یا ویسے ہی اس سے روایت کا دعویٰ کر رہا ہے۔ بہرحال امام حفص

---

[1] الاعلان بالتوبیخ ص ۹۔

بن غیاث امام اعظم کے خاص تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کی وفات ۱۹۴ھ میں ہوئی ہے۔

الامام الحافظ ہشیم بن بشیر

ہشیم بن بشیر بن ابی خازم القاسم بن دینار نام، ابو معاویہ کنیت، نسبت ولا کی وجہ سے سلمی، اصلاً بخاری، وطناً واسطی اور بلحاظ بود و باش بغدادی ہیں۔ ۱۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔ بڑے بڑے اجلہ تابعین کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا ہے۔ مثلاً عمرو بن دینار اور زہری۔ امام بخاری نے تاریخ کبیر میں امام اعظم کے ترجمہ میں جن ائمہ کے متعلق تصریح کی ہے کہ انہوں نے امام ابوحنیفہ سے حدیث روایت کی ہے ان میں ہشیم بن بشیر کو بھی شمار کیا ہے۔ امام ذہبی نے مناقب میں بھی اس کی تصریح کی ہے اور یہ بھی تذکرہ میں لکھا ہے کہ لا نزاع فی انہ من الحفاظ الثقات[1]

ان کے والد حجاج بن یوسف ثقفی کے باورچی تھے۔ مچھلی پکانے میں خاص مہارت تھی۔ اس خاندان میں ہشیم پہلے منفرد فرزند ہیں جنہوں نے اپنے لیے خاندان سے الگ ہوکر علم کی راہ تجویز کی۔ اولاً والد نے علم حاصل کرنے سے روکا لیکن ہشیم علم کے نشہ سے چور تھے وہ بالکل خاموشی سے والد کی ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت سہتے رہے اور علم میں لگے رہے۔ حافظ ہشیم قاضی ابوشیبہ کی مجلس میں حاضر ہوتے اور ان سے علم حدیث حاصل کرتے۔ ایک بار ہشیم بیمار ہوگئے اور قاضی ابوشیبہ کے درس میں نہ جاسکے۔ قاضی صاحب نے اپنے شاگرد کی غیر حاضری کا لوگوں سے سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ بیمار ہیں۔ ابوبکر الخطیب بغدادی نے بسندِ متصل یہ واقعہ اس طرح نقل کیا ہے کہ:

> ایک بار ہشیم بیمار ہوگئے۔ ابوشیبہ نے لوگوں سے دریافت کیا۔ لوگوں نے بتایا کہ بیمار ہیں۔ فرمایا کہ چلو ہشیم کی عیادت کریں۔ تمام اہل مجلس کھڑے ہوگئے اور قاضی صاحب کی ہمرکابی میں ہشیم کی عیادت کے لیے بشیر طباخ کے گھر پہنچے۔ ان کو گھر پہ کھڑا دیکھ کر ایک شخص بھاگا ہوا بشیر کے پاس آیا اور بتایا کہ تیرے گھر شہر کا قاضی

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۴۔

اُیا ہوا ہے والد گھر آئے تو قاضی صاحب ہشیم کے پاس بیٹھے ہوتے
تھے۔ جب قاضی صاحب واپس چلے گئے تو بشیر نے اپنے بیٹے سے
کہا۔ یا بنی قد کنت امنعك من الحديث فاما اليوم فلا۔ بیٹے
میں تم کو حدیث پڑھنے سے روکتا تھا لیکن آج سے نہیں روکوں
گا۔ ابو شیبہ جیسا میرے گھر آئے واہ رے میرے نصیب بھلا میں
اس کی کبھی آرزو بھی کر سکتا تھا[1]

بغداد میں علم حدیث کی اشاعت میں امام ہشیم کا بڑا ہاتھ ہے چنانچہ حافظ سخاوی نے امام
ذہبی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ :

بغداد جو عراق کا سب سے بڑا شہر ہے اس کی آبادی تابعین کے آخری
دور میں ہوئی۔ سب سے پہلے یہاں جس نے حدیث کی اشاعت کا کام
کیا وہ ہشام بن عروہ اور ان کے بعد شعبہ اور ہشیم ہیں[2]

ان کی حدیث دانی کا حال معلوم کرنا ہو تو حماد بن زید کا وہ بیان پڑھیے جو خطیب بغدادی
نے بسندِ متصل پیش کیا ہے۔

محدثین میں ہشیم سے زیادہ میں نے بلند پایہ کوئی نہیں دیکھا ہے
کچھ محدثین تو ان کو سفیان ثوری سے بھی برتر کہتے تھے۔ امام مالک
ان کی بے حد تعریف کرتے تھے وہ اسے تسلیم ہی نہ کرتے تھے
کہ عراق میں ان کے سوا کوئی محدث ہے وہ فرماتے تھے کہ کیا
ہشیم سے بڑھ کر بھی عراق میں کوئی محدث ہے[3]

ہشیم امام اعظم کے خاص تلامذہ میں سے ہیں اور ہشیم کے تلامذہ میں دوسرے محدثین
کے ساتھ امام احمد بن حنبل کو خاص مقام حاصل ہے اس لحاظ سے جیسے ہشیم اور ابو یوسف
کا باہم رشتہ استاد برادر ہونے کا ہے۔ ایسے ہی امام احمد کا رشتہ بھی ہشیم اور قاضی ابو
یوسف سے نسبت تلمذ میں ایک ہے کیونکہ امام احمد بن حنبل نے جب تحصیل علم کا کام

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۲۴۷۔ [2] الاعلان بالتوبیخ ص ۹۲
[3] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۹۱۔

شروع کیا تو سب سے پہلے قاضی ابو یوسف کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے حدیثیں لکھیں۔ فن حدیث میں اگر قاضی صاحب کی جلالت قدر کا اندازہ کرنا ہو تو ان کے دو شاگرد امام احمد اور امام یحییٰ بن معین کی ان کے بارے میں آراء پڑھیے۔ افسوس کہ یہ تفصیل کا محل نہیں ہے۔

بہر حال ہشیم بن بشیر علم حدیث کے امام اور امام ابو حنیفہ کے تلمیذ ہیں۔ الخطیب نے ان کی تاریخ وفات ۱۸۳ھ بتائی ہے۔

یہاں امام اعظم کے تمام تلامذہ کا استقصاء مقصود نہیں ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی حفاظ ہیں جن کے تراجم حافظ ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں لکھے ہیں اور جن کے بارے میں خود امام ذہبی کی تصریح ہے کہ یہ امام اعظم کے تلامذہ ہیں یا پھر جن کا امام علی بن المدینی، امام بخاری، حافظ عسقلانی نے امام اعظم کے تلامذہ حدیث میں ذکر کیا ہے۔

اگر ہم یہاں حافظ الدین البزاز اور علامہ خوارزمی کی تصریح کے مطابق امام اعظم کے تمام تلامذہ بیان کریں تو ایک طول طویل داستان ہو جائے گی اس لیے ہم طوالت سے بچنے کے لیے صرف ان ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

محدثین کرام کا امام اعظم سے علمی رشتہ

یہ امام اعظم کے چند مخصوص تلامذہ ہیں۔ لیجیے ان ہی کی مدد سے بعد میں آنے والے محدثین کا امام اعظم سے علمی رشتہ معلوم کر لیجیے تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ اس آفتاب عالمتاب کی شعاعیں کہاں کہاں پہنچی ہوئی ہیں۔

اس شجرہ علمی کی ایک ایک شاخ کی نشاندہی تو از بس مشکل ہے۔ ہم یہاں صرف بطور گلے از گلزار اجمالی طور پر عرض کرتے ہیں۔ اسی اجمال سے آپ کو پوری تفصیلات کا اندازہ ہو جائے گا۔

امام اعظم
ابو حنیفہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
عبد اللہ بن المبارک
یحییٰ بن زکریا
حفص بن غیاث
عبد اللہ بن یزید
ابراہیم بن طہمان
۱- عبد الرحمن بن مہدی
۲- یحییٰ بن معین
۳- ابو بکر بن ابی شیبہ
۴- احمد بن حنبل
۱- ابو کریب
۲- یعقوب
۳- ابراہیم بن موسیٰ
۱- اسحاق بن راہویہ
۲- عثمان بن ابی شیبہ
۳- علی بن المدینی
۴- یحییٰ بن معین
۱- احمد بن حنبل
۲- بخاری
۳- الحارث بن محمد
۴- اسحاق
۱،۲- بخاری و مسلم
۳- ابو داؤد
۴- ترمذی
۵- نسائی
۶- ابن ماجہ

امام اعظم
ابوحنیفہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
مکی بن ابراہیم
ابو عاصم النبیل
یزید بن ہارون
وکیع بن الجراح
علی بن مسہر
۱۔ الکدیمی
۲۔ یحییٰ بن معین
۳۔ الذہلی
۴۔ عباس الدوری
۱۔ الدارمی
۲۔ ابومسلم الکجی
۳۔ الحارث ابن ابی اسامہ
۱۔ عبد بن حمید
۲۔ ابوخیثمہ
۳۔ ابوبکر بن ابی شیبہ
۱۔ ابوکریب
۲۔ علی بن المدینی
۱۔ علی بن حجر
۲۔ ہناد بن السری
۳۔ سوید بن سعید

امام اعظم
ابو حنیفہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
امام داؤد الطائی
عبداللہ ابن المبارک
یحییٰ بن سعید القطان
عبدالرزاق
امام محمد
قاضی ابو یوسف
زفر
امام شافعی
امام مزنی
امام طحاوی
امام طبرانی
نعیم الاصفہانی
طیب البغدادی
حسن بن زیاد
یزید بن ہارون
امام احمد بن حنبل
علی بن المدینی
یحییٰ بن معین - امام بخاری - امام مسلم - امام ابوداؤد
ترمذی
نسائی

عبدالرحمٰن بن مہدی: اسحاق بن راہویہ، علی بن المدینی، محمد بن یحییٰ، الذہلی

یحییٰ بن معین: امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، ابو زرعہ

امام احمد: امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابوزرعہ، ابوالقاسم البغوی

امام بخاری: محمد بن نصر مروزی، جزرہ، مطین، ابن خزیمہ

الدارمی: مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، جعفر الفریابی

ابومسلم الکجی: ابوبکر القطیعی، ابوالقاسم الطبرانی، النجاد، القزاز

الکدیمی: ابن الانباری ابوبکر القطیعی ابوبکر الشافعی

الذہلی: ابوزرعہ، ابن خزیمہ، السراج، بخاری

ابوکریب: بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ

یعقوب بن ابراہیم: یحییٰ بن صاعد، قاسم المطرز، بقی بن مخلد

حفص بن غیاث

اسحاق ابن ابراہیم : بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی

عثمان بن ابی شیبہ : ابویعلیٰ، جعفر الفریابی، نسائی، ابن ماجہ

ابراہیم بن طہمان

بخاری : محمد بن نصر مروزی، ابن خزیمہ، صالح بن جزرہ

نسائی : ابوبشر الدولابی، ابوالقاسم الطبرانی

وکیع بن الجراح

علی ابن المدینی : ذہلی، بخاری، ابویعلیٰ

ابوبکر بن ابی شیبہ : ابوزرعہ، بقی بن مخلد، الفریابی

علی بن مسہر

علی بن حجر : بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی

ہناد بن السری : ابوزرعہ، ابوالعباس، عبدان

مسعر بن کدام

یحییٰ ابن آدم : احمد، اسحاق، عبد بن حمید، الحسن بن علی
محمد بن یحییٰ الذہلی، بخاری، دارمی، القفات

ابونعیم

امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حفص بن غیاث
فضیل بن دکین
حکام بن یعلی
سفیان بن عیینہ
مسعر بن کدام
زفر بن الہذیل
عبداللہ بن المبارک
علی بن مسہر
مکی بن ابراہیم
وکیع بن الجراح
یحییٰ القطان
یحییٰ بن معین
علی بن المدینی
احمد بن حنبل
دارمی
ذہلی
اسحاق بن راہویہ
ابن ابی شیبہ
یحییٰ بن معین
امام شافعی
حمیدی
بخاری
سفیان الثوری
اصحاب ستہ
محمد بن عبداللہ انصاری
اصحاب ستہ
امام احمد
یحییٰ بن معین
مسلم، ابوزرعہ
بخاری
اصحاب ستہ
بخاری، ابوعوانہ
طبرانی
مسلم، ترمذی، ابن خزیمہ
بیہقی، حاکم، ابواحمد، دارقطنی
شیخ الاسلام الہروی
اصحاب ستہ

امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ
یزید بن ذریع
ابراہیم بن طہمان
محمد بن الحسن
ابوعاصم النبیل
شعیب دمشقی
ابویوسف
یوسف بن خالد
عبداللہ بن ادریس
اسد بن عمر
قاسم بن معن
اصحاب ستہ
اصحاب ستہ
یحییٰ بن اکثم
اصحاب ستہ
بخاری
علی بن الجعد - احمد
علی بن المدینی بشر بن الولید
امام شافعی
ابن مبارک امام مالک
اصحاب ستہ
احمد بن منیع
احمد بن حنبل
یحییٰ القطان
یحییٰ بن معین
بخاری
ترمذی
امام شافعی
امام احمد
یعلی بن منصور
بخاری
علی بن المدینی
علی بن معبد
یحییٰ بن معین — محمد بن اسحاق
قاسم بن سلام — ابوحاتم — ابن ابی حاتم
ابویعلی - ابونعیم - ابن خزیمہ
امام مزنی
امام طحاوی
الطبرانی
ابویعلی
ابوالشیخ - ابن عدی - ابن حبان
ابن مردویہ
ابوعوانہ

امام بیہقی
دارقطنی
ابن خزیمہ
بخاری
ابن ماجہ
ترمذی
امام احمد
مسلم، ترمذی
عبد بن حمید
احمد بن حنبل
یزید بن ہارون
مسلم، ابوداؤد، ترمذی
دارمی
ابوعاصم
ابویعلی موصلی
یحیی بن معین
عبدالرزاق
ابوداؤد
ابوبکر بن ابی شیبہ
عبیداللہ بن موسی
ابوعبدالرحمان
المقری
امام اعظم
ابوحنیفہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ
حماد رض
عبدالرحمن بن ہرمز رض
عطا بن ابی رباح رض
عمرو بن دینار رض
عامر بن شراحیل رض
ابراہیم
علقمہ
ابوہریرہ
ابوسعید خدری
ام سلمہ
عائشہ
ابن عباس
ابن عمر
علی
عمران بن حصین
عبداللہ بن مسعود
عبداللہ بن عمر
ابن عباس
جابر
جریر - عدی
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

مرتبہ، عبدالوکیل علوی

اسماء کتب ————

اسماء رجال ————

اسماء اماکن ————

اسمائے کتب

الف

ث

ج

ش

ص

ل

م

ن

اسماءِ امکنہ

ا

ب

اسماءِ قبائل و جماعات

ض

ظ

ع

ق

م

ن

ہ

فہرست اسماء رجال

ت

ث

ج

خ

د

ش

ص

ض

ط

م

ن

⁂